حافظ تقی الدین

پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں

پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں

حافظ تقی الدین

فکشن ہاؤس
۱۸۔ مزنگ روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب = پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں

مصنف = حافظ تقی الدین

پبلشرز = فکشن ہاؤس

18 مزنگ روڈ لاہور فون ا

پرنٹرز = زاہد بشیر پرنٹرز لاہور

سرورق = ریاظ

اشاعت = 1995ء

قیمت = 300 روپے

فہرست

حصہ دوم

مقدمہ

یہ عرضی دعویٰ آنے والی نسلوں کے حضور پیش کیا جاتا ہے۔ جسکی تفصیل کتاب ھذا ہے۔ میں نے 1991ء میں ماہ نامہ "جینے دو" کا گوجرانوالہ سے اجراء کیا تو مجھے صحافت کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں نے ماہنامہ "جینے دو" کو سیاسی بنیادوں پر چلانے کی کوشش کی میرا ذہنی لگاؤ عوامی نیشنل پارٹی کے ساتھ تھا مگر میرا ساتھ پارٹی ورکروں لیڈروں نے نہیں دیا۔

میں نے ذاتی وسائل کے ساتھ "جینے دو" کو جاری رکھا میں نے ایک مضمون قسط وار جاری کیا جسکا عنوان تھا "بیسویں صدی کی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں" پرانے اور نئے قوم پرست کارکنوں نے اس کاوش کو بہت سراہا۔ انکی ہمت بندھانے کی وجہ سے میں نے اس موضوع پر مسلسل لکھنا شروع کر دیا میرا پرچہ بہت پیچھے رہ گیا میں لکھتا لکھتا بہت آگے نکل گیا۔

میں نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی یہ مذہبی علمی گھرانہ تھا۔ میرے والد حضرت مولانا عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ گوجرانوالہ شیرانوالہ باغ کی جامع مسجد کے خطیب تھے۔ گوجرانوالہ میں تحریک آزادی کا مرکز یہی مسجد تھی۔ یہاں ہی تحریک آزادی کے سلسلہ میں جلسے وغیرہ ہوتے تھے۔ اسی مسجد سے نکل کر سیاسی کارکن سرکار برطانیہ کے خلاف جلوس نکالا کرتے تھے۔ گرفتار ہوتے تھے' جیلوں میں جاتے تھے۔ میں نے آنکھ کھولی تو اپنے آپکو تحریک آزادی کے مجاہدین کے درمیان پایا۔ جلسوں میں تقریر کرنے والے کہا کرتے تھے کہ انگریز پانچ ہزار میل سے ہم پر حکمرانی کرنے آگیا ہے ہم انگریز حکومت سے چھٹکارا چاہتے ہیں۔ آزادی چاہتے ہیں اور یہ کہ انگریز حکمرانوں نے ہی عالم اسلام پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ اگر ہندوستان آزاد ہو گیا تو عالم اسلام بھی آزاد ہو جائے گا خلافت اسلامیہ' ترکیہ انگریزوں نے ہی تباہ کی ہے۔ انگریز اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے اس وقت میری عمر تھوڑی تھی اور ہم بچے اس جہاد میں صرف اتنی ہی شرکت کرتے تھے کہ کسی انگریز یا کسی افسر کو دیکھتے تو دور سے گالیاں دے کر بھاگ جایا کرتے تھے زیر نظر کتاب میں کچھ واقعات ایک سے زائد مرتبہ بھی لکھے گئے یہ ایک نقص ہے مگر مجبوری تھی اس لئے کہ ہر جماعت اور گروہ ان واقعات سے گزرتا تھا۔ اسی لئے جماعتوں کے تذکرہ کے ساتھ واقعات کا ایک سے زائد مرتبہ لکھا جانا بھی ضروری ہو گیا۔ مسلمان امراء کا ایک بہت بڑا طبقہ خطاب یافتہ مراعات یافتہ مسلم لیگ کی شکل میں انگریز کا حامی تھا مگر میدان عمل میں یہ لوگ نہ تھے۔ پھر تقسیم ہند کا فارمولا سامنے آیا جنگ عالم گیر دوم کے ختم ہونے کے بعد مسلم لیگ میدان عمل میں آئی۔ 1945ء کے انتخابات جیت لئے اور پھر ہندوستان تقسیم ہو گیا پاکستان بن گیا پھر ایک سازش کے تحت لاکھوں لوگوں کا قتل عام ہوا۔ صرف اس لئے کہ اس دھرتی میں رہنے والے لوگوں میں نفرت

پیدا کی جائے پھر نفرت کو مستقل رکھنے کے لئے ریاست کشمیر کو متنازعہ بنا دیا گیا۔ اس دھرتی پر رہنے والے لوگوں میں مستقل جنگ کی کیفیت پیدا کر دی گئی جو آج تک جاری ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد اس خطہ کی وہ جماعتیں جنہوں نے انگریز سرکار کے خلاف جنگ کی تھی تحریک چلاتی رہی تھیں جن میں مجلس احرار' جمعیت علمائے ہند' خدائی خدمت گار' خاکسار بھی شامل تھے انہیں ملعون قرار دیا گیا۔ اخبارات ریڈیو ٹیلی ویژن سے انکی کردار کشی کی جاتی ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ تاریخ کو مسخ کیا گیا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا تحریک آزادی کے ساتھ وابستہ لوگوں کو ملک آزاد ہونے پر انعامات سے نوازا جاتا جیسا کہ ہندوستان میں ہوا ہے۔ مگر پاکستان میں ہر قسم کا گند ان پر اچھالا گیا۔ آج 1995ء میں پاکستان کے معرض وجود میں آئے ہوئے 48 سال گزر چکے ہیں۔ آج بھی برٹش حکومت کے خلاف تحریک آزادی کے ساتھ وابستہ لوگوں کی کردار کشی کی جاتی ہے۔ زیر نظر کتاب دو حصوں میں ہے۔ حصہ اول میں تحریک آزادی کے ساتھ وابستہ جماعتوں اور لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ حصہ دوم میں پاکستان بن جانے کے بعد کی سیاسی جماعتوں' شخصیتوں' تحریکوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ آنے والی نسلوں کے آگے ایک مقدمہ کی شکل میں کتاب پیش کی گئی ہے۔ کہ وہ فیصلہ کریں کہ بیسویں صدی کی سیاسی جماعتوں اور تحریکوں میں انعام و اکرام اور عزت کی حق دار کون تھے۔ رسوائی اور ذلت کن لوگوں کے حصہ میں آنی چاہئے تھی۔

تقی الدین

حصہ اوّل

پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں

پرانے لوگوں کے قدموں کے نشان ہی ہمیں راستے کی سمت بتاتے ہیں۔ میں نے جس عشرے میں آنکھ کھولی وہ وقت بھی بڑا ہی ہنگامہ خیز تھا۔ سیاسی تحریکیں بڑی شدت سے چل رہی تھیں۔ 1914ء کی جنگ کے آثار نمایاں تھے۔ لوگوں میں جنگ عظیم کی باتیں عام تھیں۔ فوجی علاقوں کے فوجی ریٹائر لوگ جنگ کی تباہ کاریوں کی داستانیں بچھڑ جانے والوں کی کہانیاں دور دراز ملکوں میں جنگی خدمات کے دلچسپ واقعات بڑے ذوق شوق سے بیان کیا کرتے تھے۔ 1914ء کی جنگ کے نتیجہ میں خلافت ترکی کی شکست مسلمانوں پر ایک بہت بڑا صدمہ تھی۔ مسلمان اجتماعی سوچ پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ ترکی کی شکست خاتمہ خلافت کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک نیا سیاسی شعور پیدا ہوا۔ جنگ عظیم اول یورپ کے گروہوں کے مابین لڑی گئی تھی۔ فریق اول میں جرمنی' ترکی' اٹلی تھے جبکہ فریق دوم میں برطانیہ' فرانس' روس اور دیگر یورپ کی حکومتیں تھیں جنگ زیادہ تر جرمنی اور فرانس کی سرحدوں پر ہی لڑی گئی۔ یہ جنگ 1914ء میں شروع ہو کر 1919ء میں ختم ہوئی۔ اس جنگ کے نتیجہ میں جرمنی گروپ کو شکست ہوئی تھی جس کے نتیجہ میں خلافت عثمانیہ پاش پاش ہو گئی۔ خلافت عثمانیہ بشمول ترکی کے سعودی عرب' فلسطین' شام' لبنان' عراق' مصر' لیبیا' مراکش' تیونس' الجزائراور دیگر ریاستوں پر مشتمل تھی۔ خلافت عثمانیہ کی شکست سے یہ تمام ممالک فرانس اور برطانیہ کے زیر کنٹرول آ گئے۔ صرف ترکی ہی ترکوں کے پاس رہ گیا جو کہ بالکل نیم جان تھا۔ اس صورت حال کا ہندوستان کے مسلمانوں پر بہت گہرا اثر ہوا اور ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ یہ ایک قدرتی امر تھا۔ جنگ کے خاتمہ کے ساتھ ہی ہندوستان میں تحریک آزادی زورو شور کے ساتھ شروع ہو گئی۔ 1914ء کی جنگ کی محرکات میں اور باتوں کے علاوہ سب سے بڑا محرک جرمنی تھا۔ 1870ء سے قبل جرمن نام کا کوئی ملک کرہ ارض پر نہ تھا۔ 200 دو صد خود مختار ریاستوں کے مل جانے سے وفاقی جمہوریہ جرمنی معرض وجود میں آیا۔ ان ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست پروشیا تھی۔ جرمنی کے متحد ہونے اور معرض وجود میں آنے کی وجہ یہ تھی کہ مغربی یورپ کے کچھ ممالک صنعتی ترقی میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ دنیا کے کافی حصہ پر سیاسی تسلط بھی قائم کر لیا تھا۔ ان ممالک میں پیش پیش برطانیہ فرانس پرتگال' ہالینڈ' بلجیم تھے۔ تقریباً" ساری دنیا پر سیاسی بالا دستی انہی ممالک کی تھی۔ پھر یہ ترقی یافتہ ممالک ایشیا' افریقہ اور دیگر اپنے مقبوضہ ممالک سے خام مال سستے داموں خرید کر لے آتے اور یورپ کے کارخانوں میں تیار کر کے مقبوضہ ممالک کو مہنگے داموں فروخت کرتے تھے۔ یورپ کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تجارت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں' دیگر یہ کہ ان سامراجی ممالک نے دنیا میں ایسے طریقے اپنائے ہوئے تھے ٹیکس کا ایسا نظام بنایا ہوا تھا کہ یورپ کی دیگر ترقی یافتہ ریاستوں کا مال فروخت نہ ہو سکتا تھا۔ اگر فروخت ہوتا بھی تھا تو اچھے داموں فروخت نہ ہوتا تھا۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی نے معرض وجود میں آنے اور ترقی کرنے کے بعد فرانس' اور برطانیہ کے تجارتی نظام کو چیلنج کر دیا کہ دنیا کی سیاسی اور اقتصادی تقسیم میں ہمیں بھی حصہ دیا جائے۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ جرمنی اور ترکی حلیف تھے۔ برطانیہ اور فرانس نے مل کر ترکی کے مسلمان علاقوں میں خلافت کے خلاف آثار پیدا

کر دیے۔ جس کی وجہ سے عرب ممالک میں ترکی کے خلاف ہیجان پیدا کر دیا گیا۔ اس ہیجان کو روکنے کے لئے علماء ہند نے کافی کوشش کی۔ شیخ الہند حضرت محمود الحسن مہتمم دارالعلوم دیوبند' حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ حجاز مقدس گئے۔ لوگوں میں خلافت عثمانیہ کے ساتھ رہنے کی تلقین کی اور شریف حسین مکہ والئی حجاز گورنر ترکی سے بھی ملے مگر خلافت عثمانیہ کے ٹکڑے کرنے کی سازش مکمل ہو چکی تھی۔ حضرت شیخ الہند اور حضرت مدنی کو گرفتار کر لیا گیا اور بحیرہ روم کے جزیرہ مالٹا میں قید کر لیے گئے۔ اس وقت تک رہا نہ کیے گئے جب تک خلافت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیے گئے۔ خلافت عثمانیہ کے ختم ہونے کے بعد وہ مسلمان ملک جو خلافت کا حصہ تھے ان کی تقسیم مندرجہ ذیل طریقہ پر عمل میں آئی۔ الجزائر' تیونس' مراکش' شام' لبنان اور دیگر چھوٹے ملک فرانس کے حصہ میں آئے۔ جبکہ لیبیا' مصر' فلسطین' سوڈان' عراق' حجاز مقدس اور دیگر ریاستیں برطانیہ کے حصہ میں آئیں۔ انہی میں سے کچھ علاقوں پر برطانیہ نے براہ راست کنٹرول کر لیا اور کچھ علاقوں پر اپنے معتمد حکمران قائم کر دیے۔ ترکی کے خلاف اور مسلم ملکوں کے حصے بخرے کرنے کے لئے برطانیہ نے زیادہ تر پنجابی فوج ہی استعمال کی تھی۔ یہ برطانوی فوج مسلم ملکوں بشمول' مکہ مدینہ' ترکی میں فوجی کاروائیوں سے ہچکچاہٹ کرتی تھی۔ جس کے علاج کے لئے پنجاب کے گدی نشین پیروں نے تعویز لکھ کر دیے تھے جو فوجیوں میں تقسیم کر دیے گئے تھے۔ تعویزوں کا مطلب یہ تھا کہ انگریز فوج کے مسلمان فوجی کسی بھی متبرک مقام پر کسی بھی مسلمان پر یا مسلمانوں پر گولی چلائیں گے تو انہیں کوئی گناہ نہ ہو گا اور یہ کہ حاکم وقت کی اطاعت حکم خداوندی ہے۔ ان تعویذات کے ذریعے جو بھی روحانی تحفظ دیا جا سکتا تھا وہ دیا گیا۔ اور پھر مسلم فوجیوں نے کسی بھی کاروائی میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ برطانیہ اور فرانس کی فتح مکمل ہوئی۔ ترکی اور جرمنی کو مکمل شکست ہوئی۔ روس 1917ء کے سوشلسٹ انقلاب کی وجہ سے جنگ سے کنارہ کش ہو چکا تھا۔ یک طرفہ ہی جنگ بند کر چکا تھا۔ فتح اور شکست میں اس کا کوئی بھی حصہ نہ تھا۔ 1919 میں جنگ عظیم اول مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔

بیسویں صدی کی سیاسی تحریکیں اور تاریخی حقائق

1914ء کی جنگ اور اسکے اثرات جو کہ ہندوستان پر پڑے وہ لکھے گئے۔ ترکی بھی اس جنگ میں جرمنی کا اتحادی تھا۔ مختصر ترین لفظوں میں یورپ اور ترکی کے متعلق بھی لکھا جانا ضروری ہے۔

اسلامی خلافت کی تاریخ

حضور علیہ السلام کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد خلافت راشدہ اور اس کے بعد خلافت بنو امیہ قائم ہوئی جو کہ پورے جاہ جلال کے ساتھ 132 ہجری تک قائم رہی۔ اسکا دار الخلافہ دمشق تھا۔ پھر بنو عباس برسراقتدار آ گئے۔ ساتویں صدی ہجری تک بنو عباس کی خلافت قائم رہی جس کا دار الحکومت بغداد تھا۔ تاتاریوں کے بادشاہ ہلاکو خان نے خلافت عباسیہ کو ختم کر دیا اور بغداد پر قبضہ کر

لیا۔ عباسی خلیفہ کو قتل کر دیا گیا۔ خلیفہ کا ولی عہد جان بچا کر مصر پہنچ گیا۔ اس نے مصر میں کاغذی خلافت قائم کر لی۔ وہ یوں کہ حکومت تو مصر پر کسی اور مسلمان بادشاہ کی تھی مگر خلافت کی گدی بغیر کسی اختیارات کے اس عباسی خلیفہ کے پاس رہی اور اس بے اختیار خلیفہ کا کام یہ ہوتا تھا کہ کوئی بھی مسلمان بادشاہ اپنی مسلمان پبلک کو مطمئن کرنے کے لیے خلیفتہ المسلمین سے بادشاہت کی سند لے جایا کرتا تھا تاکہ مسلمان پبلک کو مطمئن کرے کہ وہ خلیفتہ المسلمین کی جانب سے مقرر کردہ بادشاہ ہے۔ اسکی اطاعت کی جائے۔ آٹھویں صدی ہجری کے آخر تک عثمانی ترک کافی طاقت ور ہو چکے تھے اور انہوں نے ترک اور عرب علاقوں کے علاوہ یورپ کے کافی حصہ پر بھی قبضہ کیا ہوا تھا۔ اس وجہ سے مسلمانوں میں ایک تحریک پیدا ہوئی کہ خلافت مضبوط ہاتھوں میں ہونی چاہیے۔ چونکہ عثمانی ترک اس وقت کافی مضبوط ہیں، طاقتور ہیں، یورپ کی طاقتیں بھی انکی باج گزار ہیں۔ اس لیے اسلامی خلافت کی وراثت اور تبرکات انکے حوالے کیے جائیں۔ چنانچہ آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں ترکی کے جو بادشاہ تھے انکے ہاتھ پر تمام مسلمانوں بشمول خلیفہ عباسی کی بیعت کی گئی اور سلطان ترکی خلیفتہ المسلمین بن گئے اور یہی خلافت عثمانیہ، ترکی ہی 1914ء کی جنگ میں جرمنی کی ساتھی تھی۔ اسی خلافت کے خلاف انگریز نے جنگ لڑی تھی۔ اسی جنگ میں ہندوستانی فوج استعمال ہوئی تھی۔ جس میں کافی تعداد پنجابی مسلمان فوجیوں کی تھی۔ اسی جنگ کے نتیجہ میں خلافت عثمانیہ ختم ہوئی تھی۔ اسی جنگ کے نتیجہ میں تمام عرب ملکوں پر برطانیہ اور فرانس کا تسلط ہوا۔ اسی جنگ کے ختم ہونے پر فلسطین پر مکمل کنٹرول برطانیہ کو حاصل ہوا

یورپ اور ترکی کے حالات

مزید تاریخی حقائق بیان کرنے سے پہلے یورپ اور ترکی کے حالات بیسویں صدی کے ابتدائی وقت کے بیان کرنا بہت ضروری ہیں۔ لاہور کے پیسہ اخبار کے مالک منشی محبوب عالم جو کہ اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے اہل علم میں شمار ہوتے تھے۔ وہ 1901ء میں یورپ ترکی اور مشرق وسطیٰ کے دورے پر روانہ ہوتے ہیں۔ روانگی کے وقت انکے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ جس میں لاہور شہر کے معززین نے بشمول حکیم الامت علامہ اقبال نے بھی شرکت کی تھی۔ علامہ صاحب اس وقت نوجوان تھے انہوں نے منشی صاحب کے اعزاز میں ایک نظم بھی پڑھی تھی

منشی صاحب نے الوداعی تقریب کے بعد بذریعہ ریل گاڑی اور پھر بحری جہاز کے ذریعے یہ سفر شروع کیا تھا۔ اس سفر کی تمام روداد انہوں نے اپنی ایک کتاب سفر نامہ بلاد روم، مصر و یورپ و ترکی تحریر کیا جس میں اس وقت کے تمام حقائق بیان کیے ہیں۔ جو کچھ بھی ان ملکوں کے حالات اس وقت کے لکھوں گا یہ اسی کتاب سے ماخوذ ہونگے۔ یہ کتاب اس وقت بھی کتابی کباڑ خانوں سے مل سکتی ہے

وہ لکھتے ہیں جب ہمارا بحری جہاز نہر سویز سے گزر کر بحیرہ روم میں داخل ہوا تو دو یورپین باشندے جو میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی زبان میں یہ بات کی کہ اب مہذب لوگوں کا علاقہ شروع ہو گیا ہے۔ مجھے انکی یہ بات اچھی نہ لگی۔ مگر جب یورپ پہنچا تو پتہ چلا کہ ان لوگوں کا کہنا

بالکل ٹھیک تھا یورپ کے مقابلہ میں ہم ایشیائی لوگ پسماندہ اور انتہائی غیر مہذب اور جاہل ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب میں ذکر کیا۔ فرانس کے شہر پیرس میں 1901ء میں نمائش لگی ہوئی تھی۔ میں برطانیہ میں تقریباً" ایک ماہ گزار کر پیرس نمائش دیکھنے فرانس چلا گیا۔ پیرس نمائش بہت بڑی نمائش تھی۔ تمام یورپ کے ملکوں کے صنعتی سٹالوں کے علاوہ ایشیائی ملکوں کے صنعتی سٹال بھی لگے ہوئے تھے۔ ہندوستانی سٹال پر چند چیزیں رکھی ہوئیں تھیں جن میں بنارسی کپڑا بھی تھا مگر کسی توجہ کے قابل یہ سٹال نہ تھا۔ یورپ کے صنعتی سٹالوں کو دیکھ کر انکی ترقی پر حیرت بھی ہوئی۔ فرانس کی ایک سٹیل کمپنی کا سٹال تھا جنہوں نے سٹال پر لوہے کا ایک مینار بنایا ہوا تھا۔ جس کی انچائی گیارہ سو فٹ تھی اور مینار کی گیارہ منزلیں تھیں۔ ہر منزل ایک 100 سو فٹ کی تھی۔ دیکھنے والے ایک یا زیادہ سے زیادہ دو منزلوں تک اوپر جاتے تھے پھر نیچے آجاتے تھے۔ زیادہ اونچائی پر جانے کی ہمت شاید کسی میں ہو۔ ہم نے لوگوں کو دو منزلوں سے اوپر جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہاں روس کا سٹال بھی تھا جس میں کافی صنعتی اشیاء تھیں۔ ہمارے تصور یا خیال میں روس بہت ہی پسماندہ ملک ہونا چاہیے تھا مگر ہماری توقع سے بہت زیادہ وہ نمائش میں اپنی مصنوعات لے کر آیا ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں ترکی کا بھی سٹال لگا ہوا تھا۔ جس میں ایک بہت بڑی تصویر ایک سپاہی کی لگی ہوئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ترکی میں فوجی سپاہی یا فوج ہی تیار ہوتی ہے

وہ لکھتے ہیں ایران کا بادشاہ ناصرالدین شاہ قاچار بھی پیرس نمائش دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ وہ ایک فرانسیسی مصور سے گھنٹوں اسکے سامنے بیٹھ کر تصویر بنواتے رہتے تھے۔ منشی محبوب عالم صاحب یورپ کے دیگر ملکوں میں بھی گئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جرمن کے لوگ انتہائی خوش اخلاق اور خوبصورت ہیں اور تقریباً" تمام یورپ خوش حال ہے۔ لوگ آسودگی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یورپ کا تمام سفر انہوں نے ریل گاڑی کے ذریعے کیا۔ انہوں نے یورپ کے مختلف ملکوں سے بہت ساری کتابیں بھی خرید کی تھیں۔ جو ہندوستان لانی تھیں۔ یورپ کے ملکوں میں اس وقت بھی قانون تھا کہ ایشیاء کے لوگ آباد نہیں ہو سکتے

ترکی کے اندر بذریعہ ریل گاڑی داخل ہوئے تو گاڑی میں ترکی حکام داخل ہوئے۔ انہوں نے وہ تمام کتابیں اور دیگر لٹریچر قبضہ میں کر لیا۔ منشی صاحب نے بہت احتجاج کیا جسے حکام نے بالکل نہ مانا اور کہا کہ خلافت عثمانیہ نے قانون نافذ کیا ہوا ہے کہ باہر سے کوئی بھی کتاب اخبار رسالہ جات حدود خلافت عثمانیہ میں داخل نہیں ہو سکتے

خصوصی طور پر یورپ سے تو کسی قسم کا لٹریچر داخل نہیں ہو سکتا آپ باب عالی میں التجا کریں کہ آپ نے یہ کتابیں ہندوستان لے کر جانی ہیں شائد آپ کو واپس مل جائیں بہر حال ہم ہر گز یہ کتابیں آپکو نہ دیں گے۔ آخر کتابیں حکومتی اہل کاروں کے قبضہ میں چلی گئیں اور گاڑی قسطنطنیہ کی جانب رواں دواں تھی ذہن میں کئی قسم کی امنگیں تھیں جو پوری ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ قصر خلافت کیسا ہو گا۔ ترکی کے لوگ کیسے ہونگے اور خیالات کی دنیا میں گم کوئی شہر قریب نظر آتا تو کارخانوں کی چمنیاں دکھائی دیتی تھی مگر یہاں اس کی جگہ

مسجدوں کے مینار

دیکھ کر ایمان تازہ ہوا اور مایوسی بھی ہوئی کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں صنعت اور ٹیکنیک ہی موثر رول ادا کرتی ہے جبکہ مرکز اسلام میں کسی قسم کی کوئی صنعت نظر نہیں آتی۔ گاڑی سے اتر کر رہائش کی جگہ پر گئے۔ نہا دھو کر تازہ دم ہوا پھر کچھ آرام کیا۔ شام کے وقت قسطنطنیہ شہر کی جانب گیا ہر جانب خوبصورت ترین مساجد تھیں بازار میں گیا بڑی بڑی دوکانیں تھیں ان پر ہر قسم کا مال تھا۔ دل بہت خوش ہوا کہ چلو ترکی میں ہی مسلمان تجارت پر تو حاوی ہیں۔ دوکانوں پر کام میں مشغول دوکاندار اجلے لباس اور سر پر سرخ رومی ٹوپی پہنے ہوئے بڑی خندہ پیشانی سے گاہکوں کا استقبال کرتے۔ تھوڑی دیر بازار میں گھومنے کے بعد رہائش گاہ پر آگیا۔ دل میں کئی امنگیں تھیں کہ مرکز خلافت دیکھوں گا اور آج میں اس مرکز میں موجود ہوں۔ کئی پروگرام ذہن میں بن رہے ہیں کہ پہلے کہاں جانا ہے۔ کس سے ملنا ہے۔ خلافت عثمانیہ کی فوج اور پولیس کے یونیفارم میں لال ٹوپی پھندنے والی شامل تھی۔ ہر سرکاری اہل کار کے سر پر لال ٹوپی پھندنے والی ہوتی تھی۔ ہندوستان کے مسلمان بھی اس زمانے میں سرخ ٹوپی پھندے والی پہنا کرتے تھے۔ جیسی اس وقت آل پارٹیز لیڈر نواب زادہ نصراللہ خان پہنتے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل مسلمان کی ایک پہچان لال ٹوپی بھی ہوئی تھی۔ ریاست بہاولپور کی پولیس یونیفارم میں بھی لال ٹوپی پھندنے والی ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح ترکی پولیس کے علاوہ عام لوگ بھی لال ٹوپی پھندے والی پہن لیا کرتے تھے۔ بہت جلد یہ خوش فہمی بھی ختم ہو گئی کہ ترکی کے مسلمان خوش حال ہیں اور تجارت پر قابض ہیں۔ بازاروں اور مارکیٹوں میں جو لوگ بھی کاروبار کرتے تھے جنہیں میں مسلمان سمجھتا تھا۔ وہ یہودی اور عیسائی تھے وہ خلافت عثمانیہ کے حاکموں اور مسلمانوں کو خوش رکھنے کے لئے اپنی وضع قطع مسلمانوں جیسی بنائے رکھتے تھے۔

تجارت میں مسلمان دو فیصد سے زیادہ نہ تھے جو کہ زیادہ تر کھانے پینے کی دوکانیں کرتے تھے۔ ایک صحت افزاء پانی جو ترکی کے کسی چشمے سے لایا جاتا تھا اور بوتلوں میں بند ہو کر فروخت ہوا کرتا تھا وہ زیادہ تر مسلمان دوکاندار ہی بیچا کرتے تھے۔ معاشی اور اقتصادی حالت میں ہندوستان کے مسلمان ترکی کے مسلمانوں سے بہتر تھے۔ صنعت و حرفت کا یہ عالم تھا کہ لال ٹوپی ترکی کی یونیفارم میں شامل تھی جو کہ قلیل مقدار میں ترکی میں تیار ہوتی تھی۔ باقی ضرورت کی ساری ٹوپیاں آسٹریا سے منگوائی جاتی تھیں۔ ترکی کے لوگ خوبصورت صحت مند تھے۔ شام کے وقت نوجوان بوڑھے بچے سیرو تفریح کے لئے پارکوں باغوں میں آتے تقریباً ہر عمر رسیدہ شخص کے کندوں پر سینوں پر میڈل اور تمغے سجائے ہوئے نظر آتے۔ بڑے فخر سے اپنی سپاہیانہ زندگی کے حالات بیان کرتے وہ اسی فخر کو اپنا زندگی کا سرمایہ سمجھتے تھے۔ چند اخبارات شائع ہوتے جن میں قصر خلافت کے احکامات ہی زیادہ ہوتے۔ یہ جو مفروضہ ہمارے ہاں قائم تھا کہ ہندوستان کے مسلمان انگریز کی غلامی کی وجہ سے پسماندہ ہیں ترکی کے حالات دیکھ کر یہ غلط ثابت ہوا

قسطنطنیہ میں ایک قلعہ

جس کا نام قلعہ فراموشی تھا۔ دربار خلافت کا اگر کسی دیگر ملک سے جھگڑا یا حالت جنگ یا کوئی اور کسی قسم کا تنازعہ ہو جاتا تو اس ملک کے سفیر کو قلعہ فراموشی میں قید کر دیا جاتا تھا۔ سب سے آخر میں جو سفیر اس قلعہ میں قید ہوا وہ 1799ء میں ہوا تھا۔ انیسویں صدی عیسوی میں خلافت عثمانیہ پر کمزوری کے آثار نمایاں ہو چکے تھے اس لئے بعد میں کسی ملک کے سفیر کو قید نہیں کیا گیا تھا۔

منشی محبوب صاحب لکھتے ہیں کہ مجھے حصول کتب کی بہت جستجو تھی کوشش تھی کہ ضبط شدہ کتابیں واپس مل جاویں۔ کئی افسروں سے ملا کہیں شنوائی نہ ہوئی بڑے سے بڑا افسر اس مسئلے پر مجبوری بیان کر دیتا۔ ہر افسر کا آخری نقطہ یہ ہوتا کہ غیر ملکی کتابوں کی بندش اور ضبطی قصر خلافت کا حکم ہے اگر کچھ ہو سکتا ہے تو امیرالمومنین کے حکم سے ہی ہو سکتا ہے۔ قصر خلافت تک پہنچنے کی کوشش کی گئی جو کہ بے سود۔ حصول کتب سے تو مایوس ہو گیا تھا مگر از رائے عقیدت امیرالمومنین خلیفتہ المسلمین کو دیکھنے کی حسرت باقی تھی۔ اسکے متعلق جستجو کی گئی اس میں بھی ناکامی ہوئی میں نے افسران سے عرض کیا کہ جس مسجد میں امیرالمومنین جمعہ پڑھتے ہیں وہاں جمعہ پڑھنے کی اجازت مل جائے تاکہ میں از رائے عقیدت ایک نظر حضرت اعلیٰ کو دیکھ تو لوں مگر اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ پتہ چلا کہ قصر خلافت میں ہی ایک مسجد ہے جس میں اعلیٰ حضرت جمعہ پڑھتے ہیں اور دیگر جمعہ پڑھنے والے سرکاری اہل کار ہی ہوتے ہیں دوسرا کوئی اور شخص قصر خلافت یا اس مسجد میں جا ہی نہیں سکتا۔ یورپ کی ترقی اور خوشحالی کو دیکھ کر ترکی کی معاشی اور اقتصادی صورت حال پر نوجوان طبقے میں ہیجان تھا مگر اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا۔ علی اعلان سرکاری پالیسی کی کوئی مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کوئی سرپھرا ایسا کرتا تو پابہ زنجیر قصر خلافت میں پیش کر دیا جاتا۔ پھر اس شخص کا انجام کیا ہوتا پھر وہ لوگوں میں نظر نہیں آتا تھا۔ دینی مدارس بھی قسطنطنیہ میں تھے۔ علماء کی بہت عزت تھی۔ ایک خاص مسند کے علماء جنگی سفید پگڑی ہوتی تھی انہیں کافی عزت حاصل تھی۔

بذریعہ ریل گاڑی استنبول جانا ہوا۔ راستے میں جو بھی دیہات تھے انکے مکان کچے تھے بے ترتیب کچی اور گندی گلیاں۔ اگر کسی دیہات میں کوئی مکان پکا ہوتا تو وہ کسی عیسائی یا یہودی کا ہوتا۔ مسلمانوں میں افسران کا طبقہ خوشحال تھا۔ جنکی تعداد بہت کم تھی۔ خلافت عثمانیہ عالم اسلام کا مرکز تھی مراکش' بحیرہ اوقیانوس سے لے کر مشرقی یورپ کے بحیرہ بالٹک تک خلافت عثمانیہ کی حکمرانی تھی۔ اتنی طاقت ہونے کے باوجود وقت کی حقیقی طاقت کی طرف توجہ ہی نہ کر سکے۔ سترویں صدی عیسوی سے یورپ میں صنعتی اور سائنسی انقلاب آ چکا تھا۔ طاقت کا فلسفہ ہی بدل چکا تھا۔ مگر مسلمان یا خلافت عثمانیہ پرانی ڈگر پر ہی چل رہی تھی۔ وہ سپاہی پیدا کر رہے تھے اور ان میں جذبہ جہاد ہی پیدا کرتے رہے۔ اسی کو طاقت سمجھے تھے۔ جذبہ جہاد اور سپاہی بھی ایک وقت میں طاقت تھے مگر بین الاقوامی جنگ میں موثر رول اب جدید ہتھیاروں کا ہو چکا تھا۔ صنعت کا ہو چکا تھا۔ جس پر بشمول ترکی توجہ ہی نہ دی جاتی تھی۔ ترکی میں گھریلو صنعتیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ صنعت اور ٹکنیک نہ ہونے کی وجہ

سے خلافت عثمانیہ ضعف کا شکار ہو چکی تھی۔ اقوام یورپ ترکی کو مرد بیمار کے القاب سے یاد کیا کرتے تھے۔ جبکہ یورپ صنعتی طور پر بہت ہی آگے جا چکا تھا۔ ان حالات میں 1914ء کی جنگ میں ترکی کی شکست لازمی تھی اور جنگ کا نتیجہ عین توقع کے مطابق ہی ہوا تھا۔ اور ترکی کے محاذ پر اتحادی فوجوں نے مختصر سی جنگ کے بعد فتح حاصل کر لی تھی۔ ترکی یعنی خلافت عثمانیہ کی شکست کے بعد ساری دنیا کے مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہونا یقینی بات تھی۔ اس لئے کہ ترکی خلافت کو مسلمانوں میں وہی حیثیت حاصل تھی جو عیسائی دنیا میں پاپائے روم کو حاصل تھی۔ خلافت عثمانیہ کی حکمرانی بھی کافی مسلمان ملکوں پر تھی مگر دیگر مسلمان ملکوں کے بادشاہ بھی خلافت سے ہی بادشاہت کی سند لیا کرتے تھے اور خطبات جمعہ میں خطیب حضرات بھی خلافت اور بادشاہت کی تعریف میں خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ تمام مسلمانان عالم کا مرکز بھی خلافت ہی سمجھا جاتا تھا جو کہ اب ختم ہو چکا تھا۔ پھر خلافت کے جن علاقوں پر برطانیہ اور فرانس نے قبضہ کر لیا تھا۔ ان پر بھی اپنے خاص پٹھو حکمران بنا دیے۔ برٹش سرکار نے ترکی کے خلاف جنگ سے زیادہ سیاست سے کام لیا تھا۔ ترکی کے غیر ترک حکام جو کہ مختلف جگہوں پر متعینات تھے انہیں اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ عربوں میں ترکوں کے خلاف بغاوت پیدا کر دی تھی۔ لارنس آف عریبیا کو یہی کام سونپا گیا تھا کہ وہ عربوں کو خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر قائم کر دے اور وہ اس میں کامیاب ہوا

افغانستان کے حالات

1914ء کی جنگ کے دوران یا اسکے فوراً بعد انگریز سرکار کے خلاف تحریک چلی تھی اس میں افغانستان کے حالات پر بھی جو کہ اس وقت تھے روشنی ڈالنا از حد ضروری ہیں۔ جنگ کے دوران امیر حبیب اللہ خان کی حکومت افغانستان پر تھی جو کہ نیم خود مختار تھی۔ افغانستان کا بادشاہ انگریز سرکار کا وظیفہ خوار بھی تھا۔ انہی دنوں ہندوستان سے بہت سارے نوجوان اس غرض سے افغانستان گئے تھے کہ وہاں سے کوشش کی جائے اور ہندوستان کو آزاد کرایا جائے۔ آزادی کی تحریک مسلم نوجوانوں میں پیدا کرنے والے حضرت شیخ الہند محمود الحسن 'مولانا عبیداللہ سندھی' حضرت مدنی تھے۔ حضرت سندھی 1915ء میں کابل پہنچ گئے تھے۔ انکی کابل موجودگی میں جرمنی اور ترکی کا ایک وفد امیر کابل کے پاس آیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے افغانستان حملہ کر دے ہم اسے ہر قسم کے اسلحہ کی مدد کریں گے یہ ساری باتیں امیر حبیب اللہ خان نے برٹش سفیر کے ذریعے وائسرائے ہند کو پہنچا دیں اسکے عوض بہت مال دولت حاصل کر لیا تھا۔ امیر کابل ہندوستانی حریت پسندوں سے ہر قسم کی معلومات لیتے اور انگریز سرکار کو بتا دیا کرتے تھے۔ ہندوستان کے مسلمان لیڈر اور عام لوگ بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ یاغستان کے لوگ یعنی آزاد قبائل کے لوگ ہما وقت جہاد میں مصروف رہتے ہیں اور وہ انگریز کے خلاف جہاد کو ایمان کا جزو سمجھتے ہیں اور یہ کہ افغانستان کے لوگ اور حکومت بھی ہندوستان کی آزادی کے لیے ہما وقت مستعد ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے کہ افغان حکومت کو یہ یقین ہو جانا چاہیے کہ لوگ ہمارے ساتھ ہیں اور پھر وہ حملہ کر دیں گے اور اندر سے لوگ بغاوت کر دیں گے اور

ہندوستان آزاد ہو جائے۔ ایک اور خوش فہمی بھی مسلمانوں میں موجود تھی کہ ترکی کے سلطان خلیفۃ المسلمین اگر حکم کر دیں کہ تمام مسلمان متحد ہو کر جس جگہ بھی موجود ہوں وہ کافر حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر کے اپنے وطن، آزاد کرا لیں گے۔ خلافت کی دعائیں انکے ساتھ ہیں تو مسلمان کافر حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر دیں گے عملی طور پر مندرجہ بالا دونوں خوش فہمیاں کلی طور پر غلط تھیں۔ 1914ء کی جنگ جب شروع ہوئی تھی تو مسلمانان ہند کے سربر آوردہ لیڈروں جنکا مسلمانوں پر کافی اثر بھی تھا خطاب یافتگان سر اور خان بہادروں جن میں ڈاکٹر علامہ اقبال بھی شامل تھے۔ تاج برطانیہ کو ایک جلسہ کے ذریعے جو کہ برکت علی محمدن ہال لاہور میں ہوا تھا یقین دلایا کہ وہ اپنی تمام صلاحیتیں پیش کی تھی کہ جرمنی اور خلافت عثمانیہ ترکی کے خلاف جنگ میں مسلمانان ہند اور خصوصی طور پر پنجاب کے مسلمان ہر طرح کی مالی و جانی مدد تاج برطانیہ کو کریں گے۔ اسی طرح آزاد قبائل کے لوگ خاص کر سردار اور ملک بھی سرکار برطانیہ کے وظیفہ خوار تھے۔ ان میں چند لوگ لوٹ مار کرتے تھے وہ اپنے پر بغاوت کا خول چڑھا لیتے تھے۔

حقیقت میں وہ لوٹ مار کرنے والے ہوتے تھے۔ مال متاع لوٹ کر قبائلی علاقے میں چلے جاتے تھے۔ لوگوں میں تاثر یہ پھیل جاتا تھا کہ یہ لوگ مجاہدین اور تحریک آزادی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح افغان حکمران بھی انگریز کا وظیفہ خوار تھا جو ہندوستان کے باغی لیڈر کارکن وہاں گئے ہوتے تھے انکے ہر ایک ارادے کو سرکار برطانیہ تک پہنچا دیا کرتے تھے۔ جہاں تک جلسے جلوسوں کا تعلق تھا پنجاب میں بہت لوگ سرکار کے خلاف ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب انتخابات کا وقت آتا تو پنجاب کے مسلمان سرکار پرستوں کی جھولی میں جا گرا کرتے تھے

خطاب یافتہ لوگ ہی حقیقی معنوں میں پنجاب کے مسلمانوں کے لیڈر تھے اور آج بھی انہیں لوگوں کے وارثان ہی پاکستان کے لیڈر ہیں جو لوگ تحریک آزادی کے سلسلہ میں افغانستان گئے ہوئے تھے ان میں مولوی محمد علی قصوری، مولوی برکت اللہ صاحب، مہندر پرتاب، شیخ ابراہیم صاحب اور دیگر بہت سارے لوگ تھے جو کابل افغانستان گئے تھے۔ جن میں سے بعض پڑھے لکھے لوگوں کو سرکاری نوکریاں بھی دی گئیں تھیں جو کہ بہت ہی کم تھیں۔ باقی لوگ سرکار کے خرچہ پر ہی وہاں رہے جو کہ بہت ہی کم ملتا تھا اور ان لوگوں سے افغانستان کے حکام مختلف معلومات لیا کرتے تھے، اور سرکار برطانیہ کو بذریعہ سفیر بھیج دیا کرتے تھے۔ جبکہ سیاسی ورکر حکام کابل سے ملکر جو حالات بیان کرتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ بہت کارہائے نمایاں ادا کر رہے ہیں۔ اسی زمانے میں تحریک ہجرت بھی مسلمانوں نے چلائی جس کا ماخذ یہ تھا کہ حضور علیہ السلام کا فرمان اور آپ کے حالات زندگی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر مسلمانوں پر کہیں برا وقت آ جائے زمین تنگ کر دی جائے تو ہجرت کریں۔

تحریک ہجرت

مسلمان وہاں سے نقل مکانی کر جاویں۔ راسخ العقیدہ مسلمانوں کو یہ بات حکم خداوندی معلوم ہوئی اور اس پر عمل کرنے کے لیے قربستہ ہو گئے۔ تحریک ہجرت کے لیڈران کو قومی اور بین الاقوامی

حالات کا بھی پتہ نہ تھا۔ ان کو یہ تک بھی پتہ نہ تھا کہ یہ لوگ کہاں جائیں گے اور ان پر کیا کیا تکالیف آئیں گی۔ از روئے اسلام مسئلہ بیان کر دیا گیا اور تحریک ہجرت جاری کر دی۔ سادہ لوح مسلمان اپنا مال و متاع اونے پونے داموں بیچ کر افغانستان ہجرت اس خوش فہمی کے ساتھ ہجرت کرنے لگے کہ جب ہم وہاں پہنچیں گے تو افغانستان کے حکام ہمارا بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کریں گے۔ ہمیں سینوں سے لگائیں گے۔ اور ہماری خاطر تواضع کریں گے اور ہمیں اپنے ملک میں آباد کریں گے۔ اور ہندوستان کی جنگ آزادی میں ہمارے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔ پھر جس طرح حضور علیہ السلام کے وقت انصار اور مہاجرین نے مل کر مکہ فتح کر لیا تھا اسی طرح بالاخر ہم بھی ہندوستان فتح کر لیں گے۔ انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کریں گے۔ اس تحریک میں لوگوں نے اپنے گھر اونے پونے داموں بیچے اور کچھ روزانہ استعمال کی اشیاء ساتھ لیتے اور سفر پر روانہ ہو جاتے۔ اہل محلہ ہندو اور سکھ بھی انہیں روکتے مگر وہ حکم خداوندی سمجھ کر ہجرت کو چل دیتے۔ پھر اسی ہجرت کی حالت میں انہیں حکام بھی روکتے مگر وہ ہرگز نہ رکتے۔ یہ لوگ کسی جگہ انفرادی طور پر جا رہے تھے تو کہیں چند مل کر ہجرت میں مصروف تھے۔ یہ لوگ کابل کی سرحد پر وقفے وقفے کے ساتھ پہنچنا شروع ہو گئے۔ حکومت ہند کے ملازمین نے بھی ان کو روکا اور افغان حکام نے بھی آگے جانے سے منع کر دیا۔ مگر مہاجرین کہتے تھے کہ ہمیں بادشاہ کے حضور کابل تک جانے دیا جائے۔ افغان حکام مان گئے۔ مہاجرین جب کابل پہنچے تو انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ بادشاہ تک تو انکی رسائی نہ ہوئی اور نہ ہی کابل کے حکام نے انہیں خوش آمدید کہا۔ کابل کی سرد آب و ہوا جس میں یہ لوگ رہنے کے عادی نہ تھے۔ اور پھر مناسب رہائش کا بندوبست بھی نہ تھا۔ موسم کے لحاظ سے اوڑھنا بچھونا بھی نہ تھا' پہننے کو اس ماحول میں لباس بھی نہ تھا۔ زاد راہ جو ساتھ تھا وہ بھی ختم ہوتا نظر آنے لگا۔ یہ لوگ بہت بری حالت میں واپس آئے تو گھر بھی نہ تھے وہ تو خود بیچ کر گئے تھے گنتی کے چند لوگ جو آگے روسی علاقوں میں چلے گئے اور وہیں آباد ہو گئے اور انہیں وہاں پر کام وغیرہ بھی مل گیا ان میں سے اقبال شیدائی اور دیگر چند ایک لوگ ہندوستان آزاد ہونے کے بعد واپس آ گئے تھے۔ تحریک ہجرت مکمل ناکام ہوئی اور یہ تحریک ان مسلمانوں کے لیے جو اس پر عمل پیرا ہوئے تھے مصیبت کا باعث بنی۔

امت مسلمہ میں آزادی کا تصور یہ پیدا کیا گیا ہے کہ اگر کسی ملک کا حاکم مسلمان ہے تو وہ آزاد ہیں اگر وہ غیر مسلم ہے تو وہ غلام ہے۔ یہ حقیقی تصور نہیں۔ افغانستان کا حکمران امیر حبیب اللہ خان آزاد خود مختار حکمران نہیں تھا۔ حضرت سندھی نے اپنے حالات زندگی میں لکھا ہے امیر حبیب اللہ خان انتہائی بدکردار آدمی تھا۔ ظالم تھا بے رحم تھا۔ ہندوستان کے مسلمان افغانستان کے لوگوں کی نسبت خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ افغانستان میں جنگل کا قانون تھا جبکہ انگریز کی عمل داری میں قانون کی حکمرانی تھی ہندوستان میں ریل گاڑی اور دیگر سفری سہولتیں موجود تھیں جبکہ افغانستان میں ابھی گھوڑوں اور جانوروں پر ہی سفر کیا جاتا تھا۔ لیکن ان سب چیزوں کے باوجود لوگوں کو ذہنی طور پر اس بات پر تیار کیا جاتا تھا کہ حاکم مسلمان ہی ہو تو مسلمان آزاد ہیں چاہے وہ کتنا ہی بدکردار ظالم کیوں نہ ہو۔ قیام پاکستان سے چند سال قبل کی بات ہے جبکہ لوگوں میں کسی حد تک یہ یقین بھی ہو چلا تھا کہ انگریز ہندوستان چھوڑ رہے ہیں کچھ لوگوں نے امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام آزاد سے سوال کیا کہ اگر

انگریز مسلمان ہو جاویں تو آپ انکی حکمرانی قبول کرلیں گے اس پر حضرت نے جواب دیا کہ انگریز مسلمان بھی ہو جاویں تو ہم ایسی صورت میں انکی حکمرانی قبول نہیں کریں گے۔ کیونکہ وہ باہر سے آکر یہاں حکمران بنے ہیں طاقت کے زور پر حکمران بنے ہیں اگر وہ مسلمان بھی ہو جاویں اور یہاں کے باشندے بن جاویں اور لوگوں کی مرضی سے حکمران بن جاویں تو ہم انہیں قبول کرلیں گے۔ اس قسم کے خیالات چند مسلمان لیڈروں کے تھے۔ ورنہ عام مسلمانوں کے ذھن میں یہی بات ڈالی جاتی تھی کہ حاکم مسلمان ہو تو مسلمان آزاد ہیں چاہے وہ کتنا ہی بد کردار ہی کیوں نہ ہو۔ اسی تصور نے مسلمان حکمرانوں میں ظلم اور جبر کا ذھن بن گیا ہے۔ پھر عام مجالس میں تقاریر میں علماء ظالم حکمرانوں کے زیادہ قصیدے بیان کرتے ہیں۔ حجاج بن یوسف ظالم ترین حکمران تھا مگر علماء حضرات نے اسکے تمام ظلم معاف کردیئے اس لئے کہ اس نے قران شریف پر اعراب ڈالے تھے اور قابل تعریف بن گیا۔ اسی وجہ سے مسلمانوں میں قرون اولی سے دو فرقے بن گئے تھے۔ جو کہ بہت بڑے بنیادی فرقے تھے۔ شیعہ حضرات کا یہی مطالبہ تو تھا کہ قاتلان امام حسین سے بدلہ لیا جائے مگر اسے نہ مانا گیا قاتلان امام حسین اور قاتلان حضرت علی کو تو معاف کردیا گیا مگر اسی آڑ میں ہر ظالم حکمران کو ظلم کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔ چاہے وہ کتنا ہی مسلمانوں پر ظلم کرے وہ جائز ہے اور حاکم وقت کو ظلم زیادتی پر کوئی روک ٹوک نہیں کرسکتا

مسلمان ظالم حکمرانوں کی مذمت نہیں کی جاتی

خلفائے بنوامیہ اور خلفائے عباسیہ کے درباروں کے حالات پڑھیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں حضرت امام ابوحنیفہ کے حالات زندگی میں لکھا ہے کہ ایک وقت میں عباسی خلیفہ منصور نے چند علماء کو مشاورت کے لئے بلایا جن میں امام ابو حنیفہ بھی تھے۔ ابوسفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ نے منصور سے سخت لہجہ میں باتیں کیں پاس بیٹھے ہوئے حضرت امام ابو حنیفہ نے عبا سمیٹنا شروع کیا کہ ابھی سفیان کی گردن کٹے گی اور خون کے چھینٹے ہم پر بھی پڑیں گے۔ خلفائے بنو امیہ کا گورنر کوفہ لاکھوں انسانوں کا قاتل جن میں بہت زیادہ صحابی تابعی بھی شامل تھے۔ کسی بات پر مسجد میں بروز جمعہ کے وقت خفا ہو جاتا ہے مسجد کے دروازے بند کرکے قتل عام کا حکم دے کر مسلمانوں کا قتل عام کردیتا ہے۔ یہ تاریخ کا سب سے بڑا قاتل حجاج بن یوسف ہے۔ اگر شہادت علی اور شہادت عثمان اور شہادت امام حسین کے مجرموں کی مذمت کی جاتی تو حجاج بن یوسف جیسے درندے پیدا نہ ہوتے مگر یہ ایک ایسا درندگی کا عمل جاری ہوا کہ آج تک جاری ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ کو قید کردیا جاتا ہے حضرت امام منصور کو ظالم نہیں کہتے خاموشی سے ظلم سہہ لیتے ہیں۔ اگر حضرت امام ابوحنیفہ منصور خلیفہ کے ظلم کی مذمت کرتے تو معتصم باللہ یا واثق باللہ جیسے ظالم حکمران پیدا نہ ہوتے۔ جنہوں نے امام احمد بن حنبل کو خلق قرآن کے مسئلہ پر قید میں ڈال دیا پھر ہر روز امام احمد بن حنبل کو بر سربازار کوڑے مارے جاتے ذلیل کیا جاتا مگر امام صاحب ہیں کہ ظلم سہہ رہے ہیں اور ظالموں کی مذمت تک نہیں کی جس کے نتیجہ میں آنے والے وقت میں لاکھوں ظالم حکمران پیدا ہوئے اور ہو رہے ہیں اور ظلم بھی زیادہ تر

مسلمانوں پر ہی کرتے ہیں اور ظلم کی چکی میں اکثریت مسلمان ہی پس رہے ہیں۔ موجودہ مسلمان حکمران بھی عیش عشرت کو اپنا حق سمجھتے ہیں اور اپنی رعیت مسلمان پر جبر بھی اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ہمارے اس وقت ایک عام تصور ہے کہ تھانے دار کو بھی 7 خون معاف ہوتے ہیں اور حاکم جتنے بھی خون کرلیں، ظلم کرلیں انہیں کوئی پرسش نہیں جبکہ قرآن کریم میں کئی جگہ یہ آیت ہے کہ خداوند کریم ظالموں کو پسند نہیں کرتا اور کئی جگہ ظالموں اور ظلم کی مذمت کی گئی ہے۔ جن اکابر پر بھی ظلم کی مختصر ترین روداد بیان کی گئی ہے یہ امت مسلمہ کے رہبر تھے۔ ستون تھے۔ اگر اتنے بڑے لوگوں کو بے رحمی سے قتل کیا جاتا ہے، شہید کیا جاتا، ظلم کی چکی میں پیسا جاتا ہے تو پھر اس وقت عام لوگوں کا کیا حال ہوگا اور جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے اسکا گلہ ہم کس سے کریں ہر افسر اپنے آپکو مختار کل سمجھتا ہے جو کچھ بھی کرلے اسے کوئی پرسش نہیں بہرحال یہ باتیں تو ضمنی تھیں۔ اصل تو ہم افغانستان کی صورت حال پر بحث کر رہے تھے۔ حضرت سندھی اور دیگر بہت سارے سیاسی کارکن وطن عزیز کی آزادی کی جد و جہد کے لئے افغانستان گئے ہوئے تھے انکی کوشش بار آور نہ ہو رہی تھیں۔ امیر حبیب اللہ خان شاہ افغانستان بھی انگریز کے تابعہ فرمان بادشاہ تھے اور روس میں سوشلسٹ انقلاب آچکا تھا کچھ لوگ سوویت یونین بھی گئے جن میں ایک نوجوان خوشی محمد بھی تھا جو کہ تاشقند یونیورسٹی میں حصول تعلیم کے لئے داخل بھی ہو چکا تو اس نے تاشقند کے حکمرانوں میں رسوخ بھی قائم کرلیا تھا اسکی وجہ سے کابل میں حضرت سندھی اور دیگر مجاہدین آزادی سے رابطہ ہوا انہیں مجاہدین کی کوشش سے امیر امان اللہ خان کی حکومت اور سوویت یونین کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا کہ اگر افغانستان پر کوئی بیرونی حملہ ہوا تو سوویت یونین افغانستان کی امداد کرے گی یہی معاہدہ 1919 ہے جس کے تحت روسی فوجیں کابل میں 1979 میں داخل ہوتیں تھیں۔ 1918 میں جنگ عظیم اول ختم ہو چکی تھی اتحادی فوجیں فاتح ہونے کے باوجود تھک چکی تھیں مزید کسی جنگ کے لئے تیار نہ تھیں۔

شاہ امان اللہ خان کی برطانیہ کے خلاف جنگ

جو سیاسی کارکن کابل میں تھے انکے مشورہ سے شاہ امان اللہ خان نے ہندوستان کے سرحدی علاقہ پر حملہ کر دیا۔ بنوں کے کچھ علاقہ پر قبضہ بھی کرلیا۔ راولپنڈی پر ہوائی حملہ بھی کیا۔ انگریز فوجیں افغانستان میں داخل ہوگئی تھیں اس مختصر سی جنگ کے بعد انگریز حکومت نے صلح کا جھنڈا بلند کر دیا۔ برطانوی حکومت کو پتہ تھا کہ افغانستان کے حملہ کے پس پردہ سوویت یونین ہے۔ اگر جنگ طول پکڑتی ہے تو سوویت یونین افغانستان کی مدد کو آجائے گا اس لئے برطانوی ہند کی حکومت نے جنگ بندی کو ہی بہتری سمجھا اور ساتھ ہی اس وقت پنجاب میں حکومت کے خلاف بہت زور کی تحریک چل اٹھی تھی اسکا فائدہ بھی شاہ افغانستان کو پہنچا اور حکومت برطانیہ نے شاہ افغانستان کو مکمل خود مختار بادشاہ تسلیم کر لیا

اس جنگ سے قبل افغانستان کی حکومت نیم خود مختار تھی مگر اس جنگ کے نتیجہ میں افغانستان مکمل خود مختار ہوگیا۔ حکومت افغانستان نے بیرون ملک یورپ میں بھی اپنے سفیر مقرر کئے۔ تمام دنیا

میں سفیر مقرر کیے۔ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان صاحب کو باہر کی دنیا سے دعوتیں آنے لگیں کہ وہ ہمارے ملک کا دورہ کریں دعوت دینے والے ملکوں میں یورپ کے ملک زیادہ تر اور یورپ کے ملک ہی اس وقت آزاد تھے ورنہ ایشیا اور افریقہ کے ممالک پر تو اقوام یورپ کا تسلط تھا۔ شہنشاہ امان اللہ خان صاحب نے بیرون ملک جانے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے کئی ملکوں میں جانا تھا۔ انگریز اپنی سیاسی چالوں میں خوب مہارت رکھتے تھے وہ جانتے تھے کہ مسلمان حکمرانوں پر کونسا حربہ استعمال کرنا ہے۔ کیسے مسلمان سربراہان مملکت کو زیر کر کے ہمیں بدلہ لینا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ افغانستان کے لوگ علماء حضرات کے زیر اثر ہیں۔ لوگ انہیں کی مانتے ہیں انہیں ہی آخرت اور دنیا میں نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب غازی امان اللہ خان یورپ کے دورے پر روانہ ہو گئے تو ایسے پریس فوٹوگرافر ساتھ کر دیے یا جو پریس فوٹوگرافر یورپ سے اعلیٰ حضرت کے ساتھ ہوئے تو انہیں خرید لیا گیا اور انہیں خاص انداز سے غازی امان اللہ خان کے دورے کی فوٹوگرافی کرنے کو کہا گیا پھر تمام دورے کی فوٹوگرافی اسی انداز سے ہوئی۔ تمام دورہ کی خبریں اسی انداز سے بنوائی گئیں۔ پھر افغانستان کے مولوی حضرات کو انگریز نے اپنی حمایت میں کیا دھن دولت کیا کچھ نہیں کر سکتی غازی امان اللہ خان ابھی یورپ کے دورے سے واپس نہیں پہنچا کہ خاص قسم کی فوٹوگرافی اور خاص قسم کی خبریں پہلے افغانستان پہنچ گئیں کہ غازی امان اللہ خان نیم برہنہ عورتوں کے ساتھ ڈانس کر رہا ہے۔ نوجوان لڑکیوں کے ساتھ ہاتھ ملا رہا ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھا ہوا ہے۔ کسی نوجوان لڑکی کا بوسہ لے رہا ہے۔ یہ سب باتیں یورپ میں کوئی جرم بھی نہیں تھیں۔

امان اللہ خان کے خلاف بغاوت

مگر انگریز افغانستان کے لوگوں کے مزاج سے بھی واقف تھا اور مولوی تخریبی طاقت سے خوب واقف تھے۔ ملا شور بازار اس وقت کابل کے بااثر اور طاقتور علماء میں شمار ہوتا تھا۔ افغانستان میں ان تصویروں کی تشہیر کی گئی۔ افغانستان کے اکثر مولوی حضرات نے ملا شور بازار کی قیادت میں فتویٰ جاری کر دیا کہ غازی امان اللہ خان کافر ہو گیا ہے۔ کافر عورتوں کے ساتھ ہاتھ ملاتا ہے' بوسہ لیتا ہے' ناچ کرتا ہے' اس کی اطاعت لازمی نہیں اور جو شخص بادشاہ امان اللہ خان کی اطاعت کرے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا۔ اس کے فتوے نے غازی امان اللہ خان کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ پبلک نے ہر حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ فوج اور سپاہ نے بھی عدم تعاون کا اعلان کر دیا بالاخر غازی امان اللہ خان جس نے انگریز سرکار سے مکمل آزادی حاصل کی تھی۔ جس کے تدبر سے دنیا میں افغانستان اور غازی امان اللہ خان کی عزت ہوئی۔ جسے دنیا میں آزادی کا ہیرو کہا جانے لگا۔ وہ تخت تاج چھوڑ کر افغانستان سے بھاگ جانے پر مجبور ہو گیا۔ انگریز اور مولوی ملا شور بازار کامیاب ہوئے۔ غازی امان اللہ خان روشن خیال بادشاہ تھا اسکی سمجھ میں یہ بات آچکی تھی کہ افغانستان کی ترقی اور خوشحالی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک میں صنعتیں لگائی جائیں' زراعت کا جدید طریقہ اپنایا جائے۔ یہی وہ چیز تھی جو یورپین حکمرانوں کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس لئے اگر ایشیا کے لوگ صنعتی ترقی میں شامل ہو گئے تو یہ بھی ترقی یافتہ ہو

جائیں گے اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونگے اور یورپ کے سیٹھ کارخانہ دار اپنی مصنوعات کہاں فروخت کریں گے یورپ کی مقدور بھر کوشش یہی ہوتی تھی کہ ایشیا کہ لوگ اتنی ہی ترقی کریں جتنی یورپ کے صنعتی کارخانوں کے لئے نقصان دہ نہ ہو اور انکی اجارہ داری قائم رہے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اقوام یورپ نے مولوی اور مشائخ کو اپنا آلہ کار بنایا ان لوگوں کے ذریعے جو بھی کام کیا کامیاب رہا۔ ویسے بھی یہاں کا خان' وڈیرہ' چوہدری' سردار اور خان بہادر بھی اقوام یورپ کے ہی آلہ کار رہے ہیں۔ مگر ہراول دستے کا کام ہمیشہ مولوی اور مشائخ نے کیا ہے۔ یہ لوگ انگریز کو سستے بھی مل جایا کرتے تھے۔

اس لیے افغانستان کی حکومت ختم کرنے کے لئے غازی امان اللہ خان کو تخت سے اتارنے کے لئے ملاں کو ہی استعمال کیا اور کامیاب رہا اور آج کے اس جدید دور میں بھی افغانستان کی پیپلز ڈیمو کریٹک پارٹی کی حکومت کو مولوی کے ذریعہ ہی ختم کرایا گیا۔ آج افغانستان میں ڈیمو کریٹک حکومت ختم ہو کر خالص مولوی کی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ جو کہ افغان انتشار کا بہترین نمونہ ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آنے والا وقت کیا رخ اختیار کرے گا اور تخت حاصل کرنے کے لئے کون سا عالم دین کامیاب ہوتا ہے۔ غازی امان اللہ خان کے اقتدار سے الگ ہونے کے بعد افغانستان کچھ عرصہ انتشار کا شکار رہا پھر اس وقت نادر شاہ کی حکومت قائم ہو گئی۔ حضرت سندھی نے افغانستان میں نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی تھی اور حضرت خود ہی متفقہ طور پر کابل نیشنل کانگرس کے صدر چنے گئے تھے اور اسی حوالے سے ہی افغانستان کی حکومت کے ساتھ معاملات کیا کرتے تھے۔ حکومت افغان بھی انہیں انڈین نیشنل کانگرس کا نمائندہ ہی سمجھتی تھی پھر کانگرس کے گیا کے اجلاس میں باقاعدہ کابل کی انڈین نیشنل کانگرس کو تسلیم کیا گیا تھا اور حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمتہ اللہ علیہ کو انڈین نیشنل کانگرس کا نمائندہ ظاہر کیا گیا تھا۔ اس حوالے سے ہی حضرت شاہ افغانستان سے اور دیگر افغان حکمرانوں سے بات چیت کیا کرتے تھے۔

1917ء میں روس میں سوشلسٹ انقلاب آچکا تھا۔ سویت یونین بن چکا تھا۔ حضرت نے ہندوستان کی آزادی کی معاونت کے لئے روس جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ روسی سفیر سے تو ملتے ہی رہتے تھے اسی کی معاونت سے سویٹ یونین جانے کا پروگرام بنایا۔ حکومت روس کو پہلے ہی مطلع کر دیا گیا تھا۔ سب پروگرام سویت یونین کے سفیر مقیم کابل اور حکومت کابل کے مشورہ سے بنا تھا۔ حضرت سندھی 1922ء میں ازبکستان کے راستے عازم ماسکو ہوئے۔ وہاں پر سات ماہ رہے۔ انہوں نے سوشلسٹ معاشرے کا بغور مطالعہ کیا۔ فرماتے ہیں

"میرا تعلق انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ تھا اور حکومت روس نے بھی مجھے ہندوستانی مہمان سمجھتے ہوئے اچھا سلوک کیا اور ہر قسم کی سہولت سے مجھے نوازا گیا۔ مجھے مطالعہ کے لئے ہر قسم کی سہولت دی گئی۔ میری ملاقات سویت یونین کے افسران سے ہوتی رہتی تھی اور تبادلہ خیالات بھی ہوتا رہتا تھا۔ کامریڈ لینن سے میری کوئی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ اس وقت اس قدر بیمار تھے کہ کسی کو پہچان ہی نہ سکتے تھے"۔

حضرت سندھی ماسکو چلے گے۔

جو روایات میرے اور کامریڈ لینن کا بارے ہندوستان کے اخبارات میں چھپتی رہی ہیں وہ سب غلط ہیں من گھڑت ہیں ہاں حکومت روس نے جو میری پذیرائی کی ہے اس کا میں ازحد مشکور ہوں۔ یہ پذیرائی کانگرس کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے کی گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

"سوشلزم کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے اس کی کچھ چیزیں پسند بھی آئیں مگر میرے نزدیک حضرت شاہ ولی اللہ کا فلسفہ ہی وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اور راہنمائی پیش کرتا ہے"

سات ماہ سوویت یونین رہنے کے بعد سوویت یونین کے افسران کے بتائے ہوئے راستے سے میں 1923ء میں ترکی کے شہر انقرہ پہنچ گیا۔ تین سال تک ترکی میں رہا میں نے تحریک اتحاد اسلامی کا بغور مطالعہ کیا۔ مجھے کوئی مرکز نظر نہیں آیا۔ میں نے بھی ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو انڈین نیشنل کانگرس میں داخل کرنا ضروری سمجھا اور کانگرس میں اپنے اصول کا ایک پارٹی پروگرام چھاپ دیا جس سے میری مذہبی تحریک ہر مخالف انقلاب سے محفوظ رہ سکتی تھی۔ ترکی میں رہتے ہوئے لالہ لاجپت رائے اور ڈاکٹر انصاری سے بھی ملاقات ہوئی ان سے بھی تحریک آزادی ہند کے بارے بہت باتیں ہوئیں

تحریک خلافت جو ہندوستان میں چلی تھی اس کی بنیادی محرکات یہ تھے کہ خلافت ترکیہ عثمانیہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ 1914ء کی جنگ میں جرمنی کی حلیف تھی اور جرمنی کے ساتھ خلافت ترکیہ کو بھی شکست ہو چکی تھی۔ اب عالم اسلام یا مسلمانان عالم کا کوئی مرکز نہیں تھا جس کو ایسی طاقت اور مرکزیت حاصل ہو جیسی کہ خلافت عثمانیہ کو تھی۔ اس وجہ سے تحریک خلافت ہندوستان میں چلی جس کا مدعا یہ تھا کہ انگریز نے چونکہ خلافت عثمانیہ کو ختم کیا ہے اس لیے ہندوستان کو آزاد کرایا جائے۔ انگریز کا تسلط ختم ہونے سے ہی عالم اسلام آزاد بھی ہو سکتا ہے اور اسلامی خلافت بھی قائم ہو سکتی ہے۔ انڈین نیشنل کانگرس بھی اس مسئلہ پر پوری طرح معاون تھی۔ خلافت کے موضوع پر ہم آئندہ صفحات پر پوری تفصیل کے ساتھ لکھیں گے اور تمام اکابرین کی آراء بھی اس میں لکھیں گے۔ اس وقت ہم حضرت مولانا سندھی کی جدوجہد آزادی کو ہی اور ان کے سفر کو ہی بحث کا موضوع بنائیں گے۔ ترکی میں خلافت ختم ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ ترکی صنعتی طور پر بہت پسماندہ تھا اور ترکی کا نوجوان طبقہ یہ محسوس کرتا تھا کہ جب تک جمہوری حکومت نہ ہو گی اس وقت تک جدید سائنسی علوم اور صنعتی علوم کو خلافتی حکام نہیں اپنائیں گے۔ اس لیے ضروری ہو گیا تھا کہ قدیم پاپائیت' ملائیت کو ختم کیا جائے تب ہی ترکی کو جدید راستوں پر ڈالا جا سکتا ہے۔ اور بہتر نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت سندھی نے بہت کوشش کی کہ حکام ترکی کسی حد تک ہی حکومت کو اسلامی بنا لیں اور خلافت کی کوئی کمزور سی شکل ہی قائم کر لیں۔ مگر ترکی حکام نہیں مانے۔ تین سال تک حضرت سندھی ترکی میں رہے اور اس دوران اور بھی کئی لیڈران کرام ہندوستان سے ترکی جاتے رہے مگر کوئی منزل متعین نہ کر سکے۔ اور کوئی بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ حضرت اس کے بعد مکہ معظمہ چلے گئے وہاں پر بیت اللہ

شریف کے سائے میں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

1938ء تک مکہ شریف میں درس قرآن دیتے رہے۔ اس دوران بھی ان کی نظر تحریک آزادی ہند پر ہی تھی۔ حج کے موقع پر جو بھی علماء کرام حج بیت اللہ کے جاتے ان سے حضرت سندھی ملاقات کرتے' تبادلہ خیال کرتے۔ حضرت مولانا عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ نے بھی 1930ء میں حضرت سندھی سے حج کے موقع پر ملاقات کی تھی۔ تحریک آزادی ہند کے بارے تبادلہ خیالات ہوا تھا دونوں اکابرین ایک دوسرے کے خیالات سے مستفیض ہوئے۔ ایک اور بات بھی قارئین کو بتاتا چلوں کہ سعودی حکومت انگریز اور اقوام یورپ کے زیر اثر تھی۔ اس لئے جس وقت حضرت سندھی مکہ میں تشریف لائے تو حکومت سعودیہ نے ان پر یہ پابندی لگا دی تھی کہ وہ کوئی بھی حرکت ایسی نہیں کر سکتے جس سے ہندوستان میں یا بیرون ہند انگریز حکمران پریشان ہوں۔ تاج برطانیہ کے لئے کسی قسم کی پریشانی حکومت سعودیہ کی پریشانی تصور ہو گی۔ حضرت سندھی کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ کسی قسم کی سیاست میں حصہ نہ لیں گے۔ اس لئے وہ اعلانیہ حج کے موقعہ پر یا علاوہ حج کے کوئی بھی تحریک اعلانیہ نہیں چلا سکتے تھے۔ اس لئے وہ حج کے موقع پر ہندوستانی چیدہ چیدہ لوگوں کو انفرادی طور پر ہی ملتے اور تبادلہ خیالات کرتے تھے۔

1938ء میں ہندوستان کی پارلیمنٹ میں کانگرس نے ایک قرار داد پیش کی جس کی منظوری سے تمام وہ لوگ جو تحریک آزادی کے سلسلہ میں بیرون ملک گئے ہوئے تھے انہیں ملک میں آنے کی اجازت مکمل تحفظ کے ساتھ مل گئی اور حضرت سندھی مکہ مکرمہ سے واپس ہندوستان تشریف لے آئے۔ حضرت سندھی تقریباً 23 سال ملک سے باہر رہے اور ملک کی آزادی کی جدوجہد بھی کرتے رہے اور وہ اس سلسلہ میں افغانستان' سوویت یونین' ترکی اور سعودی عرب میں رہے۔ جو کچھ انہوں نے تحریک آزادی کے سلسلہ میں اخذ کیا وہ جمیعت علمائے ہند کی مجالس آملہ میں پیش کیا۔ علماء نے ان کی رائے اور نتائج کو کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ موجودہ حالات میں اگر ہندوستان آزاد بھی ہوتا ہے ہندوستانی مسلمانوں میں آزادی کے فوائد حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں۔ اس وجہ سے جب تک مسلمان جدید علم اور سائنس میں ٹیکنیکل مہارت حاصل نہیں کریں گے اس وقت تک پسماندہ ہی رہیں گے۔ سوشلسٹ نظام معیشت کا انہوں نے نزدیک سے مطالعہ کیا تھا اور وہ اس سے متاثر بھی تھے۔ علماء حضرات کو انکے ساتھ بڑی امیدیں وابستہ تھیں وہ سمجھتے تھے کہ حضرت سندھی انہیں کوئی بہت اچھی خوش خبری دیں گے جبکہ حضرت کی وجہ سے علماء حضرات اور بھی مایوس ہوئے۔ جمیعت اللعمائے ہند کی 1942ء میں ایک کانفرنس لاہور میں منعقد تھی جس کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی۔ گوجرانوالہ بھی جمیعت کا ایک مرکز تھا۔ حضرت مولانا عبدالواحد خطیب جامعہ مسجد گوجرانوالہ جمیعت کے سرکردہ راہنما تھے۔ ایک روز انہیں ایام میں حضرت سندھی گوجرانوالہ تشریف لے آئے ان کا مقصد جمیعت کانفرنس میں اصلاحی پروگرام شامل کرنا تھا۔ مولانا عبدالحنان ہزاروی نائب ناظم جمیعت العمائے ہند بھی مولانا عبدالواحد صاحب کے پاس گوجرانوالہ میں ہی تھے حضرت سندھی کو مایوسی ہوئی ان کے اصلاحی پروگرام کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ پھر جمیعت العمائے ہند کی لاہور کانفرنس ہوئی جس میں حضرت مدنی'

مولانا ابوالکلام آزاد حضرت امیر شریف کے بشمول سینکڑوں علمائے کرام نے بڑے جوش و خروش سے شرکت کی مگر حضرت سندھی تن تنہا تھے کوئی ایک بھی عالم دین ان کے ساتھ شامل نہ تھا۔ نہ ہی انہیں سٹیج پر بیٹھنے کو جگہ دی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حضرت سندھی 1942ء کے علمائے ہند کے ڈھانچے میں فٹ نہیں آسکتے تھے۔ یہ وقت اور حالات کی ستم ظریفی ہے کہ ایک شخص 23 سال تک وطن کی آزادی کے لیے جلا وطن ہوتا ہے' مصائب برداشت کرتا ہے۔ مگر جب وہ اپنی جدو جہد کا ثمر دیکھنے وطن پہنچتا ہے تو وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔

سید جمال الدین افغانی

بیسویں صدی کی سیاسی تحریکوں میں حضرت جمال الدین افغانی کا تذکرہ بھی جا بجا آتا ہے۔ مسلم تحریکوں میں تو بالکل ضروری ہے کہ علامہ افغانی کا تذکرہ آئے۔ اس لئے ضروری ہے کہ انکے متعلق بھی کچھ لکھا جائے۔ جمال الدین افغانی جیسا کہ نام و القاب سے ظاہر ہے کہ وہ افغانستان کے رہنے والے تھے مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایران کے رہنے والے تھے۔ چونکہ وہ میر دوست محمد والی کابل کے دربار کے ساتھ وابستہ تھے اس نسبت سے انہیں افغانی کہا جانے لگا۔ بہر حال یہ ایک الگ بحث ہے ہم اس وقت انکے حالات زندگی اور افکار خیالات پر چند باتیں کریں گے۔ انکے متعلق کچھ کتابیں بھی لکھی گئیں ہیں۔ مگر وہ پاکستان میں یا اردو زبان میں بہت کم ہیں۔ فی الوقت ہم جو بھی کہیں گے وہ شاہد حسین رزاقی صاحب کی لکھی ہوئی کتاب سید جمال الدین افغانی کے حیات و افکار سے اخذ کریں گے۔ افغانی صاحب 1838ء میں افغانستان کے صوبہ جلال آباد کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انکا گھرانہ علمی ہونے کے ساتھ ساتھ مرشدانہ صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ انکے والد بزرگوار کے مناسب حد تک مریدین بھی تھے۔ سید جمال الدین بڑے ہی ذہین تھے تمام مروجہ علوم سے 20 سال کی عمر میں ہی فارغ ہو چکے تھے۔ پھر سائنس کی طرف راغب ہوئے کسی حد تک سائنس میں بھی دسترس حاصل کی۔ دل میں ایک امنگ تھی تڑپ تھی کہ دنیائے اسلام کو کس طرح موجودہ بحران سے نکالا جائے۔ کس طرح عظمت رفتہ کو بحال کیا جائے اس کے لئے انہوں نے اوائل عمر میں ہی جدو جہد شروع کر دی۔ انکا نقطہ نظر اتحاد بین المسلمین تھا اسکے لئے انہوں نے کئی ملکوں کے کئی سفر اختیار کئے اسکے ساتھ وہ قدیم اور جدید کو ملا کر آگے قدم بڑھانا چاہتے تھے۔ ترکی میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد پھر وہ دوبارہ مصر میں آ گئے انکی مصر میں بہت ہی عزت کی گئی جامع ازہر کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ درس و تدریس میں مشغولیت اختیار کر لی۔ جامع ازہر کا نصاب جو کہ گیارہ سو سال پرانا تھا اس میں جدیدیت شامل کرنے کی کوشش کی جسے قدامت پسند طبقہ ماننے کو تیار نہیں تھا مگر افغانی کی شخصیت اتنی مسحور کن تھی۔ کہ قدامت پسندوں کو ہتھیار ڈالنا پڑے مگر وہ ہر وقت اس طاق میں رہتے کہ کوئی بھی عمل افغانی کا ان سے اوجھل نہ رہتا۔ ایک روز جامعہ ازہر میں دوران تعلیم حضرت افغانی نے گلوب کے ذریعے طالب علموں کو علم ہیت گردش زمین کے متعلق سمجھانا چاہا تو شور مچ گیا کہ یہ بدعت ہے اور علامہ افغانی بدعتی ہے

علامہ افغانی کے مصری شاگردوں میں مفتی محمد عبدہ سب سے زیادہ قابل اور ذہین شاگرد تھے جنہوں نے انکے مشن کو آگے بھی بڑھایا اور انکی شاگردی کا حق ادا کیا۔ دوسرے نمبر پر علامہ افغانی کی تعلیمات سے متاثر ہونے والوں میں ساعد زاغول پاشا تھے جو بعد میں مصر کے بہت بڑے قوم پرست لیڈر بنے اور قوم پرست تحریک وفد پارٹی کی بنیاد رکھی۔ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف تحریک بھی چلائی قید' جلا

وطن بھی ہوئے اور 1924ء میں مصری پارلیمنٹ کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ علامہ افغانی جہاں اتحاد بین المسلمین کے داعی تھے۔ وہاں قوم پرست راہنماء بھی تھے وہ نہیں چاہتے تھے کوئی قوم کسی دوسری قوم پر حاوی ہو جائے چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ علامہ افغانی نے مصر سے اخبار جاری کرنے کی کوشش کی مگر اجازت نہ ملی مگر ان کے شاگردوں کو چار برس کی جدو جہد کے بعد اخبار کی اجازت ملی چنانچہ 1875ء میں انہوں نے "الاهرام" اخبار جاری کیا جو آج بھی مصر کا سب سے بڑا اخبار ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی ادبی ہفت روزہ اخبار جاری ہوئے جس میں علامہ کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ علامہ کے شاگرد یعقوب سنا جو ابو نظارہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ انہوں نے ایک مزاحیہ سیاسی اخبار جاری کیا۔ جس سے مقربین اور حاکمین کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ارباب حکومت اس مزاح کو برداشت نہ کر سکے اور اخبار بند کر دیا اور یعقوب سنا کو جلا وطن کر دیا اور وہ پیرس چلے گئے۔ علامہ افغانی مقرر بھی بہت پائے کے تھے ان کی تقاریر موثر ہوتی تھیں۔ ہر دل میں گھر کر جایا کرتی تھیں وہ لوگوں میں قوم پرستی کا جذبہ بھی ابھارتے' کسانوں ،فلاحین کی ترقی اور خوشحالی کی جدوجہد بھی کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ فلاحین زمین کا سینہ چیر کر غلہ حاصل کرتے ہیں۔ ظالموں کا سینہ چیر کر آزادی کیوں حاصل نہیں کرتے۔ علامہ افغانی کی انقلابی جدوجہد کے اثرات کو انگریز حکمران بڑی شدت سے محسوس کرنے لگے اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر علامہ افغانی مصر میں مزید کچھ عرصہ رہتا ہے تو برطانوی بالادستی کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ اس لئے انگریز حکام کے کہنے پر توفیق پاشا نے علامہ افغانی کے مصر سے نکل جانے کے احکام جاری کر دیے اور انہیں بے سرو سامانی کی حالت میں گرفتار کر کے نہر سویز پر بمبئی جانے والے جہاز میں سوار کرا کے ہندوستان بھیج دیا گیا۔ علامہ افغانی چاہتے تھے کہ انہیں استنبول یا مکہ جانے دیا جائے مگر کوئی مطالبہ بھی حکام نے منظور نہ کیا۔ علامہ افغانی بمبئی سے ہوتے ہوئے حیدر آباد دکن پہنچ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ حیدر آباد کو ہی اپنے خیالات پھیلانے کا مرکز بنائیں گے۔ مگر حیدر آباد پہنچ کر انہیں سخت مایوسی ہوئی کہ یہ ریاست بھی انگریزوں کے ہی زیر تسلط تھی اور حیدر آباد کے حکام نے چاہا کہ علامہ افغانی کو ریاست کا ملازم رکھ کر ان کا منہ بند کر دیا جائے۔ جسے علامہ نے منظور نہ کیا۔ سر سید احمد خان کے نیچری خیالات کے بارے میں علم ہونے پر ایک مضمون نیچر ازم کے خلاف لکھا اور چھاپا جس میں نیچر ازم کو سب سے گھٹیا قرار دیا۔ حیدر آباد میں رہتے ہوئے علامہ افغانی نے اساتذہ' طلباء' امراء' علماء اور دوسرے سربرآوردہ لوگوں کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہر قوم کی زبان ہوتی ہے۔ قومی ترقی کے لئے مشترکہ زبان کا ہونا از بس ضروری ہے۔ ہندوستان میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں مگر خوش قسمتی سے ایک زبان ایسی بھی ہے جو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جا سکتی ہے۔ کوشش کرنے سے پورے ملک کی قومی زبان بن سکتی ہے۔ انہوں نے جدید علوم کو قومی زبان میں پیش کرنا انفرادی اور قومی ترقی کے لئے از حد ضروری سمجھا۔ علامہ خود یورپ کی کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔

مگر وہ کسی بھی قوم کی ترقی کے لئے جدید علوم کو اسی زبان میں پیش کرنا بنیادی نقطہ سمجھتے تھے۔ اور انہوں نے اپنے مقالہ میں زور دے کر کہا کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ

اپنی ملکی زبان میں جدید علوم کے حصول کا انتظام نہ کرے۔ اور آج جبکہ جدید علوم نے دنیا کا احاطہ کیا ہوا ہے اور طاقت کا فلسفہ ہی سائنس اور تکنیکی مہارت ہے۔ اور اقوام یورپ' فرانس' برطانیہ اور دیگر اقوام نے بھی جدید علوم سے طاقت اور ترقی حاصل کی ہے۔ اس لیے ہر ہندوستانی پر لازم ہے کہ جدید علم حاصل کرے اور ہر عالم پر یہ ضروری ہے کہ جدید علوم کا ترجمہ اپنی زبان میں پیش کرے۔ تاکہ معاشی اور اقتصادی آزادی حاصل کی جا سکے۔ دیگر انہوں نے مصر' مکہ' استنبول' ایران اور مشرق وسطیٰ کے دیگر ملکوں میں رہتے ہوئے یہ بھی محسوس کیا کہ ان تمام ممالک پر انگریز کا ہی تسلط ہے۔ انگریز سے آزادی حاصل کرنے کے لیے قومی تحریکوں کا ہونا ازحد ضروری ہے اور مشرق وسطیٰ کی آزادی کے لئے وہ ہی تحریک کامیاب ہو سکتی ہے جو فرقہ واریت پر مبنی نہ ہو۔ ہندو مسلم متحدہ جدوجہد سے ہی ہندوستان کی آزادی سے ہم کنار ہو سکتے ہے۔ حصول علم کے بارے میں انہوں نے فرمایا۔

"ہمارے علمائے دین ایک ہزار سال پرانا نصاب تعلیم ابھی تک مدرسوں میں پڑھا رہے ہیں اور علم کے دو درجے بنا دیتے ہیں ایک علوم اسلامیہ' ایک علوم فرہنگ""

دینی درس گاہوں میں صرف' نحو اور دیگر کتابیں بڑے زور سے پڑھائی جاتی ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ طالبعلم عربی زبان جان جائے۔ دس سال درس گاہ میں علم حاصل کرنے والا طالبعلم عربی کے دو الفاظ بھی بول نہیں سکتا' چند سطور لکھ بھی نہیں سکتا۔ دیگر علوم میں وہ بالکل جاہل ہوتا ہے۔ وہ ساری رات دینی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کر دیتے ہیں۔ جس بتی کی روشنی میں وہ پڑھ رہے ہوتے ہیں اس کے متعلق یہ تک پتہ نہیں ہوتا کہ بتی کی چمنی نکال دی جائے تو دھواں کیوں دینے لگ جاتی ہے اگر چمنی اوپر رکھ دی جائے تو دھواں کیوں بند ہو جاتا ہے۔ وہ دنیاوی علوم میں بالکل جاہل ہوتے ہیں۔ آج اس امر کی ازحد ضرورت ہے کہ درس گاہوں کا تعلیمی نصاب بدلا جائے اور نصاب میں جدید علوم کی کتابیں شامل کی جائیں تاکہ دینی درس گاہوں میں پڑھنے والا دنیا کے چیلنج کا مقابلہ کر سکے۔

علامہ افغانی کلکتہ سے لندن

1882ء میں علامہ افغانی سیدھے لندن روانہ ہو گئے۔ جہاں انہوں نے مختصر قیام کیا اور پھر پیرس پہنچ گئے۔ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ علامہ افغانی عالم دین و دنیا ہونے کے ساتھ ساتھ سیاح بھی تھے۔ انہوں نے کافی اسلامی ملکوں کا دورہ کیا۔ یورپ کے کئی ملکوں میں بھی گئے۔ وہ بہت ساری زبانیں جانتے تھے۔ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لینے کی کافی صلاحیت ان میں موجود تھی۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔ انکی تحریک نے مردہ دلوں میں جان پیدا کر دی تھی۔ وہ اس وقت آنے والے خطرات سے اسلامی دنیا کو آگاہ کرتے رہے۔ انکا فرمان حرف بحرف ٹھیک ثابت ہوا۔ علامہ افغانی کا لندن اور اسکے بعد پیرس جانے کا ارادہ اس لئے بھی بنا کہ علامہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ غلام ملکوں میں انکی یہ تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔ لوگوں نے خاص طور پر برسراقتدار لوگوں نے انکی دعوت پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ سمجھتے تھے کہ برطانیہ اور فرانس کے لوگوں کے ضمیر کو جھنجوڑا جائے تاکہ وہ بھی زیر نگیں ملکوں پر رحم

کریں۔ پیرس پہنچنے کی خبر یعقوب سنا نے اپنے اخبار "ابو نظارہ" میں چھاپی جو مصر سے بندش کے بعد پیرس میں شائع ہو رہا تھا۔ یعقوب سنا مذہباً" یہودی تھا۔ لیکن قوم پرست تھا اور علامہ افغانی کا بہت معتقد تھا۔ پیرس میں پہنچ جانے کے بعد علامہ افغانی نے ایک بہت بڑا تجزیہ برائے اشاعت اخبارات کو دیا جس میں مسلمانوں کے زوال کا رونا رویا گیا۔ جس میں کمزروی کی اصل وجہ مسلمانوں کا آپس میں نفاق بتائی اور خلافت عثمانیہ کے زیر نگین علاقے کے بااختیار لوگوں پر بااثر لوگوں پر یہ زور دیا گیا تھا کہ وہ خلافت عثمانیہ کی مخالفت نہ کریں۔ خلافت ہی ایک امید کی کرن ہے۔ جس کے قائم رہنے سے امت مسلمہ غلامی سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔ علامہ افغانی نے ایک مقالہ برائے اشاعت دیا۔ جس میں مسلمانوں کو بزدلی سے منع کیا گیا تھا اور لکھا گیا تھا کہ مسلمانوں پر اس وقت جو بھی کمزوری واقع ہے وہ انکی بزدلی کی وجہ سے ہے۔ عیسائیت کے ساتھ اسلام کا موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ

"اسلام میں مسلمانوں کی جو بھی حکومتیں قائم کی تھیں یہ انکی سیاسی جہانبانی تھی۔ جس کی وجہ سے مسلمان دنیا پر حاکم ہوئے اور عزت حاصل کی۔ جبکہ عیسائیت کی جہانبانی کا راز مسیحیت میں نہیں تھا کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ فرمان کہ جو تجھے تھپڑ مارے تو تو دوسرا گال آگے کر دے یہ عدم تشدد کا فلسفہ تھا۔ جہانبانی کا فلسفہ نہیں تھا"۔

پھر کیا وجہ ہے کی سامان حرب تو مسیح کے ماننے والوں نے پہلے بنا لیا اور مسلمان ابھی تک اس میدان میں گم گشتہ ہیں۔ جدید علوم میں غیر مسلم ہی آگے گئے جبکہ مسلمان ابھی تک جاہل ہیں اور غلام ہیں اور غلامی گے لئے آزادی کو قربان کر دیتے ہیں اور علامہ افغانی نے یہ بھی گلہ کیا انگریز اور فرانسیسی اور روسی اقوام نے باعزت لوگوں کو ذلت میں ڈال دیا۔ مسلمان تخت نشینوں کو فرش نشین کر دیا اور یہ بھی کہا کہ انگریز صرف 25000 ہزار فوج سے پچیس کروڑ عوام کو غلام بنائے ہوئے ہے اور مسلمان دنیا میں اس وقت پچیس کروڑ سے زائد ہیں اگر متفق ہو جائیں تو اقوام یورپ کی غلامی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ فرانس کے ایک فلاسفر رینا سے ایک مباحثہ کا ذکر بھی کیا گیا جس میں رینا کا کہنا تھا کہ فلسفہ اور سائنس مسلمانوں میں یونانی علوم کی وجہ سے داخل ہوئی ہے۔ جبکہ ابتدائی دور میں مسلمان فلسفہ اور سائنس کو شیطانی علوم ہی سمجھتے تھے۔ جس کا جواب علامہ افغانی نے بڑا مدلل دیا یہ مباحثہ الگ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ مہدی سوڈانی اور انکے رفقاء بھی علامہ افغانی کے شاگردوں میں سے تھے جب سوڈان میں مہدی سوڈانی نے بغاوت کر دی اور انگریز حکمرانوں اور مصری حکمرانوں کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ جس میں کئی انگریز افسران مارے گئے اور انگریزوں کو بری طرح شکست ہوئی تو مصر کے انگریز حکمرانوں نے فرانس میں علامہ افغانی سے رابطہ پیدا کیا کہ وہ سوڈان کے مسئلہ پر معاونت کریں۔ اسکے جواب میں علامہ نے یہ کہا تھا کہ انگریز سوڈان سے نکل جائیں اگر مزید کشت و خون سے لوگوں کو بچانا ہے تو ایک وفد تشکیل دیں۔ جس میں مصری اور انگریز شامل ہوں۔ انگریزوں میں مسٹر بلٹ کا شامل ہونا بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ مسٹر بلٹ واحد انگریز لیڈر تھے جو غلام قوموں کی آزادی کے زبردست حامی تھے۔ آخر کار سوڈان کا مسئلہ انگریزوں کی مکمل شکست پر ختم ہوا۔ مسٹر بلٹ نے علامہ افغانی کو ساتھ لے کر بہت کوشش کی کہ مہدی سوڈانی کے ساتھ انگریزوں کی صلح کرا

دی جائے۔ مگر سوڈان میں مکمل شکست کے بعد حکومت برطانیہ کے وقار کا مسئلہ بن چکا تھا اور اب مزید بات چیت بے فائدہ معلوم ہوتی تھی اور تعطل پیدا ہو گیا۔ مصر کے متعلق حکومت برطانیہ کی پالیسی سے علامہ افغانی بہت مایوس ہو گئے اور ارادہ کیا کہ وہ افغانستان جائیں اور امیر عبدالرحمٰن سے مل کر حکومت روس سے صلح کرا دیں۔ اس عمل سے انگریز یقیناً" خوف زدہ ہونگے۔ اس لئے کہ اس عمل سے ہندوستان کی تحریک آزادی میں تقویت آئے گی اور ہم مصر کے معاملہ میں فائدہ حاصل کر لیں گے۔ تاہم بلنٹ کے کہنے پر علامہ افغانی لندن جانے پر رضامند ہو گئے۔ وہاں پر انہوں نے برطانوی لیڈروں سے بلنٹ کے ہمراہ سوڈان کے مسئلہ پر بات چیت کی اور اسکے علاوہ عالمی سیاست پر بھی بات چیت ہوئی

برطانوی لیڈروں سے علامہ افغانی کی بات چیت

علامہ سے برطانوی لیڈروں کا کہنا تھا کہ روس نے بھی مسلم علاقوں پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ آپ مذمت صرف برطانوی حکومت کی کرتے ہیں۔ اسکے جواب میں علامہ نے فرمایا کہ حکومت روس نے واقعی چند مسلم علاقوں پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ مگر برطانیہ نے تو مرکز اسلام اور خلافت اسلامیہ اور عالم اسلام کو بے دست و پا کر دیا ہے اور ہندوستان پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ برطانیہ کے زیر قبضہ علاقوں میں مساجد کے اماموں' موذنوں' محافظوں کو تنخواہ نہیں دی جاتی۔ جبکہ روس کی حکومت مساجد کے اماموں' موذنوں اور محافظوں کو تنخواہ دیتی ہے۔

اور بھی بہت ساری باتیں برطانوی لیڈروں اور علامہ کے درمیان ہوتی رہیں۔ برطانوی لیڈر علامہ کو روس حکومت سے ڈراتے رہے اور علامہ انہیں انکے اپنے کرتوت یاد کراتے رہے اور بات چیت ختم ہو گئی۔ برطانوی حکومت کے مسلسل جارحانہ طرز عمل نے علامہ افغانی کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ انگریزی سامراج سے نجات حاصل کرنے کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ حکومت روس سے اتحاد اور تعاون کیا جائے۔

علامہ نے انگریزوں سے اسلام کے خلاف جارحانہ عزائم کے پیش نظر برائے اشاعت بیانات اور مضامین اخبارات کو دیئے اور سفر روس کا پروگرام بنانا شروع کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ روس' ترکی اور افغانستان ملکر انگریز سامراج کا مقابلہ کریں۔ روس میں بھی ان خیالات کے حامی موجود تھے۔ علامہ 1885ء کے آخر میں پیرس سے سیدھے ماسکو روانہ ہو گئے۔ مگر انکا پروگرام سفر خفیہ رکھا گیا تھا۔ وہ روس کے چند لیڈروں کے ساتھ خفیہ بات چیت کرنے کے بعد افغانستان چلے گئے۔ امیر عبدالرحمٰن کے ساتھ بات چیت ہوئی۔ اپنا منصوبہ پیش کیا کہ افغانستان' روس اور ترکی ملکر انگریز کو پریشان کر سکتے ہیں اور اس منصوبہ سے بہت سارے عرب اور اسلامی ممالک آزاد ہو سکتے ہیں۔ امیر عبدالرحمٰن والی افغانستان کو اس منصوبے سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ صرف اپنے اقتدار اور اپنی ذات کی حد تک ہی سوچتے تھے۔ علامہ کو مایوسی ہوئی اور منصوبہ ناکام ہوا۔ علامہ نے ماسکو میں رہتے ہوئے حکومت روس

کے زیر نگیں مسلمانوں کے حقوق کی بات چیت کی۔ جس میں کامیابی ہوئی اور حکومت نے مسلمانوں کے حقوق، مطالبات منظور کئے

مندرجہ بالا منصوبہ کی ناکامی کے بعد حضرت علامہ ایران کی طرف راغب ہوئے اور کافی عرصہ تک ایران کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھا۔ مسقط کے راستے ایران روانہ ہوئے۔ مسقط میں مقیم تھے کہ شاہ ایران کا تار ملا ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ علامہ تہران روانہ ہو گئے۔ حکومت کی طرف سے شاندار استقبال کیا گیا اور کئی بار بادشاہ سے ملاقات ہوئی۔ شہنشاہ ایران ناصرالدین شاہ قاچار علامہ سے بہت اخلاق اور محبت سے پیش آیا

بیان کیاجاتا ہے کہ شاہ ایران نے علامہ پر اس لئے زیادہ توجہ دی تھی کہ وہ علامہ افغانی کے زریعے روس سے کوئی اچھا سمجھوتہ چاہتے تھے۔ شاہ ایران کو معلوم ہی تھا کہ علامہ کے حکومت روس سے اچھے تعلقات ہیں اور شاہ ایران نے علامہ سے اس سلسلہ میں روس جانے کی درخواست کی اور ساتھ علامہ سے یہ بھی کہا کہ حکومت ایران کے لیے کوئی اصلاحات تجویز کریں۔ جب علامہ نے ایران کے لئے دستوری حکومت کا خاکہ پیش کیا تھا جو کہ شاہ ایران اور قائدین حکومت کو قطعی نامنظور تھیں۔ جبکہ عوام کا دیرینہ مطالبہ ہی ایران کا دستوری حکومت نافذ کرنے کا تھا۔ علامہ کے جرات مندانہ اقدام سے ایرانی بہت خوش ہوئے اور علامہ اور بھی مقبول ہوئے۔ ادھر شاہ ایران علامہ کو اُپنے لئے خطرہ محسوس کرنے لگے اور انہیں آگاہ کیا گیا کہ وہ ایران سے چلے جاویں۔ علامہ افغانی ایران سے ماسکو روانہ ہو گئے۔ مئی 1887ء کو علامہ ماسکو پہنچے اور دو سال تک ماسکو رہے۔ یہ انکا دوسرا سفر روس تھا۔ وہ مرزا نعمت اللہ اصفہانی کے مہمان ہوئے۔ اپنے دوست کاتکوف کے مشورہ سے انگریزوں کے خلاف اقتدار اسلامی اور حکومت روس میں اتحاد پیدا کرنے کے منصوبہ کو عملی شکل دینے کی تدابیر پر غور کرتے رہے۔ کاتکوف ایک نامور صحافی اور اپنی قوم کے بااثر سیادت دان تھے اور انگریزی اقتدار کے انتہائی مخالف تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ علامہ نے روس کا یہ سفر کاتکوف کی دعوت پر ہی کیا تھا۔ علامہ کے روس پہنچنے کے چند روز بعد کاتکوف کا انتقال ہو گیا اور علامہ اپنی تجاویز پر عمل نہ کر سکے۔ علامہ ماسکو سے پیٹرزبرگ چلے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں رہے اور انکی سرگرمیوں کا محور صرف یہی امر تھا کہ اسلامی دنیا کو کسی طرح انگریز سامراج سے نجات دلائی جائے اور خاص کر وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے فکر مند تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ عالم اسلام کی آزادی ہندوستان کی آزادی سے وابستہ ہے۔ اگر ہندوستان آزاد ہو گیا تو عالم اسلام خود ہی آزاد ہو جائے گا۔

علامہ پیٹرز برگز سے جرمنی آ گئے۔ میونخ میں قیام کیا شاہ ایران اور علامہ کی میونخ میں ملاقات ہوئی۔ شہنشاہ علامہ کو ایران ساتھ لے جانا چاہتے تھے اور انہیں ایران کا وزیراعظم بنانے کو کہہ رہے تھے جبکہ اس وقت کے ایران کے وزیراعظم امین السلطنت بہت پریشان ہوئے۔ وہ جانتا تھا کہ روسی حکومت سے افغانی کے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ جبکہ مجھے انگریزوں کا حمایتی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے جتنے منصوبے انگریزوں کے ساتھ ملکر بنائے گئے ہیں وہ سب غارت ہو جاویں گے۔

وزیراعظم امین السلطنت نے ایک سازش کے ذریعے علامہ کو شاہ ایران کے حکم سے روس بھجوا

دیا۔ جس سے وزیراعظم کی مسند اعلیٰ کے لئے خطرہ ختم ہو گیا۔
شاہ ایران کے حکم سے علامہ ماسکو چلے گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے روسی حکمرانوں سے ایران تنازعات کے بارے بات چیت کی۔ بڑی کوشش کے بعد انہیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔ ایران اور روس کے درمیان معاہدہ کرانے میں کامیاب ہوئے۔ جس میں دونوں ملکوں کا فائدہ تھا اور اس معاہدہ سے انگریز استعمار کو نقصان تھا۔ علامہ بہت خوش ایران واپس آئے۔ تہران کے باہر ہی وزیر اعظم کو اپنی آمد کی اطلاع کی۔ جس کے جواب میں وزیراعظم نے کہا کہ آپ شہر سے باہر ہی ٹھہریں میں شہنشاہ سے مل کر آپکو مطلع کرتا ہوں۔ پھر اسکے بعد تین ماہ تک کوئی جواب نہیں ملا۔ حکومت روس کو بھی فکر لاحق ہوئی کہ علامہ ایک معاہدہ کر کے گئے ہیں اور پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ حکومت روس نے علامہ کو مطلع کیا کہ آپ ایک غیر رسمی معاہدہ کر کے گئے ہیں اور پھر اسکا کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ اتنی مدت گزر جانے کے بعد شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ اب جو بھی بات حکومت روس کی طرف سے حکومت ایران سے ہو گی وہ بذریعہ سفیر ایران یا سفیر روس ہو گی۔ علامہ نے حکومت روس سے جو کامیابی حاصل کی تھی وہ بڑی محنت سے حاصل کی تھی۔ علامہ کو اسکی ناکامی پر بہت ہی افسوس ہوا' دکھ ہوا۔ اور علامہ نے پھر ایران میں دستوری حکومت کے لئے جدوجہد تیز کر دی اور لوگ جوق در جوق علامہ کی تحریک میں شامل ہونے لگے۔ علامہ درگاہ شاہ عبدالعظیم میں مقیم ہو کر دستوری تحریک کو چلانے لگ گئے۔ اس درگاہ کا اتنا احترام تھا کہ وہاں کسی کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر ایک روز وہ بیمار تھے کہ پچاس کے قریب سپاہی آئے علامہ کو گرفتار کر لیا اور گدھے کی پیٹھ پر باندھ کر ٹھٹھرتی ہوئی سردی کی رات تھی لے گئے۔ اور حدود ایران سے باہر نکال دیا۔ علامہ کے دوستوں نے بعد میں انکا علاج کیا اور پھر وہ بغداد گئے اور پھر لندن چلے گئے۔ وہاں رہ کر ایران میں دستوری حکومت کی جدوجہد کرتے رہے۔ علامہ کو ایران سے نکال دینے کے بعد حکومت ایران نے انگریزوں کو ایران میں بہت زیادہ مراعات دیں۔ تمباکو کا ٹھیکہ جن میں اہم تھا۔ لوگوں میں شاہ ایران کے خلاف ہیجان پیدا ہوا دستوری تحریک زیادہ طاقتور ہو گئی۔
علامہ نے بصرہ میں بیٹھ کر ایران کے علمائے کرام مجتہدین عظام کو خط لکھے۔ جن میں وزیراعظم ایران اور شاہ ایران کی بدمعاشیوں' فضول خرچیوں' ملک فروشیوں کی داستانیں رقم کیں۔ جس کی وجہ سے ایران میں بغاوت کے آثار پیدا ہوئے اور لوگوں نے تمباکو جلا دیا۔ ایک روز شاہ ایران نے جب تمباکو منگوایا تو پتہ چلا کہ تمباکو کا ایک پتہ بھی نہیں ہے بلاخر تمباکو کا ٹھیکہ جو برطانیہ کو دیا ہوا تھا وہ منسوخ کرنا پڑا۔ شاہ کے خلاف تحریک جاری رہی۔ علامہ بصرہ سے لندن چلے گئے وہاں سے ایک اخبار جاری کیا اور تحریک کی راہنمائی کرتے رہے اور انہوں نے فرمایا کہ ایران کی آبادی کا پانچواں حصہ روس اور ترکی کی گلیوں بازاروں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ تن پر کپڑا نہیں' بھوک افلاس کے مارے نیچ سے نیچ کام کر کے پیٹ بھر رہے ہیں۔ مگر شاہ ایران اور اس کے مصاحبین ہیں کہ عیش و عشرت میں مگن ہیں۔ ایران میں شاہ ایران کے خلاف تحریک زوروں پر تھی۔ شاہ گھبرا بھی گیا تھا۔ اس نے اپنے ایک معتمد خاص کے ذریعے علامہ کی خدمت میں ہدیہ نظرانہ پیش کیا جسے علامہ نے قبول نہیں کیا اور شہنشاہ ایران کے خلاف تحریک جاری رکھی۔ آخر شاہ ایران کی اپیل پر حکومت برطانیہ نے

جس پریس سے علامہ کا اخبار چھپتا تھا وہاں اخبار کی چھپائی بند کرا دی اور علامہ کا اخبار لندن میں بند ہو گیا۔

لندن میں ہی حضرت خلیفتہ المسلمین کی طرف سے ترکی تشریف لانے کا دعوت نامہ ملا۔ علامہ نہیں جانا چاہتے تھے مگر سلطان ترکی کی جانب سے کئی بار اصرار کیا گیا۔ بلکہ اس حد تک انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ غیر مسلموں کے دیش میں رہ کر مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے آپ ترکی تشریف لے آویں۔ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کریں۔ ہماری آنکھیں آپکی منتظر ہیں۔ علامہ افغانی 1892ء میں عازم استنبول ہوئے جہاں پر انکا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد مسٹر بلنٹ بھی استنبول گئے۔ انکا کہنا ہے کہ میں نے علامہ کو خلافت ترکیہ میں عزت والا پایا اور سلطان ترکی انکا احترام کرتے تھے۔

علامہ افغانی ترکی میں

ترکی میں رہتے ہوئے علامہ نے اپنی توجہ کا مرکز اتحاد بین المسلمین بنایا۔ سلطان ترکی نے بھی علامہ کی اس مسلہ پر حوصلہ افزائی کی۔ سلطان یہ سمجھتا تھا کہ اتحاد اسلامی سے ان کا اقتدار مضبوط ہو گا اور تمام ملک اسلامیہ ان کے زیر نگیں ہو جاویں گے۔ اس سلسلہ میں علامہ نے دنیائے اسلام کو خطوط لکھے جن میں اتحاد اسلام پر زور دیا گیا۔ علامہ یہ چاہتے تھے کہ تمام عالم اسلام میں ایک تنظیم قائم کی جائے جس کی شاخیں ہر ملک میں ہوں اور ہر ملک کے ہر شہر میں قصبہ قریہ میں ہوں اور اس تنظیم کا مرکز مکہ مکرمہ ہو۔ اس اتحاد اسلامی کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ اگر کسی مسلمان ملک پر کوئی غیر مسلم ملک حملہ آور ہو تو سارے ملکر اسکا مقابلہ کریں اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اگر مصر خلافت عثمانیہ سے آزاد ہو جاتا ہے تب بھی اس کے سائیہ میں ھی رہنا چاہیے۔ مراکش اور ترکی میں سفارتی تعلقات بھی نہ تھے اس پر بھی وہ افسوس کا اظہار کرتے تھے۔ ایران اور ترکی مفاحمت کو بھی وہ اتحاد میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ افغانستان اور ایران کی جنگ کو بھی علامہ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ علامہ نے جو بھی خط ملت اسلامہ کے مقتدر علماء کرام اور با اثر لوگوں کو لکھے تھے ان کے جواب حوصلہ افزاء تھے۔ مگر شاہ ایران ناصر الدین شاہ نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور اسے جب یہ پتہ چلا کہ ایرانی علماء علامہ افغانی سے تعاون کر رہے تو وہ فکر مند ہوا۔ تو اس نے ایرانی سفیر متعینہ استنبول کے ذریعے سلطان ترکی سے التجا کی کہ ایرانی مجتہدین اور علماء جو علامہ افغانی سے تعاون کر رہے ہیں انہیں گرفتار کر کے ہمارے حوالے کیا جائے۔ جسے سلطان ترکی نے منظور کرتے ہوئے گرفتار کرا دیا اور ایران بھیج دیئے۔ جب افغانی کو اس کا پتہ چلا تو وہ بہت رنجیدہ ہوئے۔ سلطان سے ایرانی مجتدیں اور علمائے کرام کی گرفتاری کا گلہ کیا تو سلطان ترکی نے کہا کہ لاعلمی میں یہ سب کچھ ہو گیا ہے۔ ایرانی سفیر نے کہا کہ جلد ہی یہ علماء اور مجتدین رہا ہو کر آ جاویں گے۔ مگر سب کچھ طفل تسلی تھی۔ آخر یہ علماء اور مجتدیں ایران لے جا کر قتل کر دیے گئے تھے۔ علامہ افغانی بھی سلطان ترکی کے زیر عتاب آ گئے۔

شاہی مہمان کے بجائے شاہی قیدی بنائے گئے۔ علامہ افغانی کی تحریک اتحاد بین المسلمین کا نظریہ مختلف تھا۔ جبکہ سلطان ترکی اس اتحاد سے اپنے اقتدار کی مضبوطی سمجھ رہے تھے اور شاہ ایران اس اتحاد سے اپنے آپ کو خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ جبکہ افغانی کا مقصد اتحاد کا مرکز طائف مکہ مکرمہ کے پاس ہونا تھا اور ایک تنظیم قائم کرنا تھا۔ جس کے آگے بادشاہ بھی جواب دہ ہوتے یہ تنظیم کسی بھی حکمران مسلمان کو منظور نہ تھی۔ علامہ افغانی کے جانثار بھی ایران میں کافی تھے۔ مرزا رضا خان جو علامہ کے بہت ہی معتقد تھے۔ انہوں نے ناصر الدین شاہ قاچار کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اور ایرانی سیاست کا ایک باب ختم ہو گیا۔ ناصر الدین کے بعد مظفر الدین تخت نشین ہوا اور سلطان ترکی سے مطالبہ کیا کہ افغانی اور ان کے بھائی مرزا آغا خان، مرزا حسن خان، شیخ ابوالقاسم کو گرفتار کر کے ایرانی حکومت کے حوالے کیا جائے۔ سلطان ترکی نے علامہ افغانی کے علاوہ علامہ کے تین رفقاء کو گرفتار کر کے حکومت ایران کے حوالے کر دیا گیا۔ جب وہ ایران پہنچے تو ان پر انسانیت سوز مظالم کئے گئے اور پھر قتل کر دئے گئے

ناصر الدین شاہ کے قتل کے بعد سلطان ترکی بھی علامہ افغانی سے خائف ہونے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ علامہ افغانی کے پاس جانثار ہیں جو ناصر الدین کو قتل کر سکتے ہیں۔ وہ مجھے بھی قتل کر سکتے ہیں اس نے علامہ افغانی پر پابندی اور بھی زیادہ کر دی۔ جب علامہ اپنے جانثاروں معتقدین میں بیٹھتے تو انکا موضوع اتحاد بین المسلمین ہوتا۔ پھر اس اتحاد کے سربراہ کی صورت میں کئی نام آتے۔ یہ باتیں بھی سلطان تک خود ہی پہنچ جاتی تھیں۔ سلطان تو اتحاد بین المسلمین اس لیے چاہتے تھے کہ ان کی حکومت اور اقتدار میں اضافہ ہو نہ کہ اس لیے کہ کوئی اور ہی حاکم بن جائے۔ علامہ "سرطان" کے مریض بن گئے۔ آخر میں برائے علاج لندن جانے کی اجازت چاہی مگر سلطان ترکی نے اجازت نہ دی۔ آخر یہ انقلابی حریت پسند عظیم راہنماء 9 مارچ 1897ء کو اس دار فانی سے رخصت فرما گئے۔ خداوند کریم کی طرف سے آئے تھے اسی کی طرف چلے گئے۔ حضرت کا جنازہ بڑی شان و شوکت سے اٹھایا گیا اور قبرستان شیوخ میں انہیں دفن کیا گیا۔

1919ء تک ان کی قبر بے نام و نمود رہی آخر ان کے ایک امریکی معتقد چارلس کریس استنبول آئے۔ انہوں نے علامہ افغانی کا مقبرہ سنگ مرمر سے بنوایا جو کہ چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک رہا۔ پھر حکومت افغانستان نے حکومت ترکی سے اجازت لے کر علامہ کا جسد خاکی افغانستان منتقل کر دیا۔ افغانستان کے روشن خیال فرماں روا غازی امان اللہ خان ان کے بہت ہی معتقد تھے۔ علامہ کی موت کے متعلق بعض لوگ یہ خیال بھی کرتے ہیں کہ سلطان عبدالحمید نے انہیں آہستہ اثر کرنے والا زہر دلوایا تھا۔ علامہ کی موت کے متعلق بعض ان کے یورپی دوستوں نے بھی یہی خدشہ ظاہر کیا تھا۔ بہرحال وہ عظیم انسان تھے وہ اپنے مقصد کی لگن میں تمام زندگی مشکلات جھیلتے رہے مگر اپنے آپ میں کمزوری کے آثار نہیں آنے دیے

46979

تنقید و تبصرہ

سید جمال الدین افغانی رحمتہ اللہ علیہ انتہائی بلند مرتبہ شخصیت کے مالک تھے۔ 20 سال کی عمر میں ہی مروجہ علوم سے فارغ ہو گئے۔ وہ انتہائی ذہین اور پرکشش فن تقریر کے ماہر تھے۔ وہ اپنی گفتار اور کردار سے لوگوں کو اپنی طرف راغب کر لیا کرتے تھے۔ جوانی میں وطن کو حصول مقصد کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ وہ اتحاد بین المسلمین کے انیسویں صدی میں مبلغ تھے انکی زندگی کا مقصد ہی یہ تھا کہ اسلام کی عظمت رفتہ کو کیسے حاصل کیا جائے۔ خلیفہ المسلمین کے حضور ترکی میں پیش ہوئے مقصد بیان کیا۔ ہر ایک نے تائید کی وہ ایران کے بادشاہ ناصر الدین کی خدمت میں پیش ہوئے۔ وہ مصر کے بادشاہ خدیو اسماعیل کے حضور پیش ہوئے مدعا بیان کیا۔ وہ لندن' پیرس' ماسکو بھی گئے۔ وہ ہر مسلمان بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ وہ ہر استعمار کے آگے پیش ہوئے کہ مسلمانان عالم کو آزاد کرائیں۔ انہوں نے مہدی سوڈانی جیسے مجاہد تیار کئے۔ انہوں نے سوڈان میں انگریزوں کو شکست فاش دی۔ انہوں نے ایسے جانثار پیدا کئے جو جان کی پرواہ کئے بغیر خطرات میں کود جایا کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر مسلمان متحد ہو جاویں تو مسلمانان عالم کی عظمت رفتہ بحال ہو سکتی ہے اور کفار کی غلامی سے مسلمانوں کو نجات مل سکتی ہے۔ ساری زندگی وہ اسی مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ آئیں ہم حضرت علامہ کی زندگی اور انکی جدوجہد پر تنقیدی پہلو سے غور کریں کہ حصول مقصد کے لئے حضرت علامہ افغانی نے جو راہیں متعین کیں تھیں وہ واقعی اس پر چل کر اسلام کی عظمت رفتہ بحال کر سکتے تھے اور اس راہ میں کامیابی حاصل کر سکتے تھے۔ میرا اس میں جواب نہ میں ہے اس لیے کہ اتحاد بین المسلمین ممکن ہی نہیں ایسا کبھی ہوا ہی نہیں - حضور علیہ اسلام کی زندگی تک تو اتحاد بین المسلمین تھا آپ جب اس دنیا سے چلے گے تو اتحاد بھی نہ رہا خلافت کے جھگڑے پر حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ تو خفا تھے ہی مگر انصار مدینہ کو بھی مطمئن نہ کیا گیا سقیفہ بن سعد میں حضرت سعد بن عبادہ کو انصار مدینہ خلیفہ بنانا چاہتے تھے وہ حق دار بھی تھے جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں ایک دفعہ مدینہ سے باہر ایک غزوہ میں شمولیت کے لیے گئے تھے تو اپنی جگہ نائب سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو جانشین بنا کر گئے تھے۔ پھر حضور علیہ سلام نے خطبہ حج الوداع میں فرمایا تھا کہ کسی عربی کو عجمی پر اور نہ کسی عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت ہے۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سنا کر کہ امانت قریش کے پاس ہی رہے گی ہمیشہ کے لئے انصار مدینہ کا منہ بند کر دیا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قاتل فیروز لولو ہی تھا یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل چند مصری باغی ہی تھے۔ انکے پیچھے کوئی سازش نہ تھی۔ سربراہان مملکت کے قتل کو ایک شخص یا چند لوگوں کے کھاتہ میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ اسکے پیچھے بڑے محرکات ہوتے ہیں۔ پھر جنگ جمل' جنگ صفین مشہادت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ' عبداللہ بن زبیر اور آل مروان کی جنگ لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام چودہ سو سالہ تاریخ اسلام میں اقتدار حصول اقتدار کے واقعات اس بات کے گواہ ہیں کہ رضا کارانہ طور پر کوئی اقتدار چھوڑتا ہی

نہیں اور نہ ہی مسند بغیر خطرات کے حاصل ہوتی ہے یہ بات ناممکن تھی۔ انیسوی صدی میں جبکہ 42 ملکوں میں اسلامی جھنڈا لہرا رہا ہے اور 30 کروڑ کے لگ بھگ مسلمان دنیا میں موجود ہیں وہ کسی ایک شخص کو امت کا سربراہ بنالیں۔ جبکہ عالم اسلام میں ہر اسلامی مملکت میں ایک سربراہ موجود ہے اور انکا دربار یا اسمبلی بھی ہے۔ انکی ایک انتظامیہ بھی ہے۔ انکے پیچھے کئی نائب سلطنت بھی ہیں۔ ان کے پیچھے سیاسی جکڑ بند بھی ہیں - پھر کوئی ایسا طریقہ بھی قرون اولیٰ سے وضع نہیں کیا گیا جس پر چلتے ہوئے پرامن طریقہ پر اقتدار منتقل ہو جائے۔ حضور علیہ السلام کا واضح فرمان موجود ہے کہ میرا زمانہ سب سے بہتر ہے۔ پھر اس کے بعد والا زمانہ کم بہتر ہے اور پھر کم بہتر ہے۔ حضور علیہ السلام کی اس دنیا سے رخصت کے بعد ہی خلافت کے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ جب کہ مسلمان صرف لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ آج جبکہ زمانہ بھی اچھا نہیں' مسلمان تعداد میں بھی تیس کروڑ سے زائد ہیں' آج اتحاد بین المسلمین کیسے ممکن ہو گا۔ آج فطری طور پر ہی انسان میں منصب یا اقتدار کی خواہش موجود ہے۔ یہ ایسی خواہش ہے جس کے آگے اور تمام خواہشیں ہیچ ہیں۔ حصول اقتدار کے لیے بڑے بڑے نیک لوگوں نے اپنے بھائیوں کو' باپوں کو قتل کر دیا۔ وہ رضاکارانہ طور پر اقتدار سے الگ ہو کر تخت تاج کسی اور کے حوالے کر دیں گے ایسا ممکن نہیں۔ علامہ افغانی کا بیسویں صدی کی سیاسی تحریکوں میں بہت تذکرہ آتا ہے - ہمارے ہندوستان میں جو تحریک بھی چلی خصوصی طور پر مسلم تحریک میں حضرت علامہ افغانی کو مشعل راہ بنایا جاتا رہا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ انکی اپنی تحریک کا جائزہ بھی لیا جائے اور انکی ناکامی کی وجوہات کو کھول کر بیان کیا جائے

ہندوستان میں خصوصی طور پر ایران اور دیگر مسلم ملکوں میں مجموعی طور پر خطبہ جمعہ میں یا دیگر مجالس میں واعظین حضرات مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی داستانیں بیان کرتے رہتے ہیں اور یہ واعظین علماء' خطیب کا پسندیدہ موضوع ہوتا ہے اور لوگ اس موضوع سے متاثر بھی بہت ہوتے اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ تقریباً" ایک ہزار سال سے زائد عرصہ تک مسلمان دنیا کی سیاست پر حاوی رہے ہیں۔ ایشیاء' افریقہ اور یورپ کے بہت بڑے حصہ پر مسلمان بادشاہوں کی حکومتیں رہی ہیں۔ اس وقت بھی مسلمانوں کی دنیا میں صرف ایک حکومت نہ ہوتی تھی بلکہ کئی حکومتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اموی بھی تھے' عباسی بھی تھے' فاطمی بھی تھے' غوری' غزنوی' سلطان بھی تھے' اور بھی سلاطین کئی جگہوں پر بادشاہ تھے۔ بہرحال اقتدار مسلمان حکمرانوں کے پاس تھا اور یہ داستانیں واعظین بیان کرتے رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے عامتہ الناس میں یہ خواہش ہر وقت رہتی تھی کہ مسلمانوں کی عظمت رفتہ دوبارہ واپس آ جاوے۔ اسکے لئے واعظین' خطیب' علماء حضرات اور لیڈران جو علاج تجویز کرتے تھے وہ یہی تھا کہ اگر مسلمان متحد ہو جاویں تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں شکست نہیں دے سکتی اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اتحاد میں برکت بھی ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اگر چند لوگ جمع ہو جاویں تو تھوڑے لوگوں پر حاوی ہوتے ہیں۔ اور یہ بات لوگوں کو بہت آسانی سے سمجھ بھی آ جاتی تھی۔ اور اتحاد کی بات کہنے سے کوئی شخص معترض نہیں ہو سکتا تھا اور دیگر یہ کہ واعظین' خطیب' علماء اور لیڈروں کو اتحاد بین المسلمین کا وعظ کرنے سے اپنی ذات کو بھی فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ وہ اس لئے کہ اتحاد کرنے سے اول تو لوگ اسی واعظ'

خطیب، عالم، لیڈر کے گرد جمع ہونگے جو اتحاد بین المسلمین کی تلقین کرتا ہے بعد میں اگر اس واعظ عالم خطیب یا لیڈر میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ لوگوں کو اپنے گرد جمع رکھ سکے۔ تو وہ کوئی اور راہ دکھائے گا اور لوگوں کو دیگر مرکز سے روشناس کرائے گا۔ دیگر جس مرکز کے ساتھ وہ لوگوں کو روشناس کرائے گا وہاں پر بھی اسکی قدر و منزلت ہو گی۔ حصول منصب اقتدار فطری حق بھی ہے اور سب سے بڑی انسانی خواہش بھی ہے۔ سر سید احمد خان سے کسی نے پوچھا کہ آپ اگر قرون اولی میں ہوتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیتے یا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا سر سید نے فرمایا کہ میں خود اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتا کسی کے پیچھے کیوں لگتا۔ اسی طرح علامہ افغانی سے کسی نے پوچھا کہ آپ حنفی ہیں، مالکی ہیں، حنبلی ہیں، شافی ہیں، کس کے مقلد ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں عالم دین ہوں کسی کا مقلد کیوں بنوں۔ خود سمجھدار ہوں۔ اس لئے ذہین طاقتور لوگ با صلاحیت لوگ اپنی بالا دستی قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کسی کے پیچھے نہیں لگتے۔ علامہ افغانی کا اتحاد بین المسلمین کا پروگرام جو انکے ذہن میں تھا اس پر کوئی بھی سربراہ مملکت متفق ہو ہی نہیں سکتا۔

جب علامہ صاحب امیر عبدالرحمن والی افغانستان کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ حکومت روس سے تعلقات بہتر بنائے تاکہ انگریزوں پر دباؤ ڈالا جائے اور اس عمل سے ہندوستان کی تحریک آزادی کو مدد ملے گی اور ہندوستان آزاد ہو گا۔ مگر امیر عبدالرحمان نے ان کی اس تجویز پر کوئی توجہ نہ دی اور علامہ افغانی مایوس ہو گئے۔ اگر یہی تجویز علامہ افغانی ہندوستانی لیڈروں کے آگے بھی پیش کرتے تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی ہرگز نہ مانتے۔ اس لئے کہ شمالی ہندوستان کے لوگ انگریز کے زیر تسلط 1857ء کے بعد بھی آتے ہیں۔ یہ لوگ مقامی حکمرانوں کی رعیت کے ساتھ سلوک کو اچھی طرح جانتے تھے۔ پنجاب اور سرحد کے لوگ سکھوں کے ظلم و بربریت سے اچھی طرح واقف تھے۔ ہندوستان کے جن جن علاقوں میں انگریز 1757ء سے حکمران تھے وہاں کے لوگوں کے مالی، معاشی، اقتصادی اور سماجی حالات پنجاب اور دہلی کے لوگوں سے مختلف تھے، بہتر تھے۔ وہاں سفری سہولتیں بھی لوگوں کو مل چکی تھیں۔ جبکہ شمالی ہندوستان میں لوگ ابھی بیل گاڑیوں میں ہی سفر کر رہے تھے۔ مسلمان لیڈروں بشمول سر سید احمد خان سرکار انگلشیہ کے بہت ہی بہی خواہ تھے۔ دیگر یہ کہ ہندوستانی عوام میں بشمول مسلمانوں کے انگریز سرکار کے خلاف کوئی تحریک بھی نہ تھی اور انیسویں صدی میں انگریز کے خلاف ماسوائے 1857ء کی تحریک کے کوئی بھی تحریک نہ ہوئی اور نہ کوئی ہیجان ہی انگریز کے خلاف تھا۔

حضرت علامہ افغانی کی تحریک جب وہ امیر عبدالرحمن سے ہندوستان کی آزادی کا منصوبہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ انیسوی صدی کے آٹھویں دہائی کا واقع ہے کہ اس وقت کسی قسم کی کوئی تحریک ہندوستان میں انگریز کے خلاف نہ تھی اس لئے اگر علامہ افغانی اس وقت ہندوستانی لیڈروں سے مشورہ کرتے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کی کوشش بذریعہ افغانستان کرتے ہیں آپ لوگ تعاون کریں تو شائد ہندوستانی لیڈروں ماسوائے علماء حضرات کے کوئی تعاون بھی نہ کرتا اور علامہ افغانی کو کورا جواب ملتا۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں علامہ کی تجاویز کوئی اچھا نتیجہ دیے بغیر ختم ہو گئیں۔ پھر علامہ

افغانی مصر میں جاتے ہیں وہاں پر علماء اور ذہین لوگوں سے ملتے ہیں۔ جامع ازہر کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں۔ انکی ہمہ گیر اور پر کشش شخصیت کی بدولت انکے گرد بہت لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ جن میں محمد عبدہ اور سعد زاغول پاشا نہایت ذہین اور پر کشش شخصیات کے مالک تھے اور لوگ بھی کافی انکے ہمنوا بنے۔ جامع ازہر میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ تقریباً" 8 سال تک جاری رہتا ہے۔ مہدی سوڈانی بھی آپکے ہی شاگرد تھے۔ جنہوں نے سوڈان میں انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کیا اور قلیل عرصہ میں سوڈان فتح کر لیا۔ سوڈان کی فتح بھی علامہ افغانی کے حصہ میں ہی جاتی ہے۔ لیکن جہاں تحریک چلتی ہے، راہبر تحریک رہتا ہے۔ وہاں سوچ و بچار میں وسعت بھی آتی ہے۔ زیر بحث حکمران بھی آتے ہیں۔ مصر میں نہر سویز بن جانے کی وجہ سے سوڈان میں مہدی سوڈانی کی فتح کی وجہ سے انگریز چوکس ہوگئے تھے۔ مصر کا بادشاہ بھی انگریز کے ہی زیر اثر تھا سرکار برطانیہ نے ضروری سمجھا کہ دنیا پر اپنی تجارتی بالادستی قائم رکھنے کے لئے استعماری اطوار کو قائم رکھنے کے لیے کسی اور مہدی سوڈانی جیسی شخصیت کی پیدائش کو روکنے کے لئے یہ ضروی تصور کرنے لگ گئے تھے کہ مصر میں انگریز فوج مذید اتاری جائے اور جس تحریک نے مہدی سوڈانی جیسے حریت پسند پیدا کئے ہیں اسے بھی ختم کیا جائے۔ چنانچہ ایک روز ایک شاہی فرمان کے ذریعے علامہ افغانی کو مصر سے نکل جانے کے حکم کے ساتھ ہی ایک جہاز میں سوار کر کے بمبئی بھیج دیا گیا۔ مصر میں بھی صورت حال یہ ہوئی کہ مصر کے بادشاہ نے علامہ افغانی کو اپنے اقتدار کے لئے خطرہ محسوس کیا۔ وہ انگریزوں کو اپنا حامی و ناصر سمجھتا تھا۔ مہدی سوڈانی کی کامیابی کے بعد شاہ مصر یہ خطرہ بھانپ گیا تھا کہ آنے والے وقت میں ایک مہدی بھی پیدا ہو سکتا ہے جو انگریزوں کے ساتھ ساتھ مصری بادشاہت کا بھی دشمن ہو گا۔ اس لیے علامہ افغانی بمبئی پہنچتے ہی حیدر آباد دکن چلے گئے

نظام دکن کے ہاں کوئی عزت نہ ہوئی اس لیے کہ نظام حیدر آباد بذات خود انگریز کا وظیفہ خوار تھا۔ سرکاری نوکری کی پیش کش کی گئی جسے علامہ افغانی نے منظور نہ کیا اور دکن سے کلکتہ چلے گئے۔ وہاں لوگوں نے کافی عزت کی مگر علامہ افغانی کو اپنے مقصد میں کامیابی وہاں بھی نظر نہیں آئی۔ وہ تقریباً" دو سال ہندوستان رہنے کے بعد مایوس ہو کر یورپ روانہ ہو گئے۔ پہلے کچھ عرصہ لندن رہے۔ پھر پیرس میں مستقل قیام کر لیا۔ وہاں سے اپنی تحریک اتحاد بین المسلمین کا پرچار شروع کر دیا اور ان کے ساتھ مصر کے وہ دوست جو ان سے متاثر تھے۔ وہ بھی ساتھ شامل ہو گئے کچھ عرصہ بعد ایران کے بادشاہ ناصرالدین انہیں مجبور کر کے ساتھ لے گئے۔ پہلے تو شاہ ایران نے انہیں وزارت عظمیٰ کی پیش کش کی مگر بعد میں سابقہ وزیراعظم کی چالاکی اور سیاست سے انہیں بجائے وزارت عظمیٰ کے ایران کا نمائندہ بنا کر روس بھیج دیا گیا۔ حکومت روس نے ان کی بہت عزت افزائی کی ان کی ہر خواہش کی تکمیل اور عزت کی مسلمانوں کے حقوق جو حکومت روس کے زیر حکومت رہتے ہیں۔ منظور کرائے۔ ایرانی مطالبات منظور کرائے۔ مگر جب وہ خوشی خوشی واپس ایران آئے تو حکومت ایران نے کوئی توجہ نہ دی۔ علامہ نے ایک خانقاہ جس میں کسی کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ درس تدریس شروع کر دی۔ شاہ ایران نے علامہ افغانی کو اپنی حکومت کے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے گرفتار کر کے ٹٹو پر باندھ کر حدود ایران سے باہر بھیج دیا اور علامہ کچھ دن بغداد میں رہے اور پھر پیرس چلے گئے۔ وہاں جا کر اتحاد بین

المسلمین کے لیے کام شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد سلطان ترکی کی جانب سے ترکی آنے کا دعوت نامہ ملا۔ علامہ ترکی جانے کے لیے رضا مند ہوئے۔ بلاخر سلطان عبدالحمید کے اسرار پر ترکی چلے گئے۔ جہاں ان کا شاہانہ استقبال ہوا اور اپنی تحریک اسلامی اتحاد کے لیے کام شروع کر دیا۔ جب علامہ درس و تدریس کا کام کرتے تو مختلف قسم کے سوال و جواب زیر بحث آتے کہ اسلامی اتحاد عالمی مرکز کس جگہ ہو گا۔ سربراہ کون ہوگا اور سربراہ کس طرح چنا جائے گا۔ وہ طریقے جب سامعین کو بتائے جاتے تو یہ خبریں دربار خلافت تک بھی پہنچتی خلیفہ المسلمین اپنے آپ کو اس میں فٹ نہ محسوس کرتے ہوئے شک شبہ کا اظہار کرتے۔ پھر علامہ کے درس و تدریس پر بھی خفیہ پولیس کا عملہ تعینات کر دیا گیا۔ خفیہ رپورٹ خلیفتہ المسلمین کو پہنچتی آخر ایک واقع یوں ہوا کہ علامہ افغانی کے ایک معتقد خاص نے شاہ ایران کو گولی مار کر قتل کر دیا۔ موقع پر ہی گرفتار ہو گیا۔ اذیت ناک طریقہ پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

کچھ ایرانی مجتہدین بھی علامہ افغانی کے پاس درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ حکومت ایران نے ناصر الدین شاہ کے قتل کے جرم میں ایرانی مجتہدین کو حکومت ترکیہ سے مانگ لیا سلطان عبدالحمید ایران کے کے حکم سے ایرانی مجتہدین کو حکومت ایران کے حوالے کر دیا گیا۔ علامہ جمال الدین افغانی کو ایران کے حوالے نہ کیا گیا مگر سلطان ترکی خطرہ محسوس کرنے لگا بلاخر قید کی حالت میں ہی علامہ افغانی کو زہر دے کر مروا دیا گیا۔ 58 سال کی عمر میں علامہ افغانی اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ حضرت علامہ کے جذبات قابل احترام تھے۔ وہ بہت ہی ذھین اور پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے جو کام اپنے اوپر لے لیا تھا وہ نیچر کے خلاف مگر اس کا انجام نیچر کے عین مطابق ہوا۔ انہیں وقت نے حکیم الامت کا خطاب دیا ہے۔ جسے انہوں نے خوب نبھایا۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں بھی حکیم الامت ہوئے۔ انہوں نے حکیم الامت ہونے کا اپنی ذات پر اثر نہیں ہونے دیا ہے۔ وہ اسلامی اتحاد کے علمبردار بھی تھے۔ 1914ء کی جنگ عظیم میں جو خلافت عثمانیہ کے خلاف لڑی گئی تھی انگریز حکمرانوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ وہ اور مسلمانان ھند جرمنی اور خلافت ترکیہ کے خلاف جنگ میں سرکار برطانیہ کی پوری مدد کریں گے۔ تن من دھن سے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں۔ جنگ عظیم اول میں ان حکم الامتوں نے اور پنجاب کے مشائخ نے ترکی خلافت کے خلاف جنگ میں پنجابی سپاہوں کو تعویز بھی لکھ کر دیے تھے۔ خلافت اسلامیہ کے خلاف جنگ لڑنے میں انہیں کسی قسم کا کوئی نقصان نہ ہوگا اور نہ ہی گناہ ہو گا

یورپ کا صنعتی انقلاب

سولہویں صدی عیسوی میں یورپ کا صنعتی انقلاب شروع ہو چکا تھا۔ تب نئی ایجادات معرض وجود میں آنے لگی تھیں۔ سامان حرب میں نئی چیزیں سامنے آ چکی تھیں جو کہ مشرقی یورپ کے ذریعے وسعت ایشیا تک پہنچ چکی تھیں۔ اس وقت ہندوستان پر حکومت ابراہیم لودھی کی تھی
بابر صرف 1200 بارہ ہزار فوج سے ہندوستان پر حملہ آور ہوا پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی اور بابر کے درمیاں جنگ ہوئی۔ مقابلہ ہوا بابر کے پاس جدید اسلحہ تھا وہ ساتھ توپیں لے کر آیا تھا۔ ہندوستانیوں نے پہلے توپیں دیکھی ہوئی نہ تھیں جنگ شروع ہوتی بابر نے دائیں بائیں سے توپ خانہ کھول دیا۔ گولہ باری سے ابراہیم لودھی کی فوجوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ بے شمار فوجی مارے گئے۔ بادشاہ خود بھی میدان جنگ میں مارا گیا۔ دوپہر سے قبل جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ بابر کے پاس صرف بارہ ہزار فوج تھی جس نے دولاکھ فوج کو چند گھنٹوں میں شکست فاش دے کر پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا اور اس بہت بڑی فتح میں کامیاب رول جدید اسلحے کا تھا۔ صنعتی اور سائنس ترقی نے یورپ میں انقلاب برپا کر دیا تھا پرانے نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔ یورپ جس نے عالمی سیاست میں کبھی باہر جھانک کر بھی نہ دیکھا تھا جدید صنعتی انقلاب کی وجہ سے جدید ہتھیارں سے لیس دل کش مصنوعات کو فروخت کرنے کے لیے ایشیا' افریقہ اور آسٹریلیا کے براعظموں کی طرف چل دیے۔ چھوٹے چھوٹے ملک جنگی آبادیاں چند لاکھوں پر مشتمل تھیں وہ اپنی صنعت اور تجارت کو پھیلانے کے لے دھیرے دھیرے آگے بڑھنا شروع ہو گئے۔ یورپ کے یہ سب صنعتی ملک مذھبا" عیسائی تھے مگر ان کی کوئی تحریک اتحاد بین کرسچین نہ تھی۔ انہیں کسی حکم امت کی بھی ضرورت نہ تھی اور ان میں کوئی جبہ قبا والے بھی نہ تھے۔ انکے کسی بادشاہ کو یا کسی ملکہ کو اقتدار کا خطرہ بھی لاحق نہ ہوا۔ انہوں نے کسی حکیم الامت کو زہر دلوا کر مروایا بھی نہیں تھا۔ شاہان یورپ اور عوام کی قسم کے سیاسی انقلاب سے بے نیاز فطرت کے قوانین کو دیکھ رہے ہیں اور اسکی گتھیاں سلجھا رہے ہیں' ہر آن کہ کوئی شخص یا گروہ کوئی نئی چیز تیار کرتا ہے۔ ایجاد کرتا ہے۔ تو حکومت کے آگے پیش کرتا ہے۔ رجسٹرڈ کراتا ہے۔ فروخت کے لئے سرکار کی منظوری سے مارکیٹ میں پیش کر دیتا ہے۔ وہ قانون فطرت کو متحرک سمجھتے ہوئے اسی حرکت سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ خدا کے برگزیدہ لوگ فطرت کو ساکت اور جامد سمجھتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ دھرے کسی عیسیٰ علیہ السلام یا امام مہدی یا کسی حکیم الامت کے منتظر ہیں۔ پھر اسی بہانے کئی عیسیٰ آئے' کئی مہدی آے' کئی حکیم الامت آئے۔ اپنے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کا ارشاد فرمایا۔ ذرا غور سے دیکھا کہ وہ بھی اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں۔ سیدھی سی بات تھی نہ بتائی مگر وہی قبہ جبہ دستارے فضیلت اپنے سے کسی کو جدا نہ ہونے دینا۔ شعور نہ دینا کہ کہیں یہ لوگ بھی پسماندگی سے نکل نہ جاویں اور اپنے قبہ جبہ تار تار نہ ہو جاۓ۔ علامہ افغانی انتہائی ذہین اور پر کشش شخصیت کے مالک تھے۔ وہ نوجوانوں کو گرویدہ کر لیا کرتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اسلامی علوم کے علاوہ اور بھی علوم ہیں۔ سائنس کی افادیت کے بھی قائیل تھے۔ ایک جگہ انکی تحریر میں یہ بھی آیا ہے کہ مذہبی مدارس کے طالب علموں کو یہ تک پتہ نہیں ہوتا کہ جس چراغ کے آگے بیٹھ کر وہ کتابوں کا مطالعہ

کرتے ہیں اسکی چمنی ہٹا دی جائے تو دھواں کیوں پھیل جاتا ہے۔ اور اگر چمنی رکھ دی جائے تو دھواں کیوں نہیں آتا۔ وہ طالب علم اگر علوم دین حاصل کر بھی لے تو وہ عالم کہلانے کا حق دار نہیں۔ علامہ کی ساری زندگی کے حالات سے پتہ چلتا ہے وہ متحرک انسان تھے۔ انہوں نے یورپ افریقہ اور ایشیا کے کافی ملک دیکھے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت کے متمدن ترین شہر پیرس لندن اور ماسکو بھی کئی بار دیکھ چکے تھے اور ان شہروں میں کئی کئی ماہ نہیں بلکہ سالوں تک رہ بھی چکے تھے وہ یورپ اور ایشیا کی بہت ساری زبانوں سے بھی واقف تھے۔ وہ اسلامی تاریخ سے بھی واقف تھے وہ اسلامی علوم فلسفہ فنوں اور جنگی حکمت علموں سے بھی واقف تھے۔ یقیناً" انہوں نے سابقہ جنگوں اور فتوحات اور آج کی جنگی فتوحات کا موازنہ کیا ہوگا۔ پرانے وقتوں میں لوگ تلوار' نیزے' بھالے سے جنگ کیا کرتے۔ آج جدید ہتیاروں نے وہ جگہ لے لی ہے

پیرس' لندن اور ماسکو میں رہتے ہوئے انہوں نے غور کیا ہوگا کہ ان شہروں کے لوگ خوشحال بھی ہونگے۔ انکی معیشت بھی صنعتی بن چکی ہے۔ انکی سیاست بھی سائنس اور صنعت کے تابع ہو چکی ہے اور پرانا نظام معیشت اور نظام صنعت ختم ہو چکا ہے۔ مشینی دور ہے ہر کام مشین کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ بہت سارے لوگ گرد جمع ہو جاویں تو طاقت ضرور بن جاتی تھی۔ آج بھی بہت سارے لوگ جمع ہو جاویں تو طاقت بن جاتی ہے مگر یہ طاقت بین الاقوامی طاقت کا توازن نہیں بدل سکتی۔ یہ طاقت سیاست پر حاوی نہیں ہو سکتی۔ بہت سارے لوگ قدیم اسلحہ لے کر اس ملک کو فتح نہیں کر سکتے جو جدید اسلحہ لے کر میدان جنگ میں آ جاویں۔ جبکہ چند لوگ جدید اسلحہ سے لیس ہو کر قدیم بستیوں کو بڑی آسانی سے فتح کر سکتے ہیں۔ اگر حضرت علامہ افغانی پیرس' ماسکو اور لندن کی معیشت اور سائنس کا سیاست کا ذرا غور سے مطالعہ کرتے تو انہیں محسوس ہوتا اور وہ جان جاتے کہ موجودہ جدید دور میں پرانا سیاسی نظام اور معاشی نظام ختم ہو چکا ہے۔ اب سائنس کا دور ہے ایجادات کا دور ہے۔ بجائے اسکے کہ وہ اتحاد بین المسلمین کے لئے اسلامستان کے لئے بہت سارے اسلامی ملکوں میں اتحاد کی تحریک چلاتے۔ مقتدر لوگوں کو' بادشاہوں کو' اپنا مخالف بنا لیتے۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے۔ بلکہ صرف کسی ایک ملک میں بیٹھ جاتے لوگوں میں جدید علم کی' سائنس کی روشنی پھیلاتے۔ عام لوگوں کو صنعتیں لگانے کی ترغیب دیتے۔ جدید سے جدید تر کے لیے لوگوں میں شعور پیدا کرتے۔ لوگ بھی خوش حال ہو جانے تھے صنعتی اور سائنسی ترقی کے ساتھ وہ ملک بھی ترقی یافتہ ملکوں میں شامل ہو جاتا۔ رومانیہ' اور چیکو سلواکیہ اسی زمانے میں ترکی سے آزاد ہوئے تھے۔ آج یہ ملک یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اگر حضرت علامہ افغانی کسی ایک اسلامی ملک کو بھی ترقی کی راہ پر گامزن کر دیتے تو آج وہی ملک حضرت علامہ افغانی کی بدولت ترقی یافتہ ملک ہوتا اور دوسرے ملک خودبخود اس ملک کی پیروی کرتے اور یہی اتحاد بین المسلمین کا مرکز بن جاتا اور علامہ افغانی جدید اسلامی دور کا بانی بھی بن جاتا۔

اسرائیل

1914ء کی جنگ کے نتیجے میں جرمن اور ترکی کو شکست ہوئی۔ جرمن پر توان جنگ ڈالدیا گیا۔ ترکی کے علاقے جو غیر ترکوں پر مشتمل تھے وہ اس کے قبضے سے نکل گئے۔ جن میں زیادہ تر عرب علاقے تھے۔ شریف مکہ جو مکے کا حکمران تھا انگریزوں نے مکہ کا حکمران اسے تسلیم کرلیا۔ اس کے تین بیٹے تھے ایک شریف حسین کا ہی ولی عہد بنا۔ دوسرا عراق کا بادشاہ بنا۔ تیسرا شرق اردن کا حکمران بنا۔ اردن کے موجودہ حکمران شاہ حسین شریف حسین مکہ کے پڑپوتے ہیں۔ شریف حسین مکہ والی حجاز موجودہ سعودی عرب کا حکمران تھا۔ سعودی عرب کے موجودہ بادشاہ شاہ فاہد کے والد عبدالعزیز نے 1927ء میں بغاوت کر کے تخت تاج پر قبضہ کرلیا اور شریف حسین کا خاندان مکہ سے بھاگ کر عراق آ گیا۔ عراق کی حکومت بھی اسی خاندان کے پاس تھی - 1957ء میں ایک فوجی بغاوت میں اس خاندان کے جو لوگ عراق میں حکمران تھے وہ قتل کر دیے گئے اور حکومت پر ایک فوجی کرنل کریم قاسم نے قبضہ کرلیا اور پھر اسکے بعد عراق مکمل اور فوجی حکمرانوں کے کنٹرول میں چلا گیا۔ اس خاندان کا آخری حکمران جو شریف حسین مکہ کا پوتا تھا وہ نوجوان شاہ فیصل تھا اور اس کا ولی عہد شہزادہ عبدالالہ تھا جو قتل کر دیے گئے تھے۔ فلسطین انگریزوں نے اپنے کنٹرول میں کیا اور دنیا بھر سے یہودی فلسطین میں آ کر آباد ہونا شروع ہو گئے۔ اس وقت ہندوستان میں جو آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں انکے لیڈران لوگوں کے شعور میں یہ بات لائے تھے کہ فلسطین کو وطن یہود بنایا جا رہا ہے اور مجلس احرار کے جلسوں میں جمیعت العلمائے ہند کے جلسوں میں قرار دادیں منظور کی جاتی تھیں کہ انگریز حکمران فلسطین کو وطن یہود بنانا چاہتے ہیں اور دنیا بھر سے یہودی لا کر فلسطین میں آباد کئے جا رہے ہیں - جلسوں اور جلوسوں میں اس عمل کی مذمت کی جاتی۔ دراصل 1914ء کی جنگ میں اور بہت سارے سامراجی مفادات کے ساتھ ایک یہ بھی مفاد وابستہ تھا کہ مشرق وسطیٰ پر اور افریقہ کے بہت بڑے حصہ پر عرب قابض ہیں اور یہ لوگ مسلمان بھی ہیں اور انکی ایک یونیٹی بھی ہے اور یہ خطہ بھی بہت بڑا ہے۔

سامراجی مفادات میں یہ بات شامل تھی عین عرب کے قلب میں یہودی آباد کر دیے جاویں اور اس علاقے کو وطن یہود بنا دیا جائے۔ اسی پروگرام کے پیش نظر دنیا بھر کے یہودیوں میں یہ تحریک پیدا کی گئی کہ وہ فلسطین میں جا کر آباد ہوں۔ یورپ کے یہودی مالدار تھے انہوں نے فلسطین میں آ کر مہنگے داموں زمین خرید کرنا شروع کر دیں۔ ایک جگہ کی قیمت اگر عام حالات میں ایک ہزار پونڈ ہوتی تو یہودی لوگ وہی جگہ دس ہزار پونڈ میں خرید کرتے پھر جدید علوم سے واقف تھے وہ اگر زرعی زمین ہوتی تو بہترین کھیتی وہاں پر کی جاتی اگر وہ رہائشی جگہ ہوتی تو بہترین رہائش وہاں پر بنائی جاتی۔ جن جگہوں پر یہودی آباد ہوتے ان جگہوں پر بہترین نہری نظام بنایا گیا۔ بہترین آبی وسائل بنائے گئے - بہترین زراعت کی گئی - باغات لگائے گئے۔ کرنل محمد خان اپنی کتاب بجنگ آمد میں لکھتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم میں ہماری فوجی کانوائی عراق سے مصر کی جانب روانہ ہوئی اور ہمیں فلسطین سے گزر کر جانا تھا۔

راستے میں عرب علاقوں سے گزر ہوا تو کھیتی قدیم طرز پر کی جا رہی تھی۔ ہل کی جوگ میں مریل سے ڈنگر جتے ہوئے تھے اور بعض جگہ جوگ میں ایک گائے ہے اور ساتھ ایک گدھی ہے۔ غرض عرب علاقوں میں کسی ڈھنگ کی کھیتی نہ تھی۔ پھر اچانک ہم کسی ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو انتہائی زرخیز تھا' باغات تھے' نہریں تھیں' رنگ و نسل کے اعتبار سے لوگ عربی نہیں کوئی یورپین معلوم ہوتے تھے۔ چند میل چلنے کے بعد کانوائی رکی تو پتہ چلا کہ اس بہترین اور جدید ترین کھیتی باڑی کے علاقہ میں یہودی آباد ہیں اور یہ انہیں کا علاقہ ہے۔ عربوں اور یہودیوں کی کھیتی باڑی میں کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ یہودیوں کے علاقہ کی کھیتی بہتر سے بہترین تھی جبکہ عربوں کی کھیتی باڑی زیادہ تر پختہ ایمان کی علامت معلوم ہوتی تھی۔ یہودیوں نے جن علاقوں میں رہائش اختیار کی تھی یا جو جگہیں انہوں نے خرید کیں انہیں خوب آباد کیا۔ بہترین رہائش اختیار کی' بہترین عمارات بنائیں جدید صنعتیں لگائیں' علاقے کو خود کفیل بنایا۔ 1948ء تک فلسطین میں تقریباً" آٹھ لاکھ یہودی آباد ہو چکے تھے اور فلسطین کی تقسیم کا اعلان کر دیا گیا۔ فلسطین کی تقسیم کا منصوبہ تو پہلے ہی موجود تھا۔ دریائے اردن کے مشرقی کنارے اور مغربی حصہ پر ھی شرق اردن کی حکومت قائم کر دی گئی۔ جس کے سربراہ موجودہ شاہ اردن کے دادا شاہ عبداللہ بنے۔ اور فلسطین کے مغربی حصہ پو جو صحرائے سینا کے مشرق میں واقع ہے۔ اسرائیل کی حکومت قائم ہو گئی جس کی آبادی اس وقت تقریباً" آٹھ لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ جس روز یہ حکومت قائم ہوئی اسی روز ارد گرد کی پانچ عرب حکومتوں نے اسرائیل پر حملہ کر دیا۔ جن کے نام یہ ہیں۔ مصر' شام' لبنان' شرق اردن' سعودی عرب تقریباً" دو سال یہ جنگ جاری رہی۔ جب یہ جنگ بند ہوئی تو عربوں کے مزید علاقوں پر بھی اسرائیل نے قبضہ کر لیا ہوا تھا جن میں سعودی عرب کی ایلات کی بندرگاہ بھی شامل تھی۔ عربوں کی اتنی بڑی شکست کہ وہ ایک چھوٹے نوزائیدہ ملک سے شکست کھا گئے۔ اور مزید علاقوں سے بھی بے دخل کر دیے گئے جو عرب ملک اسرائیل سے شکست کھا گئے وہ سارے ہی رقبے اور آبادی کے لحاظ سے اسرائیل سے کئی گناہ بڑے تھے۔ پھر ان ملکوں میں بے چینی اور بغاوت کے آثار پیدا ہوئے۔ فوجیوں کو گلہ تھا کہ انہیں ناکارہ اسلحہ دیا گیا تھا جس کی وجہ سے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے شرق اردن کے شاہ عبداللہ جو نماز جمعہ پڑھ کر بیت المقدس کی مسجد سے نکل رہے تھے مسجد کی سیڑھیوں میں ہی گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد شام میں انقلاب آگیا وہاں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ پھر مصر کے بادشاہ شاہ فاروق کا تختہ الٹ دیا گیا۔ جنرل نجیب نے اقتدار سنبھال لیا اور بعد میں کرنل ناصر مصر کے اقتدار پر قابض ہو گئے۔ یمن میں بادشاہت ختم کر دی گئی۔ جمہوری حکومت قائم کر دی گئی۔ ایک فوجی جرنیل نے صدارت سنبھال لی۔ عرب عوام اور حکومتوں میں اضطراب تھا اور شکست کو بری طرح تسلیم کیا جا رہا تھا۔ مصر اور شام نے اپنی خارجہ پالیسی تبدیل کر لی۔ مغربی ممالک کی بجائے اپنے تعلقات سوشلسٹ بلاک کے ساتھ قائم کر لئے۔

1956ء میں نہر سویز جو کہ برطانیہ اور فرانس کی ملکیت تھی مصر نے اپنے کنٹرول میں کر لی۔ جس کے نتیجہ میں برطانیہ' فرانس اور اسرائیل نے مصر پر حملہ کر دیا۔ صرف دو دن کی جنگ میں

مصر پر اتحادیوں نے نہر سویز پر قبضہ کر لیا۔ قبضہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ سوویت یونین کے وزیراعظم مارشل بلگانن کی دھمکی سے جنگ بند کر دی گئی اور ساتھ اتحادی فوجوں نے مصر نہر سویز صحرائے سینا خالی کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اس جنگ میں مصر فتح یاب ہوا۔ کرنل ناصر دنیا کے بڑے لیڈروں میں شمار ہونے لگے اور پھر بعد میں مصر اور شام ۔ نے فیڈریشن قائم کر لی۔ متحدہ عرب جمہوریہ قائم کر لی۔ مصر کی جنگ میں پاکستان میں بھی مصر کے حق میں مظاہرے ہوئے او وقت پاکستان کے وزیراعظم سہروردی تھے۔ پاکستان کی پالیسی برطانیہ و فرانس اور اسرائیل کے حق میں تھی۔ جبکہ پبلک مصر کے ساتھ تھی۔ سارے ملک میں مصر کے حق میں مظاہرے ہوئے۔ جب وزیراعظم سہروردی سے سوال کیا گیا کہ پاکستان کے عوام تو عربوں کے حق میں ہیں۔ مصر کے حق میں ہیں۔ آپ کیوں نہیں مصر کی عربوں کی حمایت کرتے سہروردی نے اس کا جواب یہ دیا تھا کہ مصر یا عربوں کی طاقت صفر کے برابر ہے۔ میں صفر کی حمایت کیوں کرو میں نے پہلے بھی کئی ابواب میں ذکر کیا ہے کہ سترویں صدی کے صنعتی اور سائنسی انقلاب نے طاقت کا فلسفہ بدل دیا ہے۔ آج وہ ملک طاقت ور ہے جو صنعت اور سائنس میں پوری دسترس رکھتا ہے۔ عرب ممالک اس معاملے میں خالی ہاتھ ہیں۔ آج کی جنگ مشینی جنگ ہے جس کے پاس بہتر اور جدید مشینری ہو گی وہی جنگ جیتے گا۔ عربوں نے ابھی تک اس طرف توجہ نہیں کی عرب تیل کی وجہ سے خوشحال ہیں مگر تیل نکالنے میں بھی وہ اقوام مغرب کے مرہون منت ہیں۔ وہی زمین سے تیل نکال کر دیتے ہیں۔ وہی مشینری تیل نکالنے کی مہیا کرتے ہیں وہ تیل صاف کرنے کے لیے پلانٹ بھی دیتے ہیں۔ وہ ہر قسم کی راہنمائی کرتے ہیں تو عرب خوش حال ہیں ورنہ عرب سوکھی روٹی کے محتاج ہوتے۔ سائنس کے اصول جو نہیں اپنائیں گے پسماندگی کے گڑھے میں گر جاویں گے۔ ہم مصر کی جنگ کی باتیں کر رہے تھے۔ سوویت یونین کی مداخلت کی وجہ سے مصر کو جنگ میں کامیابی ہو گئی۔ اسرائیل اور اس کے اتحادیوں کو شکست ہوئی۔ اسی کامیابی کو ہی اگر عرب دیکھتے اور وجہ دریافت کرتے تو انہیں صنعتی اور سائنسی ترقی نمایاں نظر آتی اور وہ اس طرف راغب ہو جاتے تو آئندہ آنے والے وقتوں میں کامیابی حاصل کر لیتے۔ مگر ایسا نہ ہوا عرب حکمرانوں نے عوام نے ہنرمندی کی طرف توجہ نہ دی۔ اسلحہ کے انبار لگاتے رہے۔

1967ء عرب اسرائیل جنگ پھر ہوئی اور عربوں کو شکست فاش ہوئی۔ مصر کے صدر کرنل جمال عبدالناصر کو شکست کی وجہ سے دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا اور وہ اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ انکا جنازہ تاریخ انسانی کا سب سے بڑا جنازا تھا جس میں پچاس لاکھ لوگ شریک ہوئے۔ تمام اقوام عرب نے خصوصی طور پر اور مسلمان ملکوں نے عمومی طور پر اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا ہوا تھا۔ عرب ملک اپنے دل میں یہ ارادہ رکھے ہوئے تھے کہ ہم اسرائیل کو نیست و نابود کر دیں گے۔ جب اسرائیل قائم ہوا تھا کچھ فلسطینی مہاجر بھی اسرائیلی علاقوں سے ہجرت کر کے ساتھ والے عرب ممالک میں پہنچے تھے۔ انہوں نے ایک فوجی تنظیم آزادی فلسطین قائم کر لی تھی اردن، لبنان میں جس کی شاخیں موجود تھیں۔ جس کے سربراہ یاسر عرفات تھے اور ہیں اور فلسطینی لوگوں نے اسرائیل کے

خلاف گوریلا جنگ شروع کر دی جو کہ زیادہ تر اردن کے باڈر سے کی جاتیں تھیں۔ اسرائیل نے اردن پر حملہ کر کے حریت پسندوں کے کیمپ تباہ کر دیے اور اردن کے شہریوں کو بھی بہت نقصان ہوا۔ اردن نے فلسطینی مہاجرین کو شرق اردن سے نکال دیا۔ وہ جاکر لبنان میں آباد ہو گئے۔ وہاں پر کیمپ بن گئے۔ وہاں سے گوریلا جنگ اسرائیل کے خلاف شروع کر دی گئی۔ لبنان پر کئی بار اسرائیل نے حملے کئے۔ کئی بار فلسطینی کیمپ تباہ کئے۔ آخر کار فلسطینی مہاجرین نے اقوام متحدہ کے کہنے پر لبنان خالی کر دیا اور اب تیونس میں فلسطینی حریت پسند ہیں مگر کبھی ایک کاروائی سننے میں نہیں آئی۔ 1967ء کی جنگ میں اسرائیل نے نہر سویز پر صحرائے سینا پر شام کے علاقہ پر اور اردن کے علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ مصر میں کرنل جمال عبدالناصر کے انتقال کے بعد انور سادات مصر کے علاقہ کے صدر بنے۔ جنہوں نے چند سال بعد اسرائیل کے ساتھ مصالحت کر لی۔ کیمپ ڈیوڈ کے مقام پر ایک سمجھوتہ ہوا جس کے تحت مصر نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ اور اسرائیل نے مصر کے مقبوضہ علاقے چھوڑ دیئے۔ دیگر عرب ممالک بھی محسوس کرتے ہیں کہ اسرائیل کے ساتھ امن معاہدہ کرلیں گے اور تسلیم بھی کر لیں گے اور امید کی جاتی ہے کی اکیسویں صدی میں عرب کے خطہ میں امن ہو جائے گا اور ہر قسم کے جنگی خطرات سے محفوظ ہو جائے گا۔

بنی اسرائیل

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بشمول حضرت یوسف علیہ السلام بارہ بیٹے تھے۔ حضرت اسحاق انکے والد تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام انکے دادا تھے۔ سترہ سو سال قبل مسیح حضرت یعقوب کے بارہ بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام سمیت ہماری لوکل داستانوں کے اذکار کے مطابق مصر میں آکر آباد ہو گئے۔ اور انکی جو آگے نسل ہوئی اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں بھی بنی اسرائیل کا ذکر جا بجا آتا ہے۔ تیرہ سو سال قبل مسیح جب بنی اسرائیل کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی تو بنی اسرائیل کے قبیلہ بنی لاوی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ جنکی پرورش شاہی خاندان میں ہوئی وہ بہت صحت مند اورتوانا تھے۔ ان سے شاہی قبیلے کا ایک فرد قتل ہو گیا اور وہ ابھی جوانی کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ مصر سے فلسطین چلے گئے وہاں پر ہی انہوں نے شادی بھی کی اور کئی سال تک فلسطین میں رہے۔ اس وقت فلسطین میں کوئی منظم حکومت نہ تھی۔ وہ جتنا عرصہ وہاں رہے حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ کافی وقت گزر جانے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ مصر کے لوگوں کو قبطی کا قتل بھول گیا ہو گا۔ اب مصر جانا چاہیے۔ خداوند کریم کی طرف سے انہیں نبوت عطا ہوئی اور ساتھ ہی انکی دعا سے حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت عطا ہوئی۔ دونوں بھائی مصر میں فرعون کے دربار میں گئے۔ خداوند کی وحدانیت بیان کرنے کے بعد مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکل جانے کی اجازت دی جائے۔

جسے فرعون نہیں مانا اس لئے کہ بنی اسرائیل مصر میں محنت مزدوری کرتے تھے' شہر کی صفائی کرتے تھے' بھٹوں پر اینٹیں بنانے ' پکاتے تھے۔ کھیت میں مزدوری بھی کرتے تھے۔ فرعون مصر یہ سمجھتا تھا کہ بنی اسرائیل کے چلے جانے کے بعد مصر میں مزدوروں کا بحران پیدا ہو گا اس لئے بنی اسرائیل کو مصر سے نہ جانے دیا جائے۔ فرعون کے اجازت نہ دینے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل نے خفیہ طور پر مصر سے نکل جانے کی تیاری شروع کر دی پھر ایک روز بنی اسرائیل مصر کو چھوڑ کر صحرائے سینا کی طرف برائے فلسطین روانہ ہو گئے اور وہ بحیرہ قلزم کے جنوبی حصہ سے گزر کر صحرائے سینا کی طرف روانہ ہو گئے۔ قبطی حکمران فرعون اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ بنی اسرائیل کے تعاقب میں روانہ ہوا مگر وہ بحیرہ قلزم کی موجوں میں ہی ڈوب کر بمعہ اپنے لشکر کے تباہ ہو گیا۔ صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کو پانی کی قلت پیش آئی۔ خداوند کریم کے حکم سے انہیں پانی کے چشمے مل گئے۔ جو خداوند کریم کی ان پر خاص عنایت تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو منظم کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ فلسطین کے خوبصورت اور زرخیز علاقوں پر بزور طاقت قبضہ کیا جا سکے۔ مگر بنی اسرائیل اس کے لیے تیار نہ ہوئے اور انہوں نے حضرت موسیٰ کو جواب دیا کہ "فلسطین میں تو لڑ جا کر یا تیرا خدا لڑے ہم سے یہ جنگ و جدل نہیں ہوتی اور ہم کو تم نے خواہ مخواہ مصر سے اپنے گھروں سے نکالا ہم وہاں بڑے پرامن طریقہ سے زندگی بسر کر رہے تھے"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی اس وقت کی قوم سے مایوس ہوئے اور آنے والی نسل کا انتظار کرنے لگے۔ پھر بنی اسرائیل چالیس سال تک صحرائے سینا میں گھومتے رہے پھر جدید نسل میں جذبہ حریت پیدا کیا انہیں فلسطین کی خوبصورتی سے آگاہ کیا اور انہیں اپنی کامیابی کی یقین دہانی بھی کرائی۔ تب بنی اسرائیل کی نوجوان نسل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کہا مانا اور فلسطین پر حملہ آور ہو گئے اور حضرت موسیٰ کی زندگی میں ہی فلسطین کے کافی حصہ پر قبضہ کر لیا تھا اور بنی اسرائیل فلسطین میں آباد ہو گئے اور ساتھ ہی فلسطینیوں کی اور بنی اسرائیل کی جنگ ہمیشہ کے لئے شروع ہو گئی۔ بنی اسرائیل کو یہودی اس نسبت سے کہا جاتا ہے کہ عہد نامہ قدیم میں یہ لکھا ہوا ہے کہ بنی اسرائیل میں سرداری کا حق بادشاہت کا حق بنی یہودہ کو ہی ہو گا۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں سے اور کسی قبیلے کو نہیں ہو گا۔ قرآن کریم میں جتنے پیغمبروں کے نام آئے ہیں ان میں سے زیادہ تر بنی اسرائیل کے نبی ہی ہوئے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام' حضرت سلیمان علیہ السلام ' حضرت یونس علیہ السلام ' حضرت ذکریا علیہ السلام اور دیگر بہت سارے بنی اسرائیل میں ہی ہوئے۔ پھر ایک وقت میں عراق کے بادشاہ بخت نصر نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ فلسطینیوں اور بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا۔ کافی دیر تک فلسطین پر بخت نصر کی حکومت رہی اس کے بعد رومتہ الکبریٰ نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب اس دنیا میں مبعوث ہوئے تو اس وقت یوروشلم پر رومتہ الکبریٰ کی ہی حکمرانی تھی۔ مگر بنی اسرائیل اور حکومت روم کے ایک معاہدہ کے تحت بنی اسرائیل کے لئے سزا اور جزا عہد نامہ قدیم کے قانون کے مطابق ہی دی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑایا گیا تھا وہ یہودی قانون کے مطابق سزائے موت دی گئی تھی

اور عہد نامہ قدیم کے مطابق جرم یہ ثابت کیا گیا تھا کہ چونکہ یسوع مسیح اپنے آپکو خدا کا بیٹا کہتا ہے۔ عہد نامہ قدیم کے مطابق ایسا کہنے والا سزائے موت کا مستحق ہے۔ اس لئے یسوع مسیح کو مصلوب کیا جائے۔ بنی اسرائیل فلسطین میں ہی رہے اور حکومت رومتہ الکبریٰ ہی کی تھی۔ تیسری صدی عیسوی میں یورپ کی کافی حکومتیں اور لوگ بھی عیسائی ہو گئے اور فلسطین پر حکمرانی بھی عیسائی حکمرانوں کی ہو گئی۔ حضور علیہ السلام کے بعثت کے وقت اور اعلان نبوت کے وقت بھی بنی اسرائیل فلسطین میں اور دیگر عرب علاقوں میں رہتے تھے۔ مشرق وسطیٰ کے علاقوں ماسوائے خطہ حجاز کے قسطنطنیہ کے عیسائی حکمرانوں کی حکومت تھی۔ عرب کی دیگر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بھی قلیل مقدار میں بنی اسرائیل آباد تھے۔ یثرب موجودہ نام مدینہ شریف میں بھی بنی اسرائیل نصف کے قریب آباد تھے۔ قریب ہی قصبہ خیبر میں بھی یہودی آباد رہتے تھے۔

حضور علیہ السلام اعلان نبوت کے بعد ہجرت کر کے مدینہ شریف چلے آئے تو بنی اسرائیل کے ساتھ مل جل کر رہنے کا ایک معاہدہ کیا جسے میثاق مدینہ کہتے ہیں۔ مکہ سے ہجرت کے چھٹے سال تک تمام بنی اسرائیل کو مدینہ سے نکال دیا گیا تھا اور خیبر بھی فتح ہو چکا تھا۔ حضور علیہ السلام کے ایک فرمان کے موجب کہ یہود اور نصارا کو جزیرۃ العرب سے خارج کر دیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں فلسطین کے فتح ہونے کے بعد بنی اسرائیل کو جزیرۃ العرب سے خارج کر دیا گیا تھا اور فلسطین پر ہمیشہ ہی حکومت مسلمانوں کی رہی اور یہودی واپس فلسطین نہیں آئے۔ درمیان میں ایک وقت 90 سال تک فلسطین پر یورپ کے عیسائی حکمران رہے۔ بعد میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے عیسائیوں سے فلسطین چھین لیا اور پھر 1918ء تک فلسطین پر عثمانی ترکوں کی حکومت رہی۔ 1918ء میں برطانیہ نے جب فلسطین کو فتح کر لیا تھا تو پھر دوبارہ بنی اسرائیل کو دنیا بھر سے منگوا کر آباد کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح ایک مملکت اسرائیل کے نام نے معرض وجود میں آئی جو کہ آج تک موجود ہے اور پوری طاقت کے ساتھ زندہ اور تابندہ ہے۔

روس کا سوشلسٹ انقلاب

ہندوستان کی سیاسی تحریکوں میں جن بیرونی عوامل کا حصہ ہے ان میں روس کے سوشلسٹ انقلاب 1917ء کا بھی نمایاں کردار موجود ہے۔ اس انقلاب کے اور 1914ء کی جنگ کے بعد بھی ہندوستان میں سیاسی تحریکوں کو نیا ولولہ اور جوش ملا۔ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ وفاقی جمہوریہ جرمنی 1870ء میں ہی معرض وجود میں آیا تھا۔ یہ وفاق 200 کے قریب خود مختار ریاستوں نے مل کر بنایا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ دیگر اقوام یورپ کی طرح وہ بھی مل جل کر ترقی کریں اور 44 سال کے قلیل عرصہ میں جرمنی صنعتی اور سائنسی ترقی میں مغربی یورپ کے دیگر ممالک سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ جبکہ

دنیا پر سیاسی اجارہ دار دیگر ملکوں کو تجارت میں آگے نہیں بڑھنے دیتے تھے۔ اس لئے کہ ایشیا' افریقہ کے بیشتر ممالک پر انہیں کا قبضہ تھا۔ وہ دیگر ممالک کے مال تجارت پر اتنا ٹیکس لگا دیا کرتے تھے کہ وہ مارکیٹ میں مقابلہ ہی نہ کر سکتے تھے۔ 1914ء کی عالمی جنگ کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اجارہ دار ملک جرمنی یا اس جیسے دیگر ملکوں کو اپنے زیر قبضہ ملکوں میں تجارت ہی نہ کرنے دیتے تھے۔ جنگ میں جرمنی کی شکست کے بعد اجارہ دار ملکوں کو فتح تو حاصل ہو گئی مگر انقلاب روس نے انہیں ایک اور ہی درد سر میں مبتلا کردیا۔ روس کا انقلاب مارکس ازم کے نعرہ پر ہوا تھا۔ مارکس کا کہنا یہ تھا کہ سرمایہ جو ہے وہ محنت سے بنتا ہے۔ محنت مزدور اور کسان کرتے ہیں۔ سرمایہ دار نے پیسے کے زور سے محنت کش کی محنت سے کافی حصہ چھین لیتا ہے اور اس لیے سرمایہ دار اور زیادہ سرمایہ دار بنتا چلا جاتا ہے۔ جبکہ محنت کش غریب اور فاقہ کش ہی رہ جاتا ہے۔ جدید مشینی دور کے متعلق مارکس کا نظریہ تو تھا کہ قبل ازیں ہنر مند اپنی ذات میں خود کفیل تھا۔ ایک جولاہا خود کپڑا تیار کرسکتا تھا اور اسکی مزدوری بھی خود ہی لیتا تھا۔ مگر مشینی دور نے جولاہے کو مشین کا پرزا بنا دیا ہے

وہ مشین سے الگ بالکل بے کار ہے۔ وہ محنت اور ہنر مندی کے لیے مشین کا محتاج ہے۔ اسے ہر صورت میں روزی کمانے کے لیے مشین کا سہارا لینا پڑھتا ہے اور مشین کا مالک سرمایہ دار اپنے من مانے ریٹ پر اس سے کام کراتا ہے۔ اسطرح سرمایہ دار ہنر مند کو کم محنت دے کر اپنی تجوری بھرتا ہے اور سرمایہ دار بنتا چلا جاتا ہے اور اسکا علاج کارل مارکس نے یہ بتایا کہ ذرائع پیداوار کارخانے یا زمین اجتماعی ملکیت ہونے چاہیے اور مزدور کو اسکا معاوضہ اجتماعی نظام سے ہی پورا دیا جا سکتا ہے اور ملکیت کا اجتماعی نظام ہی ہونا چاہیے۔ تب ہی چھوٹا طبقہ خوشحال ہو سکتا ہے اور استحصالی نظام ختم کیا جا سکتا ہے۔ روس میں انقلاب کے بعد مارکس ازم رائج کر دیا گیا۔ تمام نجی ملکیت ختم کر دی گئی۔ زمین اور کارخانے سرکاری ملکیت قرار دے دیے گئے۔ سرکار نے عوام کے لیے مکان علاج تعلیم خوراک اور دیگر ضرویات زندگی اپنے ذمہ لے لیں۔ اجتماعی کاشت اور سرکاری صنعتی نظام رائج کر دیا گیا۔ روس کے سوشلسٹ انقلاب نے ساری دنیا پر اثرات مرتب کئے۔ ایشیا اور افریقہ کے غلام ملکوں کو سہارا مل گیا کہ ایک ایسی بھی یورپ کی طاقت ہے جو آزادی کی تحریکوں میں معاون ہو سکتی ہے۔ جس کی معاونت سے تحریک آزادی کو بڑھاوا دیا جا سکتا ہے۔ روس کے انقلابیوں کو کامریڈ بھی کہا جاتا تھا۔ اس حوالے سے ہندوستان کی تحریک آزادی کے کارکن بھی اپنے آپ کو کامریڈ کہلوانے لگ گئے۔ رئیس نہ آئی تھی۔ بلکہ انگریز حکمرانی کے زیر سایہ اپوزیشن پارٹی انڈین نیشنل کانگرس کی شکل میں معرض وجود میں آئی۔ جس کا منشاء اور مقصد یہ تھا کہ وہ قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے انگریز حکمرانوں کے آگے عوام کے مطالبات پیش کریں گے اور انڈین نیشنل کانگرس کا بانی بھی ایک انگریز ہی تھا۔ مگر وقت کے ساتھ حالات بھی بدلتے گئے۔ کچھ ہندوستانی لوگ جب یورپ تعلیم کے لیے یا محنت مزدوری کے لیے گئے تو انہیں یورپ کی معیشت اور خوشحالی اور آزادی نے متاثر کیا۔ ان لوگوں میں وطن کی آزادی کی امنگ پیدا ہوئی۔ انہوں نے وہاں پر ہی ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد اس انداز سے شروع کی ہندوستان کہ لوگوں کی پسماندگی' جہالت' بھوک' افلاس اہل یورپ کے آگے پیش کیا جانے لگا اور اسکی وجہ انگریز کی حکمرانی بتائی گئی۔ بعض جگہ سے چھوٹے چھوٹے اخبار بھی نکالے گئے۔ ہندوستانیوں کی

غلامی اور بد حالی کا ذکر کیا جاتا تھا اور پھر بعض نوجوان امریکہ اور کینڈا وغیرہ بھی گئے اور بعض نوجوان یہ ارادہ لے کر بھی باہر گئے کہ جن انگریز افسران نے ہندوستانیوں پر ظلم کئے ہوں یا بے گناہوں کو قتل کیا ہو اور انہیں قتل بھی کیا گیا۔ چنانچہ ڈھینگڑا کا مقدمہ قتل اس سلسلہ میں بہت مشہور ہوا۔ جس نے لارڈ کرزن کے اے ڈی سی سرکزن وائیل کو امپیریل انسٹی ٹیوٹ میں قتل کر دیا تھا۔ یہ بتیس سالہ نوجوان مسٹر مدن لال ڈھینگڑا نے قتل کیا تھا اور حکام کے سامنے بیان دیا تھا کہ اس نے سرکزن کو قتل کر کے بے شمار ہندوستانیوں کے قاتل کو مارا ہے۔ جس کے ظلم کی داستان بڑی لمبی ہے۔ ہم ہر اس ظالم کو قتل کریں گے جو ہماری سرزمین پر ظلم کرے گا۔ مسٹر مدن لال ڈھینگڑا نے یکم جولائی 1909ء کو سرکرزن کو قتل کیا تھا اور دس جولائی 1909ء کو مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا تھا اور مسٹر مدن لال ڈھینگڑا کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

اس قسم کے اور بھی کئی واقعات ہوئے جن میں جلیانوالہ باغ امرتسر میں ایک ہزار سے زائد لوگوں کے قاتل جنرل ایڈوائر کو برطانیہ میں ہی جا کر قتل کیا گیا تھا اور جس جلوس پر انگریز افسر نے لاٹھی چارج کا حکم دیا تھا۔ جس میں لالہ لاجپت رائے شہید ہوئے تھے۔ اس انگریز ایس پی کو بھی ایک سکھ نوجوان بھگت سنگھ نے قتل کیا تھا۔ انگریز افسران کے یہ سب قتل تحریک آزادی کا بھی حصہ تھے

تو ہم بیسوی صدی کے ابتدائی سالوں کی تحریک آزادی کا تذکرہ کر رہے تھے۔ یورپ کے ہر بڑے شہر میں ہندوستانی نوجوان تھے اور وہ جہاں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یا کوئی دھندا کرتے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی موجود تھے۔ جو وطن کی آزادی کی امنگ رکھتے تھے اور اس کے لیے جدوجہد بھی کرتے تھے۔

پھر یورپ اور امریکہ اور کینڈا کے ان نوجوانوں میں رابطے ہوئے۔ انہوں نے منظم جدوجہد کا آغاز کیا اور اپنی ہماگیر پارٹی کا نام غدر پارٹی رکھا۔ یہ نام رکھنے کی اصل وجہ یہ تھی 1857ء میں جو تحریک آزادی مسلح دلی کے گرد و نواح میں لڑی گئی تھی اسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا۔ اس نام پر ان نوجوانوں نے پارٹی کا نام غدر پارٹی رکھا۔ اسی غدر پارٹی نے جہاز راں سروس چلانے کا بندوبست کیا اور ایک جہاز خرید لیا گیا۔ جس نے مسافروں کو ہندوستان اور دیگر مختلف مشرقی علاقوں سے لوگوں کو بحرالکاہل کے راستے امریکہ، کینڈا پہنچانا تھا۔ مگر انگریز اور اس کے حواری ملکوں نے اس جہاز راں سروس کو ناکام بنا دیا

الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے جو اخبار تحریک آزادی میں جاری کیا تھا اسکا نام بھی انہوں نے کامریڈ ہی رکھا تھا۔ روس کے پہلے صدر اور کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری لینن نے جہاں یہ اعلان کیا تھا کہ دنیا بھر کے مزدور و کسانوں ایک ہو جاؤ اور ہم حقوق کی جدوجہد میں آپ کے ساتھ ہیں۔ وہاں یہ بھی اعلان کیا تھا کہ غلام قوموں کو ہم آزادی کی جدوجہد میں اپنے تعاون کا یقین دلاتے ہیں اور ساتھ ہی زار روس کے وقت جو حکومت روس کے مقبوضہ ممالک تھے۔ انکے لیے یہ اعلان کیا گیا جو ملک بھی الگ ہونا چاہتا ہے وہ الگ ہو جائے۔ چنانچہ فن لینڈ نے روس سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا اور ابھی تک الگ ہے۔ بقایہ مقبوضہ ممالک نے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا اور پھر تمام ممالک کی ایک مشترکہ یونین بنائی

گئی جس کا نام رکھا گیا یونائیٹڈ سٹیٹ سوویت ایپک ' (یو ایس ایس آر) جس کو عرف عام میں سوویت یونین بھی کہا جانے لگا۔ سویت یونین کے تعاون سے دنیا میں تحریک آزادی کو تقویت ملی۔ ہر غلام ملک کی تحریک آزادی میں ایک نئی زندگی آئی۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی جنگ کے فوراً بعد جو تحریک آزادی میں جوش اور ولولہ آیا اسکی ایک وجہ انقلاب روس بھی تھا۔ اور سوویت یونین کا دنیا بھر کی تحریک آزادی کو تعاون کی یقین دہانی تھی۔ 1919ء میں افغانستان کے شاہ امان اللہ خان نے ہندوستان کے خلاف اعلان جنگ کردیا اور جنگ شروع ہو گئی۔ تھوڑے وقت میں ہی ہندوستان کی اس وقت کی انگریز حکومت نے افغانستان کو امن کی پیش کش کر دی اور افغانستان کے تمام مطالبے بھی تسلیم کر لئے۔اس کے پس پردہ بھی انقلاب روس ہی تھا۔ اس لئے افغانی حکومت نے 1919ء میں ایک معائدہ حکومت روس کے ساتھ بھی کیا تھا کہ اگر کسی بیرونی طاقت نے افغانستان پر حملہ کیا تو سوویت یونین ہر قسم کی جنگی امداد افغانستان کو دے گی۔ اسی وجہ سے حکومت ہند نے افغانستان کے تمام مطالبات منظور کر لئے اور افغانستان کی حکومت کو خود مختار آزاد تسلیم کر لیا گیا اور پھر سوویت یونین نے افغانستان کے راستے ہندوستان کے حریت پسندوں کی ہر قسم کی امداد کی اور بلاخر ہندوستان آزاد ہوا

1914ء کی جنگ سے قبل غدر پارٹی

میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ جس روز سے ہندوستان میں انگریز حکمران بنا اسی روز سے آزادی کی تحریکیں کسی نہ کسی طرح سے چل رہی تھیں - 1857ء سے قبل ہندوستان کی مختلف جگہوں کے بادشاہ اور راجے مہاراجے اپنی بادشاہت یا اپنی راج گدھی بچانے کے لیے جنگوں میں مصروف تھے۔ 1857ء تک انگریز حکمرانوں نے اپنے راستے کے تمام تنکوں کو صاف کر دیا تھا اور کوئی بھی مسلح جدوجہد انگریز حکمرانوں کے خلاف ہندوستان میں باقی نہ رہی تھی۔ پرانے بادشاہوں کی راجوں کی حکومتیں شخصی حکومتیں تھیں لوگوں کا ان حکمرانوں کے ساتھ لگاؤ بھی کوئی خاص نہ ہوتا تھا۔ بعض وقت لوگ مقامی حکمرانوں سے بیزاری کا اظہار بھی کیا کرے تھے۔ لیکن دھرتی کے ساتھ وابستگی کا تقاضہ یہ تھا کہ لوگ جذباتی لگاؤ بھی دیسی حکمرانوں کے ساتھ رکھتے تھے۔ مگر 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد پورے ہندوستان میں مسلحہ جدوجہد نے دم توڑ دیا تھا اور پورا ہندوستان برطانیہ کے زیر نگین آگیا تھا۔ اسکے بعد انیسویں صدی کے آخر تک کسی قسم کی کوئی نمایاں تحریک انگریز حکمرانوں کے خلاف معرض وجود میں نہ آئی تھی بلکہ انگریز حکمرانی کے زیر سایہ اپوزیشن پارٹی انڈین نیشنل کانگرس کی شکل میں معرض وجود میں آئی۔ جس کا منشا اور مقصد یہ تھا کہ وہ قانون کے دائیرہ میں رہتے ہوئے انگریز حکمرانوں کے آگے عوام کے مطالبات پیش کریں گے۔ اور انڈین نیشنل کانگرس کا بانی بھی ایک انگریز ہی تھا۔ مگر وقت کے ساتھ حالات بھی بدلتے گئے۔ کچھ ہندوستانی لوگ جب یورپ تعلیم کے لئے یا محنت مزدوری کے لئے گئے تو انہیں یورپ کی معیشت اور خوشحالی اور آزادی نے متاثر کیا۔ ان لوگوں میں وطن کی آزادی کی امنگ پیدا ہوگی۔ انہوں نے وہاں پر ہی ہندوستان کے آزادی کی جدوجہد اس انداز سے

شروع کی کہ ہندوستان کے لوگوں کی پسماندگی' جہالت' بھوکھ' افلاس اہل یورپ کے آگے پیش کیا جانے لگا اور اس کی وجہ انگریز کی حکمرانی بتائی گئی۔ بعض جگہ سے چھوٹے چھوٹے اخبار بھی نکالے گئے۔ ہندوستانیوں کی غلامی اور بد حال کا ذکر کیا جاتا تھا۔ اور پھر بعض نوجوان امریکہ اور کینڈا وغیرہ بھی گئے اور بعض نوجوان یہ ارادہ لے کر بھی باہر گئے کہ جن انگریز افسران نے ہندوستانیوں پر ظلم کئے ہوں یا بے گناہوں کو قتل کیا ہو انہیں قتل بھی کیا گیا۔ چنانچہ ڈھینگڑا کا مقدمہ قتل اس سلسلہ میں بہت مشہور ہوا۔ جس نے لارڈ کرزن کے اے۔ ڈی۔ سی۔ سرکزن وائٹل کو امپیریل انسٹی ٹیوٹ میں قتل کر دیا تھا۔ یہ بتیس سالہ نوجوان مسٹر مدن لال ڈھینگڑا نے قتل کیا تھا اور حکام کے سامنے بیان دیا تھا کہ میں نے سرکزن کو قتل کر کے ان بے شمار ہندوستانیوں کے قاتل کو مارا ہے۔ جس کے ظلم کی داستان بڑی لمبی ہے۔ اور ہم ہر اس ظالم کو قتل کریں گے جو ہماری سرزمین پر ظلم کرے گا۔ مسٹر مدن لال ڈھینگڑا نے یکم جولائی 1909ء کو سرکرزن کو قتل کیا تھا اوردس جولائی 1909ء کو مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا تھا اور مسٹر مدن لال ڈھینگڑا کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اس قسم کے اور بھی کئی واقعات ہوئے جن میں جلیانوالہ باغ امرتسر میں ایک ہزار سے زائد لوگوں کے قاتل جنرل اڈوائیر کو برطانیہ میں ہی قتل کر دیا گیا تھا۔ اور جس جلوس پر انگریز ایس۔ پی۔ نے لاٹھی چارج کا حکم دیا تھا جس میں لالہ لاجپت رائے شہید ہوئے تھے۔ اس انگریز ایس۔ پی۔ کو بھی ایک سکھ نوجوان بھگت سنگھ نے ہی قتل کیا تھا۔ انگریز افسران کے یہ سب اقتال تحریک آزادی کا ہی حصہ تھے۔

تا ہم بیسوی صدی کے ابتدائی سالوں کی تحریک آزادی کا تذکرہ کر رہے تھے۔ یورپ کے بڑے شہر میں ہندوستانی نوجوان تھے اور وہ جہاں تعلیم حاصل کرتے تھے یا کوئی دھندا کرتے تھے ان میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو وطن کی آزادی کی امنگ رکھتے تھے۔ اور اس کے لئے جدوجہد بھی کرتے تھے۔ پھر یورپ' امریکہ اور کینڈا کے ان نوجوانوں میں رابطے ہوئے۔ انہوں نے منظم جدوجہد کا آغاز کیا اور اپنی ہما گیر پارٹی کا نام غدر پارٹی رکھا۔ یہ نام رکھنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ 1957ء میں جو تحریک آزادی مسلح دلی کے گرد و نواح میں لڑی گئی تھی اسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا اسی نام پر ان نوجوانوں نے پارٹی کا نام غدر پارٹی رکھا۔ اسی غدر پارٹی نے جہازراں سروس چلانے کا بندوبست کیا۔ اور ایک جہاز خرید کیا گیا جس نے مسافروں کو ہندستان اور دیگر مختلف مشرقی علاقوں سے لوگوں کو بحرالکاہل کے راستے امریکہ' کینڈا پہنچانا تھا۔ مگر انگریز اور اس کے حواری ملکوں نے اس جہازراں سروس کو ناکام بنا دیا۔

گاماں گاٹا مارا جہاز پر

اس جہاز پر اسلحہ خرید کر رکھا گیا اور بہت سارے نوجوان اس میں سوار ہوئے اور وطن کی آزادی کی خاطر ہندوستان کی طرف روانہ ہو گئے اور 5 ستمبر 1914ء کو ہگلی کی بندرگاہ پر پہنچ گئے۔ جہاز کے مسافروں کو ایک خاص ٹرین میں سوار ہونے کو کہا گیا۔ جس کا انہوں نے انکار کر دیا۔ بلکہ کلکتہ کی

طرف مارچ شروع کر دیا جہاں وہ گردوارہ میں گرنتھ رکھنا چاہتے تھے۔ آگے دو نوجوانوں نے گرنتھ صاحب اٹھا رکھا تھا۔ باقی لوگ ان کے پیچھے تھے۔ پولیس نے بلاخر مسافروں کو روک لیا اور گولی چلا دی۔ 20 ہندوستانی مارے گئے اور دو انگریز افسر بھی مارے گئے اور بہت سارے جہاز کے مسافر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ لوگ گرفتار بھی کر لیے گئے جنہیں بہت بڑی بڑی سزائیں ہوئیں۔ بعض لوگ جنہیں قید کی سزا ہوئی تھی وہ لوگ 1940ء کے بعد سزا پوری کر کے رہا ہوئے تھے۔ گامان گاٹا مارا جہاز کے زیادہ کردار سکھ عقیدہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاز کی اس تحریک نے لوگوں میں ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا کیا۔ ہندوستان بھر کے لوگوں نے تحریک آزادی کے ان مجاہدین کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جگہ جگہ ان کے سواگت میں اجلاس ہوئے۔ جلوس نکالے گئے۔

غدر پارٹی کی قیادت میں بھائی بھگوان سنگھ کا نام سب سے اونچا تھا۔ پھر ان کے ساتھ ہی ہردیال سنگھ' رام چندر پشاوری اور مولوی برکت اللہ بھی تھے۔ ان لیڈران کی ہمت اور کوشش سے ملک اور بیرون ملک تحریک آزادی میں بہت کام ہوا۔ تحریک آزادی میں جو ولولہ لوگوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ وہ غدر پارٹی کا بہت بڑا کارنامہ تھا اور حکومت ہند بھی اس جذبہ حریت سے غافل نہ تھی۔ غدر پارٹی کی تحریک صرف ہندوستان یا امریکہ اور کینڈا میں ہی نہ تھی بلکہ مشرق بعید کے ممالک ہانگ کانگ' شنگھائی' منیلا' بنکاک' سنگاپور اور دیگر علاقوں میں بھی تھی۔ اور ہندوستانی آباد کاروں میں ہیجان موجود تھا۔ انہیں علاقوں سے بھی ہندوستانی تارکین وطن ملکی آزادی کی جدوجہد میں شامل ہوئے اور کئی قسم کی وارداتیں کیں۔ یہ لوگ مختلف گروپوں کی شکل میں ہندوستان آتے تھے۔ لیڈرانہ رول ادا کرنے والے مندرجہ ذیل لوگ تھے ندھان سنگھ 'کیر اور دھم سنگھ' جوالا سنگھ' نواب خان اور دیگر لوگ بھی شامل تھے ان لوگوں نے ملک میں داخل ہو کر سرکار کی مختلف جگہوں پر کاروایاں کیں' تھانوں پر حملے کیے' سرکاری خزانوں کو لوٹا گیا۔ ان وارداتوں میں کہیں کامیابی بھی ہوئی کہیں ناکامی بھی ہوئی۔ فوجی چھاؤنیوں میں بھی رابطے قائم کیے گئے۔ فوجیوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی گئی۔ پھر ان میں سے کئی لوگ گرفتار ہوئے۔ جن میں گوپال سنگھ' بھائی بھگوان سنگھ' گوبند بہاری' لعل بش بہاری ہندی' بھائی ستھوک سنگھ' گورھا رام نرنجن داس' منشی رام داس اور دیگر بہت سارے لوگ شامل تھے۔ اس کے علاوہ غدر پارٹی کے لوگوں کو امریکہ میں بھی گرفتار کیا گیا۔ امریکہ میں قید ہونے والے لیڈران کو مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔ ان جیلوں میں روس کے جلا وطن قیدی بھی موجود تھے۔ مزدور لیڈران بھی موجود تھے۔ سوشلسٹ نظریہ رکھنے والے اور لوگ بھی موجود تھے۔ ان سیاسی قیدیوں میں تبادلہ خیالات ہوئے۔ غدر پارٹی کے لوگ سوشلسٹ رجحانات سے مارکسزم سے بہت متاثر ہوئے اور روس کے سوشلسٹ انقلاب کو خوش آمدید کہا اور مارکسزم اور لینن ازم کو ذہنی طور پر بھی قبول کیا اور بلاخر غدر پارٹی کے بہت سارے لوگ کیمونسٹ انٹرنیشل پارٹی میں شامل ہو گئے۔

1914ء کی جنگ کے ایام میں غدر پارٹی کے بہت سارے لوگ افغانستان ترکی اور بہت سارے یورپ' امریکہ اور مشرق کے ملکوں میں وطن کی ازادی کے لیے کام کر رہے تھے۔ حضرت مولانا عبداللہ سندھی اور دیگر بہت سارے لوگ افغانستان اور ترکی اور دیگر ممالک میں وطن کی آزادی کے لیے

باعمل تھے - لالہ لاجپت رائے تحریک آزادی کے بہت بڑے اور مخلص لیڈر تھے۔ وہ لاہور کے ہی رہنے والے تھے۔ بلند پایہ خطیب تھے۔ انہوں نے بھی دنیا کا دورہ کیا۔ وہ ترکی بھی گئے۔ یورپ اور امریکہ بھی گئے۔ جہاں انہوں نے اپنے وطن کی غلامی کا کیس اقوام عالم کے آگے پیش کیا اور متاثر کیا اور اقوام عالم کی حمایت حاصل کی وہ پیرس کے ایک عوامی ہال میں ہندوستان کی آزادی کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے اور اقوام یورپ کو ہندوستان کے غلام ہونے کی داستان غم سنا رہے تھے۔ وہاں ہال میں ہی ایک سوشلسٹ نوجوان نے اعتراض کیا کہ اگر ہندوستان آزاد بھی ہو گیا۔ انگریز چلے بھی گئے۔ انگریز حکام کی جگہ دیسی حکام بن گئے۔ تو عوام کو کیا فائدہ ہو گا۔ کیونکہ جب تک ملک میں معاشی تبدیلی نہ ہو گی تو لوگ خوش حال نہ ہوں گے۔ ایک ایسی تبدیلی جسے لوگ اپنی اور روز مرہ کی زندگی میں خوش کن انداز میں محسوس نہ کریں اس کا عام لوگوں کو کیا فائدہ ہو گا ماسوائے اس بات کے چند لوگوں کو سرکاری نوکریاں مل جاویں گی

اور وہ لوگ ہی انگریزوں کی طرح سیاہ سفید کے مالک بن جاویں گے۔ لالہ لاجپٹ رائے اسکا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ کھسیانی ہنسی کے ساتھ سوال کو ٹال گئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ دنیا کے بیشتر ملکوں میں اقوام یورپ کی حکمرانی تھی اور آزادی کی تحریکیں دنیا بھر میں چل رہیں تھیں۔ اسی طرح جنوبی افریقہ میں بھی تحریک چل رہی تھی۔ جنوبی افریقہ پر بھی انگریزوں کا ہی تسلط تھا اور آج 1994ء میں انگریزوں نے کچھ حقوق دیے ہیں۔ انہیں حکمرانوں کے اختیارات ملے ہیں۔ جنوبی افریقہ کے صدر نیلسن منڈیلا کو 25 سال کی قید کے بعد رہائی ملی ہے۔ جنوبی افریقہ کے عوام کی اکثریت کو انگریز اقلیت کے برابر سمجھا گیا ہے۔ پیرس کے اس حال میں جہاں لالہ لاجپت رائے تقریر کر رہے تھے ان پر جو ایک نوجوان نے اعتراض کیا تھا کہ اگر بدیش حکمران انگریز ملک چھوڑ کر ہندوستان آزاد کر کے چلے بھی جاتے ہیں اور انکی جگہ مقامی لوگ حکمران بن بھی جاتے ہیں تو عام لوگوں کو کیا فائدہ ہو گا۔ آج جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس نوجوان کا اعتراض بلکل ٹھیک تھا کہ آج مقامی حکمران بدیش حکمرانوں سے زیادہ ظالم ہیں' راشی ہیں'بد کردار ہیں' جھوٹے ہیں' مکار ہیں۔ لوگوں کو لوٹنے کے لئے نت نئے طریقے ایجاد کرتے ہیں' لوگوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے' سرکاری اہل کا جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں' راشی افسران کی جنبش قلم سے خاندانوں کے خاندان تباہ کردیے جاتے ہیں۔

سوشلسٹ رجحانات

یورپ میں سوشلسٹ رجحانات انیسویں صدی میں ہی شروع ہو گئے تھے۔ جب یورپ نے صنعتی ترقی میں قدم رکھا تو آجر اور اجیر کے مسائل بھی پیدا ہوئے اور مزدور کے معاملات نے ایک بین الاقوامی مسئلہ پیدا کر دیا - پہلے کارخانوں میں یونین پیدا ہوئی۔ مزدوروں کے مطالبات سامنے آئے۔ ضروریات پیش کی گئی۔ سرمایہ دار کارخانہ دار کا مزید سرمایہ دار ہونا حرف تنقید بنایا گیا۔ مسائل کے حل پیش کیے گئے۔ کوئی حل قابل عمل تھے کوئی نہ تھے۔ کوئی مسائل توجہ طلب تھے کوئی نہ تھے۔ جیسا کہ

پہلے بھی ذکر گیا ہے کہ اقوام یورپ نے صنعتی ترقی کے ساتھ ہی نئی نئی ایجادات کیں - جدید ترین اسلحہ بنایا اور پھر ایشیا اور افریقہ پر چڑھ دوڑے اور ان ملکوں کو غلام بنا کر اپنی مصنوعات کی منڈی بنا لیا۔ غلام قوموں میں فطری عمل یہ پیدا ہوا کہ آزادی کی تحریکوں نے جنم لیا اور اقوام یورپ کے خلاف آزادی کی تحریکیں شروع ہو گئیں - وہاں یورپ میں مزدور اور کسان تحریکیں پیدا ہوئی جو زمینداروں اور کارخانہ داروں کے خلاف تھیں۔ کھیت مزدور اور فیکٹری مزدور اپنی جدوجہد میں یک جان ہو گئے۔ مزدوروں کی پسماندگی دور کرنے کے لئے کئی خیالات سامنے آئے - کئی فلسفی پیدا ہوئے جنہوں نے مزدوروں کے معاملات کو بہتر سے بہتر انداز میں پیش کیا۔ مارکس' انجلز اور کئی فلاسفر اس دور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے خیالات سے لوگوں کو متاثر کیا۔ جن میں سب سے زیادہ مارکس کا نظریہ مقبول ہوا۔ جس نے بیسوی صدی میں ہی دنیا کے بیشتر ممالک میں اور تقریباً" 40 فی صد دنیا کی آبادی پر اپنے خیالات کی حکمرانی کی۔

کارل مارکس کا نظریہ

مارکس کے نظریات کو مختصر ترین لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے وہ کہتا ہے کہ

"جہان رنگ و بو میں جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے یہ جو عمارات ہیں' باغات ہیں' کارخانے ہیں' ہوائی جہاز ہیں' سونا ہے' چاندی ہے' اناج ہے' فروٹ ہے' کھیت کھلیان جو کچھ بھی ہے۔ یہ مزدور کی محنت سے پیدا ہوتا ہے۔ کارخانے چلتے ہیں۔ باغات لگتے ہیں۔ بحری جہاز بنتے ہیں۔ مگر مزدور کی محنت کی کم اجرت دے کر سرمایہ دار بنا ہے اور وہ اپنے سرمایہ کے بل بوتے پر ہنرمند کی بنی ہوئی چیزیں سستے داموں خرید کر اپنے سرمایہ میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ مزدور نیم فاقہ کشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور جدید مشینی دور میں مزدور مشین کا پرزہ بن کر رہ گیا ہے - دست کار کی اپنی انفرادی حیثیت ختم ہو گئی ہے۔ وہ بھی مشین کا پرزہ ہی بن گیا ہے۔ مشین کا بنا ہوا دھاگہ اور کپڑا ہاتھ کے بنے ہوئے دھاگے اور کپڑے سے سستا بھی ہے اور خوبصورت بھی ہے۔ اس لیے ہاتھ کھڈی کے مزدور کی ذاتی حیثیت ختم ہو گئی۔ اب وہ مجبور ہے کہ کپڑے کے کارخانے میں جا کر مزدوری کرے اور مل مالک کا جو جی چاہے اسے مزدوری دے۔ اس طرح کارخانہ دار تو بہت بڑا سرمایہ دار بن جاتا ہے۔ مگر مزدور پسماندہ ہی رہتا ہے۔ مارکس نے نظریہ پیش کیا کہ مزدور سے اسکی طاقت کے مطابق کام لے اور اسکی ضرورت کے مطابق اجرت دے۔ 1917ء اکتوبر روس میں جو انقلاب آیا تھا اس کا نعرہ یہی تھا کہ وہ جہاں تک ممکن ہو گا پیداوار کو عوام میں مساوی تقسیم کریں گے۔ لینن کی قیادت میں یہ انقلاب آیا تھا اس وقت جنگ عظیم اول زوروں پر تھی۔ حکومت روس بھی اس جنگ میں شریک تھی اور فریق تھی۔ سب سے پہلا بین الاقوامی فرمان جو لینن نے جاری کیا وہ یک طرفہ جنگ بندی کا تھا اور فرمان میں کہا گیا تھا کہ یہ جنگ سرمایہ داروں کی ہے۔ روس کے مزدور کسی سرمایہ داروں کی جنگ میں شریک نہیں ہونگے۔ اس لیے فوجوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ مورچے ٹھنڈے کر دیں۔ جنگ بند کر دیں۔ روس کی

جنگ بندی سے جرمن نے بھی جنگ بند کر دی اور اب جرمن کے مدمقابل فرانس اور برطانیہ تھے اور یہ جنگ 1918ء میں جرمن کی شکست کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ لینن نے دوسرا فرمان جاری کیا کہ زار روس کے وقت جو قومیں روس کے زیر تابعہ تھیں انہیں آزاد کیا جاتا ہے۔ آزاد حیثیت سے اگر وہ قومیں کوئی یونین تشکیل دینا چاہتی ہیں تو ہر قوم برابری کی حیثیت سے اس یونین میں شامل ہو سکتی ہے۔ فن لینڈ بھی اس وقت حکومت روس کے تحت ہی تھا۔ جسنے آزاد رہنے کا فیصلہ کیا۔ باقی تمام ریاستیں جو زار روس کے وقت حکومت کے ماتحت تھیں وہ سب اس یونین میں شامل ہو گئیں۔ اور اسکا نام (یو ۔ ایس ۔ ایس ۔ آر) یونائیٹڈ سٹیٹ سوویت ری پبلک رکھا گیا۔ جس میں وسط کی 6 مسلم ریاستیں بھی شامل تھیں۔

نیا روس

روس کے انقلاب نے دنیا پر سکتہ طاری کر دیا ۔ صنعتی اور سرمایہ دار ملک ایک نئی سوچ میں پڑ گئے۔ قبل ازیں زار روس کی حکومت مغربی یورپ کے ملکوں کی حامی تھی جبکہ سوشلسٹ روس کا بنیادی فلسفہ ہی الگ تھا۔ دنیا بھر میں سوشلسٹ نظریہ رکھنے والے لوگوں میں ایکتا پیدا ہوئی ۔ جو سوشلسٹ لیڈر یا ورکر جیلوں میں بند تھے انکا آپس میں تبادلہ خیالات ہوا۔ جدید خیالات نے اپنا رنگ دکھایا۔ ہند کے بہت سارے لوگ جو بیرون ملک قیدی تھے انہیں سے بیشتر لوگوں نے سوشلسٹ نظریات کو اپنانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی ۔ لینن کا ایک اور فرمان دینا میں گونجا کہ دنیا بھر کے مزدور ایک ہو جاؤ ۔ مزدوروں میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ پھر ایک اور فرمان نے دنیا کی سیاست کا پانسہ ہی پلٹ دیا کہ سوویت یونین دنیا کی محکوم اقوام کی آزادی کے لئے ہر قسم کی مدد کرے گا۔ اس اعلان سے ہندوستان کی تحریک آزادی میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوا۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ اقوام عالم میں ایک ایسی طاقت بھی ہے جو غلام قوموں کی آزادی کی حامی ہے۔ پھر جب یہ خبر کسی مزدور گھرانے میں پہنچتی کہ روس کا صدر قوم کا موچی ہے یا فلاں وزیر دھوبی قوم سے تعلق رکھتا ہے یا فلاں جرنیل قوم تیلی ہے یا روس کا صدر سکول ماسٹر کا بیٹا ہے۔ راقم الحروف کا گاؤں ضلع راولپنڈی میں ہے ۔ پرانے وقتوں کی بات جب جنگ عظیم اول ہو رہی تھی۔ سٹالن سوویت یونین کے صدر تھے ۔ ہٹلر جرمنی کے چانسلر تھے ۔ مسولینی اٹلی کے صدر تھے۔ گاؤں میں ایک موچیوں کی دوکان پر عموماً" میرا بیٹھنا ہوتا تھا آج بھی پنجاب کے دیہاتوں میں موچی ' نائی' تیلی یا دیگر دست کاروں کو کمی کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی مہا بھارت کی کمہ تقسیم کے تحت انہیں چھوٹی جاتی کے لوگ کہا جاتا ہے۔ وہ ہی رواج مسلمانوں میں بھی ہے۔ دیہاتوں میں سرداروں یا چودھراہٹ کے مسئلہ پر چھوٹی جاتی کے لوگوں کو چودھراہٹ کے اہل نہیں سمجھا جاتا اور انہیں کمی کمہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس موچی گھرانے کے بزرگ کا نام مستقیم تھا۔ . . مجھے کہتے کہ قاضی جی سنا گیا ہے کہ روس کا بادشاہ موچی ہے۔ اٹلی کا بادشاہ دھوبی ہے اور جرمنی کا بادشاہ لوہار ہے۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے یہ تو پتہ نہیں کہ یہ شاہان یورپ کس کس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر یہ یقین کریں کہ ان سربراہان مملکت میں کوئی بھی راجہ نہیں' راجپوت نہیں' زمیندار نہیں۔ یہ سب

سربراہان دست کار لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے باپ دادا دست کار تھے۔ اور اپنے ہاتھوں سے ہی کام کر کے رزق حاصل کیا کرتے تھے۔ اور ان لوگوں نے بادشاہوں، شہنشاہوں کو شکست دے کر ہی تحت سلطنت الٹ کر ہی اپنی بادشاہتیں قائم کی ہیں۔ اور چھوٹے لوگوں کو سر اونچا کر کے چلنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ روس کے سوشلسٹ انقلاب نے دنیا بھر کے مزدوروں، محنت کشوں کو عزت بخشی۔ مزدوروں کا اعتماد بحال ہوا۔

انیسویں صدی میں یورپ اور پوری دنیا کے مزدوروں کی فلاح کے لئے کوئی قوانین نہ تھے۔ اوقات کار کا تعین نہ تھا۔ صبح کے وقت مزدور کام پر جاتے رات کو واپس آتے۔ ہفتہ وار چھٹی نہ تھی۔ یوم مئی جو مزدور مناتے ہیں انہیں حقوق کی جنگ میں مزدوروں نے امریکہ کی ریاست شکاگو میں ایک جلوس نکالا ہوا تھا۔ جس پر پولیس نے گولی چلا دی تھی۔ ایک سو سے زائد مزدور شہید ہو گئے تھے۔ جن کے خون سے مزدوروں نے جھنڈا رنگا۔ وہی سرخ جھنڈا مزدوروں کا امتیازی نشان بن گیا۔ روس کے انقلاب نے یورپ کے حکمرانوں کو ایک نئے فکر میں ڈال دیا۔ اب ایک ایسی طاقت بھی دنیا میں بن چکی تھی جسکی سیاست عملی سیاسی دھارے سے کچھ قدرے مختلف بھی تھی اور یورپی سیاست دانوں کے لئے فکر مندی کا ایک اور دروازہ کھل گیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ انقلاب روس کا جہاں ساری دنیا پر اثرات ہوئے ہندوستان کے لوگ بھی انقلاب روس کی افادیت سے چشم پوشی نہ کر سکے۔ تحریک آزادی کے ساتھ وابستگی کا جذبہ نوجوانوں میں اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ بعض نوجوان تو اسلحہ مل جانے کی صورت میں بغاوت پر بھی بڑی شدت سے آمادہ تھے۔ جس طرح یہ نوجوان ماضی قریب میں یورپ اور جرمنی کی مدد سے ملک آزاد کرانا چاہتے تھے۔ اسی طرح انقلاب روس کے بعد کچھ نوجوانوں نے ماسکو کا رخ بھی کر لیا تھا۔

ان جوانوں میں ویر مندر ناتھ، چٹوپادیا، ایم این رائے اور خیری برادران بھی شامل تھے۔ یہ لوگ ماسکو بھی گئے۔ کمیونسٹ انٹر نیشنل میں شامل بھی ہوئے۔ سوشلزم سے متاثر بھی ہوئے اور ان لوگوں نے قومی اور بین القوامی سٹیج پر کام کیا۔ سوویت یونین کی انقلابی حکومت نے ان لوگوں کی تحریک آزادی کے سلسلہ میں حوصلہ افزائی بھی کی۔ یہ ھندو نوجوان تو زندگی کے آخری ایام تک سوشلسٹ نظام کی جدوجہد کے ساتھ وابستہ رہے مگر دلی کے خیری برادران جو حضرت شیخ الہند سے متاثر ہو کر آزادی کی جدوجہد میں شامل ہوئے۔ جنکے نام پروفیسر محمد ھادی اور پروفیسر محمد وارث تھے۔ وہ تھوڑا عرصہ تو تحریک آزادی کے ساتھ وابستہ رہے ماسکو میں انکی بہت عزت بھی ہوئی۔ پھر تحریک آزادی کو خیرباد کہ کر سرکار سے معافی مانگ کر روزمرہ کی زندگانی میں مصروف ہو گئے اور بھی کئی ہندوستانی نوجوان تحریک آزادی میں اپنا نقش چھوڑ کر اس دار فانی سے بھی کوچ کر گئے۔ اقبال شیدائی، فیروزدین، منصور فضل الٰہی، قربان دیگر بہت سارے مجاھدین تحریک آزادی ھند و پاک آزاد ہو جانے کے بعد میں سوشلسٹ نظام معشیت کی جدوجہد میں مصروف رہے اور آج ان لوگوں کا کسی کو پتہ تک نہیں۔ خصوصی طور پر پاکستان میں تو تحریک آزادی کے مجاھدین کو تاریخ کے اندھے کوئیں میں پھینک دیا گیا ہے۔

رولٹ ایکٹ

حکومت ھند کو تحریک آزادی کے سلسلہ میں مجاہدین تحریک آزادی کے کارناموں سے پریشانی لاحق تھی۔ جنگ عظیم اول ابھی جاری تھی۔ دسمبر 1918ء کو حکومت ھند نے ایک قرارداد کے ذریعے فیصلہ کیا کہ ایک کمیٹی قائم کی جائے۔ یہ جو کمیٹی قائم کی گئی اس کے سربراہ جسٹس رولٹ بنائے گئے اور اس کمیٹی کے ممبران بہت بڑے بڑے سرکاری افسران اور سرکار کے منظور نظر لوگوں کو بنایا گیا۔ کمیٹی کے ممبران کی تعداد 6 تھی۔ اس کمیٹی نے حکومت ھند کو چار پانچ ماہ میں ایک ضخیم رپورٹ پیش کر دی۔ حکومت ھند نے یہ رپورٹ جنوری 1919ء میں شائع کر دی اور مسودہ قانون بھی منظوری کے لئے سنٹرل اسمبلی میں پیش کر دیا۔ اس رپورٹ کی منظوری کے لئے اسمبلی میں پیش ہونا ہی تھا کہ سارے ہندوستان میں غم و غصہ کا اظہار کیا گیا۔ رولٹ ایکٹ کا مقصد یہ تھا کہ جنگ کے بعد بھی ڈیفنس آف انڈیا کے سخت گیر قوانین کو جاری رکھا جائے۔ یہ قانون 18 مارچ 1919ء کو اسمبلی نے منظور کیا۔ اس قانون کے خلاف پہلے 30 مارچ ہڑتال کی تاریخ مقرر کی پھر 13 اپریل کو ہڑتال کی تاریخ مقرر کی گئی۔ دہلی میں 30 مارچ سے ہی ہڑتال شروع ہو گئی۔ بعض سرکاری ممبران نے بھی سنٹرل اسمبلی میں بل کی مخالفت کی تھی۔ بعض لوگ جو اعتدال پسند تھے وہ بھی رولٹ ایکٹ کی وجہ سے سرکار کے مخالف تھے۔

دراصل رولٹ ایکٹ ایک مسودہ قانون تھا جس سے سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگانا مقصود تھی۔ اس بل کے ذریعے کسی شخص کو بھی بلاوجہ بتائے گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں کو سختی سے کچل دیا جا سکتا تھا۔ کہ ھندوستان کی تمام سیاسی پارٹیاں جو کہ متحرک تھیں۔ فوری طور پر میدان عمل میں آگئیں اور ایک عام سیاسی تحریک شروع ہو گئی۔ ملکی سطح پر تو اس وقت سرکار کے خلاف تحریک چلانے والی صرف انڈین نیشنل کانگرس ہی تھی مگر کانگرس کی حلیف جماعتوں' جمعیت العلمائے ھند اور دیگر علاقائی جماعتیں بھی بڑھ چڑھ کر رولٹ ایکٹ کے خلاف متحرک ہو گئیں۔ ملک کے ہر طبقہ نے رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک کی حمایت کی۔ اگر کسی نے تحریک کی حمایت نہ کی تو مخالفت کی جرات نہ کی۔ رابندر ناتھ ٹیگور جو کہ ھندوستان بھر میں قابل عزت و احترام حیثیت رکھتے تھے۔ وہ مہاتما گاندھی کے نام اپنے پیغام میں فرماتے ہیں۔

"میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ ہماری روحانی آزادی کو کمزور کرنے والی کوئی چیز آپکے راستہ میں حائل نہ ہو۔ حق کے لیے شہادت کا جذبہ محض توہم پرستی اور مذہبی جنون میں نہ بدل جائے اور وہ خود فریبی پیدا نہ ہو جائے جو قابل احترام ناموں میں اپنا چہرہ چھپایا کرتی ہے"

دلی کے ہنگاموں کی تفصیل بیان کرنے سے قبل ہندوستان کے دیگر علاقوں کے حالات بیان کرنے بھی ضروری ہیں۔ رولٹ بل کونسل میں پیش ہوا۔ یکم مارچ 1919ء سے مہاتما گاندھی نے ستیہ گرہ کا اعلان کر دیا۔ 18 مارچ 1919ء کو رولٹ ایکٹ پاس ہو گیا۔ 30 مارچ کو دلی میں ہنگامے جنازے کا جلوس۔ یکم اپریل 1919ء دلی میں عام ہڑتال۔ مہاتما گاندھی 9 مارچ کو گرفتار کر لئے گئے۔ ڈاکٹر سیف

الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال گرفتار کر لئے گے۔ لاہور' احمد آباد' سورت' امرتسر میں بلوے ہنگامے۔
لاہور میں گولی چلی۔ سٹیشن لوٹ لیا گیا۔ لاہور' حافظ آباد' گوجرانوالہ میں ہنگامے
جلیانوالہ باغ میں امرتسر میں گولی چلی 2000 دو ہزار کے قریب لوگ شہید اور زخمی ہوئے۔
گوجرانوالہ میں بلوے تمام سرکاری عمارتیں جلا دیں گئی جن میں سٹیشن اور بڑا ڈاکخانہ بھی شامل تھا۔
پنجاب کے چیدہ چیدہ شہروں میں مارشل لا لگا دیا گیا۔ دہلی میں ہڑتال اور کشت وخون۔ دلی میں کشت وخون اور ہنگامے۔ دلی شہر ہنگاموں کی لپیٹ میں پوری طرح آگیا تھا۔ حکیم اجمل خان دلی کے بے تاج بادشاہ تھے۔ انکی مشاورت میں ایک کمیٹی تھی جو ہر وقت کی صورت حال حکیم صاحب کے گوش گزار کرتے تھے۔ ایجی ٹیشن کے دوران 30 مارچ 1919ء کو یوم دعا منایا گیا۔ لوگ دہلی کے ریلوے اسٹیشن کے قریب جمع ہوئے۔ جلسہ کے ساتھ ہنگانے بھی شروع ہو گئے۔ عوام پر حکومت نے گولی چلا دی۔ اس واقعہ کی تحقیقات کے لیے ایک عوامی کمیٹی تشکیل دی گئی جو حکیم اجمل خان کی زیر قیادت بنائی گئی۔
جس کے ممبران حکیم صاحب کے علاوہ رائے صاحب' پیارے لال اور رائے بہادر سلطان سنگھ تھے۔
مذید تفصیل کے ساتھ ڈاکٹر انصاری رحمتہ اللہ علیہ کے حوالے سے درج ذیل میں تمام شہر میں انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھا تھا۔ لوگ جذبانیت میں مغلوب تھے۔ حکیم اجمل خان صاحب نے اپنی بے مثل شخصیت سے کام نہ لیا ہوتا تو یقینی بات تھی کہ 1857ء کے حالات دھرائے جاتے۔ جیسا کہ قتل عام کے لیے حکومت بالکل تیار تھی۔ اس زمانے میں یوں کہنا چاہیے کہ حکیم صاحب ہی دلی کے بے تاج بادشاہ تھے۔ تمام شہر سے محلہ وار پنچایت منتخب کی گئی تھی۔ پنچایت نے حکیم صاحب کو اپنا صدر بنایا تھا اور مشاورت کے لئے پانچ آدمیوں کی کمیٹی قائم کی گئی تھی جن کے ذمہ انتظامی معاملات کے مختلف شعبے دیئے گئے تھے۔ اراکین پنچایت شہری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ تمام شہری معاملات میں پولیس اور دیگر سرکاری عملہ کو مفلوج کر دیا گیا تھا۔ حکیم صاحب کے مشورہ سے ہی ہر کام سر انجام دیتا تھا۔
وہ ایک وقت میں بہت سارے کاموں کی دیکھ بھال کی صلاحیت رکھتے تھے۔ کسی کام کو بھی ادھورا نہیں چھوڑتے تھے۔ انہیں ایام میں جب مہاتما گاندھی دلی تشریف لا رہے تھے اور راستے میں ہی گرفتار کر کے واپس بمبئی بھیج دیئے گئے تھے۔ یہ خبر جب دہلی پہنچی تو لوگ بہت مشتعل ہو گئے۔ ہڑتال ہوئی۔
جلسے ہوئے۔ جلوس نکلے شہر کی ابتر صورت حال کے پیش نظر دلی کے ڈپٹی کمشنر نے شہری انتظام کی مشاورت کے لیے ایک میٹنگ بلائی۔ جس میں حکیم صاحب بھی موجود تھے۔ دہلی ٹاؤن حال میں ڈپٹی کمشنر نے یہ اجلاس بلایا تھا۔ لوگوں میں یہ چرچہ ہو گیا کہ یہ اجلاس انگریزوں نے دھوکہ دہی کے لئے بلایا ہے اور وہ حکیم صاحب کو قتل کر دیں گے یا گرفتار کر لیں گے۔ دلی کے لوگ ٹاؤن حال کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے۔ جب لوگ بہت زیادہ ہو گئے تو حکیم صاحب کے حق میں نعرہ بازی شروع ہو گئی۔ پولیس اور فوج جو ٹاؤن حال کو گھیرے ہوئے تھی اس سے تصادم کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ یہ خبر اندر میٹنگ ہال میں انگریز ڈپٹی کمشنر تک پہنچی تو اس نے حکیم صاحب سے التجا کی وہ لوگوں کے سامنے جاویں اور انہیں سمجھائیں کہ وہ خیریت سے ہیں اور آپ لوگ پر امن رہیں

جلیانوالہ باغ

جب دلی میں تحریک زوروں پر تھی تو پنجاب میں بھی اسکے اثرات ہوئے نہایت شدو مد کے ساتھ سنٹرل پنجاب میں ہنگامے شروع ہوئے جس میں لاہور، امرتسر، گوجرانوالہ پیش پیش تھے۔ ان شہروں میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ امرتسر جلیانوالہ باغ میں ایک بہت بڑے جلسہ پر سرکار نے گولی چلا دی۔ جس سے تقریباً گیارہ سو لوگ شہید ہو گئے۔ لاہور اور گوجرانوالہ اور دیگر شہروں میں بھی چند ایک لوگ تشدد کا شکار ہوئے۔ افغانستان میں امیر حبیب اللہ کے انتقال کے بعد امیر امان اللہ بادشاہ بنے۔ یہ روشن خیال بادشاہ تھے۔ پنجاب میں حکومتی تشدد کے پیش نظر سرحدی علاقوں میں افغان بادشاہ نے صوبہ سرحد پر حملہ کر دیا۔ سرکار نے مجبور ہو کر افغان بادشاہ کی شرائط پر صلح کر لی اور امان اللہ خان افغانستان کے خود مختار بادشاہ بن گئے۔ افغانستان کے بادشاہ کی کامیابی کی صورت میں تمام ہندوستان میں خلافت کمیٹیوں نے جشن استقلال بھی منایا۔ شاہ امان اللہ خان کی کامیابی پر اسلامیان ہند بہت خوش تھے۔ جس سے آزادی کی تحریک کو یہ نقصان ہونے لگا کہ ہندو یہ سمجھنے لگ گئے شاہ افغانستان کی کامیابی اور ہندوستان میں تحریک خلافت کا زور کہیں ہندوستان میں افغانستان کی مدد سے اسلامی خلافت تو قائم نہ ہو جائے گی۔ ایسے نازک موقع پر اس خدشات کو ختم کرنے کے لیے حکیم اجمل خان صاحب اور مہاتما گاندھی جی میدان عمل میں آ گئے اور انہوں نے اپنے بیانات سے اپنی تقاریر سے فضا کو مقدر ہونے سے بچا لیا۔ تحریک خلافت اور کانگرس میں کسی قسم کی دراڑ نہ آنے دی اور افغانستان کی جنگ شہنشاہ افغانستان کی خود مختاری کے بعد ہی ختم ہو گئی اور چونکہ ہندوستان اور افغان جنگ میں انگریز سرکار کو ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔ اس وجہ سے انگریز نے اپنی حکمت عملی تبدیل کر کے اعلیٰ حضرت امان اللہ خان کی بادشاہت ہی مولویوں کے ذریعہ ختم کرا دی۔ جس سے انگریز کو تو فائدہ ہوا ہی تھا۔ ساتھ ہندو مسلم تحریک آزادی اور خلافت کو بھی نقصان ہونے سے بچ گئی اور ساتھ ہی مہاتما گاندھی اور حکیم اجمل خان صاحبان نے کانگرس اور خلافت کا ایک مشترکہ اجلاس بلایا جس میں گاندھی جی نے ایک مدلل تقریر کی۔ جس سے ہندو مسلمان بھائی چارہ کو مزید مضبوط کیا گیا۔ خلافت کی تحریک کے لیے اپنی غیر مشروط حمایت کا یقین دلایا گیا۔ یورپ کی جنگ میں انگریز کو فتح ہو چکی تھی۔ خلافت ترکیہ کو شکست ہو چکی تھی۔ حکومت ہند جشن فتح منانا چاہتی تھی۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں فیصلہ کیا گیا کہ حکومت ہند جو فتح کا جشن منا رہی ہے اس میں شرکت ہرگز نہ کی جائے اور ساتھ ہی انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔ جلیانوالہ باغ میں جو گولی چلائی گئی تھی اور پنجاب اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں جو پر تشدد واقعات ہوئے تھے۔ جن میں ہزاروں لوگ شہید زخمی اور قید ہوئے تھے۔ حکومت نے اسکی اشک شوئی کے لیے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی۔ جس کا نام ہنٹر کمیٹی رکھا گیا تھا۔ جس نے ایک رپوٹ حکومت ہند کو پیش کرنی تھی۔ عوام نے ہنٹر کمیٹی کا بائیکاٹ کیا۔ لیکن سرکار کی بنائی ہوئی کمیٹی میں بھی ہندوستانی ممبران نے اختلاف کیا اور متفقہ رپورٹ ہنٹر کمیٹی پیش نہ کر سکی۔

1920ء میں امرتسر میں کانگرس اور مسلم لیگ کے اجلاس ہوئے۔ کانگرس کے صدر موتی لعل نہرو بنے۔ جبکہ مسلم لیگ کے صدر حکیم اجمل خان بنے۔ حکیم صاحب نے ایک مشترکہ اجلاس میں

مسلمانان ہند سے اپیل کی کہ وہ عید قربان کے موقعہ پر گائے کی قربانی رضاکارانہ طور پر نہ کریں۔ اس لئے کہ ہم چاہتے ہیں کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ہر اس عمل سے پرہیز کریں جو لوگوں میں وجہ منافرت بنتا ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ عملی قدم اسکا یہ ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے ہندوؤں کے مقدس شہروں میں زبیحہ گائے نہ کیا جائے اور بعد میں سارے ملک میں اس پر عمل کیا جائے۔ لیگ کے پلیٹ فارم سے زبیحہ گاؤ کی ممانت کو ایک اچھا عمل قرار دیا گیا اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے نیک شگون سمجھا گیا۔ حکیم اجمل خان کے اس اقدام کو بہت اچھا قدم قرار دیا گیا اور گاندھی جی نے بھی بہت ہی تعریف کی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد علی برادراں بھی رہا کر دیے گئے ہند و مسلم اتحاد کی جس جدوجہد کی وہ آبیاری کرتے رہے تھے وہ حکیم اجمل خان صاحب کی کوشش اور ہمت سے ایک درخت بن چکا تھا۔ مگر ہند میں ابھی خلافت کے مسئلہ پر مسلمانوں میں ہیجان موجود تھا۔ برطانیہ نے خلافت ترکیہ کے حصے بخرے تو کر ہی لئے تھے مگر اب خلافت کو قائم رکھنے کے لئے مسلمانان ہند جدوجہد میں مصروف تھے اور کانگرس بھی اس مسئلہ پر مسلمانوں کی ہمنوا تھی۔ ماہ جنوری 1920ء کو ہی ایک وفد ڈاکٹر انصاری کی زیر قیادت وائسرائے ہند کے پاس ترکی کے ساتھ شرائط صلح کے متعلق عرض حال بیان کرنے گیا۔ اس وفد کی واپسی پر عام مسلمان جماعتوں کی طرف سے اعلان کیا گیا۔ صلح کی شرائط پر اگر مسلمان ہند کے جذبات کا احترام نہ کیا گیا تو مسلمانوں کی وفاداری پر ناقابل برداشت بوجھ پڑے گا۔ اور حکیم اجمل خان صاحب نے ایک اجلاس میں حکومت ہند کے عطا کردہ خطاب حاذق الملک اور تحفہ قیصر ہند واپس کر دیے۔ حکیم صاحب کے خطاب واپس کرنے کے بعد کئی اور لوگوں نے بھی خطاب واپس کر دیے۔ اس زمانے میں بعض علمائے ہند نے ہجرت کا فتوی جاری کر دیا اور کئی لوگ ہجرت کر کے کابل افغانستان روانہ ہو گئے۔ تحریک ہجرت کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

سوہن سنگھ بھکنا،

کرتار سنگھ سرابھا،

کانگریس اور مسلم لیگ کا مشترکہ اجلاس

مئی 1924ء میں مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس ایک حال میں ہوا۔ اس اجلاس میں مولانا محمد علی جوہر' مسٹر آصف علی اور چند ایک دیگر کانگرسی ارکان شامل ہوئے۔ جس میں قرار دادیں منظور کی گئیں۔ جس میں قرارداد کی شکل میں مندرجہ ذیل مطالبات گورنمنٹ کے آگے پیش کئے گئے۔

نمبر1 فیڈرل طرز حکومت ہونا چاہیے۔
نمبر2 جداگانہ طریقہ انتخاب ہونا چاہیے۔
نمبر3 جو فرقہ کسی صوبہ میں اکثریت رکھتا ہو اسکو اقلیت یا مساوات میں تقسیم نہ کیا جائے۔
نمبر4 بہت چھوٹی اقلیتوں کو جو موثر نمائندگی حاصل نہ کر سکتی ہوں نمائندگی کے معاملہ میں خاص رعائت دی جائے۔
نمبر5 صوبہ سرحد سمیت مسلمان اکثریت کے صوبوں کی تعداد تین کر دی جائے۔

اس قرار داد کے بعد اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ 1916ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کے مشترکہ اجلاس میں جو عدم تعاون کی قرار داد منظور کی گئی تھی۔ وہ علمائے ہند کا فتویٰ بھی تھا کہ جو مسلمان جنگ میں سرکار انگلشیہ کے ساتھ تعاون کرے گا جنگ میں سرکار کی مدد کرے گا وہ اسلام کا غدار کافر ہو گا۔ مگر ہندوستان کے اسی فی صد مسلم لیگیوں نے انگریز سرکار کی حمایت کی تھی اور جنگ میں ہر طرح کا تعاون کیا تھا اور انعام و اکرام حاصل کئے تھے۔

نہرو رپورٹ

1927ء کی ایک شام مسٹر محمد علی جناح اور موتی لال نہرو کی ملاقات ہوئی۔ دونوں ہی سنٹرل اسمبلی کے ممبر تھے۔ مسٹر نہرو نے کہا کہ اگر آپ جداگانہ انتخاب کے مطالبہ سے دست بردار ہو جاویں تو میں کانگرس سے آپ کے تمام مطالبات منظور کرا دیتا ہوں۔ مسٹر جناح مان گئے۔ پھر ایک کانفرنس بلائی گئی جس میں ہندوستان بھر کے چیدہ چیدہ مسلمان لیڈر بلائے گئے۔ جن میں مولانا محمد علی جوہر' سر علی امام راجہ آف محمود آباد' مفتی کفائیت اللہ صاحب' ڈاکٹر انصاری' سر محمد شفیع بھی شامل تھے۔ ان لیڈران کے کئی اجلاس ہوئے۔ کانفرنس کا منظور کردہ فارمولا شائع کیا گیا۔ جسے نہرو رپورٹ بھی کہا جاتا ہے۔

نمبر1 سندھ کو صوبہ بمبئی سے الگ کر کے صوبہ بنا دیا جائے۔
نمبر2 صوبہ سرحد اور بلوچستان کو آئینی اصلاحات نافذ کر کے دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ دیا جائے۔
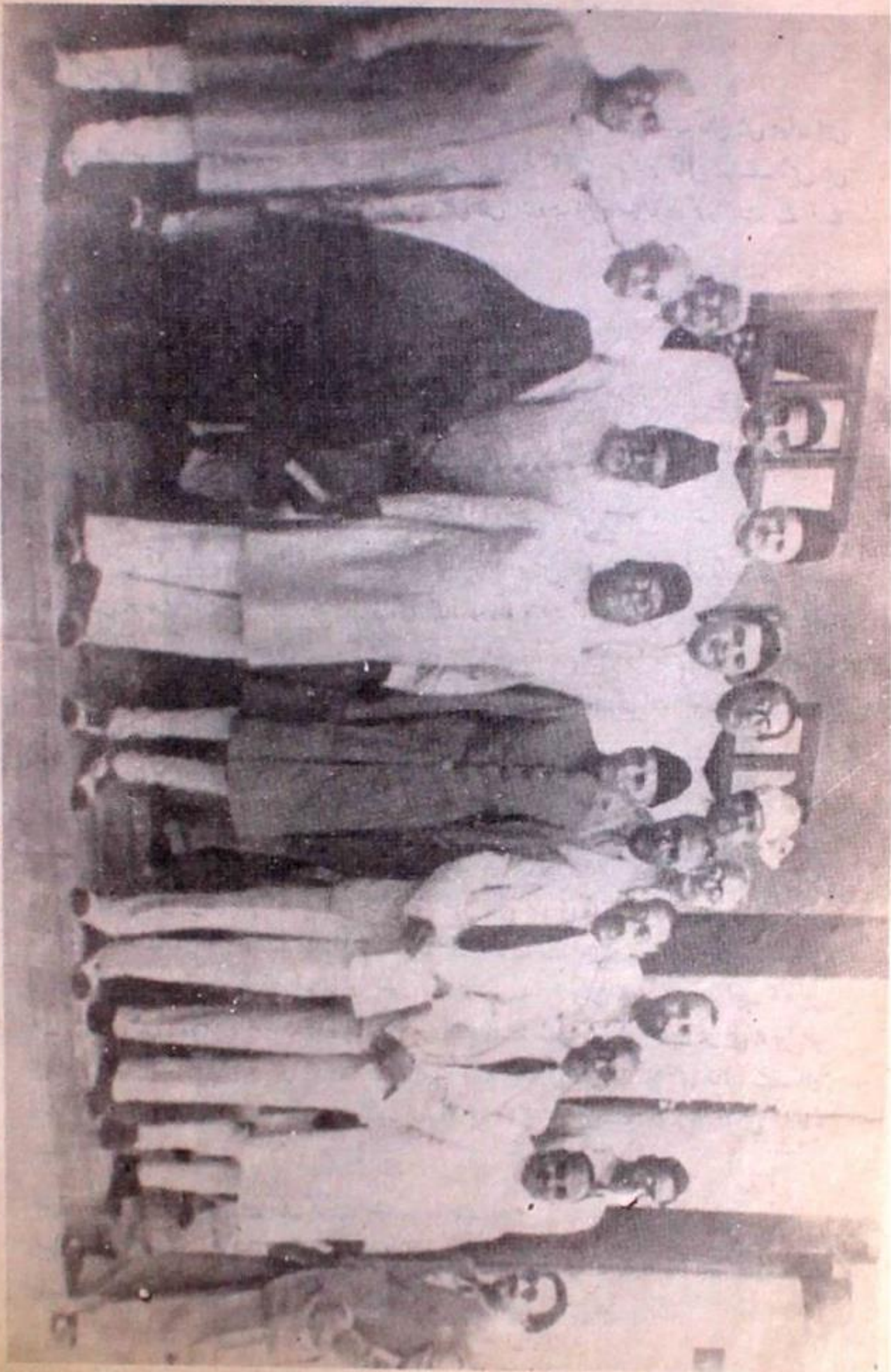
قائد اعظم محمد علی جناح مسلم لیگی رہنماؤں کے ساتھ

نمبر3 اس صورت میں تمام مسلمان مخلوط طریقہ انتخاب منظور کر لیں گے۔
نمبر4 . سندھ صوبہ سرحد بلوچستان میں مسلمان ہندو اقلیت کو وہی مرعات دیں گے جو ہندو صوبوں میں مسلمان اقلیت کو حاصل ہونگے۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لئے مخلوط طرز انتخاب کی بنا پر ملکی آبادی کے تناسب کے مطابق نشتیں مخصوص ہوں گی اور مرکزی اسمبلی میں ان کے لئے کم از کم ایک تہائی نشستیں محفوظ ہوں گی۔

دھلی اجلاس میں یہ تجاویز منظور ہو گئیں تھیں جب یہ خبر اخبار میں چھپی تو پنجاب کے مسلم لیگی لیڈران نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مخلوط طریقہ انتخاب ہرگز نہ مانیں گے۔دہلی تجاویز کے خلاف سر فضل حسین' سر محمد شفیع' سر ڈاکٹر محمد اقبال پیش پیش تھے۔ انہوں نے کئی اجلاس کئے۔ اخباری بیانات دیے۔ مسٹر جناح نے بھی دہلی تجاویز منوانے کی بہت کوشش کی مگر بلاخر یہ تجویز پروان نہ چڑھ سکی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ مخلوط انتخاب کی وجہ سے پنجاب کے سرکار پرست الیکشنوں میں ہرگز کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔ اس لئے کہ پنجاب کے زمیندار اور جاگیردار طبقہ ہندو مسلم مخالفت پیدا کر کے ہی اپنی چودھراہٹ قائم رکھ سکتا تھا۔ بصورت دیگر یہ لوگ کسی صورت بھی لوگوں میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکتے۔ مخلوط طریقہ انتخاب میں قوم پرست جماعتیں یا وہ لوگ جو ہندو مسلم اتحاد کے دعوے دار تھے کامیاب ہوتے تھے۔ ایسی صورت حال میں پنجاب میں کانگرس یا مجلس احرار یا جمیعت العلمائے ہند کے لوگ کامیاب ہوتے تھے۔ اس وجہ سے پنجاب کے مسلم لیگیوں نے نہرو رپورٹ کے خلاف شور مچانا شروع کر دیا۔ سرکار بھی یہی چاہتی تھی کہ ہندو مسلم آپس میں ہی لڑتے رہیں اس لئے نہرو رپورٹ یا اعلان دہلی ناکام ہو گیا

سائمن کمیشن کا ہنگامہ

ہندوستان کی تحریک آزادی کے بڑے ادوار گزرے ہیں۔ جن میں کئی ہنگامے ہوئے' کئی تحریکیں چلیں' مقصد مقدم صرف ایک تھا کہ کسی طرح ہندوستان پر سے بدیشی راج ختم کیا جائے۔ لیکن یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ تحریک آزادی کے ہر دور نے آنے والے وقت کے لئے نئی راہیں بھی کھولی ہیں اور کچھ مشکلات بھی پیدا کی ہیں۔ بیسوی صدی کے شروع سے لے کر سائمن کمیشن کے ہندوستان میں آنے تک کئی تحریکوں نے جنم لیا۔ مدہم ہوئی' ختم ہوئی۔ پھر ایک نئی تحریک گزشتہ تحریکوں کے نقش پا پر چل نکلی۔ انہیں تحریکوں میں سائمن کمیشن کا ہنگامہ بھی تھا۔ گذشتہ تحریکوں کے ثمر کے طور پر ہی سائمن کمیشن قائم ہوا تھا۔ اس کمیشن کے ممبران برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے دو ممبروں کے اس کمیشن کے سربراہ سر جان سائمن تھے۔ اس نسبت سے اسے سائمن کمیشن کہا جاتا تھا۔ اس کمیشن کا مقصد ہندوستان ہی میں دورہ کر کے یہ معلوم کرنا تھا کہ ہندوستان کے عوام کو کس قسم کے آئینی اختیارات کے جاویں۔ دوسرے لفظوں میں ہندوستان کے عوام کو اپنے مسائل۔
خود سلجھانے کے متعلق آئینی اختیارات دیے تھے۔ اس کمیشن کا جب اعلان کیا گیا تو اس میں

ہندوستانی ممبر کوئی نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے صدر مسٹر جناح نے بھی اور کانگرس اور دیگر جماعتوں نے اعتراض کیا کہ ہندوستانی معاملات سلجھانے کے لئے ہندوستانی کے لوگوں کو آئینی اختیارات دینے کے لئے کمیشن بنایا گیا۔ لیکن اس میں ہندوستانی نمائندہ کوئی بھی نہیں رکھا گیا۔ احتجاج کے طور پر کمیشن کا بائیکاٹ ہندوستان کی تقریباً" تمام جماعتوں نے کیا اور ہندوستان کی سنٹرل پارلیمنٹ میں سائمن کمیشن کے خلاف ایک قرار داد ہندوستانی ممبران نے اکثریت کے ساتھ پاس کی۔ اس قرارداد کے محرک مسٹر جناح ہی تھے۔ اس قرارداد کی منظوری کے بعد اور تمام سیاسی پارٹیوں کے بائیکاٹ کے بعد قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ جس جگہ بھی یہ کمیشن گیا۔ وہاں لوگوں نے کالی جھنڈیوں سے استقبال کیا۔ ہنگامے ہوئے۔ جلوس نکالے گئے اور جلسے بھی ہوئے۔ سائمن کمیشن فروری 1928ء کو ہندوستان میں آگیا تھا۔ مگر کسی شہر کا کوئی دورہ کمیشن نے ستمبر تک نہیں کیا۔ کمیشن کے ممبران اپنے طور پر ہی افسران وغیرہ سے مل کر معلومات جمع کرتے رہے۔ ہندوستانی معاملات کا حل ڈھونڈتے رہے۔ مگر جب ملک بھر کا دورہ انہوں نے ستمبر 1928ء سے شروع کیا۔ کمیشن جس جگہ بھی جاتا سرکاری افسران اور سرکار پرست لوگ اس کا خوش دلانہ استقبال کرتے۔ جبکہ عوام کالی جھنڈیوں سے استقبال کرتے۔ کئی جگہ ہنگامے بھی ہوئے اور لوگوں پر لاٹھی چارج بھی ہوا۔ لکھنؤ میں بائیکاٹ کے جلوس کی قیادت پنڈت جوہر لال نہرو اور گوبند بھلہ پنٹ نے کی تھی۔ سرکاری پولیس نے جلوس پر لاٹھی چارج کیا۔ جس میں پنڈت جوہر لال نہرو اور پنڈت گوبند بھلہ پنٹ بھی مضروب ہوئے تھے۔ یہ دونوں حضرات پنڈت نہرو آزاد ہندوستان کے وزیراعظم بنے تھے۔ جبکہ گوبند بھلہ پنٹ یو پی کے وزیراعلیٰ اور بھارت کے بعد میں وزیر داخلہ بھی رہے۔

اور جب سائمن "کمیشن ماہ اکتوبر میں لاہور آیا تو اس میں بھی استقبال کرنے والے افسران اور سرکار پرست لوگ ہی تھے۔ جبکہ کالی جھنڈیوں سے سائمن کمیشن گو بیک کہنے والے عوام تھے۔ ایک لطیفہ بھی اس زمانے میں مشہور ہوا کہ خوش دلانا استقبال کرنے والے افسران کے ساتھ جن میں سرکار پرست لوگ تھے ن میں مولوی غلام محی الدین قصوری ایڈووکیٹ بھی شامل تھے۔ مولوی قصوری کا قد چھوٹا تھا لوگ سائمن کمیشن گو بیک اور مولوی قصوری دلا کہتے۔

اب دلا پنجابی میں گالی ہے مگر مولوی قصوری اپنے نام کے ساتھ دلا کی گالی سن کر خوش ہوتے اور لوگوں کا جھک کر شکریہ کرتے اور کمیشن کے ممبران کو یہ تاثر دیتے کہ لوگ میری بہت عزت کر رہے ہیں۔ دلا کہنے سے میرا احترام کیا جا رہا ہے۔ کمیشن کے ممبران نے سمجھ لیا کہ پنجابی زبان میں لفظ دلا احترام کا لفظ ہے۔ اسی روز شام کو جب مسٹر سائمن کی ملاقات سر فضل حسین وزیراعلیٰ پنجاب سے ہوئی تو مسٹر سائمن نے سر فضل حق کو یوں مخاطب کیا۔ ہیلو مسٹر سر فضل حسین دلا" سر فضل حسین کے کان کھڑے ہو گئے۔ کچھ حیران بھی ہوئے اور وہ یہ سن بھی چکے تھے مولوی محی الدین قصوری کو لوگ دلا کہتے رہے ہیں تو فوراً" سر فضل حسین نے مسٹر سائمن سے کہا کہ دلا پنجابی زبان میں چھوٹے قد

والے لوگوں کے لئے عزت کا لفظ ہے۔ لمبے قد والوں کے لیے نہیں ہے۔ سائمن کمیشن گو بیک کہنے والے دیگر جگہوں کی طرح پنجاب میں بھی بہت تھے۔ یہ کمیشن جب ریل کے ذریعے لاہور پہنچا تو خوشدلانہ استقبال پنجاب گورنمنٹ کے افسران کے ساتھ سرکار پرست لوگوں نے کیا مگر کانگریس اور خلافت نے کالی جھنڈیوں سے استقبال کیا۔ اور بہت بڑا جلوس ریلوے سٹیشن کی طرف لنڈا بازار کی جانب بڑھا۔ جس کی قیادت مولانا ظفر علی' مولانا عبدالقادر قصوری' لالہ لاجپت رائے اور دیگر کئی لیڈروں نے کی۔ جلوس جب لنڈا بازار سے گزر کر اسٹیشن کے قریب پہنچا تو سائمن کمیشن کے خلاف پورے جوش وجذبہ کے ساتھ نعرے بازی شروع ہو گئی۔ پولیس نے جلوس کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے لاٹھی چارج کر دیا۔ جس سے اور لوگوں کے علاوہ لالہ لاجپت رائے بھی زخمی ہوئے اور انہیں دل پر سینے پر چوٹیں لگیں۔ وہ عمر رسیدہ تھے انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں یہ کہا تھا کہ میری سینے پر لگی ہوئی پولیس کی چوٹ امپیریزم کے محل میں آخری کیل ثابت ہو گی اور بلاخر وہ پولیس کی اس چوٹ سے جانبر نہ ہو سکے اور سورگ باش ہو گئے۔ لالہ لاجپت رائے کی پولیس تشدد کی وجہ سے موت کوئی معمولی واقع نہ تھا سارے ہندوستان میں اس موت پر آنسو بہائے گئے اور سوگ منایا گیا۔ اس موت کی وجہ سے نوجوانوں میں بھی ہیجان پیدا ہوا۔ خفیہ طور پر انتقام کی آگ سلگنے لگی۔ خفیہ دہشت پسند تنظیم قائم ہو گئی۔ ایک ماہ بعد لاہور کے ایس ایس پی کے دفتر کے باہر مسٹر سانڈرس جس کے حکم سے جلوس پر لاٹھی چارج ہوا تھا اسے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا اور قاتل فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس قتل کے شبہ میں کئی نوجوان پکڑے گئے مگر سب بے گناہ تھے۔ پھر چند ماہ بعد سنٹرل پارلیمنٹ کے ایک اجلاس پر بم دھماکہ ہوا جس میں دو ملزم پکڑے گئے۔ یہی سانڈرس کے قاتل تھے۔ انہوں نے ہی لالہ لاجپت رائے کا بدلہ لیا تھا۔ یہ تھے بھگت سنگھ اور دت ان پر مقدمہ چلا اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔
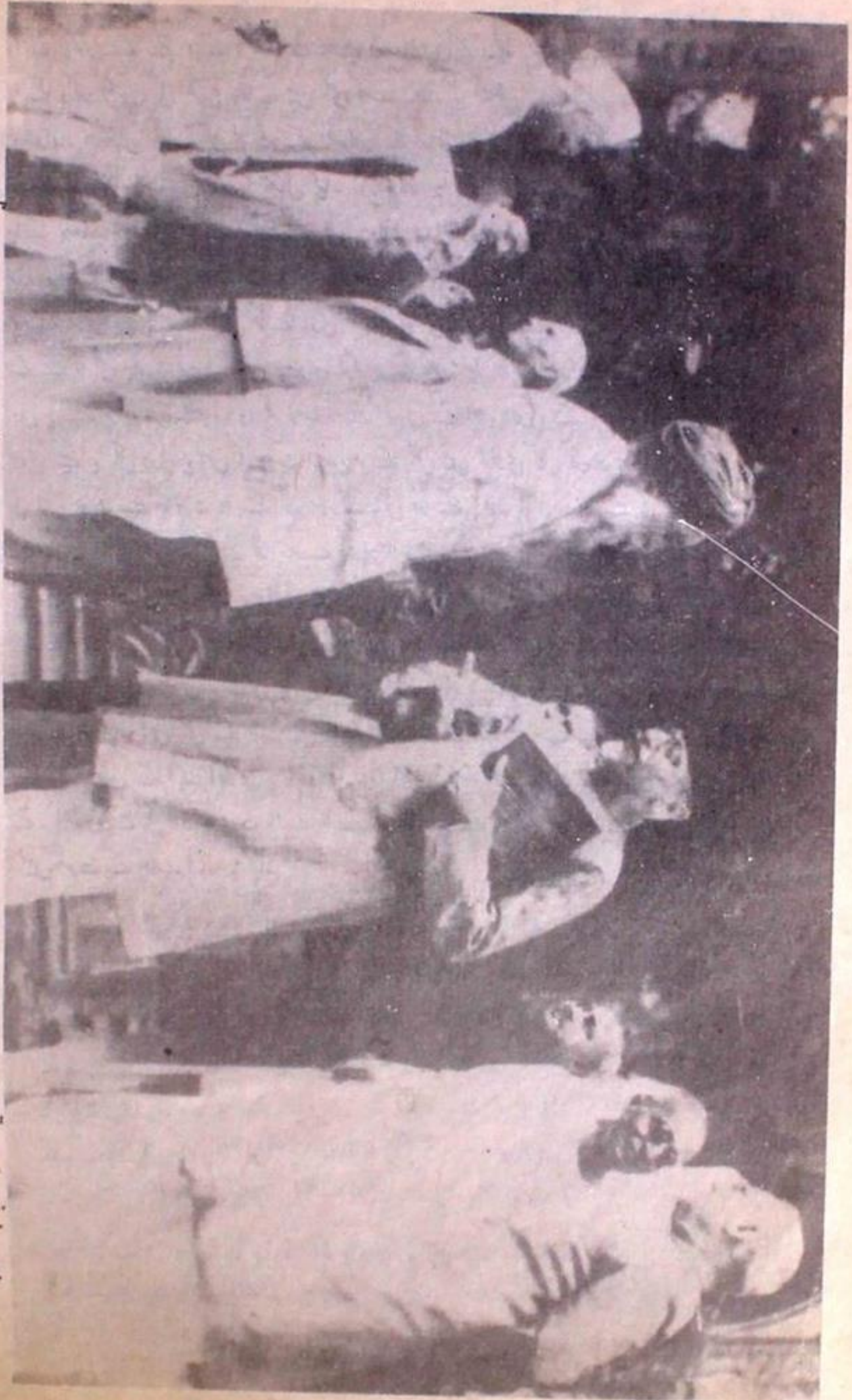
شملہ کانفرنس کے موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام ازاد، ماسٹر تارا سنگھ، قائد اعظم محمد علی جناح اور خواجہ ناظم الدین

تحریک خلافت

1918ء جنگ عظیم اول کا خاتمہ کے ساتھ ہی خلافت عثمانیہ کو بھی شکست ہو گئی۔ جرمن اور ترکی جنگ عظیم میں حلیف تھے۔ اس جنگ میں تمام اقوام یورپ اور جو بھی اقوام یورپ کے مقبوضات بشمول ہندوستان کی حکومت بھی جرمنی اور ترکی کے خلاف جنگ میں بر سرپیکار تھے۔ اس جنگ کے اختتام پر جرمن کے شکست کے ساتھ ہی ترکی کو بھی شکست ہو گئی۔ اس شکست کو عالم اسلام میں بہت محسوس کیا گیا اور مرکز اسلام جو کہ تیرا سو سال سے چلا آ رہا تھا وہ ختم ہو گیا اور جنگ میں جن ممالک نے جنگ لڑی تھی ان میں بڑی طاقتیں فرانس اور برطانیہ ہی تھیں اور دنیا میں برطانیہ کے مقبوضات زیادہ تھے۔ برطانیہ کو ہی اس وقت بڑی طاقت دنیا میں سمجھا جاتا تھا اور برطانوی فوجوں نے ہی اس جنگ کو فتح کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور فاتح فوجوں میں کثیر تعداد بھی پنجابی افواج کی ہی تھی اور جن میں نادانستہ طور پر زیادہ مسلمان ہی تھے۔ پنجاب کے مشائخ اور زمینداروں نے لاکھوں لوگوں کو فوج میں بھرتی کر کے انگریز کی طاقت بڑھائی اور خود انعامات اور خطابات حاصل کئے۔ جب بعض فوجیوں کو پتا چلا کہ ہمیں خلافت اسلامیہ کو منتشر کرنے کے لیے جنگ میں شامل کیا گیا ہے تو انکے دل دھل گئے۔ پھر پنجاب کے مشائخ حضرات نے انگریزی فوج کی مسلمان سپاہ میں تعویز تقسیم کئے کہ وہ تعویز بازوؤں پر باندھ کر گلے میں ڈالکر بے دھڑک ترکوں کی فوج کے خلاف حملہ آور ہوں انہیں اس جنگ میں کوئی گناہ نہیں ہو گا۔ بلکہ ایک فاسق' فاجر ترکی حکومت کو ظالم حکومت کو ختم کرنے کا ثواب ہی ہوگا اس طرح خلافت اسلامیہ ترکیہ کے خلاف جنگ میں خلافت اسلامیہ کو ختم کرنے میں اہم کردار بھی پنجاب کے جاگیردار مشائخ اور بیورو کریٹ مسلمانوں نے ہی ادا کیا تھا اور اس خدمت کے عوض سرکار برطانیہ سے خطابات اور انعامات حاصل کئے۔ آج بھی حکومت پاکستان پر انہیں جاگیردار مشائخ اور بیورو کریٹ خاندانوں کا ہی قبضہ ہے۔ وہ ہی اپنے آپکو اسلام اور مسلمانوں کے سربراہ کہلواتے ہیں۔

جنگ عظیم اول ہندوستان کے مسلمان جذباتی طور پر سرکار برطانیہ کے خلاف تھے۔ ان جذبات کو ابھارنے والے علمائے دیوبند تھے۔ جو یہ سمجھتے تھے کہ اسلامیان مسلمانوں کی تکالیف اور شکست و ریخت کا ذمہ دار سرکار برطانیہ ہے اور سامنے نظر بھی آ رہا تھا کہ خلافت عثمانیہ کے کئی ٹکرے ٹکرے کر دیے گئے۔ کچھ مسلم ممالک پر فرانس قابض ہو گیا تھا بقایا حصہ پر برطانیہ قابض ہو گیا۔ دیگر کچھ

حصوں پر برطانیہ سرکار نے اپنے تابعہ دار حکمران بنا دیے۔ دیگر یہ کہ مسلمانوں کے تین مرکز دنیا میں مانے جاتے ہیں۔ نمبر1 مکہ مکرمہ شریف' نمبر2 مدینہ منورہ روضہ رسول اکرم' نمبر3 مرکز خلافت

قرآن کریم میں جہاں خداوند کریم کی تابعہ داری کا حکم ہے وہاں پر حضور علیہ السلام کی تابعہ داری کا حکم بھی دیا گیا اور ساتھ خلیفتہ المسلمین کی تابعہ داری کا حکم بھی اسی طرح ہے اور خلیفتہ المسلمین کو اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اب جبکہ برطانوی سرکار نے مرکز خلافت کو ہی ختم کر دیا ہے تو مسلمانوں میں ہیجان کا آنا قدرتی بات تھی اور اس ہیجان کے زیادہ اثرات ہندوستان میں پیدا ہوئے اور علمائے دیوبند نے پیدا کئے۔ دیگر عقائد کے علماء بریلوی یا شیعہ حضرات نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے برطانوی سرکار کی مخالفت نہیں کی۔ ویسے دلی ہمدردی وہ بھی خلافت اسلامیہ کے ساتھ ہی رکھتے تھے اور خلافت کی بقا کے لیے دعاگو بھی تھے۔ خلافت اسلامیہ ترکیہ کا تسلسل حضور علیہ السلام کے ساتھ ہی جا کر ملتا ہے۔ حضور علیہ السلام کے اس دنیا سے رخصت فرمانے کے بعد خلافت راشدہ قائم ہوئی۔ خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق بنے۔ خلافت راشدہ کے بعد خلافت بنو امیہ قائم ہوئی جس کے بانی حضرت امیر معاویہ تھے۔ معاویہ اور آل مرواں کی حکومت کا خاتمہ 132 ہجری میں ہوا۔ پھر خلافت اسلامیہ بنو عباس کے پاس چلی گئی۔ جس کے بانی سفاح تھے۔ مگر عملی طور پر پہلے خلیفہ منصور قرار دیے گئے۔ بنو عباس کی خلافت عملی طور پر 632 ہجری تک قائم رہی۔ جس کا پایہ تخت بغداد تھا۔ تاتاریوں کے حملہ سے بغداد تباہ ہو گیا۔ خلافت عباسیہ کو شکست ہو گئی۔ خلیفتہ المسلمین قتل کرا دیے گئے۔ مگر شاہی خاندان کے کچھ لوگ اپنی جانیں بچا کر مصر پہنچ گئے۔ جنہوں نے خلافت عباسیہ حکمرانی کے بغیر ہی قائم کر لی اور یہ خلافت بھی مرکز اسلام ہی سمجھی جاتی تھی۔ دیگر مسلمان حکومتیں جو کہ اس وقت مختلف جگہوں پر بشمول ہندوستان کے قائم تھیں۔ انہیں مصر کی اس بے اختیار خلافت سے سند عطا کی جاتی تھی۔ پھر دنیا کی تمام مساجد میں سلطان وقت کے ساتھ ساتھ خلیفتہ المسلمین کا خطبہ بھی پڑھا جاتا تھا۔ آٹھویں صدی ہجری میں ترکی کے سلطان سلیم نے بہت سارے اسلامی ممالک کے ساتھ مصر پر بھی قبضہ کر لیا تو پھر عباسی خلیفہ جو کہ اس وقت مصر میں تھا اور بے اختیار بھی تھا۔ اس کے پاس طاقت بھی نہ تھی اسنے سلطان سلیم اول کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور خلافت اسلامیہ کے تمامتر تبرکات بھی سلطان سلیم اول کے سپرد کر دے۔ اس طرح آٹھویں صدی میں اسلامیان عالم کا مرکز خلافت اسلامیہ ترکیہ عثمانیہ کو قرار دیا گیا۔ اس خلافت اسلام کے خلاف انگریزوں نے جنگ کی اور انگریز حکومت کے معاون ہمارے ملک کے بڑے بڑے زمیندار جاگیردار مسلمان تھے۔ جنہوں نے اس جنگ میں سرکار برطانیہ کی مدد کر کے خطابات حاصل کئے' زمین' جاگیریں بھی حاصل کیں۔ مسند سرکار بھی حاصل کئے اور عام مسلمان اور تحریک آزادی کے ساتھ وابستہ لوگ اسی خلافت کو بچانے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں' تحریک چلا رہے ہیں' جیلوں میں جا رہے ہیں' مال و دولت نچھاور کر رہے ہیں۔ شہید ہو رہے ہیں۔ جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر خطرات کا سامنا کر رہے ہیں۔ اور جو لوگ اس وقت انگریز کے طرف دار تھے خلافت کو ختم کر کے فوائد حاصل کر رہے تھے۔ وہی لوگ اس وقت مسلمانوں کے

قائد بھی ہیں یہ سیاست کے کمال ہیں۔

ذرائع ابلاغ کی جادوگری ہے کہ جو لوگ بیسوی صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرہ میں خلافت اسلامی ترکی کو ختم کرنے والے تھے۔ نیست و نابود کرنے والے تھے۔ وہی بیسوی صدی کے دوسرے پچاس سالوں میں آزاد پاکستان میں مسلمانوں کے ہیروز بھی بنتے ہیں۔ رہبر بھی کہلاتے ہیں۔ مسند اقتدار پر بھی قابض ہیں۔ ہر قسم کی آسائشیں بھی انہیں کے لئے ہیں اور جو لوگ خلافت اسلامیہ ترکیہ کے حامی تھے' بچانے والے تھے' اسلامی اقدار پر جانیں نچھاور کرنے والے تھے' قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والے تھے' تحریک آزادی میں تن من دھن قربان کرنے والے تھے' انہیں خیالات کے ورثاء کو آج پاکستان میں غدار کہا جاتا ہے۔ 1914ء کی جنگ کے دوران ہی مسلمانان ہند نے سرکار برطانیہ کے ساتھ کسی قسم کے تعاون نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ماسوائے ان لوگوں کے جو سرکار کے حامی تھے۔ باقی مسلمانان ہند نے جنگ عظیم اول کے دوران سرکار کے خلاف بھرپور عدم تعاون کیا۔ کسی قسم کا سرکار انگلشیہ کے ساتھ تعاون نہ کیا۔ نہ ہی فوجی بھرتی کی اور نہ ہی فوجی سازو سامان ہی بنا کر دیا اور عدم تعاون ایک مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے کیا اور ہندوستان بھر کے ہزاروں علمائے دیو بند نے فتویٰ جاری کیا تھا کہ سرکار برطانیہ خلافت اسلامیہ ترکیہ کے خلاف بر سر پیکار ہے۔ ازروئے اسلام سرکار برطانیہ کی اطاعت کفر ہے۔ اس لئے جنگ عظیم میں مسلمانان ہند کسی قسم کا تعاون سرکار انگلشیہ کے ساتھ نہ کریں۔ یہ تمام عوامل تحریک خلافت کا باعث بنے اور پھر تحریک خلافت میں ہندوؤں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ ہی سرکار برطانیہ کے خلاف جلوس یا جلسے ہوتے تھے۔ تحریک خلافت کی راہنمائی جہاں مسلم اکابرین کرتے تھے وہ مہاتما گاندھی بھی راہنمائی میں شامل ہوتے تھے۔

خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس 23 نومبر 1919ء کو دہلی میں منعقد ہوا۔ بنگال کے مولوی فضل الحق نے صدارت کی۔ مہاتما گاندھی کے علاوہ حکیم اجمل خان' ڈاکٹر ایم اے انصاری' مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی اور دیگر اکابرین ہند نے شرکت کی۔ فیصلہ ہوا کہ حکومت ہند کے خلاف تحریک عدم تعاون چلائی جائے اور یہ تحریک عدم تشدد پر ہو گی۔ تحریک کے مقاصد یہ تھے۔

1:- ترکی کی خلافت قائم رکھی جائے۔

2:- مسلمانوں کے مقدس مقامات ترکوں کی حفاظت میں رہیں۔

3:- ترکوں کی سلطنت کی حدود وہی رہنے دی جائیں جو جنگ سے پہلے تھیں خلافت کمیٹی کے پہلے اجلاس میں تہ پایا کہ مسلمان جشن فتح میں شرکت نہیں کریں گے۔ اگر انکے مطالبات منظور نہ ہوئے تو وہ حکومت سے ترک موالات کریں گے اور برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ کریں گے۔ کانگرس نے بھی اس تحریک خلافت کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔

جنگ برطانیہ کی فتح اور خلافت ترکیہ کی شکست کے بعد ہندوستان میں ہر طرف ہیجان پیدا ہو گیا۔ تحریک خلافت کانگرس کے اشتراک سے میدان عمل میں آ چکی تھی۔ تحریک خلافت اور سیاسی جدوجہد کو کچلنے کے لئے سرکار نے رولٹ ایکٹ پاس کیا۔ جس کے خلاف ملک بھر میں مظاہرے شروع

ہو گئے۔ جس کے نتیجہ میں پنجاب کے چار اضلاع میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ امرتسر' جلیانوالہ باغ میں گولی چلی جس سے تقریباً گیارہ سو لوگ شہید ہو گئے اور تین ہزار آدمی زخمی ہوئے تھے۔ دسمبر 1919ء کے آخری ہفتہ میں کانگرس اور خلافت کمیٹی کے علاوہ مسلم لیگ کا اجلاس بھی منعقد ہوا۔ علی برادران مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی چھدواڑہ جیل سے رہائی کے بعد سیدھے امرتسر کے اجلاس میں شامل ہونے کے لئے پہنچ گئے۔ کانگرس مسلم لیگ خلافت کمیٹی کے مشترکہ اجلاس میں خلافت ترکیہ کی شکست سے عالم اسلام میں جو مایوسی اور رنج پیدا ہوا اس سے حکومت ہند کو آگاہ کیا گیا۔ قرارداد منظور کی گئی۔

جس وقت سے اتحادی قوموں نے جرمنی اور ترکی کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا جنگ عظیم اول شروع ہو گئی تھی تب سے ہی عالم اسلام میں اضطراب اور رنج شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ 15 جنوری 1918ء کو ایک اعلان کے ذریعے برطانوی وزیراعظم مسٹر جارج نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ ہم ترکی کے خلاف جنگ نہیں لڑ رہے بلکہ جرمنی کے بادشاہ قیصر ثانی کی توسیع پسندی کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ ترکی جن علاقوں پر قابض ہے وہ اسی کے پاس رہیں گے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ جنگ تو صرف ترکی حکومت کے خلاف ہے۔ خلافت ترکیہ کے خلاف نہیں اور وعدہ کیا کہ مقامات مقدسہ کی توہین نہیں کی جائے گی بلکہ مقامات مقدسہ کا احترام یقینی بنایا جائے گا۔ برطانوی حکومت نے یہ وعدہ کسی حد تک پورا کیا۔ اس نے ترکی کے زیر حکومت مسلمان علاقوں پر از خود حملہ نہیں کیا بلکہ اپنے حمائتیوں کے ذریعے ان ملکوں میں ہی خلافت ترکیہ کے خلاف بغاوت کرا دی۔ جس کے نتیجہ میں مشرق وسطیٰ کے تمام ملک خلافت ترکیہ کے قبضہ سے نکل گئے۔ حجاز مقدس' عراق پر شریف خاندان کی حکومت قائم کر دی گئی۔ شام' لبنان' فرانس کے قبضہ میں چلے گئے۔ ترکی کی شکست کے بعد دیگر ممالک جو کہ خلافت کے زیر نگیں تھے مکمل خود مختار ہو گئے۔ ترکی پر خلافت قائم رہتے ہوئے مصطفےٰ کمال پاشا نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور جدید ترکی کی بنیاد رکھ دی۔ بلاخر 1924ء میں خلافت عثمانیہ کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا۔ جنوری 1920ء کو اٹھارہ لیڈروں پر مشتمل ڈاکٹر انصاری کی زیر قیادت ایک وفد نے وائسرائے ہند لارڈ چیمسفورڈ سے ملاقات کی خلافت اور مقامات مقدسہ کے تحفظ کے بارے مسلمانان ہند کے جذبات پیش کئے۔ وائسرائے ہند نے وفد سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا کہ ترکی کی قسمت کا فیصلہ صرف حکومت برطانیہ نے نہیں کرنا بلکہ اتحادی اقوام نے مل کر کرنا ہے۔ اس لئے میں وائسرائے ہند اس معاملہ میں آپ لوگوں کو کوئی یقین دہانی نہیں کرا سکتا اور نہ ہی کوئی وعدہ کر سکتا ہوں۔ وائسرائے کا جواب مایوس کن تھا۔ چنانچہ 20 جنوری کو خلافت کمیٹی کا ایک اور اجلاس ہوا جس میں آئندہ لائحہ عمل تمہ پایا گیا جو مندرجہ ذیل ہے۔ خطابات ترک کئے جاویں۔ حکومت کے تعلیمی اداروں اور عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ فوج اور پولیس کے علاوہ حکومت کے تمام اداروں سے استعفٰے دلوائے جاویں۔ سرکاری ٹیکس اور واجبات نہ دیئے جاویں۔ مگر یہ سارے پروگرام عدم تشدد سے ہوں اور نظم و ضبط بھی از حد ضروری ہے۔

(مارچ 1920ء کے آغاز میں ایک وفد حضرت مولانا محمد جوہر کی قیادت میں انگلستان گیا۔ جس میں حضرت مولانا سید سلمان ندوی' سید حسین' حسن محمد حیات' مولوی ابوالقاسم' شیخ شبیر حسن قدوائی' محمد شعیب قریشی اور عبدالرحمن صدیقی اس وفد میں شامل لوگوں میں چند لوگ پہلے ہی انگلستان میں مقیم تھے اور تحریک خلافت میں شامل ہو گئے تھے۔ بحری جہاز کا یہ سفر تھا راستے میں بذریعہ اخبار معلوم ہوا کہ ترکی کی قسمت کا فیصلہ چند روز میں ہونے والا ہے۔ چنانچہ وفد عجلت میں لندن پہنچا اور انگلستان کے سیاست دانوں سے ملاقاتیں بھی کیں۔ وفد کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ لندن کی فضا ترکی کے سخت خلاف ہے۔ وفد کی 17 مارچ 1920ء کو انگلستان کے وزیر اعظم لارڈ جارج سے ملاقات ہوئی۔ وزیر اعظم نے وفد کے مطالبات منظور کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اسٹریا اور جرمنی سے انصاف ہو چکا ہے اب ترکی سے بھی انصاف بہت جلد ہو جائے گا اور برطانوی وزیر اعظم کا رویہ انتہائی ہتک آمیز تھا۔)

معاہدہ سیور

14 مئی 1920 کو اتحادیوں نے معاہدہ سیور کی رو سے ترکی کا فیصلہ کر دیا۔ اسکے حصے بخرے کر دیئے گئے۔ حجاز مقدس جو کہ اس وقت سعودی عرب ہے اور صوبہ عراق شریف حسین مکہ جو کہ پہلے بھی ترکوں کے وقت انہی علاقوں کا حاکم تھا اسے دے دیا گیا۔ فلسطین کو انگریزوں نے اپنے کنٹرول میں رکھ لیا شام' لبنان' فرانس کو دے دیے گئے۔ آرمینیا کو آزاد ریاست قرار دیا گیا۔ جنوبی اناطولیہ کو اٹلی کے زیر نگرانی تسلیم کر لیا گیا۔ اندریا' نوبل' گیلی' پولی 'اراس' سمرنا اور ٹینڈس یونان کے حوالے کر دیے گئے۔ درہ دانیال اور خلیج فاسفورس کو بین الاقوامی قرار دیا گیا۔ ترکی پر بھاری تاوان جنگ بھی عائد کر دیا گیا۔ ترکی کے بحری جہاز بھی ضبط کر لئے گئے۔ ہوائی فوج رکھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ بری فوج کی تعداد کم کر دی گئی۔ فوجی سکول بند کر دیے گئے۔

عملی طور پر خلافت اسلامیہ ختم کر دی گئی مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں ترکی میں ایک نئی حکومت قائم کر دی گئی۔ جو کہ مذہبی پایا یتت سے بلکل مختلف تھی۔ اسی حکومت کی یونان کے ساتھ جنگ بھی شروع ہو گئی۔ اتحادی اقوام نے ترکی کے بہت علاقوں پر یونانی اقتدار تسلیم کر لیا تھا جو کہ مصطفیٰ کمال پاشا کی نئی حکومت کو بھی منظور نہ تھا۔ جنگ چھڑ گئی۔ جس میں ترکی حکومت کو شاندار کامیابیاں بھی ہوئیں۔ جس کی مبارک باد خلافت کمیٹی کے اجلاس مورخہ 21-7-8 کو ایک قرار داد کے ذریعہ دی گئی۔ قرار داد کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں

آل انڈیا خلافت کمیٹی کا یہ اجلاس غازی مصطفیٰ کمال پاشا اتا ترک اور انقرہ کی حکومت کی شاندار کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہے اور یہ اجلاس خداوند کریم سے دعاگو ہے کہ ترک بہت جلد ٹرکش ایمپائر کی سرزمین سے اتحادی افواج کو کلی طور پر نکال دینے میں کامیاب ہو جاویں گے۔ اور اجلاس میں یہ بھی واضع کہا کہ اگر برطانوی حکومت نے انقرہ سے جنگ کی تو ہندوستان کے مسلمان سول

نافرمانی شروع کر دیں گے اور مکمل آزادی کا اعلان کر دیں گے۔

گرفتاریاں

ستمبر 1921ء کو کراچی میں خلافت کمیٹی کا ایک اجلاس خالق دنیا حال میں منعقد ہوا۔ جس میں مولانا محمد علی جوہر نے بڑی بے باقی سے ایک بیان دیا - فرمایا کہ ہم بادشاہ انگلستان کو اپنا بادشاہ تسلیم نہیں کرتے ہم کسی ایسے انسان کی وفاداری کا دم نہیں بھر سکتے جو ہمیں خداوند کریم کی وفاداری سے محروم کر دے۔ میں بادشاہ کے خلاف کوئی لفظ نہیں کہوں گا اور نہ ہی شاہی خاندان کے خلاف کچھ کہوں گا مگر جہاں حکومت کے مقابلہ میں خداوند کریم کی اطاعت کا سوال آ جائے تو میں حکومت کی اطاعت سے انکار کروں گا اور میں صرف خداوند کریم کی ہی اطاعت کروں گا اور خداوند کریم کی اطاعت ہی صرف انسانوں پر لازم ہے۔

اگر کوئی بیرونی مسلم طاقت ملک گیری کے لئے ہندوستان پر حملہ آور ہو گی تو میں اسکے خلاف سینہ سپر ہو جاؤں گا۔ اگر خلافت قائم کرنے کی خاطر یا خلافت کے مقصد کے لئے حملہ آور ہو تو میں حکومت برطانیہ کے خلاف جہاد کروں گا اور پوری طاقت کے ساتھ برطانوی حکومت کو ختم کروں گا۔ اس لئے کہ یہ میرا مذہبی فریضہ ہے۔ حضرت مولانا محمد علی جوہر نے مندرجہ بالا بیان کراچی کی عدالت میں دیا تھا۔ جس کی پاداش میں انہیں دو سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ دیگر لیڈر کرام کو بھی دو سال کی سزا سنائی گئی۔

1921ء میں پرنس آف ویلز کی ہندوستان میں آمد تھی۔ خلافت کمیٹی اور کانگرس نے پرنس آف ویلز کی استقبالیہ تقریبات کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ وائسرائے ہند لارڈ ایڈنگ نے شہزادہ کی آمد پر مخالفانہ مظاہرہ اور بائیکاٹ نہ کرنے کی اپیل کی تو مہاتما گاندھی نے وائسرائے کی اپیل مسترد کر دی کہ مقدمہ کراچی کے نظر بندوں کی رہائی کے بغیر کسی سمجھوتہ کی بات نہیں ہو سکتی۔ نومبر 1921ء کو پرنس آف ویلز کی آمد پر بمبئی میں سخت فساد ہو گئے۔ پولیس اور فوج کی گولیوں سے 53 افراد شہید ہو گئے۔ ملک بھر میں مظاہرے اور ہڑتالیں اور گرفتاریاں ہوئیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء نے بھی ہڑتال کر دی اور ایک ماہ یونیورسٹی بند رہی۔

تحریک خلافت کا خاتمہ

سول نافرمانی کے نئے پروگرام کا آغاز ہونے والا تھا۔ دسمبر 1921ء کانگریس مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے مشترکہ اجلاس احمد آباد میں شروع ہوئے۔ تحریک خلافت کو مزید بہتر شکل سے چلانا تھا اور اسکی ابتدا گورنمنٹ کو ٹیکس نہ دینے سے ہونا تھا اور اسکی ابتدا بردولی سے کی جانی تھی۔ خلافت

کمیٹی کے تمام لیڈر قید ہو چکے تھے۔ مسلم لیڈر شپ کے قید ہونے کی وجہ سے تحریک خلافت کا ڈکٹیٹر گاندھی جی کو بنا دیا گیا اور تحریک کے تمام اختیارات گاندھی جی کے پاس چلے گئے۔ 1921ء کے آخر تک خلافت کے تمام لیڈر گاندھی جی کے سوا گرفتار ہو چکے تھے۔ سول نافرمانی کے نئے پروگرام کا آغاز ہونے والا تھا۔ 5 فروری 1922ء کو ضلع گورکھ پور کے تھانہ چورا چوری میں ایک ایسا واقع رونما ہوا کہ گاندھی جی نے اچانک تحریک کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ چورا چوری کے ایک عوامی جلوس کا پولیس سے تصادم ہو گیا۔ پولیس نے جلوس کو منتشر کرنے کے لئے جلوس پر گولی چلا دی۔ پولیس کے پاس گولیاں کم تھیں ختم ہو گئیں۔ پولیس نے پسپا ہو کر تھانے میں پناہ لے لی مشتعل ہجوم نے تھانے پر دھاوا بول دیا اور اسے آگ لگا دی۔ جس سے اکیس پولیس والے جل کر مر گئے۔ اس واقع کا گاندھی جی نے اس قدر اثر لیا کہ کانگرس کے اس وقت کے صدر حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری سے مشورہ کئے بغیر ہی سول فرمانی کی تحریک یہ کہ کر ختم کر دی کہ چونکہ عدم تعاون اور ترک موالات کی تحریک عدم تشدد پر کاربند نہیں رہے اس لئے یہ تحریک ختم کی جاتی ہے۔

یہ تحریک 1857ء کے بعد ہندو اور مسلمانوں کی آخری مشترکہ تحریک تھی جس سے ہندو اور مسلمانوں نے مل کر قربانیاں دیں اور جیلیں کاٹیں۔ تحریک خلافت میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک برتن میں کھانا کھایا اور پانی پیا۔ تحریک کے خاتمہ کے بعد فرقہ پرستوں نے پھر اپنا مکروہ دھندا شروع کر دیا تھوڑے عرصہ بعد پھر ہندو مسلم کشیدگی نے پر پرزے نکال لئے اور تحریک خلافت ٹھنڈی پڑ گئی۔

آخر 3 مارچ 1924ء کو ترکی کی نئی حکومت نے مصطفیٰ کمال پاشا اتا ترک کی زیر قیادت خود خلافت کا خاتمہ کر دیا اور ترکی کو لادینی ریاست قرار دیا۔ اس سے تحریک خلافت کے راہنماؤں کو بہت دکھ ہوا۔

تحریک خلافت کا جائزہ

تحریک خلافت ایک ہمہ گیر تحریک تھی کہ جسکی بازگشت ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ مسلمان ملکوں اور یورپ میں بھی محسوس کی گئی۔ تحریک خلافت دور دراز کے علاقوں کے علاوہ دیہاتوں تک میں محسوس کی گئی۔ تحریک خلافت نے بین الاقوامی سیاست کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اگرچہ یہ تحریک بظاہر ناکام ہوئی مگر اسکے اثرات بہت دور تک ہوئے۔ تحریک خلافت نے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی اور سیاسی بیداری کی ایک ایسی لہر اٹھی جس سے ہندوستان کی سیاست میں ایسے ستارے نمودار ہوئے جنکی روشنی آج بھی نظر آتی ہے اور دیر تک قائم رہے گی۔ اسی تحریک کی وجہ سے مہاتما گاندھی کو بہت شہرت ملی اور وہ ہندوستان کے چوٹی کے لیڈر بن گئے۔ اس تحریک کی وجہ سے فرقہ پرستی کی حوصلہ شکنی ہوئی اور ہندو مسلمان قریب ہوئے۔ اسی تحریک نے برٹش سامراج کے پاؤں ہندوستان کی سرزمین سے اکھاڑ دیئے۔ گو تحریک خلافت کے اچانک ختم ہو جانے سے تحریک کے ورکروں میں مایوسی آئی۔

خاص کر مسلمانوں نے اچانک تحریک ختم کیے جانے کے اعلان کو بزدلانہ فعل محسوس کیا مگر فطری طور پر اس مقام پر جہاں تشدد کے رجحان نے تحریک کو اپنی طرف کھینچ لیا ہو تحریک کے خاتمہ کا اعلان ہی بہتر حل تھا۔

تحریک خلافت نے برطانیہ کو ترکی اور یونان کی جنگ میں یونان کا ساتھ نہ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اگر ہندوستان میں تحریک خلافت نہ ہوتی تو انگریزوں کے خلافت انگریزوں نے مکمل کر یونان کا ساتھ دینا تھا۔ جس کے نتیجہ میں ترکی کی مزید تباہی ہونا تھی۔

تحریک خلافت کی وجہ سے ہی علمائے ہند زیادہ تعداد میں بیسوی صدی کی سیاست میں آئے اور مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار ہوا۔

بیسوی صدی میں تحریک خلافت ہی مسلمانوں کی ہمہ گیر تحریک تھی جس کی حمایت کانگرس نے بھی مکمل کر کی اور عدم تعاون کی صورت میں مہاتما گاندھی کی حمایت حاصل ہوئی۔ جدید سیاسی طور طریقے بھی معلوم ہوئے اور مسلمانوں کا انداز فکر بھی تبدیل ہوا اور اس تحریک نے برصغیر کی تحریک آزادی میں ایک اہم باب رقم کیا۔

تحریک کا دوسرا رخ

تحریک میں تشدد شامل ہونے کی وجہ سے تحریک بندش کا شکار ہوئی اس لئے کہ چورا چوری تھانہ کے جلائے جانے اور 18 پولیس مینوں کی ہلاکت کے بعد اگر تحریک جاری رہتی تو حکومت تشدد سے تحریک کو کچل سکتی تھی۔ ایک انتہائی عمل تک پہنچانا تحریک کے ورکروں کے لئے بہت نقصان دہ ہوتا۔ تحریک کے کچلے جانے کی صورت میں کارکن انتہائی مایوس ہوتے اور جو کچھ تحریک کی وجہ سے سیاسی فوائد حاصل ہونے تھے وہ سب ہی ختم ہو جاتے۔

تحریک خلافت نے برصغیر کی تاریخ میں ہندو مسلم اتحاد کی فضا پیدا کی تھی لیکن حکومت وقت کے لئے فرقہ پرستوں کے لئے شائد یہ کوئی اچھی بات نہ تھی۔ اس لئے ہندو مسلم اتحاد دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ بہت جلد پھر فرقہ وارانہ رجحانات نے سر اٹھانا شروع کر دیا اور ہندو مسلم کشیدگی پیدا ہو گئی۔ تحریک خلافت کی ناکامی کی ایک وجہ تحریک ہجرت بھی تھی جس کے المناک نتائج نے بہت برے اثرات مرتب کئے۔ ہزاروں مسلمانوں کو شدید جانی اور مالی نقصان اٹھانے پڑے اور انہیں شدید پریشانی کے عالم میں وطن واپس لوٹنا پڑا۔ جس کے باعث انکے سارے ولولے اور جوش ٹھنڈے پڑ گئے اور تحریک ناکام ہو گئی۔

حضرت مولانا شوکت علی حضرت مولانا محمد علی جوہر

مولانا محمد علی جوہر ریاست رامپور کے ایک متمول گھرانے میں 1872ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی انکے والد فوت ہو گئے۔ مولانا شوکت علی انکے بڑے بھائی تھے۔ محمد علی جوہر نے ابتدائی تعلیم رواج کے مطابق مسجد میں ہی حاصل کی۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں جدید تعلیم حاصل کرنے کا رجحان نہیں تھا۔ ہزار مخالفت کے باوجود علی برادران کو حصول علم کے لئے بریلی کے ہائی سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں مروجہ تعلیم حاصل کی۔ 1990ء میں دونوں بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ علی برادران کے والد 1880ء میں ہی فوت ہو چکے تھے۔ انکی پرورش انکی والدہ ماجدہ جو تحریک خلافت میں اماں بی کے نام سے مشہور ہوئی تھیں۔ انہوں نے کی علی گڑھ کالج میں بھی دونوں بھائیوں کی طالب علموں میں پوزیشن نمایاں رہی۔ مولانا شوکت علی کالج کی کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی بن گئے۔ خوبصورت اور خاصے صحت مند تھے۔ چھوٹے بھائی محمد علی جوہر نے علمی میدان میں سارے صوبہ یوپی میں اول پوزیشن حاصل کی۔ اس شاندار کامیابی پر ریاست رامپور کی طرف سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفہ ملا۔ چنانچہ 1898ء میں محمد علی جوہر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے آکسفورڈ انگلستان چلے گئے۔ چار سال بعد جدید تاریخ میں آنرز کی ڈگری لے کر واپس آئے۔ قیام انگلستان میں انہوں نے انڈین سول سروس کا امتحان بھی دیا جس میں وہ کامیاب نہ ہوئے۔ محمد علی جوہر کی خواہش تھی کہ علی گڑھ کالج میں معلم بن سکیں۔ نواب محسن الملک کی بھی خواہش تھی کہ انہیں کالج میں ملازم رکھا جائے مگر انگریز پرنسپل مارسن کی مخالفت کی وجہ سے وہ کالج میں حصول ملازمت میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مگر انہیں جلد ہی ریاست رامپور میں محکمہ تعلیم میں اعلیٰ ملازمت مل گئی مگر یہ ملازمت بھی انہوں نے بہت جلد چھوڑ دی اور ریاست بڑودہ میں محکمہ افیون میں ملازمت اختیار کی لی۔

چار سال کے قلیل عرصہ میں انہوں نے ذہانت اور محنت سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ محکمہ مذکورہ کی آمدن کئی گناہ بڑھ گئی۔ چنانچہ مہاراجہ نے انکی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک ضلع کا انتظام انکے سپرد کر دیا۔ اسی اثناء میں محمد علی جوہر نے ملکی سیاست میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دی اور اخبارات میں اپنے مضامین لکھنے لگے۔ اسکے علاوہ 1907ء میں آج کے علی گڑھ کے عنوان سے انہوں نے مضامین کا ایک سلسلہ لکھنا شروع کیا۔ اس سے انہوں نے ایک ادیب کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی اور بہت اخبارات اور رسالوں کے ایڈیٹروں نے انہیں اپنے اخبارات میں لکھنے کی پیش کش کی۔ 1906ء میں انہوں نے مسلم لیگ کے پہلے کنونشن میں شرکت کی اور اسکی روداد ایک کتابچے کی شکل میں شائع کی۔ 1910ء میں انہوں نے ملازمت چھوڑ دی اور کلکتہ سے ایک ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" نام کا جاری کیا جس کا پہلا شمارہ 14 جنوری 1911ء کو شائع ہوا۔ انگریزی زبان کے اس ہفتہ وار رسالے کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی اسکی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کسی شمارے کی اشاعت میں کسی وجہ سے تاخیر ہو جاتی تو پڑھنے والے بے تاب ہو جاتے تھے خاص کر واسرائے ہند کی بیوی بڑی بے تابی سے ٹیلیفون کرتی تھی کہ کامریڈ کیوں نہیں شائع ہوا اور کب شائع ہو رہا ہے۔ جب 1913ء ہندوستان کا دارلحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا تو کامریڈ بھی دہلی میں ہی آ گیا۔

1914ء میں مولانا جوہر علی نے دہلی سے اردو اخبار "ہمدرد" بھی جاری کیا۔ انہیں ایام میں لندن کے اخبار "دی ٹائمز" نے ایک حقارت آمیز مضمون خلافت ترکیہ اسلامیہ کے خلاف شائع کیا۔ جس میں ترکی کو بڑی ہی ذلت آمیز دھمکی دے کر وارننگ دی گئی تھی کہ وہ اس جنگ 1914ء میں شامل نہ ہو ورنہ ترکی کچل دیا جائے گا۔ مولانا جوہر کو اس مضمون سے بہت رنج ہوا انہوں نے چالیس گھنٹے کی مسلسل کوشش سے ایک مضمون لکھا جو بیس کالموں پر مشتمل تھا۔ "چائس آف دی ترک" اپنے اخبار میں شائع کیا جس میں ترکی کے خلاف برطانیہ کی زیادتیوں اور سازشوں کو بے نقاب کیا اور ساتھ انہوں نے ترکی کو اتحادیوں کا ساتھ دینے کا مشورہ دیا تھا۔ اس مضمون کی اشاعت پر کامریڈ اور ہمدرد کی ضمانتیں ضبط کر لیں گئیں اور مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی مئی 1915ء کو نظر بند کر دیے گئے۔

صحافت کے ساتھ ساتھ مولانا محمد علی سیاست میں بھی باقاعدہ حصہ لیتے رہے انکے اخبار انکے سیاسی نظریات کے ترجمان تھے۔ پہلی تحریک جس میں انہوں نے حصہ لیا وہ مسلم یونیورسٹی کی تحریک تھی۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے دوران انہوں نے ترکی کی پر زور حمایت کی اور انکے لئے چندہ جمع کیا۔ ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ایک طبی وفد ترکی بھیجنے کا اہتمام کیا جب مسجد کانپور کا واقع پیش آیا تو مولانا جوہر اور سیکرٹری مسلم لیگ سید وزیر حسین کی قیادت میں ایک وفد کی صورت میں انگلستان گئے تاکہ برطانوی حکومت کو صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کیا جائے۔ جس کے نتیجے میں برطانوی حکومت نے واسرائے ہند پر دباؤ ڈالا کہ معاملے کو اچھے طریقے سے سلجھایا جائے۔ جب پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو مولانا جوہر کو ترکی کے بارے سخت تشویش ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے طلعت پاشا کو تار دے کر کہا

کہ جنگ میں شامل ہونے کے لئے حکومت ترکی کو بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے جب ترکی نے میدان جنگ اور جرمن کی حمایت کا اعلان کر دیا تو پھر مولانا محمد علی جوہر نے ترکی کی حمایت اور ہر قسم کی امداد کا اعلان کر دیا۔ حکومت نے محمد علی جوہر کے اخبار کامریڈ اور ہمدرد کی ضمانتیں ضبط کر لیں اور بڑے بھائی مولانا شوکت علی کو نظر بند کر دیا۔ مولانا محمد علی کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کا صدر منتخب کیا گیا لیکن شامل ہونے کی اجازت نہ دی گئی۔ مگر مولانا محمد علی جوہر کی والدہ اماں بی اس اجلاس میں شریک ہوئیں۔ جنکی تقریر نے حاضرین میں اچھا خاصہ جوش و خروش پیدا کر دیا۔ پانچ سال کی قید کے بعد 1919ء میں علی برادران کو رہا کیا گیا۔ چھدواڑہ جیل سے سیدھے امرتسر پہنچے جہاں خلافت کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ امرتسر میں ان کا بہت بڑا استقبال کیا گیا اور مولانا محمد علی جوہر نے اس جلسہ میں تحریک خلافت کی قیادت سنبھال لی۔ انہوں نے اپنی چھاجانے والی خطابت اور پر کشش شخصیت سے ایسی تحریک چلائی جسکی مثال تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اس وقت انکی شہرت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ جگہ جگہ ان کے گیت گائے جاتے تھے۔ ان کی والدہ اماں بی نے بھی تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان کی ذات کے ساتھ بھی مناجاتیں پڑھی گئیں۔ اس دوران جگہ جگہ خلافت کمیٹی کے جلسے جلوس ہوتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر نے انگلستان میں خلافت کے وفد کی قیادت کی۔ یورپ کا دورہ کر کے ترکی کی سالمیت اور خلافت کے تحفظ کے لئے تقریر اور تحریر کے ذریعے بھرپور انداز میں اقوام یورپ کے آگے خلافت کی حیثیت اور مسلمانوں میں خلافت کا تقدس پیش کیا۔ وطن واپس آکر انہوں نے ترک موالات اور عدم تعاون کی تحریکوں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا۔ آخر 1921ء خلافت کمیٹی کے اجلاس کراچی کے موقع پر گرفتار کر لئے گئے اور مقدمہ چلا کر انہیں دو سال قید با مشقت کی سزا کا حکم سنا دیا گیا۔

تحریک کا جائزہ

اگرچہ تحریک خلافت کی ناکامی ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لئے ایک المناک سانحہ تھا۔ مولانا محمد علی جوہر کے لئے ذاتی طور پر یہ سانحہ شدید روحانی کرب کا باعث بنا مگر انہوں نے مسلمانان ہند کے تحفظ کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ انہوں نے کامریڈ اور ہمدرد دوبارہ جاری کرنے کے لئے فرقہ وارانہ کشیدگی ختم کرنے کی کوشش، ہندو مسلم اتحاد قائم رکھنے پر پورا زور لگایا لیکن وہ اسمیں دلی منشا کے مطابق کامیاب نہ ہو سکے وہ جدوجہد کرتے رہے۔ قائداعظم سے مل کر انہوں نے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے ٹھوس اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا۔ تجاویز دہلی مرتب کرنے میں قائداعظم کا ساتھ دیا۔ جس میں انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ آخر انہوں نے 1928ء میں دہلی کے مقام پر آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں پر جوش حصہ لیا۔ 1930ء میں وہ خرابی صحت کے باوجود انگلستان گئے اور گول میز کانفرنس میں حصہ لیا۔ روانگی کے وقت انہوں نے کہا تھا کہ میں مرنے کے لئے جا رہا ہوں۔ انکی صحت کافی

خراب تھی دوران سفر بعض وقت وہ اس قدر لاغر ہو جاتے کہ انہیں سٹیچر پر لے جایا جاتا تھا۔ لندن کی گول میز کانفرنس میں انھوں نے اپنی معرکۃ الارا تقریر کی ہندوستان کی نمائندگی کا حق ادا کر دیا۔

انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں لندن کے حکمرانوں سے ہندوستان کے لئے درجہ نو آبادیات لینے نہیں آیا میں مکمل آزادی کا مطالبہ لے کر آیا ہوں۔ میں آج جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ جب میں واپس ہندوستان جاؤں تو میرے ہاتھ میں ہندوستان کی آزادی کا پروانہ ہو۔ بصورت دیگر میں غلام ہندوستان جانے کی بجائے کسی غیر مگر آزاد ملک میں موت کو ترجیح دوں گا۔ اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپکو انگلستان میں مجھے قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی۔ خداوند کریم (عزوجل) نے اپنے بندے کی آواز سنی اور اسے پورا کیا اور اس مجاہد آزادی کو غلام ملک میں واپس آنے کی زحمت گوارہ نہ کرنی پڑی۔ وہ چند روز بعد 4 جنوری 1931ء کو لندن میں ہی صبح کے وقت رحلت فرما گئے اور انہیں فلسطین لے جا کر بیت المقدس میں دفن کیا گیا انکی شہرت عالم اسلام سے باہر تک پھیلی ہوئی تھی۔ انکی موت کی اطلاع نے دنیا کو ماتم کدہ بنا دیا۔ وہ نڈر سیاست دان' شعلہ بیان' مقرر ممتاز صحافی اور ملت کا درد رکھنے والے پر خلوص لیڈر تھے۔ مشہور انگریزی ادیب ایچ جی ویلز "مولانا محمد علی جوہر" کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ محمد علی جوہر کے پاس برک کی زبان' میکالے کا قلم اور نپولین کا دل تھا۔

آزادی ہند کی جدوجہد میں مولانا محمد علی جوہر کو ایک بلند مقام حاصل ہوا انکا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ عوام نے انکی آواز پر آزادی کی جدوجہد میں والہانہ شرکت کی اور مولانا محمد علی جوہر نے اپنی زندگی میں عوامی سیاست کی۔ وہ ڈرائنگ روم کی سیاست کے قائل نہ تھے۔ انکی تحریک آزادی میں شمولیت کی وجہ سے مسلمانوں میں آزادی کا شعور بھی پیدا ہوا اور انھوں نے لوگوں کو آزادی کی جنگ کے لئے تیار بھی کیا اور یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ محمد علی جوہر بیسوی صدی کے پہلے نصف میں ہندوستان کے ممتاز اور سب سے بڑے لیڈر' بیباک لیڈر' نڈر لیڈر تھے۔ انھوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر سیاست کی رہنمائی کی وہ سازش کی پیداوار نہ تھے۔

مولانا شوکت علی

محمد علی جوہر کے بڑے بھائی تھے۔ 1870ء میں پیدا ہوئے بچپن سے ہی والد فوت ہو گئے تھے۔ دونوں بھائیوں نے بریلی کے ایک سکول سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ 1890ء کو دونوں بھائی علی گڑھ کالج میں داخل ہو گئے۔ شوکت علی طالب علمی کے زمانے میں کرکٹ کے نامور کھلاڑی تھے کالج کی کرکٹ ٹیم کے کپتان بن گئے۔ وہ اچھے مقرر بھی تھے۔ بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ ساتھ ساتھ قومی کاموں میں دلچسپی بھی لیتے رہے۔ مولانا شوکت علی پر علی گڑھ کے ماحول کا اس قدر اثر تھا کہ وہ مسلمانوں کے مفادات کے لئے ہما وقت فکر مند رہتے تھے۔

سر آغا خان نے مسلم یونیورسٹی کے لئے چندے کا آغاز کیا تو مولانا شوکت علی نے ملازمت چھوڑ کر حصول چندہ کی جدوجہد میں شامل ہو گئے اور سر آغا خان کے سیکرٹری کی حیثیت سے ساتھ رہے۔ سارے ہندوستان کا دورا کیا اور انکی کوشش اور محنت سے 30 لاکھ روپے چندہ جمع ہو گیا۔ مولانا شوکت علی قومی جذبے سے اس قدر سرشار تھے کہ انہوں نے اس مقصد کے لئے سرکاری ملازمت کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ ریٹائرمنٹ لے کر آپ قومی تحریکوں کے ساتھ وابستہ ہو گئے سیاسی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1913ء میں انہیں انجمن خدام کعبہ کا سیکرٹری منتخب کر لیا گیا وہ اپنے بھائی مولانا محمد علی جوہر کے شانہ بشانہ سیاسی کاموں جدوجہد میں حصہ لیتے رہتے۔ سیکرٹری خدام کعبہ کی حیثیت سے انہوں نے مقام مقدسہ کے تحفظ کے لئے ہر ممکن اقدام کئے انجمن نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو یقین دلائے کہ وہ مسلمانوں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی نہیں کریں گے۔ مولانا شوکت علی بھی بڑے پر جوش مقرر تھے اور وہ ساری زندگی برطانوی حکومت کو للکارتے رہے سوئے ہوئے ہندوستانیوں کو جگاتے رہے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران 1915ء کو علی برادران قید کر لئے گئے اور 1919ء میں ایک ساتھ ہی دونوں بھائی رہا ہوئے تھے اور سیدھے خلافت کے اجلاس امرتسر میں پہنچ گئے اور اپنے گھر بچوں کو ملنے بھی نہ گئے تھے۔ 1921ء میں دونوں بھائیوں کو دوبارہ کراچی سے گرفتار کیا گیا اور دو سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔

تحریک خلافت کے خاتمہ کے بعد علی برادران تحریک آزادی کے ساتھ ہی وابستہ رہے اور تا زندگی وہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں شامل رہے مولانا شوکت علی 1938ء میں اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ تحریک آزادی ہند میں جو باب علی برادران نے رقم کیا وہ ایک روشن اور درخشندہ باب ہے وہ تاریخ ہند میں روشن حروف میں لکھا جائے گا۔

تحریک خلافت پر تنقید و تبصرہ

تحریک خلافت امت مسلمہ کے ایک بنیادی عقیدہ کے گرد گھومتی ہے۔ خداوند کریم (عزوجل) کی اطاعت جس طرح لازم ہے۔ اسی طرح حضور علیہ اسلام کی اطاعت بھی لازم ہے۔ اس طرح نائب رسول خلیفتہ المسلمین کی اطاعت بھی لازم ہے اور خلافت مرکز اسلام کا تیسرا بڑا ستون ہے۔ 1914ء کی جنگ عظیم یورپ کے دو بڑے گروہوں کے مابین لڑی گئی تھی۔ گروہ نمبر1:- فرانس' برطانیہ' روس اور دیگر اقوام جبکہ گروہ نمبر2:- جرمنی' اٹلی اور ترکی تھے اور ترکی حکومت مذہبی حکومت تھی اور وہ امت مسلمہ کا مرکز خلافت تھی اور ترکی کی بادشاہت کو خلافت اسلامیہ ترکیہ کہا جاتا تھا۔ ترکی کے خلاف جنگ گویا کہ مرکز اسلام کے خلاف جنگ تھی۔ 1914ء کی اس جنگ سے مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہونا یقینی امر تھا۔ جنگ کے آغاز میں ہی امت مسلمہ میں اضطراب کے آثار پیدا ہو گئے تھے اور

خصوصی طور پر ہندوستان کے مسلمانوں میں اضطراب زیادہ تھا اور خلافت کے حق میں علمائے دیو بند نے فتوی بھی جاری کیا تھا۔ کہ چونکہ ہندوستان پر انگریز کی حکومت ہے اور انگریز ہی خلافت اسلامیہ ترکیہ کے خلاف بر سر جنگ ہے۔ اس لئے ہندوستان کی انگریز حکومت کے ساتھ جنگی مقاصد کے لئے کسی قسم کا بھی تعاون از روئے اسلام کفر ہے' حرام ہے۔ اور پھر خلافت کمیٹی نے علمائے ھند کے فتوئی کی روشنی میں حکومت ہند کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہ کرنے کی تحریک چلائی اور اسکا نام تحریک عدم تعاون رکھا گیا۔ اور اس فتوے میں یہ بھی کہا گیا کہ انگریز سرکار کے خطاب واپس کئے جاویں اور ملازمتیں ترک کی جاویں اس تحریک کا نام ترک موالات رکھا گیا تھا۔ بہت سارے علمائے ہند کے فتوے کے تحت بہت سارے مسلمانوں نے سرکاری ملازمتیں چھوڑ دیں خطاب بھی واپس کر دیے۔ حکیم اجمل خان جو کہ کانگریس کے صدر بھی تھے۔ انہوں نے شفاالملک کا سرکاری خطاب حکومت کو واپس کر دیا۔ اور عوام نے انہیں مسیح الملک کا خطاب دیا جو کہ آج تک انکے نام کے ساتھ وابستہ ہے۔ عدم تعاون اور ترک موالات کی تحریک بڑے زوروں پر چلائی گئی۔ بہت سارے لوگوں نے خطابات واپس کئے' ملازمتیں چھوڑیں' سرکار کی ٹھیکداریاں چھوڑیں مگر پنجاب میں اس کا اثر بہت کم ہوا۔ آج بھی جو لوگ ملک کی سیاست میں نمایاں نظر آتے ہیں' یا سرکار میں جن کی اس وقت بھی عزت ہے یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے 1914ء کی جنگ میں انگریز سرکار سے تعاون کر کے خلافت ترکیہ کے خلاف سرکار کو امداد دے کر خطابات حاصل کئے اور فائدے حاصل کئے۔ 25 نومبر اور مورخہ 19 اگست 1914ء کے لاہور کے اس وقت کے مشہور پیسہ اخبار میں مرقوم ہے۔ کہ جس وقت 1914ء کی جنگ شروع ہوئی انہیں ایام میں مسلم لیڈران نے جنہیں سر عبدالقادر' ڈاکٹر اقبال' سر محمد شفیع اور سر ظفراللہ بھی شامل تھے۔ برکت علی اسلامیہ حال لاہور میں جلسہ ہوا ایک قرار داد کے ذریعہ حکومت کو یقین دلایا گیا تھا کہ 1914ء کی اس جنگ میں پنجاب کے عوام جن کے لیڈر ہم ہیں سرکار برطانیہ کی ہر قسم کی مدد کریں گے' جنگی تعاون کریں گے' فوجی بھرتی دیں گے' چنانچہ ایک طرف علمائے دیو بند یا خلافت کمیٹی لوگوں کو حکومت وقت انگریز سرکار کے خلاف ہر قسم کے تعاون سے منع کرتے تھے۔ اور دوسری طرف پنجاب کے زمیندار' خطاب یافتہ' وڈیرے' سرکار کو ہر قسم کے تعاون کا یقین بھی دلا رہے تھے۔ انہیں ایام میں جب خلافت تحریک پورے ہندوستان میں بڑے زور پر چل رہی تھی پنجاب کے مشائخ اور گدی نشین نے عوام کو انگریز سرکار کی فوجی بھرتی کے لئے آمادہ کیا اور بہت لوگ جو فوج میں بھرتی ہو کر محاذ جنگ پر گئے تو انہیں پتہ چلا کہ وہ خلافت اسلامیہ ترکیہ کے خلاف بر سر پیکار ہیں۔ انکے دل دہل سے گئے۔ یہ اثرات ب برطانوی فوج کے افسران کو معلوم ہوئے تو انہوں نے مرکزی سرکار کو مطلع کیا۔ اس معاملے پر . ذکر کیا گیا اور پھر پنجاب کے مشائخ نے' پیران عظام نے تعویز دئے تھے اور وہ تعویز پنجابی مسلم افواج میں تقسیم ہوئے۔ ان تعویزات کے اثرات یہ بتائے گئے تھے کہ اگر ترکوں کے خلاف مسلمان جنگ کریں گے' حملہ آور ہونگے تو انہیں کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں ہو گا۔ بلکہ ایک بدکردار حکومت ترکی کے خلاف جدوجہد کرنے سے مسلم فوجیوں کو ثواب ہو گا اور ان تعویزات پر پنجاب کے تقریباً 36

مشائخ، پیران عظام کے دستخط اور نام تحریر تھے جس میں سرفہرست حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پور والے بھی شامل تھے۔

یہ جنگ اس وقت کے جدید اسلحہ سے لڑی گئی تھی اور ساتھ ہی اس وقت کی جنگ میں انسانوں کی بھی بہت سخت ضرورت تھی۔ بصورت دیگر 1914ء کی جنگ میں خلافت اسلامیہ ترکیہ کے حق میں جدوجہد بھی مسلمانان ہند ہی کر رہے تھے۔ وہ خلافت ترکیہ کو قائم رکھنے کی جدوجہد کر رہے تھے اور مسلم نوکر شاہی مسلم زمیندار، جاگیردار پنجاب اور خطاب یافتگان اپنے ذاتی فائدہ کے لئے ہر وہ قدم اٹھانے کی جدوجہد کر رہے تھے جس سے انکی سرکار کے گھر عزت ہو اور انہیں اقتدار میں حصہ دوام ملے۔ تحریک خلافت میں کانگرس بھی انگریز سرکار کے خلاف شانہ بشانہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جدوجہد کر رہی تھی۔ ہندو بھی قربانیاں دے رہے تھے، جیلوں میں جا رہے تھے، سرکار تشدد کا نشانہ بھی بن رہے تھے، یہ سب قربانیاں غیر مسلم شعوری طور پر دے رہے تھے۔ وہ کسی ثواب کی نیت سے یہ قربانیں نہیں دے رہے تھے بلکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ انگریز کے غیر مستحکم ہونے کی وجہ سے، کمزور ہونے کی وجہ سے بلاخر ہندوستان بھی آزاد ہو گا۔ ہندوستان میں ہندو مسلم دونوں کو آزادی ملنے کا فائدہ ہو گا۔ ہندو چونکہ ہندوستان میں زیادہ رہتے ہیں اس لئے آزاد ہونے کی صورت میں ہندوؤں کو زیادہ ہی فائدہ ہو گا۔ اس لئے خلافت کی تحریک سے انگریزی اقتدار کو چوٹ لگتی ہے۔ اس لئے ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ملکر تحریک خلافت کے حق میں جدوجہد کی قربانیاں دیں۔ تحریک خلافت کے تمام مسلم لیڈران جب جیلوں میں چلے گئے تو قیادت گاندھی جی کے ہاتھ میں آگئی اور انہوں نے تحریک کی پوری رہنمائی کی لیکن جب تحریک میں تشدد کے رجحانات داخل ہو گئے تو انہوں نے تحریک بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ واقع یوں ہوا کہ صوبہ بہار تھانہ چورا چوری کے پولیس عملہ نے خلافت کے جلوس پر گولی چلا دی۔ جس سے چند لوگ زخمی ہوئے۔ اس پر مظاہرین نے تھانے پر حملہ کر دیا۔ تھانے کا گھیراؤ کر کے آگ لگا دی۔ تھانے کے اندر 18 پولیس والے تھے جو جل کر راکھ ہو گئے۔ اس تشدد کے واقع کے بعد گاندھی جی نے تحریک خلافت بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس لئے کہ اگر مذید تحریک چلائی جاتی تو اس میں تشدد کا عنصر شامل ہو چکا تھا۔ سرکار کے پاس تحریک کچل دینے کا بہانہ بن چکا تھا۔ اگر مزید تحریک چلائی جاتی تو سرکار برطانیہ نے تحریک کو کچل دینا تھا۔ جس سے بہت سارے ورکر قتل ہو جانے تھے، تشدد کا نشانہ بن جانے تھے۔ اس لئے مہاتمہ گاندھی جی نے تحریک بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ ان کا قدم بہت ہی دانش مندانہ تھا۔ تحریک خلافت میں مسلمانان ہند جذباتی طور پر داخل تھے وہ اپنے مذہبی جذبے کی انا کے لئے، ثواب کے لئے، تحریک خلافت میں قربانیاں دے رہے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانان عالم کا مرکز خلافت اسلامیہ ترکی ہے۔ اگر یہ ختم ہو جاتا ہے تو عالم اسلام کا مرکز ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جو کہ حضور علیہ السلام کے بعد سے اس وقت تک قائم ہے۔ جو ذات خدا عزوجل کے بعد اور رسالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت سب سے بڑا مرکز ہے۔ اسکے ختم ہو جانے کے بعد مسلمانان عالم بے یار و مددگار ہو جاتے ہیں۔ اس مرکز کو بچانے کے لئے مسلمانان ہند جدوجہد کر

رہے تھے، قربانیاں دے رہے تھے۔ اس ساری تحریک کے نتیجہ میں کسی قسم کی مالی امداد ملنے کی کوئی توقع پیش نظر نہ تھی۔ مسلمان صرف واسطے ثواب کے ہی تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ اور جان اور مال کے نذرانے پیش کر رہے تھے۔ تحریک خلافت کے مسلمانوں میں بڑے لیڈر علی برادران ہی تھے۔ انکی والدہ اماں بی بھی انہیں ایام میں بہت مشہور ہوئیں۔ انہیں ایام میں ایک مصرع اماں بی کے نام پر زبان زدہ عام ہوا۔

"بولی اماں بی محمد علی سے بیٹا خلافت پہ جان قربان کرنا"

خلافت تحریک کے وقت ہی جب خلافت بھی ابھی قائم تھی تو ترکی حکومت پر مصطفےٰ کمال پاشا نے قبضہ کر لیا تھا اور یونان اور ترکی کی جنگ بھی شروع ہو گئی۔ اس وقت بھی مسلمانان ہند ترکی کے حق میں جلسے کرتے، جلوس نکالتے۔ انہیں ایام میں گلیوں، بازاروں میں جلوسوں میں نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ ان میں ایک شعر یہ بھی بہت مشہور ہوا

ع "رو رو کہیں شمر ناں دے باں تے نالے دکھیاں مایاں
آویں مصطفےٰ کمال وے تیریاں دور بلایاں۔

ہر جلسہ اور ہر جلوس میں خلافت ترکیہ اور پھر مصطفیٰ کمال کی حکومت کی مدح کی جاتی تھی۔ گذشتہ سال ماہنامہ "جینے دو" میں مشہور احرار لیڈر جانباز مرزا کا ایک انٹرویو میں نے شائع کیا تھا۔ یہ انٹرویو میں نے خود جا کر مرزا صاحب سے لیا تھا۔ ان کا انٹرویو ان کی ساری زندگی کے حالات پر مبنی تھا۔ مگر بچپن کے واقعات میں وہ کہتے ہیں کہ بچپن میں ہی مجھے نظمیں پڑھنے، سرکار کے خلاف جلوسوں میں شامل ہونے کا بہت شوق تھا۔ جانباز مرزا تمام زندگی مجلس احرار اسلام کا ساتھ ہی وابستہ رہے اورانہوں نے تاریخ احرار کتاب بھی لکھی جو کہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ وہ 1992ء میں تقریبا 83 سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ وہ صحافی بھی تھے۔ ماہنامہ تبصرہ لاہور سے نکالا کرتے تھے۔ وہ اپنے بچپن کے حالات کے بارے فرماتے ہیں کہ میری عمر اس وقت تقریبا 12 سال تھی۔ میں ایک بچوں کے جلوس کی قیادت کر رہا تھا۔ جو کہ سرکار کے خلاف تھا۔ میں آگے آگے ایک نظم کے بول پڑھتا تھا اور بچے میرے پیچھے پڑھتے تھے اور مجھے پولیس پکڑ کر لے گئی۔ میں جو نظم پڑھ رہا تھا اسکے بول تھے۔

غازی مصطفےٰ کمال وے تیریاں دور بلاواں
کریں بکرے یونانی حلال وے بیبا وانگ قصاباں

اس وقت خلافت ترکیہ تو قائم تھی مگر حکومت غازی مصطفےٰ کمال اتا ترک کر رہے تھے۔ اور ہمارے ہاں کی جو تحریک خلافت تھی وہ بھی خلافت کے ساتھ ساتھ ترکوں کی مدح میں جلسے جلوس نکال رہے تھے۔ غرضیکہ مسلمانان ہند خلافت اور ترکوں کی حمایت مذہبی فریضہ سمجھ کر کر رہے تھے۔ جانباز مرزا کہتے ہیں کہ پولیس نے تھانے لے جا کر مجھے 10 تھپڑ مارے اور وارننگ دے کہ چھوڑ دیا کہ آئندہ یہ شعر بکرے یونانی حلال والہ نہیں پڑھنا۔ اسی قسم کی مداح سرائی جلسوں جلوسوں میں ہوتی تھی۔ کوئی واضح نصب العین نہ تھا کہ اگر خلافت ترکیہ قائم نہیں رہتی تو پھر آئندہ قدم کیا ہو گا اور بالآخر ترک

نوجوان فوجیوں نے ہی مصطفےٰ کمال پاشا کی قیادت میں خلافت اسلامیہ ترکیہ کو ختم کر دیا۔

تنقید

ہندوستان کے مسلمان تحریک خلافت کے محرک تھے۔ دنیا میں کسی اور جگہ خلافت ترکیہ کے حق میں کوئی تحریک نہیں چلی۔ حالانکہ دنیا میں اس وقت اور بھی مسلم ملک موجود تھے۔ تحریک خلافت کو چلانے والے قوم پرست مسلمان تھے۔ جنکی قیادت جمیعت العلمائے ہند کر رہی تھی۔ جسکے بہت بڑے لیڈر شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے حجاز مقدس کا دورہ بھی کیا۔ انکے ساتھ حضرت مولانا حسین احمد مدنی بھی تھے۔ دونوں حضرات کو حجاز مقدس میں ھی قید کر لیا گیا تھا۔ اور انہیں مالٹا جزیرہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ اور پانچ سال وہ قید رہے اور جنگ عظیم اول فتح کے بعد انہیں رہا کیا گیا تھا۔ مسلمانان ہند جذباتی طور پر خلافت اسلامیہ ترکیہ کے حامی تھے اور اسکے قائم اور دائم رہنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ جبکہ وہ ملک جنکی وابستگی خلافت اسلامیہ ترکیہ کے ساتھ تھی۔ وہاں کے لوگ خلافت ترکیہ کے خلاف تھے۔ 1880ء سے قبل خلافت ترکیہ کی حدود بہت وسیع تھی۔ مشرقی یورپ کے بہت بڑے حصے پر خلافت ترکیہ قائم تھی۔ بشمول یوگوسلاویہ یونان' رومانیہ' بلغاریہ' چیکو سلواکیہ' ہنگری اور دیگر بہت سارے ملکوں پر خلافت ترکیہ کی حکومت تھی اور ایشیا اور افریقہ میں مراکش' تیونس' الجزائر' مصر' لیبیا' حجاز مقدس اور دیگر تمام عرب علاقوں پر حکمرانی اور اقتدار تھا۔ 1880 کے بعد مشرقی یورپ کے بہت سارے علاقے خلافت ترکیہ کے ہاتھ سے نکل گئے۔ باقی محدود علاقے ترکیہ کے قبضے میں رہ گئے۔ جن میں آرمینیا وغیرہ کے کچھ علاقے بھی شامل تھے۔ اسی طرح عرب علاقوں میں بھی مقامی حکومتیں ہی بااختیار تھیں۔ اقتدار اعلیٰ خلافت ترکیہ کے پاس تھا۔ جبکہ مقامی لوگ اقتدار اعلیٰ بھی خلافت ترکی کے پاس نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

اس لئے کہ طاقت کا فلسفہ بدل چکا تھا۔ صنعت و حرفت کے دور نے دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ پندرھویں صدی عیسوی میں ہی یورپ جدید ایجادات کی وجہ سے دنیا پر اپنا اقتدار اعلیٰ منوا چکا تھا۔ یورپ کی ترقی کے اثرات دنیا میں بڑی شدت سے محسوس کئے جا رہے تھے۔ جن عرب علاقوں پر اقتدار اعلیٰ خلافت ترکیہ کے پاس تھی انکے ہاں زیر زمین معدنیات کے بے حد بے حساب.ذخائر تھے اور اقوام یورپ ان خزائین کی نشان دہی بھی کر رہے تھے۔ اقوام عرب یہ حقیقی طور پر محسوس کرتے تھے کہ خلافت اسلامیہ ترکیہ کے زیر سایہ رہ کر ترقی نہیں کر سکیں گے۔ زیر زمین خزائین حاصل نہیں کر سکیں گے۔ صنعتی ترقی میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ اس لئے اقوام عرب نے خلافت اسلامیہ کے خلاف بغاوت کر دی بعض علاقوں پر عرب کے شیخ ہی حکمران رہے۔ بعض علاقوں پر جن میں شام' لبنان' فلسطین' تیونس' الجزائر بھی شامل تھے۔ فرانس اور برطانیہ نے اپنی حکمرانی قائم کر لی۔ جبکہ حجاز مقدس' عراق' مصر' لیبیا' سوڈان' یمن اور دیگر عرب ریاستوں پر عرب شیوخ حکمران بن گئے۔

خلافت ترکیہ کے زیر نگین یورپین ملک آرمینیا اور دیگر تھوڑے سے علاقے خلافت ترکیہ سے آزاد ہو گئے۔ دیگر یہ کہ خلافت ترکیہ کے زیر نگین علاقے تو آزاد ہو گئے مگر ترکیہ کے عوام میں بھی قدیم خلافت عثمانیہ کے خلاف اضطراب موجود تھا۔ ترکی کا ایک حصہ یورپ میں بھی تھا۔ یورپ کی ترقی کے اثرات قبول کرنا ترکی کے نوجوانوں کے لئے ایک فطری عمل تھا۔ یورپ کے دھانے پر ہوتے ہوئے بھی' استعماری طاقت کے ہوتے ہوئے بھی ترکی پسماندہ ہی تھا۔ یورپ کا کوئی بھی لٹریچر ترکی میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ نظام تعلیم وہی پرانا درس نظامی تھا۔ ترکی کے 98 فی صد مسلم عوام انتہائی غربت کی زندگی گزار رہے تھے۔ نوجوان جو کسی بھی طریقہ سے یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں سے سیاحت کر کے آ جاتے وہ ترکی کی حالت زار پر رونا شروع کر دیتے تھے۔ ترکی حقیقی طور پر اس قدر پسماندہ تھا کہ سرخ ٹوپی ترکی پولیس کے یونیفارم میں شامل تھی۔ یہ بھی محدود تعداد میں ترکی میں تیار ہوتی تھی - آسٹریا سے درآمد کی جاتی تھے۔ ترکی کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہماری پسماندگی کی وجہ ہی خلافت اسلامیہ ہے اور جب تک کہ لوگ جدید علوم سے بہراور نہیں ہونگے اس وقت تک ترقی غریب اور پسماندگی میں گھرا رہے گا۔ جس وقت غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے ترکی کی حکومت پر قبضہ کر لیا اور خلافت کو بے دست و پا کر دیا اس وقت ہندوستان میں تحریک خلافت بڑے زوروں پر چل رہی تھی۔ ہندوستان سے ایک وفد ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ترکی گیا۔ انہیں ایام میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھی بھی ماسکو سے ترکی پہنچ چکے تھے۔ ڈاکٹر انصارے کی زیر قیادت جو وفد ہندوستگان سے گیا ہوا تھا۔ اس میں حضرت سندھی بھی شامل ہوئے۔ ترکی کے حکمرانوں سے ملے۔ ان سے التجا کی کہ خلافت اسلامیہ ترکیہ کو قائم رہنے دیا جائے۔ کیونکہ یہ مرکز ملت اسلامیہ ہے۔ اس پر ترکی کے حکمرانوں نے جواب دیا کہ یہ مرکز آپ کسی اور جگہ بنا لیں ہم ملک اسلامیہ کے مرکز خلافت سے باز آئے۔ جس نے ہمارے مقدر میں بھوک افلاس اور پسماندگی ڈال دی ہے۔ خلافت کے جو نوادرات پڑے ہوئے ہیں اگر آپ لے جانا چاہتے ہیں تو لے جاویں اور جہاں آپ چاہیں مرکز خلافت بنا لیں۔ الغرض ترک عوام پر جدیدیت مسلط ہو چکی تھی اور وہ یقین رکھتے تھے کہ خلافت کا پرانا نظام جب تک ختم نہیں ہو گا ترکی پر غربت مسلط ہی رہے گی۔ خلافت اسلامیہ ترکیہ کے زیر نگین ملکوں کے لوگ بھی معاشی ترقی کے راستے میں حائل خلافت اسلامیہ ترکیہ کو ہی سمجھتے تھے۔ اس لئے جب خلافت اسلامیہ ترکیہ کو ختم کیا گیا تو اسکے حق میں کسی طرف سے بھی کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر نفس نے خلافت ترکیہ کے خاتمہ کو عطیہ خداوندی سمجھتے ہوئے نوافل شکرانہ ادا کئے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خلافت ترکیہ سے آزاد ہونے والے ممالک خصوصی طور پر عرب ممالک کو زیر زمین خزائین اقوام یورپ نے نکال کر دیئے اور عرب ممالک خوش حال ترین ملک بن گئے۔ خلافت کے زیر تسلط رہتے ہوتے انکی معدنیات تک رسائی ہی نہیں ہونا تھی اور وہ ہمیشہ ہی غربت اور پسماندگی میں گرفتار رہتے۔ آج خوش حالی میں عرب ممالک اقوام یورپ کا مقابلہ کرتے ہیں اور خود ترکی بھی عرب ملکوں کے مقابلہ میں معاشی حالات میں پسماندہ ہے اور یورپ کے ملک جو انیسوی صدی میں ترکی کے زیر نگیں تھے وہ بھی اس وقت ترکی سے زیادہ خوش حال ہیں ترقی یافتہ ہیں۔

خان عبدالغفار خان

تحریک خدائی خدمت گار

خدائی خدمت گار تحریک کے بانی خان عبدالغفار تھے اور یہ تحریک صوبہ سرحد میں قائم ہوئی اور وہیں پروان چڑھی۔ ابتدا میں یہ تحریک فرسودہ رسومات کے خلاف ایک سماج سدھار تحریک تھی۔ مگر پھر یہ انقلابی تحریک بن گئی۔ خان عبدالغفار جو اس تحریک کے بانی تھے وہ امن پسند تھے اور انکی تمام زندگی تحریک کے بارے یہ کوشش رہی کہ امن آشتی اور عدم تشدد کے ساتھ ہی لوگوں کے سماجی اور سیاسی مسائل کو حل کیا جائے اور ملک کی آزادی کی جدوجہد بھی عدم تشدد کے ساتھ کی جائے۔

خان عبدالغفار صوبہ سرحد کے ضلع چارسدہ کے گاؤں اتمان زئی کے رہنے والے تھے۔ انکے والد خان بہرام خان بہت بڑے زمیندار تھے اور علاقے کے بہت بڑے خان تھے۔ وہ 1890ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے پشاور کے ہائی سکول میں حاصل کی۔ ابھی میٹرک کا امتحان پاس کیا ہی تھا کہ فوج میں انہیں اعلیٰ کمیشن مل گیا جو کہ اس وقت ہندوستان میں خاص خاص اور بڑے گھرانے کے نوجوانوں کو ملا کرتا تھا کمیشن بھی مل گیا۔ تمام قواعد و ضوابط بھی پاس کر لئے۔ جب انگریز آفیسر کے روبرو پیش ہوئے تو انگریز آفیسر کی متکبرانہ بات چیت نے انہیں فوج کی اعلیٰ ملازمت سے متنفر کر دیا اور فوج کی اعلیٰ ملازمت کو انہوں نے ٹھکرا دیا۔

پھر وہ تعلیم کی طرف راغب ہوئے۔ میٹرک کے بعد وہ علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔ وہیں سے تعلیم حاصل کر کے انکے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلینڈ گئے ہوئے تھے۔

خان عبدالغفار بھی کو علی گڑھ میں دو سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر خان صاحب نے لندن سے خط لکھا کہ وہ بھی انجیرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن ہی آ جاویں۔ عبدلغفار خان لندن جانے کو تیار ہو گئے۔

والد صاحب نے خرچہ کے لئے تین ہزار روپیہ بھی دے دیا۔ بحری جہاز کا ٹکٹ بھی لے لیا مگر ماں کی محبت آڑے آئی۔ والدہ کو کسی نے بتا دیا کہ جو نوجوان انگریزوں کے دیس میں ایک دفعہ چلا جاتا ہے پھر واپس نہیں آتا۔ پہلے ایک بیٹا ڈاکٹر خان صاحب کو گوا بیٹھی ہو اب عبدالغفار کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ ماں کی محبت نے خان عبدالغفار کے پاؤں باندھ دیے اور وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ سن شعور میں پہنچ کر 20 سال کی عمر میں ہی محسوس کیا کہ لوگوں میں تعلیم نہیں ہے جو کچھ مسجدوں میں پڑھایا جاتا ہے وہ دنیا میں ترقی کے لئے کافی نہیں ہے اور سرکاری اسکول چیدہ چیدہ بڑے شہروں میں ہیں اور انہیں بھی صرف وہ تعلیم ہی دی جاتی ہے جس سے نوجوان بڑے ہو کر سرکاری ملازم بن سکیں۔ انہوں نے تعلیم عام کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ کچھ پڑھے ہوئے لوگوں کو بھی ساتھ ملایا۔ ایک

انجمن بنائی۔ جس کا مقصد دیہاتوں میں سکول کھولنا اور لوگوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنا تھا۔ حاجی صاحب ترنگ زئی کی زیر قیادت میں انہوں نے پہلا مدرسہ اتمان زئی میں کھولا پھر اور جگہوں پر بھی درس گاہیں قائم کیں۔ ان مدارس میں نصاب تعلیم وہی تھا جو سرکاری سکولوں میں تھا مگر زائد یہ کہ بچوں کو دینی تعلیم بھی ساتھ دی جاتی اور انگریز کے خلاف جدوجہد کا درس بھی دیا جاتا تھا۔

حاجی صاحب ترنگ زئی تحریک آزادی کے ایک مجاہد تھے۔ عبدالغفار خان علمائے دیو بند سے بہت متاثر تھے۔ وہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی اور شیخ الہند محمودالحسن سے بھی مل چکے تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اس وقت صحیح خدمت یہ ہے کہ لوگوں کو حصول آزادی کی طرف بھی راغب کیا جائے اور آنے والی نسل کو جدید علوم سے بھی بہرہ ور کیا جائے۔ جدید علم اور آزادی کا جھنڈا اٹھائے خان عبدالغفار اٹھے اور چند سالوں میں ہی انہوں نے صوبہ سرحد کے بیشتر علاقوں میں آزاد سکول قائم کر دیئے اور تحریک آزادی میں جدوجہد کرنے والے مجاہدین کی ایک اچھی خاصی جماعت قائم کر دی۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ باشاہ خان تحریک آزادی میں علمائے دیو بند سے اور جدید علم کے حصول میں سرسید احمد خان سے متاثر تھے۔ لیکن حصول آزادی کی جدوجہد میں وہ عدم تشدد پر یقین رکھتے تھے اور یہ کہنا بھی ٹھیک نہ ہو گا کہ وہ عدم تشدد کے نظریہ میں گاندھی جی سے متاثر تھے اس لئے کہ جب انہوں نے 1912ء میں آزادی کی جدوجہد عدم تشدد سے شروع کی تو اس وقت گاندھی جی جنوبی افریقہ میں تھے اور وہ بہت بعد ہندوستان میں آئے اور تحریک آزادی کی قیادت کانگریس کی رہنمائی عدم تشدد سے کرنے لگے ہم اگر یہ کہیں تو غلط نہ ہو گا کہ بادشاہ خان پیدائشی طور پر یا ذہنی طور پر تشدد کے حامی نہ تھے اگر ہم یہ کہیں کہ وہ ضرور کسی سے متاثر ہی تھے تو ہم انہیں حضرت عیسیٰ علیہ اسلام یا مہاتمہ بدھ سے ہی کہہ سکتے ہیں تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ خان کی مہاتما گاندھی سے پہلی ملاقات 1926ء میں ہوئی۔ جب وہ صوبہ سرحد کے واحد عوامی لیڈر مانے جا چکے تھے۔

وہ اپنا ایک واقع بیان کرتے ہیں کہ جب ہم چند جگہوں پر آزاد سکول کھولنے میں کامیاب ہو گئے تو ایک مولوی میرے ساتھ مناظرہ کرنے کو آ گیا۔ اسکے ایک ہاتھ میں قرآن شریف تھا اوردوسرے ہاتھ میں بندوق تھی۔ وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا کہ غفار خان یا تو مجھے قرآن سے یہ ثابت کر دے کہ قرآن و حدیث کے علاوہ کوئی دیگر علم پڑھنا جائز ہے یا پھر تیرے اور میرے درمیان بندوق فیصلہ کرے گی۔ میں نے اس ملاں صاحب سے کہا کہ ہم جو سکول کھول رہے ہیں ان میں دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی پڑھائیں گے یہ کہیں منع نہیں ہے۔ رہی اس بندوق کی بات تو میں اسکا قائل نہیں ہوں۔ ملاں صاحب اگر تمہیں بندوق بازی کا بہت شوق ہے تو اتمان زئی میں میرا ایک چچا زاد بھائی احمد خان ہے اس سے بندوق بازی کی بات کریں وہ تمہیں اسکا جواب دیگا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ بادشاہ خان ذہنی طور پر تشدد پسندی کے خلاف تھے۔ دیگر یہ کہ کوئی بھی اصلاحی تحریک تشدد سے چل ہی نہیں سکتی۔ اصلاحی تحریک کے لئے پیار و محبت بھائی چارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ فرقہ پرستی کے لئے دو فرقوں کو دو گروہوں کو آپس میں لڑانے کے لئے تشدد کا پرچار کیا جا سکتا ہے۔

بادشاہ خان قومی جذبہ رکھنے والے انسان دوست تھے۔ وہ اپنی جدوجہد کے آغاز میں جہاں آنے والی نسل کی تعلیم کے لئے دور دراز دیہاتوں میں سکول قائم کرتے ہیں۔ وہاں نوجوانوں میں وطن کی آزادی کا جذبہ بھی پیدا کیا۔ لوگوں میں احترام آدمیت پیدا کیا۔ انہوں نے وطن کی آزادی کا درس شیخ الہند محمود الحسن صاحب اور حضرت سندھی سے لیا۔ وہ دیو بند اور دہلی اکثر جایا کرتے تھے اور ان اکابرین سے ملتے رہتے تھے اور آزادی وطن کی شمع روشن کرتے رہتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار الہلال اور لاہور کا اخبار زمیندار بھی انکے زیر مطالعہ رہا ہے۔ وہ تحریک آزادی میں سیکولر ذہن رکھتے تھے۔ وہ فرقہ پرستی کے سخت خلاف تھے اور تمام زندگی اسی نظریہ پر قائم رہے حضرت شیخ الہند کے ساتھ بادشاہ خان کا رابطہ اور خط و کتابت بھی تا زندگی قائم رہی۔ سال میں ایک دو دفعہ بادشاہ خان دیو بند ضرور جایا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند اور دیگر تحریک آزادی کے متوالوں سے ضرور ملا کرتے تھے۔ اسی طرح انہیں حضرت شیخ الہند نے دیو بند بلایا۔ مولانا عزیز گل اور حضرت سندھی اور دیگر علمائے کرام کے ساتھ ایک خفیہ اجلاس ہوا۔ جس میں تحریک آزادی ہند پر غور و فکر کیا گیا۔ یہ واقع 1914ء کا ہے۔ دیو بند کے اس اجلاس میں ان کے ساتھی مولانا افضل ربی اور مخفی صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔ فیصلہ ہوا کہ آزاد قبائلی میں جہاد کے لئے مرکز بنایا جائے میں اور مخفی صاحب بٹ خیلہ سے ہوتے ہوئے آزاد قبائل میں گئے۔ وہاں مرکز جہاد کے لئے جگہ تلاش کر لی: حضرت سندھی نے آکر مرکز جہاد دیکھنا تھا۔ ہم انتظار کرتے رہے مگر وہ نہ آئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ہم بھی واپس آگئے۔ یورپ میں جنگ شروع ہو چکی تھی۔ جرمنی اور ترکی ساتھی تھے۔ مسلمان عوام کی ہمدردیاں جرمنی اور ترکی کے ساتھ تھیں عام مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ انگریز شکست کھا جائیں گے اور ایسی صورت میں ہندوستان بھی آزاد ہو جائے گا۔ اس لئے حریت پسند لوگ اور جماعتیں زیادہ متحرک ہو گئیں۔ حضرت شیخ الہند نے آزاد قبائل میں تحریک آزادی کا مرکز قائم کرنے کے لئے مولانا سیف الرحمان صاحب کو بھیج دیا اور ہم نے مرکز قائم کرنے کے لئے جگہ مقرر کر لی۔

اس طرح کے اور مرکز بھی قائم کئے گئے اس ساری تحریک کا مقصد یہ تھا کہ سرحدات سے انگریز سرکار کے خلاف ہیجان پیدا کیا جائے تاکہ اگر انگریز تحاریک کو دبانے کی کوشش میں اپنی فوجیں استعمال کریں تو جرمنی محاذ پر شکست کھائیں اگر انگریز فوجیں محاذ جنگ پر لڑیں تو ہندوستان کو آزاد کرا لیا جائے۔ یہ ایک حصول آزادی کی جدوجہد تھی جس کا تذکرہ ہم تحریک خلافت میں بھی کرتے ہیں۔ تحریک ہجرت میں بھی کرتے ہیں۔ تحریک ریشمی رومال میں بھی کرتے ہیں۔ دیگر تحاریک بھی اس جذبے کے گرد گھومتی ہیں۔ خدائی خدمت گار تحریک بھی آزادی کی جدوجہد میں علمائے ہند کے ساتھ تن من دھن سے شامل تھی اور ساتھ ہی وہ اصلاحی تحریک بھی جاری کئے ہوئے تھی۔ جس سے لوگوں کو سیاسی تعلیم اور آنے والی نسل کے لئے درس گاہیں گاؤں گاؤں قریہ بقریہ کھولی جا رہی تھیں۔ کچھ وقت بعد جب حاجی صاحب ترنگ زئی نے آزاد قبائل سے انگریز کے خلاف جہاد شروع کیا تو ہمارے مدارس بھی بند کر دئے گئے۔ اس لئے کہ سرکار یہ سمجھتی تھی کہ یہ جو مدارس ہیں حاجی صاحب ترنگ زئی ہی انہیں

چلا رہے ہیں۔ جب ہم نے سرکار سے یہ کہا کہ ملاں لوگوں کی مخالفت سے بچنے کے لئے ہم نے ان مدارس کا سرپرست انہیں بنایا ہوا ہے۔ ورنہ ان مدارس سے حاجی صاحب کا کوئی تعلق نہیں۔ اس جواب پر سرکار نے ہمیں بھی گرفتار کر لیا۔ آزاد مدارس کے اساتذہ کو قید کر دیا گیا۔ جیل میں بہت بے عزت بھی کیا جاتا تھا۔ چکی پسوائی جاتی۔ کولہوں کے آگے جوتا جاتا تھا۔ بادشاہ خان کہتے ہیں جو جیل میں مجھے کپڑے پہننے کو دیئے گئے تھے وہ بہت چھوٹے تھے میرا قد اونچا تھا۔ پاجامہ زانوں تک اور قمیض کمر تک تھی۔ انہیں ایام میں پنجاب اور دیگر ہندوستانی علاقوں میں تحریک خلافت چل رہی تھی۔ جبکہ صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گار تحریک آزادی کی جنگ بھی لڑ رہے تھے اور ساتھ ہی آنے والی نسل کے لئے درس گاہیں بھی قائم کر رہے تھے۔ انہیں ایام میں سرکار برطانیہ نے رولٹ ایکٹ پاس کیا۔ جس کا مقصد سیاسی کارکنوں کو بغیر وجہ بتائے گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ قید کیا جا سکتا تھا۔ خدائی خدمت گار تحریک نے رولٹ ایکٹ کے خلاف بھی پوری جدوجہد کی اور بادشاہ خان گرفتار ہوئے اور سرکار نے کئی دیہاتوں پر جنمیں انگریز سرکار کے خلاف جلسے جلوس ہوتے تھے اجتماعی جرمانے بھی کیے۔ اتمان زئی پر تیس ہزار جرمانہ کیا تھا رولٹ ایکٹ کی تحریک میں ہزاروں پٹھان گرفتار ہوئے' قید ہوئے' اور لوگوں میں سیاسی شعور پختہ ہوا۔

تحریک ہجرت

دہلی میں خلافت کمیٹی کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ جس میں بادشاہ خان کی زیر قیادت خدائی خدمت گاروں کا ایک وفد بھی شریک ہوا۔ اسی جلسہ میں ایک جذباتی نوجوان عزیز ہندی نے مسلمانوں کے لئے ہجرت کر جانے کی قرار داد پیش کی۔ لیڈران کرام نے عزیز ہندی کو بہت سمجھایا کہ یہ وقت ہجرت کی قرارداد کا نہیں مگر اس نے بڑی تیزی کے ساتھ جلسہ میں ہجرت کی قرار داد پیش کر دی جو کہ بڑے جوش خروش کے ساتھ منظور کر لی گئی اور پھر مسلم عوام نے اپنا مال و متاع اونے پونے بیچ کر افغانستان کی طرف ہجرت شروع کر دی۔ جب قافلے پشاور پہنچے تو وہاں پر استقبال کیا جاتا اور پھر صوبہ سرحد کے عوام نے بھی ہجرت شروع کر دی۔ بادشاہ خان ہجرت کے خلاف تھے مگر مجبوراً انہیں بھی ہجرت کرنا پڑی۔ مہاجرین کو جا کر کابل میں پتہ چلا کہ حکومت افغانستان بھی بہت کمزور حکومت ہے اور وہ انگریز کے ساتھ جنگ کر کے ہندوستان کی آزادی میں مدد نہیں کر سکتی۔ ایسی حالت میں مہاجرین بہت مایوس ہوئے اور وہ لوگ بہت بری حالت میں وطن واپس آئے۔ ہجرت کی تحریک جذباتی سیاست کی بہت ہی مایوس کن مثال تھی۔ جس نے سیاسی کارکنوں میں بہت مایوسی پیدا کی۔ بادشاہ خان اور دیگر خدائی خدمت گار بھی واپس آ گئے اور تحریک ناکام ہوئی۔ تحریک ہجرت کی ناکامی کے بعد خدائی خدمت گار پھر تعلیم تربیت کی طرف راغب ہو گئے۔ انہیں ایام میں ریاست دیر میں دیر کے مقام پر بھی ایک درس گاہ قائم کی جس میں چار سو سے زیادہ طالب علم ہو گئے۔ آخر انگریز سرکار کے کہنے پر نواب آف

محمد فاروق قریشی اور خان عبدالغفار خاں کے ساتھ

دیر نے یہ مدرسہ ختم کر دیا اور امارت بھی گرا دی گئی۔ انگریزی علاقوں کے دیہاتوں میں بھی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ ان تعلیمی پروگراموں میں خدائی خدمت گاروں کو دیگر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے علاوہ یہ بھی بہت بڑی مشکل تھی کہ مالی وسائل بہت کم ہوتے ہوئے جو استاد بھی مدارس میں پڑھانے کے لئے رکھے جاتے تھے انکی تنخواہیں قلیل ہوتی تھیں۔ پہلے تو انہیں ڈرا دھمکا کر ان سکولوں کی نوکری سے بھگا دیا جاتا تھا اگر یہ طریقہ کامیاب نہ ہوتا تو پھر ان استادوں کو زیادہ تنخواہ دے کر سرکاری ملازمت دے دی جاتی تھی۔ اس لئے ان مدارس میں معلمین کی کمی رہتی تھی اور پھر بعد میں انہیں سکولوں سے جو نوجوان تعلیم حاصل کر لیتے تھے وہی لوگ رضاکارانہ طور پر استاد بھی بن جایا کرتے تھے یا قومی جذبہ رکھنے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اس کمی کو پورا کیا۔ مسلمان زمیندار تجارت کو بنیوں کا کام سمجھتے تھے۔ بادشاہ خان نے لوگوں میں تجارتی اور زرعی شعور پیدا کیا۔ اتمان زئی میں مسلمانوں کی تجارتی منڈی بن گئی۔ زراعت میں پھلوں اور سبزیوں کی کاشت عام ہونے لگی۔ تحریک خلافت کے صدر بھی بادشاہ خان ہی تھے۔ گرفتار ہو گئے اور بھی بہت سارے خدائی خدمت گار گرفتار ہوئے اور بادشاہ خان کو تین سال قید سخت کی سزا سنائی گئی۔ قید کے دوران جیل والوں نے ہر قسم کی تکالیف اور اذیت دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ 1928ء میں جب بادشاہ خان رہا ہوئے تو پٹھان عوام نے انکا بہت خیر مقدم کیا۔ جگہ جگہ جلسے ہوئے اور اتمان زئی میں بادشاہ خان کی رہائی پر بہت بڑا جلسہ ہوا۔ جس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔ اجلاس نے متفقہ طور پر بادشاہ خان کو فخر افغان کا خطاب دیا۔

بادشاہ خان رہائی کے بعد

بادشاہ خان رہائی کے بعد تعلیمی پروگرام پر دوبارہ توجہ دی جانے لگی تمام سکول جو ہم نے بنائے تھے وہ بڑی کامیابی سے چل رہے تھے۔ انہیں سکولوں کے طلباء اور مدرسین کے ساتھ دیہاتوں کا دورہ کیا۔ لوگوں کو تعلیم کی طرف راغب کیا تمام۔ صوبہ سرحد میں کئی جگہوں پر سکول قائم کئے۔ تعلیمی تحریک زیادہ زورو شور کے ساتھ مزید چلائی گئی۔ انہیں ایام میں بادشاہ خان حج پر گئے۔ مدینہ شریف، مکہ شریف میں فریضہ حج ادا کرنے کے بعد شام، لبنان فلسطین بھی گئے۔ بیت المقدس کی سیڑھیوں سے انکی بیوی گر کر زخمی ہوئی اور وہیں پر ہی فوت ہو گئیں۔ بیت المقدس میں ہی مدفون ہیں۔ 1929ء میں جب ملاؤں کی شورش کی وجہ سے امیر امان اللہ خان کی حمائیت کے خلاف بغاوت ہوئی تو سرحد کے خدائی خدمت گاروں نے امیر امان اللہ خان کی حمائیت کی اور شاہ امان اللہ خان کی معزولی کے بعد نادر خان کی حمائیت کی اور ساتھ ہی صوبہ سرحد سے چندہ جمع کر کے نادر خان کو دیا۔ رضاکاروں سے بھی اسکی امداد کی 1929ء لاہور میں کانگریس کا جلسہ تھا۔ جس میں بادشاہ خان اور انکے ساتھی بھی بڑی تعداد میں بطور مبصر شامل ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ مرد اور نوجوان تو ایک طرف عورتیں بھی تحریک آزادی میں

بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں اور کانگریس نے اسی جلسہ میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا ریزولیشن بھی پاس کیا تھا۔ خدائی خدمت گار بھی جلسہ سے بہت متاثر ہوئے۔ واپس جا کر انہوں نے ایک بہت بڑا جلسہ کیا اور لوگوں کو لاہور کانگرس کے جلسہ کے حالات بیان کئے اور کہا کہ پٹھانوں کو بھی وطن کی آزادی کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کرنا چاہئے۔ ہم بھی اس دھرتی کے باسی ہیں۔ ہمیں اپنی تحریک عدم تشدد سے جاری کرنی چاہیے۔ انہوں نے پھر عدم تشدد کا فلسفہ لوگوں کو سمجھایا۔ تحریک خدائی خدمت گار کی باقاعدہ سے جماعت بندی کی۔ جھنڈا لہرایا۔ رضا کار تنظیم قائم کی جس کی وردی سرخ رنگ کی تھی۔ جدوجہد کا بنیادی طریقہ کار عدم تشدد پر مبنی تھا۔ اگر کوئی طاقت ور سختی کرتا ہے تو برداشت کرو ہاتھ مت اٹھاؤ۔ حکومت اگر لاٹھی چلاتی ہے' گولی چلاتی ہے' سختی کرتی ہے' برداشت کرو۔ مگر اپنی بات کہتے رہو' مار کھاتے ہوئے' ظلم سہتے رہو' اپنی بات کہتے ہوئے آگے بڑھتے رہو۔

صوبہ سرحد کے علماء نے ڈھول باجا بجانا منع کیا ہوا تھا۔ مگر خدائی خدمت گار اپنے جلوس کے آگے ڈھول اور تاسے بجاتے اور خدائی خدمت گار رضا کار اور لیڈران انکے پیچھے جلوس کیساتھ چلتے۔ شوقیہ نوجوان ان میں شامل ہو جاتے اور پھر وہ بھی تحریک آزادی کے رضا کار بن جاتے۔ تھوڑے عرصہ میں ہی صوبہ سرحد کچھ پختون علاقوں میں تقریبا ہر جگہ خدائی خدمت گاروں کے دفاتر قائم ہوگئے۔ سرخ وردی اور سرخ جھنڈا یعنی سرخ رنگ کو بطور جدوجہد کی علامت کے چنا گیا تھا۔ خدائی خدمت گار تحریک کا زیادہ کام دیہات میں تھا۔ لیڈران اور رضاکار پیدل ہی دیہاتوں میں گھوم کر جلسے کرتے تھے۔ اس زمانے میں غربت آج کی نسبت زیادہ تھی۔ سائیکل بھی کسی کسی کے پاس ہوتی تھی۔ جس کسی رضا کار کے پاس سائیکل ہوتی تو وہ پروگرام کے مطابق سائیکل پر پہلے کسی گاؤں میں پہنچ جاتا۔ لوگوں کو جمع کرتا۔ تھوڑی دیر میں لیڈران رضا کار بھی وہاں پہنچ جاتے۔ جلسہ کرتے اور سائیکل والا رضا کار پہلے دوسرے گاؤں میں پہنچ جاتا۔ لوگوں کو جمع کرتا۔ رضاکاران اور لیڈران کے آنے تک وہیں رہتا۔ پھر سائیکل والا دوسرے گاؤں چلا جاتا۔ اس طرح ایک دن میں خدائی خدمت گار بارہ بارہ' پندراں پندراں جلسے کرتے اور لوگوں کو منظم کرتے' بیدار کرتے اور جدوجہد کرتے جاتے تھے۔ اس طرح دن بدن زیادہ لوگ تنظیم میں شامل ہوتے گئے۔ رضا کاروں کی بھی تنظیم قائم کر دی گئی۔ ضلع شہر دیہات اور کل تنظیم کے سالار مقرر کئے گئے۔ بہت بڑے بڑے جلسے بھی کئے گئے۔ لیکن سرکار ہمارے جلسوں سے فکر مند تھی۔ بہت کوشش بھی کی جاتی کہ لوگ ہمارے جلسوں میں نہ آویں۔ مگر لوگوں کا جذبہ آزادی ہمارے جلسوں میں کھینچ کر لے آتا۔ خدائی خدمت گار تحریک دن بدن ترقی پر تھی۔ ان جلسوں کی وجہ سے حکومت نے خدائی خدمت گار تحریک کے لیڈران کو گرفتار کر لیا۔ ایک مقدمہ قائم کیا گیا۔ بادشاہ خان اور انکے ساتھیوں کو تین تین سال قید بامشقت دی گئی۔

قصہ خوانی بازار کا خونیں واقع

بادشاہ خان کو گجرات جیل میں بھیج دیا گیا۔ بادشاہ خان 23 اپریل 1930ء کو گرفتار کیے گئے تھے۔ قصہ خوانی بازار میں گولی چل گئی۔ 23 اپریل کو پشاور شہر میں بھی بہت سارے حریت پسندوں کو گرفتار کیا گیا۔ اللہ بخش برقی صاحب جو کانگریس کمٹی شہر کے سیکرٹری جنرل بھی تھے انہیں پولیس گرفتار کر کے تھانہ کابلی گیٹ پیدل ہی لے جا رہے تھے تو برقی صاحب کے ساتھ لوگوں کا بہت بڑا جلوس ہو گیا۔ پولیس نے جلوس کو منتشر کرنا چاہا جو کہ نہ ہوا۔ فوج کو مدد کے لئے بلا لیا گیا۔ فوج ہندوستانی تھی۔ اس نے نہتے عوام کے ہجوم پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ ہندوستانی فوجی دستے کو واپس بھیج دیا اور گورا فوج آ گئی۔ اس نے نہتے عوام پر گولی چلا دی۔ جس سے سینکڑوں عوام شہید و زخمی ہو گئے۔ قصہ خوانی بازار پشاور میں اس وقت بھی شہداء 23 اپریل 1930ء کی یادگار موجود ہے۔ قصہ خوانی بازار کے شہداء تک بات ختم نہیں ہوئی۔ پولیس اور گورا فوج دیہاتوں میں پھیل گئی۔ جہاں جہاں خدائی خدمت گاروں کے دفاتر تھے ان پر قبضہ کیا۔ جھنڈے اتار کر پھینک دیے۔ کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ دس کارکنوں کو گرفتار کرتے دس اور گرفتار ہونے کو آگے آ جاتے۔ بعض گاؤں کے تمام لوگوں کو ایک جگہ جمع کیا جاتا اور کہا جاتا کہ جو شخص اس معافی نامے پر انگھوٹھا لگا دے وہ چلا جائے۔ کوئی بھی معافی نامے پر انگھوٹھا نہ لگاتا۔ بعض جگہ دیہاتوں کا محاصرہ کیا گیا۔ کئی کئی دن تک لوگوں کو گھروں سے باہر نہیں نکلنے دیا گیا۔ چارسدہ شہر کا اکیس دن محاصرا رکھا نہ کوئی شخص اپنے گھر سے باہر نکل سکتا تھا نہ ہی گھر آ سکتا تھا۔ بھوک کی وجہ سے لوگوں کے مال ڈنگر گھروں سے نکل گئے پھر وہ لوگوں کو واپس نہ ملے۔ ایک جگہ خدائی خدمت گاروں کا جلسہ تھا۔ ایک قاری صاحب تلاوت کر رہے تھے اسے گولی کا نشانہ بنا کر شہید کر دیا۔ پھر لوگوں کو منتشر ہونے کو کہا گیا جب عوام منتشر نہ ہوئے تو ان پر گولی چلائی گئی۔ لوگ شہید ہوئے زخمی ہوئے۔ یہ واقع ضلع بنوں کے ماتی خیل کا تھا۔ کئی جگہ پر خدائی خدمت گاروں پر تشدد کر کے ٹھنڈے پانی میں غوطے دیے گئے۔ کئی دیہاتوں پر اجتماعی جرمانے کیے گئے۔ ضلع مردان کے گاؤں تکر میں ایک جلسہ تھا جس میں بہت لوگ شریک تھے۔ ایک عورت لوگوں کو پانی پلا رہی تھی۔ جلسہ گاہ میں مردان کے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر مرنی انگریز آ گیا وہ جلسہ کو منتشر کرنا چاہتا تھا۔ پولیس کو لاٹھی چارج کا حکم دیا۔ پانی پلانے والی عورت نے گھڑا اسسٹنٹ کمشنر کو مار دیا۔ قریب ہی کسی عربی مدرسہ کے طالب علم تھے جن کے ہاتھ میں کلہاڑیاں تھیں۔ وہ انگریز افسر پر حملہ آور ہوئے مسٹر برنی قتل ہو گیا۔ تکر گاؤں کا فوج نے محاصرہ کر لیا۔ فائرنگ کی گئی۔ بے شمار لوگ، بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں شہید ہوئیں۔ یہ واقعہ 29 مئی 1930ء کا ہے۔

ایک گاؤں میں جب بہت سارے لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا تو باقی گاؤں کے لوگوں کو ایک جگہ جمع کیا گیا اور کہا گیا جو شخص اس معافی نامے پر انگوٹھا لگا دے وہ گھر چلا جائے۔ ایک شخص نے انگھوٹھا

لگا دیا اور وہ گھر چلا گیا گھر میں جب وہ اپنی بیوی کے روبرو پیش ہوا تو وہ کپڑے دھو رہی تھی اس نے اپنے خاوند کو مخاطب کر کے کہا کہ معافی نامے پر انگوٹھا لگا کر آ گئے ہو۔ اب تم کپڑے دھوؤ میں وطن کی آزادی کے لئے گرفتار ہونے جاتی ہوں - پھر وہ شخص گھر سے واپس آیا اور اس نے انگریز افسر کے سامنے وطن کی آزادی کے نعرے لگائے اور گرفتار ہو کر جیل چلا گیا۔ اسی طرح ایک اور گاؤں کی بات کرتے ہیں کہ جب تمام خدائی خدمت گار گرفتار کر لئے گئے اور باقی لوگوں کو ایک جگہ جمع کیا گیا اور سرکاری افسر نے کہا کہ اور تو کوئی سرخ پوش اس گاؤں میں نہیں۔ بعض لوگ جو سرخ پوش نہیں تھے وہ جلدی سے اپنے گھروں میں گئے اور اپنے کپڑے سرخ رنگ میں ڈبو کر گیلے کپڑوں میں ہی افسران کے سامنے پیش ہو گئے کہ ہم بھی سرخ پوش ہیں۔ ضلع مردان کے قصبہ لونڈ موڑ میں پولیس گئی غلام محمد خدائی خدمت گار کا حجرہ جلا دیا۔ گھر جلا دیا۔ بہت سارے لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ لوگوں پر بہت تشدد اور ظلم کیا گیا۔ صوابی کے کئی علماء کے گھر اور کتب خانے جلا دیے گئے

چارسدہ میں اسسٹنٹ کمشنر کا قتل

چارسدہ میں ایک شخص حبیب نور نے دن دیہاڑے ایک انگریز اسسٹنٹ کمشنر کو گولی کا نشانہ بنایا مگر وہ بچ گیا حبیب نور گرفتار کر لیا گیا۔ دوسرے دن ہی اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ بادشاہ خان کے بیٹے عبدالولی خان اس وقت تیرہ برس کے تھے۔ سرخ وردی پہنے ہوئے چارسدہ کے خدائی خدمت گار کے دفتر میں تھے۔ گورا پلٹن نے دفتر کو گھیر لیا۔ ایک گورا سپاہی ان پر بھی حملہ آور ہوا مگر ایک دیسی افسر نے انہیں بچا لیا۔ راقم کے ایک دوست جناب غازی خان صاحب آف ہی اس وقت بھی زندہ ہیں۔ وہ اس وقت کے حالات بتاتے ہیں کہ صوبہ سرحد کے پختون علاقوں میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس کا کوئی نہ کوئی فرد جیل میں نہ گیا ہو۔ تحریک آزادی سے متاثر نہ ہوا ہو۔ غازی خان کے والد ٹھیکیدار تھے۔ ترک موالات کی تحریک میں انہیں کہا گیا کہ وہ گورنمنٹ کی ٹھیکیداری چھوڑ دیں۔ وہ ٹھیکیدار تھے انہوں نے ٹھیکیداری چھوڑ دی۔ قلاش ہو گئے مگر تا زندگی انگریز حکومت کے ساتھ عدم تعاون جاری رکھا۔ غازی خان صاحب سے بڑے بھائی جیل گئے۔ قید میں انسے کولھو کی مشقت لی جاتی تھی۔ مشقت کی تاب نہ لا کر جیل میں فوت ہو گیا۔ انہوں نے فرمایا کہ 1930ء میں خدائی خدمت گار تحریک کے تقریباً 40 ہزار آدمی جیلوں میں ڈال دیے گئے۔ سینکڑوں تشدد آمیز مشقت کی وجہ سے لقمہ اجل ہوئے۔ ہزاروں جیل کے اذیت ناک سلوک کی وجہ سے مختلف امراض میں مبتلا ہو گئے۔ جبکہ تحریک کے دوران مختلف جگہوں پر گولی چلنے کی وجہ سے سینکڑوں لوگ شہید ہوئے اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ اس تحریک میں صوبہ سرحد کے پختونوں نے جتنی قربانیاں دی ہیں اتنی پورے ہندوستان میں نہیں دی گئیں۔

پورے صوبہ سرحد کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ جو شخص بھی صوبہ سے باہر پنجاب کی طرف

جاتا تھا۔ دریائے سندھ پر پوچھ گچھ کی جاتی تھی انہیں حالات میں چند لیڈران جنہوں نے کشتیوں کے ذریعے دریائے سندھ عبور کیا وہ گجرات جیل میں بادشاہ خان سے ملے۔ خدائی خدمت گاروں پر سرکار کے ظلم کی داستان بیان کی۔ انکے کہنے پر پنجاب کے مختلف لیڈران اور جماعتوں سے ملے۔ مسلم لیگ نے انہیں مایوس کیا کہ سرکار کے خلاف کسی جنگ میں ہم آپکی کوئی امداد نہیں کر سکتے۔ پھر کانگرس کے لیڈران سے بھی ملے گاندھی جی نے امداد کا وعدہ کیا اور وائسرائے ہند سے ملے اور انہیں کہا کہ گاندھی پیکٹ کے تحت تمام سیاسی قیدی رہا ہو چکے ہیں تو صوبہ سرحد کے خدائی خدمت گار کیوں رہا نہیں کئے گئے۔ اگر صوبہ سرحد کے خدائی خدمت گاروں کو رہا نہ کیا گیا تو ہم انکی ہر قسم کی امداد کریں گے۔ چنانچہ کانگرس کے کہنے پر حکومت کے مظالم کی تحقیق کے لئے ایک کمیشن قائم کیا گیا جس کے سربراہ سردار وٹھل بھائی پٹیل تھے۔ انہوں نے اپنی تحقیق کی رپورٹ تیار کر کے شائع کر دی۔ حکومت نے اس رپورٹ کی تمام کاپیاں ضبط کر لیں۔ مگر پھر بھی کانگرس کو کچھ کاپیاں ہاتھ آگئیں اور وہ بیرون ملک اخبارات کو بھیج دی گئیں۔ آخر حکومت ہمارے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر تیار ہو گئی اور حکومت نے وعدہ کیا کہ ہم صوبہ سرحد کو بھی 1919ء کی اصلاحات دینے کو تیار ہیں جو کچھ بھی ہندوستان کے دیگر صوبوں کو دیا گیا ہے وہی صوبہ سرحد کو بھی حقوق دیں گے۔ مگر شرط یہ ہے کہ کانگرس سے الگ ہو جاویں۔

بادشاہ خان اور انکے ساتھیوں کی رہائی

بادشاہ خان کو جب رہا کیا گیا تو گجرات کے لوگوں نے بہت بڑا جلوس نکالا۔ تمام ہندو، سکھ، مسلمان جلوس میں شریک ہوئے۔ پھر جہلم کے لوگ آئے وہ جہلم لے گئے۔ شہر کے باہر ہی لوگوں کا بہت بڑا اجتماع تھا۔ پھر شہر میں ہمارا جلوس گیا اور پھر ہم لاہور چلے گئے۔ لاہور ریلوے سٹیشن پر بہت بڑے اجتماع نے مولانا ظفر علی اور پنڈت شانتا رام کی قیادت میں ہمارا استقبال کیا گیا اور ہمارا جلوس سارے شہر میں گھوما۔ جلوس میں تمام مذاہب کے لوگوں کے علاوہ عورتیں بھی تھیں۔ کئی جگہ جلوس جلسہ کی شکل اختیار کرتا رہا ہر جلسہ میں پھولوں کے ہار پہنائے جاتے، تقریریں ہوتیں، تحریک آزادی کے مجاہدین کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا۔ موچی دروازے پر جلوس کا اختتام ہوا۔ وہاں پر بہت بڑے جلسے کا انتظام تھا۔ وہاں پر بادشاہ خان نے بہت مختصر تقریر کی جس میں کہا تھا کہ ہم وطن کی آزادی کے لئے صوبہ سرحد سے ایک لاکھ رضا کار دیں گے جو تن من دھن سے آزادی کی تحریک کے مجاہد ہونگے۔ انہیں مختصر الفاظ سے تقریر ختم ہو گئی۔ جلسے میں بہت پبلک تھی بہت مشکل سے جلسہ گاہ سے نکل کر بادشاہ خان برائے روانگی پشاور بذریعہ ریل گاڑی روانہ ہو گئے۔ صبح کے وقت انکا راولپنڈی میں بھی بہت بڑا استقبال کیا گیا۔

کراچی روانگی

بادشاہ خان پشاور پہنچ جانے کے بعد اپنے گھر کو روانہ ہوئے چند ہی روز آرام کرنے کے بعد پھر اپنی جدوجہد شروع کر دی اور ساتھ ہی کراچی میں آل انڈیا کانگرس کے جلسہ میں شرکت کی تیاری شروع کر دی۔ تمام علاقوں کے نمائندہ خدائی خدمت گار رضا کاروں کا ایک جیش تیار کیا گیا جسکی تعداد 40 تھی۔ مقررہ تاریخ کو پشاور سے ہمیں بادشاہ خان اور ان کے ساتھیوں کو بہت بڑے جلسے اور پھر جلوس کی شکل میں بذریعہ ریل گاڑی برائے کراچی رخصت کیا گیا۔ جب ہماری گاڑی لاہور پہنچی تو ہمارے استقبال کے لئے بہت بڑا اجتماع تھا یہاں گاڑی برائے کراچی تبدیل ہونا تھی۔ رضاکار پہلی گاڑی سے اترے پلیٹ فارم پر اپنے ڈھول تاشوں کے ساتھ پریڈ کی اور یہ بہت ہی سہانا منظر تھا استقبال کرنے والوں نے بہت داد دی انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائے۔ لاہور سے گاڑی چل پڑی رائے ونڈ سٹیشن پر ایک مرد اور ایک عورت نے بڑی منت سماجت کی کہ ہمیں بھی اپنے ڈبہ میں بٹھالیں۔ ہم نے انہیں بیٹھا لیا تو پتہ چلا کہ یہ دونوں بھگت سنگھ کے ماں اور باپ ہیں بھگت سنگھ ابھی دو دن قبل انگریز سرکار کے خلاف سرگرمیوں میں پھانسی پا چکا تھا۔ اس نے لالہ لاجپت رائے کے قاتل لاہور کے انگریز ایس پی کو قتل کر دیا تھا جسکے جرم میں اسے سزائے موت ہوئی تھی۔ خدائی خدمت گاروں نے انکے سوگ میں ڈھول بجانے بند کر دیے تھے مگر بھگت سنگھ کے والدین نے زور دے کر خدائی خدمت گاروں سے دوبارہ ڈھول بجوانا شروع کر دیا اور کہا کہ ہمارا بیٹا شہید ہوا ہے اس لئے شہید کی موت پر ڈھول تاشے بجائیں اور خوشی منائیں۔ کراچی تک ہر بڑے سٹیشن پر ہمارا استقبال ہوتا گیا اور ہم پورے جوش خروش کے ساتھ کراچی پہنچ گئے۔ کراچی سٹیشن پر عبدالخالق خلیق صاحب کی زیر قیادت بہت سارے پٹھان استقبال کو آئے ہوئے تھے اور ساتھ ہی نوجوان بھارت سبھا کے رضاکار اور کانگرسی کارکن بھی بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ چونکہ کراچی کانگرس کمیٹی اور گاندھی جی نے جلوس پر پابندی لگائی تھی اس لئے ہم موٹروں پر سوار ہو کر جلسہ گاہ میں پہنچے خدائی خدمت گاروں کو جلسہ گاہ میں گھومنے کی کوئی پابندی نہ تھی۔ ہم جہاں چاہتے جاتے۔ کراچی کے پٹھان آباد کاروں نے ہمارے اعزاز میں جلسہ کیا سپاس نامہ پیش کیا۔ خدائی خدمت گاروں کے فنڈ میں 250 روپے جمع کرائے۔ کراچی میں مفتی کفائیت اللہ صاحب مولانا احمد سعید صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔

کراچی کے اجلاس میں ہی خدائی خدمت تحریک نے آل انڈیا کانگرس میں باقاعدہ شمولیت کا اعلان کیا اور اب باقاعدہ خدائی خدمت گار تحریک کا کارکن کانگریس کا ممبر بھی بن سکتا تھا۔ یاد رہے کہ 1929ء سے قبل مسلم لیگ جماعت کا رکن بھی کانگرس کا رکن بن سکتا تھا اسی طرح جمیعت العلمائے ہند کا رکن بھی اور بعد میں مجلس احرار کا رکن بھی کانگرس کا رکن بن سکتا تھا۔ دیگر یہ کہ خدائی خدمت گاروں کا کانگرس میں شمولیت میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ اس لئے کہ خدائی خدمت گار اور کانگرس دونوں ہی وطن کی آزادی کے حامی تھے۔ دونوں ہی جدوجہد میں عدم تشدد پر یقین رکھتے تھے،

دونوں جماعتیں ہی سیکولر سیاست پر یقین رکھتی تھیں۔ کراچی کے جلسہ کے بعد کچھ خدائی خدمت گار چند لیڈران کے ہمراہ واپس پشاور چلے گئے اور کچھ رضا کار بادشاہ خان کے ساتھ کانگرسی لیڈران کے ساتھ ہندوستان کے دیگر علاقوں کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ بادشاہ خان اور انکے ساتھی بذریعہ بحری جہاز بمبئی گئے۔ وہاں پر بہت لوگوں نے انکا استقبال کیا۔ جلوس نکالے گئے' جلسے بھی ہوئے۔ اسی طرح دہلی میں بھی بہت استقبال کیا گیا۔ جلوس جلسے بھی ہوئے پھر سہارن پور' لدھیانہ' جالندھر' امرتسر میں بھی بہت جلسے جلوس ہوئے اور بہت بڑا استقبال کیا گیا اور پھر خدائی خدمت گار واپس صوبہ سرحد پہنچ گئے۔

سرخ پوش پھر متحرک ہو گئے۔

چند روز آرام کے بعد بادشاہ خان بھی متحرک ہو گئے اور صوبہ سرحد کے مغربی اضلاع بنوں کوہاٹ وغیرہ کا دورہ کیا۔ گاؤں گاؤں گئے۔ لوگوں میں جاگرتا پیدا کی۔ انگریز کے خلاف متحرک کیا۔ جلسے کئے۔ جلوس نکالے بہت سے نئے لوگ تحریک خدائی خدمت گار میں شامل ہوئے۔ پنجاب کے جن علاقوں میں پشتو بولی جاتی ہے۔ کیمل پور اور میانوالی میں بھی بادشاہ خان گئے مگر وہاں کے خانوں اور وڈیروں نے کوئی جلسہ وغیرہ نہیں کرنے دیا۔ پنڈی گھیب کے صوبے دار ملک دوست محمد نے اپنے کارندوں کے ہمراہ خدائی خدمت گاروں کے پر امن جلوس پر فائرنگ کر دی جس سے جرنیل شاہ ولی جس نے جھنڈا اٹھا رکھا تھا شہید ہو گیا اور دیگر کئی خدائی خدمت گار زخمی ہوئے۔ جلوس پر پتھراؤ بھی کیا گیا۔ پھر بھی کئی دفعہ خدائی خدمت گار پنجاب کے ان اضلاع میں اپنا اثر قائم کرنے کے لئے آئے مگر پنجاب کی نوکر شاہی اور چوہدریوں نے انکے پیر نہیں ٹکنے دیے اور ناکام ہوئے۔ اسکے بعد خدائی خدمت گار تحریک کی جدوجہد پختون علاقوں میں رہی۔ بادشاہ خان نے ہر پختون علاقے کا پیدل دورا کیا۔ لوگوں نے بہت بڑھ چڑھ کر تحریک میں حصہ لیا۔ 1931ء میں بادشاہ خان مہاتمہ گاندھی سے ملنے باردولی گئے راستے میں نواب آف بھوپال کے افسران نے انہیں گاڑی سے اتار لیا۔ مہمان نوازی کی نواب صاحب سے ملاقات بھی ہوئی نواب آف بھوپال نے بادشاہ خان کو وائسرائے ہند سے ملانے کی تجویز پیش کی مگر بادشاہ خان نہیں مانے اور وہ بار دولی میں مہاتمہ گاندی سے ملنے چلے گئے۔ باردولی میں کانگرسی لیڈران نے ریلوے سٹیشن پر انکا استقبال کیا اور پھر مہاتمہ گاندھی سے بھی ملاقات ہوئی۔ مہاتمہ گاندھی کے ساتھ تقریبا ایک ماہ رہے۔ بہت سارے جلسوں کو خطاب کیا۔ بہت سارے اشرم بھی دیکھے۔ ہر جگہ پختون آباد کاروں نے بھی والہانہ استقبال کیا۔ گاندھی جی کبھی کبھی صوبہ سرحد کے مختلف معاملات پر تبادلہ خیالات کرتے رہتے تھے۔ ایک ماہ کے بعد گاندھی جی نے واپس جانے کی اجازت دی اور پتہ چلا کہ وائسرائے ہند مہاتمہ گاندھی کو میرے خلاف بدظن کر رہا تھا اور گاندھی جی مختلف معاملات میں میرے ساتھ باتیں کرتے تھے اور پھر وائسرائے کے ساتھ تحریری تبادلہ خیالات ہوتا۔

وائسرائے کا مقصد یہ تھا کہ گاندھی جی کو خدائی خدمت گاروں کی حمایت سے دست بردار کر دیا جائے۔ اس مقصد میں وائسرائے ہند کامیاب نہ ہوا اور گاندھی جی میری تحریک خدائی خدمت گار سے مطمئن ہو گئے اور بادشاہ خان واپس آ گئے واپس جب صوبہ سرحد پہنچے پتہ چلا کہ بھابڑا گاؤں میں چند بچوں نے ایک ڈرامہ کیا جو سرکار کے خلاف تھا۔ جس کے مین کردار گرفتار کر لئے گئے۔ جنہیں دو دو نہیں تین تین سال کی سزائیں ہوئی۔ درمیانے درجے کی خدائی خدمت گار لیڈر شپ کی اس صورتحال پر بہت خفا ہوئے۔ کچھ لیڈروں نے اس ڈرامے سے بری الذمہ ہونے کا اعلان کیا۔ اور کچھ لیڈر تحریک خدائی خدمت گار سے مستعفی بھی ہوئے۔ بلاخر بادشاہ خان نے اس صورت حال پر کنٹرول کر لیا۔

حکومت کا تشدد خدائی خدمت گاروں پر دن بدن بڑھتا رہا۔ جو بھی سرخ وردی میں رضاکار پولیس کو نظر آتا اسے حراساں کیا جاتا۔ مارا جاتا اور اعلان کر دیا گیا کہ جی ٹی روڈ پر کوئی بھی باوردی سرخ پوش نظر آئے تو اسے گرفتار کر لیا جائے۔ ہر روز سرخ پوشوں پر ظلم کے نئے طریقے اپنائے جاتے۔ ایک بس میں بادشاہ خان اور چار سرخ پوش رضاکار جا رہے تھے پولیس نے بس کا راستہ روک کر بادشاہ خان اور سرخ پوش رضا کاروں کو بس سے نیچے اتار لیا اور یہ لوگ پیدل اپنی منزل پر پہنچے اس ساری صورتحال سے گاندھی جی باخبر تھے۔ انہوں نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ صوبہ سرحد جاویں مگر وائسرائے ہند نے انہیں جانے سے روک دیا۔ پھر گاندھی جی نے پنڈت جواہر لال نہرو اور پٹیل کو صوبہ سرحد بھیجنا چاہا۔ وائسرائے یہ بھی نہ مانے آخر انہوں نے اپنے بیٹے دیو داس گاندھی کو صوبہ سرحد کے حالات معلوم کرنے کو بھیج دیا اور ساتھ بذریعہ ٹیلی گرام یہ پابندی بھی لگائی کہ دیو داس کے اعزاز میں کوئی جلسہ یا جلوس نہ کریں۔ دیو داس جب آئے تو انہوں نے بھی یہی کہا اس لئے ان کے استقبال کے لئے جلوس جلسہ وغیرہ نہیں ہوا۔ تمام صوبہ سرحد میں انہیں گھومایا گیا۔ حالات دیکھائے گئے۔ بیانات قلمبند کرائے گئے۔ سرکار نے دیو داس اور مجھے قتل کرانے کی سازش بھی کی جس میں ہم بچ گئے۔ ہم جس گاڑی پر اتمان زئی سے سوار ہوئے تھے اس گاڑی پر راستے میں فائرنگ کی گئی تھی جس میں سوار سرخ پوش زخمی ہوئے تھے۔ چونکہ ہم نے راستے میں گاڑی بدل لی تھی۔ اس لئے ہم بچ گئے تھے۔ دیو داس گاندھی صوبہ سرحد کا دورا مکمل کر چکے واپسی پر ہم بھی بمبئی انکے ساتھ چلے گئے۔ کانگرس کے جلسہ میں شریک ہوئے۔ صوبہ سرحد کے معاملات زیر بحث آئے۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے کہا صوبہ سرحد کے کانگرس کے تمام اختیارات بادشاہ خان کا پاس ہیں۔ جیسے وہ پارٹی چلائیں گے ویسے ہی چلے گی۔ بادشاہ خان جب واپس صوبہ سرحد پہنچے تو پھر اپنی جدوجہد میں مستعد ہو گئے۔ چند روز بعد گاندھی جی کا تار ملا کہ شملہ آؤ شملہ جاتے ہوئے راستے میں عوام کے کہنے پر لاہور اور جالندھر کے جلسوں سے بھی خطاب کیا۔ پھر شملہ گئے۔ پنڈت نہرو بھی شملہ میں ہی موجود تھے۔ گاندھی جی نے گول میز کانفرنس میں شمولیت کے بارے مشورہ کرنا تھا۔ گاندھی جی سے تمام ورکنگ کمیٹی کے ممبران نے کہا کہ وہ ضرور گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لئے لندن جاویں۔ مجھے گاندھی جی نے کہا کہ آپ ہوم سیکرٹری اور چیف سیکرٹری سے مل لیں۔ صوبہ سرحد کے ظلم کے بارے میں ان سے بات چیت کی ہے۔

آپ بھی انہیں اپنی داستان غم سنائیں۔ شملہ میں ہی پنجاب کے ایک خان بہادر صاحب جو محکمہ انٹیلی جنس میں تھے انکے بیٹے نے جو اسلامیہ کالج پشاور میں زیر تعلیم تھا مجھے چائے کی دعوت دی جو میں نے قبول کی۔ بلبل ہوٹل میں یہ دعوت کی گئی تھی جب میں ہوٹل میں پہنچا تو ہمارے لئے چائے کا الگ انتظام کیا گیا تھا۔ ہوٹل میں انگریز بھی چائے پی رہے تھے۔ انہوں نے خدائی خدمت گاروں کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ ہم الگ جگہ پر جا کر بیٹھ گئے۔ اس دعوت میں فیروز خان نون اور پنجاب کے متعدد لیڈروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ فروز خان نون جب دعوت میں تشریف لائے تو آتے ہی انہوں نے کہا کہ خان صاحب آپ نے غضب کر دیا۔ آپ کانگرس میں شامل ہو گئے۔ اس پر میں نے انہیں جواب دیا کہ ہم پر انگریز ظلم کرتا تھا ہم آپکے پاس مسلم لیگ کے پاس آئے کہ ہمیں انگریز کے ظلم سے نجات دلائیں آپ نے ہمیں کورا جواب دے دیا۔ اور پھر ہم کانگرس کے پاس گئے کانگرس نے ہمارا ساتھ دیا اور آزادی کی جنگ میں ہماری ساتھی بنی۔ اس لئے ہم کانگرس میں شامل ہوئے۔

بادشاہ خان شملہ میں

ملک صاحب: ہم آپ سے کہتے ہیں کہ اگر مسلم لیگ اور پنجاب کے لیڈران آزادی کی اس جنگ میں ہمارے ساتھ دیں تو ہم ابھی کانگرس کو چھوڑ کر مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ ملک سرفراز خان نون 15 سال بعد بہار میں ملے تو میں نے انہیں شملہ والی بات یاد دلائی تو انہوں نے نظریں نیچی کر لیں کوئی جواب نہ دیا۔ شملہ میں فارن سیکرٹری مسٹر ہارن سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ صوبہ سرحد میں ڈپٹی کمشنر رہ چکا تھا۔ کچھ گلہ گزاریاں انکی تھیں، کچھ ہماری جدوجہد کے نتائج تھے۔ بہر حال ملاقات بڑے خوش گوار ماحول میں ہوئی انہوں نے مجھے لالچ بھی دینے کی کوشش کی جس کا میں نے یہ جواب دیا کہ میں ایک پیسہ کی روٹی اور ایک پیسہ کی دال پر گزر اوقات کر سکتا ہوں۔ مجھے کسی لالچ کی ضرورت نہیں۔ فارن سیکرٹری مسٹر ہارن اچھا آدمی تھا اس کی بات چیت میں رعونت نہ تھی۔ پھر ہوم سیکرٹری سے ملاقات ہوئی۔ انکے مزاج میں تکبر تھا، رعونت تھی۔ انہوں نے الزام لگایا کہ خدائی خدمت گار تشدد والی جماعت ہے اور انگریز حکومت اتنی کمزور نہیں کہ وہ کسی تشدد سے مرغوب ہو جائے یا ختم ہو جائے۔ شملہ میں کچھ دوستوں نے وائسرائے سے ملاقات کا مشورہ بھی دیا جو نہ ہو سکی۔ پارٹی میں گروہ بندی شملہ کانفرنس سے واپس آنے پر پتہ چلا کہ خدائی خدمت گار تحریک میں انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ تحریک کے مقتدر ساتھی سید احمد شاہ نے نیا گروپ جماعت میں ہی بنا لیا ہے اور اس انتشار کو پنجاب کے اخبارات نے بہت اچھالا اور ساتھ ہی سرکاری لوگوں نے انتشار کو اپنے لئے بہت استعمال کیا۔ بہت کوشش کی مگر میاں احمد شاہ اور انکے ساتھی ڈھپ پر نہ آئے تھے۔ انہیں ایام میں ڈیرہ اسماعیل خان میں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا۔ وہاں جا کر حالات معلوم کئے تو یہ سب حکومت کی شرارت تھی۔ مگر فساد تو ہوئے تھے لوگوں کے نقصان بھی ہوئے تھے بادشاہ خان نے ہندوؤں اور

مسلمانوں میں صلح کی بہت کوشش کی مگر کوئی نمایاں کامیابی نہ ہوئی۔ پھر انہوں نے بنوں اور کوہاٹ کے ہندو خدائی خدمت گاروں کو بلا لیا۔ جس سے انہیں سمجھایا گیا اور کسی حد تک معاملے کو سلجھاؤ ہو سکا۔ اندرونی خلفشار کے بارے میں پشاور میں خدائی خدمت تحریک کی مرکزی کونسل کا اجلاس ہوا۔ جس میں پارٹی انتشار پر غور کیا گیا۔ مرکزی کونسل نے تمام اختلافات کو رد کیا اور بادشاہ خان پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔

اکتوبر 1931 میں دہلی میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ لونڈ خورڈ کے غلام محمد خان کے ہمراہ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کی اور کہا گاندھی ارون پیکٹ کے باوجود صلح کے باوجود ابھی تک مالاکنڈ ایجنسی کے قیدیوں کو رہا نہیں کیا گیا۔ ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس حکومت کو سفارش کرے کہ وہ مالاکنڈ ایجنسی کے قیدیوں کو رہا کریں۔ ورکنگ کمیٹی کے جلسہ سے واپسی کے بعد بادشاہ خان نے ضلع ہزارہ کے دروہ کا پروگرام بنایا۔ بیس سرخ پوش رضاکاروں کے ساتھ ضلع ہزارہ کے دروہ پر روانہ ہو گئے۔ پہلا جلسہ ہری پور میں کیا۔ پھر وہاں سے ایبٹ آباد روانہ ہوئے۔ ہری پور کے حکیم عبدالسلام اور دیگر خدائی خدمت گار بھی ساتھ تھے۔ ایبٹ آباد میں دفعہ ایک سو چوالیس لگا دی گئی تھی۔ خدائی خدمت گار رضاکار چار چار کی ٹولیوں میں بٹ گئے۔ یہ رضا کاروں کا ایک بہت بڑا جلوس بن گیا تھا۔ پھر سارے ضلع ہزارہ میں دفعہ ایک سو چوالیس تقریباً ہر جگہ استقبال کرتی رہی۔ چار چار کی ٹولیوں میں ہر جگہ تقسیم ہوتے رہے اور مسجدوں میں جلسے کرتے۔ حکومت کے ہر حربے کے باوجود ضلع ہزارہ کا دورہ کامیاب رہا۔ ضلع ہزارہ سے واپسی پر پنجاب کے علاقہ ہنجمہ میں ہم نے چاہا کہ لوگوں کو جمع کر کے جلسہ کریں مگر پولیس نے ہمیں ایسا نہ کرنے دیا اور ہمیں حکم دیا گیا کہ شام سے قبل پنجاب کے علاقہ سے نکل جاویں۔ بہت ساری پولیس نے ہمیں ایک بس میں بٹھا کر دریائے اٹک سے پار صوبہ سرحد کی طرف دھکیل دیا اور ہم دورہ ختم کر کے واپس آ گئے۔

ہم نے آرام سے تھوڑا ہی بیٹھنا تھا پھر دیہاتوں کا دورہ شروع کر دیا گیا۔ انہی ایام میں ڈاکٹر خان صاحب کے پاس گورنر سرحد کے کئی پیغام آئے کہ وہ بادشاہ خان سے ملنا چاہتے ہیں۔ مختلف علاقوں کا دورہ ختم کر کے جب واپس پشاور پہنچے تو ڈاکٹر خان صاحب نے گورنر سے ملاقات کے لئے کہا۔ میں نہیں مانتا تھا مگر ڈاکٹر صاحب نے مجبور کیا تو جانا پڑا موجودہ گورنر پہلے گورنر سے بہتر تھا۔ بڑے اچھے طریقے سے پیش آیا۔ مختلف موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ بعض جو شکایات ہمیں تھیں وہ اس نے نوٹ کر لیں کہ وہ وائسرائے ہند سے ان امور پر تبادلہ خیال کریں گے۔ ملاقات ختم ہو گئی

سرحد کونسل کا اجلاس

دسمبر 1932ء میں سرحد کونسل اجلاس اتمان زئی میں منعقد ہوا جس میں حکیم عبدالسلام نے تجویز پیش کی کہ جو دوست خدائی خدمت گار تنظیم سے الگ ہو گئے ہیں انہیں واپس لایا جائے۔ بہت سارے

لوگوں نے اس کی تائید کی مگر انکو پارٹی سے نکالا تو نہیں گیا تھا وہ خود ہی پارٹی چھوڑ گئے تھے۔ وہ اگر خود ہی دوبارہ پارٹی میں آنا چاہتے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ کچھ لوگوں نے مخالفت کی کہ وہ پارٹی بھی خود چھوڑ کر گئے ہیں اور وہ اس وقت پارٹی کی مخالفت بھی کر رہے ہیں۔ دوسری تجویز یہ پیش کی گئی کہ کانگریس سے پارٹی کے لئے امداد لینی چاہئے۔ بادشاہ خان اور بہت سارے لوگوں نے امداد لینے کی مخالفت کی اور کہا کہ ہم کانگرس سے اس وقت کچھ بھی نہیں لیتے اور لوگ اتنی باتیں بناتے ہیں۔ اگر ہم نے امداد لی تو لوگ کیا کیا باتیں نہ بنائیں گے بادشاہ خان نے یہ بھی کہا اس بات پر جواہر لال نہرو مجھ سے ناراض بھی تھے۔ ڈاکٹر انصاری کے گھر میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور مجھے کہا گیا کہ سرحد پارٹی کو قبل ازیں ہم پانچ سو روپے ماہوار کی امداد دیا کرتے تھے۔ اس وقت چونکہ پارٹی بہت بڑی ہے آپ زیادہ امداد بھی لے سکتے ہیں۔ جسکا میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ ملک آپکا نہیں ہمارا بھی ہے اس لئے جتنی قربانی آپ کریں گے اس سے زیادہ ہم کریں گے۔ خدائی خدمت گار سردار رام سنگھ نے تجویز پیش کی کہ انگلستان کے وزیراعظم نے سرحد کے حقوق کے بارے جو تقریر کی ہے وہ تسلی بخش نہیں۔ ہمیں منظور نہیں کرنی چاہئے۔ وکیل سمین جان نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا جو حقوق ہمیں مل رہے ہیں وہ لے لینے چاہئیں۔ قاضی عطاءاللہ جان نے اور علی اصغر خان نے کہا کہ جو ملتا ہے وہ لے لینا چاہئے۔ مزید کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ میں نے کہا کہ اگر اصلاحات میں کچھ فائدہ نظر آتا ہے تو لے لینا چاہیے۔ اگر تمام ہندوستان ان اصلاحات پر عدم اطمینان کا اظہار کرے تو ہمیں رد کر دینی چاہئیں بلاخر سردار رام سنگھ کی تجویز منظور ہو گئی۔

صوبہ کی جنرل کونسل کا اجلاس ختم ہو گیا وزیراعظم برطانیہ نے ہندوستان کے لئے جن اصلاحات کا اعلان کیا تھا اسکے متعلق سرحد کے گورنر نے ایک دربار منعقد کیا تھا۔ جس میں خان برادران کو بھی مدعو کیا گیا۔ مگر خدائی خدمت گاروں نے ان اصلاحات کو ناکافی سمجھتے ہوئے گورنر کے دربار میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ اسی اثناء میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ بمبئی کا بلاوا آ گیا۔ ہمیں 26 دسمبر کو بمبئی پہنچنا تھا مگر اسی روز ہم دونوں بھائیوں ڈاکٹر صاحب اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ دو گاڑیوں میں بیٹھا کر لے گئے۔ اٹک کے پل پر ہمیں ایک پولیس چوکی پر بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں قاضی عطاءاللہ جان اور ڈاکٹر خان صاحب کے بیٹے سعد اللہ خان بھی گرفتار ہو کر آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں ریلوے سٹیشن پر لے جا کر گاڑی میں سوار کر دیا گیا اور ہمارے اوپر سنگین پہرہ مسلح پہرہ لگا دیا گیا۔ لندن میں گول میز کانفرنس ناکام ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں سب سے پہلے بادشاہ خان اور خدائی خدمت گاروں کو گرفتار کیا گیا۔ اسی رات 500 پانچ سو خدائی خدمت گار گرفتار ہوئے۔ پھر عام گرفتاریاں ہوئی۔ ہزاروں خدائی خدمت گار گرفتار کر لئے گئے اور گرفتار شدگان پر تشدد بھی بہت کیا جاتا تھا۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ گرفتار خدائی خدمت گار پکڑے جاتے' ان پر تشدد کیا جاتا' انکا گھر لوٹا جاتا' رسوا کیا جاتا' چھوڑ دیا جاتا۔ جو لوگ جیلوں میں تھے ان پر بھی طرح طرح کے تشدد کئے جاتے۔ کئی لوگ تشدد کیوجہ سے ہی موت کی نیند سو جاتے بادشاہ خان کو ہزاری باغ جیل صوبہ بہار میں بھیج دیا اور قید تنہائی

میں رکھا گیا۔ قاضی عطااللہ جان' ڈاکٹر خان صاحب اور سعداللہ خان کو بھی بہار کی مختلف جیلوں میں قید تنہائی میں رکھا گیا جو کہ انتہائی تکلیف دہ تھی۔ تقریبا ایک سال قید تنہائی کے بعد بادشاہ خان کے ساتھ ڈاکٹر خان صاحب کو بھی بھیج دیا گیا۔ دونوں بھائیوں نے جیل کی خالی جگہ پر سبزی وغیرہ بھی کاشت کی۔ پپیتے کے درخت بھی لگائے۔ 1934ء میں جب ہماری رہائی ہوئی تو ہمارا مشقتی جو ہمارا کھانا پکاتا تھا وہ بہت خفا ہوا۔ رنجیدہ ہوا۔ میں نے کہا کہ تو ہماری رہائی پر خوش نہیں وہ کہنے لگا رہائی پر تو خوش ہوں مگر جدائی پر رنجیدہ ہوں۔

خان برادران کی ہزاری باغ جیل سے رہائی

رہائی کے بعد ہم پٹنہ آئے۔ وہاں پر ایک سیاسی قیدی جو ہمارے ساتھ جیل میں تھا اسکے مہمان بنے۔ جب دیگر سیاسی قیدیوں کو پتہ چلا کہ ہم رہا ہو گئے۔ وہ بھی سب جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد بھی آ گئے۔ ہمارا بہت بڑا جلوس نکالا گیا۔ بہت بڑا جلسہ ہوا اور پٹنہ میں ہی پتہ چل گیا کہ سرکار نے صوبہ سرحد اور پنجاب میں بادشاہ خان کے داخلے پر پابندی لگا دی ہے۔ ان حالات میں گاندھی جی اور جمنا لال بزاز نے ہمیں دعوت دی کہ سرحد اور پنجاب میں داخلے پر پابندی ہے اس لئے آپ ہمارے پاس واردھا آجاویں اور ہم وردھا چلے گئے۔ تھوڑے دن کے بعد بمبئی میں آل انڈیا کانگرس کا اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو کانگرس کا صدر بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کا تار مجھے ملا کہ کانگرس کا صدر مجھے بنایا گیا ہے۔ میں آپکے حق میں دست بردار ہوتا ہوں۔ میں نے بذریعہ تار ہی انہیں جواب دیا کہ میں خدائی خدمت گار ہوں کوئی عہدہ وغیرہ میری ضرورت یا خواہش نہیں۔ پھر ہم بمبئی کانگرس کے اجلاس میں شرکت کے لئے گئے۔ بمبئی میں کانگرس کے جلسے کا پنڈال بہت بڑا خوبصورت بادشاہ خان کے نام پر بنایا گیا تھا۔ بہت بڑا جلسہ ہوا اور جلسہ کی صدارت بھی بادشاہ خان نے کی کہ جلسہ کے اختتام پر بادشاہ خان کلکتہ چلے گئے۔ وہاں کلکتہ کارپوریشن نے استقبالیہ پیش کیا۔ پھر بہت بڑا جلسہ ہوا کئی بنگالی لیڈران سے ملاقات بھی ہوئی

بادشاہ خان سہروردی ملاقات

بادشاہ خان کی جناب سہروردی سابق وزیراعظم پاکستان سے کلکتہ میں ملاقات ہوئی۔ کلکتہ ہی کے ایک ہندو لیڈر کو ساتھ لے کر وہ دیہاتوں میں بنگال کے لوگوں میں آزادی کی شمع روشن کرنے لگ گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ صوبہ سرحد میں تو جانے کی اجازت نہیں۔ انہوں نے بنگال کے عوام میں ہی تحریک آزادی کا درس شروع کر دیا۔ پھر وہ گرفتار کر لئے گئے۔ دو سال قید ہوئی۔ کچھ روز بمبئی جیل میں رکھا گیا اور پھر سابرمتی جیل بھیج دیا گیا۔ اس جیل میں اسکے ساتھ بہت تکلیف دہ سلوک کیا گیا قید

تنہائی میں رکھا۔ آب ہوا اچھی نہ تھی۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ خوراک سی کلاس سے بھی بدتر دی جاتی تھی۔ وہاں سے الموڑہ جیل میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہاں بھی صورت حال یہ ہی تھی۔ آخر اس جیل سے اگست 1936ء کو رہا ہوا اور ساتھ ہی ایک پروانہ دے دیا گیا کہ آپ صوبہ سرحد اور پنجاب نہیں جا سکتے۔ وہ اس لئے کہ صوبہ سرحد میں الیکشن ہو رہے تھے۔ سرکار نہیں چاہتی تھی میری سرحد میں ہونے کی وجہ سے خدائی خدمت گاروں کو زیادہ سیٹیں مل جاویں۔ رہائی کے بعد جیل کے گیٹ سے باہر ہوا تو دیکھا الموڑہ کے بہت سارے کانگرسی میرے استقبال کو کھڑے تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ الموڑہ لے گئے۔ رات جلسہ ہوا۔ سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ بہت لوگ تھے میری بہت عزت افزائی کی گئی۔ دوسرے روز میں واردھا گاندھی جی کے پاس جانے کے لئے روانہ ہو گیا۔ گاندھی جی واردھا میں نہ تھے مگر مجھے ایک رات واردھا میں ٹھرا لیا گیا۔ رات کو بہت بڑا جلسہ ہوا۔ دوسرے روز سیوگرم جہاں گاندھی جی ٹھرے ہوئے تھے پہنچا۔ گاندھی جی مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ آگے بڑھ کر میرا استقبال کیا۔ انکے ساتھ جمنا لال بزاز اور دوسرے کانگرسی لیڈر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ گاندھی جی بہت خوش ہوئے۔ میرے گھر والوں کو میری رہائی کا پتہ چلا تو میرے بیٹے غنی اور ولی اور بیٹی مہر تاج ملنے کو سواگرام آئیں

1937ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس تھا۔ دو سال قبل مجھے بمبئی سے ہی گرفتار کیا گیا تھا اور دو سال قید ہوئی تھی۔ گاندھی جی مجھے نہیں جانے دیتے تھے کہ کہیں پھر گرفتار نہ ہو جائے۔ ابھی تو رہا ہو کر آیا ہے۔ چند روز آرام تو کر لے۔ مگر پنڈت نہرو گاندھی جی سے اصرار کر کے مجھے ساتھ لے گئے۔ جن مسیحی لوگوں کے جلسہ میں تقریر کرنے سے قبل دو سال گرفتار کیا گیا تھا۔ انہیں ہی لوگوں نے پھر جلسہ کیااور بہت عزت افزائی کی کانگرس کی صدارت کے لئے مجھے کہا گیا میں نے انکار کر دیا۔ پھر متفقہ طور پر پنڈت نہرو کو کانگرس کا صدر بنایا گیا۔

بمبئی کے قریب ہی فیض پور قصبہ تھا وہاں کانگرس کا جلسہ ہوا۔ ایم این رائے بھی کانگرس کے جلسہ میں شریک ہوئے۔ وہ ورکنگ کمیٹی کے ممبر بننا چاہتے تھے۔ وہ انہیں ایام میں تاشقند سے آئے تھے۔ ورکنگ کمیٹی کا ممبر نہ بن سکنے کی وجہ سے وہ بلاخر کانگرس کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے کمیونسٹ پارٹی بنا لی اور اس سیاست پر گامزن ہو گئے۔ انہیں ایام میں تمام ہندوستان میں 1935ء ایکٹ کے تحت صوبائی الیکشن ہوئے۔ صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گاروں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ جنہوں نے 5.3 فی صد ووٹ حاصل کئے۔ بادشاہ خان کو صوبہ سرحد جانے کی اجازت نہ تھی۔ اسکے باوجود خدائی خدمت گاروں نے صوبہ کی اسمبلی میں اکثریت حاصل کی۔

بادشاہ خان سیواگرام میں

بادشاہ خان سیواگرام میں گاندھی جی کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ اس گاؤں کی صفائی کرنے والوں نے گاؤں کی صفائی سے انکار کر دیا۔ گاندھی جی کے ساتھ مل کر ہم نے گاؤں کی صفائی کی۔ مگر گاؤں

کے لوگ ذہنی طور پر ہمارے خلاف ہو گئے۔ جس کوئیں سے ہم پانی لیا کرتے تھے اس کوئیں سے پانی لینا چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ ہم پر الزام تھا کہ ہم نے نیچ کام کیا ہے۔ اس لئے ہمارا کنواں بھی انکے خیال میں بھرسٹ ہو گیا تھا اور ہم انکے نزدیک اچھوت بن گئے تھے۔

صوبہ سرحد میں کل صوبے کی 40 نشستیں تھیں۔ جن میں سے 19 پر خدائی خدمت گار کامیاب ہوئے تھے۔ مگر وزارت کی دعوت گورنر سرحد نے صاحب زادہ عبدالقیوم خان کو دی۔ انکی وزارت چھ ماہ سے زیادہ نہ چلی۔ بجٹ منظور نہ کرا سکی ختم ہو گئی۔ پھر کانگر وزارت ڈاکٹر خان صاحب کی قیادت میں بنائی گئی۔ ان ایام میں بادشاہ خان بنارس میں ہی تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ بنارس میں ان دنوں ایک صاحب نے برائے عبادت ایک ایسی جگہ بنائی تھی جس میں ہر عقیدہ کے لوگ جا کر عبادت کر سکتے تھے۔ کسی کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ انہیں ایام میں بادشاہ خان نے سندھ اور بلوچستان کا دورہ بھی کیا۔ کوئٹہ میں خان عبدالصمد خان اچک زئی نے اپنے کارکنوں کے ساتھ بادشاہ خان کا استقبال کیا اور بلوچستان کے بہت بڑے علاقوں کا دورہ بھی کیا۔ جھٹ پٹ کے بلوچ علاقہ میں بادشاہ خان ایک جلسہ کر رہے تھے۔ انکے جلسہ پر وہاں کے بلوچوں نے حملہ کر دیا۔ بادشاہ خان اور انکے ساتھی بلوچوں کی کلہاڑیوں سے زخمی ہوئے۔ مضروبین کو ہسپتال لایا گیا۔ چند روز انکا علاج کیا گیا صحت یاب ہونے پر وہاں سے آگئے۔

بادشاہ خان

1937ء میں سات سال بعد صوبہ سرحد میں داخل ہونے کی اجازت ملی۔ گزشتہ سات سالوں میں خدائی خدمت گاروں پر بہت ظلم کئے گئے۔ سرخ وردی بھی صوبہ سرحد میں منع کر دی گئی۔ مگر جب بادشاہ خان اپنے صوبے میں داخل ہوئے تو ورکروں نے از خود ہی پابندی توڑ کر سرخ وردی پہننی شروع کر دی۔ پھر سرکار نے بھی کوئی مداخلت نہ کی ساتھ ہی یہ کہ صوبہ سرحد کی اسمبلی میں بھی خدائی خدمت گاروں کو اچھی خاصی پوزیشن بن چکی تھی اور ہندوستان میں بھی کانگرس اکثر صوبوں میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس لئے سرکار نے خدائی خدمت گاروں کے ساتھ مزید الجھنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر اب سرکار انکے خلاف اپنے کارندوں سے دباؤ ڈال رہی تھی۔ جنمیں پیر اور مولوی حضرات' خان بہادر' سر صاحبان پیش پیش تھے۔ مولوی محمد اسحاق مانسہروی بھی بادشاہ خان کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ سر صاحب زاد عبدالقیوم کی اکثریت نہ ہوتے ہوئے بھی صوبہ سرحد کا وزیر اعلیٰ انہیں بنا دیا گیا تھا۔ جنکے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر کے اسے شکست دی جا چکی تھی۔ سر صاحب زادہ عبدالقیوم کی وزارت کو شکست ہو جانے کے بعد ڈاکٹر خان صاحب کی زیر قیادت کانگرس کی مرکزی قیادت ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مولانا ابوالکلام آزاد اور بادشاہ خان کے مشورہ سے چار وزراء پر مشتمل وزارت قائم کی گئی۔ ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ قاضی' عطاءاللہ خان' لالہ بھنجو رام اور ضلع ہزارہ سے وزیر لئے گئے

اور پہلی خدائی خدمت گار وزارت قائم ہو گئی۔ خدائی خدمت گار وزارت کو جو مشکل آئی وہ یہ تھی کہ نوکر شاہی اپنی ڈگر پر چل رہی تھی۔ وزیروں کی پرواہ نہیں کرتی تھی۔ جسکو بڑے جتن سے کسی حد تک سیدھے راستے پر لایا گیا مگر ہمارے وزیر جب نوکر شاہی سے خلت ملت ہوئے تو انکی عادات میں بھی فرق آگیا۔ اور وہ خدائی خدمت گاروں کے مقاصد سے کچھ دور ہٹ گئے۔ جس سے ہماری تحریک کے مقاصد کو نقصان ہوا۔ انہیں ایام میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی صوبہ سرحد کا دورا کیا۔ تمام بڑے بڑے شہروں میں انکے جلوس اور جلسے کئے۔ جس سے یہ بہت متاثر ہوئے۔ پھر پشاور میں بہت بڑا جلسہ کیا گیا۔ جلوس نکالا گیا۔ کاروائی ساری پشتو زبان میں تھی جو کہ پنڈت نہرو کو سمجھ نہ آتی تھی مگر وہ لوگوں کے جوش خروش اور نعروں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

انہیں ایام 1938ء میں مہاتما گاندھی نے بھی صوبہ سرحد کا دورہ کیا۔ وہ بھی خدائی خدمت گاروں کے نظم و ضبط سے بہت متاثر ہوئے۔ بنوں کوہاٹ ڈیرہ اسماعیل خان مردان اور ضلع ہزارہ کا انہوں نے دورہ کیا اور خدائی خدمت گاروں کے نظم و ضبط کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب کی جس جگہ بھی میں گیا سٹیشن پر یا جلسہ پر ہر جگہ شور و غوغا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میں نے کانوں میں روئی ٹھوس رکھی تھی۔ مگر خدائی خدمت گاروں کے نظم و ضبط نے مجھے حوصلہ دیا ہے کہ لوگوں کو اگر صحیح طریقہ پر منظم کیا جائے تو بہت اچھے نتائج نکل سکتے ہیں۔ انہیں ایام میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس کلکتہ میں ہوا۔ ممبران ورکنگ کمیٹی کی رہائش کا بڑا پر تکلف انتظام کیا گیا تھا۔ یہ سارا انتظام بنگال کانگرس جسکے لیڈر سبھاش چندر بوس تھے وہ کر رہے تھے۔ میرے لئے بھی بہت پر تکلف انتظام کیا گیا تھا۔ پتہ چلا کہ یہ پر تکلف انتظام اس لئے بھی ہے کہ مسٹر بوس کانگرس کے صدر بننا چاہتے ہیں۔

وزارت اور مشکلات

صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گاروں کی وزارت تو بن گئی مگر مشکلات مزید بڑھ گئیں۔ اختیارات بہت ہی کم ملے۔ مگر لوگوں کی توقعات بہت زیادہ تھیں۔ اگر حکومت میں ایک نوکری کی آسامی نکلتی تو امیدوار سو ہوتے۔ اگر ایک نوکر رکھ لیا جاتا تو ننانوے ناراض ہوتے۔ جرگہ کا قانون جو کہ بہت ظالمانہ تھا مگر ہمارے پاس اسکے ختم کرنے کے اختیارات نہ تھے۔ اسی طرح ہم بہت کچھ کرنا چاہتے تھے مگر محدود اختیارات کی وجہ سے نہیں کر سکتے تھے۔ نوکر شاہی بظاہر ساتھ تھی مگر حقیقت میں وہ ہمارے سخت مخالف تھی۔ جس کسی سرکاری افسر کو رشوت یا کسی اور بدعنوانی میں پکڑا جاتا تھا اسے سزا دینے کی بجائے گورنر اسے ایجنسی میں تبدیل کر دیا کرتا تھا۔ بعض وقت سرکاری افسر ہمارے جلسوں کو بھی خراب کرتے تھے اور انہیں کوئی باز پرس نہیں ہوتی تھی۔ ہمارے اپنے گاؤں میں جوا بازی کا اڈا تھا۔ ڈاکٹر خان صاحب خود اڈے کو بند کرنے آ گئے۔ مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ پولیس تعاون ہی نہیں

کرتی تھی۔ بلکہ خود مجرموں کے ساتھ جرم میں شریک ہوتی تھی۔ کئی سرکاری افسران پر بدعنوانیاں ثابت ہوتیں مگر گورنر کی مداخلت سے وہ عدالت سے بری کر دیے گئے۔ اسکے علاوہ وزارت کی وجہ سے پارٹی میں بھی کئی قسم کی سازشیں ابھرنے لگیں۔ خدائی خدمت گاروں کے مخالف بھی سازشوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ ان حالات نے بادشاہ خان کو مجبور کر دیا کہ وہ وازارت چھوڑ دینے کی تجویز آل انڈیا کانگرس کے آگے پیش کریں مگر کانگریس نے جواب دیا کہ تجربہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی وزارتوں کا بھی اچھا نہیں آیا۔ اس لئے وزارتیں تو چھوڑ ہی دیں گے مگر ابھی وقت نہیں۔ وقت آنے پر تمام وزارتیں اکٹھی ہی چھوڑی جائیں گی۔

وازرت مستعفی ہو گئی

1939ء میں یورپ جنگ عالمگیر دوئم کی لپیٹ میں آ گیا۔ ایک جانب جرمن تھا جبکہ دوسری جانب بشمول برطانیہ تمام اقوام یورپ تھیں۔ ہندوستان پر حکومت بھی برطانیہ کی تھی۔ وائسرائے ہند نے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ کانگرس اس پر معترض ہوئی کہ وائسرائے ہند کو ہندوستان کی طرف سے اعلان جنگ کرنے کا کوئی حق نہ تھا کہ ہندوستان میں کانگرس نمائندہ جماعت ہے۔ اسکے مشورہ کے بغیر ہندوستان کو کسی جنگ میں دھکیلا نہیں جا سکتا اور کانگرس صرف اسی صورت جنگ میں ہندوستان کے شامل ہونے کی حمایت کر سکتی ہے کہ حکومت برطانیہ اعلان کرے کہ وہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزاد کر دے گی۔ بصورت دیگر کانگرس حکومت کے ساتھ عدم تعاون کرتے ہوئے ہندوستان کے تمام صوبوں میں وزارتوں سے الگ ہونے کا اعلان کرتے ہوئے مستعفی ہو گئے اور بشمول صوبہ سرحد کے ہندوستان کے گیارہ میں سے آٹھ صوبوں پر کانگرس کی حکومت تھی جو کہ سب کے سب مستعفی ہو گئے۔

کانگرس نے وزارتیں چھوڑ دیں

کانگریس نے وزارتیں چھوڑ دیں تو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس واردھا میں ہوا۔ جس میں سول نافرمانی کا ریزرویشن پاس کیا گیا۔ طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ سب سے پہلے وزیر اپنے آپکو سول نافرمانی کے لئے پیش کریں۔ پبلک جلسہ میں گورنمنٹ کی مخالفت کی جائے یورپ میں لڑی جانے والی جنگ کو برطانیہ کی جنگ کہا جائے۔ جنگ کے ساتھ عدم تعاون کا اعلان کیا جائے۔ فوجی بھرتی نہ دینے کا اعلان کیا جائے۔ اگر گورنمنٹ گرفتار کرلے تو ٹھیک ہے اگر گرفتاری نہ ہو تو مزید جلسے کئے جاویں اور سرکار کے خلاف لوگوں کو ابھارا جائے۔ سول نافرمانی کی اس تحریک کو فائدہ ہوا۔ بہت جوش و خروش سے جلسے جلوس بھی ہوئے مگر کچھ لوگوں نے تحریک میں بہت بزدلی دیکھائی۔ خاص کر وکلاء جو پارٹی

ممبران تھے یا اسمبلی کے ممبران تھے انہوں نے قطعی طور پر پارٹی ڈسپلن کی پرواہ نہیں کی۔ جن میں خان عبدالقیوم خان بیرسٹر اور ضلع ہزارہ کے وکیل پیش پیش تھے اور خدائی خدمت گار قربانیاں دے رہے تھے۔ وہ وکالت کے ذریعے مال پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان وکلا کو کہا گیا کہ یا وہ پارٹی چھوڑ دیں یا پارٹی ڈسپلن کریں مگر ان وکلاء نے کوئی پرواہ نہیں کی اور پارٹی کے لئے ذلت کا باعث بنتے رہے۔ پڑھے لکھے لوگ چاہے وہ انگریزی سکولوں کے پڑھے ہوئے تھے یا مولانا تھے انہوں نے ہماری تحریک میں کوئی کام نہیں کیا۔ انہیں ایام میں ایک انگریز اسسٹنٹ کمشنر نے بادشاہ خان کو قتل کرنے کی سازش بھی کی۔ دو جرائم پیشہ لوگوں کو قتل پر معمور کیا۔ مگر قاتلین اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ اپنی دشمن داری میں خود ہی قتل ہو گئے

1941ء میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں ہوا۔ جس میں شرکت کے لئے بادشاہ خان کو بمبئی جانا ہوا۔ انہیں ایام میں جاپان نے مشرق بعید پر حملہ کر دیا اور بہت سارے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس واردھا میں بلایا گیا۔ بادشاہ خان بھی تشریف لائے۔ نئی صورت حال جو جاپان کی جنگ میں شامل ہونے کی وجہ سے پیدا ہو گئی اس پر مکمل بحث ہوئی۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ بعض لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ہمیں جنگ میں حکومت کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔ عدم تشدد کا فلسفہ چھوڑ دینا چاہیے۔ جاپان چونکہ ہندوستان کی سرحدات کے قریب آ چکا ہے اس لئے ہمیں حکومت کے ساتھ مل کر اپنے ملک کا دفاع کرنا چاہئے۔ جبکہ گاندھی جی اور بادشاہ خان عدم تشدد کے حامی تھے۔ وہ جنگ میں کسی قیمت پر شرکت نہیں چاہتے تھے۔ آخر ورکنگ کمیٹی انتشار کا شکار ہو گئی۔ گاندھی جی اور بادشاہ خان ایک طرف رہ گئے اور باقی کانگرس ورکنگ کمیٹی دوسری طرف ہو گئی۔ گاندھی جی اور بادشاہ خان نے ورکنگ کمیٹی سے استعفےٰ دے دیا اور فیصلہ ہوا کہ وراداہا میں آل انڈیا کانگرس کا اجلاس بلایا جائے اور یہ معاملہ اس اجلاس میں رکھا جائے۔ واردہا میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے کثرت رائے سے یہ قرار داد منظور کر لی۔ مولانا ابوالکلام کی صدارت میں جلسہ تھا۔ بادشاہ خان کو بولنے بھی نہ دیا گیا۔ بادشاہ خان واپس پشاور پہنچ گئے۔ کانگریس کے اجلاس کے حالات بیان کئے۔ سرحد کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں بادشاہ خان کی جگہ ڈاکٹر خان صاحب کو ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کر دیا۔ اس وقت جنگ کے بادل ہندوستان کی سرحدات پر منڈلاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ انڈونیشیا' سنگاپور' ملائشیا اور دیگر تمام ممالک پر جاپان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ برما پر بھی جاپان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ کلکتہ پر جاپانی جہاز بمباری کر چکا تھا۔

یہ حالات خدائی خدمت گار تحریک کے لئے بہت ہی گھمبیر تھے۔ عدم تشدد کا فلسفہ ناکام ہوتا نظر آ رہا تھا۔ انہیں ایام میں حکومت انگلستان نے اپنے ایک وزیر سراسٹی فرڈ کرپس کو بھیجا تاکہ وہ ہندوستان کے لیڈروں سے ملاقات کر کے جنگ میں انکی حمایت حاصل کر سکیں۔ کرپس مشن ناکام ہوا اور مسٹر کرپس واپس انگلینڈ چلے گئے۔ خدائی خدمت گار رضاکاروں نے لوگوں میں یہ شعور پیدا کرنے کے لئے صوبہ سرحد کے تمام علاقوں میں اپنے ورکر بھیجے کہ یورپ میں جنگ کی وجہ سے اور جاپان کے

حملہ کی وجہ سے کپڑے کے کارخانے بھی بند ہو رہے ہیں اس لئے اپنی مدد آپ کے تحت پختون لوگوں کو قدم اٹھانا چاہیے۔ آنے والے وقت میں اناج کی قلت ہو سکتی ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ اپنی طاقت کے مطابق اناج ذخیرہ کریں۔ کپڑے کی قلت بھی ضرور آئے گی۔ اس لئے ہر شخص چرخا کاتنا سیکھ لے تا کہ اپنے لئے کپڑا خود تیار کر سکیں۔ مسٹر کرپس اپنے مشن میں ناکام ہوئے تو لوگوں میں مایوسی کے آثار نمایاں ہوئے۔ ان دنوں بمبئی میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ کانگرس نے ہندوستان چھوڑ دو کی قرار داد منظور کی۔ جس کا مطلب تھا کہ انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے جاویں اور ہندوستان کے لوگ خود ہی اپنے معاملات سلجھا لیں گے۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران گرفتار کر لئے گئے۔ انکی گرفتاری کے ساتھ ہی تمام ہندوستان میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ لوگوں نے عدم تشدد کی جگہ تشدد کی راہ اختیار کی۔ انگریز بھی یہی چاہتا تھا۔ اس نے 1942ء کی ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک کو کچل کر رکھ دیا اور لوگوں پر بہت ظلم کئے گئے۔ ظلم کرتے وقت سرکار نے مرد و زن کی تمیز نہ کی۔ فوج اور پولیس کی کاروائی کے علاوہ انہوں نے مشین گنوں سے ہوائی جہازوں سے بھی گولیاں چلائیں۔ بم چلائے گئے۔ ہر صوبہ کا ایک ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا تھا۔ صوبہ سرحد کا ڈکٹیٹر بادشاہ خان کو مقرر کیا گیا تھا۔ بادشاہ خان نے خدائی خدمت گاروں کی ایک میٹنگ بلائی جس میں شامل لوگوں نے کہا کہ کانگرس نے آپکو صوبہ سرحد کا ڈکٹیٹر مقرر کیا ہے۔ اس میٹنگ کی ضرورت کیا ہے۔ آپ حکم کریں گے ہم تعمیل کریں گے۔ فیصلہ ہوا کہ سڑکوں پر روکاوٹیں کسی جاویں' پل توڑے جاویں۔ مگر جو آدمی پل توڑے یا سڑک توڑے وہ خود ہی تھانہ میں پیش ہو کر اقبال جرم کرے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو بے گناہ لوگ بہت مارے جاویں گے۔ اسی وجہ سے تحریک کو بجائے فائدہ کے نقصان زیادہ ہو گا۔

پھر یہ فیصلہ ہوا کہ دیسی افسران کے پاس جاویں گے۔ انہیں کہیں گے کہ وہ انگریز کا حکم ماننا چھوڑ دیں بصورت دیگر انہیں کرسیوں سے نیچے گرا دیں گے اور عدالتی کام عوام خود ہی کریں گے۔ عدالتوں پر دھاوا بولنے سے قبل ہر عدالت میں چند خدائی خدمت گار جاتے۔حاکم اگر دیسی ہو تو اسے کہتے کہ تم انگریز کی تابعداری چھوڑو ہمارے ساتھ مل جاؤ تا کہ ملک آزاد ہو۔ اگر حاکم انگریز ہوتا تو اسے کہتے تم چھ ہزار میل سے یہاں حکمرانی کرنے آگئے ہو یہاں سے چلے جاؤ۔ آگے سے خدائی خدمت گار رضاکاروں کو مارا جاتا اور بڑا ہی بے دردی سے مارا جاتا۔ پھر زیادہ رضاکار مل کر عدالتوں اور سرکاری دفاتر پر دھاوا بول دیتے آگے سے پولیس اور افسران خود ڈنڈوں سے مارتے تھے۔ پشاور کا ڈپٹی کمشنر اس وقت سکندر مرزا تھا جو بعد میں پاکستان کا صدر بھی بنا۔ وہ بذات خود رضا کاروں کو ڈنڈے مارا کرتا تھا۔ ایک رضا کار کو اس نے خود ڈنڈا مارا تھا۔ ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ رضاکار وہیں مر گیا تھا اور بھی کئی لوگ ڈنڈوں سے شدید زخمی ہوئے اور شہید بھی ہو گئے۔ پھر گورنمنٹ نے پھر پالیسی بدلی۔ خدائی خدمت گاروں کو گرفتار کیا جاتا اور دور دراز کے جنگلوں میں جا کر چھوڑا دیا جاتا تھا۔ مگر چند روز بعد گورنمنٹ نے پالیسی بدل دی جو لوگ سرکار کے خلاف جلوس نکالتے انہیں ڈنڈوں سے مارا بھی جاتا۔ بے عزت بھی کیا جاتا اور قید بھی کر دیا جاتا۔ اسی طرح بادشاہ خان ایک جلوس
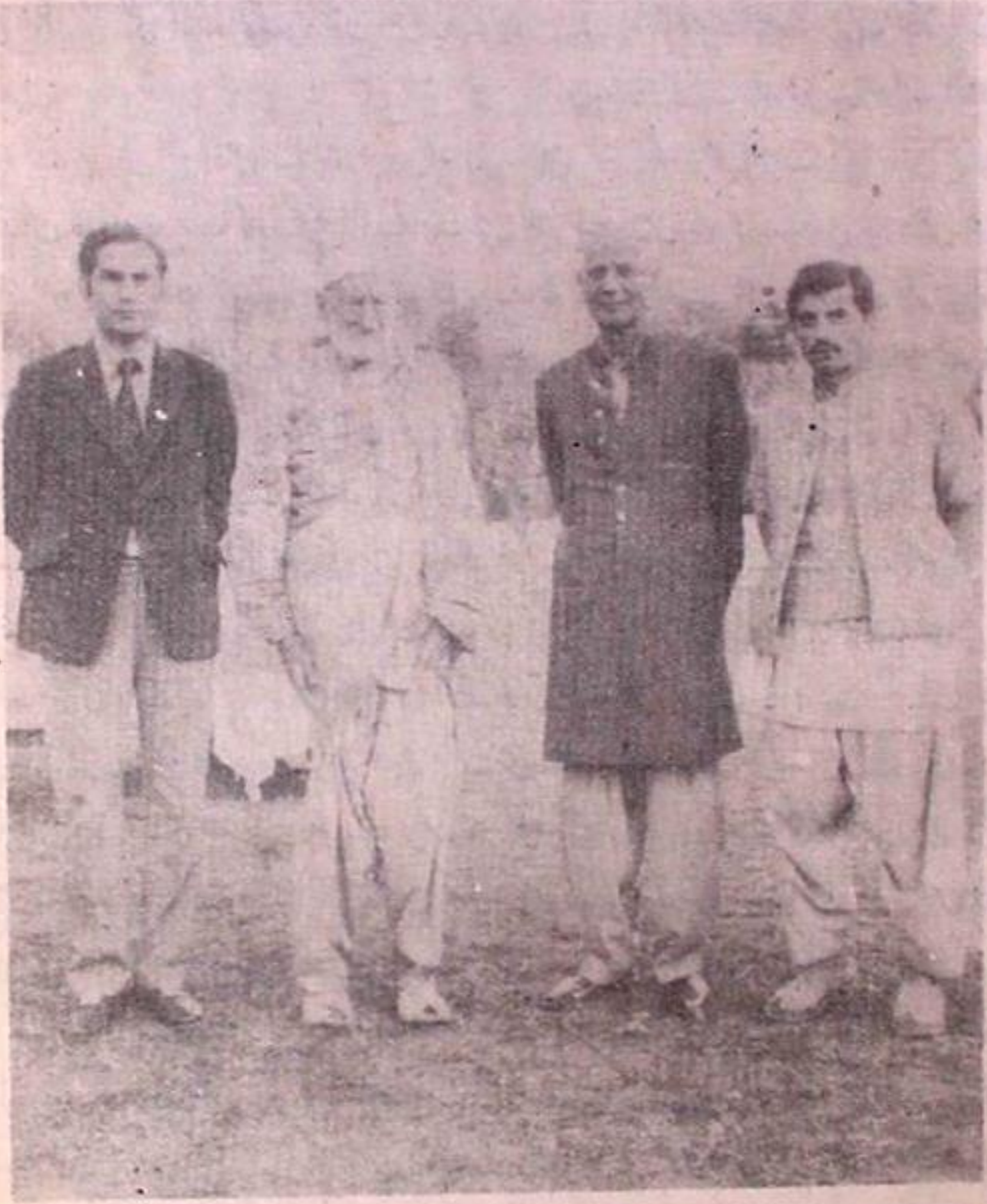
خان عبدالغفار خان اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ

کی قیادت کر رہے تھے آگے سے۔ انگریز حاکم ڈنڈا فورس لیے ہوئے خدائی خدمت گاروں کے مقابلہ میں آ گیا۔ اس نے نہتے اور عدم تشدد کے پروانوں پر ڈنڈے چلانے شروع کر دیے۔ سارے رضاکار شدید زخمی ہوئے۔ سب کو گرفتار کر لیا گیا اور مختلف جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ بادشاہ خان کو ہری پور جیل میں بھیجا گیا۔ پولیس تشدد کی وجہ سے ان کی پسلیاں ٹوٹ گئیں تھیں جن پر جیل میں پلستر کیا گیا اور وہ بہت دن تک اس چوٹ کی وجہ سے صاحب فراش رہے۔ ملاؤں اور پیروں کے ذریعے بادشاہ خان پر کفر کا فتوا لگایا گیا۔ ملاؤں اور پیروں کو خدائی خدمت گار تحریک کے خلاف استعمال کیا گیا۔ ہم نے یہ اپیل کی تھی کہ جو لوگ پختون سرکار کے ملازم ہیں وہ ملازمت چھوڑ دیں۔ انگریز سے ترک موالات کریں۔ عدم تعاون کریں۔ مگر کسی نے بھی سرکاری ملازمت نہ چھوڑی۔ صرف اسلامیہ ہائی سکول پشاور کے پرنسپل یحییٰ خان نے ملازمت چھوڑی۔ باقی جن لوگوں کو ہم نے بھی ملازم کرایا ہوا تھا انہوں نے بھی خدائی خدمت گار تحریک کی حمایت میں ملازمت نہیں چھوڑی۔ ہری پور جیل میں خدائی خدمت گار نعرہ بازی بہت کرتے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے بادشاہ خان سے شکایت کی کہ اگر یہ لوگ نعرہ بازی بند نہیں کریں گے تو ہم نے جو رعایت ان کو دے رکھی ہے وہ بند کر دیں گے۔ بادشاہ خان نے انہیں سمجھایا مگر وہ نہ مانے پھر بادشاہ خان کو ہری پور جیل سے ایبٹ آباد جیل بھیج دیا گیا اور خدائی خدمت گاروں پر ہری پور جیل میں بہت سختی ہوئی اور تمام رعایتیں جو ان کو دی ہوئی تھیں وہ بند کر دی گئیں۔ ایبٹ آباد میں بادشاہ خان کی مزید طبیعت خراب ہوئی۔ رہائش کے لئے بہت چھوٹا کمرہ دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر کے کہنے پر رہنے کے لئے بڑا کمرہ دے دیا گیا اور ساتھ ہی ولی خان سمیت تین اور خدائی خدمت گار ساتھی بنا دیے گئے۔ ولی خان کی آنکھ کو تکلیف ہو گئی تھی۔ ماہرین چشم کی سفارش پر برائے علاج انہیں رہا کیا گیا۔ وہ برائے علاج چشم بمبئی چلے گئے۔ ان کی ایک ہی آنکھ تھی کیونکہ ان کی ایک آنکھ بچپن میں ہی خسرہ کی وجہ سے ناکارہ ہو چکی تھی۔ جب ولی خان کو برائے علاج چشم رہا کیا گیا تو انہیں بادشاہ خان نے کہا تھا کہ تمہیں صرف علاج کے لئے ہی رہا کیا گیا ہے۔ اس لئے کسی تحریک میں حصہ نہ لینا جب تک تم مرض چشم سے صحت یاب نہ ہو جاؤ۔

انہی ایام میں بنگال میں قحط پڑ گیا تھا خدائی خدمت گار آدھا راشن کھاتے تھے اور آدھا بچا لیتے تاکہ بنگال کے قحط زدہ لوگوں کو بھیجا جائے۔ ہم نے چند روز میں جو آدھا راشن بچایا تھا وہ جیل سپرنٹنڈنٹ کو پیش کر دیا۔ پتہ نہیں وہ راشن بنگال میں بھیجا گیا کہ نہیں اسی طرح ہم 1945ء تک جیل میں رہے مختلف قسم کے چھوٹے موٹے واقعات بھی پیش آتے رہے۔ ڈاکٹر خان صاحب بھی رہا کر دیے گئے اور انہوں نے مسلم لیگ کی وزارت جو اورنگ زیب کی زیر قیادت تھی اس پر عدم اعتماد کیا اور پھر دوبارہ بادشاہ خان کے مشورہ کے بغیر ہی وزارت بنالی اور بادشاہ خان کی رہائی کے حکم بھی جاری کرا دیے گئے۔ بادشاہ خان نے رہا ہونے سے انکار کر دیا کہ جب تک دوسرے خدائی خدمت گار کارکن رہا نہیں ہونگے وہ باہر نہیں آئیں گے۔ مگر ڈاکٹر خان اور دیگر وزیروں کی منت سماجت کی وجہ سے بادشاہ خان بھی جیل سے باہر آ گئے اور دیگر سیاسی قیدی بھی رہا ہونا شروع ہو گئے۔

بادشاہ خان کی بمبئی کو روانگی

بادشاہ خان مہاتما گاندھی کے بلاوے پر بمبئی چلے گئے۔ بمبئی جب بھی وہ جایا کرتے تھے تو راستے میں وہ ضرور گاندھی جی کے بیٹے دیو داس گاندھی کے پاس ضرور ٹھہرا کرتے تھے۔ دیوداس کی بیوی مسٹر راج گوپال اچاریہ کی بیٹی تھی وہ بادشاہ خان کی بہت آؤ بھگت کیا کرتی تھی۔ بادشاہ خان تھرڈ کلاس میں سفر کیا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے راستہ تکلیف میں کٹتا تھا۔ وہ آرام کے لئے بھی دہلی میں ٹھہر جایا کرتے تھے۔ دوسرے روز بمبئی روانہ ہوئے۔ بمبئی میں گاندھی جی برلا کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ بادشاہ خان بھی وہیں چلے گئے اور ان کے ساتھ ہی رہنے لگ گئے۔ ایک روز بادشاہ خان نے گاندھی جی سے کہا کہ آپ لوگوں میں بڑی مدت سے عدم تشدد کا درس دے رہے ہیں اور میں بہت تھوڑے وقت سے صوبہ سرحد میں عدم تشدد کا درس دے رہا ہوں مگر 1942ء کی تحریک ہندوستان چھوڑ دو میں ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں تشدد کے واقعات ہوئے ہیں مگر صوبہ سرحد میں نہیں ہوئے اس کی کیا وجہ ہے گاندھی جی نے جواب دیا کہ عدم تشدد بہادروں کا کام ہے۔ بزدلوں کا نہیں۔ اسی وجہ سے ہندوستان کے لوگوں نے بزدلی سے کام لیتے ہوئے تشدد کا سہارا لیا۔ جبکہ پٹھان بہادر تھے انہوں نے تشدد کا سہارا نہیں لیا اور وہ تحریک میں کامیاب ہوئے۔ بادشاہ خان کہتے ہیں کہ میں گاندھی جی کے پاس بیٹھا تھا تو ایک آدمی جو پوشاک سے غریب آدمی معلوم ہوتا تھا اس نے گاندھی جی کو کچھ روپے پیش کئے۔ گاندھی جی نے پوچھا کتنے ہیں جواب میں اس شخص نے کہا کہ ستر ہزار ہیں۔ گاندھی جی نے کہا کہ ایک لاکھ پورے کرو اور اس نے ایک لاکھ پورے کر دیے۔ اسی طرح ایک مجلس میں گاندھی جی نے اپنے سیکرٹری ڈیسائی سے کہا کہ بمبئی کے سیٹھوں سے ہریجنوں کے لئے دس لاکھ روپیہ مانگو پاس بیٹھے ہوئے دو سیٹھوں نے کہا کہ ڈھائی ڈھائی لاکھ کا انتظام تو ہم کر دیتے ہیں باقی پانچ لاکھ روپے کے لئے کوئی اور انتظام کرا لیں۔ گاندھی جی جب بھی لوگوں سے قومی آزادی اور فلاحی کاموں کے لئے روپے مانگتے تو لوگ کروڑوں روپے دیتے تھے۔ جبکہ صوبہ سرحد کے خدائی خدمت گار اپنے بل بوتے پر تحریک چلاتے تھے۔ کوئی کسی سے روپے پیسے کی مدد نہیں مانگی جاتی تھی۔ الٹا مخالفین ان پر الزام لگاتے تھے یہ خدائی خدمت گار قوم کا چندہ کھا گئے ہیں۔ ہریجن کالونی دہلی میں تھی اور سیوا گرام واردھا میں تھا جب گاندھی جی پراتھنا عبادت کرتے تھے تو ہر مذہب اور ہر مذہبی کتاب بطور تبرک وہاں پڑھی جاتی تھی۔ بادشاہ خان تلاوت قرآن مجید اور اس کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔ ایک جاپانی ان کے آشرم میں تھا جو بدھ مت کی متبرک کلام پڑھتا تھا۔ اسی طرح جن مذاہب کے لوگ وہاں ہوتے اپنے اپنے مذہب کا کلام سنایا جاتا تھا اور اپنے اپنے طریقے پر عبادت کی جاتی تھی۔ مسلم لیگ والوں نے ایک شخص میجر خورشید صوبہ سرحد بھیجا تھا جو تشدد آمیز پروپیگنڈا کیا کرتا تھا کہ یہ چند سرخ پوش ہیں جنہیں قتل کرایا جائے تو معاملہ ختم ہو جائے گا

غازی پختون تنظیم

ان فسادی لوگوں کے مقابلہ کے لئے نوجوان پختونوں نے ایک تنظیم نوجوان پختون قائم کی۔ مگر خداوند کریم نے پختونوں کو کسی بہت بڑے فساد سے بچا لیا۔ یورپ کی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ متحدہ ہندوستان کے آخری الیکشن کے اعلانات ہو چکے تھے۔ بادشاہ خان الیکشن کے حامی نہ تھے۔ ان کے خیال میں الیکشن کے نتیجہ میں جو بھی خدائی خدمت گاروں کی حکومت بنے گی وہ بے اختیار قسم کی حکومت ہو گی اور تحریک کو بے اختیار حکومت بنانے میں فائدہ کی بجائے نقصان ہے۔ اس لئے بادشاہ خان الیکشن لڑنے کے حق میں نہ تھے۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی میں بھی انہوں نے صوبہ سرحد میں الیکشن نہ لڑنے اعلان کر دیا تھا۔ کانگرسی لیڈروں نے بادشاہ خان کی بہت منت سماجت کی مگر وہ نہیں مان رہے تھے اور ورکنگ کمیٹی کے اجلاس سے واپس آ گئے مگر انہی ایام میں مسلم لیگ نے خدائی خدمت گاروں کے خلاف زہریلا پراپیگنڈا شروع کر دیا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی جماعت خدا کی جماعت ہے۔ رسول اللہؐ کی جماعت ہے۔ خدائی خدمت گار کافر ہیں۔ مرتد ہیں' ہندو ہیں' ہندو کے ایجنٹ ہیں۔ مسلم لیگ کو ووٹ دینا حضور علیہ السلام کو ووٹ دینا ہے۔ خدائی خدمت گاروں کو ووٹ دینا گاندھی کو ووٹ دینا ہے۔ پھر پنجاب کے صوبہ سرحد کے کالج سکول بند کر دیے گئے۔ طالب علموں کو الیکشن میں مسلم لیگ کے لیے پراپیگنڈہ پر لگا دیا گیا۔ انہی دنوں بادشاہ خان کی ملاقات ابن الحسنات پیر آف مانکی شریف سے ہوئی۔ پیر صاحب نے جناح صاحب کی ایک تحریر بادشاہ خان کو دکھائی جس پر لکھا تھا کہ اگر پاکستان بن گیا تو پاکستان میں نظام شریعت نافذ ہو گا۔ بادشاہ خان نے پیر آف مانکی شریف سے کہا کہ اس کاغذ کو چاٹو پاکستان میں کبھی بھی نظام شریعت نافذ نہیں ہو گا۔ راقم نے پاکستان بن جانے کے بعد غالباً 1949ء میں پیر آف مانکی شریف عوامی لیگ کے پلیٹ فارم پر ایک جلسہ میں گوجرانوالہ تشریف لائے اور یہ ذکر کیا تھا کہ جناح صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا' تحریر لکھ کر دی تھی کہ اگر پاکستان بن گیا تو یہاں نظام شریعت نافذ ہو گا۔ تو میں نے پیر آف مانکی شریف نے جناح صاحب کو تار بھیجا کہ نظام شریعت نافذ کرو۔ مگر مجھے جواب ملا کہ خان عبدالقیوم سے ملو اور تم وزیر بن جاؤ اور جب بھی میں نے جناح صاحب سے نظام شریعت نافذ کرنے کی بات کی تو جواب ملتا کہ تم وزیر بن جاؤ اور ہم سے مسلم لیگ والوں نے شریعت کے نام پر دھوکا کیا ہے۔ بادشاہ خان نے بھی پیر آف مانکی شریف کو یہی کہا تھا کہ اگر شریعت نافذ ہو جائے تو جناح صاحب سمیت مسلم لیگ والوں کی شریعت میں کوئی جگہ ہی نہیں تو پھر کیوں وہ نظام شریعت نافذ کریں گے

خان عبدالغفار خان، خان عبدالولی خان و دیگر ساتھی

الیکشن نہیں لڑنا چاہتے تھے

صوبہ سرحد کے الیکشن خدائی خدمت گار نہیں لڑنا چاہتے تھے۔ مگر حالات نے مجبور کر دیا کہ خدائی خدمت گار الیکشن میں حصہ لیں۔ الیکشن کے نتیجہ میں خدائی خدمت گار کامیاب ہوئے۔ صوبہ سرحد کی اسمبلی کی پچاس سیٹیں تھیں جن میں 31 خدائی خدمت گار 2 جمیعت العلمائے ہند اور سترہ مسلم لیگ کو ملیں۔ اس الیکشن میں مسلم لیگ کی حمایت میں انگریز ملازمین اور دیسی ملازمین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا مگر پھر بھی خدائی خدمت گار کامیاب ہوئے۔ الیکشن جیت جانے کے بعد سرخ پوش وزارت نہیں بنا رہے تھے کہ جب تک سرکاری ملازمین جنھوں نے الیکشن میں مسلم لیگ کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے ان کے خلاف کاروائی کا اختیار نہ ہو گا ہم وزارت نہیں بنائیں گے۔ آخر مولانا آزاد اور مرکزی کانگرس کے مجبور کرنے پر وزارت بنائی گئی۔ سنٹرل پارلیمنٹ کے لئے صوبائی اسمبلیوں کے ممبران نے ہی ممبر منتخب کرنے تھے۔ صوبہ سرحد سے تین مسلمان ممبر منتخب ہونے تھے۔ ضلع ہزارہ کا ایک ممبر مسلم لیگ نے بنایا تھا۔ جبکہ کانگرس اور خدائی خدمت گاروں سے بادشاہ خان اور مولانا ابوالکلام آزاد کو سنٹرل پارلیمنٹ جو کہ دستور ساز اسمبلی بھی تھی چنے گئے۔ شملہ کانفرنس مارچ 1946ء میں انگلینڈ سے ایک کیبنٹ مشن ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ پر بات چیت کے لئے جس کے اراکین کی تعداد تین تھی جس میں سرٹی فرڈ کرپس لارڈ پتھک لارنس مسٹر اگزنڈر اور وائسرائے ھند لارڈویول بھی وفد کے معاون تھے۔ اس وفد نے یہ تجویز کیا کہ ایک گول میز کانفرنس بلائی جائے جس میں ہندوستان کی دونوں بڑی پارٹیوں کانگرس اور مسلم لیگ کے چار چار ممبر ہونگے۔ کیبنٹ مشن کے ممبران بھی اس میں شامل ہونگے اور ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔ کانگرس نے جو ممبر تجویز کیے ان کے نام یہ ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد خان' عبدالغفار خان' پنڈت جواہر لال نہرو' سردار پٹیل۔ مسلم لیگ کے وفد کے اراکین کے نام یہ ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح' نواب زادہ لیاقت علی خان' راجہ آف محمود آباد' سردار عبدالرب نشتر۔ گول میز کانفرنس میں الجھاؤ تھا کیبنٹ مشن کی باتوں سے کچھ واضع نہیں ہو رہا تھا۔ اس پر کانگری ممبران نے کہا کہ کیا برطانیہ ہندوستان چھوڑتا ہے کہ نہیں۔ یہاں سے اپنی گورا فوجیں نکالتا ہے کہ نہیں۔ اس پر کیبنٹ مشن نے جواب دیا کہ انگریز ہندوستان چھوڑنے کو تیار ہیں مگر کس کے حوالے کر کے جاویں۔ اس کے لیے ہندوستان کی دو بڑی پارٹیاں کسی فارمولے پہنچتی ہی نہیں۔ اس پر پنڈت نہرو نے جواب دیا کہ اگر یہ ملک ہمارے حوالے نہیں کرتے تو مسلم لیگ کے حوالے ہی کر دیں۔ مگر انگریز یہاں سے چلے جاویں۔ اس بات کا جناح صاحب پر بہت اچھا اثر ہوا مگر دونوں بڑی جماعتیں کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکیں

شملہ کانفرنس ناکام ہو گئی

شملہ کانفرنس کے بعد انگلستان میں انتخابات ہوئے۔ چرچل کی کنزرو-ٹیو پارٹی ہار گئی اور لیبر پارٹی جیت گئی اور لیبر پارٹی نے اعلان کیا کہ ہم نے ہندوستان کے متعلق جو پہلے کہا تھا وہی اب کہتے ہیں۔ اور حکومت برطانیہ بہت جلد ہندوستان کو چھوڑ دے گی۔ پھر کیبنٹ مشن ہندوستان بھیجا گیا۔ جس نے از خود کیبنٹ پلان پیش کر دیا۔ ہندوستان کے تین حصے اے بی سی بنائے گئے۔ اے حصہ میں صوبہ سرحد صوبہ پنجاب سندھ بلوچستان جس میں پنجاب پورا تھا۔ سی حصہ پر پورا بنگال اور پورا آسام تھا۔ بی حصہ پر بقایا ہندوستان تھا۔ مرکز کے پاس اختیارات میں صرف تین محکمے رکھے تھے۔ دفاع خارجہ مواصلات مرکزی پارلیمنٹ ہو گی جس کے اگر سو 100 ممبران ہو نگے تو 45 ہندو 45 مسلمان اور دس دیگر اقلیت سے لیے جاویں گے۔ مسلم لیگ نے پہلے تو اس سکیم کو ماننے میں لیت ولعل کیا مگر بعد میں مان گئی۔ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے ہی کیبنٹ مشن پلان منظور کر لیا اور مرکز میں وزارت جو عارضی بنی تھی وہ بھی کانگرس اور مسلم لیگ کولیشن بن گئی۔ جن کے وزراء کے نام یہ تھے مسلم لیگ مسٹر چندریگر' نواب زادہ لیاقت علی خان ' سردار عبدالرب نشتر' راجہ غضنفر علی خان' مسٹر جوکندر ناتھ منڈل۔ کانگرس کے وزیر پنڈت نہرو' سردار پٹیل' مولانا ابوالکلام آزاد' مسٹر جگ جیون رام تھے۔ دیگر تین ممبران اقلیت پارٹی کے تھے انکے نام یاد نہیں ہیں۔ یہ کابینہ بن گئی۔ مسلم لیگ اور کانگرس مخلوط حکومت میں شامل تھے۔ مخلوط کابینہ کے سربراہ پنڈت نہرو تھے۔ انہی ایام میں کانگرس کے صدر جو مسلسل سات سال سے مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ انہوں نے از خود صدارت سے ہٹ جانے کی پیش کش کی اور اپنی جگہ کانگرس کا صدر پنڈت نہرو کو تجویز کیا جو کانگرس کی مرکزی کونسل نے منظور کر لیا۔ پنڈت نہرو ملک کے وزیراعظم بھی ہیں اور کانگرس کے صدر بھی ہیں۔ کولیشن چل رہی تھی مگر کانگرسی لیڈر کچھ کولیشن گورنمنٹ سے مطمئن نہ تھے۔ وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ والے وزارت داخلہ لینا چاہتے تھے۔ وزیر داخلہ سردار پٹیل پہلے بن چکے تھے وہ کسی قیمت پر یہ محکمہ مسلم لیگ کو دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ اسی قدرو منزلت کا محکمہ وزارت خزانہ تھا جو مسلم لیگ کو کانگرس والے دینا چاہتے تھے مگر مسلم لیگ وزارت خزانہ نہیں لینا چاہتی تھی۔ وزارت داخلہ پر ہی مصر تھی۔ چوہدری محمد علی اس وقت وزارت خزانہ کے مرکزی ڈپٹی سکریڑی تھے۔ وہ مسٹر جناح اور لیاقت علی خان سے ملے اور انہیں کہا کہ وہ وزارت خزانہ لے لیں کیونکہ وزارت خزانہ ہی تمام حکومت کی چابی ہے چنانچہ مسلم لیگ نے وزارت خزانہ لے لی اور کانگرس کو تگنی کا ناچ نچانا شروع کر دیا۔ وہ یوں کہ مطالبہ زر جو کانگرس وزارتوں کی طرف سے آتا تھا اس پر اعتراض لگا کر وزارت خزانہ بھیج دیتی کہ فنڈ نہیں یا کوئی اور اعتراض لگا دیتی اس وجہ نے کانگرسی وزارت بڑی مشکل میں پھنس گئی۔ کانگرس مسلم لیگ سے جان چھڑانے کی حد تک زچ ہو چکی تھی

انہی ایام میں پنڈت نہرو بمبئی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب فرما رہے تھے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ کانگرس کیبنٹ مشن پلان کی مستقبل میں ہمیشہ کے لئے پابند نہیں۔ ہندوستان کا دستور وفاقی ہو گا دستور ساز اسمبلی کثرت رائے سے دستور میں تبدیلی کر سکتی ہے۔ اتنی بات تھی کہ ہندوستان کی سیاست میں دوبارہ تلاطم آگیا۔ مسلم لیگ نے کہنا شروع کر دیا کہ کانگرس والے مکر گئے ہیں آئندہ ہمیں ان پر کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ کانگرس اور پنڈت نہرو نے بھی بعد میں تردید کی کہ پریس کانفرنس میں جو بات کہی گئی اس کا مطلب یہ نہیں تھا وہ نہیں تھا۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا واپس آنا بہت مشکل تھا بلکہ ناممکن ہو گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو اس وقت کانگرس کے صدر تھے جن کی صدارت میں کیبنٹ مشن پلان کانگرس اور مسلم لیگ نے منظور کیا تھا۔ انہوں نے اپنی کتاب ہماری آزادی میں لکھا ہے کہ میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جواہر لعل نہرو کا یہ بیان غلط تھا۔ اور یہ کہنا درست نہیں ہے کانگرس کیبنٹ مشن پلان میں اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہے ترمیم کر سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم کانگرسی یہ مان چکے ہیں کہ مرکز میں وفاقی طرز کی حکومت ہو گی اور مرکز کے پاس صرف تین محکمے ہو نگے۔ باقی تمام محکمے صوبوں کے پاس ہو نگے اور انہیں کے اختیارات میں رہیں گے اور ہم یہ بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ تین گروپوں اے بی سی میں تقسیم ہو نگے۔ ان شرائط میں کانگرس کو اپنی طرف سے معاہدہ شریک دوسرے فریقوں کی رضامندی کے بغیر کسی قسم کی تبدیلی کا حق حاصل نہیں ہو گا۔

مسلم لیگ کا اعتراض

مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح صاحب نے پنڈت نہرو کے بیان پر سخت نوٹس لیا اور کہا کہ ہم نے کیبنٹ مشن پلان اس وجہ سے منظور کر لیا تھا کہ کانگرس ایک پلان کو مان چکی ہے اس لئے ہم نے بھی مان لیا۔ مگر کانگرس کے صدر پنڈت جواہر لعل نہرو کے بمبئی والے بیان نے ہمیں کانگرس کے رویے کے بارے شک میں ڈال دیا ہے کہ ابھی انگریز ہندوستان میں ہی ہیں تو کانگرس نے اپنا ارادہ ظاہر کر دیا ہے کہ دل سے اس کیبنٹ مشن پلان کو نہیں مانتے۔ اس لیے اقلیت کی تفکرات کو اور تقویت ملی ہے کہ کانگرس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ جناح صاحب کے اس بیان کے بعد کیبنٹ مشن پلان کی تجویز ختم ہو گئی

وزیراعظم پنڈت نہرو کا دورہ وزیرستان

جب پنڈت نہرو ہندوستان کے وزیراعظم تھے تو وزیرستان کے قبائیل پر برطانوی حکومت نے بمباری کی۔ بادشاہ خان' پنڈت نہرو سے ملے کہ آپ کی حکومت ہے اور پٹھانوں پر بمباری ہو رہی ہے

پنڈت نہرو نے قبائلی علاقوں کا دورہ کرنے کا ارادہ کیا مگر صوبہ سرحد کے گورنر کے کہنے پر وائسرائے ہند نے پنڈت نہرو کو آزاد قبائل کا دورہ نہ کرنے کی تجویز پیش کی کہ اگر آپ بادشاہ خان کے ساتھ صوبہ سرحد کے آزاد قبائل کا دورہ کیا تو وہاں فساد ہو گا۔ آپ کے خلاف مظاہرے ہو نگے۔ مسلم لیگ اور سرکاری افسران کی ملی بھگت سے پنڈت نہرو اور بادشاہ خان کے خلاف آزاد قبائل میں دورہ کے وقت فساد کیا۔ لیڈروں کو پتھر مارنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ تین جگہوں پر ان لیڈران کو پتھر مارے گئے جن سے پنڈت نہرو اور بادشاہ خان بھی زخمی ہوئے اور یہ ایک بہت ہی افسوس ناک واقع تھا۔ انہی ایام میں مرکزی اسمبلی میں 47 - 1946ء کا بجٹ بھی پیش ہونا تھا۔ بجٹ وزیر خزانہ نے پیش کرنا تھا۔ وزیر خزانہ لیاقت علی خان تھے۔ جنگ عظیم دوم میں یورپ جنگ کی لپیٹ میں تھا جس کی وجہ سے یورپ کے کارخانے یا تو بند تھے یا پھر جنگی سامان بنانے پر لگے ہوئے تھے۔ ضرورت کی چیزوں کی یورپ میں جنگ کی وجہ سے بہت کمی ہو گئی تھی۔ یہ چیزیں ہندوستان سے ہی یورپ کو زیادہ مقدار میں جاتی تھیں۔ ضروریات زندگی کی قیمتیں بڑھ گئیں تھیں اور کاروبار میں بہت تیزی آ گئی تھی اور تجارت پیشہ لوگوں نے بہت روپے کمائے تھے۔ افراط زر کی شرح زیادہ ہو گئی تھی۔ زیادہ دولت بلیک میں چلی گئی تھی۔ بڑے سیٹھوں نے آمدنیوں پر بہت کم ٹیکس دیا ہوا تھا۔ مرکز میں وزیر خزانہ لیاقت علی خان تھے جو ہر وقت اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی طرح کانگرس کی ساکھ کو نقصان پہنچایا جائے۔ انہوں نے وزارت خزانہ کے مسلم ملازمین سے ملکر بجٹ میں ایسا اقدام اٹھایا کہ کانگرس کی ساکھ کو بہت نقصان پہنچا۔ وہ یوں کہ اس وقت ہندوستان کی کرنسی میں ایک ہزار اور دس ہزار کے نوٹ بھی ہوتے تھے انہوں نے 47 - 1946ء کے بجٹ میں منسوخ کر دیئے۔ کانگرس کو چندہ دینے والے یہی سیٹھ ہوتے تھے۔ انہیں کو کانگرس کی پہلی مخلوط حکومت میں بہت زیادہ نقصان ہوا

لیاقت علی خان کا بجٹ

وزیر خزانہ لیاقت علی خان کا بجٹ بھی تقسیم ہند کے لیے بہت زیادہ معاون ثابت ہوا اور بلاخر کانگرس کے چوٹی کے ہندو لیڈر ذہنی طور تقسیم ہند پر رضامند ہو گئے پھر جلتی پر تیل کا کام یہ تھا کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے اور ہندوستان کو متحدہ رکھنے کی تمام کوششیں بری طرح پامال ہوتی ہوئی نظر آنے لگ گئیں۔ وائسرائے ہند لاڈ ویول کر ہر طرف کے جانے کے بعد لارڈ مونٹ بیٹن وائسرائے ہند مقرر ہوئے۔ انہوں نے اپنا مشن آگے بڑھانا شروع کر دیا اور انہوں نے فرمایا کہ برطانوی حکومت کسی منشا کے مطابق ہندوستان کی آزادی 30 جون 1948ء کو عمل میں آ جانی چاہیے۔ کچھ مشکلات ہیں انہیں دور کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی اور کچھ نہ کچھ حل نکالا جائے گا۔ انہی ایام میں کلکتہ بمبئی کے علاوہ نواکھل بہار اور یوپی فساد کی زد میں آ چکے تھے۔ پنجاب ابھی خاموش تھا مگر بے قراری بدستور بڑھ رہی تھی۔ 4 مارچ 1947ء پنجاب میں ملک خضرحیات کی

وزارت مستعفی ہو گئی اور ساتھ ہی فرقہ وارانہ کشیدگی شروع ہو گئی

راولپنڈی اور دیگر علاقوں میں زبردست فساد ہوئے۔ ہزاروں آدمی چند دنوں میں مارے گئے۔ فرقہ وارانہ کشیدگی بڑی منظم طریقہ پر پھیل رہی تھی اور ساتھ ہی امن کی کوششیں دم توڑ رہی تھیں۔ حکومتی ادارے بھی فرقہ واریت اور فسادات سے پہلو تہی کر رہے تھے۔ حکومتی عناصر بھی کھلم کھلا فسادات کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ مسلم لیگ کا مطالبہ تھا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ پاکستان میں شامل ہوں۔ مگر تقسیم ھند کا فارمولا تسلیم ہو جانے کے بعد پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کانگرس نے پیش کر دیا۔ پنجاب کے مشرقی اضلاع میں ہندو سکھ اکثریت سے تھے۔ اس وجہ سے مشرقی پنجاب بھارت میں شامل ہوا اسی طرح مغربی بنگال میں بھی ہندو اکثریت سے تھے اور وہ ہندوستان میں شامل ہوا

بہار میں فساد

بہار میں جب فساد ہوئے تو بہت سارے مسلمان مارے گئے انکے گھر لوٹ لیے گئے۔ بادشاہ خان انہیں ایام میں بہار کے فساد زدہ علاقوں میں گئے۔ لوگوں کے حال احوال معلوم کئے۔ انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان میں امن قائم کرنے کی کوششیں بہت ہی کم ہو رہی ہیں۔ بہار میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ مسلم لیگی لیڈر شپ امن کی کوششوں کے برخلاف مسلمانوں میں نقل مکانی کی ترغیب دے رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ فساد زدہ علاقوں میں مسلم لیگی لیڈر شپ بھی پٹنہ میں جمع تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی ان سے جو بات چیت ہوئی اسکا نتیجہ یہ تھا کہ وہ امن کی کوششوں میں معاون نہ تھا وہ سیاسی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش میں ہر وقت سرگرداں تھے اور لوگوں کو نقل مکانی کی ترغیب دے رہے تھے اور وہ بہاریوں کو مشرقی بنگال چلے جانے کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ فرقہ وارانہ فساد کو ہوا دینے میں مشغول تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ فرقہ وارانہ کشیدگی ہی انہیں منزل مقصود دلا سکتی ہے۔ ان فساد زدہ علاقوں سے بہت سارے بہاری مشرقی بنگال ہجرت کر گئے جو کہ اس وقت بنگلہ دیش بن چکا ہے اور آج بھی بہاری مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ آج بھی وہ لوگ مہاجر کے مہاجر ہیں۔ کسی جگہ بھی وہ قیام مستقل نہیں کر سکے۔ بہاریوں کو بنگلہ دیش والے بھی قبول نہیں کرتے۔ جبکہ پاکستان میں سندھی بھی انہیں قبول کرنے کو تیار نہیں سندھیوں کا کہنا ہے کہ اگر بہاری پاکستان میں لائے گئے تو وہ بلاخر کراچی میں ہی جمع ہونگے جبکہ اس وقت بھی جو ہندوستانی مہاجر کراچی اور حیدر آباد وغیرہ میں آباد ہیں وہ بھی مقامی سندھی آبادی سے کم ہیں۔ وہ بھی سندھیوں کے لیے ایک مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ مذید بہاری پاکستان آنے سے وہ بھی سندھ میں ہیں آ جائیں گے اور سندھی اپنے ہی ملک میں اقلیت میں ہو جائیں گے اور ہم غیر سندھیوں کی اپنے اوپر حکمرانی کسی صورت بھی قبول نہیں کر سکیں گے۔ بہار میں ابھی فساد کی آگ ٹھنڈی ہو ہی رہی تھی کہ پنجاب میں فساد شروع ہوئے۔ بادشاہ خان کو

سرحد کی فکر لاحق ہوئی۔ وہ صوبہ سرحد آگے یہاں خدائی خدمت گاروں کی صوبائی حکومت کی وجہ سے حالات پر امن تھے۔ مگر مسلم لیگی اور فرقہ پرست عناصر جو انگریزی افسران کے زیر اثر تھے انکی کوشش تھی کہ سرحد میں بھی فسادات کروائے جاویں۔ مگر خدائی خدمت گاروں کی کوشش و ہمت اور جدوجہد سے فسادات نہ ہونے دیے۔ ہندوؤں اور سکھوں میں کچھ لوگ انگریز پرست تھے وہ مسلم لیگیوں کے ساتھ ملکر کوششیں کرتے رہے۔ مرکزی سرکار سے مطالبہ کرتے رہے کہ صوبہ سرحد میں برسر اقتدار خدائی خدمت گاروں کی حکومت ختم کر کے گورنر راج نافذ کیا جائے مگر خدائی خدمت گاروں کی ہمت سے وہ کوششیں میں کامیاب نہ ہوئی۔ سرحد مسلم لیگ کے رضاکار بھی بہار کے فساد زدہ علاقوں میں گئے ہوئے تھے۔ وہ مسلمانوں کو آباد کرنے۔ انکی خدمت کرنے کی بجائے فساد کو زیادہ ہوا دیتے تھے اور بہار سے انسانی ہڈیاں لائے تھے جو کہ دیہاتوں میں لوگوں کو دیکھاتے تھے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں پر ظلم کیا ہے۔ اس لئے بہار کے مسلمانوں کا بدلہ یہاں صوبہ سرحد کے نہتے ہندوؤں اور سکھوں سے لیا جائے اور انہوں نے فرقہ وارانہ فساد کرانے کی بہت کوششیں کی مگر خدائی خدمت گاروں کی کوشش اور محنت سے مسلم لیگی فرقہ وارانہ فساد کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے مگر جب بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا فیصلہ ہو گیا تو ساتھ ہی صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کا فیصلہ بھی کر لیا گیا تو صوبہ سرحد کے حالات مزید خراب ہو گئے۔ مسلم لیگ اور سرکاری ملازمین نے شہر میں فسادات کرا دیے۔

حکومت خدائی خدمت گاروں کی تھی مگر سرکاری ملازمین حکومت کی بات نہیں مانتے تھے۔ مسلم لیگ کے ساتھ سرکاری ملازمین بھی فسادات میں معاونت کر رہے تھے اور فرقہ وارانہ فسادات خان برادران کی حکومت کو بد نام کرنے کے لئے کرائے جا رہے تھے۔ بادشاہ خان کے حکم سے خدائی خدمت گاروں کی تنظیم کے دس ہزار رضا کار شہر پشاور میں لائے گئے۔ ہندوں اور سکھوں کو گھروں سے نکال کر دوکانوں اور کام کاج پر بٹھایا گیا اور تمام شہر پشاور میں سرخ پوش رضا کار ہندوؤں سکھوں کی حفاظت کے لے مقرر کیے گئے اور امن امان قائم ہوا۔ اسی طرح صوبہ سرحد کے دوسرے شہروں میں بھی جان پر کھیل کر سرخ پوش رضا کاروں نے امن قائم کیا۔ ہندو سکھوں کے جان و مال کی حفاظت کی

سروں کا سودا

تقسیم ہند کا فارمولا کانگرس نے منظور کر لیا تو کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا۔ جس میں شرکت کے لئے بادشاہ خان نئی دہلی گئے۔ بادشاہ خان کو بالکل یقین تھا کہ کانگرس کسی صورت میں بھی تقسیم ہند کے فارمولے کو نہیں مانے گی۔ ورکنگ کمیٹی میں راج گوپال اچاریہ اور سردار پٹیل کی رائے تو تقسیم ہند کے حق میں تھی ہی مگر جب اسی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں پنڈت نہرو اور مہاتمہ گاندھی نے بھی تقسیم ہند کے حق میں دلائل دینا شروع کر دیے تو بادشاہ خان سکتے میں آ گئے۔ چند منٹ تک تو ان کے منہ سے بات نہیں نکلی جب انہوں نے بات کی تو یہ تھی کہ گاندھی جی آپ نے تو ہمیں

بھیڑیوں کے آگے ڈال دیا ہے۔ اگر آپ نے ہمارے سروں کا سودا کر ہی دینا تھا تو ہم سے پوچھ لیا ہوتا تاکہ ہم اپنے مستقبل کا کچھ تو بچاؤ کر لیتے۔ ہم نے مسلم لیگ کے خلاف الیکشن لڑ کے کامیابی حاصل کی ہے۔ سروں کی دشمنیاں پڑ گئیں ہیں۔ آپ نے ہمیں ان کے آگے ڈال دیا ہے۔ گاندھی جی جو کچھ ہمارے ساتھ مستقبل میں ہو گا آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکیں گے۔ ہم نے آزادی کی جس مانگ میں سندھور بھرا تھا وہ دل سے ٹپکتا ہوا خون بن جائے گا۔ جس آزادی کا خواب دیکھا تھا جس کے لئے جدوجہد کی تھی وہ ہمارے گلے کا پھندا بن جائے گی۔ آخر میں بادشاہ خان نے ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں یہ کہا کہ ریفرنڈم کا پھندا مذید آپ نے ہمارے گلے میں ڈال دیا اگر آپ نے ہمیں بھیڑیوں کے آگے ڈال دیا ہے تو پھر ریفرنڈم کی کیا ضرورت ہے۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ختم ہوا

بادشاہ خان اور انکے ساتھی

بادشاہ خان پشاور واپس آ گئے صوبہ سرحد کے لیے حکومت ہند نے ریفرنڈم کا اعلان کیا کہ عوام رائے دیں کہ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں خدائی خدمت گاروں نے یہ مطالبہ کیا کہ صوبہ سرحد کو حق خود اختیاری دیا جائے کہ وہ ہندوستان میں اور پاکستان کے علاوہ آزاد پختونستان میں بھی شامل ہو سکے۔ جسے حکومت ہند نے نہیں مانا۔ پختونوں کی حق خود اختیاری نہیں مانی گئی۔ خدائی خدمت گاروں نے ریفرنڈم کا بائی کاٹ کیا ریفرنڈم میں کوئی مد مقابل نہ تھا اس لیے مسلم لیگ یک طرفہ الیکشن میں جیت گئی اور صوبہ سرحد کی شمولیت پاکستان میں ہو گی۔ اس طرح سرخ پوش یا خدائی خدمت گار اور انکی سیاست ایک اندھے کنویں میں گر گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے اس دھرتی پر معتوب گردان دیے گئے اور حالات زمانہ دیکھیے کہ جن لوگوں نے وطن کی آزادی کی جدوجہد میں تن من دھن قربان کر دیا۔ جب وطن آزاد ہوا تو وہ اسی وطن کے غداروں کی لسٹ میں شامل کر دیے گئے۔

خان لیاقت علی خان

جمیعت العلمائے ہند

تاریخ کے اوراق پر کہیں کہیں علماء کی جدوجہد کے کارنامے بھی نظر آتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے جب مغلیہ حکومت بہت کمزور ہو گئی تھی تو آپ بہت مضطرب تھے۔ اس وقت علماء حضرات کی سیاست یہ تھی کہ اگر کسی جگہ کی مسلمان حکومت کمزور ہو جایا کرتی تھی تو علماء حضرات اسے طاقت ور بنانے میں بھی مدد کرتے اگر یہ ممکن نہ ہوتا تو قریب کی کسی طاقت ور مسلمان حکومت کو دعوت دیتے کہ وہ حملہ آور ہو کر کمزور حکومت کو ختم کر کے طاقت ور حکومت قائم کر دیں۔ اس میں انکی مصلحت یہ ہوتی تھی کہ کمزور مسلمان حکومت کے خلاف مقامی غیر مسلم آبادی بھی بغاوت کر کے تخت تاج پر قبضہ کر سکتی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ احمد شاہ ابدالی بھی شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کی دعوت پر ہندوستان میں حملہ آور ہوا تھا۔

شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے خاندان سے ہی حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ اور سید احمد بریلوی رحمتہ اللہ علیہ بھی جہاد کی غرض سے پنجاب کی سکھ حکومت سے پنجہ آزما ہوئے جنکی ساری جماعت اور وہ خود بھی بالا کوٹ کے مقام پر سکھوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے اور مجاہدین بالا کوٹ کے آثار آج بھی امت مسلمہ میں محسوس کیے جاتے ہیں۔

1857ء کی جنگ آزادی جسے وقت کے حاکموں نے غدر کا نام دیا تھا وہ وطن کی آزادی کی مسلح جدوجہد کی آخری کوشش تھی۔ اسمیں بھی علمائے ہند کا کردار نظر آتا ہے۔ کئی علماء کو جنگ آزادی کے خاتمہ پر پھانسیاں دی گئیں۔ 1857ء کی جنگ آزادی کا مرکز یوپی اور دہلی تھا۔ کئی دن تک کئی جگہوں پر حریت پسند حکمران رہے۔ مرٹھ میں بھی انگریز حکومت کی دیسی افواج نے بغاوت کر دی تھی۔ ہزاروں باغی فوجیوں کو تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ محمودالحسن کی عمر اس وقت سات سال کی تھی انہوں نے اپنا بچپن اپنے ننھیال مرٹھ میں ہی گزارا تھا۔ انکی آنکھوں کے سامنے حریت پسندوں کو سزائیں دی گئیں تھیں، پھانسیاں دی گئیں تھیں۔ یہ سب تحریکیں اور سزائیں دیکھنے کے بعد جو نقش ان کے دل پر ہوئے انہی نقوش نے انہیں بیسوی صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں مجاہد ملت شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن بنا دیا۔ 1857ء سے قبل تحریک آزادی مسلح جدوجہد کی شکل میں تھی راجے، مہاراجے، نواب، سلطان اپنی راج گدی یا سلطنت کے بچاؤ کی مسلح جدوجہد کر رہے تھے۔ جبکہ 1857ء میں پورے ہندوستان پر بلا شرکت غیر انگریز بہادر کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ تمام مسلح مخالفتیں دم توڑ چکی تھیں۔ پنجاب میں سکھوں کی حکومت بھی ختم ہو چکی تھی۔ لوگ ہندوستان کی آزادی سے مایوس ہو چکے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ لوگ تحریک آزادی یا غدر 1857ء کا انجام دیکھ چکے تھے مگر دلوں میں بدیشی حکومت کے خلاف نفرتیں موجود تھیں۔ اب ہندوستان کے لوگوں کی یہ حالت تھی کہ کبھی کبھار چھوٹے موٹے اجتماع میں کسی مطالبہ پر سرکار سے حاجت روائی کی بات کرتے ورنہ بلکل خاموشی تھی ہو کا عالم تھا۔ اسی عالم میں حضرت مولانا محمد قاسم نے اٹھاروی صدی کے آٹھویں عشرہ میں دینی درس گاہ دارالعلوم دیو

بند کی بنیاد رکھی۔ جس کا مقصد علمائے دین بنانا اور انکی تربیت کرنا تھا۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن بھی اسی مدرسہ دیو بند کے طالب علم رہے اور بعد میں مدرس بھی بن گئے۔ انکے ذہن میں تحریک آزادی 1857ء کا نقش موجود تھا۔ انہوں نے تحریک آزادی کی لائنوں پر بھی طالب علموں کی تربیت شروع کر دی۔ بیسوی صدی کے شروع میں وہ دارالعلوم دیو بند کے صدر مدرس بن چکے تھے اور طالب علموں کے واجب الاحترام راہنماء بھی بن چکے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں حریت پسند علمائے دین کی ایک جمعیت بھی پیدا کر چکے تھے۔ حضرت شیخ الہند عالم اسلام کے حالات سے بھی غافل نہ تھے وہ سمجھتے تھے کہ عالم اسلام کو تباہ کرنے والا اسلامی حکومتوں کو تباہ کرنے والا برطانوی سامراج ہی تو ہے۔

دیو بند کے فارغ طالب علم عالم دین اپنے اپنے علاقوں میں لوگوں کو حکمران انگریزوں کے خلاف ابھارتے بھی تھے، انہیں منظم بھی کرتے اور لوگوں میں شعور بیدار کرنے کے لئے وہ خطبہ جمعہ میں سرکار انگلستان کے خلاف تقاریر کرتے اور عوام میں انگریز کے خلاف نفرت پیدا کرتے۔ 1912ء تک ہندوستان کے تقریباً تمام علاقوں میں دیو بند کے پڑھے ہوئے علماء حضرات عوام میں سرکار انگلشیہ کے خلاف شعور بیدار کر رہے تھے۔ انہی ایام میں حضرت شیخ الہند کے پاس صوبہ سرحد کے مشہور راہنماء بادشاہ خان بھی حاضر ہوئے انہیں آزاد قبائل میں جا کر سرکار انگلشیہ کے خلاف کام کرنے کو کہا گیا۔ اسی زمانے میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کو حضرت شیخ الہند نے وطن کی آزادی کی جدوجہد کے لئے کابل روانہ کیا۔ انہی ایام میں بنگال کے علماء کو بھی سرکار انگلشیہ کے خلاف متحرک کیا گیا۔ غرض ہندوستان کے ہر علاقہ میں علمائے ہند نے آزادی کی جدوجہد پورے جوش و خروش کے ساتھ شروع کر دی تھی۔ 1914ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ یہ جنگ یورپ کے دو گروہوں کے درمیان تھی۔ ایک گروہ کی قیادت برطانیہ اور فرانس کر رہے تھے۔ دوسرے گروہ میں جرمنی اور ترکی تھے۔ اصل مقابلہ جرمنی اور فرانس وغیرہ میں تھا۔ ترکی تو بلکل کمزور حکومت تھی۔

ترکی صنعتی طور پر پسماندہ تھا

ترکی بالکل صنعتی طور پر پسماندہ تھا۔ وہ گنتی کی کوئی طاقت نہ تھی مگر عالم اسلام کا ترکی مرکز تھا۔ خلیفتہ المسلمین ہی ترکی کے حاکم اعلیٰ تھے اور ساتھ ہی مشرق وسطیٰ کے عرب علاقوں پر بھی خلیفتہ المسلمین ہی حکمران تھے اور یورپ کے کئی علاقوں پر بھی انکی حکومت تھی۔ اس جنگ میں اگر برطانیہ جیت جاتا ہے تو عالم اسلام کے مرکز خلافت کو بھی شکست ہو جاتی ہے۔ اس بناء پر علمائے ہند نے یہ فتویٰ جاری کیا کہ جنگ میں کسی قسم کی سرکار انگلشیہ کو امداد کرنا از روئے اسلام کفر ہے۔ جب شیخ الہند کو پتہ چلا کہ سرکار برطانیہ عربوں میں ترکوں کے خلاف بغاوت منظم کر رہے ہیں تو وہ اپنے نائب حضرت مولانا سید حسن احمد مدنی کو ساتھ لے کر عازم مکہ ہوئے تاکہ عربوں کو ترکوں کے خلاف خلیفتہ المسلمین کے خلاف بغاوت سے باز رکھیں۔ مگر وہاں پر انہیں انگریز کے اشارے پر گرفتار کر لیا گیا اور

خطیب اسرار صاحبزادہ فیض الحسن

جزیرہ مالٹا میں قید کر دیا گیا۔ جب وہ پانچ سال کی قید کے بعد رہا کیے گئے تو ترکی کی حکومت خلافت اسلامیہ ترکیہ کو شکست ہو چکی تھی اور اسکے حصے بخرے بھی کیے جا چکے تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد آزادی کی مسلح جدوجہد تو ختم ہو چکی تھی مگر لوگوں میں اضطراب بدستور موجود تھا۔ انگلستان میں جب پارلیمانی نظام حکومت قائم ہوا تو حکومت برطانیہ چند تحفظات کے ساتھ وہی پارلیمانی نظام اپنے مقبوضہ علاقوں میں بھی قائم کرنا چاہتی تھی تاکہ لوگ اپنے عقل و شعور کے ساتھ نمائندوں کے ذریعے اپنے مسائل سے حکومت کو آگاہ کریں تاکہ لوگوں کا حکومت پر اعتماد بحال ہو اسی ضمن میں 1884ء میں ایک انگریز دانشور نے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی کانگرس کے پلیٹ فارم پر چند دانشور جمع ہوتے' چند لوگ جمع ہوتے اور قراردادوں کے ذریعے حکومت تک اپنی آواز پہنچاتے اور اسکے بعد 1906ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈھاکہ میں رکھی گئی۔ اب لوگوں میں جماعت سازی کا شعور پیدا ہو چکا تھا اور افادیت سے بھی واقف ہو چکے تھے۔ گو علمائے دیو بند کافی حد تک منظم طریقہ پر سرکار برطانیہ کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے مگر وہ اس انداز سے منظم نہ تھے جس انداز سے آج کے دور میں جماعتیں منظم ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ علمائے دیو بند ہی حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت سید احمد بریلوی کا افکار خیالات اور 1857ء کے مجاہدین آزادی کے جدوجہد کے وارث علماء ہی بیسوی صدی میں جمیعت العلمائے ہند کے پلیٹ فارم پر جمع ہوئے اور تحریک آزادی کی جدوجہد میں نمایاں خدمات انجام دیں تو یہ ایک حقیقت پر مبنی ہے۔

تنظیم جمعیت العلمائے ہند

22 نومبر 1919ء کو دہلی میں تحریک خلافت کا ایک جلسہ تھا۔ جس میں ہندوستان بھر سے نمائندگان آئے ہوئے تھے۔ ان میں علماء حضرات بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ خلافت کا اجلاس ختم ہوا تو ہندوستان بھر کے 25 چیدہ چیدہ علماء نے الگ ایک اجلاس کیا۔ جس میں ایک تنظیم قائم کی گئی جسکا نام جمیعت العلمائے ہند رکھا گیا۔ جسکے صدر اتفاق رائے سے حضرت مفتی کفائیت اللہ صاحب اور جنرل سیکرٹری حضرت مولانا احمد سعید صاحب بنائے گئے۔ 25 علماء کی اس کنونشن میں تنظیم قائم کی گئی تھی۔ اسکی صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے فرمائی۔ جس میں جمیعت کے صدر حضرت مولانا مفتی کفائیت اللہ صاحب نے تنظیم کے اغراض مقاصد بیان کیے کہ جمیعت کے ارکان تین قسم کے لوگ ہونگے۔

1:- وہ اہل علم حضرات جنہوں نے باقائدہ کسی دینی مدرسہ سے دینی علم حاصل کیا ہو۔

2:- یا وہ لوگ رکن بن سکیں گے جنہوں نے باقاعدہ تعلیم تو حاصل نہیں کی مگر وہ دین کی خدمت پر معمور ہیں' امامت کرتے ہیں' واعظین میں شمار ہوتے ہیں' مذہب کے ساتھ تبلیغ کے ساتھ وابستہ ہیں۔

3:- پر عام لوگوں کو رکن جماعت بنانا تھا جن کو انصار بھی کہا جاتا تھا۔
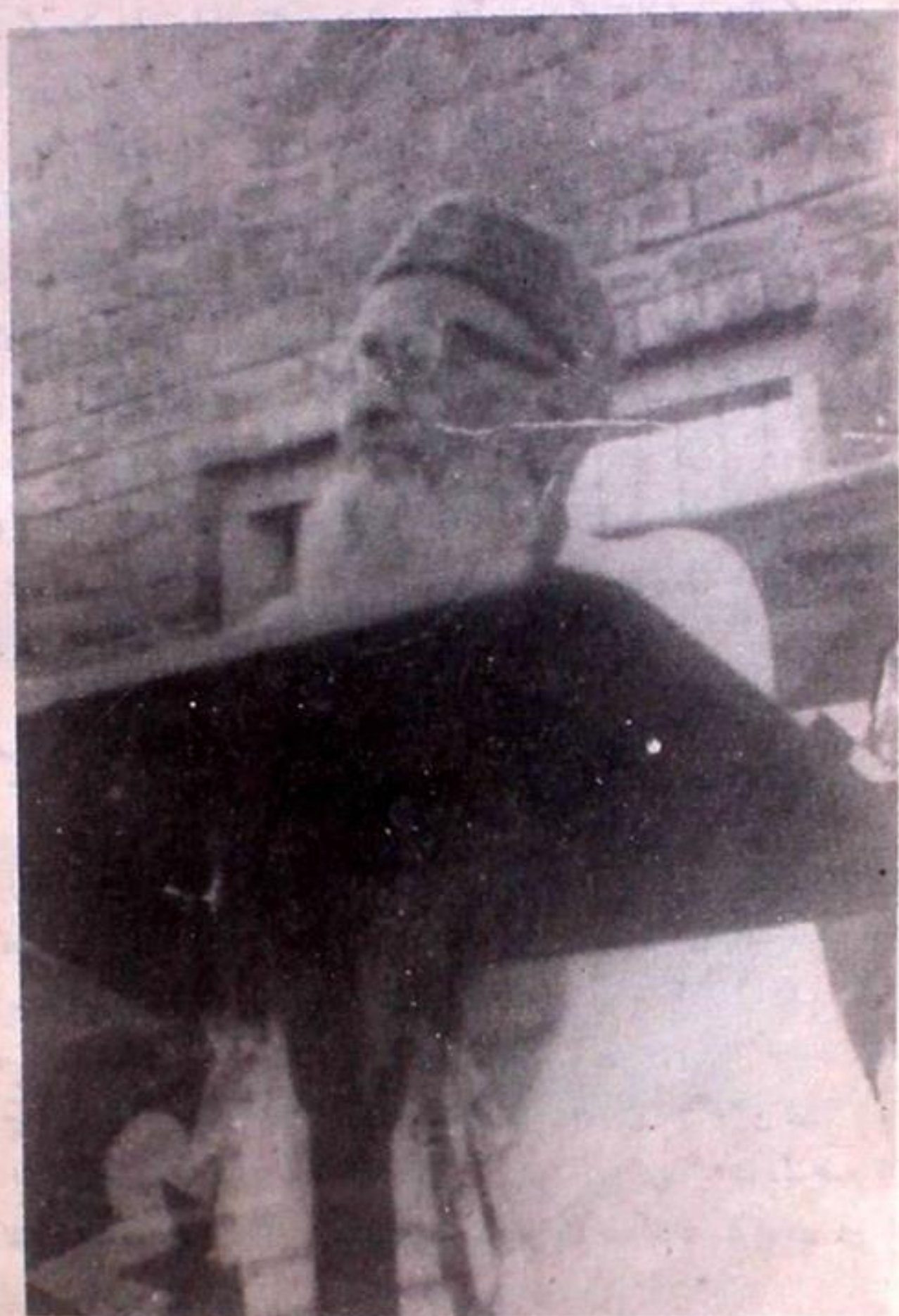
الجمعیہ کا اجراء

1925ء میں اخبار الجمعیہ کا اجراء ہوا یہ اخبار جدوجہد آزادی میں لیڈنگ رول ادا کرتا رہا ہے۔ خلافت کے وقت جو ہندو مسلم بھائی چارہ کی فضا پیدا ہوئی تھی وہ آریہ سماجیوں کے خلاف مذہبی سٹیج سے بھرپور مدافعت کی۔

1920ء میں اتحادی طاقتوں نے خلافت ترکیہ کا فیصلہ مسلمانان ہند کے جذبات و احساسات کو مدنظر رکھے بغیر کر دیا تو اس وقت کانگرس اور خلافت نے عدم تعاون اور ترک موالات کی تحریک چلائی تو اسیر جمعیت العلمائے ہند بھی انکے ساتھ شانہ بشانہ جدوجہد میں شامل تھی۔ اور اپنے اجلاس دہلی میں فتویٰ جاری کیا کہ انگریز حکومت کے ساتھ تعاون کرنا اور سرکار سے خطاب لینا یا کوئی اور فائدہ حاصل کرنا حرام ہے۔ یہ فتویٰ جب جاری کیا گیا کہ سرکار سے خطاب لینا یا کوئی اور فائدہ حاصل کرنا حرام ہے۔ یہ فتویٰ جب جاری کیا گیا تو سرکار نے ضبط کر لیا۔ کئی بار یہ فتویٰ جاری ہوا کئی بار ضبط ہوا۔ آخر سرکار نے جمیعت کے مندرجہ ذیل لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ حضرت مولانا شوکت علی، حضرت مولانا محمد علی جوہر، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ، پیر غلام مجدد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا نثار احمد صاحب بھی گرفتار شدگان میں شامل تھے۔ جمیعت العلمائے ھند کو کانگرس اور خلافت کی مکمل حمائت حاصل تھی وہ سمجھتی تھی کہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں مل جل کر ہی بہتر نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ جمیعت علمائے ہند نے سائمن کمیشن کے خلاف تحریک میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سائمن کمیشن ہندوستانیوں کے ساتھ فراڈ ہے دھوکہ ہے۔ 1927ء میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا اعلان دہلی یا نہرو رپورٹ جس میں چند تحفظات کے ساتھ مسلمانوں کو مخلوط طریقہ انتخاب منظور کرنے کو کہا گیا تھا۔ جسکی تفصیل سابقہ ابواب میں آچکی ہے۔ جمیعت العلمائے ہند نے مکمل تائید کی۔

3 اگست 1931ء کو جمیعت نے ایک نیا فارمولا کانگرس کو پیش کیا جس کے منظور کئے جانے سے مخلوط طریقہ انتخاب مانا جا سکتا ہے۔ جس میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے ساتھ ایک اور فارمولا بھی کانگرس کو پیش کیا گیا۔ یہ فارمولا وزیراعظم برطانیہ کو بھی بھیجا گیا اور اسکی ایک کاپی گول میز کانفرنس کے شرکاء حافظ ہدائیت حسن اور علامہ اقبال جو کہ گول میز کانفرنس کے ممبران تھے بھیجا گیا تھا مگر برطانوی وزیراعظم نے یہ فارمولا رد کر دیا اور علامہ اقبال نے بھی تائید نہیں کی تھی۔

دوسری عالمی جنگ شروع ہونے کے بعد مسلم لیگ نے 1940ء قرار داد پاکستان پاس کی جو تقسیم ہند کا ایک فارمولا تھا۔ جمیعت نے تقسیم ہند کی مخالفت کی مگر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی جو کہ جمیعت میں کوئی عہدہ تو نہ رکھتے تھے۔ مگر انکا احترام کافی تھا انہوں نے جمیعت کے ساتھ اختلاف کرتے ہوئے تقسیم ہند کے فارمولے کی حمائیت کی اور وہ تا زندگی مسلم لیگ کے ہی حامی رہے۔ انکے زیر سایہ جمیعت العلمائے اسلام قائم ہوئی جس کے وہ صدر اور بانی بھی تھے۔ پاکستان بن جانے کے بعد انکی

جمیعت العلمائے اسلام بے اثر ہو گئی۔ 1937ء کے الیکشن میں جمیعت العلمائے ہند نے الیکشن میں مسلم لیگ کا ساتھ دیا مگر یہ تعاون بہت تھوڑے عرصہ تک رہا۔ 1940ء میں جمیعت علماء کی مجلس عاملہ کا اجلاس تین چار مارچ 1940ء کو زیر صدارت مفتی کفائیت اللہ صاحب منعقد ہوا۔ جس میں مسلم نیشنل پارٹیوں کی ایک آزاد مسلم کانفرنس بلانے کے تجویز پاس کی گئی۔ اس میں آل انڈیا مسلم مجلس، مجلس احرار آل انڈیا یا مومن کانفرنس خدائی خدمت گار تحریک انجمن وطن بلوچستان آل انڈیا شعبہ پولیٹیکل کانفرنس کرشک پرجا پارٹی بھی تھی۔ اس کانفرنس کا مقصد مسلم لیگ کے علیحدہ مطالبے کے برعکس ایک کمزور وفاقی ریاست اور آزاد صوبے اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ تھا۔ یہی فارمولا کچھ ترامیم کے ساتھ 1942ء میں جمیعت العلمائے ہند کا سیاسی پروگرام بنا۔ 1945ء کا الیکشن جمیعت اور آل پارٹیز متحدہ محاذ نے اس نعرے متعے ساتھ مسلم لیگ کے خلاف لڑا تھا جس میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور جمیعت العلمائے ہند ناکام ہوئے تھے مسلم لیگ جیت گئی تھی۔

1929ء میں جمیعت العلماء نے شاروداہا ایکٹ کے خلاف تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ شاردھا ایکٹ مرکزی اسمبلی نے ایک قانون پاس کیا تھا جس میں کم عمری کی شادی پر پابندی لگائی گئی تھی۔ جمیعت نے اسے شعائر اسلام کے خلاف سمجھتے ہوئے اسکے خلاف تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ 1930ء میں پشاور قصہ خوانی بازار خدائی خدمت گاروں پر حکومت نے گولی چلائی جس میں سینکڑوں لوگ شہید ہزاروں زخمی ہوئے تھے۔ جمیعت العلمائے ہند نے تحقیقاتی کمیٹی میں شرکت کی اور اپنے دو نمائندے مفتی کفائیت اللہ اور مفتی محمد نعیم صاحب کو کانگرسی کمیٹی کے ساتھ شامل کیا۔ جب کانگرس اور جمیعت کی تحقیقاتی کمیٹی کا فیصلہ شائع ہوا تو حکومت ہند نے ضبط کر لیا تھا۔

جمیعت العلمائے ہند نے ہر اس معاملہ میں جس میں مسلم حقوق اور مسلم قانون کی خلاف ورزی ہوتی تھی اسکے خلاف ہمیشہ آواز بلند کی اور جدوجہد بھی کی 1932ء میں مسلم کو غیر مسلم کی شادی کا مسودہ قانون پیش ہوا تو جمیعت نے اس پر توجہ نہ دی اور اسلامی نقطہ نگاہ سے اس پر رائے دی۔ حکومت ہند نے معلمین حج کے لئے بھی ایک مسودہ قانون بنانا چاہا تو جمیعت نے فورا" احتجاج کیا کہ مذہبی معاملات میں حکومت ہند کو مداخلت کا قطعی کوئی حق نہیں۔ جمیعت کی کوشش سے ہی اوقاف کی زمین اور جائیداد پر سے انکم ٹیکس معاف کیا گیا۔

جمیعت علمائے ہند کا ایک بہت بڑا اجلاس امرتسر میں مورخہ 31 دسمبر 1919ء کو منعقد ہوا جس میں ہندوستان بھر کے علمائے کرام نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں اتفاق رائے سے یہ تجویز منظور کی گئی کہ جمیعت العلمائے ہند کا یہ اجلاس کامل ارادتمندی اور خلوص کے ساتھ اظہار کرتا ہے کہ حضرت سلطان معظم شہنشاہ خلافت عثمانیہ ترکیہ مسلمانوں کے امیرالمومنین ہیں۔ اس لئے اسکے نام کا خطبہ پڑھا جائے

تجویز نمبر2 میں جمعت العلمائے ہند کے منعقد اجلاس میں حضرت مولانا محمودالحسن اسیر مالٹا اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ مطالبہ اتفاق رائے سے منظور ہوا۔

ایک تجویز میں یہ پاس کیا گیا کہ صرف مرکزی جمیعت العلماء کے ساتھ لفظ ہند کا استعمال ہو گا دیگر جمیعت علمائے پنجاب جمیعت العلمائے سرحد وغیرہ۔

حضرت شیخ الہند کی تقریر

جمیعت العلمائے ہند کے اجلاس دوئم بمقام دہلی مورخہ 19-20-21 نومبر 1920ء زیر صدارت حضرت شیخ الہند محمود الحسن منعقد ہوا۔ جس میں حضرت شیخ الہند نے طویل اور ایمان افروز تقریر فرمائی جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ دور حاضر میں دشمنان اسلام نے مقامات مقدسہ کو غصب کر کے اقتدار خلافت کو پامال کیا ہے۔ مسلمانوں کے واجب الاحترام جان و مال سے زیادہ عزیز مذہب کی توہین کی ہے۔ مسلمانوں کا مال متاع ہی انکا مذہب اور عقیدہ ہے۔ برطانوی حکومت نے جب خلافت اسلامیہ کو پامال کیا ہے تو گویا مسلمانوں کا سب کچھ ہی لوٹ لیا ہے یوں تو یورپ کی عیسائی حکومتیں خلافت اسلامیہ ترکیہ کے خلاف ہمیشہ ہی برسرپیکار رہی ہیں مگر 1877ء سے خلافت عثمانیہ کے خلاف لوٹ کھسوٹ کا ایک مستقل سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا۔ مصر' قبرص' طرابلس' سالونیکا' یونان' بلغاریہ' سرویا' البانیہ' ترکی اس سے یکے بعد دیگرے چھین لئے گئے اور خلافت عثمانیہ کا اقتدار ختم کر دیا گیا۔ پھر 1914ء کو جنگ میں شام 'عراق 'عرب' سمرنا' ترکی کے مسلمانوں پر مصیبت کے پہاڑ توڑے گئے۔ لاکھوں مسلمان قتل کئے گئے - کیا مسیحی امت سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ بیت اللہ شریف اور روضہ اطہرؐ کا احترام کریں گے۔ شریف حسین مکہ جو سرکار برطانیہ کا وظیفہ خوار ہے۔ جو برطانوی حکمرانوں کی تصاویر اپنے سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ وہ شریف حسین جو اسلامی مجاہدین کو گرفتار کر کے برطانوی فوج کے حوالے کرتا رہا ہے۔ وہ شعائر اسلام کی حفاظت کرے گا ایک غدار السلام سے ایسا ممکن نہیں۔

ہندوستان کے کثیر علمائے دین کی جماعت یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس سامان حرب نہیں' توپیں' ہوائی جہاز و دیگر سامان جنگ نہیں اس لئے ہم مادی جنگ تو انگریز کے خلاف نہیں لڑ سکتے مگر ہم دشمنان اسلام انگریزوں کے خلاف عدم تعاون تو کر سکتے ہیں۔ ترک موالات تو کر سکتے ہیں۔ اس لئے جمیعت العلمائے ہند اور دیگر علمائے ہند کے متفقہ فیصلہ پر یہ فتویٰ صادر کرتے ہیں کہ ہندوستان کی برطانوی حکومت کے ساتھ کسی قسم کا بھی تعاون نہ کیا جائے اور سرکار انگلشیہ کی نوکری بھی نہ کی جائے۔ عدم تعاون اور ترک موالات متفقہ عمل کیا جائے۔ آج احتجاج اور مطالبہ حقوق کے میدان صرف مظاہروں کے پلیٹ فارم ہیں۔ ہوائی جہاز' بندوق' توپ تفنگ نہیں۔ اس لئے ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ احتجاج ' مظاہروں اور جلسوں کے ذریعے برطانیہ کی حکومت کو مجبور کرے کہ وہ مسلمانوں پر بربریت سے باز آ جاویں۔ حضرت شیخ الہند نے اس جلسہ میں قرآنی آیات سے انگریز کی مخالفت کو جہاد قرار دیا اور علمائے ہند کو مجبور کیا کہ وہ اپنی تمام تر توجہ برٹش سامراج کی بیخ کنی کے لئے

وقف کریں اور اپنی تمام صلاحیتیں اس جہاد کے لئے وقف کر دیں۔ جمیعت العلمائے ہند کے اس اجلاس میں گیارہ تجاویز منظور کی گئیں۔ جنمیں زیادہ عدم تعاون اور ترک موالات پر زور دیا گیا۔ تمام تجاویز اتفاق سے منظور کرلیں گئیں۔

جمیعت العلمائے ہند کا تیسرا سالانہ اجلاس

مورخہ 18-19-20 نومبر 1921ء لاہور میں زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد منعقد ہوا۔ طویل تحریری خطبہ صدارت پڑھا گیا۔ جس میں مسلمانوں کی پسماندگی اور درماندگی کا ذکر کیا گیا اور اسلامی عقیدہ کی بنیاد پر انکا علاج بھی بیان کیا گیا۔ مولانا کا طرز بیان اور خطبہ صدارت نہایت عالمانہ تھا۔ 32 سال کی عمر میں یہ منصب کہ جمیعت العلمائے ہند کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی اور معرکتہ الاعرا خطبہ صدارت پیش کیا۔ تین دن کی اس کانفرنس کے بعد چند تجاویز منظور کی گئیں۔

1 جمیعت العلمائے ہند کی مجلس منتظمہ کا یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ جمیعت کے جس فتوے کو چیف کمشنر دہلی کے اعلان مورخہ 13 جولائی 1921ء دہلی اور بعض دوسرے صوبوں میں ضبط کیا گیا ہے وہ تمام تر شریعت اسلامیہ کے احکام پر مشتمل ہیں جو کہ تیرہ سو برسوں سے اپنی یکساں اور غیر مبتدل قطعیت کے ساتھ موجود ہیں اور جنکا اعتقاد اور عمل ہر مسلمان پر فرض ہے بناء بریں علماء حضرات کسی صورت میں بھی مداخلت دین مسلمین برداشت نہ کریں گے۔

2 جمیعت العلمائے ہند کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ گورنمنٹ نے خلافت کمیٹی کے لیڈروں بشمول حضرت مولانا شوکت علی' مولانا محمد علی جوہر' مولانا حسین احمد مدنی پیر غلام مجدد' ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور دیگر لیڈران خلافت کو گرفتار کیا گیا ہے انکی مذمت کرتا ہے جن الزامات میں ان لیڈران کو گرفتا کیا گیا ہے ان گرفتارشدگان لیڈران کرام کا عمل اسلام کے مطابق تھا سرکار برطانیہ کے خلاف عدم تعاون اور ترک موالات بھی عین اسلامی احکامات کے مطابق ہیں

3 مسلمانوں کے لئے فوج اور پولیس میں بھرتی ہونا بھی حرام ہے (الف) اس لئے کہ فوج کو کسی بھی مسلمان حکومت کے خلاف لڑایا جا سکتا ہے فوج اور پولیس کو مسلمانوں پر ہی تشدد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کا کفر کے ساتھ ہو کر جنگ کرنا جس سے کفر کی شہرت بڑھتی ہو اس وجہ سے فوج اور پولیس کی نوکری حرام ہے جمیعت العلمائے ہند کے اجلاس میں اور بھی کئی تجاویز منظور کی گئیں

جمیعت کا اجلاس چہارم

24-25-26 دسمبر 1922ء زیر صدارت مولانا حبیب الرحمان دیو بندی صوبہ بہار کے گیا کے

مقام پر ہوا خطبہ صدارت حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب نے پیش کیا نہائت بصیرت افروز خطبہ تھا مقامی حالات کے علاوہ یورپ کے حالات اور 1914ء کی جنگ پر بھی تبصرہ کیا گیا آپ نے انقلاب روس 1917ء کی تعریف اس پرولتاری انقلاب کو مظلوم قوموں کا انقلاب قرار دیا ترکی کے غازی مصطفے کمال پاشا اور انور پاشا کی بھی تعریف کی غازی امان اللہ خان کی حکومت کو مسلمانان ہند کے لئے امید کی کرن قرار دیا۔ قرار داد جمیعت العلمائے ہند غازی مصطفے کمال پاشا کی حکومت کو قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے امید رکھی کہ یہ حکومت سابقہ خلیفتہ المسلمین کی طرح عالم اسلام کی راہنمائی کرتی رہے گی۔ جمیعت العلمائے ہند کا یہ اجلاس خاندان عثمانی کی اسلام کے لئے خدمات کے پیش نظر سلطان عبدالمجید کو خلیفتہ المسلمین کرتا ہے انکا انتخاب اسلامی اصولوں کو مد نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔

ایک قرار داد کے ذریعے کونسل کے انتخابات پر کھڑے ہونے کو ناجائز قرار دیا گیا ہے بشمول مندرجہ بالا قرار دادوں کے کل 14 قرار دادیں جمیعت کے اس اجلاس میں منظور کی گئیں۔

جمیعت اللعلمائے ہند کا مرکزی چھٹا اجلاس

11-12-13 جنوری 1925ء کو مراد آباد میں زیر صدارت مولانا ابو محاسن محمد سجاد نقشبندی منعقد ہوا جس میں ملک کے تمام سیاسی حالات پر توجہ دی گئی لوگوں کو سرکار انگلیشیہ کے خلاف عدم تعاون اور ترک موالات پر زور دیا گیا اختتام اجلاس پر 27 تجاویز منظور کی گئیں جن میں مندرجہ ذیل تجویز بھی شامل تھی۔ جمیعت العلمائے ہند کا یہ مرکزی اجلاس ملک میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان فساد کو سخت افسوس کی نظر سے دیکھتا ہے جمیعت نے سات سرکردہ ارکان جماعت کی کمیٹی قائم کی جو مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں ہم آہنگی پیدا کریں

جمیعت کا اجلاس پنجم کوکناڈا دہلی

29 دسمبر 1923ء زیر صدارت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی منعقد ہوا۔ حضرت سید حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک طویل خطبہ صدارت پیش کیا جس میں تاریخ کے حوالوں سے مسلمانان عالم کے عروج و زوال کی داستانیں پیش کی گئیں۔ امت مسلمہ کے زوال کی داستان پیش کی خلافت عثمانیہ کی شکست کا مرثیہ پڑھا گیا۔ برطانیہ عظمی کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا گیا۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کو بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کو کہا گیا۔ ہندوستان میں بسنے والے دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کو کہا گیا۔ حصول آزادی کی جدوجہد میں ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ حصول مقصد کے لئے آگے بڑھنے کو کہا گیا اور انہوں نے فرمایا کہ عالم اسلام کا سب سے بڑا دشمن اس وقت برطانیہ ہے عالم اسلام اور ہندوستان کی آزادی کے لئے کانگرس کے ساتھ مل کر ہی

حصول آزادی کی جدوجہد میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

اجلاس کے آخر میں چند تجاویز پاس کی گئیں جن میں مندرجہ ذیل تجویز بھی شامل ہیں۔
جمیعت العلمائے ہند کا یہ اجلاس حضرت مولانا حسین احمد مدنی' حضرت مولانا نثار احمد صاحب' پیر غلام مجدد صاحب' مولانا شوکت علی صاحب' مولانا محمد علی جوہر صاحب اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو صاحب مجاہدین کراچی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انکی کامیاب رہائی پر مبارک باد پیش کرتا ہے

جمیعت العلمائے ہند کا ساتواں اجلاس کلکتہ

میں مورخہ 11-12-13-14 مارچ 1926ء زیر صدارت حضرت مولانا سید سلیمان ندوی منعقد ہوا جس میں ملک کی عام سیاسی صورت حال عدم تعاون ترک موالات کی تحاریک پر زور دیا گیا آزادی کی جدوجہد کو مزید تیز کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا عالم اسلام کی تنظیم کی ضرورت پر زور دیا گیا تمام ہندوستان سے علماء کے ڈیلی گیٹ اس کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد جدید طریقوں پر چلانے پر زور دیا گیا یورپین طاقتوں کی ہوس ملک گیری کی مذمت کی گئی۔
اس کانفرنس میں کل 20 تجاویز پاس کی گئیں جسمیں مندرجہ ذیل تجاویز بھی شامل تھیں۔ تجویز نمبر 4 میں کہا گیا ہے کہ مسلمانان ہند اپنے ملک کی بنی ہوئی مصنوعات استعمال کریں گھر کا بنا ہوا کھدر کا کپڑا اپنے زیب تن کریں بدیشی مال کا بائیکاٹ کریں اپنے ملک کی بنی ہوئی چیزوں کو استعمال کر کے ہی ملک سے غربت افلاس کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے تجویز نمبر 2 میں کہا گیا ہے کہ جس طرح عبادات مذہبی فریضہ ہیں اسی طرح آزادی کی جدوجہد بھی مذہبی فریضہ ہے تمام مسلمانوں کے لئے لازمی ہے کہ ملک کی آزادی کو مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے تحریک آزادی میں شامل ہوں تجویز نمبر 41 میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان کی تمام اقوام اور رسم الخط اور اردو زبان کو قومی ورثہ سمجھتے ہوئے اپنائیں تاکہ یہ کل ہندوستان کی متفقہ زبان بن جائے۔

جمیعت العلمائے ہند کا آٹھواں اجلاس پشاور

زیر صدارت حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری مورخہ 2-3-4 دسمبر 1927ء کو منعقد ہوا حضرت علامہ انور شاہ صاحب نے طویل خطبہ صدارت پیش کیا جس میں مذہبی امور کے علاوہ ملکی سیاست پر بھی اظہار خیال کیا گیا جلسہ کی منصب صدارت ملنے پر منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔ مسئلہ قومیت پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ مذہب اور عقیدہ کا رشتہ ہی قومیت یا قوم کو جنم دیتا ہے فرمایا کہ افغان ایک قوم ہیں مگر مسلمان بھی ہیں ترکی ایک قوم ہیں مگر مسلمان بھی ہیں انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان میں کئی قومیں آباد ہیں مگر مسلمان ایک الگ قوم ہیں انہوں نے تجاویز دہلی جسمیں ہندوستان بھر

کے علماء اور لیڈران نے مخلوط انتخابات کی تجویز چند تحفظات کے ساتھ قبول کرنے کو کہا گیا تھا منظور نہیں کیا ان تجاویز کو اگر ہندو مان لیتے تو مخلوط انتخاب کی تجویز کو مانا جا سکتا تھا مگر انہیں ایام میں ہندو مہا سبھا نے بھی اعلان دہلی کی تجاویز کو نہیں مانا اس لئے اعلان دہلی اپنی موت آپ ہی مر گیا انہوں نے جمیعت العلمائے ہند کی سابق آٹھ سالہ کارکردگی کی تعریف بھی کی۔ ہندوستان کی دینی حیثیت کے بارے انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان دالحرب بھی نہیں دارلسلام بھی نہیں یہ دارالا امان ہے جب حضور علیہ السلام ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو مدینہ میں دیگر مذاہب کے لوگ بھی رہتے تھے اس لئے مدینہ شریف کو اس وقت دارلامان کہا گیا تھا اور غیر مسلموں کے ساتھ معاہدات بھی ہوتے تھے اور انکے ساتھ مل جل کر رہنے کے عہد بھی کئے گئے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان کے لوگوں کی بدقسمتی ہے کہ وہ ایک بدیشی قوم کے غلام ہیں۔ یہ امر مجبوری ہے دنیا میں کوئی شخص بھی غلامی کو نہیں پسند کرتا اہل ہند کو آئینی مراعات دینے کے لئے حکومت نے کئی بار کمیشن قائم کئے مگر ہر کمیشن کی سفارشات اہل ہند کو مطمئن نہ کر سکیں۔ دیگر صوبوں میں کچھ آئینی اختیارات منتخب حکومتوں کو دیئے گئے مگر صوبہ سرحد کو شاید قدیم غیر دستوری علاقہ سمجھا گیا ہے۔ یہاں پر عوام کے کوئی حقوق ہی نہیں تعلیمی اعتبار سے صوبہ سرحد میں صرف تین کالج ہیں دیہاتوں میں سکول کا نام و نشان تک نہیں پچاس لاکھ کی آبادی والے اس صوبے کے لوگوں کو انسان بھی نہیں سمجھا گیا۔ سرکاری اہل کار ہیں' پولیس ہے جس کسی شہری کے ساتھ کوئی بھی سلوک کریں کوئی پرسان حال نہیں یہ امتیازی سلوک صوبہ سرحد کے ساتھ شائد اس لئے ہے کہ یہاں کی آبادی اکثریت مسلمانوں کی ہے اور حکومت کی پالیسی ہے کہ مسلمانوں کو پسماندہ رکھا جائے کانفرنس میں 52 تجاویز منظور کی گئیں جن میں مندرجہ ذیل تجاویز بھی شامل ہیں

تجویز نمبر 2 میں کہا گیا ہے کہ مجاہدین تحریک آزادی حضرت مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ جناب خواجہ غازی عبدالرحمان رحمتہ اللہ علیہ حضرت مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی رحمت اللہ علیہ ان حضرات پر جیل میں تشدد آمیز ناروا سلوک کی مذمت کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ ان مجاہدین پر سختی بند کی جائے تجویز نمبر 10 یہ اجلاس صوبہ سرحد کے مسلمانوں خصوصی طور پر اور عام مسلمانوں سے عمومی طور پر پر زور اپیل کرتا ہے کہ بیاہ شادی میں لڑکی کی قیمت وصول کرنی بند کی جائے اور شادیوں میں سادگی اور بے جا اخراجات ہرگز نہ کئے جاویں

تجویز نمبر 13 جمیعت العلمائے ہند کا یہ اجلاس گورنمنٹ سے مطالبہ کرتے ہے کہ صوبہ سرحد کو جلد از جلد مکمل آئینی اصلاحات دی جاویں اور باشندگان صوبہ سرحد سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنے اس فطری حق کا برابر مطالبہ کرتے رہیں گے جب تک آئینی حقوق حاصل نہیں ہو جائے جدوجہد جاری رکھیں گے۔

جمیعت کا یہ اجلاس حکومت پنجاب کی متشددانہ پالیسی جس کے تحت اخبار زمیندار اور سیاست کی ضمانت ضبط کی گئی ہے مذمت کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ صحافتی آزادی کو قائم رکھتے ہوئے اپنے یہ احکام فورا۔ واپس لے

پنڈت موتی لال نہرو کی موت پر افسوس کا اظہار کیا گیا۔ استقبالیہ خطبہ میں کہا گیا کہ جداگانہ انتخابات سے مسلمانوں کو اگرچہ کچھ فائدہ ہے مگر نقصانات بہت زیادہ ہیں۔ اور ایسی صورت میں دونوں مذاہب یا ہندوستان کے تمام مذاہب کے لوگوں میں نفرت زیادہ ہو جائے گی اور کہا گیا کہ ہم جداگانہ انتخاب کے معمولی فائدے سے انکار نہیں کرتے۔ مگر اس کے نقصانات اس کے فائدہ سے کہیں زیادہ ہونگے۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے خطبہ صدارت میں

سندھ کو علیحدہ صوبہ بنائے جانے کی تائید کی اور صوبہ سرحد میں اصلاحات نافذ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ نہرو رپورٹ کا اس وقت کوئی تذکرہ نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو اکٹھا رکھنے کا ایک بہترین حل تھا۔ اور انہوں نے فرمایا کہ شاردھا ایکٹ کے متعلق میں پہلے بھی اظہار رائے دے چکا ہوں۔ مگر اب پھر یہ کہوں گا کہ صغیر سنی کی شادی اسلامی روح کے منافی ہے۔ میں اپنی بصیرت کے مطابق رائے رکھتا ہوں کہ صغیر سنی کی شادی مستحسن نہیں۔ اسلامی ممالک میں بھی یہ رسم بہت کم یا بالکل ہی ختم ہو چکی ہے۔ نکاح، طلاق اور ورثہ کے قانون جو عدالتوں میں اس وقت رائج ہیں۔ جنہیں محمڈن لاء کا نام دیا گیا ہے وہ سخت ناقص ہیں۔ مولانا آزاد نے فرمایا کہ ہندو مسلم مسائل کا حل باہمی روابط سے ہی نکالا جا سکتا ہے نفرت سے نہیں۔ جمعیت العلمائے ہند ایک کمیٹی قائم کرے جو ہندو مسلم مسائل کا حل تلاش کریں۔ اسکے بعد فاضل صدر جلسہ نے کانپور، آگرا، بنارس اور مرزا پور کے خونی واقعات پر افسوس کا اظہار کیا۔ مندرجہ ذیل تجویزیں منظور کی گئیں

1:- ہندو مسلم فسادات بنارس، مرزا پور، آگرہ، کانپور پر اظہار نفرت

2:- مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی اور دیگر سیاسی قیدی کی رہائی کا مطالبہ

3:- تمام فدا کاران آزادی بشمول شہدائے صوبہ سرحد جنہوں نے جنگ آزادی میں جانیں قربان کی ہیں انہیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

5:- حکومت کی طرف سرحدی قبائل پر جو بمباری کی گئی ہے اسکے خلاف نفرت کا اظہار

6:- بدیشی کپڑے اور دیگر غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ لوگوں کو اپنے ملک کی چیزیں استعمال اور غیر ملکی چیزوں کے بائی کاٹ کا مشورہ دیا گیا

7:- آئندہ دستور اساسی میں مسلمانوں کی تہذیب اور پرسنل لاء کی حفاظت کا مطالبہ۔

8:- سردار بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کی شجاعت کا اعتراف انہیں شہید قوم قرار دیا

9:- صوبہ سرحد کے سرخ پوش رہنماء حبیب نور کے خلاف اقدام قتل کا مقدمہ چوبیس گھنٹے میں سزائے موت پر اظہار ناراضگی

10:- فلسطین میں برطانیہ کی یہود نواز پالیسی پر زور مذمت کا اظہار

11:- ہندو مسلم مفاہمت مسودہ مرتب کرنے کا اختیار مجلس عاملہ کو دیا گیا

12:- صوبہ سرحد کے متولیاں وقف سے دینی مدارس قائم کرنے کا مطالبہ

جمیعت العلمائے ہند کا اجلاس دہلی

3-4-5 مارچ 1939 زیر صدارت مولانا عبدالحق مدنی

خطبہ استقبالیہ شوکت اللہ شاہ صاحب انصاری نے پیش کیا۔ وطن کی آزادی کی جدوجہد میں انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ تعاون کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ برطانوی حکومت بھی اس فکر میں ہے کہ خلافت اسلامیہ کے جلیل القدر منصب کو کسی ماتحت اسلامی فرمانروا کے سپرد کر دے تا کہ خلیفتہ السلام کی حیثیت وہ ہو جائے جو ہندوستان کے والیان ریاست کی ہے۔ دوسری طرف ہندوستان کی قومی جدوجہد کو کمزور کرنے کے لئے تقسیم ہند کے منصوبوں میں مسلمانوں کو الجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مزید انہوں نے فرمایا کہ ملک میں فرقہ پرستی کے رجحانات کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ تعاون کیا جاوے

مولانا عبدالحق مدنی نے کہا کہ ہندو فرقہ پرست یہ کہہ رہے ہیں کہ ہندوستان کی قومی زبان سنکرت رسم الخط میں ہونی چاہیے۔ اسکی مذمت کرتے ہوئے مولانا مدنی نے کہا کہ کانگرس کا رویہ قومی زبان کے معاملہ میں ٹھیک ہے۔ ہمیں کانگرس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ حضرت مدنی نے یو پی گورنمنٹ کی مذمت کی کہ اس نے لکھنؤ شہر میں مدح صحابہ پر پابندی لگائی ہے۔ اجلاس میں کئی تجاویز منظور کی گئی۔ جن میں سے مندرجہ ذیل تجاویز بھی شامل ہیں۔

تجویز نمبر1 جمیعت علمائے ہند کا یہ اجلاس غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی بے وقت موت پر گہرے رنج و الم کا اظہار کرتے ہوئے دعا کرتا ہے کہ خداوند کریم انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے آمین

تجویز نمبر2 جمیعت کا عظیم الشان اجلاس ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم اور انکی بیگم کی بے وقت موت پر گہرے رنج غم کا اظہار کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ خدا وند کریم مرحومین کو جنت میں جگہ دے آمین

تجویز نمبر3 جمیعت کا یہ اجلاس حضرت مولانا شوکت علی مرحوم کی بے وقت موت پر رنج غم کا اظہار کرتا ہے۔ دعاگو ہیں کہ خداوند کریم انہیں جنت میں جگہ دے آمین

تجویز نمبر4 جمیعت العلمائے ہند کا یہ اجلاس ڈاکٹر سر محمد اقبال کی وفات حسرت آیات پر گہرے رنج کا اظہار کرتا ہے۔ خداوند کریم سے دعا کرتے ہیں کہ مرحوم کو جنت میں جگہ دے آمین

تجویز نمبر5 چونکہ مسلمانان ہند کا پرسنل لاء مخصوص ہے۔ ملت اسلامیہ ایک مستقل ملت ہے کانگرس نے بھی مسلمانوں کو ملت تسلیم کیا ہے اس لئے مسلمانوں کے گھریلو مسائل کے حل کے لئے ایک الگ محکمہ قائم کیا جائے۔ جس کا وزیر بھی مسلمان ہو۔ مسلمانوں کے تمام گھریلو مقدمات کے انہیں

جناب بھٹو، نواب اکبر بگتی، بیگم رعنا لیاقت علی اور یحییٰ بختیار

عدالتوں کے ذریعے فیصلے کیے جاویں۔ ہر قسم نکاح، طلاق، ورثہ وغیرہ

جمیعت علمائے ہند کا بارھواں اجلاس

جونپور مورخہ 7-8-7 جون 1940ء

خطبہ صدارت میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ موجودہ جنگ عالگیر نے دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ بڑی بڑی اقوام نیست و نابوت ہو رہی ہیں۔ فرانس، بلجیم، ہالینڈ جن کا دنیا میں دبدبہ تھا جرمنی کے آگے ٹھہر نہ سکیں۔ ہم ہیں کہ غلامی کے بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں۔ برطانوی فوج نے ہماری تاریخ بدل کر رکھ دی ہے۔ قانون سازی میں ہندوستانیوں کا کوئی حصہ نہیں ہے

برطانوی قوم 1600ء میں بغرض تجارت ہندوستان میں وارد ہوئے تھے آج وہ ہمارے آقا ہیں۔
انہوں نے ہندوستان کی 400 سالہ تاریخ کے حوالوں سے ہندوستانی قوم کے دکھ درد بیان کئے اور کہا کہ کس طرح برٹش حکمرانوں نے لوگوں کو اپنی گرفت میں جکڑ کر اپنی حکمرانی قائم کی حضرت مدنی نے عہد غلامی کی پوری سرگزشت تفصیل کے ساتھ بیان کی

کل 15 تجاویز بیان کی گئی بشمول مندرجہ ذیل دہلی کے نمبر2

تجویز نمبر1 حضرت مولانا معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کی وفات پر گہرے رنج غم کا اظہار کیا گیا۔

تجویز نمبر2 میں اجلاس میرٹھ کی اس قرار داد کی تائید کی گئی جس میں ہندوستانی عوام سے کہا گیا ہے کہ یورپ کی اس ہولناک جنگ میں حکومت کے ساتھ ہر گز تعاون نہ کیا جائے حکومت برطانیہ جنگ کی ہولناکی میں گھیرے ہونے کے باوجود ہندوستان آزاد کرنے کو تیار نہیں۔ اس لئے جمیعت العلمائے ہند امت مسلمہ سے پر زور اپیل کرتی کہ وہ حکومت کے ساتھ کسی قسم کی معاونت نہ کریں

تجویز نمبر4 جمیعت کا یہ اجلاس آزاد مسلم کانفرنس دہلی کی تجاویز کی تصدیق اور تائید کرتا ہے۔ یہ تجاویز وطن کی آزادی اور مسلم مفاد کے تحفظ کے لئے نہایت ضروری ہیں

تجویز نمبر5 جمیعت کا یہ اجلاس مسلمانوں میں برادری اونچ نیچ کی مذمت کرتا ہے ہر مسلمان واجب الاحترام ہے کوئی برادری اونچ نیچ اسلام میں نہیں

تجویز نمبر8 جمیعت کا یہ اجلاس تحریک مدح صحابہ کی تائید کرتا ہے۔ یہ اجلاس اپنی منظور شدہ تجویز دہلی کی تائید اور توصیف کرتا ہے

تجویز نمبر10 یہ اجلاس مسجد شہید گنج کے متعلق پریوی کونسل کے فیصلہ کی مذمت کرتا ہے۔ ہمیں مخالفانہ قبضہ 12 سال سے [illegible]د ہونے پر مسلمانوں کو مسجد شہید گنج سے بے دخل کرتا ہے

جمعیت علمائے ہند کا تیرھواں سالانہ اجلاس لاہور

مورخہ 20-21-22 مارچ 1942ء زیر صدارت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ
جمیعت العلمائے ہند کے اس اجلاس میں راقم بھی موجود تھا۔ خطبہ استقبالیہ مولانا عبدالقادر قصوری نے پڑھنا تھا جو بیمار ہونے کی وجہ سے خود نہ پڑھ سکے انکے بیٹے مشہور قانون دان میاں محمود علی قصوری کے بڑے بھائی محمد علی قصوری نے پڑھا تھا۔ خطبہ صدارت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے پہلے سے چھپا ہوا پڑھا تھا۔ جلسہ میں جس وقت حضرت مدنی خطبہ صدارت پڑھ رہے تھے مسلم لیگ والوں نے ہنگامہ کر دیا تھا۔ جس کو احرار رضاکاروں نے کچل دیا۔ چند منٹ کے بعد جلد ہی امن قائم ہو گیا تھا۔ حضرت مدنی نے بین الاقوامی حالات پر روشنی ڈالی۔ تقسیم ہند کو مسلمانوں کے لئے نقصان دہ قرار دیا۔ جداگانہ انتخابات کو مسلمانوں کے لئے مخلوط انتخاب سے زیادہ مضر قرار دیا۔ جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ جنگ عالمگیر 1940ء میں مسلمانوں کو حکومت ہند کے ساتھ عدم تعاون کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ آزاد ہندوستان کے لئے وفاقی طرز حکومت جسمیں مرکز کے پاس کم سے کم اختیارات ہوں۔ آئین بنانے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی سفارشات کو موجودہ آئینی خلفشار کے لئے بہترین حل قرار دیا گیا۔ بشمول مندرجہ ذیل تجاویز کے کل اٹھارہ تجاویز منظور کی گئیں۔

تجویز نمبر1 جمیعت علمائے ہند کا یہ اجلاس مولانا محمد سجاد صاحب امیر شریعت صوبہ بہار کی وفات پر اظہار رنج الم کرتے ہوئے دعاگو ہے کہ خدا وند کریم مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے آمین

تجویز نمبر4 میں مسلمانوں کے فرقوں میں آپس میں ہم آہنگی کی ضرورتوں پر زور دیا گیا

تجویز نمبر11 جمیعت العلمائے ہند کا یہ اجلاس مدارس عربیہ کے نصاب میں دور حاضر کی ضرورتوں کے مطابق تبدیلی کو اشد ضروری سمجھتا ہے۔ اس لئے ماہرین کی کمیٹی قائم کی جائے جو موجودہ تعلیمی نصاب عصر حاضر کی ضرورتوں کے مطابق ترتیب دے تاکہ عربیہ ادارے کے تعلیم یافتہ طالب علم وقت کے ساتھ اپنی زندگی کو چلا سکیں

تجویز نمبر13 جنگ کے مہیب خطرات کے پیش نظر ضرورت ہے کہ ہر عام اور خاص ملکی مصنوعات استعمال کریں اور ملک کو صنعتی دور میں داخل کرنے کی طرف بھی بھرپور توجہ دیں اور جدوجہد کریں۔

تجویز نمبر14 میں سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ خصوصی طور پر مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی صدر مجلس احرار اسلام کی خرابی صحت کی بنا پر رہائی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو
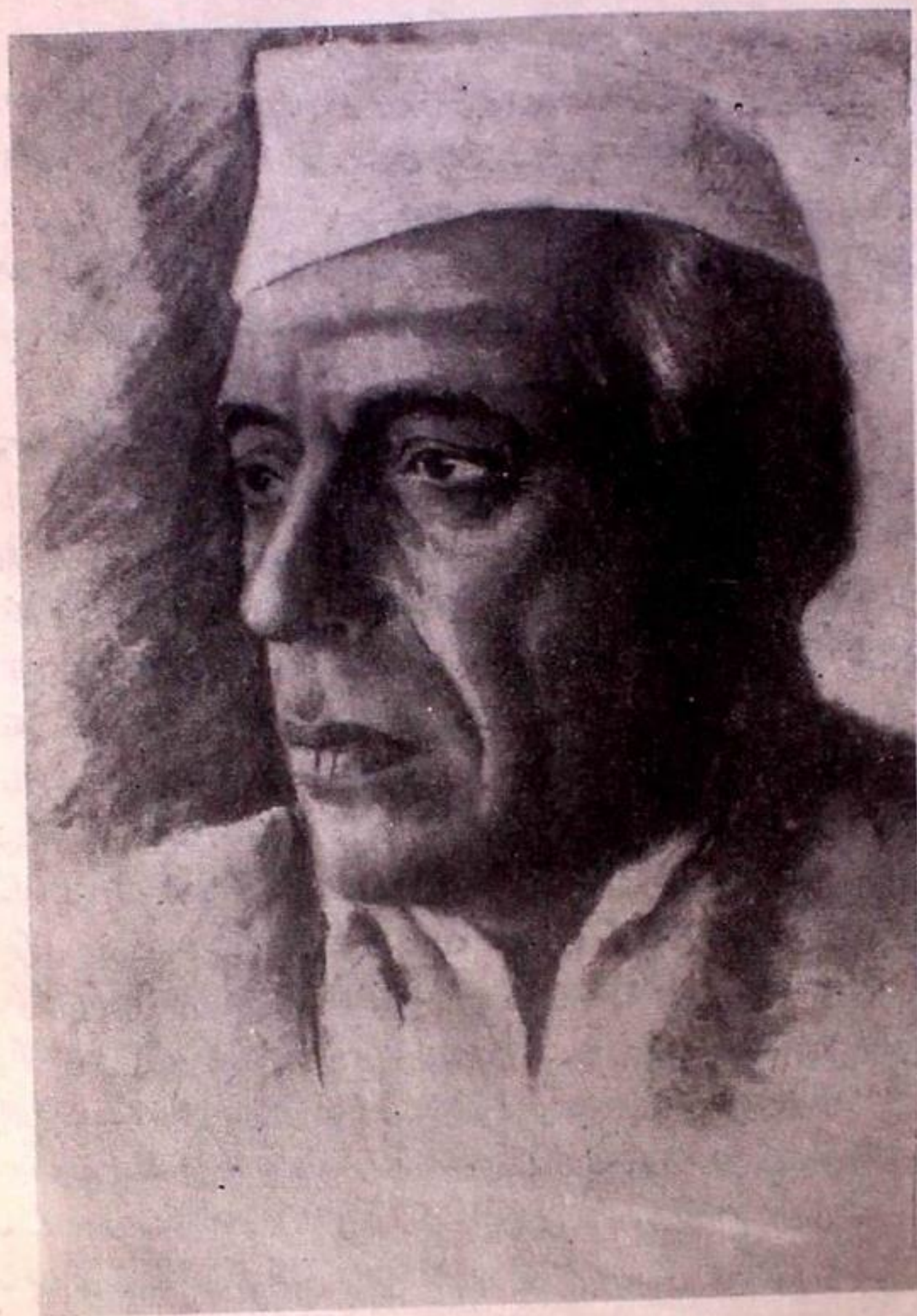
جمیعت العلمائے ہند کا چودھواں اجلاس

مورخہ 21-22-23 مئی 1945 زیر صدارت حضرت مولانا حسین احمد مدنی بمقام سہارنپور یو پی اس اجلاس میں بھی جمیعت کی وہی پالیسی پیش کی گئی جو لاہور 1442ء کے اجلاس میں پیش کی گئی تھی۔ مگر 1945ء کے الیکشن کے لئے مطالبہ پاکستان کے جواب میں یا ہندوستان کے مسائل دستوری حل کرنے کی پوری ذمہ داری سے پیش کیا گیا۔ 1945ء کے الیکشن میں جمیعت کا دستوری خاکہ تھا بہرحال جمیعت کے اس دستوری فارمولے کو امت مسلمہ نے رد کر دیا تھا اور مسلمانان ہند نے تقسیم ہند کا فارمولا منظور کر لیا تھا۔ مسلم لیگ الیکشن 1945ء جیت گئی۔

جمیعت العلمائے ہند کا دستوری فارمولا

1:- ہندوستان کا دستور وفاقی اصول پر مرتب کیا جائے

2:- تمام صوبے (وفاقی وحدتوں) مکمل طور پر آزاد ہوں اور 95 فی صد اختیارات انہیں کو حاصل ہوں

3:- وفاقی مرکز کو وہی اختیارات حاصل ہونگے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں گے۔

4:- وفاقی وحدتوں کے لئے حق خود ارادیت تسلیم کیا جائے

5:- وفاق کی تشکیل ایسے اصولوں پر کی جائے جس میں مسلمانوں کے مذہبی سیاسی اور تہذیبی حقوق کا اس طرح تحفظ کیا جائے جو مسلمانوں کے لئے قابل اطمینان ہو۔ جمیعت علماء کی رائے سے یہ اطمینان ذیل کے اصول پر وفاقی حکومت کی تشکیل سے حاصل ہو سکتا ہے

1:- مرکزی ایوان میں تناسب نمائندگی یہ ہو ہندو 45 مسلمان 45 دیگر اقلیتیں 10 جمیعت علماء نے اس دفعہ کی روح کو بطور اصول پیش نظر رکھا ہے

2:- اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان مرکزی 2/3 اکثریت اپنے مذہبی سیاسی تہذیبی ثقافتی آزادی کے خلاف قرار دے تو وہ بل ایوان میں زیر بحث نہ آسکے گا

3:- ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جو مرکز اور صوبوں کے تنازعات اور صوبوں کے باہمی جھگڑوں اور ملک کے قوموں کے اختلافات کا آخری فیصلہ کرے جس میں مسلم اور غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو۔ سپریم کورٹ کے ججوں کی تقرری کا اختیار مسلم اور غیر مسلم صوبوں کی ایسی کمیٹی کو دیا جائے جسمیں مسلم اور غیر مسلم تعداد مساوی ہو

4:- اسکے علاوہ کوئی اور اصول جو مسلم اور غیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے طے کیا جائے جمیعت العلمائے ہند کے نزدیک اگر مذکورہ اصول پر وفاق تشکیل کی جائے تو وفاقی مرکز میں مسلم و غیر مسلم جماعتوں کی حفاظت کا مسئلہ فریقین کے لئے قابل اطمینان طور پر حل ہو جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد جمیعت العلمائے ہند کا جو اصول کار رہا ہے۔ اسکے پیش نظر اس نے دفعہ 4 میں مجوزہ

صورتوں کے علاوہ کسی ایسے اصول کے لئے گنجائش باقی رکھی ہے جو وفاق میں مسلمانوں کی مذہبی سیاسی ثقافتی حقوق کے تحفظ کی ضمانت ہو سکے۔

جمعت العلمائے ہند کے اجلاس سہارنپور کی تجاویز

نمبر1 ۔جمعت العلمائے ہند کا یہ اجلاس حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کی وفات حسرت آیات پر گہرے رنج غم کا اظہار کرتا ہے۔ جمیعت کا یہ اجلاس حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی وفات، خان بہادر شہید اللہ بخش سندھی صدر آل انڈیا آزاد مسلم کانفرنس کی بے وقت شہادت و حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی اہلیہ محترمہ صاحبہ کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ یہ اجلاس دیگر حریت پسند مجاہدین بشمول مولانا عبدالرحیم پوپلزی، مولانا قاری عبداللہ صاحب مراد آباد، مولانا حافظ محمد یوسف انصاری، پیر سید صدر عالم صاحب گیلانی میانوالی، حاجی عبدالجبار صاحب دہلی، مولانا عمر فاروق صاحب غازی پور، مولانا ظہور احمد صاحب بگوی، حضرت مولانا گل شیر صاحب اٹک، مولانا علی حسن قدوائی جونپوری و دیگر مرحومین کی بے وقت موت پر گہرے رنج غم کا اظہار کرتا ہے اور خداوند کریم سے دعاگو ہے کہ مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ دے آمین

نمبر2۔ یہ اجلاس یو پی کانگرس کا بعض لیڈران کے اردو کے خلاف رویے کی مذمت کرتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ کانگریس لیڈران اردو کو بھی قومی زبان سمجھتے ہوئے اسے اپنائیں گے اور یہ رویہ ترک کر دیں گے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ بلکہ وہ یہ رویہ اختیار کریں گے کہ اردو اور ہندی دونوں ہی قومی زبانیں ہیں

5- جمعتہ العلمائے ہند کا یہ اجلاس سیاسی قیدیوں تحریک آزادی کے تمام قیدیوں کی فوری رہائی کا مطالبہ کرتا ہے

9- جمعتہ العلمائے ہند کا یہ اجلاس سان فرانسکو کے ان نام نہاد ہندوستانی نمائندگان پر عدم اعتماد کا اظہار کرتا ہے جنہیں حکومت ہند نے برطانوی شہنشاہیت کے مفاد کی ترجمانی کے لئے نامزد کیا اور اقوام عالم پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ ان نام نہاد نمائندوں کا عوام میں کوئی مقام ہے

تنقید تبصرہ

1945ء کے الیکشن میں مسلم لیگ تمام ہندوستان میں بھاری اکثریت سے جیت گئی تھی۔ جمیعت العلمائے ہند کو مختلف جگہوں پر چند ایک سیٹیں ملیں تھی جن میں وہ صوبہ سرحد کی دو سیٹیں ملی تھیں۔

مسلمانان ہند نے مسلم لیگ کے تقسیم ہند کا فارمولا منظور کر لیا۔ جمیعت العلمائے ہند کا اثر افغانستان سمیت پورے ہندوستان پر تھا۔ جمیعت علمائے ہند عملی طور پر مذہبی جماعت تھی مگر سیاست میں وہ ہندوستان کی دوسری اقوام کے ساتھ مل جل کر اپنا جیو اور جینے دو کی پالیسی رکھتی تھی۔ جمیعت العلمائے ہند کا ذہنی مرکز دارالعلوم دیو بند تھا۔ اسی مدرسہ کے پڑھے ہوئے علماء حضرات جمیعت کے مبلغ بنتے تھے۔ وہ دوسری جگہوں میں جا کر مساجدوں میں امامت کراتے تھے اور اپنے حلقہ تبلیغ میں لوگوں کو آزادی کا سیاسی درس بھی دیا کرتے تھے اور ساتھ ہی وہ ہر جگہ دینی مدرسے بھی قائم کرتے اور طالب علموں میں جذبہ حریت پیدا کرتے۔ پھر اسی طرح جوت سے جوت جگتی تھی۔ مذید دینی مدارس کے طالب علم حریت پسند بنتے تھے۔ لوگوں میں درس آزادی دیتے وہ دینی معاملات میں غیر مسلموں کے ساتھ اکٹھے رہ کر زندہ رہنا' معاشرتی فریضہ سمجھتے تھے۔ گوجرانولہ میں پاکستان بن جانے سے قبل ہندو مسلم فرقہ وارانہ ہم آہنگی تو تھی ہی مگر ساتھ جمیعت العلماء کے مقامی صدر مفتی عبدالواحد صاحب تھے۔ اتفاق سے انہی ایام میں کانگرس گوجرانوالہ کے صدر بھی مفتی عبدالواحد ہی تھے۔ اکثر دیکھا گیا تھا کہ کانگریسی ورکر مفتی صاحب سے ہدایات لینے جامعہ مسجد شیرانوالہ باغ میں ہی آیا کرتے تھے۔ مسجد کے حجرہ میں ہی کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس بھی ہوا کرتے تھے۔ جن میں غیر مسلم ہندو سکھ بھی ہوا کرتے تھے۔ بعض وقت اگر حاضرین زیادہ ہو جاتے تھے تو مسجد کے اندر ہی غیر مسلم ہندو سکھوں سمیت اجلاس ہو جایا کرتے تھے۔ یعنی رواداری کا یہ عالم تھا کہ اس میں کوئی گناہ یا عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کئی دفعہ اگر کوئی مشترکہ جلوس ہوتا تو اگر کوئی شخص تکبیر کا نعرا بلند کرتا تو غیر مسلم ہندو سکھ بھی اللہ اکبر کہہ دیا کرتے تھے۔ جمیعت کے علماء یہ سمجھتے تھے کہ اس دھرتی پر صدیوں سے ہندو' سکھ 'مسلمان اکٹھے رہ رہے ہیں آگے بھی اسی طرح مل جل کر رہنا ہے تو آپس میں بگاڑ کیوں پیدا کریں۔ تحریک آزادی میں تو یہ بالکل اٹل اصول تھا کہ غیر ملکی حکمرانوں کو نکالنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کے تمام فرقوں کے لوگ مل جل کر آزادی کی جدوجہد کریں گے۔ تب ہی آزادی حاصل کر سکیں گے۔

1988ء میں راقم الحروف دہلی گیا تو وہاں بھی مجھے تقسیم ہند سے قبل کا منظر نظر آیا۔ سردار رچھپال سنگھ اکالی پارٹی' ماسٹر تارا سنگھ گروپ کے صدر ہیں اور سرکار میں انکا کافی اثر و رسوخ ہے۔ بھارت کی مشہور شخصیت بھی ہیں۔ ان سے میرا تعارف پاکستان میں جب وہ گردواروں کی یاترا پر آئے تھے ہو چکا تھا۔ میں جب سردار صاحب سے دہلی میں ملنے گیا تو شام کا ٹائم تھا۔ رمضان شریف کا مہینہ تھا۔ سردار صاحب مجھے ساتھ لے کر ایک مسجد میں چلے گئے۔ مسجد کے امام صاحب انکے دوست تھے۔ مسجد کے حجرے میں تین چار ہندو' سکھ اور بھی بیٹھے تھے۔ افطاری کا وقت تھا۔ کھانے پینے کی اشیاء برائے افطاری پڑی ہوئی تھیں۔ کھانے کی اشیاء میں گوشت نہیں تھا۔ باقی چیزیں تھیں۔ افطاری کے وقت سب نے کھایا پیا۔ مسلمان نماز پڑھنے چلے گئے اور ہندو سکھ وہیں حجرے میں بیٹھے رہے۔ اسی قسم کے حالات پاکستان کے ان علاقوں میں بھی بعض جگہوں پر تھے۔ گوجرانوالہ میں مفتی عبدالواحد صاحب کے پاس غریب کانگرس ہندو ورکر بھی آتے تھے۔ بعض وقت وہ بھی طالب علموں کے ساتھ کھانا جو بھی ہوتا

کھا لیا کرتے تھے۔ غرض یہ کہ جو ہندو مسلم دور کا تصور اس وقت ہمارے ہاں ہے وہ اس وقت بالکل نہیں تھا۔ دیگر یہ کہ جمیعت علمائے ہند انگریزوں کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے اور عالم اسلام کی آزادی کے لئے ضروری سمجھے تھے کہ انگریز سرکار سے وطن آزاد کرایا جائے۔ جمیعت میں ذہنی طور پر دو دھڑے تھے۔ ویسے تو جمیعت مذہبی جماعت ہوتے ہوئے بھی ہندوستان میں سیکولر حکومت کے حامی تھے - دونوں گروپ ایک دوسرے گروپ کا احترام بھی ملحوظ رکھتے تھے۔ مگر اختلافات بھی ان میں نمایاں تھے۔ جمیعت میں متحرک گروپ جسکی قیادت حضرت مولانا حسین احمد مدنی کرتے تھے وہ عدم تشدد متحدہ قومیت اور مخلوط الیکشن کا حامی تھا۔ جبکہ دوسرا گروپ جو کہ کمزور بھی تھا متحرک بھی نہیں تھا۔ اسکی قیادت حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کرتے تھے۔ متحدہ ہندوستان کے آخری ایام میں حضرت عثمانی جمیعت علمائے ہند سے الگ ہو گئے تھے اور انہوں نے الگ جماعت جمیعت العلمائے اسلام کے نام سے بنا لی تھی اور مسلم لیگ کے اتحادی بن گئے اور دستور ساز اسملی کے ممبر بھی بن گئے اور پاکستان بن جانے کے بعد وہ دیوبند سے ہجرت کر کے کراچی آ گئے تھے اور کراچی میں وفات پائی۔ حضرت عثمانی کی وفات کے بعد جمیعت العلمائے ہند کا جو گروہ پاکستان میں رہ گیا تھا۔ انہوں نے اپنی جماعت کو جمیعت العلمائے اسلام میں مدغم کر لیا اور اس طرح وہ جمیعت العلمائے اسلام کہلانے لگے اور جو لوگ بھارت میں جمیعت کے تھے وہ جمیعت العلمائے ہند ہی کہلاتے رہے اور اس وقت بھی جمیعت وہاں پر مضبوط جماعت ہے اور کانگرس کی حامی ہے اور کانگرس کے ساتھ تعاون سے ہی وہ وہاں کے مسلمانوں کی خدمت کر رہے ہیں۔ 1937ء کے الیکشن میں جمیعت نے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ مل کر الیکشن لڑا تھا۔ مگر یہ دونوں جماعتیں مل کر نہ چل سکیں۔ الیکشن میں کامیابی بھی ہوئی۔ مگر پھر یہ جماعتیں الگ الگ ہو گئیں۔ جمیعت علماء کی بیسوی صدی کی تنظیم میں نمایاں ذکر حضرت شیخ الہند محمود الحسن صاحب کا ہے۔ انہیں شیخ الہند کا خطاب بھی تحریک خلافت نے دیا تھا۔ بیسوی صدی میں مکمل آزادی کا نعرہ مسلمانوں میں حضرت شیخ الہند نے دیا تھا اور انہیں کی کاوش سے جمیعت آزادی پسند تحریک بن گئی
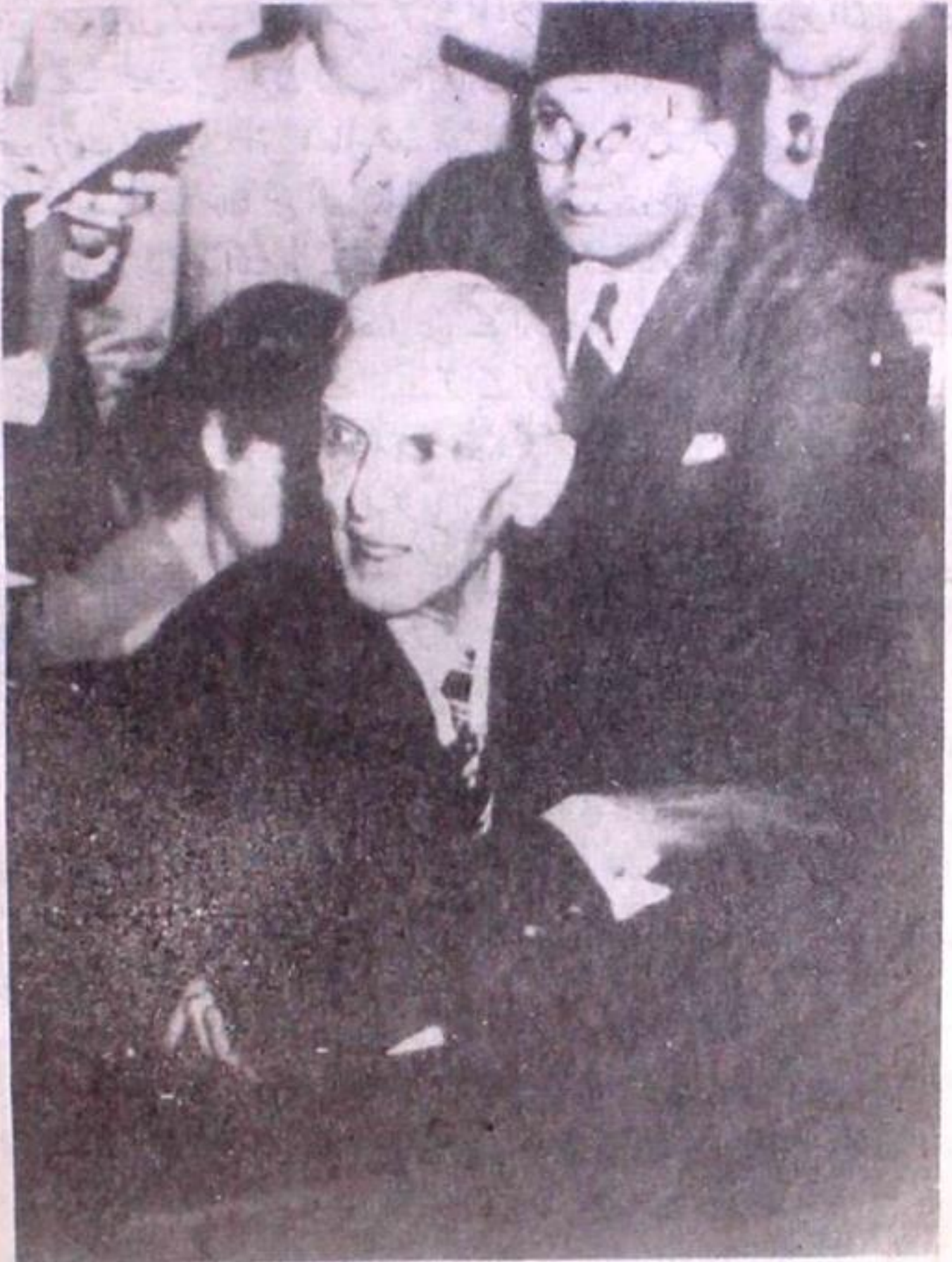
قائد اعظم محمد علی جناح

قیام مسلم لیگ

1906ء میں مسلم لیگ ڈھاکہ میں قائم ہوئی۔ مسلم کونشن بلانے والے نواب مشتاق حسین نواب آف ڈھاکہ تھے۔ کرسمس کا موقعہ تھا جب یہ اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمتہ اللہ علیہ بھی شریک ہوئے تھے۔ وہ اپنی کتاب ہماری آزادی میں لکھتے ہیں کہ مسلم لیگ کے قیام کے دو مقصد بیان کئے گئے تھے۔ مقصد نمبر1 یہ کہ ھندوستانی مسلمانوں میں برطانوی حکومت سے وفاداری کے جذبے کو تقویت پہنچانا تھا۔ دوسرا سرکاری ملازمتوں کے معاملے میں ھندوؤں اور دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے حق کو پیش کرنا اور مسلمانوں کے مفاد اور حقوق کو محفوظ کرنا تھا۔ لیگ کے لیڈر قدرتی طور پر سیاسی آزادی کے مطالبے کے خلاف تھے جو کانگرس کرتی تھی۔ مسلم لیگ کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ مسلم حقوق کی بات کی جائے اور انہیں مطالبوں کے ساتھ لوگوں کو پیچھے لگایا جائے اور اس وقت تک مسلم لیگ کی پالیسی یہی رہتی تھی۔ جب کوئی ایسی صورت حال پیدا نہ ہو جائے کہ لوگوں میں سرکار انگلشیہ کے خلاف بہت زیادہ جوش جذبہ پیدا نہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں بھی مسلم لیگ کی پوزیشن دو ٹوک نہ ہوتی بلکہ لوگوں میں دوگلے پن کے ساتھ جذبہ حریت کی باتیں کرتے مگر کسی علانیہ سرکاری مخالفت سے اجتناب کرتے۔ اگر ضرورت محسوس سمجھتے تو دربار سرکار میں اپنی وفاداری کا اظہار بھی کرتے مگر بیسوی صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرہ میں ہندوستاں کے مسلمانوں کی ایسی پوزیشن جذباتی بن گئی جو کہ مسلم لیگ کے کنٹرول سے باہر ہو گئی۔ 1914ء کی جنگ عظیم نے ہندوستان میں یہ احساس پیدا ہوا کہ مسلمانوں کا دنیا میں سب سے بڑا دشمن ہی برطانیہ ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ 1914ء کی جنگ یورپ کے دو گروہوں میں لڑی گئی تھی۔ ایک طرف فرانس' برطانیہ اور اس کے حواری تھے۔ دوسری طرف جرمنی اور ترکی تھے۔ خلافت ترکیہ مسلمانوں کے عقیدہ میں بہت ہی مقدس حکومت تھی۔ امت مسلمہ کے نزدیک سب سے مقدس مقام مکہ شریف ہے۔ دوسرے نمبر پر روضہ رسولؐ مدینہ شریف ہے۔ جبکہ تیسرے نمبر پر خلافت اسلامیہ مقدس ترین ادارہ ہے اور یورپ کی اس جنگ میں اگر برطانیہ کو شکست ہوتی ہے تو ہندوستان آزاد بھی ہوتا ہے۔ خلافت بھی قائم رہتی ہے۔ اگر برطانیہ فتح یاب ہوتا ہے تو خلافت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ خلافت اسلامیہ مکہ شریف' مدینہ شریف اور بیت المقدس پر اور تمام عالم اسلام پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔

جب 1915ء میں یورپ میں جنگ زوروں پر تھی اسی کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کے اندر بھی اضطراب زوروں پر تھا۔ انہیں ایام میں حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ خلافت اسلامی کو بچانے کی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ انہیں ایام میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمتہ اللہ علیہ تحریک آزادی ہند کے لئے افغانستان اور پھر ماسکو کا دورہ کرتے ہیں۔ انہیں ایام میں ہندوستان کی آزادی پسند جماعتیں عدم تعاون کی تحریک پیش کرتی ہیں کہ جنگ میں

حکومت برطانیہ سے کسی قسم کا تعاون نہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے کانگرس اور مسلم لیگ کا مشترکہ اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ جس کی لالہ لاجپت رائے نے صدارت کی۔ اس میں حکومت کے خلاف عدم تعاون کا ریزولیشن پیش کیا گیا۔ محمد علی جناح جو کہ اس وقت بھی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ انہوں نے حکومت کے خلاف عدم تعاون کی تحریک کی سخت مخالفت کی اور اس تحریک پر جب رائے شماری ہوئی تو صرف محمد علی جناح کا ووٹ ہی تحریک کے خلاف گیا۔ باقی تمام ہاؤس نے عدم تعاون کی قرار داد متفقہ منظور کرلی تھی۔ دراصل بات یہ تھی کہ مسلم لیگ نے ہمیشہ ہی مسلمانوں کی جذباتیت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر اس وقت مسلمان ملت اور قوم کے جذبات خلافت کے حق میں چلے گئے تھے۔ اس لئے بادنخواستہ بہت عرصے تک مسلم لیگ کو عملی سیاست سے کنارہ کش رہنا پڑا۔ اس وقت اور ہر وقت بھی مسلم لیگ کی سیاست کا محور ذاتی مفاد اور گروہی مفاد ہی رہا ہے۔ جو طریقہ کار اس وقت تھا کہ حاکم وقت کے ساتھ مل کر سیاست کرو۔ آج بھی وہی ہے۔ ایوب اگر اقتدار میں آگیا اسکے ساتھ مل جاؤ فائدے حاصل کرو۔ یحییٰ خان اگر حاکم بن گیا ہے تو مسلم لیگ اسکے حوالے کردو۔ اگر ضیاء الحق صدر بن گیا ہے تو پوری مسلم لیگ کے ساتھ اسکے معاون بن جاؤ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے اس وقت انگریز حکومت کے ساتھ تعاون کیا تھا اور سرکار کے 1914ء کی جنگ میں خلافت ترکیہ کے خلاف مدد کی تھی۔ فوجی بھرتی دی تھی۔ ان کے خاندان پاکستان میں سرخرو ہوئے۔ اس وقت راولپنڈی ضلع کے ایک مرکزی وزیر جن کے دادا 1914ء کی جنگ کے وقت فوج میں صوبے دار تھے۔ وہ اس جنگ میں مارے گئے اور ساتھ ہی ان وزیر صاحب کے دادا کے بھائی بھی صوبے دار تھے۔ وہ زندہ بچ گئے اور زمانہ امن میں انہیں خان بہادر کا خطاب بھی دیا گیا اور آج انہیں کے خاندان کی پاکستان میں حکمرانی بھی ہے۔ پاکستان کے سابق صدر ایوب خان کے والد بھی 1914ء کی جنگ میں صوبے دار تھے اور وہ پاکستان کے حاکم بھی بنے۔ پاکستان کے تقریباً 95 فی صد برسر اقتدار لوگ انہیں انگریز کے ساتھ تعاون کرنے والے لوگوں کی اولاد سے ہی ہیں اور توقع بھی یہی کی جاتی ہے کہ آنے والے وقت میں بھی یہی لوگ انہیں کے خاندان سے برسر اقتدار رہیں گے۔

1915ء سے لے کر تقریباً 1924ء تک مسلم لیگ کی تنظیم عضو معطل کی طرح ہی رہی پھر آہستہ آہستہ لوگوں میں خلافت اسلامیہ کے ختم ہونے کا رنج ختم ہونا شروع ہوگیا۔

تقسیم ہند کی تجویز

23 مارچ 1940ء کو لاہور منٹو پارک میں جہاں اس وقت مینار پاکستان بنا ہوا ہے آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک نمائندہ اجلاس ہوا۔ جس میں متفقہ طور پر تقسیم ہند کی قرار داد منظور کی گئی۔ یہ قرارداد جلسہ مسٹر محمد علی جناح نے پیش کی اور مولوی فضل الحق شیر بنگال نے اس کی تائید کی تھی۔ اس قرار داد میں کہا

گیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان ایک الگ قوم ہیں جنکی اکثریت شمال مغرب میں پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ میں ہے اور جنوب مشرق میں اسام اور بنگال میں ہے۔ ان علاقوں کے رہنے والوں کو حق خود اختیاری دیا جائے۔ اسی قرارداد میں کچھ ترمیم کے بعد مسلمانوں کو حق خود اختیاری مل گیا۔

1945ء کے انتخابات میں مسلم لیگ مسلم علاقوں میں اکثریت سے کامیاب ہو گئی۔ صوبہ سرحد میں خدائی خدمتگار اکثریت سے کامیاب ہوئے تھے جہاں ریفرنڈم کے ذریعے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کر دیا گیا۔ انہیں انتخابات کے نتیجہ میں پاکستان معرض وجود میں آیا اور 14 اگست 1947ء کو پاکستان بن گیا۔ جس کے پہلے گورنر جنرل محمد علی جناح تھے اور وزیر اعظم لیاقت علی خان۔ تقسیم ہند کا کارنامہ تاریخ ہند میں بہت بڑا کارنامہ تھا اور پاکستان روشن اور تابندہ موجود ہے۔

تحریک پاکستان

تحریک پاکستان اس قسم کی تحریک نہ تھی جس قسم کی تحریکیں کانگرس یا خلافت نے چلائی تھیں۔ گورنمنٹ کے خلاف ایجی ٹیشن کی جاتی تھی، جلسے ہوتے، جلوس نکلتے۔ 1942ء کی کانگرسی تحریک میں تو تشدد کا عنصر غالب ہوا۔ ریلوے لائینیں اکھیڑ دی گئیں۔ سرکاری عمارات جلا دی گئیں، گورنمنٹ کے ساتھ عدم تعاون کیا گیا، بدامنی پیدا کی گئی، لوگوں کو ٹیکس نہ دینے کی ترغیب دی گئی جیسے آج کے لوگوں نے 1977ء میں بھٹو کے خلاف تحریک دیکھی ہو گی یا 1968ء میں یو ڈی ایف کی تحریک ایوب کے خلاف دیکھی ہو گی۔ تحریک پاکستان اس قسم کی تحریک نہ تھی۔ خضر حیات کی پنجاب وزارت کے خلاف مسلم لیگ نے پنجاب میں تحریک چلائی تھی۔ اسکا ذکر الگ مضمون میں کریں گے وہ صرف پنجاب تک ہی محدود تھی۔ ہندوستان کے کسی اور صوبے میں نہ تھی تحریک پاکستان حقیقت میں اس وقت کے انگریز حکمران کے خلاف نہ تھی بلکہ یہ تحریک ہندوستان کی ان طاقتوں کے خلاف تھی جو ہندوستان کو متحد رکھنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کے خلاف تھی جو فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف تھے جو بے گناہ انسانی جانوں کے قتل عام کے خلاف تھے۔ مسلم لیگ کے لیڈران میں اکثریت زمینداروں، جاگیرداروں اور وڈیروں خطاب یافتہ، مراعات یافتہ امراء کی تھی جو ذاتی اثر و رسوخ کے تحت اسمبلیوں کے ممبر بن جایا کرتے اور انکی یہ چودھراہٹ مسلمہ تھی جو ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے انکے پاس تھی۔ جب مسلم لیگ جماعت بنائی گئی تھی اس وقت بھی انکے پیش نظر سرکار سے فائدے حاصل کرنا ہی تھا۔ کوئی انقلابی پروگرام نہ تھا۔ 1937ء کے انتخابات کے بعد مسلم ممبران اسمبلی جو کہ اپنے ہی اثر و رسوخ کی وجہ سے ممبران اسمبلی بنتے تھے وہ اکثریت میں اپنے صوبوں کی جو مخلوط جماعت ہوتی اسکے بھی ممبر ہوتے اور

ساتھ وہ مسلم لیگ کے حامی بھی بن جایا کرتے تھے۔ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صرف دو شخص راجہ غضنفر علی اور ملک برکت علی ممبر بنے تھے۔ باقی تمام ممبران اسمبلی ذاتی اثر کی وجہ سے یا یونینسٹ پارٹی اور مسلم سرکاری افسران کی حمایت کی وجہ سے ممبر بنے تھے۔ مگر وہ زیادہ تر ملکی سطح پر مسلم لیگ کے حامی ہوتے۔ اور صوبائی سطح پر یونینسٹ گورنمنٹ کے حامی ہوتے۔ یہ دونوں جماعتیں ذاتی فائدے حاصل کرنے کے لئے ہوئی تھیں اسی طرح سندھ بنگال کے حالات بھی تھے۔ 1937ء کے انتخابات 1935ء ایکٹ کے تحت ہوئے تھے۔ اس ایکٹ کے تحت اسمبلیاں مکمل خود مختار تھیں ان میں گورنر مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ ہندوستان کے دیگر سات صوبوں میں کانگرس کو اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ کانگرس نے صوبوں کی وزارتوں میں مراعات یافتہ' خطاب یافتہ' جاگیر دار مسلمانوں کی بجائے قوم پرست لوگوں کو اپنی وزارتوں میں شامل کیا۔ 1935ء ایکٹ نافذ ہونے سے قبل تو گورنر جسے چاہتا تھا وہی وزیر بنتا تھا۔ مگر اب وہ صورت حال نہ تھی اب جو پارٹی اکثریت سے ہوتی وہی اپنی مرضی سے وزارت بناتی یہ ایک مسلم خطاب یافتہ مراعات یافتہ طبقہ پر بہت بڑی چوٹ تھی۔ وہ اقتدار پر ایک صدی سے زائد عرصہ سے قابض جنہیں یک دم مسند اقتدار سے ہٹا دیا گیا۔ مسلم لیگ کے متحد اور فعال ہونے کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی اس لئے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان سے انگریز جاتا ہوا بھی نظر آ رہا تھا ایسی صورت میں مسلم مراعات یافتہ خطاب یافتہ طبقہ پھر وہ اکثریت مشائخ جو سیاست سے ہمیشہ ہی دور رہتے تھے اور مسلم نوکر شاہی جو اپنے مستقبل کو ان حالات میں مخدوش سمجھتی تھی انگریز سرکار کی اپنی ضرورت بھی تھی جس نے مسلم لیگ میں جان ڈال دی اور وہ بطور تحریک کچھ متحرک ہو گئی۔ پنجاب کا مسلم پریس تقریباً" اجتماعی طور پر مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کا ہمنوا تھا۔ اس وقت لاہور سے "زمیندار' احسان' انقلاب" اخبار نکلتے تھے یہ سب اخبار تحریک پاکستان کے ہمنوا تھے اور سب سے بڑھ کر کافروں کے خلاف جذبہ جہاد بھی مسلم لیگ کا مددگار تھا اور ساتھ ہی مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی بھی مسلم لیگ کی معاون تھی۔ مسلمان مجموعی طور پر تجارت میں غیر مسلموں سے بہت پیچھے تھے۔ اور انگریز دو صد سالہ اقتدار میں لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی بھی مسلم لیگ نے ورثہ میں اپنا کر مسلمان الگ قوم ہیں ہندو الگ قوم ہیں ہندو کی گڈوی ہے مسلمان کا لوٹا ہے وغیرہ وغیرہ مگر اس جنگ میں انگریز حکمران کے خلاف کوئی تحریک نہیں تھی۔ فرقہ پرست متعصب ہندو کو بھی معاف کر دیا گیا۔ گالی دی جاتی تو قوم پرست ہندو کو قوم پرست مسلمان کو یعنی جو لوگ امن اور شانتی محبت اور مل جل کر رہنا چاہتے ہیں انہیں گالی دی جاتی ہے اور جو گالی کا جواب گالی سے دینا جانتے ہیں انہیں پیار کیا جا رہا ہے۔ قوم پرست مسلمان ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں آگے تھے انکا نقطہ نظر یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک بھی انگریز کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں ان کی غلامی کی وجہ ہندوستان کی غلامی ہے۔ تمام مغرب اور عالم اسلام کی آزادی کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کو آزاد کرایا جائے۔ ہندوستان

کی آزادی تب ہی ممکن ہے جب ہندوستان کی تمام اقوام مذاہب ملکر آزادی کی جدوجہد کریں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہندو مسلم اور دیگر مذاہب کے لوگ ملکر آزادی کی جدوجہد کریں۔ ہندوستان کے آزاد ہونے سے عالم اسلام بھی آزاد ہو جائے گا۔ اس جذبے کے پیش نظر علمائے دین کانگرس سے ملکر آزادی کی جدوجہد میں شریک تھے اور قربانیاں دے رہے تھے۔

تحریک پاکستان یہ تھی کہ مجاہدین آزادی کو گالیاں دی جاویں انپر طرح طرح کے جھوٹے الزام لگائے جاویں۔ اخبارات میں انکی کردار کشی کی جائے 1942ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کانگرس کے صدر تھے انہوں نے بحیثیت صدر کانگرس مسلم لیگ پارٹی کو ایک خط لکھا مسلم لیگ کے لیڈراں نے کانگرس کے خط کا برائے راست جواب تو نہ دیا مگر مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح نے انہیں ایک اخباری بیان میں یہ کہا کہ کانگرس کا پالیسی خط لکھنے کا ابوالکلام آزاد کو کوئی حق نہیں تھا وہ تو کانگرس کا شو بوائے ہے۔ 1937ء سے مسلسل مسلم لیگی لیڈروں کا تحریک آزادی کے مجاہدین کی کردار کشی کا منظم عمل جن میں بیشتر مسلم اخبارات بھی شامل تھے مسلم لیگ کے ہر جلسہ میں مجاہدین آزادی کو گالیاں دینا۔ وہی گالیاں اخبارات بھی مشتہر کرتے رہتے تھے۔ کبھی حضرت امیر شریعت سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی کردار کشی ہو رہی ہے کبھی دیگر لیڈروں کی کردار کشی کی خبریں اخبارات کی زینت بن رہی ہیں۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو پنجاب کانگرس کے صدر تھے۔ انپر مسلم لیگیوں نے ملتان شہر میں قاتلانہ حملہ کیا وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا سکے۔ اس سارے کردار کشی کے عمل میں مسلم لیگ کے لیڈراں مسلم پریس مسلم نوکر شاہی پیش پیش تھی۔ کبھی اخبارات میں یہ خبر آ جاتی کہ فلاں مسلمان قوم پرست لیڈر نے ہندو لیڈی ورکروں سے ماتھے پر ٹکہ لگوایا ہے۔ فلاں مسلمان لیڈر نے ہندوؤں کے ساتھ کھانا کھایا فلاں لیڈر ہندوؤں سے تنخواہ لیتا ہے۔ اس قسم کی مسلسل تحریک کو ہی ہم تحریک پاکستان کہہ سکتے ہیں۔ پھر انگریز سرکار نے بھی مسلم حقوق کے لئے مسلم لیگ کو ہی نمائندہ جماعت تسلیم کیا۔ ریل گاڑی میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی صدر جمعیت العلمائے ہند سفر کر رہے تھے۔ جالندھر ریلوے سٹیشن پر گاڑی پہنچی تو مسلم لیگی نوجوانوں نے انہیں گالیاں دیں ان کے ڈبے میں داخل ہو کر انہیں بے عزت کیا انکی داڑھی میں شراب ڈالی گئی یہ خبر اخبارات کی زینت بنی۔ دیگر یہ کہ مسلمان اقتصادی اعتبار سے غیر مسلموں، ہندوؤں سے پس ماندہ تھے۔ مسلم لیگی اقتصادیات کی بات بھی کرتے تھے کہ اگر پاکستان بن گیا تو مسلمان اسودہ حال ہو جاویں گے۔ جن مجاہدین آزادی کی کردار کشی کی جا رہی تھی وہ مردانہ وار آزادی کی جدوجہد میں قربانیاں پیش کر رہے تھے۔ کسی معاوضے کے طلب گار نہ تھے۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کرائے کے مکان میں زندگی گزار کر اس دنیا سے چلے گئے وہ چاہتے تو سونے کی اینٹوں کا مکان بنا سکتے تھے۔ وہ پیر زادے تھے ان کے والد کے لاکھوں مرید تھے جس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب تذکرہ میں کیا ہے۔ انکی تصانیف دس سے زائد تھیں ان کی رائلٹی بھی خوش حال زندگی گزارنے کے لئے کافی تھی وہ عربی اور اردو کے ادیب تھے۔ مصر کے اخبار "الاحرام" میں ان کے مضامین چھپتے تھے جن کی انہیں رائلٹی ملتی تھی مگر یہ سب دولت اور احترام قربان کر کے تحریک آزادی میں شامل ہوئے۔

تا زندگی جدوجہد کرتے رہے کسی کی گالیوں کو طعن تشنیع کی پرواہ نہیں کی۔ حصول مقصد تک لڑتے رہے آخر کامیاب ہوئے وطن آزاد ہوا۔ حضرت امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ سید زادے خوش الحان خطیب ہندوستان میں انکے پائے کا کوئی مقرر نہیں اگر پیری مریدی ہی کر لیں تو لاکھوں مرید بن جاویں۔ مگر آزمائش دارورسن کی طرف راغب ہوئے پوری زندگی داؤ پر لگا دی وطن کی آزادی کو اولیت دی۔ کبھی جیل میں کبھی ریل میں۔ درہ خیبر سے لے کر راس کماڑی تک لوگوں کو خبردار کر رہا ہے۔ آزادی کے گیت سنا رہا ہے۔ وطن کی آبرو بچانے کے لئے نعرہ حق بلند کر رہا ہے۔

ہوا ہے گو تند تیز چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جسکو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

کرائے کے مکان میں زندگی گزار دی اپنا مکان نہیں بنا سکے آخر کرایہ کے مکان میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مولانا سید حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ دارلعلوم دیو بند کے صدر مدرس ہزاروں کے استاد لاکھوں کے مرشد نظام حیدر آباد دکن نے وظیفہ دے کر خریدنا چاہا ٹھکرا دیا۔ وطن کی آزادی کے لئے دارورسن کی آزمائش میں داخل ہو گئے۔ خلافت ترکیہ کو بچانے کے لئے اپنے مرشد شیخ الہند محمود الحسن رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ مکہ شریف جاتے ہیں کہ علماء پر جو اثرو رسوخ ہے وہ استعمال کر کے خلافت ترکیہ اسلامیہ کو بچایا جائے۔ انگریز کے حاشہ بردار شریف مکہ کے حکم سے گرفتار کر کے جزائر مالٹا میں اپنے مرشد کے ساتھ ہی قید کر دیے جاتے ہیں۔ پانچ سال بعد رہائی ملتی ہے۔ واپس وطن ہندوستان میں آکر آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کبھی جیل میں کبھی میدان کار زار میں زندگی کا مقصد صرف یہ کہ ہندوستان کو اور عالم اسلام کو کس طرح آزاد کرانا ہے' کیا کیا جدوجہد کرنی ہے' تمام زندگی مدرسہ کے مکان میں گزار دی۔ اپنا مکان بھی نہیں بنایا اور اسی فقیری میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

خدائی خدمت گار تحریک کے بانی خان عبدالغفار خان اتحان زئی کے رئیس اعظم ہیں۔ 1908ء میں کنگ کمشن ملا۔ اس زمانے میں بہت کم ہندوستانیوں کو کنگ کمشن ملتا تھا۔ بہت خوشی منائی گئی۔ جب فوجی ٹریننگ پر جاتے ہیں تو انگریز آفیسر کا رویہ ہندوستانی افسران کے ساتھ ہتک آمیز تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر انگریز حکمرانوں کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی کنگ کمشن کو ٹھکرا کر واپس گھر آ گئے اور آزادی کی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ خدائی خدمت گار تحریک کی بنیاد رکھی۔ جس کا مفصل ذکر پہلے ابواب میں آچکا ہے۔ ساری زندگی آزادی کی جدوجہد میں مصروف رہے۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آزادی وطن کی منظم کوششیں کیں۔ ورثہ میں ملی ہوئی جائیداد گھٹ گئی۔ اپنی جیب سے روپیہ پیسہ خرچ کر کے آزادی وطن کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان آزادی کے راہنماؤں کے ساتھ ساتھ ہزاروں لاکھوں انکے ساتھی جنکی بے مثال قربانیوں نے بدیشی حکمرانوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر

دیا مسلم لیگ کی تحریک پاکستان یہ ہے کہ آزادی وطن کے متوالوں کو گالیاں دی جاویں انہیں ہندو کا ایجنٹ کہا جاوے۔ راقم الحروف نے مسلم لیگ کے جلسوں میں تحریک پاکستان کے زمانے میں خود کئی بار سنا تھا ہر لیڈر کی تقریر کا مدعا ہی مجاہدین آزادی کو گالیاں دینا ہوتا تھا کہ 10 گالیاں تحریک آزادی کے مسلم مجاہدین کو دی جاتی تھیں۔ بڑے سے لے کر چھوٹے لیڈروں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا تھا۔ چار دفعہ کانگرس کو اور ساتھ ہی ہندوؤں کو بھی گالیاں دی جاتی تھیں۔ فرقہ وارانہ منافرت پیدا کی جاتی تھی۔ فسادات کی روک تھام کے بہانے مسلمانوں کو فسادات کے لئے تیار رہنے کی ہدایات کی جاتی تھیں۔ راقم الحروف خود بھی مسلم لیگ اور دیگر جماعتوں کے جلسوں میں شریک ہوتا رہا ہے۔ 1937ء سے لیکر 1947ء تک سیاسی عمل میں شامل رہا ہے۔ پھر ایک بار کہہ دوں کہ تحریک پاکستان ان دس سالوں کا مقصد قوم پرست مندرجہ بالا لیڈروں کی اور انکے حواریوں کی کردار کشی کرنا مسلم عوام میں فرقہ واریت کا ذہن تیار کرنا۔ تاکہ ضرورت کے وقت مسلمانوں کو غیر مسلم ہندوؤں سکھوں سے لڑایا جا سکے۔ انکی اس پالیسی کی وجہ سے بمبئی اور کلکتے میں تو 1944ء سے فسادات شروع ہو چکے تھے۔ پھر قتل عام 1947ء میں ہوا۔ مسلم لیگ کے دو ذمہ دار لیڈر سید نور احمد نے مارشل لاء سے مارشل لاء تک سرپامین میرٹھی نے بھی نامہ اعمال کتاب لکھی ہے جو اس وقت 1994ء میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں ان میں بھی قوم پرست مسلم لیڈروں کی کردار کشی کی گئی اور فرقہ وارانہ منافرت پھیلائی گئی ہے اور تحریک پاکستان میں انگریز حکومت وقت کے خلاف اور نوکر شاہی کے خلاف کوئی تحریک نہیں کی گئی۔ بلکہ دبی زبان میں حاکموں اور افسروں کی تعریف کی جاتی تھی۔ مسلم نوکر شاہی مسلم لیگ کے ساتھ تھی اور آج بھی مسلم لیگ کی پالیسی پاکستان میں مخالفین کی کردار کشی کی جاتی ہے اور نوکر شاہی سے مل کر سیاست کی جاتی ہے اور ہندو مسلم منافرت کی وجہ سے ہی 48-1947ء میں لاکھوں انسان قتل ہوئے اسی منافرت کی وجہ سے ہی کشمیر کا مسئلہ پیدا ہوا اور جنگ کشمیر ہوئی۔ اسی منافرت کی وجہ سے 1965ء میں انڈو پاک جنگ ہوئی اسی منافرت کی وجہ سے ہی 1971ء کی جنگ ہوئی اور پاکستان دو لخت ہوا اور اسی منافرت کی وجہ سے اس وقت یہ بدقسمت دھرتی 1994ء میں ایک ہولناک ایٹمی جنگ کے دھانے پر کھڑی ہے۔ تحریک پاکستان میں یہ منافرت مسلم اخبارات اشتہارات اور جلسوں کے ذریعے پھیلائی جاتی تھی اور ہم آج کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اس دھرتی کا انجام کیا ہو گا۔ اس وقت جس راہ پر چل رہے ہیں اس کا نتیجہ ایک ہولناک ایٹمی جنگ کی صورت میں بھی ظاہر ہو سکتا ہے جس سے یہ دھرتی ہی تباہ ہو جائے گی۔

قائد اعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خان
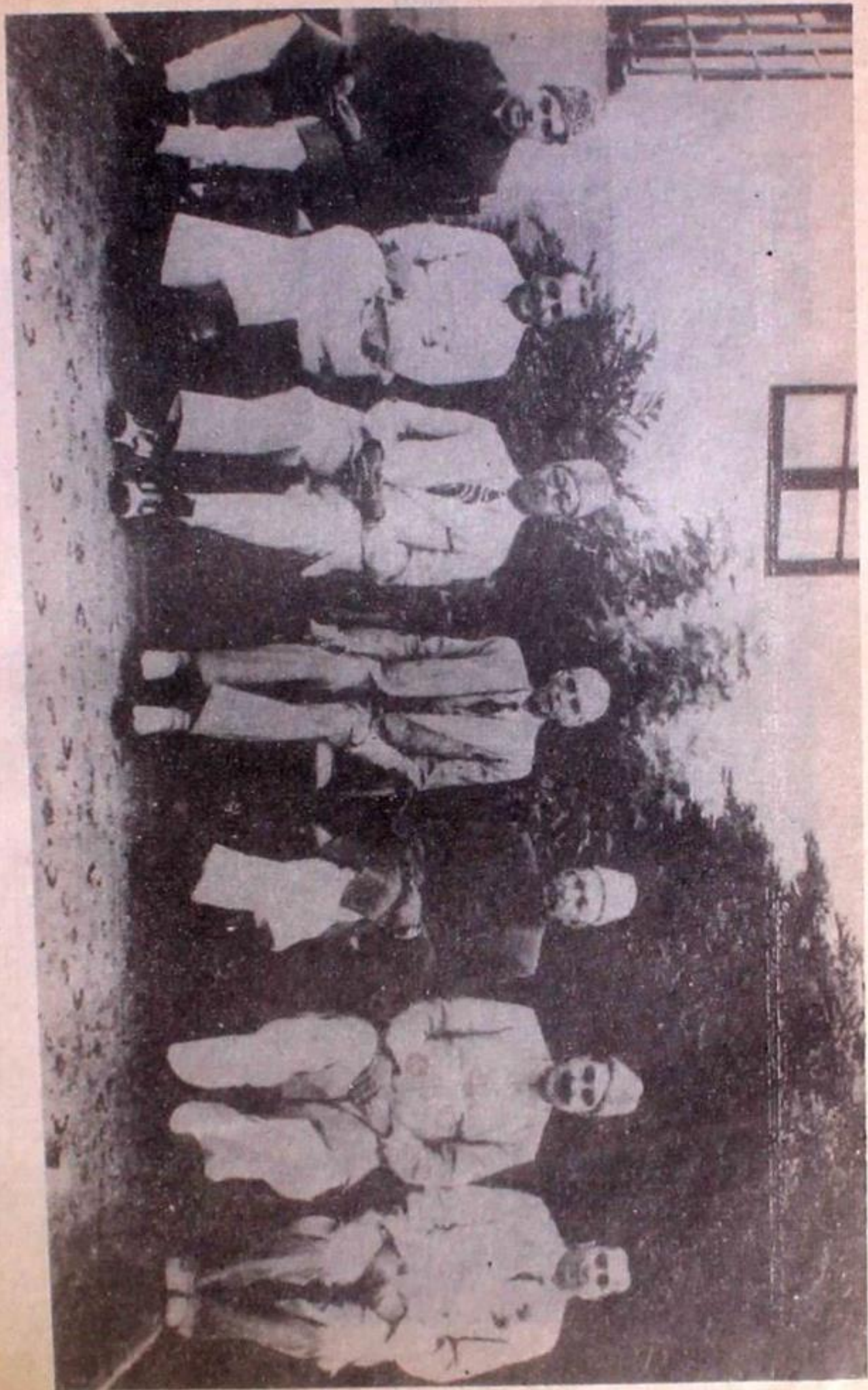
مسلم لیگ کی تحریک

1945ء کے انتخابات کے بعد مسلم لیگ کو پنجاب اسمبلی میں مسلم ممبران کی حیثیت سے اکثریت حاصل ہو گئی تھی۔ مگر مجموعی طور پر اسمبلی میں مسلم لیگ اکثریت حاصل نہ کر سکی تھی۔ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کے 80 مسلم ممبران مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔ اس وجہ سے مسلم لیگ کی حکومت نہ بن سکی۔ جبکہ کانگرس، آکالی پارٹی اور یونیسٹ پارٹی نے مل کر پنجاب کی وزارت بنائی جنکی مجموعی طور پنجاب اسمبلی میں اکثریت تھی۔ جنکے ممبروں کی تعداد 94 تھی ملک خضر حیات کی کولیشن گورنمنٹ کے خلاف فروری 1947ء میں مسلم لیگ نے تحریک سول نافرمانی چلائی جس کا مطالبہ یہ تھا کہ خضر حکومت ختم کی جائے۔ یہ تحریک تقریباً" ایک ماہ تک پنجاب میں چلتی رہی اور جلوس بازاروں میں نکلتے خضر کے خلاف نعرہ بازی کی جاتی تھی اور لوگ گرفتاریاں بھی پیش کرتے اور سرکار انہیں پکڑ کر دور دراز مقامات پر جا کر چھوڑ دیتی تھی۔ کچھ لیڈر لوگوں کو گرفتار بھی کیا گیا تھا اور انہیں اچھی کلاس میں رکھا گیا تھا۔ مسلم لیگ والے اس قسم کی کسی تحریک کے چلنے کے حق میں نہ تھے۔ مگر جب مسلم لیگ میں میاں افتخار الدین شامل ہوئے تو انھوں نے مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنانے کے لئے تحریک سول نافرمانی چلانا ضروری سمجھا اور خضر وزارت ہی انکے سامنے تھی۔ کیونکہ الیکشن کے بعد پنجاب کی حکومت بنانے کا حق مسلم لیگ اپنا سمجھتی تھی جو کہ نہ بن سکی تھی۔ دیگر یہ بھی عرض ہے کہ مسلم لیگ کی یہ تحریک انگریز سے مطالبہ پاکستان کے لئے نہ تھی بلکہ خضر وزارت کے خلاف تھی کہ خضر حیات کی وزارت ختم کی جائے اور اس تحریک میں اکثریت مسلم ملازمین تحریک کی حامی تھی۔ ہمارے ایک دوست جو اب بھی زندہ ہیں۔ وہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میرا چالان ہو گیا تھا۔ جو میں بھگتنے کے لئے تحصیل دار کے آگے پیش ہونے کے لئے گیا ہوا تھا۔ مجھے کسی نے بتایا کہ تحصیل دار مسلمان ہے۔ اسکے آگے پیش ہو کر کہو کہ میں بے گناہ ہوں اور میرا چالان غلط ہوا ہے اور اس نے یہی کچھ جا کر تحصیل دار کے سامنے کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ میں نے خضر حیات کے خلاف جلوس میں بھی جانا ہے۔ تحصیل دار نے سب کچھ معاف کر دیا اور ساتھ سول نافرمانی کے جلوس میں شامل ہونے کی مزید تلقین بھی کی۔ جو جلوس سول نافرمانی کے ہوتے تھے ان میں نعرہ ہوتا تھا مسلم لیگ زندہ باد' پاکستان زندہ باد۔ لے کر رہیں گے پاکستان۔ دینا پڑے گا پاکستان۔ خضر کتا ہائے ہائے۔

ایک مہینہ تحریک چلنے کے بعد 3 مارچ 1947ء کو خضر وزارت مستعفی ہو گئی۔ خضر وزارت کا ختم ہونا تھا کہ پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ راولپنڈی ڈویژن میں سب سے پہلے فسادات

ہوئے۔ تھانہ جوترہ ضلع راولپنڈی کے علاقہ میں تین چار گاؤں میں تقریبا ایک ہزار ہندو سکھ مارے گئے اور پھر فساد بڑھنا شروع ہو گئے۔ مسلم لیگ کی تحریک میں اور فسادات میں حکومت پوری طرح فسادیوں کے ساتھ معاون تھی۔ ہمارے گوجرانوالہ میں مسلم لیگ کے ایک بہت پرانے ورکر جنکی اس وقت 1993ء میں بھی عمر 93 سال کم از کم ہو گی۔ مسلم لیگ کے لئے انکی خدمات کی بہت تعریف بھی کی جاتی ہے۔ انکا اسم گرامی خلیفہ امام دین ہے۔ انہیں سابقہ وزیر اعظم سہروردی نے بھی نوازا تھا۔ وہ انکی بہت تعریف کیا کرتے تھے اور جنرل ضیاء الحق نے بھی اپنے وقت میں انہیں نوازا تھا اور انکی بہت تعریف کی یہ صاحب جالندھر کے رہنے والے تھے اور وہاں بلدیہ کے سکول میں مدرس تھے۔ اب قارئین ہی بتائیں کہ کوئی بھی سرکاری ملازم سرکار کی منشاء کے خلاف کوئی کام کر سکتا ہے اور یہ صاحب گوجرانوالہ میں بھی آ کر بلدیہ کے سکول میں مدرس رہے اور 1960ء کو ریٹائر ہوئے تھے۔

کوئی بھی سرکاری ملازم سرکار کی منشاء کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اسے نوکری سے ہٹا دیا جاتا ہے اور مقدمہ الگ بن جاتا ہے۔ حضرت امیر شریعت سید عطاءاللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے خلاف سرکاری مقدمہ تھا۔ پولیس کا حوالدار لدھا رام جس نے شاہ صاحب کی تقریر کی رپورٹ کی تھی۔ اس نے سرکار کی منشاء کے خلاف عدالت میں گواہی دی تھی۔ اسے نوکری سے بھی نکال دیا گیا تھا اور اس پر منحرف ہو جانے کا مقدمہ بن گیا تھا۔ جس میں وہ 3 ماہ قید بھی ہوا تھا۔ مسلم لیگ کے جتنے بھی لیڈر تھے وہ منشاء سرکار کے عین مطابق ہی کام کرتے تھے۔ سر شاہنواز، سر فضل حسین، سر فروز خان نون، سر ظفراللہ، سر محمد شفیع، سر عبدالقادر، سر محمد نواز خان آف کوٹ، سر صاحب زادہ عبدالقیوم، سر ڈاکٹر محمد اقبال، خان بہادر محمد ایوب کھوڑا، خان بہادر چوہدری محمد حیات خان اور دیگر بے شمار سر اور خان بہادر اور خان صاحب جو مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ تھے۔ انہیں یہ خطاب ایسے ہی نہیں مل گئے تھے۔ بلکہ انکی کئی نسلوں کی جدوجہد تھی۔ کئی نسلوں سے یہ لوگ سرکار انگلشیہ کے خدمت گزار تھے۔ تب ہی یہ خطاب ان لوگوں کو ملے تھے۔ اور جو کچھ بھی مسلم لیگ کرا رہی تھی وہ منشائے حکومت برطانیہ و ہند کے عین مطابق تھا۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا پھر ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ پنجاب اسمبلی میں کل سیٹیں 180 ایک سو اسی تھیں۔ 81 مسلم لیگ کی تھیں۔ بقایا کولیشن گورنمنٹ کی تھیں۔ اگر وزارت خضر حیات کی ختم بھی ہو جاتی ہے تب بھی مسلم لیگ تو حکومت بنا نہیں سکتی تھی۔ پھر تحریک چلانے کا کیا مقصد اور مقصد یہاں آ کر عیاں ہو جاتا ہے کہ خضر حیات کولیشن حکومت کے ہوتے ہوئے پنجاب میں فرقہ وارانہ فساد کھل کر نہیں کرائے جا سکتے۔ اس لئے خضر کولیشن کے خلاف تحریک چلائی گئی۔ جب خضر کولیشن حکومت ختم ہوئی تو ساتھ ہی پنجاب میں فرقہ وارانہ فساد شروع کرا دیے گئے اور سب سے پہلے مسلم اکثریت والے علاقے راولپنڈی ڈویژن میں فساد ہوا۔ ان جگہوں پر ہزاروں غیر مسلم ہندو سکھ قتل ہوئے۔ لوٹ لئے گئے۔ ان علاقوں سے جو لوگ بچ کر مشرقی پنجاب پہنچے۔ انہوں نے وہاں جا کر فرقہ واریت کی آگ لگا دی اور وہاں مسلمانوں کو قتل کیا جانے لگا۔ لوٹا جانے لگا جو عمل راولپنڈی ڈویژن

میں مسلمانوں نے کیا وہی عمل مشرقی پنجاب میں غیر مسلموں نے کیا۔ مارچ 1947ء کے فسادات کے بعد ماحول میں کھچاؤ تو اسی طرح رہا مگر قتل اور لوٹ مار کی وارداتیں اکا دکا تھیں۔ مگر جب 14 اگست 1947ء کو تقسیم ہند اور ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہوا تو پھر منظم طریقہ پر قتل عام شروع ہو گیا۔ مسلم پنجاب میں پولیس کی نگرانی میں ہندو سکھوں کو قتل کیا جاتا تھا۔ اسی طرح غیر مسلم پنجاب میں مسلمانوں کو قتل کیا جانے لگا۔ اس ساری کاروائی اور قتل عام کا مقصد یہ تھا کہ عوام کے دلوں میں نفرت پیدا کی جائے۔ جو عوام صدیوں سے ایک جگہ بھائیوں کی طرح رہ رہے تھے وہ ایک دوسرے کے ویری بن جاویں تاکہ تقسیم ہند کا فارمولا کامیاب ہو جائے اس دھرتی پر لاکھوں لوگوں کا یہ قتل عام صرف اس موقع کے لئے کرایا گیا تھا تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ تقسیم ہند غلط ہوئی ہے۔

اور ساتھ ہی درمیان میں کشمیر کا مسئلہ اس انداز سے پیدا کر دیا گیا کہ ہندوستان کے دونوں ملک ہر وقت بندوقیں تانے ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے رہیں اور کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ کبھی اس دھرتی پر بھی امن ہو گا اور اس کاروائی کے پس پردہ یورپ اور امریکہ کا سیاسی خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہے۔ برطانیہ اور امریکہ دوسری عالمی جنگ میں اتحادی بھی تھے۔ بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے اور ہندوستان میں جاری آزادی کی تحریکات کی وجہ سے برطانیہ مجبور ہو چکا تھا کہ وہ ہندوستان کو آزاد کر دے۔ مگر مستقبل کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے برطانیہ اور امریکہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کو متحدہ رکھتے ہوئے آزاد کر دیا جائے۔ مسلم لیگی لیڈران کی سابقہ ہسٹری عیاں تھی کہ اس کے لیڈر لوگ ہر وقت ہی سرکار برطانیہ کے وفادار رہے ہیں۔ اور سرکار برطانیہ کے خطاب یافتہ لوگوں پر ہی مسلم لیگ کی لیڈر شپ مشتمل تھی۔ مسلم لیگ کی مسلمانوں میں کامیابی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مسلمان مجموعی طور پر ہندوستان میں غیر مسلم ہم وطنوں سے پسماندہ تھے۔ انھیں اپنا بہتر مستقبل تقسیم ہند میں نظر آتا تھا۔ مسلم واعظین اپنے وعظ میں سابقہ مسلم حکومتوں کے قصیدے پڑھا کرتے تھے اور کچھ اس انداز سے سابقہ مسلم حکومتوں کی تعریفات کی جاتی تھیں کہ عامتہ المسلمین عش عش کر اٹھتے تھے۔ اس چیز کا فائدہ مسلم لیگ والوں نے اٹھایا کہ ہندوستان تقسیم ہو گا تب ہی اسلامی حکومت بنے گی۔ اس لئے مسلمانوں نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ دیگر یہ کہ برطانیہ اور امریکہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہندوستان کو متحد رہنے دیا گیا تو آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرے نمبر کا ملک ہے۔ اور مستقبل قریب میں ہندوستان دنیا کی سپر طاقت بن سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اقوام یورپ برطانیہ اور امریکہ کا ایشیا پر ہولڈ ختم ہو جائے گا ان کی تجارت پر منفی اثرات پڑیں گے۔ چین، روس اور ہندوستان کا متحدہ بلاک دنیا میں طاقت کا توازن اپنے ہاتھ میں کر سکتا ہے۔ دیگر یہ کہ ہندوستان تقسیم ہونے کی صورت میں ایسے مسائل پیدا کر دیے گئے کہ یہ ہمیشہ ہی آپس میں لڑتے رہیں اور یورپ اور امریکہ کی چودھراہٹ ان پر قائم رہے گی۔ اقوام یورپ اور امریکہ کا دنیا میں سب سے بڑا دشمن کمیونسٹ بلاک تھا اور ہے۔ اس کے خلاف پاکستان کو استعمال کیا گیا اور ہر پاکستانی حکومت نے امریکہ کی ہر پالیسی کی حمایت کی اور ہر حکم کی تعمیل اپنا وظیفہ بنایا ہوا ہے۔ یہی منشاء امریکہ اور برطانیہ کی پاکستان بنانے کے بارے تھی۔
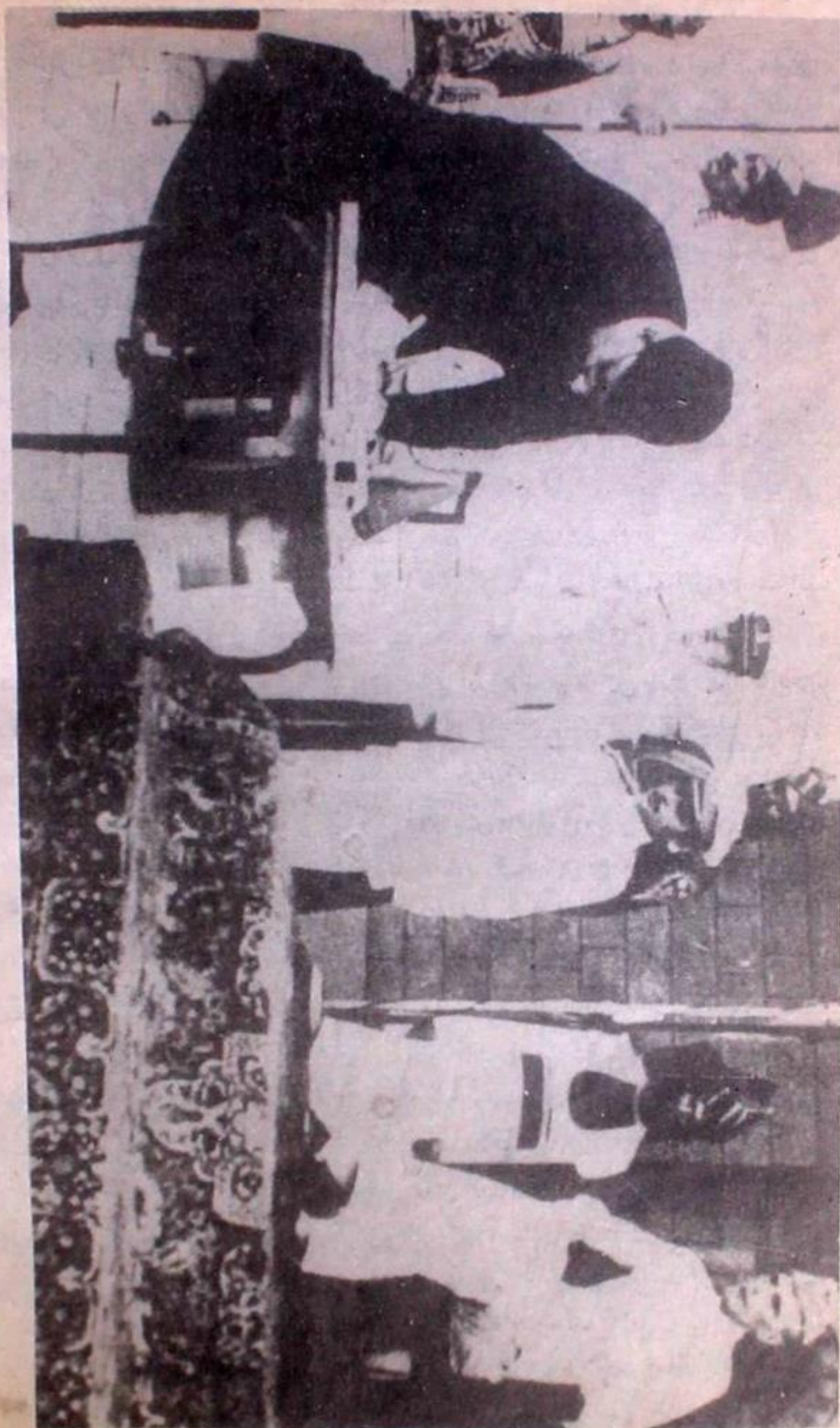
مجلس احرار

نہرو رپورٹ

1929ء لاہور میں دریائے راوی کے کنارے آل انڈیا کانگرس کا بشمول (تحریک خلافت، خدائی خدمت گار تحریک اور دیگر تحریک آزادی کے ساتھ وابستہ لوگوں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ جس میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا ریزولیشن منظور کیا گیا۔ اسی اجلاس میں ساتھ ہی نہرو رپورٹ بھی دریا برد کی گئی۔ نہرو رپورٹ جس کا گزشتہ ابواب میں ذکر آ چکا ہے۔ جس میں مخلوط طریقہ انتخابات مان لینے کی صورت میں مسلمانوں کو کئی تحفظات دیے گئے تھے۔ جس میں نمبر1 سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے مسلمانوں کا الگ صوبہ بنانا تھا۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کو آئینی مراعات دے کر دوسرے صوبوں کے برابر لانا تھا۔ بنگال اور پنجاب جو کہ مسلم اکثریت کے صوبے تھے ان میں کچھ مراعات غیر مسلموں کو دینا تھیں۔ وہی مراعات غیر مسلم صوبوں میں مسلمانوں کو دی جانی تھیں۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں 33 فیصد مسلمانوں کی نمائندگی تسلیم کر لی گئی تھی۔ یہی موٹی موٹی چند ایک باتوں کے علاوہ کچھ چھوٹے نکات بھی تھے جنکا اس موقع پر ذکر کرنا ضروری نہیں۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے مطالبات بھی اسی حد تک کئے تھے۔ مگر پنجاب کا وہ مسلم امراء کا طبقہ جو جذباتی نعرے اور فرقہ واریت کو ہوا دیے بغیر الیکشن جیت نہیں سکتا تھا جنکی قیادت سر فضل حسین، سر محمد شفیع اور علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کر رہے تھے وہ مخلوط طریقہ انتخابات کسی صورت بھی ماننے کو تیار نہ تھے۔ یہ لوگ سرکار پرست تھے۔ انگریز سرکار بھی فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہوا دے کر ہی اپنی حکومت کو مستحکم رکھ سکتے تھے۔ ان لوگوں کی آواز کو کافی اہمیت دی گئی اور مسلم لیگ کے اس گروپ نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں جلسے بھی کئے اور مسلم عوام کو مخلوط طریقہ انتخاب کے خلاف آواز بلند کرنے کو کہا گیا۔ بلاخر نہرو رپورٹ کو مسلمانوں نے مخلوط طریقہ انتخاب کی وجہ سے رد کر دیا۔ مگر نہرو رپورٹ کا جو اصل نقصان تھا وہ سکھوں کو تھا کیونکہ سکھ زیادہ تعداد میں صرف پنجاب میں رہتے تھے اور وہ بیس فی صد سے زائد نہ تھے۔ انکا نہرو رپورٹ میں تذکرہ ہی نہیں تھا اگر سکھوں کو پنجاب میں زائد نمائندگی دی جاتی ہے تو وہ کس فرقہ کی نمائندگی سے کاٹ کر دی جاتی۔ اگر مسلمانوں کی نمائندگی کم کر کے دی جاتی ہے تو سکھ تو صرف پنجاب میں ہیں وہ کسی دوسرے صوبے میں اکثریت نہیں رکھتے وہ مسلمانوں کو کیا دیں گے۔ دیگر یہ کہ مسلمانوں کی پنجاب میں اکثریت اتنی کم تھی کہ اگر وہ سکھ اور ہندو اقلیت کو زیادہ نمائندگی دیتے ہیں تو انکی جو برائے نام اکثریت ہے وہ بھی ختم ہو جاتی۔ اس لیے سکھوں کو پنجاب میں کچھ دے نہیں سکتے تھے۔ نہرو رپورٹ میں سکھوں کے حقوق کا تذکرہ نہیں کیا گیا تھا اور سکھوں نے بھی سوچ سمجھ کر نہرو رپورٹ کے خلاف احتجاج کیا تھا کہ اگر پنجاب اسمبلی میں 54 فی صد مسلمان ممبران کی تعداد مقرر کی گئی تھی تو وہ ہر صورت اسمبلی میں 54 فی صد مسلمان ممبران پہنچ جائیں گے۔ مگر نہرو رپورٹ اتنی متنازعہ بن گئی تھی کہ

اس کا ختم ہو جانا ہی ضروری بن گیا تھا۔ 1929ء کے دریائے راوی کے کنارے اس اجلاس میں کانگرس اور خلافت کے مشترکہ اجلاس میں ریزولیشن پاس کیا وہاں نہرو رپورٹ کو متنازعہ سمجھ کر ختم کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا گیا۔ فیصلہ ہو گیا کہ نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں پھینک کر دریا برد کر دیا جائے۔ پھر بہت سارے ہندو سکھ اور مسلمان لیڈران نہرو رپورٹ کی کاپیاں ہاتھ میں لیے دریائے راوی میں پھینک رہے ہیں۔ ہندو نہرو رپورٹ ختم ہونے پر اس لیے خوش تھے کہ مسلمانوں کو اسمبلیوں میں نمائندگی کچھ زیادہ دے دی گئی تھی چلو اچھا ہوا مسلمان نہیں مانے۔ مسلمان اس لیے خوش تھے کہ نہرو رپورٹ ہمیں پہلے ہندوستانی بنا دیتی تھی حالانکہ ہم پہلے مسلمان ہیں۔ سکھ اس لیے خوش تھے کہ نہرو رپورٹ میں ہمیں کچھ نہیں ملنا تھا چلو اچھا ہوا نہرو رپورٹ دریا برد ہو گئی ہے۔ اس ساری صورت حال کے باوجود مسلمانوں میں مسلم لیگ میں محمد علی جناح کا گروپ جمیعت علمائے ہند کا بہت بڑا گروپ صوبہ سرحد کے خدائی خدمت گار ہندو مجارٹی کے صوبوں کے مسلمان بھی اکثریت سے مخلوط انتخابات کے حامی تھے۔ مگر آخر کار نہرو رپورٹ دریا برد ہو گئی۔

احرار کنونشن

تحریک خلافت تقریباً ختم ہو چکی تھی اس لیے کہ ترکی کی حکومت جس کی قیادت غازی مصطفیٰ کمال پاشا کر رہے تھے اس حکومت نے ہی ترکی میں خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ ترکی حکومت نے جدید پارلیمانی جمہوریت کو اپنا لیا۔ قدیم خلافت کو ختم کر دیا۔ اس لیے ہندوستان میں تحریک خلافت بے مقصد بن گئی اور جماعت خلافت کی ضرورت بھی باقی نہ رہی۔ اس لیے اسی اجلاس میں تحریک خلافت کے ساتھ وابستہ پنجاب کے لیڈران اور ورکران نے اسی شہر لاہور میں راوی کے کنارے کنونشن کیا جس میں دیگر لوگوں کے علاوہ مندرجہ ذیل لیڈر حضرات بھی شامل تھے۔ جنکے نام یہ ہیں۔

حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، حضرت مولانا داؤد غزنوی، مولانا مظہر علی اظہر، چوہدری افضل حق، خواجہ عبدالرحمٰن غازی، شیخ حسام الدین

اور دیگر سینکڑوں لوگ شامل ہوئے۔ جس میں مجلس احرار اسلام کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کنونشن میں 90 فی صد پنجاب کے مسلمان سیاسی ورکر شامل ہوئے۔ جماعت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں کانگرس کی معاون رہے گی مگر حقوق مسلم اور مسائل کے لیے علیحدہ جدوجہد کرے گی۔ جماعت احرار کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں مندرجہ بالا اکابر شامل تھے اور پہلے صدر حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور جنرل سیکرٹری مولانا مظہر علی اظہر بنے اور ایک رضاکار تنظیم بھی قائم کی گئی۔ یہ تمام کاروائی کانگرس کے اجلاس میں ہی ایک مخصوص جگہ راوی کے کنارے 1929ء میں عمل میں آئی اور یہ کنونشن چوہدری افضل حق صاحب کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ مجلس احرار نے بھی کانگرس کے مکمل آزادی کے ریزولیشن کی تائید میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس

کیا اور کانگرس نمک ستہ گرہ میں بھی مجلس احرار نے کانگرس کی معاونت کی۔ دیگر یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ مجلس احرار کا ممبر کانگرس کا ممبر بھی بن سکتا ہے۔

شدھی کی تحریک

ضلع آگرہ کے علاقہ میں چند دیہات تھے جنکی آبادی راجپوتوں پر مشتمل تھی۔ یہ راجپوت مسلمان تھے مگر رسم و رواج سارے ہندوانہ رکھتے تھے۔ ہندو مہاسبھا کے ایک لیڈر نے ان دیہات پر توجہ دی کہ کیوں نہ ان لوگوں کو مکمل ہندو بنا لیا جائے۔ مہاسبھائی ہندوؤں نے ان دیہاتوں میں چکر لگانے شروع کر دیے اور انہیں مکمل ہندو ہو جانے کی تبلیغ شروع کر دی گئی اور یہ چیز جب اخبارات میں آئی تو مسلمان بھی اس طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے بھی اپنے تبلیغی مشن بھیجنے شروع کر دیے۔ اخبارات میں بھی خوب چرچے ہونے لگے اور اس مقصد کے لیے چندے جمع ہونے شروع ہو گئے اور ایک مقابلہ شروع ہو گیا۔ اس سلسلے میں سید نور احمد کی کتاب مارشل لاء سے مارشل لاء تک میں راجہ غضنفر علی خان کے حوالے سے ایک مضمون شائع ہوا جس میں حقیقت حال پر کافی روشنی پڑھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے مسلم لیگ اور مسلم راجپوت تنظیموں نے چندہ جمع کیا تھا میں یہ چندہ بھیجنے سے قبل صورت حال معلوم کرنے کے لیے آگرہ کے ان راجپوت دیہاتوں میں جانے کا فیصلہ کیا۔ دو ساتھیوں سمیت آگرہ گیا۔ وہاں سے پتہ معلوم کر کے متنازعہ راجپوت علاقے میں چلا گیا۔ چند روز وہاں رہ کر حالات معلوم کئے۔ راجہ صاحب خود بھی راجپوت گھرانے سے تھے۔ اس لیے انہوں نے برادری کے حوالے سے تحقیق شروع کر دی تو پتہ چلا کہ یہ دیہاتی راجپوت لوگ بڑے ہوشیار اور چالاک ہیں اور اپنے مطلب کے پکے ہیں۔ جب ہندو انکے پاس انہیں مکمل ہندو بنانے کے لیے جاتے ہیں تو وہ انہیں کہتے ہیں کہ ہم مسلم نوابوں کے مقروض ہیں زیر بار ہیں۔ جب تک انکے قرض سے نہیں نکل جاتے اس وقت تک ہم مکمل ہندو نہیں بن سکتے۔ اس طرح وہ ہندوؤں سے مال کھاتے اگر مسلمان انکے پاس جاتے اور انہیں مکمل اسلامی تعلیمات کا درس دیتے اور کہتے کہ ہندوانہ رسمیں اور ہندوانہ بو و باش چھوڑ دیں اور مکمل مسلمان ہو جاویں تو وہ عذر پیش کرتے کہ وہ ہند بنیوں کے مقروض ہیں زیر بار ہیں۔ جب تک ہندو بنیوں کے قرض سے نہیں نکل جاتے اس وقت تک یہ کیسے ممکن ہے کہ مکمل مسلمان ہو جاویں۔ ہماری امداد کریں تاکہ ہم ہندو بنیوں کے قرض سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ اب ہندو مہاسبھا والے بھی ہندوؤں سے چندہ جمع کر کے دے رہے ہیں تاکہ انہیں مسلم نوابوں سے آزاد کرا سکیں۔ مسلم تنظیمیں بھی چندہ جمع کر رہی ہیں کہ مسلم راجپوتوں کو ہندو بنیوں سے آزادی دلائی جائے۔ اس تمام صورت حال سے اسلامیان ہند کو بذریعہ اخبارات آگاہ کیا گیا اور جو چندہ راجہ غضنفر علی خان صاحب کی زیر قیادت مسلم لیگ اور مسلم راجپوتوں نے جمع کیا ہوا تھا وہ جمیعت علماء ہند کو بھیج دیا گیا۔ اس طرح راجہ غضنفر علی صاحب کی تھوڑی سی کوشش سے یہ جذباتی مسئلہ اپنے انجام کو پہنچ گیا اور

شدھی کی اس تحریک میں مجلس احرار نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور اسلامیان ہند کے جذبات کی پوری تائید کی تھی

شاردھا ایکٹ

مجلس احرار اور جمیعت علمائے ہند نے شاردھا ایکٹ کی بھرپور مخالفت کی اور اسے مداخلت فی الدین کہا گیا۔ شاردھا ایکٹ میں ہندوستان کے لوگوں کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ 16 سال سے کم عمر لڑکی اور 21 سال سے کم عمر لڑکے کی شادی نہ کریں۔ یہی قانون اس وقت پاکستان میں بھی رائج ہے۔ مگر اس وقت متحدہ ہندوستان کے وقت اس قانون کو مداخلت فی الدین قرار دے کر باقاعدہ تحریک چلائی گئی تھی۔ جس میں جمیعت علمائے ہند پیش پیش تھی۔ اسی زمانے 1931ء میں جمیعت علمائے ہند کے کراچی اجلاس میں حضرت مولانا ابو الکلام آزاد رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ علماء حضرات جو شاردھا ایکٹ کی مخالفت کرتے ہیں اور اپنی ساری طاقت اس پر صرف کرتے رہے ہیں انہیں میری عرض ہے کہ اسلام میں بھی کم عمری یعنی بچوں کی شادی کو قابل تعریف عمل نہیں قرار دیا اس لیے شاردھا ایکٹ کی مخالفت میں اپنی تمام طاقت ختم کرنا کوئی اچھا عمل نہیں۔ مگر مجلس احرار اور جمیعت علماء ہند نے شاردھا ایکٹ کی پوری شدت سے مخالفت کی۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری بشمول مجلس احرار نے پورے پنجاب میں اس وقت بطور تحریک ہزاروں بچوں کی شادیاں کرا دیں۔ ادھر یو پی جمیعت علمائے ہند نے حضرت مولانا احمد سعید صاحب کی زیر قیادت شاردھا ایکٹ کی سخت مخالفت کرتے ہوئے ہزاروں بچوں کی شادیاں کرا دی۔ شاردھا ایکٹ میں بنیادی جو بات سمجھ میں آئی وہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ ایکٹ کسی غیر مسلم نے بنایا تھا۔ پارلیمنٹ میں پیش کیا تھا اور منظور ہو گیا تھا۔ اگر یہی ایکٹ شاید کوئی مسلمان منظور کراتا۔ پارلیمنٹ میں پیش کرتا تو شاید یہ تحریک نہ چلتی۔ آج پاکستان میں یہ ہی قانون رائج ہے بلکہ کثرت آبادی کی وجہ سے اب تو یہ سوچا جا رہا ہے کہ جس عمر میں اس وقت شادیاں ہو رہی ہیں اس سے بھی وقت زیادہ کیا جائے تاکہ آبادی کے مسئلہ پر موثر کنٹرول کیا جا سکے۔

امیر شریعت کا اعزاز

تحریک خلافت اور کانگرس نے ترک موالات کی تحریکیں چلائی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ انگریز کے دیئے ہوئے خطاب واپس کیے جاویں اس سلسلہ میں حکیم اجمل خان صاحب نے انگریز کا دیا ہوا شفاء الملک کا خطاب واپس کیا تھا اور قوم نے انہیں مسیح الملک کا خطاب دیا تھا اسی طرح حضرت مولانا محمود الحسن حاصب کو قوم نے شیخ الہند کا خطاب دیا تھا۔ اسی طرح 1930ء کے آخری ایام میں حضرت مولانا احمد علی لاہور کی جامع مسجد شیرانوالہ لاہور میں 500 پانچ سو علماء حضرات کے اجتماع جسکی

صدارت حضرت علامہ انور شاہ کشمیری فرما رہے تھے اس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کو امیر شریعت کا خطاب دیا گیا اور پہلے نمبر پر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری نے بیت کی دوسرے نمبر پر حضرت مولانا عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ نے بیت کی۔ پھر تمام حاضرین علمائے دین جنکی تعداد 500 پانچ سو سے زائد تھی ۔ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ہاتھ پر بیت کی۔ اسی طرح یہ تقریب سعید انجام کو پہنچی۔ امیر شریعت نے انہیں ایام میں سرکار کے خلاف کئی خطاب کئے اور قید بھی ہوئے اور قاتلانہ حملے بھی ان پر ہوئے

مکلیگن کالج کی تحریک

1931ء ماہ اکتوبر کا ذکر ہے کہ لاہور مکلیگن کالج کے انگریز پرنسپل نے دوران لیکچر کچھ باتیں ایسی بھی کیں جن سے حضور علیہ السلام کی توہین کا پہلو نکلتا تھا۔ مسلم طالب علموں کا ایک گروہ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جس میں کالج پرنسپل کے رویئے کے بارے حضورؐ کی توہین کے بارے عرض کیا تو حضرت علامہ نے ان طالب علموں کو احرار راہنماؤں سے ملنے کا مشورہ دیا۔ طالب علموں کا وہ گروہ احرار راہنماؤں سے ملنے مجلس احرار کے دفتر میں چلا گیا۔ دفتر میں حضرت امیر شریعت سمیت دیگر حضرات بھی موجود تھے۔ طالب علموں کے گروہ نے مدعا بیان کیا۔ غور فکر کے بعد جلسے کا اعلان کر دیا گیا۔ جلسے میں حضرت امیر شریعت نے مکلیگن کالج پر پکٹنگ لگانے کا اعلان کیا۔ رضاکاروں نے کالج کے دروازے پر پکٹنگ شروع کر دی۔ پولیس آ گئی رضاکاروں پر لاٹھی چارج ہوا۔ کئی رضاکار زخمی ہوئے۔ رضاکاروں میں جانباز مرزا جو احرار کے دوسرے درجے کے لیڈران میں بھی شمار ہوتے تھے وہ اسی ایجی ٹیشن میں زخمی ہوئے۔ انہوں نے اس وقت کی پولیس لاٹھی چارج سے زخمی ہونے والا بازو بھی مجھے دکھایا تھا۔ پولیس کی لاٹھی سے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی وہ ٹھیک طرح پر جڑی نہ تھی اس لیے وہ اس وقت بھی الگ ابھری ہوئی نظر آئی تھی۔ تین روز تک کالج پر پکٹنگ احرار ورکروں کی جاری رہی۔ آخر مکلیگن کالج کے انگریز پرنسپل نے مسلمان طالب علموں سے اور جمیعت احرار سے معافی مانگی اور آئندہ بھی محتاط رہنے کا وعدہ کیا اور تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔

مجلس احرار کا مرکزی اجلاس

جولائی 1931ء کو مجلس احرار کا مرکزی اجلاس زیر صدارت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی منعقد ہوا۔ اجلاس میں جماعت کی جدید تنظیم کی گئی۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو صدر مقرر کیا گیا اور جنرل سیکرٹری مولانا داؤد غزنوی بنائے گئے۔ اجلاس میں ایک ریزولیشن پاس کیا گیا جس میں مسلمانان ہند کے لیے جداگانہ طریقہ انتخاب منظور کیا گیا۔ جماعت کی وسعت کو پھیلایا گیا تمام

پنجاب میں تبلیغی دورا کیا۔ عوام مجلس احرار میں شامل ہوئے۔ انہیں ایام میں لندن میں گول میز کانفرنس کے لیے گاندھی جی نے بمبئی روانہ ہونا تھا حضرت امیر شریعت اور مولانا حبیب الرحمٰن انہیں ملنے کے لیے بمبئی چلے گئے۔ گاندھی جی سے ملاقات میں انہیں مشورہ دیا کہ آپ لندن نہ جاویں۔ انگریز آپکو پلیٹ میں رکھ کر آزادی نہیں دے گا بلکہ طاقت کے ساتھ انگریز سے آزادی چھیننی ہو گی۔ گاندھی جی نے احرار راہنماؤں کے مشورے کو بڑے غور سے سنا مگر لندن جانے کا پروگرام ملتوی نہیں کیا۔

تحریک کشمیر

تحریک کشمیر کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ پنجاب اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں یعنی انگریز کی عملداری میں حکومت کے خلاف تحریک 1916ء میں چل رہی تھی۔ ان تحریکات کا زیادہ زور پنجاب میں تھا اسکے اثرات کشمیر پر بھی ہوئے۔ پہلی دفعہ کشمیر میں ایک سیاسی جماعت شیخ عبداللہ کی زیر قیادت مسلم کانفرنس قائم ہوئی جس میں حکومت کشمیر کو ذرا جھنجوڑا۔ کئی قسم کے مطالبات کیئے گئے جن میں ٹیکسوں کی زیادتی کا مطالبہ بھی شامل تھا تعلیم کی کمی کا رونا بھی رویا گیا تھا۔ یہ کشمیر میں پہلی تحریک تھی جو بڑے محدود پیانے پر چلائی گئی جسکا زیادہ تعلق مطالبوں کی حد تک تھا۔ کوئی سول نافرمانی نہ تھی اسمیں کچھ لوگ گرفتار بھی ہوئے اس محدود تحریک کی باز گشت جب پنجاب میں پہنچی تو زیب داستان کے لیے اسکے ساتھ بہت دہشت ناک واقعات بھی شامل کر لیے گئے۔ جب پنجاب کے مقتدر لیڈران کو ان سب واقعات کا علم ہوا تو بڑے لوگوں کی ایک میٹنگ بلائی گئی جسمیں سر فضل حسین، علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال، مرزا بشیر الدین، محمود دیگر بڑے بڑے لوگوں کا اجتماع ہوا جس میں کشمیری عوام کی امداد کے لیے ایک کمیٹی جس کا نام "کشمیر کمیٹی" رکھا قائم کی گئی جسکی صدارت مرزا بشیرالدین محمود خلیفہ قادیان مرزائی کے سپرد ہوئی - وہ اس کشمیر کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے احرار لیڈران کو مرزا بشیر الدین مرزائی کا کشمیر کے معاملات میں یوں اثر انداز ہونا اچھا نہ لگا۔ انکے خیال میں مرزائیوں کا اثر کشمیر پر زیادہ ہو جائے گا اور اس طرح مرزائیت کشمیر کے لوگوں پر زیادہ اثر انداز ہو گی

پورے غور و فکر کے بعد احرار لیڈران علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ملے انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ مرزاالدین محمود کی زیر قیادت کشمیر کمیٹی سے الگ ہو جاوٗس۔ حضرت علامہ اقبال نے احرار لیڈران سے کشمیر کمیٹی سے الگ ہونے کا وعدہ کر لیا اور جب چند روز بعد برکت علی اسلامیہ ہال میں مجلس احرار کی طرف سے کشمیر کے معاملات پر اجلاس منعقد ہوا تو اس میں ڈاکٹر علامہ سر محمد اقبال نے مرزائیوں والی کشمیر کمیٹی سے الگ ہونے کا اعلان کر دیا اور اسی جگہ اسی روز اجلاس میں تحریک کشمیر کا اعلان کر دیا گیا اور تمام پنجاب میں کشمیریوں کے ساتھ یک جہتی کے لیے اجلاس کیے گئے اور تحریک کا اعلان کر دیا گیا کہ اگر مہاراجہ کشمیر نے کشمیریوں پر ظلم و

ستم بند نہ کئے تو ریاست کشمیر کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک چلائیں گے۔

وجہ تحریک یہ بیان کی جاتی ہے کہ ریاستی پولیس کا ایک مسلمان سپاہی قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا کہ بغیر کسی وجہ کے ایک ہندو سنیاسی نے سپاہی کے ہاتھ سے قرآن کریم چھین کر زمین پر پٹخ دیا۔ ریاست کی تحریک جس کی قیادت شیخ عبداللہ کر رہے تھے انکی خبریں مسلم اخبارات کی زینت بنی۔ مسلم اخبارات نے بھی تحریک کو ہوا دی۔ مجلس احرار نے لاہور کے اجلاس جو اگست 1931ء کو منعقد ہوا تھا تحریک کشمیر کو باضابطہ چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ اکتوبر 1931ء کو مجلس احرار کا ایک وفد جو چوہدری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر اور خواجہ غلام محمد پر مشتمل تھا کشمیری حکام سے بات چیت کے لیے سرینگر روانہ ہو گیا۔ سرینگر میں مہاراجہ کشمیر سے بات چیت کامیاب نہ ہوئی وفد ناکام واپس آیا۔ ادھر احرار کے شعلہ بیان مقرر بشمول حضرت امیر شریعت عوام میں جذبہ حریت پیدا کر رہے تھے جب حکومت کو تحریک کا خطرہ پیدا ہوا تو سب سے پہلے حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو گرفتار کر لیا گیا اور تحریک کشمیر کے ڈکٹیٹر حضرت مولانا مظہر علی اظہر مقرر ہوئے۔ مولانا مظہر علی صاحب نے وائسرائے ہند کے نام ایک مکتوب لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ حضرت امیر شریعت کو مرزائیوں کو خوش کرنے کے لیے گرفتار کیا گیا ہے اور حکومت ہند کا یہ اقدام قابل مذمت ہے۔ حکومت ہند نے خط کا کوئی جواب نہیں دیا اور شاہ صاحب کو ڈیڑھ سال قید ہوئی۔ تحریک کشمیر کے پہلے ڈکٹیٹر مولانا مظہر علی اظہر تھے سیالکوٹ سے تین سو رضاکاران کے ساتھ جموں باڈر پر گرفتاری پیش کی۔ مولانا مظہر علی اظہر گرفتار کر لیے گئے اور دیگر احرار لیڈر شپ بھی بعد میں گرفتار کر لی گئی۔ جو دوسرے درجے کی لیڈر شپ تحریک چلا رہی تھی وہ پس پردہ کام کر رہی تھی گرفتاری کے لیے رضاکار جلوس کی شکل میں جاتے تھے جن لوگوں نے گرفتاری پیش کرنی ہوتی تھی وہ جموں یا سرینگر جانے والی بس میں سوار ہو جاتے اور باقی جلوس واپس آ جاتا تھا۔ راقم کی عمر اس وقت تقریباً" چھ سال کی تھی۔ تھانے والہ بازار گوجرانوالہ میں ہماری رہائش ہوا کرتی تھی اسی بازار میں مجلس احرار کا دفتر بھی ہوتا تھا اور یہاں سے ہی تحریک کشمیر میں گرفتار ہونے والے جلوس کے آگے پھولوں کے ہار گلے میں ڈالے ہوئے ہوتے تھے۔ جلوس میں نعرے بازی ہوتی۔ مہاراجہ کشمیر کے خلاف نظمیں پڑھی جاتی تھیں انہیں جلوسوں میں گرفتاری دینے والوں کو کشمیر کی طرف روانہ کیا جاتا تھا۔ یوسف بٹ صاحب جو سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں انکا ایک انٹرویو ماہنامہ جینے دو میں شائع ہو چکا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں جلوس کی شکل میں سیالکوٹ سے جموں کے ریاستی بارڈر تک پہنچایا گیا۔ رات کو ہم نے باڈر کراس کیا تھا۔ رات پیدل سفر کر کے ہم جموں پہنچ گئے صبح کے وقت ایک جگہ رک کر احرار کا سرخ لباس زیب تن کیا۔ پھر جموں میں داخل ہو کر ہم نے مہاراجہ کشمیر کے خلاف نعرہ بازی کی اور ہمیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس طرح جو لوگ بسوں میں سوار ہو کر جاتے تھے انہیں باڈر پر ہی گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ پہلے پہل سول نافرمانی کرنے والوں کو انگریز حکومت کچھ نہ کہتی تھی کشمیر میں ہی گرفتار کیا جاتا تھا مگر جب ہزاروں سیاسی قیدیوں کی وجہ سے کشمیر ریاست کے جیل خانے بھر گئے تو پھر انگریز حکومت نے اپنے انگریزی علاقے میں بھی گرفتاریاں شروع کر دیں۔

تحریک کے رضاکاروں کو گرفتار کرنے کے علاوہ تشدد کر کے بھی چھوڑ دیا جاتا تھا اسکے باوجود تیس ہزار رضاکار گرفتار ہو چکے تھے تمام لیڈر گرفتار ہو چکے تھے تین ماہ تک تحریک چلی سیالکوٹ، گجرات، جہلم، راولپنڈی کے راستے رضاکار کشمیر میں داخل ہوتے اور گرفتاری دیتے۔ آخرکار تحریک میں وہ دم خم نہیں رہا کمزور پڑ گئی ریاست کشمیر میں تمام سیاسی قیدیوں کو بھی پنجاب کی جیلوں میں منتقل کر دیا لیڈران کو بوسٹر جیل میں رکھا گیا۔ دوران قید احرار لیڈران کے ساتھ ریاست اور انگریز حکومت کی بات چیت بھی ہوئی جو کہ ناکام رہی۔ تحریک ست پڑ گئی بلاخر ختم ہو گئی۔ کچھ وقت کے بعد حکومت نے تحریک میں گرفتار شدگان کو بھی رہا کرنا شروع کر دیے جس وقت تحریک کشمیر چل رہی تھی اس سے قبل ریاست کے اندر بھی حقوق اور مطالبات کی تحریک چل رہی تھی جو مسلم کانفرنس شیخ عبداللہ کی زیر قیادت چل رہی تھی مگر ان دنوں تحریکات میں فرق یہ تھا کہ مجلس احرار کی تحریک کشمیر میں فرقہ وارانہ رنگ غالب تھا جبکہ مسلم کانفرنس کی تحریک غیر فرقہ واریت پر مبنی تھی۔ مطالبات اور حقوق سب لوگوں کے لیے تھے صرف مسلمانوں کے لیے نہ تھے۔ مجلس احرار کی تحریک کشمیر کو شیخ عبداللہ اور مسلم کانفرنس نے ریاستی تحریک میں بے جا مداخلت قرار دیا تھا۔ شیخ عبداللہ کی ایک کتاب جو میری نظر سے گزری اس میں انہوں نے مجلس احرار کی تحریک کو اچھا نہیں کہا بلکہ انکی رائے یہ تھی کہ مسلم کانفرنس کی تحریک اور انکی جدوجہد کو پنجاب کے احرار نے اپنے کھاتہ میں ڈالنا چاہا فائدہ اٹھانا چاہا جسے ہم نے کامیاب نہیں ہونے دیا۔

احرار پولیٹیکل کانفرنس

جولائی 1931ء میں لاہور حبیبہ ہال میں زیر صدارت حضرت مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی احرار کانفرنس ہوئی جس کے کل چھ اجلاس ہوئے اور تمام مقتدر لیڈران احرار اس کانفرنس میں موجود تھے۔ جس میں مندرجہ ذیل قراردادیں منظور کی گئی

قرارداد ا:۔ ہرگاہ کہ تجاویز دہلی کو جو مارچ 1927ء کو مختلف جماعتوں سے تعلق رکھنے والے بارہ تیرہ لیڈران نے مرتب کی تھیں جنکی رو سے تمام صوبہ جات میں تمام اقوام کے لیے مخلوط طریقہ انتخاب کے طابع نشستیں مخصوص کرنے کی تجاویز منظور کی گئی تھی پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں نے منظور نہیں کیں۔

ب:۔ ہرگاہ یہ مسئلہ پنجاب کے فیصلے کو جو نہرو رپورٹ کے تصفیہ کے مطابق ہندو سکھ میثاق لکھنؤ 1925ء میں درج ہے اور جسکی رو سے نشستوں کی تخصیص کے بغیر باشندوں کو حق رائے دہی اور مخلوط انتخابات کی سفارش کی گئی تھی جسے سکھوں نے مسترد کر دیا اور جن سکھ لیڈران نے اسپر دستخط بھی کیئے تھے وہ بھی منحرف ہو گئے۔ ہندو لیڈران نے کھل کر انکی حمایت کی

ج:۔ اور یہ کہ گاندھی جی نے خود بھی اس میثاق سے علیحدگی اختیار کر لی اور اعلان کیا کہ

سکھوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا اس طرح وہ اس واحد فارمولے کی بنیاد اکھاڑنے میں آلہ کار بنے جس سے سمجھوتے کی بنیاد قائم ہونے کی توقع ہو سکتی تھی

د:۔ اور یہ کہ پنجاب کے ہندو اور سکھ مسلمانوں کے ساتھ باعزت اور برادرانہ سلوک کرنے کو تیار نہیں ہیں اور ارتکاء معاشرتی قطع تعلق کر کے اچھوتوں جیسا سلوک کرنے اور مشترکہ قومیت کے راستے میں روز افزوں مشکلات پیدا کر رہے ہیں

ر:۔ ہرگاہ گاندھی جی نے مسلمانوں سے مشترکہ مطالبہ طلب کیا ہے کہ جسکے بغیر وہ ہندو مسلم مسئلہ پر غور کرنے کو تیار نہیں

س:۔ اور یہ کہ پنجاب کے ہندو سکھوں نے مخلوط انتخابات کے اس فارمولے کو ماننے سے انکار کر دیا ہے جو پنجاب کے قوم پرست مسلمان قبول کرنے کو تیار ہیں اس لیے معاملات مزید توقف میں ڈالے رکھنا فضول ہے۔

نمبر1:۔ اور یہ کہ سکھوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر کوئی ایسا دستور منظور کیا گیا جس سے پنجاب کونسل میں مسلمانوں کی اکثریت کی راہ آئے تو ہم ہرگز نہ مانیں گے۔

نمبر2:۔ ہندو سکھ اس بات پر تیار نہیں کہ مرکز یا کسی بڑے صوبے سے نظام حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرنے کا کوئی موقع پیدا ہونے کی اجازت دیں

اس لیے موجودہ حالات میں اس کانفرنس کی رائے میں جداگانہ انتخابات بدستور بحال رہنا چاہئے اور مخلوط انتخابات جو مشترکہ قومیت کا نتیجہ ہوتا ہے اسے معطل رکھا جائے۔

قرارداد نمبر2:۔ دربار کشمیر کی جانب سے مسلم رعیت پر جو سختیاں کی جاتی ہیں یہ اجلاس اسکی پرزور مذمت کرتا ہے۔ مجلس احرار کا یہ اجلاس مہاراجہ ہری سنگھ سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مسلم رعیت پر ظلم بند کریں اور جو مسلمانوں پر زیادتیاں کی گئی ہیں انکی جانب دارانہ تحقیق کرائی جائے مجرموں کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں۔

قرارداد نمبر3:۔ مجلس احرار کا یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ جس طرح سکھوں کو کرپان کھلے عام رکھنے کی اجازت ہے اسی طرح مسلمانوں کو پنجاب میں تلوار بغیر لائسنس رکھنے کی اجازت دی جائے۔

مجلس احرار کے اس اجلاس میں ہزاروں لوگ شریک ہوئے مندرجہ ذیل لیڈران بھی اس کانفرنس میں شامل تھے۔ چوہدری فضل حق صاحب، چوہدری عبدالعزیز بیگوال، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، شیخ حسام الدین، مولانا داؤد غزنوی، مولانا مظہر علی اظہر، خواجہ غلام محمد ماسٹر، محمد شفیع مجلس احرار نے اپنا ایک اخبار روزنامہ احرار بھی جاری کیا تھا جو تھوڑا عرصہ جاری رہا پھر روزنامہ احرار کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ مزید پانچ ہزار کی ضمانت مانگی گئی تھوڑا عرصہ اخبار جاری رہنے کے بعد مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔

اگست 1932ء وزیراعظم برطانیہ نے ہندوستان میں جداگانہ انتخابات کا فیصلہ کر دیا اور ساتھ ہی فیصلہ کر دیا گیا کہ ہندوستان کے دو بڑے صوبوں پنجاب اور بنگال میں فرقہ واریت کے حساب سے

تناسب نمائندگی مندرجہ ذیل ہو گا۔ پنجاب اسمبلی کی کل نشستیں 175 ایک سو پچھتر ہونگی۔ جن میں 84 مسلمان جداگانہ انتخابات کے ذریعے منتخب ہونگے۔ پانچ نشستیں بڑے زمینداروں کی لیے تین مزدوروں کی مخلوط انتخابات کے ذریعے پر کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ بڑے زمینداروں کی پانچ میں سے تین مسلمان بڑے زمینداروں کی ہونگی اور دو غیر مسلموں کے لیے۔ تین مزدور نشستوں میں دو مسلمان مزدور ممبر ہونگے اور ایک غیر مسلم ممبر ہو گا۔

اسی طرح تمام ہندوستان میں جداگانہ طریقہ انتخاب رائج کر دیا گیا۔ جداگانہ طریقہ انتخاب ہونے کی وجہ سے آنے والے وقت کی سیاست بھی جداگانہ ہو گئی۔

ریاستی سیاست

ہندوستان میں انگریز کی حکمرانی تھی مگر تقریباً" تیسرا حصہ ملک پر پانچ سو ریاستوں پر مشتمل ہندوستانی حکمرانوں کے زیر تسلط بھی تھا۔ جس کا بیرونی تحفظ تو مرکزی انگریز حکومت کرتی تھی مگر اندرونی طور پر یہ ریاستیں آزاد تھیں ریاستوں کے اپنے قانون تھے اپنے آئین ہوتے تھے اور انکی اپنی ہی پولیس وغیرہ بھی موجود تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ریاستوں کی نسبت برطانوی ہند کے لوگ خوش حال بھی ہوتے تھی اور سیاسی بیداری بھی برطانوی ہند کے علاقوں میں زیادہ تھی۔ تعلیم اور روزگار کے مواقع بھی زیادہ تھے۔ ریاست الور کے کچھ لوگ ہجرت کر کے انگریز علاقوں میں چلے آئے جو لوگ ہجرت کرتے ہیں وہ کسی تکلیف کی وجہ سے ہی کرتے ہیں۔ مجلس احرار نے الور مہاجرین کے حق میں تحریک چلانا چاہی جمیعت علماء ہند نے مجلس احرار کی تحریک ریاست الور کے خلاف چلانے کی حمائیت نہ کی۔ مگر ساتھ ہی جمیعت علماء نے یہ کیا کہ ریاست الور کے مہاجرین کے مطالبات ریاستی حکمرانوں سے منوائے اور عام معافی بھی کروا دی۔ مگر اسکے باوجود مہاجرین الور واپس ریاست الور میں نہ گئے۔ چوہدری عبدالعزیز بیگوال ریاست کپور تھلہ کے رہنے والے تھے اور مجلس احرار کے مرکزی لیڈران میں شمار ہوتے تھے۔ ریاستوں کے معاملات میں چوہدری صاحب کی رائے ہی احرار میں ٹھیک سمجھی جاتی تھی۔ جس طرح دیگر ہندوستان میں ساہوکاروں کی قرض کے نیچے عام لوگ دبے ہوئے ہوتے تھے اسی طرح ریاست کپور تھلہ میں بھی ہندو ساہوکاروں کے نیچے زمیندار کسان دبے ہوئے تھے چوہدری عبدالعزیز بیگوال نے ریاست کپور تھلہ میں ایک انجمن زمینداروں کی بنائی جس کا مقصد کسانوں، زمینداروں کا تحفظ تھا اور اپنی زمینوں کو ہندو ساہوکاروں سے بچانا تھا۔ چوہدری عبدالعزیز صاحب کو ساہوکاروں کے خلاف تحریک کو ہوا دینے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور انہیں سرسری سماعت کے بعد ریاستی حکومت نے پانچ سال قید کا حکم سنا دیا اس پر مجلس احرار متحرک ہوئی اور ریاست کپور تھلہ میں تحریک سول نافرمانی شروع کر دی گئی۔ کپور تھلہ شہر جالندھر سے صرف اٹھارہ میل پر واقع ہے احرار رضاکار جالندھر سے ٹولیوں کی شکل میں سرخ لباس پہنے ہوئے کپور تھلہ کے شہر میں جاتے سڑکوں

بازاروں میں نعرے لگاتے اور واپس آ جاتے۔ اسی طرح یہ تحریک تقریباً" پندرہ بیس یوم تک رہی اور حکومت کپور تھلہ نے چوہدری عبدالعزیز بیگووال کو رہا کر دیا اور تحریک کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ کپور تھلہ میں ہندو مسلم کشیدگی بھی بن گئی اس طرح کہ شیعہ حضرات کا جلوس تھا۔ محرم کے جلوس کا تعزیہ بنا ہوا تھا وہ بڑا تھا بڑھ کے درخت کے نیچے سے گزر نہیں سکتا تھا مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ بڑھ کا درخت تھوڑا کاٹ دیا جائے تا کہ تعزیہ آسانی سے گزر جائے ہندو بڑھ کا درخت متبرک سمجھتے تھے کاٹنے نہ دیتے تھے جھگڑا ہوا گولی چلی بہت سے مسلمان شہید ہوئے' زخمی ہوئے ساری ریاست میں دفعہ 144 نافذ کر دی گئی۔ وقت کے ساتھ تحریک ٹھنڈے پڑ گئی احرار اس تحریک میں پیش پیش تھے

(حور حرم کا قصہ)

1939ء میں امرتسر کے ایک سینما میں فلم حور حرم دکھائی جانے والی تھی جس میں مسلمان بادشاہ کے دربار میں ایک برہنہ لڑکی کو رقص کرتے دکھایا گیا تھا۔

1- مسلمان بادشاہ کا حکم دینا کہ مالیہ ادا نہ کرنے والوں کے مکان جلا دیے جاویں
2- فوج کا زبردستی مالیہ وصول کرنا اور مکانوں کا جلانا
3- اس کارنامے کی خوشی میں شاہی جشن منانا
4- فوج کا بادشاہ کو اطلاع کرنا کہ جن لوگوں کو برباد کیا گیا ہے انمیں ایک خوبصورفت لڑکی بھی ہے
6- بادشاہ کا خوش ہو کر لڑکی کو اپنے حرم میں داخل کرنا
7- مسلمان وزیر کا حصول لڑکی میں قزاقوں کو متعین کرنا اور لڑکی حاصل کر کے لونڈی بنانا
8- نیلام میں لڑکی کو فروخت ہو کر حرم شاہی میں آ جاتی ہی۔

یہ فلم ایسی تھے کہ جس سے مسلم بادشاہوں کی توہین ہوتی تھے۔ مجلس احرار کے قائدین نے سینما مالکان سے کہا کہ وہ یہ فلم نہ دکھائیں اس لیے کہ اس فلم کے دکھانے سے مسلم بادشاہوں کی توہین ہوتی ہے ۔ سینما مالکان نہیں مانے پھر انہیں کہا گیا کہ فلم کے وہ حصے حذف کر دیں جو قابل اعتراض ہیں۔ مگر سینما والوں نے کوئی توجہ نہ دی آخر اس سینما کے خلاف پکٹنگ کی گئی۔ جس کے قائد مولانا عبدالغفار غزنوی مقرر ہوئے پکٹنگ کے دوران عبدالکریم نامی ایک نوجوان زخمی ہو کر شہید ہو گیا۔ مولانا عبدالغفار غزنوی گرفتار کر لیے گئے۔ تحریک کا یہ اثر ہوا کہ فلم مذکور سارے ہندوستان میں بین کر دی گئی۔ کپور تھلہ تحریک جو زمینداروں کے تحفظ کے لیے بنائی گئی تھی وہ بھی کامیاب ہوئی اس لیے کہ ساہوکاروں کے خلاف سارے ہندوستان کے کسانوں اور زمینداروں میں بے چینی پائی جاتی تھی اور کسانوں اور زمینداروں کے مطالبات حق بجانب تھے اس لیے مہاراجہ کپور تھلہ نے قانون نافذ کر دیا کہ کوئی ساہوکار اپنے قرض کی وصولی میں کسان اور زمیندار کی زمین کرک نہیں کر سکتا۔ اسی قسم کا قانون سر فضل حسین کے وقت میں انہی ایام میں حکومت پنجاب نے بھی منظور کر لیا تھا کہ کوئی ساہوکار کسان زمیندار کی زمین قرض کے عوض کرک نہیں کر سکتا اور ساتھ ہی پنجاب کی حکومت نے

یہ بھی قانون بنایا تھا کہ ساہوکاروں کے پاس جو زمین کسانوں اور زمینداروں کی رہن پڑی ہوئی تھی 20 سال تک اگر کسان یا زمیندار فک نہیں کرا سکا تو وہ خود بخود فک ہو جاویں گی۔ اس طرح پنجاب کے کسانوں اور زمینداروں کو ان قوانین کے بن جانے سے فائدہ بھی ہوا اور اس تحریک میں مجلس احرار کی بھی کوشش تھی اور وہ اس میں کامیاب ہوئے اور ساتھ ہی مجلس احرار کی تحریک کی کامیابی میں اور اضافہ بھی ہوا کہ ریاست کپور تھلہ نے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کے ذریعے منتخب کرنے کا حق بھی عوام کا تسلیم کر لیا تھا۔ چوہدری عبدالعزیز بیگوال نے ریاست کپور تھلہ کے عوامی مطالبات تسلیم ہونے پر مہاراجہ کپور تھلہ کا بڑے ہی اچھے الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور مہاراجہ کپور تھلہ کی عوام دوستی پر انہیں مبارک باد پیش کی اور توقع ظاہر کی کہ مہاراج کپور تھلہ آئندہ بھی کپور تھلہ کی رعیت پر دست شفقت رکھیں گے۔

1933ء میں ہی ہوشیار پور لدھیانہ کی مسلم نشست پر چوہدری افضل حق نے احرار کی ٹکٹ پر انتخاب میں حصہ لیا تھا جس میں وہ کامیاب ہوئے چوہدری صاحب کا الیکشن میں کامیاب دیہاتی سیٹ پر ہونا مجلس احرار کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ گوجرانوالہ کے شیخ دین محمد بھی پنجاب اسمبلی کے ممبر تھے لاہور ہائی کورٹ کے جج بن جانے کی وجہ سے یہ سیٹ خالی ہو گئی جس پر مجلس احرار کی طرف سے مولوی مظہر علی اظہر نے الیکشن میں حصہ لیا انکے مقابلے میں شیخ دین محمد کے بڑے بھائی بابو عطا محمد تھے۔ مولوی مظہر علی اظہر کامیاب ہوئے اور مجلس احرار کے پنجاب اسمبلی میں تین ممبر ہو گئے۔ جنکے نام یہ تھے

مولانا مظہر علی اظہر، چوہدری افضل حق، چوہدری عبدالرحمن راھونوالہ

مجلس احرار اور مرزائی

اٹھارویں صدی میں پنجاب کے قصبہ قادیان میں مغل خاندان کے لوگ رہتے تھے اس قصبہ قادیان کے رئیس اور مالک تھے اور سرکار انگلشیہ میں انکو کافی رسائی حاصل تھی۔ اسی طرح خاندان میں مرزا غلام محمد پیدا ہوئے جنہوں نے 1890ء میں نبی ہونے کا دعویٰ کیا اور انہوں نے اپنے کافی پیروکار پیدا کر لیے۔ امت مسلمہ عمومی طور پر ختم نبوت پر پختہ عقیدہ رکھتی تھی اس لیے لوگوں میں مسلمانوں میں مرزائی نبوت کے خلاف ہیجان پیدا ہوا علمائے دین نے مرزائیت کی مذمت کی۔ پیران عظام حضرت پیر مہر علی شاہ آف گولڑا شریف نے مرزائیت کے خلاف بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مرزا غلام احمد قادیانی 1908ء میں وفات پا گئے تو انکے خلیفہ حکیم نورالدین صاحب بنے جو کہ مرزا غلام احمد کے نائب خاص تھے۔ 1910ء میں حکیم نور دین صاحب کی وفات کے بعد مرزا بشیرالدین محمود جو کہ مرزا غلام احمد کے بیٹے تھے وہ خلیفہ بنے اور اس وقت تک بھی خلافت مرزائیت مرزا غلام احمد قادیانی کے ہی خاندان میں ہے۔ اس وقت مرزائیت کا مرکز پنجاب ضلع جھنگ میں چنیوٹ کے قریب ربوہ میں ہے مرزائیت کی

مخالفت ویسے علمائے ہند' علمائے دیو بند نے شروع دن سے ہی کرتے رہے مگر منظم مخالفت مرزائیت کے آگے بند باندھ دینے کی مخالفت مجلس احرار کے قائم ہونے کے بعد احرار نے شروع کی جو ایک مستقل تحریک بن گئی جو آج بھی موجود ہے۔ قادیان کے قصبہ پر جو کہ مرزائیت کا اقتدار تھا مرزا غلام احمد وہاں کے رئیس تھے۔ زمینوں کے مالک تھے سرکار کے گھر میں انکی رسائی بھی تھی انہوں نے ایک رضاکار رتنظیم بھی قادیان میں بنائی ہوئی تھی اس وجہ سے قادیان کے غیر مرزائی ہندو' مسلمان' سکھ بھی انسے خوف زدہ تھے۔ قادیانیت کی اجارہ داری قصبہ قادیان سے ختم کرنے کے لیے مجلس احرار نے وہاں پر اپنا دفتر قائم کیا اور وہاں مستقل مبلغ رکھے اور قادیانیت کے خلاف جلسے کئے جاتے تھے۔ پمفلٹ لکھے جاتے تھے' تقسیم کئے جاتے تھے۔ احرار نے بہت بڑی بڑی کانفرنس بھی وہاں کیں جن میں مرزائیت کو للکارا رد مرزائیت کے لیے کئی بار جب مجلس احرار جلسہ کرتی تو سرکار انگلشیہ قادیان میں دفعہ 144 نافذ کر دیتی جس کی خلاف ورزی میں احرار لیڈران کو گرفتار کیا جاتا۔ مرزائیت کے خلاف جدوجہد میں احرار لیڈر سید عطاء اللہ شاہ بخاری' مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی' چوہدری افضل الحق' مولانا مظہر علی اظہر اور دیگر احرار لیڈر گرفتار ہوئے ان پر مقدمات چلے اور قید کئے جاتے جس وقت بھی احرار لیڈران کو موقع ملتا وہ ضرور مرزائیت کی مخالفت کرتے۔ قادیان میں احرار دفتر قائم ہونے سے مرزائیت کے خلاف جلسے کانفرنس ہونے کی وجہ سے مقامی آبادی جو مرزائیت کے نیچے دبی ہوئی تھی ان میں بھی دلیری آتی اور وہ لوگ بھی احرار کے ہمنوا بنتے۔ راقم الحروف نے خود دیکھا تھا کہ انگریز کے وقت جب احرار کے جلسے ہوا کرتے تھے تو کسی جلسہ میں تین چار سکھوں کا ایک گروہ جس میں ایک بزرگ سکھ کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا ہوتا تھا جس پر ایک تختی لگی ہوتی تھی اس پر رب قادیان لکھا ہوتا تھا۔ پوچھنے پر وہ سکھ سردار جواب دیا کرتا تھا کہ اگر مرزا غلام احمد قادیانی نبی ہے تو میں قادیان کا رب ہوں اور میں نے مرزا کو نبی نہیں بنایا اور یہ جھوٹا ہے اور احرار کی مرزائیت کے خلاف جدوجہد مستقل تھی اسمیں کبھی کسی وقت کمزوری نہیں آئی۔ مجلس احرار جب 1945ء کے الیکشن میں شکست کھا گئی کسی بھی اسمبلی میں کوئی انکا ممبر نہ بنا۔ پورے ہندوستان میں کوئی بھی نمائندگی انہیں نہ ملی اور سارے ہندوستان میں مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کی گئی مسلم لیگ کے مطالبے پر ہندوستان تقسیم ہو گیا پاکستان بن گیا تو 1948ء میں لاہور میں مجلس احرار نے بیرون دہلی دروازہ میں دفاع پاکستان کانفرنس منعقد کی جس میں راقم الحروف بھی شامل ہوا تھا۔ پورے پاکستان سے احرار رضاکار شامل ہوئے تھے۔ بہت بڑی کانفرنس تھی اسی کانفرنس میں مجلس احرار کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا گیا۔ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اجلاس کے اختتام پر یہ فرمایا کہ پاکستان بن چکا ہے ہم نے جو پاکستان کی مخالفت کی تھی وہ دیانت پر مبنی تھی ہم سمجھتے تھے کہ ہندوستان متحد ہو کر ہی ترقی کر سکتا ہے خوشحال ہو سکتا ہے مگر مسلمانوں کی اکثریت نے ہماری رائے سے اختلاف کیا اور مسلم لیگ کے حق میں فیصلہ دیا ہم مسلمانوں کی اکثریت کی رائے کا احترام کرتے ہیں اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ بحیثیت سیاسی جماعت احرار کو ختم کر دیا جائے اسلیے جو ہمارے ساتھی سیاست کرنا چاہتے ہیں وہ مسلم لیگ میں شامل

ہو جاویں اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ہی سیاست کریں۔ 1950ء میں پنجاب کے صوبائی الیکشن میں مجلس احرار کے لیڈران نے مسلم لیگ کی حمایت کی تھی حضرت امیر شریعت کے علاوہ شیخ حسام الدین اور دیگر لیڈران نے مسلم لیگ کے سٹیج پر انکی حمایت میں تقاریر کیں۔ اور مجلس احرار کے ایک موثر گروپ نے حضرت امیر شریعت کی سرپرستی میں مجلس تحفظ ختم نبوت قائم کر لی تھی اور مرزائیت کے محاذ پر انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا اور ان لیڈران نے مرزائیت کے خلاف کام کرنے کے لیے دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر کام شروع کر دیا۔ پلیٹ فارم خالص مذہبی تھا اس میں کسی قسم کی سیاست ممبری الیکشن حکومت نہ تھی۔ شیعہ حضرات کا ایک موثر گروہ بریلوی مکتبہ فکر کا بہت بڑا حصہ اور دیگر دینی مکتبہ فکر کے لوگ بھی مجلس ختم نبوت کے معاون بن گئے اور 1953ء میں پورے پاکستان میں مرزائیوں کے خلاف بہت بڑی تحریک بن گئی۔ مرزائیت کے خلاف تحریک تحفظ ختم نبوت کا ذکر ہم الگ باب میں کریں گے

تحریک مسجد شہید گنج

مجلس احرار کی زندگی میں مسجد شہید گنج کا واقعہ ایک تکلیف دہ واقع تھا پنجاب کے سیاسی شاطروں نے مسجد شہید گنج کے ملبے کے نیچے مجلس احرار کی سیاست کو دفن کر دیا ایسے لوگ جو وطن کی آزادی کے لیے جانیں دینے کو بھی تیار تھے انہیں بظاہر حکمرانی کا کوئی ذوق و شوق نہ تھا مگر پنجاب کے مقتدر اور روائتی سیاست دانوں نے مجلس احرار کو اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتے ہوئے ایسی چال چلی کہ مجلس احرار ابھی پنجاب کی سیاست میں سنبھلی بھی نہ تھی کہ مات کھا گئی۔ مسجد شہید گنج یا گردوارہ شہید گنج کی تاریخ بڑی طویل ہے اور اس پر جانباز مرزا نے کتاب بھی لکھی ہے اور اس میں تاریخی شواہد بھی پیش کئے ہیں اور اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے ہمارا مقصد اس وقت گہرائی میں جانا نہیں جس سے پڑھنے والے بھول بھلیوں کا شکار ہو جاویں ہمارا مدعا یہ ہے کہ چالاک لوگ کس طرح لوگوں کو عوامی جذباتیت میں ابھار کر اپنا مفاد بھی حاصل کر لیتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بدنام بھی کر دیتے ہیں۔

1935ء ایکٹ معرض وجود میں آ جانے کے بعد جداگانہ طریقہ انتخاب رائج ہو جانے کے بعد سیاست کا رخ یکایک بدل گیا۔ خصوصی طور پر مسلمانوں میں تو طریقہ انتخاب کے اثر نے سیاست کا رخ بدل کر رکھ دیا۔

واقعات یہ ہیں کہ عدالتی فیصلہ میں شہید گنج کی جگہ سکھوں کی ملکیت تسلیم کر لی گئی۔ پرانے وقتوں میں سکھ باغیوں کو اس جگہ قتل کیا جاتا تھا اس لیے سکھوں نے اس جگہ کا نام شہید گنج رکھا ہوا تھا۔ یہ جگہ اس وقت گوردوارہ شہید گنج کے نام پر ہے اور دروازہ پر بھی گردوارہ شہید گنج لکھا ہوا ہے اور یہ شہید گنج لنڈا بازار میں ہے اور اس وقت غیر مسلم محکمہ اوقاف کے قبضہ میں ہے۔

اسی گردوارہ کے احاطہ کے اندر ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی جو بالکل غیر آباد تھی اور منتوں کے قبضہ میں تھی۔ ڈیڑھ سو سال سے کوئی اذاں نماز وغیرہ اس مسجد میں نہ ہوئی تھی یہ صرف ایک مسجد نما عمارت تھی۔ روزنامہ سیاست کے مدیر سید حبیب صاحب کا یہ کہنا بھی ہے کہ 1926ء میں جس وقت گردوارہ شہید گنج منتوں کے قبضہ میں تھا اس وقت منتوں نے کہا تھا کہ اگر مسلمان ہمیں تین ہزار روپے دے دیں تو ہم یہ مسجد مسلمانوں کو دی دیں گے مگر سید حبیب نے ایسا نہیں کیا اور بعد میں 1935ء میں حصول مسجد کی تحریک چلانے میں پیش پیش ہو گئے۔ جب مسجد گرائی جانے لگی تو مزدور وغیرہ گمبدوں پر چڑھ کر گرانے لگے تو ایک مزدور گر کر مر گیا اور شود شرابہ ہوا۔ شہر لاہور میں ایک ہیجان بذریعہ اخبارات "زمیندار و سیاست" پیدا ہو گیا۔ مختلف تجاویز سامنے آئیں۔ جن میں چارہ جوئی بھی تھی۔ گوردوارہ یا مسجد کی جائیداد پر تین فریق دعوے دار تھے منت جو کہ اس ساری جگہ پر قابض تھے گوردوارہ پر بندھک کمیٹی جو سکھوں کی تنظیم تھی' انجمن اسلامیہ جس کا دعویٰ تھا کہ مسجد چونکہ ہمیشہ مسجد ہی رہتی ہے اس لیے یہ مسلمانوں کی ملکیت ہے انہیں دی جائے۔ ساری عدالتوں نے مسلمانوں کے دعوے کو خارج کر دیا اس بنا پر مذکورہ مسجد نما عمارت گزشتہ سالہا سال سے منتوں کے قبضہ میں ہے اور اس جگہ پر بارہ سال سے زائد عرصہ سے کبھی نماز جماعت اذان نہیں ہوئی اس لیے قابضین کا حق فائق ہے۔ مسلمانوں کا دعویٰ خارج کر دیا گیا اور انگریز کے وقت میں عدالتیں جو فیصلہ کرتی تھیں ان پر عمل بھی کرایا جاتا تھا۔

تحریک کے ابتدائی ایام میں شہر لاہور کے معززین نے بات چیت کے ذریعے مسجد شہید گنج کا معاملہ طے کرنے کی کوشش کی۔ ایک میٹنگ جو مسلمانوں اور سکھ لیڈروں کے درمیان ہوئی۔ مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر روزنامہ زمیندار کی زیر قیادت حصول مسجد شہید گنج کے لیے ایک جماعت اتحاد ملت بھی بنی ہوئی تھی جس میں ایک رضاکار تنظیم بھی تھی جنکی وردی نیلی ہوتی تھی انہیں نیلی پوش بھی کہا جاتا تھا۔ یہ مجلس احرار کی [illegible] پوش تنظیم کے مقابلہ میں قائم کی گئی تھی مجلس اتحاد ملت کے لیڈران میں مولانا ظفر علی خان بھی شامل تھے۔ سکھ لیڈران کے ساتھ جو بات چیت ہوئی اس وفد کی قیادت مولانا ظفر علی کر رہے تھے اس میں اور لوگوں کے علاوہ رئیس اعظم لاہور میاں امیر الدین بھی شامل تھے۔ بات چیت کے ابتدا میں ہی سکھ لیڈران نے یہ کہا کہ کسی معاملے کو بات چیت کے ذریعے سلجھانے کا یہ طریقہ تو نہیں کہ فضا کو اشتعال انگیز بنا دیا جائے اور پھر بات چیت کی جائے۔ شہر میں اس وقت جو فضا بنی ہوئی ہے ہر جانب لٹھ باز نوجوان نیلا لباس پہنے گھوم کر اشتعال پیدا کر رہے ہیں یہ معاملات کو سلجھانے کی بات تو نہیں۔ پھر سکھ لیڈران نے کہا کہ گردوارہ شہید گنج کے ساتھ ہماری تاریخ وابستہ ہے اسی جگہ پر سکھ مجاہدین کو حکومت وقت نے شہید کیا تھا قتل کیا تھا۔ یہ گردوارہ انہیں سکھ سپوتوں کی یاد میں ہے۔ ہم کسی قیمت پر بھی اس جگہ سے دست بردار نہیں ہونگے۔ بعض اراکین وفد کی کوشش سے ماحول کو خوش گوار بنانے کی کوشش کی گئی تو پھر خوش گوار ماحول میں بات چیت شروع ہوئی تو سکھ لیڈران نے کہا کہ آج ہم آپ سے بات چیت کے بعد ایک فیصلہ پر پہنچتے ہیں کل کوئی اور انجمن اٹھ

کھڑی ہو فساد کھڑا کر دیں۔ اس پر اراکین وفد نے انہیں یقین دلایا کہ یہ نمائندہ وفد ہے اگر کوئی فیصلہ ہو جاتا ہے تو پھر کوئی فساد کھڑا نہیں ہو گا اور ہم یہ پوری ذمہ داری سے کہہ رہے ہیں

اس بات چیت میں سکھ لیڈران اس حد تک تعاون پر آمادہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے کہا کہ جس طرح مسجد آپکے لیے مقدس ہے اسی طرح شہید گنج گوردوارہ ہمارے لیے مقدس ہے اور شہید گنج گوردوارہ کے ساتھ تاریخ وابستہ ہے ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں وہ صرف اس لیے کہ بے گناہ لوگوں کا خون خرابہ نہ ہو وہ یہ کہ جس حد تک مسجد گری ہے اسے مرمت کرا دیتے ہیں اور مسجد کا احترام بحال کر دیتے ہیں۔ مگر یہ گوردوارہ پر بندھک کمیٹی کے قبضہ میں رہے گی اور سابقہ حالت میں ہی رہے گی۔ اذان نماز جماعت اس مسجد میں نہ ہو گی۔ اسکے جواب میں مولانا محمد ظفر علی خان صاحب نے کہا اتنا تو آپ دیں باقی ہم بذریعہ عدالت لے لیں گے۔ تو سکھ لیڈران نے جواب دیا کہ تو پھر آپ ابھی عدالت میں چلے جاویں اس بات چیت کا کیا فائدہ۔ دیگر اراکین نے مولانا ظفر علی صاحب سے علیحدگی میں یہ کہا کہ سکھ تجاویز مان لینی چاہیے۔ مگر مولانا نے اراکین وفد سے یہ کہا کہ مجھے ایک بڑے ذمہ دار افسر نے کہا ہے کہ مسجد شہید گنج کی تحریک جاری رکھو مسجد مل جائے گی۔ اس لیے سکھ لیڈران کی تجاویز مان لینے کی ضرورت نہیں۔ وفد ناکام واپس آگیا۔ اسکے بعد ماحول زیادہ کشیدہ ہو گیا۔ لنڈا بازار میں پولیس اور اسکی امدادی فورسز نے مورچے سمبھال لیے۔ گوردوارہ یا مسجد شہید گنج کو اپنے کنٹرول میں لے کر اس علاقہ میں حفاظتی قوانین نافذ کر دیے گئے۔ ایک حد مقرر کر دی گئی کہ کوئی شخص بھی اس سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے تحریک کے اثرات پنجاب کے دیگر شہروں میں بھی پہنچ گئے۔ ان شہروں میں بھی جلسے جلوس حصول مسجد کے لیے ہونے لگے باہر کے لوگ حصول مسجد کی خاطر قربانیاں دینے کے لیے لاہور میں آنا شروع ہو گئے۔ کئی لوگوں کو تحفظ امن عامہ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ آخر ایک روز مسلمانوں کے ایک ہجوم نے مسجد شہید گنج کی طرف بڑھنا چاہا اس پر گولی چلا دی گئی۔ تقریباً 20 مسلمان شہید ہوئے اور سو کے قریب زخمی ہو گئے۔ دوسرے روز پھر لوگ آگے بڑھے گولی چلی لوگ شہید و زخمی ہوئے۔ تحریک میں خوف کے آثار پیدا ہو گئے۔ اتحاد ملت کے لیڈران نے حضرت مولانا ظفر علی خان جو کہ کرم آباد اپنے گاؤں اور گھر میں نظر بند تھے انکا پیغام لوگوں کو پڑھ کر سنایا کہ حضرت کو تحریک کے شہداء کی موت کا بہت رنج ہوا ہے۔ انکا پیغام ہے کہ پر امن طریقہ پر حصول مسجد کی جدوجہد کریں گے بے جا جانیں ضائع نہیں کریں۔ مسلمان کی جان بہت قیمتی ہے۔ اس لئے پر امن جدوجہد کریں اور اپنے آپکو منظم کریں اور مسجد شہید گنج سے پیچھے ہٹ کر مسجد وزیر خان میں چلے جاویں۔ اور ساتھ ہی مسجد وزیر خان کے خطیب مولانا دلدار علی صاحب نے فتوی جاری کر دیا کہ جب مسجد شہید ہو رہی ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ مسجد کی حفاظت کریں اور اس حفاظت کے ساتھ اپنے خون کی بھی حفاظت کریں اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالیں۔ ان اپیلوں کے بعد تحریک مدہم پڑ گئی۔ مزید بے گناہوں کا خون رائیگاں نہیں گیا۔

مسجد شہید گنج

گزشتہ صفحات پر ہم نے لکھا ہے کہ مسجد کی ملکیت قبضہ سکھوں کے پاس تھا اور عدالت نے بھی انہیں ہی مالک قرار دیا تھا۔ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ مسجد مذکور اٹھارویں صدی میں تعمیر کی گئی ہو گی۔ تعمیر کنندہ نے رفاح عامہ کے لئے تعمیر کیا ہو گا۔ مگر اٹھارویں صدی میں لاہور شہر کی حدود دروازوں کے اندر ہی ہوتی تھی۔ اٹھارویں صدی کی کوئی عمارت ماسوائے سرکاری عمارات جیسے قلعہ عالمگیر شاہی مسجد وغیرہ ہیں مگر نجی عمارت کوئی بھی حدود شہر سے باہر نہیں بنتی تھی۔ اس لئے کہ ان عمارات میں رہائش نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ محفوظ نہیں ہوتی تھیں۔ یہ تصور بھی پرانے وقتوں میں نہیں تھا کہ کوئی گھر شہر کی حدود سے باہر رہے اور ڈاکوؤں راہزنوں کی دست برد سے محفوظ رہے۔ جو لوگ اپنے گھر شہر کی چار دیواری سے باہر بناتے تھے انہیں ڈاکو لوٹ لیا کرتے تھے۔ اس لئے لاہور شہران دروازوں کے اندر ہی تھا باہر ویرانہ ہوتا تھا یا کھیت وغیرہ ہی تھے۔ یہ کھیت اس وقت غیر مسلموں کے ہوں گے جنہوں نے آہستہ آہستہ اس مسجد کو اپنے تصرف میں کر لیا۔ یہاں پر ساتھ ہی گوردوارہ بھی بعد میں بن گیا۔ سکھوں کے دور حکومت میں یہ مسجد حکومت کی ملکیت نہ تھی اگر حکومت کی ملکیت ہوتی تو انگریزوں کو منتقل ہوتی پھر وہ مسلمانوں کو ہی مل جاتی مگر یہ مسجد ملحقہ کھیت مالکان غیر مسلموں کے قبضہ میں تھی اور اسکے ساتھ کوئی مسلم آبادی ہی نہ تھی جو اسے اپنے تصرف میں لے آتی۔ انیسوی صدی کے آخر تک دلی دروازے سے موچی دروازے شاہ عالمی دروازے کے باہر

کوئی آبادی نہ تھی۔ 1880ء تک کے کئی لوگ ملتے رہے ہیں جو کہتے تھے کہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے دہلی دروازہ' موچی دروازہ' شاہ عالمی دروازہ کے باہر کوئی آبادی نہ تھی۔ صرف کھیت ہی ہوا کرتے تھے۔ لنڈا بازار جس جگہ مسجد شہید گنج واقع ہے یہ جگہ انیسوی صدی کے آخر تک قرب و جوار میں مسلم آبادی سے محروم تھی۔ اس وجہ سے غیر مسلم کھیت مالکان نے ہی قبضہ کر لیا۔ اسی جگہ پر گزشتہ دور میں سکھ باغیوں کو قتل کیا جاتا تھا۔ اس جگہ پر سکھوں نے باغی سکھ مقتولین کی یاد میں یہ گردوارہ بنا دیا۔ جسکا نام گردوارہ شہید گنج رکھ دیا گیا۔ باغی مقتولین کی وجہ سے یہ گردوارہ سکھوں کے لئے متبرک بن گیا۔ اسی گردوارہ کی حدود کے اندر ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی جسے مسجد شہید گنج کہا جاتا تھا۔

سن 1935ء ایکٹ

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ 1927ء میں اس مسجد کے بہت قابضین 3000 تین ہزار روپیہ میں مسجد مذکورہ کا قبضہ دینے کو تیار تھے اور مسلمان لینے کو تیار نہ تھے مگر 1935ء میں کیا ہو گیا کہ حصول مسجد کے لئے جانیں تک دینے کو مسلمان تیار ہو گئے یہ سب 1935ء ایکٹ کا اعجاز تھا۔ وہ اس طرح کہ اس ایکٹ کے تحت ہندوستانی عوام کو حقوق دیئے گئے کہ اندرونی طور پر خود مختار ہیں۔ صوبوں میں اپنی مرضی کی حکومت بنا سکتے ہیں۔ حکومت کو اندرونی تمام اختیارات حاصل ہوں گے گورنر آئینی حکمران ہو گا۔ وہ منتخب حکومت کے کسی معاملہ میں مداخلت نہیں کرے گا تاوقت کہ ملک کو کوئی سنگین خطرات کا سامنا نہ ہو جائے۔ ووٹ دینے کے حق کو بھی ذرا وسعت دے دی گئی۔ پہلے اگر اسمبلی کے ایک حلقہ انتخاب میں 3000 ووٹ ہوتے تھے مگر اس ایکٹ کے تحت چار پانچ گنا زیادہ لوگوں کو ووٹ دینے کا حق مل گیا۔ ایک حلقہ انتخاب میں قبل ازیں تھوڑے ووٹ ہونے کی وجہ سے جلسے جلوسوں کی سیاست کی ضرورت نہ ہوئی تھی لوگوں کو ذاتی طور پر مل کر ہی حصول ووٹ کے لئے آمادہ کیا جا سکتا تھا مگر ایک حلقہ انتخاب میں اگر تیس چالیس ہزار ووٹ ہوں تو اس کے لئے ضرورت تھی کہ جلسے جلوسوں کی سیاست اپنائی جائے۔ ایسی سیاست میں پنجاب کا روایتی سازشی سیاست دان جو انگریز کے خطاب یافتہ انعام یافتہ تھے انکے پاس ایسی سیاست میں کامیاب ہونے کے لئے کوئی نعرہ کوئی سٹیج نہ تھا۔ دیگر یہ کہ طریقہ انتخاب جداگانہ بنایا گیا تھا کہ ہر فرقہ الگ الگ اپنے نمائندہ منتخب کر کے اسمبلیوں میں بھیجیں ایسی سیاست میں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کر کے سیاست میں کامیابی حاصل کر سکتی تھی اوپر کی سطح پر سرکار پرست ہندو سکھ مسلمان لیڈر آپس میں ایک تھے' ملتے رہتے مگر آنے والی سیاست میں وہ کامیابی فرقہ واریت میں سمجھتے تھے۔ مسلمان اور سکھ مذہب کے نام پر بہت جلدی مشتعل ہو سکتے تھے۔ سرکاری ایوانوں میں یہ سازش تیار ہوئی کہ اگر سیاست کو فرقہ واریت کا رنگ نہ دیا گیا تو اسمبلیوں پر مجاہدین تحریک آزادی اور ان کے ہمنوا قابض ہو جاویں گے۔ اور انہوں نے خود پیچھے رہ

کر مسجد گرانے کی اور اس کے خلاف تحریک چلانے کی سکیم تیار کر لی اور تمام مہرے اپنی اپنی جگہ رکھ کر مسجد گرا دی اور اس کے خلاف تحریک بھی چلوا دی۔ مطعون مجلس احرار کو کرنا شروع کر دیا کہ وہ تحریک مسجد شہید گنج میں کیوں حصہ نہیں لیتی۔ مسلمان شہید ہو رہے ہیں اور احرار تماشہ دیکھ رہے ہیں اس زمانے میں تین مسلمان اخبار تھے زمیندار - سیاست - انقلاب تینوں احرار کے خلاف لکھ رہے ہیں اور احرار کو ہی مورد الزام بنا رہے ہیں۔ مسجد سکھوں کے قبضہ میں تھی انہوں نے گرا دی۔ تحریک مجلس اتحاد ملت چلا رہی ہے جس کے لیڈر مولانا ظفر علی خان ہیں۔ مگر گالیاں احرار کو دے رہے ہیں۔ اس زمانے میں تعلیم بہت کم تھی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس کام پر لگایا گیا کہ وہ احرار کے خلاف جو بھی مسلم اخبارات لکھیں وہ بازاروں میں چوراہوں میں لوگوں کو پڑھ کر سنائیں اور ساتھ ہی یہ نوجوان لوگوں کو چھوٹے چھوٹے جلسے کر کے احرار کے خلاف بھڑکاتے ان نوجوانوں میں مشہور احرار لیڈر شورش کاشمیری بھی تھے جو بعد میں مجلس احرار میں شامل ہو گئے۔

اس سازش میں سرکار پرست طبقہ کامیاب ہوا اور مسجد سکھوں کے قبضہ میں تھی۔ انہوں نے ہی گرائی بھی تھی۔ تحریک مولانا ظفر علی خان چلا رہے تھے۔ مگر تشہیر کے ذریعے مورد الزام احرار کو بنا دیا گیا۔ سارے پنجاب میں مجلس احرار ایک مقبول جماعت تھی مگر اب پنجاب کے کسی شہر میں بھی احرار کھل کر جلسہ نہیں کر سکتے تھے۔

احرار کا موقف

مجلس احرار کی لیڈر شپ ان لوگوں پر مشتمل تھی جو تقریباً" عرصہ بیس سال سے تحریک آزادی کے ساتھ وابستہ چلے آ رہے تھے۔ کانگرس اور پھر ساتھ ہی اس کے تحریک خلافت ان جماعتوں میں قربانی ہی قربانی تھی۔ حصول منصب کے لئے کوئی طریقہ نہیں آتا تھا اور انکی گزشتہ بیس سالہ سیاسی زندگی بھی جدوجہد اور صعوبت کی ہی زندگی تھی۔ کئی کئی سال تک احرار لیڈر قید کاٹ چکے تھے مگر فرنگی سامراج کے آگے نہ جھکے' نہ بکے' وہ مسلم حقوق کی جدوجہد کرتے تھے اسکے لئے قربانیاں بھی دیتے تھے۔ مگر وہ فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ پنجاب یا لاہور میں فرقہ واریت یا کشیدگی پیدا کریں اور مسلمان جذباتیت میں آ کر اپنی جانیں قربان کریں۔ انکا نظریہ تھا کہ مسجد شہید گنج سکھوں کے قبضہ میں ہے۔ سکھوں کی ملکیت عدالتوں نے تسلیم کی ہوئی ہے یہ صرف خوشگوار ماحول میں بات چیت کے ذریعے ہی مل سکتی ہے۔ کسی تحریک سے بے گناہ لوگوں کو شہید کرا کر مسجد نہیں مل سکتی۔ بلکہ مزید فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہو گی جو کہ مسلمان اور سکھوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ کشیدگی بدیشی حکمران انگریز کروا رہے ہیں۔ اس تحریک میں شامل ہو کر مسلمانوں کا خون انگریز حکمرانوں کے مفاد میں بہایا جاتا ہے۔ چنانچہ صدر مجلس احرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے جلسہ عام میں الزام لگایا تھا کہ مسجد گرانے والا انگریز گورنر پنجاب ہے مجھ پر مقدمہ چلایا جائے۔ میں ثابت

کروں گا۔ احرار غریب لوگوں کی جماعت تھی اس لئے لیڈر شپ بھی غریب یا درمیانہ کلاس پر مشتمل تھی۔ یہ جماعت معاونین کی امداد اور چندہ پر چلتی تھی۔ دو دفعہ اخبارات نکالے روزنامہ احرار اور آزاد مگر مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گئے۔ وہ سازشی سیاست دانوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔

تبصرہ۔

جیسا کہ مجلس احرار کا موقف ہے کہ مسجد شہید گنج کی تحریک مجلس احرار کے خلاف حکمرانوں کی سازش تھی۔ جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ شہدائے شہید گنج کے خون کے عوض مولانا ظفر علی خان 1937ء کے الیکشن میں مرکزی پارلیمنٹ کے ممبر بن گئے اور سر فضل حسین اور انکی پارٹی پنجاب کے الیکشن میں کامیاب ہو گئی احرار جو 1935ء میں پنجاب کی مقبول ترین جماعت تھی مسجد شہید گنج کا الزام ان پر ڈال دیا گیا کہ اگر احرار تحریک میں حصہ لیتی تو مسلمانوں کو مسجد مل جاتی تھی۔ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ فرقہ وارانہ فساد کی سازش میں شریک ہونا احرار کے مزاج کے ہی خلاف تھا۔ اس لئے وہ تحریک میں شامل نہیں ہوئے اور وہ سمجھتے تھے کہ تحریک چلانے سے مجاہدین مسجد شہید گنج شہید یا زخمی تو ہونگے مگر مسجد نہیں ملے گی۔

اس مضمون میں مسجد شہید گنج کو ختم کرتے ہوئے تحریک کے محرکین سے پوچھتا ہوں کہ اگر یہ لوگ حصول مسجد میں مخلص تھے تو ٹھیک واقع شہید گنج کے 12 سال بعد پاکستان بن گیا اس وقت مولانا ظفر علی بھی زندہ تھے۔ مولانا اختر علی بھی زندہ تھے اور وہ تمام کردار جو اس تحریک کے ساتھ وابستہ تھے ان میں بھی اکثر لوگ زندہ تھے۔ اخبار زمیندار اور انقلاب بھی زندہ تھے۔ مولانا ظفر علی خان مرکزی دستور ساز اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ مسلم لیگ کے معتبر لیڈر بھی تھے۔ مسلم لیگ ہی پاکستان پر حکمران جماعت بھی تھی۔ ہندو سکھ بھی پاکستان سے بھاگ گئے اب کونسا امر مانع تھا کہ گوردوارہ شہید گنج کو مسجد نہ بنایا جاتا۔ اگر واقعی یہ کردار حصول مسجد کے لئے ہی جدوجہد کر رہے تھے اب وہ جگہ انکی ملکیت میں آ چکی تھی۔ اسے مسجد بنا دیا جاتا کوئی روکنے والا ہی نہ تھا مگر ایسا نہیں تھا تحریک شہید گنج کے بانیان نے حصول اقتدار کے لئے خدا کے گھر کو اپنی خواہشات کا آلہ کار بنایا ہے۔ بے گناہ لوگوں کو اپنی اغراض کے لئے قتل کر کے انکی لاشوں پر اپنے اقتدار کا محل بنایا۔ اسی طرح سندھ میں مسجد منزل گاہ جو کہ صدیوں سے ویران پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ بھی ایک مندر تھا مندر کی حدود کے اندر ہی مسجد بھی تھی۔ 1938ء میں سندھ کے وزیر اعظم اللہ بخش شہید کے خلاف مسلم لیگیوں نے مسجد کو آلہ کار بنا کر مسجد کے نام پر تحریک چلائی جس میں گولی چلی۔ ایک سو کے قریب مسلمان شہید و زخمی ہوئے اللہ بخش سومرو کی وزارت ختم ہو گئی اور تحریک بھی ختم ہو گئی اور مسلم لیگیوں نے اللہ بخش سومرو کو قتل بھی کرا دیا۔ اس زمانہ میں قتل کا الزام ایوب کھوڑو پر لگا دیا تھا۔ صرف ذاتی اور سیاسی اغراض کے لئے مسجد کو مذہب کو آلہ کار بنایا گیا۔ اللہ بخش سومرو قوم پرست راہنما تھے۔ انہوں نے انگریز کے دیے

ہوئے خان بہادر کا خطاب بھی واپس کر دیا تھا وہ ذہنی طور پر انگریز سامراجیت کے خلاف تھا۔ اس لئے فرقہ پرستوں مسلم لیگیوں نے اس کے خلاف مسجد کے نام پر تحریک چلائی۔

تحریک مدح صحابہ

مجلس احرار کی جدوجہد میں تحریک مدح صحابہ بھی شامل ہے اسکی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ لکھنؤ میں ایک جلسہ کو خطاب فرما رہے تھے کہ دوران تقریر صحابی رسول حضرت عمرؓ کا نام لیا اور ساتھ رضی اللہ بھی کہا تو مجمع سے آواز آئی کہ لکھنؤ میں اصحاب ثلاثہ یعنی خلفائے راشدین کا احترام کرنا انکا نام عزت سے پکارنا قابل دست اندازی پولیس جرم ہے۔ اس لیے آپ ایسا نہ کریں مگر حضرت امیر شریعت دوران تقریر صحابہ کرام کا نام احترام سے ہی لیتے رہے اور انہوں نے دوران تقریر یہ بھی کہا کہ کسی شخصیت کا احترام کرنا اسکی عزت کرنا جرم نہیں ہوتا بلکہ گالی دینا جرم ہوتا ہے اور مجھے کسی قانون کی کوئی پرواہ نہیں میں اصحاب ثلاثہ کا عزت و احترام کرتا رہوں گا۔ حضرت امیر شریعت کی تقریر کے بعد کسی کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ وہ یوپی کے مجلس احرار کے دورہ کے بعد واپس لاہور پہنچ گئے۔ احرار ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں لکھنؤ والا واقعہ اور معاملہ پیش کیا۔ اور ورکنگ کمیٹی نے حضرت مولانا مظہر علی اظہر کو تحقیق کے لیے مقرر کیا۔ مولانا مظہر علی اظہر نے تحقیق کے بعد جو رپورٹ پیش کی وہ مختصر لفظوں میں درج ذیل ہے۔ 1905ء سے قبل لکھنؤ شہر میں شیعہ سنی بھائیوں کی طرح رہتے تھے اور تعزیہ کے جلوس میں شیعہ سنی اور ہندو مشترکہ شریک ہوتے تھے اور کسی قسم کی فرقہ وارانہ کشیدگی نہ تھی۔ سنیوں کی نسبت شیعہ حضرات لکھنؤ میں اکثریت میں تھے۔ میونسپل کمیٹی اور اسمبلیوں کے ممبر بھی شیعہ حضرات سے ہی ہوتے تھے۔۔ شیعہ مکتبہ فکر حصول چودھراہٹ کے لیے دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ نے باہر سے شیعہ مولوی منگوا لیا۔ جس کا نام مقبول احمد تھا یہ صاحب رامپور سے لکھنؤ تشریف لائے تھے اور ان صاحب نے شیعہ حضرات کو نئے نام سے پکارنا شروع کر دیا اور شیعہ سنی نفرت پیدا کرنی شروع کر دی اور ان صاحب کی کوشش سے 1906ء میں لکھنؤ شہر میں فساد کرا دیا یہ وہ شہر ہے جہاں کبھی ہندو مسلم فساد بھی نہیں ہوئے تھے مگر ان صاحب کی وجہ سے شیعہ سنی فساد ہو گیا۔ پہلے صرف ایک تعزیہ نکلتا تھا جس میں شیعہ سنی اور ہندو بھی شریک ہوتے تھے مگر شیعہ سنی فساد کی وجہ سے ہندوؤں نے تعزیہ میں شامل ہونا بند کر دیا۔ شیعہ جو تعزیہ میں شامل ہوتے تھے سر پاؤں ننگے ماتم کناں ہوتے تھے۔ سنی تعزیہ میں اپنے رواج کے مطابق عمل کرتے تھے۔ کوئی گتکہ کھیل رہا ہے' کوئی نعتیں پڑھ رہا ہے' کوئی کسی اور شغل میں مبتلا ہوتا تھا۔ شیعہ حضرات نے کہا کہ جو لوگ ہمارے ساتھ ہمارے کربلا میں جائیں گے وہ سر اور پاؤں سے ننگے ہونگے اس پر سنیوں نے شیعہ کربلا میں جانا بند کر دیا اور شہر کے باہر اپنا الگ کربلا بنا لیا اور جداگانہ جلوس نکالنا شروع کر دیا۔ جو شیعہ سنی فساد ہوا تھا اسکی تحقیق اور آئندہ کے تحفظ کے لیے ایک کمیشن قائم کیا گیا جس کے سربراہ ایک انگریز افسر مسٹر پکٹ تھے۔ پکٹ کمیشن نے 1909ء میں اپنی رپورٹ حکومت

کے سامنے پیش کی جس میں کہا گیا۔

نمبر1 آئندہ تعزیہ کے جلوس کو شیعہ سنی جلوس نہیں کہا جائے گا صرف تعزیہ کا جلوس کہا جائے۔

نمبر2 کربلا پھول کٹورا اور کربلا تال کٹورا جانے والے تعزیے ایک ہی راستے پر چلیں گے اور آگے جا کر اپنی اپنی کربلا کو چلے جاویں گے۔

نمبر3 عشرہ محرم چہلم اور 21 رمضان المبارک کے دنوں میں مدح صحابہ پر پابندی عائد کر دی گئی۔ وضاحت میں کہا گیا ان تین دنوں میں کوئی شخص ایسے اشعار یا نظمیں، مناجاتیں نہ پڑھیں جن میں حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کی مدح یا تعریف کی گئی ہو یہاں تک کہ کسی کو رضی اللہ تعالیٰ بھی نہیں کہہ سکتے۔

نمبر4 اشعار یا نظمیں تعزیوں یا کسی اسلامی جلوس کے راستے میں نہ پڑھی جائیں اور کسی ایسی جگہ بھی نہ پڑھی جاویں جہاں سے جلوس تک ان اشعار کی آواز پہنچ سکتی ہو۔

نمبر5 مجمع یا پبلک مقام پر ایسے مدحیہ اشعار نہ پڑھے جائیں۔

نمبر6 اگر کسی شخص نے مذکورہ بالا احکام کی خلاف ورزی کی تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے گا اور اس پر دفعہ 298 یا کسی مناسب دفعہ تعزیرات ہند کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔ پگٹ کمیشن کی سفارشات کو حکومت یو پی نے مان لیا اور من و عن نافذ کر دیا گیا۔ تال کٹورا شیعہ کربلا تھی، پھول کٹورا سنی کربلا تھی۔ پگٹ کمیشن کی مندرجہ بالا رپورٹ عشرہ محرم، چہلم اور 21 رمضان المبارک کے لیے مدح صحابہ منع تھی مگر عملی طور پر یہ سارے سال کے لیے منع ہو گئی تھی اس لیے کہ چہلم شیعہ حضرات بارہ مہینے مناتے رہتے ہیں پھر کوئی نہ کوئی جلسہ جلوس شہر لکھنؤ میں کسی نہ کسی وقت ہوتے ہی رہتے تھے اس لیے عملی طور پر مدح صحابہ لکھنؤ میں کسی وقت بھی نہ کی جا سکتی تھی۔ اور اس سارے بگاڑ میں 1937ء کے الیکشن نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ جس حلقہ انتخاب میں شیعہ حضرات زیادہ تھے وہاں تبرا بازی بھی کرتے تھے۔

ان حالات میں اس حد تک بھی بگاڑ پیدا ہو گیا کہ کسی سنی مسلمان کو بلا وجہ بھی اپنے کسی ذاتی عناد کی وجہ سے مدح صحابہ کا الزام لگا کر گرفتار کر دیا جاتا تھا۔ حضرت مولانا مظہر علی اظہر اور یو پی افراد کی رپورٹ مجلس احرار میں پیش کی گئی۔ جس پر فیصلہ ہوا مدح صحابہ میں یو پی حکومت کے خلاف تحریک چلائی جائے۔ اس فیصلے کے بعد لکھنؤ میں حکومت کے خلاف تحریک جاری کر دی گئی۔ یو پی کے مختلف شہروں سے اور پنجاب سے بھی احرار رضاکار لکھنؤ میں بطور تحریک مدح صحابہ پڑھنے جاتے۔ ریل گاڑی سے اتر کر شہر میں داخل ہوتے۔ بازاروں میں جا کر اونچی آواز میں یہ شعر پڑھتے

ہیں کرنیں ایک مشعل کی
ابو بکرؓ عمرؓ عثمانؓ علی
ہم مرتبہ ہیں یاران نبی
کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

یہی شعر اونچی آوازوں میں پڑھتے۔ پولیس انہیں گرفتار کرلیتی یہ تحریک تین ماہ سے زیادہ وقت تک چلتی رہی انہی ایام میں دسمبر 1937ء میں پانچویں شیعہ پولیٹیکل کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ جسکی صدارت اودھ کے آخری بادشاہ کے فرزند شہزادہ اکرام حسین نے کی۔ ایک قرارداد میں حکومت اور سنیوں کو متنبہ کیا کہ وہ شیعوں کے حقوق اور جذبات کا خیال رکھیں ہماری حیثیت کو عملاً" نظر انداز کیا جا رہا ہے اور یہ تحریک مدح صحابہ شیعوں کے خلاف ہے۔ ان کی سیاسی حیثیت کو ختم کرنے کے لئے چلائی جارہی ہے

مندرجہ بالا قرارداد کے جواب میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی صدر مجلس احرار اسلام نے ایک بیان جاری کیا کہ یہ قطعی غلط ہے کہ تحریک مدح صحابہ شیعوں کے خلاف ہے یہ اس غلط قانون کے خلاف ہے جو کہ مدح صحابہ کے خلاف بنایا گیا ہے۔ دنیا میں کوئی اخلاقی ضابطہ نہیں جو کسی شخص کو کسی اچھے شخص کی تعریف سے روکے اور گالیاں دینا قانون میں جائز قرار دیا جائے۔ جہاں تک شیعہ حضرات کا تعلق ہے ہماری جماعت کا جنرل سیکرٹری مولانا مظہر علی اظہر بھی شیعہ ہے اور وہ اس تحریک کی راہنمائی بھی کر رہے ہیں۔

اس تحریک میں یو پی کی جیلوں میں تقریباً ایک ہزار سے زائد افراد قید ہو چکے تھے۔ رضاکاروں پر سختیاں بھی کی گئیں۔ نومبر 1937ء کو گورنر یو پی نے مدح صحابہ کمیٹی کا ایک وفد حالات پر گفتگو کرنے کے لئے بلا بھیجا۔ کافی دیر بات چیت کے بعد گورنر نے اراکین وفد کو یقین دلایا کہ اہل سنت کے مطالبات پر شکایات پر غور کریں گے۔ بشرطیکہ تحریک مدح صحابہ بند کر دی جائے۔ گورنر سے ملاقات کے بعد لکھنؤ کے سنی اکابرین نے مجلس احرار سے درخواست کی کہ وقتی طور پر مدح صحابہ کی تحریک ملتوی کی جائے چنانچہ احرار راہنماؤں نے تحریک مدح صحابہ ملتوی کر دی۔ یہ فیصلہ یو پی مجلس احرار نے جناب محمد احمد کاظمی ایڈووکیٹ ممبر سنٹرل اسمبلی کی موجودگی میں کیا۔ گورنر یو پی نے جو وعدہ کیا تھا اس کے مطابق ایک کمیٹی قائم کر دی جس نے 10 جون 1938ء کو اپنی رپورٹ گورنر یو پی کے آگے پیش کر دی۔ گورنر یو پی نے اس وقت کے یو پی کے عارضی وزیر اعظم نواب چھتاری کو بھیج دی نواب صاحب بذات خود شیعہ تھے۔ انہوں نے یہ رپوٹ دبا دی۔

شیعہ پولیٹیکل کانفرنس

آل انڈیا شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کی سٹینڈنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس میں قرار دادیں منظور کیں۔ پہلی قرارداد میں لکھنؤ کے حالیہ واقعات پر افسوس کا اظہار کیا گیا۔ دوسری قرار داد میں تحریک مدح صحابہ کے ذریعے شیعوں سے ان کے قدیم حقوق چھیننے اور ان سے محروم کرنے کی سازش قرار دیا گیا۔ نیز حکومت یو پی سے درخواست کی گئی کہ وہ شیعوں کی حفاظت کرے جو اقلیت در اقلیت ہیں۔ تیسری قرار داد میں گزشتہ فسادات میں شیعوں کے صبر و تحمل کی داد دی گئی۔

نواب آف چھتاری کے یو پی وزیر اعلیٰ تین ماہ رہے مگر انہوں نے مدح صحابہ کے متعلق جو جھگڑا تھا اس کی طرف توجہ نہ دی کانگرس وزارت بن جانے کے بعد یو پی میں گوبند پنتھ کی حکومت بن گئی۔ شیعہ وفد گاندھی کے پاس گیا کہ وہ کانگرس حکومت کو کہیں کہ وہ تحریک مدح صحابہ کو کچل دیں۔ مہاتما گاندھی نے کوئی توجہ نہ دی اس لئے کہ چند روز قبل کانگرسی وزارتوں کو ہدایت کر چکے تھے وہ سادگی اختیار کریں اور حکمرانی کی مثال حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنھم کی حکومت کو بنائیں۔ شیعہ حضرات گاندھی جی سے مایوس ہو کر مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس گئے۔ مولانا آزاد نے معاملات کو سمجھنے سوچنے کا وعدہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جو آپ نے تبرا ایجی ٹیشن شروع کر رکھی ہے پہلے وہ بند کریں۔ انہیں ایام میں شیعہ حضرات نے تبرا ایجی ٹیشن بھی شروع کر رکھی تھی پنجاب سے شیخ کرامت علی جو نارووال کے شیعہ شیخ تھے اور قانون دان تھے۔ مسلم لیگ کے لیڈر بھی تھے۔ 1945ء کے الیکشن میں شیخ صاحب گوجرانوالہ سیالکوٹ کے حلقہ انتخاب سے پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے اور پاکستان بن جانے کے بعد پنجاب کے وزیر تعلیم بنے تھے وہ شیعہ رضاکاروں کو منظم کر کے تبرا ایجی ٹیشن کے لئے لکھنؤ بھیجتے تھے یہ رضاکار بازاروں میں گھوم کر اصحاب ثلاثہ کو گالیاں دیتے تھے اور حکومت انہیں کچھ نہیں کہتی تھی۔ بعض وقت امن عامہ میں خلل کے الزام میں پکڑے بھی جاتے تھے مگر اصحاب ثلاثہ کو لکھنؤ میں بر سر بازار گالیاں دینا کوئی جرم نہیں تھا۔ حکومت یو پی نے تبرا ایجی ٹیشن کے پیش نظر لکھنؤ اور مضافات میں دفعہ 144 نافذ کر رکھی تھی تاکہ فریقین میں تصادم نہ ہو۔ سنی مسلمانوں کو دفعہ 144 کے نفاذ سے کوئی نقصان نہیں تھا اس لئے کہ از روئے قانون انہیں صرف 12 ربیع الاول کو ہی مدح صحابہ پڑھنی ہوتی تھی جو دفعہ 144 کے باعث ختم ہو چکی تھی اور شیعہ حضرات اس نقصان کو محسوس کرتے تھے۔

یو پی میں کانگرس وزارت بن چکی تھی مجلس احرار نے کانگرس وزارت کو یاد دھانی کرائی تھی کہ تحریک مدح صحابہ کی طرف آپ نے توجہ نہیں دی اگر آپ کی لاپرواہی کا یہی عالم رہا تو احرار مجبور ہو جاویں گے کہ کانگرس وزارت سے ٹکر لیں۔ اس کے جواب میں کانگرس وزارت نے مولانا ابوالکلام آزاد پر یہ ذمہ داری ڈالی کی وہ لکھنؤ میں جاکر حالات کا جائزہ لیں اور حالات کو درست کرنے کی کوشش کریں۔ قبل ازیں شیعہ حضرات بھی مولانا آزاد کے پاس جا چکے تھے اس لیے مولانا آزاد حالات کا جائزہ لینے لکھنؤ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ مگر مولانا آزاد کو لکھنؤ میں دونوں فرقوں کے معاملات سلجھانے میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ تبرا ایجی ٹیشن اور تحریک مدح صحابہ بدستور جاری تھیں نقص امن کا اندیشہ بھی بدستور موجود تھا۔ سنی اور شیعہ علاقوں میں تعزیری چوکیاں بٹھانے کا پروگرام بھی بنا مگر سنی اسے نہ مانے دونوں طرف کے رضاکار اپنے اپنے موقف پر قائم تھے اور گرفتار ہو رہے تھے۔ کانگرس حکومت بھی اس کشمکش میں کافی پریشان تھی۔ بالآخر ایک کمیٹی قائم کر دی گئی جس کے صدر صوبے کے وزیر اعظم مسٹر پنتھ تھے اور وہ لکھنؤ میں ہی نہیں تھے۔ سنیوں نے تحریک مدح صحابہ مزید تیز کر دی اور بہت سے لوگ گرفتار ہوئے۔ وزیر اعظم سمیت تمام وزراء لکھنؤ پہنچ گئے اور فریقین

کی کانفرنس کی تجویز ہوئی۔ مگر گرفتاریاں بدستور جاری تھیں۔

کانگرس حکومت کے لئے بڑی مشکل تھی کہ وہ مسلمانوں کے کسی فرقہ کی حامی بن جائے اور اس نے بھی ٹال مٹول کی پالیسی اپنائی بلاخر مجلس احرار نے مولانا عبدالشکور کی معیت میں 12 اکتوبر 1939ء کو سہ بارہ مدح صحابہ پر سول نافرمانی کا فیصلہ کیا اور ساتھ ہی شیعہ پولیٹکل کانفرنس نے اپنے اجلاس یو پی میں فیصلہ کیا کہ اگر سینوں نے مدح صحابہ پڑھی تو شیعہ اس کے مقابل تبرا کریں گے۔ اصحاب ثلاثہ کو گالیاں دیں گے۔ اس کے بعد 11 نومبر کو پھر مجلس احرار نے یو پی حکومت کو تحریک کا نوٹس دیا اور کہا کہ حکومت کے گزشتہ فیصلے میں سنی مسلمانوں کو مدح صحابہ کا حق تسلیم کیا گیا تھا۔ مگر عملی طور پر مدح صحابہؓ کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

صوبہ یو پی میں کانگرس کی حکومت تھی کانگرس کو یہ قانون جس کے تحت مدح صحابہ لکھنؤ میں منع تھی ورثہ میں ملا ہوا تھا۔ جمیعت العلمائے ہند اور مجلس احرار حکومت سے اس سلسلہ میں گفتگو بھی کر رہے تھے۔ مگر بیل کسی منڈے چڑھ نہیں رہی تھی۔ تحریک یکم مارچ 1939ء تک ملتوی کی ہوئی تھی مگر جب احرار لیڈران کو پتہ چلا کہ حکومت کسی فریق کو ناراض نہیں کرنا چاہتی اس لئے یہ معاملہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے گا تو یکم مارچ سے قبل ہی دوبارہ تحریک مدح صحابہ شروع کر دی گئی۔ حضرت مولانا عبدالشکور کی زیر قیادت مدح صحابہ کا جلوس نکالا گیا۔ جس میں ایک سو لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا اسیران مدح صحابہ نے ضمانت پر رہا ہونے سے انکار کر دیا۔ دوسرے روز پھر سو رضاکاروں نے مدح صحابہ کرتے ہوئے گرفتاری پیش کی اور ساتھ ہی لکھنؤ کے شیعہ لوگوں نے بھی تبرا کا جلوس نکالا اور گرفتاری پیش کی اور کبھی مدہم کبھی تیز سنی مدح صحابہ کے لئے قربانیاں پیش کر رہے ہیں اور شیعہ تبرا یعنی اصحاب ثلاثہ کو گالیاں دینے کے لئے جلوس نکال رہے ہیں۔ گرفتاریاں پیش کر رہے ہیں۔ دوران تحریک مدح صحابہ 25 مارچ تک تقریبا چار ہزار سنی مدح صحابہ کرتے ہوئے گرفتاری پیش کر چکے تھے۔ تیس رضاکاروں کے ایک گروہ نے یو پی اسمبلی میں داخل ہو کر مسلمان ممبران کے خلاف نعرے لگائے اور انہیں غدار ملت کہا اس پر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت یو پی نے سنی حضرات کو 12 ربیع الاول کو مدح صحابہ کی اجازت دے دی اس پر شیعہ لوگوں نے تبرا ایجی ٹیشن شروع کر دی اور اس کے لئے پنجاب اور یو پی سے تبرا کرنے والوں کے جلوس آ رہے ہیں اور گرفتاریاں پیش کر رہے ہیں۔ یہ شیعہ سنی کش مکش جاری تھی تحریک مدح صحابہ چل رہی تھی کہ یورپ میں جنگ کے بادل نمودار ہو گئے۔ دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ جسکی وجہ سے سیاست میں تغیر پیدا ہو گیا۔ وائسرائے ہند نے جنگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ جس پر کانگرس مجلس احرار اور دیگر آزادی پسند جماعتوں نے احتجاج کیا کہ ہندوستان کے عوام کی مرضی پوچھے بغیر ہی وائسرائے ہند نے جنگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ اس قسم کے حالات کی وجہ سے سیاسی پارٹیوں کی توجہ عالمگیر جنگ کی طرف ہو گئی اور تحریک مدح صحابہ عدم توجہ کا شکار ہو گئی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد مجلس احرار نے پھر تحریک مدح صحابہ کی طرف توجہ دی۔ مجلس احرار کے جنرل سیکرٹری حضرت مولانا مظہر علی اظہر کے بیٹے قیصر مصطفیٰ ایڈووکیٹ کی زیر قیادت مدح

صحابہ کی تحریک کو دوبارہ چلانے کے لئے رضاکاروں کا ایک قافلہ روانہ کیا۔ جس کا سہارن پور میں بہت استقبال کیا گیا۔ مزید رضاکار وہاں سے بھی شامل ہوئے۔ گرفتاریاں دینے کے لیے یہ سارا قافلہ لکھنؤ گیا۔ سینکڑوں لوگوں نے گرفتاریاں پیش کیں۔ اس صورت حال کو وہاں کے انگریز گورنر نے محسوس کرتے ہوئے متنازعہ قانون میں ترمیم کر دی۔ جس سے سنی مطمئن ہو گئے اور تحریک مدح صحابہ کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئی۔

مجلس احرار اور جنگ عالمگیر دوم

ستمبر 1939ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ جرمن نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ ادھر روس کی فوجیں بھی پولینڈ میں داخل ہو گئیں۔ جرمن اور سوویت یونین نے مل کر پولینڈ پر قبضہ کر لیا۔ برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ برطانیہ کے جنگ میں شامل ہونے کا قدرتی نتیجہ تھا کہ ہندوستان بھی جنگ میں شامل ہو گیا۔ جب وائسرائے ہند نے حکومت برطانیہ کی اتباع کرتے ہوئے ریڈیو پر جنگ میں شمولیت کا اعلان کیا اور کہا کہ ہم اس وقت جرمنی کے ساتھ جنگ کی حالت میں ہیں تو اس پر ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں نے بھی اپنا رد عمل ظاہر کرنا تھا۔ مجلس احرار نے اس جنگ کو سامراج کے دو دھڑوں میں جنگ قرار دیا اعلان کیا کہ مجلس احرار اس جنگ میں حکومت کے خلاف عدم تعاون کرے گی اور ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیوں میں سب سے پہلے مجلس احرار نے ہی اپنی رائے حکومت کے خلاف دی تھی اور ایک تحریک چالو کر دی گئی مجلس احرار کی تنظیم ختم کر دی گئی۔ تحریک چلانے کے لئے ڈکٹیٹر مقرر کر دیے گئے۔ باقاعدہ ایک ترتیب قائم کر دی گئی کہ اگر ڈکٹیٹر 1 گرفتار ہو جاتا ہے تو 2 پر اس کی جگہ کون ڈکٹیٹر مقرر ہو گا اسی طرح صوبائی اور ضلعی اور شہری سطح پر ایجی ٹیشن کمیٹیاں قائم کر دی گئیں۔

جنگ میں عدم تعاون کا اعلان سب سے پہلے مجلس احرار نے کیا تھا۔ اس کے بعد جمیعت العلمائے ہند نے اعلان کیا کہ وہ جنگ میں حکومت کی ہر ممکن مخالفت کریں گے۔ کانگرس نے اعلان کیا کہ وہ سوچ رہے ہیں۔ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کے بعد ہی فیصلہ کریں گے۔ میٹنگ کے بعد کانگرس نے اعلان کیا کہ وائسرائے ہند کو کوئی حق نہیں کہ وہ اکیلا ہی یہ فیصلہ کر دے کہ ہندوستان جرمنی کے ساتھ برسرپیکار ہے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ مرکزی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا جاتا اور اس کی رائے سے ہی اگر ضروری ہوتا تو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا جاتا۔ دیگر یہ کہ کانگرس معلوم کرنا چاہتی ہے کہ اگر جنگ کے نتیجہ میں برطانیہ کامیاب ہوتا ہے تو غلام ہندوستان کی کیا حیثیت ہو گی۔ حکومت اعلان کرے کہ جنگ جیت جانے کی صورت میں ہندوستان کو بھی آزاد کر دیا جائے گا۔ دنیا کی باعزت اقوام میں شامل کر لیا جائے گا۔ وائسرائے ہند نے صرف اتنا جواب دیا کہ اس وقت توپوں جہازوں کی گرج کی آواز آ رہی ہے اس وقت صرف جنگی تدابیر پر ہی بات چیت ہو سکتی ہے۔ جنگ کے بعد ہندوستان کی

دیگر جماعتوں' فرقوں پر برطانوی مفادات کے نمائندان' والیان ریاست سے مشورہ کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں ترمیم و تبدیلی کے بعد کوئی قابل قبول حل نکالا جائے گا۔ فی الحال حکومت ہند ایک مجلس مشاورت قائم کرنا چاہتی ہے جس میں ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندہ اور والیان ریاست کے نمائندے شریک ہوں گے تا کہ ان کے مشورہ سے جنگی اقدامات کئے جا سکیں۔ کانگرس نے کچھ وقت کے بعد کئی مطالبات کرنے اور کئی اجلاس کرنے کے بعد جنگ میں عدم تعاون کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی احتجاج کرتے ہوئے مورخہ 8 نومبر 1939ء کو ہندوستان کے آٹھ صوبوں میں کانگرسی حکومتیں تھیں وہ بھی مستعفی ہو گئیں۔ صرف جنگ میں مسلم لیگ نے ہی انگریز سرکار کے ساتھ تعاون کا اعلان کیا اور مسلم لیگی نواب' سر اور خان بہادر گاؤں گاؤں پھر کے لوگوں کو جنگ میں بھرتی ہونے کی ترغیب دے رہے تھے۔ شاہنامہ اسلام کے مصنف خان بہادر حفیظ جالندھری جنگی ترانے لکھنے میں مصروف تھے۔ ان کے لکھے ہوئے گانے جنگی ترانے ریڈیو پر اکثر گائے جاتے تھے۔ "اڑوس پڑوس کیے جو کیے میں چھوکرے کو بھرتی کرائی آئی اے"۔ تو ان حالات میں احرار نے تحریک فوجی بھرتی کے خلاف اور سرکار کے خلاف عدم تعاون کی جاری کی تھی۔ ہر روز احرار ورکر لیڈر گرفتار ہو رہے تھے۔ مجلس احرار ہند نے 22 ستمبر کو امرتسر کے اجلاس میں اپنی ورکنگ کمیٹی توڑ دی اور اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ قائم کر دی۔ پہلا ڈکٹیٹر قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو نامزد کیا گیا۔ قاضی صاحب کے حکم پر تمام ہندوستان میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے خلاف یوم احتجاج منایا گیا۔ جس میں گیارہ ستمبر کی قرارداد جنگ عالمگیر میں حکومت کے ساتھ عدم تعاون اور سرکار کی مخالفت کو دھرایا گیا تھا۔ جماعتی انتظام قائم رکھنے کے لئے مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل کمیٹی قائم کی گئی۔ مولانا غلام غوث ہزاروی' مولانا عبدالقیوم پوپلزئی مفتی سرحد' سردار محمد شفیع سالار احرار' شورش کاشمیری' صاحب زادہ سلمان علاولپوری' مولانا محمد اسماعیل ذبیح' نواب زادہ محمود علی خان رئیس کلاش' حاجی محمد کامل اکمل سہارنپور' چوہدری عبدالستار دہلی' چوہدری عبدالغنی روہتک' حافظ علی بہادر ایم ایل سی بمبئی ایڈیٹر روزنامہ الہلال' سید بدرالدجی سابق میئر کلکتہ کارپوریشن' ڈاکٹر محمد عمر' مولانا محمد داؤد غزنوی اور چوہدری افضل حق کو الگ رکھا گیا تا کہ وہ جماعت کی نگرانی کر سکیں۔

احرار راہنما جگہ جگہ جلسے کرتے۔ فوجی بھرتی بائیکاٹ کے نعرے لگاتے' انگریز کے ظلم کی داستان لوگوں سے بیان کرتے' عوام میں سرکار کے خلاف نفرت پیدا کرتے' پھر گرفتار ہو جاتے۔ انہیں عدالتوں سے سزائیں سنائی جاتی تھیں۔ ہمارے گوجرانوالہ مدرسہ انوارالعلوم کے ایک طالب علم حافظ احمد یار جو کہ احرار کا بڑا پر جوش ورکر تھا۔ اس نے شیرانوالہ باغ کے ایک جلسہ میں شورش کاشمیری کی مشہور نظم پڑھی تھی جس کا پہلا مصرع ہے۔ اے لشکر ملت کے رضاکار جوانوں' آزادی کامل کے طلب گار جوانوں" اس نظم میں یورپ کی جنگ میں انگریز کی شکست کی پیشن گوئی کی گئی تھی۔ اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مقدمہ چلا تین ماہ سزا ہوئی تھی۔ حافظ احمد یار کا مقدمہ اور اس کی گرفتاری کا منظر قابل دید تھا۔ گرفتاری کے بعد تھانے سے جب کچہری لے جایا گیا تھا تو سینکڑوں لوگ عدالت میں اور

ارد گرد جمع ہو جاتے تھے۔ اللہ اکبر اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے تھے اور حافظ احمد یار نے رپورٹر کی غلط رپوٹنگ کی وجہ سے وہی نظم کمرہ عدالت میں اسی جوش و خروش کے ساتھ پڑھی جس طرح اس نے جلسہ گاہ میں پڑھی تھی تو لوگ داد تحسین دینے لگے۔ اک جوش ولولہ تھا' امنگ تھی مگر چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔ فوجی بھرتی کے خلاف جس قدر تحریک زور پکڑتی گئی اسی طرح گرفتاریاں بھی زیادہ تیزی سے ہونے لگ گئیں۔ 26 ستمبر کو امرتسر سے احرار لیڈران چوہدری افضل حق' جانباز مرزا اور مولانا عبدالسلام ہمدانی کو ڈیفنس آف انڈیا کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ ان دنوں چوہدری افضل حق ضمنی انتخابات لڑ رہے تھے جیسے ہی پولنگ ختم ہوا تینوں حضرات گرفتار کر لیے گئے۔ 26 ستمبر کو قاضی احسان احمد شجاع آبادی امرتسر سے گرفتار کر لیے گئے وہ مسجد خیرالدین سے نماز پڑھ کر نکلے ہی تھے کہ گرفتار کر لیے گئے۔ اسی وقت مسجد خیرالدین کے ارد گرد ہال بازار میں بھی ہزاروں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اللہ اکبر انقلاب زندہ باد کے نعروں کی گونج میں پولیس انہیں گرفتار کر کے لے گئی۔ 29 ستمبر تک احرار کے مندرجہ ذیل لیڈران گرفتار ہو چکے تھے۔ مولانا مظہر علی اظہر' سید عطاء اللہ شاہ بخاری' شورش کاشمیری' چوہدری افضل حق' شیخ حسام الدین' صوفی عنائیت محمد پسروری' حافظ یار محمد ملتان' سید ولایت شاہ بخاری' شیخ عبدالرشید' قاضی مسعود احمد انصاری' امیر حسین بخاری' مسٹر اقبال احمد ملتان' غلام نبی جانباز' مولانا گل شیر خان' حافظ حکیم عبدالمجید نابینا لائل پور' مولانا محمد ابراہیم تاندھیانوالہ' مولانا شیخ احمد بورے والا' مولوی محمد شفیع' جناب عنائت اللہ صاحب' مولانا ہدائت اللہ صاحب' مولانا عبدالسلام ہمدانی' قاضی احسان احمد شجاع آبادی' ملک عبدالغفور انوری ملتان۔ یہ تمام گرفتار شدگان احرار کے لیڈران میں سے تھے ان گرفتار شدگان کے علاوہ سینکڑوں احرار کارکن گرفتار ہو چکے تھے اور گرفتاریاں پیش کر رہے تھے۔ 1939ء کے خاتمہ تک مجلس احرار کے تقریباً دس ہزار لیڈر اور کارکن حکومت کے خلاف تحریک میں گرفتار ہو چکے تھے اکثر احرار لیڈروں اور کارکنوں کو دو سے پانچ سال تک کی سزائیں سنائیں گئیں۔

15 دسمبر کو یو پی اور پنجاب کی جیلوں میں احرار راہنماؤں اور کارکنان کے ساتھ ناروا سلوک کے خلاف یوم اسیران احرار منایا گیا۔ جس میں حکومت کی طرف سے احرار کارکنان پر جیلوں میں ناروا سلوک کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ فوجی بھرتی اور حکومت برطانیہ کے خلاف جس جرات اور ہمت سے مجلس احرار نے تحریک چلائی اس پر کانگرس کے سابق صدر کانگرس فارورڈ بلاک کے راہنما مسٹر سبھاس چندر بوس نے احرار لیڈران اور ورکروں کو مبارک باد پیش کی۔ احرار لیڈران ورکران کو خراج تحسین پیش کیا کہ وہ قوم کے سچے خادم ہیں اور بڑی بہادری سے قوم کی امنگوں پر قربانیاں پیش کر رہے ہیں۔ کانگرس نے بھی حکومت کے خلاف تحریک شروع کر دی اور حکومت کے ساتھ جنگی معاملات میں ہر قسم کے عدم تعاون کا اعلان کر دیا۔ انفرادی ستیہ گرہ کے ساتھ گرفتاریاں پیش کر رہے تھے احرار اور کانگرس کی تحریکیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں انہیں دنوں آل انڈیا مجلس احرار کے ڈکٹیٹر سردار محمد شفیع صاحب سالار اول مجلس احرار اسلام ہند نے سات جنوری 1940ء کو دہلی جامع مسجد سے گرفتاری پیش

کرنے سے قبل تقریر کی اور اس میں تحریک کے مقاصد بیان کیے اور جامع مسجد کے باہر انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ گرفتاری سے پیشتر سردار صاحب نے مولانا غوث ہزاروی کو ڈکٹیٹر نامزد کیا اور ماسٹر تاجدین انصاری کو سالار مقرر کیا۔ اسی طرح ہندوستان کی مختلف جگہوں سے مجلس احرار کے مزید لیڈران کو گرفتار کیا گیا جن میں گوجرانوالہ سے حضرت پیر سید فیض الحسن صاحب اور پشاور سے جنرل وہاب دین خان سالار مجلس احرار پشاور' مولانا حسین بخش ڈیرہ اسماعیل خان' مولانا فضل حق پشاور اور دیگر بہت سارے لیڈران کو مختلف جگہوں سے گرفتار کیا گیا۔ جو احرار لیڈر ورکر رضاکار گرفتاریاں پیش کرتے ان پر مقدمات چلتے سزائیں دی جاتی تھیں بعض لوگوں کو تھوڑی سزائیں ہوتی تو وہ رہائی کے بعد گرفتاری پیش کر دیتے تھے۔ یہ تحریک عملاً" تو اختتام جنگ تک جاری رہی احرار کے ہر جلسہ میں اجتماعی طور پر اور ہر ورکر انفرادی طور پر سرکار کے خلاف تشہیر کے عمل میں مصروف تھا۔ مگر 1941ء میں اس وقت کے ڈکٹیٹر حضرت مولانا غلام غوث ہزاوری نے اخبارات میں اعلان کیا کہ فی الوقت تحریک معطل کی جاتی ہے اور ڈکٹیٹری نظام ختم کیا جاتا ہے اور جماعت کو دوبارہ منظم کیا جاتا ہے اور بعد میں پھر تحریک جاری کی جائے گی۔ سال 1941ء کے وسط میں بہت سارے احرار کے سیاسی قیدی رہا ہو چکے تھے مگر یو پی میں بدستور احرار کارکن گرفتاریاں پیش کر رہے تھے۔ انہیں دنوں دہلی میں احرار تبلیغ کانفرنس ہوئی جس میں صوبہ یو پی اور دیگر علاقے کے لوگوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کی پہلی نشست کی صدارت چوہدری افضل حق نے کی۔ چوہدری صاحب نے مسلمانوں کی اخلاقی' مذہبی اور سیاسی پسماندگی کا تذکرہ بڑے دل نشیں انداز میں کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ مجموعی طور پر مسلمان ذہنی طور پر عیاش واقع ہوا ہے وہ سیاسی شعلہ بیان مقررین کی تقریریں سنتا ہے تو ندامت سے سر جھکا لیتا ہے اپنی کمزوریوں پر شرمندہ ہوتا ہے واعظین خوش بیان کا واعظ سنتا ہے مگر جب چوپال میں بیٹھ کر حقے کا کش لگاتا ہے یا تنہائی میں سگریٹ کے ایک کش میں ہی یہ سب اثرات زائل کر دیتا ہے۔ پھر تازہ بتازہ اسی سابقہ ڈگر پر رواں دواں ہو جاتا ہے۔

انہیں ایام میں مولانا مظہر علی اظہر کو ڈیڑھ سال کی قید کے بعد رہا کر دیا گیا۔ وہ جب لاہور پہنچے تو انکا بہت شاندار استقبال کیا گیا اور چند روز بعد سیالکوٹ میں مجلس احرار نے تین روزہ کانفرنس منعقد کی۔ جسکی صدارت مولانا مظہر علی اظہر نے کی خطبہ صدارت میں مولانا مظہر علی اظہر سے آنے والے وقت کے لیے ہندوستان کے

آئینی مسائل پر تقریر کی اور ہندؤں کی چھوت چھات کے رویئے کی مذمت کی۔ ایک قرارداد میں جیلوں میں اسیران کے ساتھ جبر تشدد کی مذمت کی۔ دوسری قرارداد میں قادیان میں مرزائیوں کے فسادانہ رویئے کی مذمت کی گئی۔

قصور میں احرار کانفرنس

1941ء میں بھی قصور میں احرار کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت شیخ حسام الدین نے کی۔ وہ چند روز قبل ہی رہا ہو کر آئے تھے۔ اس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے حضرت مولانا حبیب الرحمن نے کہا کہ ہندو مسلم جھگڑے کا حل ماسوائے اور کوئی نہیں کہ ہندو چھوت چھات ترک کر دیں۔ جب تک ہندؤں میں چھوت چھات رہے گی فرقہ ورانہ فساد بھی ہوتے رہیں گے اور بلاخر شائد ہندوستان بھی تقسیم ہو جائے۔

اسی کانفرنس میں چوہدری افضل حق نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ انتہا درجے کے تنگ دل متعصب فرقہ پرست تمہیں فرقہ پرست کہیں گے انکی پرواہ نہ کرو۔ کاروان احرار کو اپنی منزل کی طرف چلنے دو۔ احرار کا وطن لیگی سرمایہ داروں کا پاکستان نہیں نہ کانگرس اکھنڈ ہندوستان بلکہ وہ سرزمین ہے جہاں لوگوں میں درجے نہ ہوں بلکہ انسانیت کا ایک درجہ ہو احرار کا وطن وہ ہے جہاں کوئی اچھوت نہ ہو جہاں انسانوں کو ذلیل سمجھنے والے ذلیل سمجھے جاویں۔ جہاں غریبوں کو لوٹنے والے لوٹ لئے جاویں۔ اور لوگوں کو کام پر لگا کر انکی ضرورتوں کے مطابق معیشت ہو' جہاں ہر کوئی اپنی تہذیب اور مذہب کے مطابق ترقی کرنے میں آزاد ہو' جہاں نظام حکومت کامل مساوات پر قائم ہو' جہاں سرمایہ دارانہ نظام کی طرح قانون غریب کو چکی میں نہ پیس سکے اور امیر قانون پر حکومت نہ کر سکے۔ جب تک اقلیت اور اکثریت کا موجودہ مفہوم نہیں بدلے گا امن قائم نہیں ہو گا۔ جنوری 1942ء کو مجلس احرار کے عظیم راہنما چوہدری افضل حق اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ انکی وفات پر مجلس احرار کے علاوہ ہندوستان کے سبھی آزاد خیال لوگوں نے رنج و الم کا اظہار کیا۔

چوہدری افضل حق کی موت پر 40 یوم تک مجلس احرار کے پرچم سرنگوں رہے اور انکے سوگ میں شہروں' قصبوں' دیہاتوں اور مساجد میں مجالس قائم کی گئی اور انکی مغفرت کی دعائیں کی گئی۔

1942ء میں مجلس احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ہندوستان کی موجودہ سیاسی صورت حال پر غور کیا گیا۔ ایک قرارداد منظور کی جس کا مفہوم یہ ہے احرار نے ستمبر 1939ء میں یورپ کی جنگ کے شروع میں امرتسر میں ایک اجلاس میں فیصلہ کیا تھا کہ جنگ میں انگریز حکومت کے خلاف عدم تعاون کیا جائے' فوجی بھرتی نہ دی جائے۔ عدم تعاون اور فوجی بھرتی کے خلاف تحریک چلائی جائے۔ یہ قرارداد اپنی جگہ موجود ہے۔ ابھی تک حکومت برطانیہ نے نہ تو ہندوستان کی آزادی کا وعدہ کیا ہے اور نہ ہی مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کو آزاد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ ظل وقت نے حالات رونما ہو

جانے کی وجہ سے تحریک عدم تعاون کو معطل رکھتے ہوئے ورکنگ کمیٹی کا نئے حالات پر غور کرنے کے لیے اجلاس بلایا گیا ہے۔

نمبر1 جرمنی کا سویت یونین کے خلاف بر سرپیکار ہونے کی وجہ سے جنگ کا نقشہ بدل گیا۔

نمبر2 مشرق بعید پر جاپان کا قبضہ ہو جانے کی وجہ سے جنگ ہندوستان کے دروازے پر آ گئی ہے۔ کلکتہ پر جاپانی بمباری بھی کر چکے ہیں۔ ان حالات میں مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ ابھی تحریک عدم تعاون کو معطل رکھا جائے۔

نمبر3 کرپس مشن ہندوستانی لیڈران سے آزادی کے مسئلہ پر بات چیت کرنے آ رہا ہے جس کے نتائج کا انتظار کیا جائے۔

نمبر4 مجلس احرار دونوں بڑی جماعتوں کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈران سے اپیل کرتی ہے کہ وہ کوئی ایسا فارمولہ تیار کریں جس پر متفقہ طور پر فیصلہ کریں تاکہ وطن کو آزادی کی نعمت حاصل ہو۔

10 اگست 1942ء احرار کے مرکزی دفتر سے تمامتر دفاتر احرار کو ہدایت کی کہ اگست کو احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہو رہا ہے اس وقت تک کسی سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ نہ لیں۔

18 اگست 1942ء کو لاہور میں احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ستمبر 1939ء کے اقدام سول نافرمانی کو قائم رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی جس کا مطلب یہ ہے کہ ملک کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر جبکہ مہنگائی بھی بہت زیادہ ہو چکی ہے غلہ کی کم یابی بھی بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ ملک میں ان وجوہات اور بیرونی حملہ جو کہ کلکتہ میں جاپانی جہازوں نے کیا ہے اسکے پیش نظر تحریک سول نافرمانی کو بند کرتی ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جیل میں مختلف امراض میں مبتلا تھے جس میں شوگر' اختلاج قلب' خونی بواسیر و دیگر بہت تکالیف میں مبتلا تھے۔ مجلس احرار نے یوم مولانا حبیب الرحمٰن منایا اور انکی رہائی کی اپیل کی گئی۔

مجلس احرار نے اپریل 1943ء میں سہارنپور میں کانفرنس منعقد کی یہ کانفرنس بڑی دل نشین تھی۔ ایک قرارداد کے ذریعے گرفتار احرار کارکنوں اور لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ ایک قرارداد میں مجلس احرار کے ہفت روزہ اخبار "افضل" کے کاغذ کا کوٹہ بڑھانے کا مطالبہ کیا گیا۔ ایک قرارداد میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا گیا۔ ایک قرارداد میں چوہدری افضل حق' اہلیہ مولانا ابوالکلام آزاد' والدہ چوہدری افضل حق اور دیگر مرحومین کی دعا مغفرت کی گئی۔

1931ء جب سے مجلس احرار معرض وجود میں آئی تھی احرار کا ممبر جمیعت علمائے ہند کا ممبر کانگرس کا ممبر بن سکتا تھا مگر 1943ء میں جماعت احرار نے فیصلہ کیا کہ احرار کا ممبر کسی دوسری جماعت کا ممبر نہیں بن سکتا اور فیصلہ ہوا کہ احراد کا ممبر جماعتوں سے اشتراق مجلس طور پر تو ہو سکتا ہے مگر انفرادی طور پر کوئی احرار کارکن کسی دوسری جماعت سے اشتراق نہیں کر سکتا اور دیگر یہ کہ ہندو مسلم فرقہ وارانہ رجحانات پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔

بنگال کا قحط

1943ء میں بنگال میں قحط پڑ گیا۔ قحط کیوں پڑا اسکے متعلق سیاست دانوں کی رائے یہ تھی کہ بنگال اور آسام پر جاپانی حملہ کے خطرہ کے پیش نظر کہ اگر جاپانی قبضہ کر لیں تو جاپانی غلہ وغیرہ ساتھ نہ لے جاویں۔ سرکار نے ان علاقوں سے غلہ دوسرے علاقوں میں منتقل کر دیا اور کچھ جنگی ضرورت کے لیے جمع کر لیا۔ اس وجہ سے بنگال میں قحط پڑ گیا۔ جس سے لاکھوں لوگ بھوک سے مر گئے۔ ان قحط زدہ لوگوں کی امداد کے لیے مجلس احرار پنجاب سے فنڈ جمع کر کے غلہ خرید لیا گیا اور دیگر کئی چیزیں خرید کیں اور بنگالی بھائیوں کی امداد کے لیے دو تین دفعہ وفود روانہ کئے

دہلی احرار کانفرنس میں حکومت الٰہیہ کے مقصد کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا جس میں کہا گیا کہ حکومت کا مقصد ہے لوگوں میں قرآن و سنت کے مطابق حکومت قائم کرنا اور ساتھ مجلس احرار کے کارکنوں کو نماز روزہ کی ہدائیت کی گئی۔ کارکنوں کو داڑیاں رکھنے اور اسلامی وضع بنانے کی ہدائیت کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں مولانا عزیزالرحمٰن لدھیانوی نے امریکہ اور برطانیہ کے اس ارادے کی مذمت کی جس کے تحت فلسطین کو وطن یہود بنایا جا رہا تھا اور قرارداد میں کہا گیا کہ اسلامیان ہند فلسطین کو وطن یہود بنانے کو کسی صورت بھی قبول نہیں کریں گے اور امریکہ اور برطانیہ کی مذمت کرتے رہیں گے۔

نمبر2 دوسری قرارداد میں قحط بنگال میں احرار وفد کی کارکردگی کو سراہا گیا۔ تعریف کی گئی

تیسری قراردار میں مولانا حبیب الرحمٰن کی مسلسل قید کی مذمت کی گئی اور حکومت پنجاب سے انکی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔

1943ء کے ایام میں ہی مجلس احرار کے شعلہ بیان مقرر حضرت مولانا گل شیر خان کو انکے گھر میں قتل کر دیا گیا یہ احرار جماعت کا بہت بڑا نقصان تھا۔ مولانا گل شیر بہت نیک، زاہد اور مجاہد کے علاوہ شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ انہیں ایام میں مجلس احرار کی توجہ سوامی دیانند سرسوتی کی کتاب ستیارتھ پرکاش پر پڑی۔ اس کتاب میں مذہب اسلام کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسکے خلاف مجلس احرار نے تحریک چلائی کہ ستیارتھ پرکاش پر پابندی لگائی جائے "تقریباً" ہر جلسہ میں ستیارتھ پرکاش پر پابندی لگانے کی مانگ کی جاتی تھی مگر حکومت نے یہ مطالبہ منظور نہیں کیا بھارت میں آج بھی یہ کتاب عام فروخت ہوتی ہے ہر جگہ مل سکتی ہے سوامی دیانند اریہ سماج کے پروہت تھے

نئے حالات

جنگ کے بادل چھٹ چکے تھے جرمنی شکست کھا چکا تھا۔ جاپان پر ایٹم بم گر چکا تھا۔ ملکی

سیاست پر رنگ و روپ چڑھ رہے تھے مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان عروج پر تھا۔ بڑی کامیابی کے ساتھ مسلم لیگ آگے بڑھ رہی تھی۔ انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا ملک کا امن درہم برہم ہوتا نظر آنے لگ گیا تھا۔ فرقہ واریت کا بھوت میدان عمل میں آ چکا تھا۔ تمام سیاسی قیدی جیلوں سے باہر آ چکے تھے۔ سیاسی جماعتوں نے الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا ہوا تھا۔ قوم پرست پارٹیوں نے بھی اپنا ایک پارلیمانی بورڈ قائم کیا تھا۔ شیخ حسام الدین صدر مجلس احرار اسلام اس مسئلہ پر حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے بات چیت بھی کر چکے تھے۔ دہلی میں نیشلسٹ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کا اجلاس ہوا تھا جس میں مجلس احرار کے علاوہ سرحد سے خدائی خدمت گار بھی شامل ہوئے تھے۔ جمیعت علمائے ہند' آل انڈیا مسلم کانفرنس' آل انڈیا مومن کانفرنس اور دیگر چھوٹے چھوٹے گروپ بھی اس اجلاس میں شامل ہوئے تھے۔ جس میں مشترکہ امیدوار کھڑے کرنے کا مسلم لیگ کے مقابلے میں فیصلہ کیا گیا تھا۔

مجلس احرار نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز 8-9 دسمبر 1945ء کو باغ بیرون دہلی دروازہ میں ایک بہت بڑے اجتماع میں کیا۔ جو مجلس احرار نے منعقد کیا تھا جس کی صدارت شیخ حسام الدین فرما رہے تھے۔ حضرت مولانا امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ہندوستان جیسے کثیر المذاہب' کثیر القوم ملک میں نہ پاکستان بن سکتا ہے اور نہ ہی حکومت الٰہیہ قائم ہو سکتی ہے اور پاکستان کا نعرہ صرف لوگوں سے ووٹ کی بھیک مانگنے کے لیے لگایا گیا ہے۔ اسی اجلاس میں احرار نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا۔ مولانا مظہر علی اظہر نے اپنی تقریر میں پنجاب سے 28 احرار کے امیدواروں کے نام بتائے جو آنے والے الیکشن میں حصہ لیں گے جن میں مولانا مظہر علی خود بھی شامل تھے اور اسی تقریر میں انہوں نے کہا تھا کہ محمد علی جناح کی بیوی پارسی تھی اور اس کی بیٹی بھی پارسی ہے اور جناح نے نکاح نہیں کیا تھا کورٹ میرج کیا تھا کورٹ میرج ازروئے اسلام کفر ہے۔ پھر انہوں نے مندرجہ ذیل شعر پڑھا تھا۔

ایک کافر عورت کے لیے اپنے دین کو چھوڑا
یہ قائد اعظم ہے یا کافر اعظم ہے

راقم الحروف کی عمر اس وقت تقریباً" 19 سال تھی۔ ذہنی وابستگی بھی مجلس احرار کے ساتھ تھی۔ احرار کے جلوسوں میں جایا کرتا تھا۔ مجلس احرار کے لیڈران پاکستان کو ناقابل عمل کہتے تھے۔ پاکستان کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ گوجرانوالہ احرار کانفرنس سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ پاکستان کے مطالبے کے پیچھے خون کا دریا بہہ رہا ہے یہ خون انسانوں کا ہے بے گناہ انسانوں کا خون اتنے خونیں دروازے کے نیچے سے میں نہیں گزر سکتا۔ میں اتنے بے گناہ لوگوں کے خون کی حمایت نہیں کر سکتا پھر کائنات نے دیکھا کہ لوگوں نے دیکھا کہ اسی پنجاب کی سرزمین لاکھوں بے گناہ انسانوں کے خون سے رنگین ہوئی۔ اسی جلسہ میں حضرت امیر شریعت نے فرمایا تھا کہ پاکستان ایک حصہ مشرق میں ہو گا ایک مغرب میں ہو گا درمیان میں وسیع و عریض حصہ پر بھارت کی حکومت ہو گی بھارت کے ساتھ جنگ کی صورت میں مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کی امداد نہیں کر سکے گا اور نہ ہی

مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کی امداد کر سکے گا اور بلاخر دنیا نے دیکھا کہ جنگ میں دو حصے ہی ایک دوسرے کی امداد نہیں کر سکے۔ اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ احرار والوں نے الیکشن میں بھرپور حصہ لیا بڑی بڑی کانفرنسیں ہوئی جلسے ہوئے مگر الیکشن کے نتیجہ میں مجلس احرار کو پنجاب اسمبلی میں کوئی سیٹ بھی نہ ملی۔ دوسری جگہوں پر بھی مجلس احرار کسی جگہ بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ لوگوں نے مسلم لیگ کو ووٹ دے کرر پاکستان کو ووٹ دے دیا۔ بلاخر پاکستان بن گیا۔ مجلس احرار نے پاکستان بن جانے کے بعد 1948ء میں لاہور میں ایک بہت بڑی کانفرنس کی جس میں اعلان کیا کہ پاکستان بن چکا ہے ہم نے پوری دیانت داری سے پاکستان کی مخالفت کی تھی مگر عوام کے فیصلے کو ہم مانتے ہوئے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ پاکستان قبول کرتے ہیں پاکستان کی وفاداری کا حلف اٹھاتے ہیں۔ ہماری سیاست ناکام ہوئی اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ مجلس احرار بحیثیت سیاسی جماعت کے ختم کرتے ہیں جس کسی نے سیاست کرنی ہے وہ مسلم لیگ میں چلا جائے آج سے ہم صرف تبلیغ کریں گے صرف دینی کام کریں اور مرزائیت کے خلاف محاذ قائم کریں گے۔

تنقید تبصرہ

مجلس احرار بہادر لوگوں کی جماعت تھی۔ پیشتر جو لوگ مجلس احرار کے لیڈر بنے وہ کانگرس اور خلافت کے ساتھ وابستہ تھے۔ انہوں نے جدوجہد آزادی میں بڑی قربانیاں دیں ہیں اور کسی وقت بھی وہ لوگ حکومت کے آگے جھکے نہیں' خوف زدہ نہیں ہوئے۔ تحریک خلافت تقریبا" دس سال بڑے بھرپور انداز سے اس ملک میں چلائی گئی۔ خلافت مسلمانوں کا انفرادی مسئلہ تھا مگر ہندو بھی اس تحریک میں مسلمانوں کے معاون تھے۔ یہ واحد تحریک تھی جس میں ہندو اور مسلمانوں نے ملکر جدوجہد کی۔ تحریک خلافت کے ایک وقت میں گاندھی جی بھی صدر رہے۔ ترکی خلافت خود بخود ختم ہو جانے کے بعد یہ تحریک خلافت مزید چلانے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا۔ اسی وجہ سے 1929ء میں جب راوی کے کنارے لاہور میں آل انڈیا کانگرس کا اجلاس ہوا تو اس میں احرار کونشن ہوا اور جماعت معرض وجود میں آئی۔ یہ جماعت احرار اس لیے بھی بنی تھی کہ خلافت ختم ہو جانے کے بعد پنجاب میں ایک جماعت کی ضرورت تھی جو تحریک آزادی کی ساتھ ساتھ مسلم حقوق کی بات بھی کرے۔ احرار 1931ء میں تحریک کشمیر میں متحرک ہوئے۔ مہاراجہ کشمیر کے خلاف تحریک چلائی۔ تحریک کشمیر میں مجلس احرار کا جو تصور لوگوں میں بنا وہ فرقہ واریت کا تھا۔ پھر مجلس احرار نے مسجد شہید گنج کی تحریک میں شامل نہ ہو کر قومی اور سکولر تصور قائم کیا۔ پھر احرار تحریک مسجد شہید گنج میں خود بھی شامل ہو گئے۔ جس کا سیاسی فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ مجلس احرار کا ممبر کانگرس کا ممبر بھی بن سکتا تھا۔ 1943ء تک مشترکہ ممبر شپ جاری رہی مگر اس کے بعد احرار کانگرس کے اشتراک سے الگ ہو گئے۔ احرار کے پاس بہترین شعلہ بیان مقرر تھے جنہیں لوگ سننے کے لیے جوک در جوک احرار کے جلسوں میں جایا کرتے تھے۔ بلکہ 1940ء

سے لے کر 1947ء تک مجلس احرار کے جلسوں میں بہت لوگ ہوا کرتے تھے میں نے زندگی میں صرف احرار کے جلسوں میں شمولیت بذریعہ ٹکٹ دیکھی تھی۔ جلسہ گاہ کے باہر باقاعدہ ٹکٹ گھر ہوتا تھا اور لوگ ٹکٹ لے کر جلسہ میں شمولیت کیا کرتے تھے ٹکٹ کا اہتمام بڑی کانفرنسوں میں ہوا کرتا تھا کانفرنس کے آخری اجلاس جس میں امیر شریعت نے بولنا ہوتا تھا اس وقت جلسہ کے پنڈال کی قناتیں گرا دی جاتی تھیں اور پھر ہر شخص جلسہ میں شمولیت کر لیتا تھا۔ احرار کی لیڈر شپ غریب یا درمیانہ درجے کے لوگوں پر مشتمل تھی عام ورکر غریب گھرانوں سی ہی تعلق رکھتے تھے چند رئیس لوگ بھی احرار میں تھے۔ مگر بہت تھوڑے جو انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے احرار ورکران کی سیاسی سوجھ بوجھ جذباتیت کی حد تک ہوا کرتی تھی احرار ورکران اکثریت سے حضرت امیر شریعت کے عشق کی حد تک گرویدہ تھے اور جو زندہ ہیں وہ آج تک انہیں کا وظیفہ کرتے ہیں۔ احرار کے مقرر اپنی قوت خطابت سے لوگوں میں سکتہ طاری کر دیا کرتے تھے۔ انکو خطابت کے فن پر عبور حاصل تھا وہ پل بھر میں لوگوں کو رولا دیا کرتے تھے ہنسا بھی دیا کرتے تھے۔ حضرت امیر شریعت جب قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کائنات ساقت ہو گئی ہے لحن دوودی کی جھلک انکی تلاوت اور خطابت میں نظر آیا کرتی تھی۔ حضرت قاضی احسان احمد شجاع آبادی شورش کاشمیری اور حضرت مولانا گلشیر خان صاحبان بڑے ہی پائے کے خطیب تھے۔ جس شہر میں احرار کانفرنس ہوا کرتی تھی شہر میں احرار کے جلسہ گاہ پنڈال باہر سے آئے ہوئے مندوبین کی ننت باہر سے آئے ہوئے احرار رضاکاروں کے ٹکٹ اور دیگر ضروریات کے ننت ان وجوہات کی بنا پر جلسہ گاہ ایک الگ شہر کا نقشہ بن جاتا تھا پھر اس شہر میں رضاکار سرخ وردیوں میں ملبوس شہر میں پریڈ کرتے تھے اور ان کے آگے احرار رضاکاروں کے بینڈ بھی ہوا کرتے تھے ایسا محسوس ہوا کرتا تھا کہ سرخ کائنات سمٹ کر اس شہر میں آگئی ہے۔

مجلس احرار کے جلسوں میں جہاں درس آزادی دیا جاتا تھا لوگوں کو انگریز کے خلاف ابھارا جاتا تھا۔ برطانوی سامراج کے خلاف نفرت پیدا کی جاتی تھی وہاں یہ بھی تھا کہ سابقہ وقتوں کے مسلم بادشاہوں کے قصیدے بھی پڑھے جاتے تھے۔ ان ظالم بادشاہوں کی صفائی پیش کی جاتی تھی غیر مسلم یا وہ مسلمان جو ظالم بادشاہوں کو اپنے ذہن میں اچھے نہ سمجھتے انکے آگے ظالم بادشاہوں کی صفائی بھی پیش کی جاتی تھی۔ راقم الحروف نے اپنے کانوں سے ایک جلسہ عام میں حضرت امیر شریعت نے محمود غزنوی کی بہت تعریف کی ہندو لوگ محمود غزنوی کی مخالفت کرتے ہیں انکی مذمت کی گئی تھی۔ حور حرم فلم ظالم مسلمان بادشاہ کے کردار کے خلاف تھی۔ مجلس احرار نے امرتسر کے جس سینما میں یہ فلم دکھائی گئی تھی اس سینما کے خلاف ایجی ٹیشن کی تھی غرض سابقہ دور کے مسلمان بادشاہ چاہے وہ کتنے ہی ظالم ہوتے تھے احرار کے جلسوں میں اگر وہ ضرورت محسوس کرتے تو انکی تعریف کی جاتی تھی۔ گویا احرار مسلم بادشاہوں کے صفائی کے گواہ بھی اکثر بن جایا کرتے تھے۔

یہ احرار پر ہی منحصر نہ تھا دیگر علما حضرات جنکا تعلق دیو بندی مکتبہ فکر سے ہے وہ بھی اکثر مسلم ظالم بادشاہوں کے قصیدے پڑھتے رہتے ہیں ممبر پر خطبہ جمعہ میں مسلمان بادشاہوں کو زمین پر اللہ کا

سائیہ کہتے ہیں جب ہم ان ظالم مسلم بادشاہوں کی تعریف کریں گے تو ظلم بڑے گا حاکم وقت بھی زیادہ ظلم کریں گے اس لیے کہ وہ یہ دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ گزرے ہوئے ظالم حکمرانوں کی تعریف ہو رہی ہے اور وہ سمجھتے ہیں ظلم کرنا ہی حکمرانی کا سب سے بڑا گر ہے اور ظلم کرنے سے رعیت پر رعب بھی بڑھتا ہے۔ برسر ممبر بھی تعریف کی جاتی ہے۔ احرار مسلمان ظالم حکمرانوں کی تعریف اور غیر مسلم حکمرانوں کی مذمت کرتے تھے۔ اسکا سیاسی فائدہ انہیں نہیں ملتا تھا وہ مسلم لیگ والوں کے کھاتے میں چلا جاتا تھا۔ ہندو راجوں کشمیر کپور تھلہ اور الور ریاست کے خلاف تو کاروائی کی اور تحریک بھی چلائی مگر ریاست بہاولپور کے خلاف شکایات ہوتے ہوئے بھی کوئی سنجیدہ کاروائی نہیں کی گئی۔ 1949ء میں بحیثت سیاسی جماعت احرار کے خاتمہ کے وقت احرار ورکر مختلف جماعتوں میں چلے گئے بہت سارے احرار ورکر جو حکومت الیہ کو حقیقت کے آئینے میں دیکھتے تھے وہ جماعت اسلامی میں چلے گئے اور جو لوگ درمیانہ درجے کی سوچ رکھتے تھے مذہبی بھی تھے اور ساتھ ہی سکولر قوم پرست بھی تھے وہ عوامی لیگ میں چلے گئے۔ بہت تھوڑے ورکر آزاد پاکستان پارٹی میں بھی شامل ہوئے اور بہت سارے ورکر تحفظ ختم نبوت کے ساتھ وابستہ ہوئے اور مرزائیت کے پیچھے لٹھ لیے مرزائیوں کا تعاقب کرنے لگ گئے۔ احرار ورکر بہادر نڈر اور مخلص تھے وقت کے ساتھ ڈھل جانے کا فن انہیں نہیں آتا تھا۔ مجموعی طور پر انکا ذہن ایک وقت میں مذہبی بھی تھا اور سکولر بھی تھا۔ تقسیم ہند سے قبل سیاست بکاؤ مال نہیں تھا جس جگہ بھی سیاسی کارکن تھا وہ پختہ عقیدے اور پختہ ارادے کے ساتھ تھا کارکنوں میں ایک ولولہ اور ایک جوش ہوتا تھا اس میں وہ مگن رہتے تھے۔ آنے والے وقت کے حسین خوابوں میں محو رہتے تھے۔ احرار کارکن زیادہ غریب مزدور تھے جب انہیں پتہ چلتا کہ کوئی احرار کانفرنس کسی شہر میں ہونے والی ہے تو اسمیں شمولیت کی تیاری شروع کر دیتے۔ زاد راہ کے لیے پیسے جمع کرتے' وردی اور کلہاڑی صاف ستھری کرتے' کانفرنس میں شمولیت انکے جذبے کا ایک حصہ ہوتا غالبا" انکا کسی احرار کانفرنس میں شامل ہونا سب سے خوش کن تہوار ہوتا تھا۔

سرخ قمیض خاکی شلوار اور کندھے پر کلہاڑی احرار رضاکار کا یونیفارم تھا۔

مجلس اتحاد ملت عرف نیلی پوش

مجلس اتحاد ملت نیلی پوش جماعت کے بانیاں اور لوگوں کے علاوہ سرکردہ راہنماؤں میں حضرت مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر روزنامہ زمیندار لاہور' سید حبیب صاحب ایڈیٹر روز نامہ سیاست لاہور ملک لعل خان گوجرانوالہ بھی شامل تھے۔ یہ جماعت 1935ء میں حصول مسجد شہید گنج کے لئے بنائی گئی تھی۔ جماعت خاکسار اور مجلس احرار کی طرح اس جماعت نے بھی ایک رضاکار تنظیم قائم کی تھی۔ احرار رضاکار سرخ وردی پہنتے تھے۔ خاکسار رضاکار خاکی وردی پہنتے تھے۔ مجلس اتحاد ملت نے اپنے رضاکاروں کیلئے نیلی وردی تجویز کی تھی اس لئے یہ رضاکار بوقت ضرورت نیلی قمیض شلوار وغیرہ پہنتے تھے۔ اس وجہ سے اس جماعت کو نیلی پوش بھی کہا جاتا تھا۔ بانیاں جماعت نے حصول مسجد شہید گنج کے لئے ہی یہ جماعت بنائی تھی۔ 1935ء ایکٹ کے بن جانے کی وجہ سیاست کی راہیں فرقہ واریت کی طرف مڑ گئیں تھی اس وجہ سے ہر وہ جماعت مسلمانوں میں جو سیاست کرنا چاہتی تھی اس کے لئے ضروری ہو گیا تھا کی وہ عوام کو فرقہ واریت کے لئے ابھار کر لوگوں کی حمایت حاصل کریں۔ اس لئے ضروری ہو گیا تھا کہ آنے والے الیکشن جو 1935ء ایکٹ کے جدا گانہ طریقہ انتخاب کے تحت ہو رہے تھے اس میں مسلم غیر مسلم فرقوں کو آپس میں لڑا کر امت مسلمہ کی حمایت آسانی سے حاصل کی جا سکتی تھی اس وجہ سے پنجاب کی چودھراہٹوں نے مجلس احرار کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو روک لگانے لے لئے فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہوا دینا ضروری سمجھا اور مسجد شہید گنج کا شوشا کھڑا کر دیا۔

مجلس احرار اس وقت پنجاب کے شہروں اور قصبات میں مضبوط جماعت تھی۔ وطن کی آزادی کی جدوجہد کے لئے احرار کانگرس کے ہمنوا تھے مگر مسلمانوں کے حقوق کی جدوجہد کی وجہ سے کانگرس سے الگ جماعت بنائی گئی تھی۔ ملکی سطح پر احرار غیر مسلموں کے ساتھ مل جل کر رہنے کے حامی تھے۔ پنجاب کی چودھراہٹوں کا تحریک شہید گنج چلانے کا مقصد یہ تھا کہ اگر احرار تحریک شہید گنج میں حصہ لیتے ہیں تو وہ سیاست میں گندے ہو جاویں گے اگر تحریک شہید گنج سے الگ رہتے ہیں تو مسلمانوں میں بے وقعت ہو جاویں گے دونوں صورتوں میں احرار کو یا قوم پرست مسلمانوں کو ہی زک پہنچانا تھا جس میں پنجاب کی چودھراہٹیں کامیاب ہو گئیں۔

چند لفظوں میں جماعت اتحاد ملت نیلی پوش کے بانیاں کی زندگی کے حالات کے بعد نیلی پوش جماعت کی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ نیلی پوش جماعت کے بانی اول جناب مولانا ظفر علی خاں روزنامہ زمیندار اخبار لاہور کے مالک اور ایڈیٹران چیف تھے۔ وہ تحریک آزادی میں خلافت اور کانگرس کے ساتھ وابستہ رہے۔ رولٹ ایکٹ اور سائن کمیشن کے خلاف تحریکات میں کانگرس میں ہوتے ہوئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور مجلس احرار میں بھی ابتدائی چار سال 1934ء تک شامل رہے اور پھر الگ ہو گئے اور مجلس اتحاد ملت بنالی اور اس کے سربراہ بن گئے۔ ملک لعل خان گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے نوجوانی میں گوجرانوالہ ڈی سی آفس کی ملازمت کرتے رہے۔ اعوان قبیلے سے تعلق رکھتے

تھے سرکاری نوکری چھوڑ کر انجمن اسلامیہ کی پرائیویٹ ملازمت کر لی اور تحریک آزادی کے ساتھ وابستہ ہو گئے اس وقت آزادی کی جدوجہد کرنے والی قومی جماعت صرف کانگرس ہی تھی اس میں شامل ہو گئے اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے پنجاب کانگرس کے نائب صدر بن گئے۔ اور پھر جب تحریک خلافت چلی تو اس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خلافت کمیٹی کے بھی صف اول کے لیڈروں میں شمار ہونا شروع ہو گئے۔

مجلس اتحاد ملت کے تیسرے بڑے لیڈر جناب سید حبیب تھے یہ روزنامہ سیاست لاہور کے مالک اور ایڈیٹر تھے۔ یہ تمام لیڈران 1935ء سے قبل قوم پرست تھے تحریکات آزادی اور خلافت کے ساتھ وابستہ تھے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے مگر 1935ء ایکٹ جس میں ہندوستان کی تمام کونسلوں کے لئے جداگانہ انتخابات کے ذریعے نمائندے منتخب کرنے کا بل پاس کیا گیا۔اس وجہ سے سیاست کے دھارے بدل گئے تھے اب صورت یہ ہو گئی تھی کی مسلمانوں میں سیاست پر وہ لوگ یا پارٹیاں کامیاب ہو سکتی تھیں جو مسلم اور غیر مسلم میں نفرت کی سیاست کرے اسی صورت میں مسلم ووٹروں کی ہمدردیاں حاصل ہو سکتی تھیں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں زیادہ سے زیادہ نفرت پیدا کی جا سکتی تھی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مسجد شہید گنج کا قضیہ کھڑا کیا گیا تھا۔ شہید گنج تحریک ختم ہونے کے ساتھ ہی مجلس اتحاد ملت جماعت بھی ختم ہو گئی تھی۔

مولانا ظفر علی خان 1937ء میں مرکزی کونسل کا الیکشن بھی مسلم لیگ کے ٹکٹ پر لڑا تھا اور کامیاب ہو گئے تھے اور دوسرے لیڈر بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ تحرک شہید گنج کا تذکرہ مجلس احرار کے باب میں تفصیل کے ساتھ آ چکا ہے اس لئے مزید تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں۔

انڈین نیشنل کانگرس

ہندوستان کی سب سے قدیم سیاسی جماعت کانگرس ہی تھی۔ کانگرس سے قبل ہندوستان میں کوئی سیاسی جماعت نہ تھی۔ یورپ میں سیاسی اصلاحات اور سیاسی گروہ بندی اٹھارویں صدی میں شروع ہوئی۔ اس سے قبل بھی یورپ میں سیاسی جماعتیں ہونگی۔ مگر فل وقت صرف ہندوستان کے سیاسی حالات پر غور کرنا ہے' لکھانا ہے۔ انقلاب فرانس جو اٹھارویں صدی میں ہی وقوع پذیر ہوا تھا اسکے اثرات تمام یورپ پر پڑے جس کی وجہ سے بادشاہوں نے بھی اصلاحات نافذ کیں اور حکومتی اختیارات عوام کو دیئے جانے لگے۔ اور شاہان وقت نے اپنے اختیارات میں کمی کر دی۔ اسی طرح برطانیہ میں بھی تاجداران برطانیہ نے اپنے اختیارات میں کمی کرتی ہوئے پارلیمانی نظام رائج کیا اور وہاں پر کنزرویٹر پارٹی اور لیبرل پارٹی جیسی مضبوط پارٹیاں بن گئی اور اپنے مقبوضات میں جہاں جہاں برطانیہ کی حکمرانی تھی اسی قسم کی ترغیب دی جانے لگی۔ اسی ترغیب کے پیش نظر برطانوی پارلیمنٹ کے دو ممبر ہندوستان کے دورہ پر آئے اور انہوں نے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی۔ جس کا منشور و مقصد یہ قرار پایا کہ ہندوستانی عوام کے مسائل اور ضروریات کو حکومت کے آگے پیش کرنا عوام کے حقوق کی بات حکومت تک پہنچانا اور طریقہ کار یہ واضح کیا گیا تھا کہ کانگرسی کارکنان ایک جگہ جمع ہوتے اور مسائل پر تقاریر کرتے' بحث کرتے۔ پھر حکومت کو ایک ریزولیشن کی شکل میں پیش کرتے اگر حکومت ضروری سمجھتی تو ریزولیشن کی مانگ کو مان لیتی تھی اگر نہیں ضروری سمجھتی تو رد کر دیتی تھی۔ مگر اس کارروائی کے پس پردہ کوئی تحریک یا جدوجہد نہ ہوئی تھی اور زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ اس قسم کی مانگ دوبارہ حکومت کے آگے قرارداد کے ذریعے پیش کر دی جاتی۔ انگریز کی حکمرانی کے وقت اکثر لوگ یورپ گئے' کئی طالب علم بغرض تعلیم یورپ گئے۔ ان لوگوں نے وہاں کی سیاست کا بغور مطالعہ کیا۔ لوگوں کے حقوق جو حکومتوں نے انہیں دے رکھے تھے یا جو بھی سہولتیں وہاں یورپ میں لوگوں کو میسر تھیں انہیں دیکھا اور متاثر ہوئے اور ان لوگوں نے ہندوستان میں آکر تحریک آزادی پر توجہ دی اور کانگرس میں بھی شامل ہو گئے اور کچھ نے خفیہ تنظیمیں بھی قائم کیں اور وطن کی آزادی کی جدوجہد میں شامل ہوئے مگر ان لوگوں سے جو لوگ کانگرس میں شامل ہوئے ان میں جذبہ حریت تو تھا مگر یہ لوگ آئینی جدوجہد تک ہی شامل رہے اور حقوق اور سہولتوں کی آئینی جنگ میں شامل رہے۔

تقریباً" بیس سال تک کانگرس کی حیثیت ایک ریزولیشن پاس کرنے والی حقوق کی کاغذی مانگ کرنے والی جماعت کی رہی۔ پھر 1914ء میں جنگ کے شعلے یورپ میں نمودار ہونے لگے اور دنیا کی سیاست میں تبدیلیاں آنے لگیں اور کانگرس میں بھی تبدیلی آنے لگی۔

مہاتما گاندھی

بھی ہندوستان میں تشریف لے آئے وہ تھے تو ہندوستانی مہاراشٹر صوبہ کے رہنے والے مگر والدین جنوبی افریقہ میں جا کر آباد ہو چکے تھے وہ بیرسٹر تھے۔ اور انہوں نے جنوبی افریقہ میں عوامی حقوق کی جنگ جاری کی ہوئی تھی۔ جنوبی افریقہ میں بھی انگریزوں کی حکومت ہی تھی حکومت نے انہیں ملک بدر کر دیا اور وہ ہندوستان آئے اور انہوں نے ہندوستانی سیاست کا مطالعہ کیا اور پھر وہ کانگرس میں شامل ہو گئے۔ یورپ میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی اور اس جنگ میں دو متحارب ملکوں کے گروہ تھے جرمنی اور ترکی ایک گروہ میں تھے جبکہ برطانیہ فرانس اور دیگر اقوام یورپ دوسری طرف تھیں۔ اسی جنگ کی بنیادی وجوہات یہ تھیں کہ 1914ء کے وقت دنیا پر حکمرانی برطانیہ فرانس' ہالینڈ' پرتگال کی تھی۔ انہیں ملکوں حکمرانی 200 دو صد سال سے چل رہی تھیں اس سے قبل جرمنی نام کا

کوئی ملک اس دھرتی پر نہ تھا۔ 1870ء میں یورپ کی 200 دو صد خود مختار ریاستوں نے مل کر ایک بڑی حکومت قائم کی جس کا نام وفاقی جمہوریہ جرمنی رکھا گیا تھا۔ چوالیس سال کی قلیل مدت میں وفاقی جمہوریہ جرمنی دنیا کی ایک بہت بڑی صنعتی طاقت بن گیا۔ اس وقت دنیا پر مندرجہ بالا یورپ کی حکومتوں کی اجارہ داری تھی۔ منڈیوں پر بھی برطانوی فرانسیسی تجارتی گروپ ہی قابض تھے۔ جرمنی کو اپنی مصنوعات فروخت کرنے میں دشواری تھی ان حالات میں جنگ عظیم اول 1914ء میں شروع ہوئی دوسرے لفظوں میں اس وقت جرمنی دوسرے یورپین ملکوں سے زیادہ طاقت ور ہو چکا تھا وہ دنیا کے مقبوضات جن پر برطانوی فرانسیسی گروپ نے قبضہ کیا ہوا تھا اپنا حصہ مانگتا تھا جو کہ وہ دینے کو تیار نہ تھے۔ آخر جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ نے غلام ملکوں میں بھی شعور پیدا کیا۔ یورپ کے سامراجی ہمیں غلام رکھنے کے لیے آپس میں لڑ رہے ہیں اس لیے ہمیں بھی آزاد رہنے کا حق ہے اور آزادی کی جدوجہد تیز کر دینی چاہیے۔ ان حالات میں کانگرس نے اپنی نئی حکمت عملی وضع کی اور اس وقت تک گاندھی جی اپنی صلاحیت منوا چکے تھے۔ کانگرس ان کی حمایت میں ایک بہت مضبوط گروپ بن چکا تھا اور گاندھی جی نے اپنی قیادت میں کانگرس کو نئی لائنوں پر چلا دیا تھا۔ مولانا آزاد اپنی کتاب ہماری آزادی میں لکھتے ہیں کہ 1914ء سے قبل آزادی کی خفیہ تحریک میں بنگال اور بہار کے ہندو نوجوان پیش پیش تھے۔ میں نے ان انقلابی نوجوانوں میں شامل ہونا چاہا تو مجھے مسلمان سمجھتے ہوئے انہوں نے ہچکچاہٹ سی کی مگر پھر شامل کر لیا گیا۔ تو جنگ عظیم اول سے قبل اگر کوئی تحریک آزادی کی تھی تو وہ خفیہ ہی تھی یا پھر کانگرس جو صرف حقوق کی یاد دھانی سرکار کو کراتی رہتی تھی۔ مسلم لیگ تھی جو صرف بڑے لوگوں کی جماعت تھی اور وہ مسلم حقوق کی آڑ میں اپنے مفادات حاصل کرتی تھی۔

گاندھی جی نے جنگ عظیم اول کے دوران ہی جدوجہد شروع کر دی تھی۔ پہلی تحریک ہندو اور مسلمانوں نے مشترکہ چلائی وہ خلافت تحریک تھی جس میں دونوں مذاہب کے لوگوں نے مل کر قربانیاں دیں' جانیں دیں' قید ہوئے' مالی قربانی دی' تحریک خلافت کا ذکر آ چکا ہے اس لیے ہم تفصیل میں نہیں جاویں گے۔ کانگرس کی تحریکوں کا ذکر خلافت تحریک اور خدائی خدمت گار تحریک میں آ چکا ہے۔ اس لیے اختصار سے کام لیتے ہوئے کانگرس کی تحریک پر زیادہ تفصیل سے نہیں لکھیں گے۔ خلافت تحریک ہندو مسلم مشترکہ تحریک تقریباً" آٹھ سال مسلسل چلتی رہی اور ہندو مسلمانوں نے ایک گھاٹ پانی پیا تھا۔

اسی تحریک میں سرکار کے ساتھ عدم تعاون تھا۔ فوجی بھرتی بائی کاٹ اور ترک موالات جسمیں انگریز سرکار کے دیئے ہوئے فائدوں خطاب وغیرہ کو واپس کرنا تھا۔ اسی تحریک خلافت کے دوران کانگرس میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا۔ ایک گروہ کے لیڈر سی آر داس اور حکیم اجمل خان تھے۔ اور دوسرے دھڑے کے لیڈر مہاتمہ گاندھی تھے۔ مگر تحریک خلافت پر یہ دونوں دھڑے کے لیڈر پھر متفق ہو گئے۔ کانگرس کی ذیلی تنظیم سوراج پارٹی تھی جس کے ممبران اسمبلی ممبران ہی تھے۔ 1923ء میں سوراج تنظیم پارٹی کو تمام قانون ساز اسمبلیوں کے ماسوائے پنجاب اور بنگال کے اکثریت حاصل ہو گئی۔

سوبھاس چندر بوس صدر آزاد ہند فوج

1929ء میں راوی کنارے لاہور میں کانگرس کا اجلاس ہوا جس میں مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس کیا گیا۔ یہ کانگرس کا اجلاس پورے ہندوستان کا نمائندہ اجلاس تھا۔ 1935ء میں قانون حکومت ہند پاس ہوا جس میں صوبوں کو خود مختاری دی گئی اور مشترکہ مرکز میں وفاقی حکومت تجویز کی گئی تھی۔

1935ء ایکٹ کے مطابق جو پہلے انتخابات ہوئے اس میں کانگرس کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ پنجاب اور بنگال کے علاوہ تمام صوبوں میں کانگرس کی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اور کانگرس ہندوستان کی سب سے بڑی جماعت بن گئی۔ کانگرس کے لیڈر مسٹری سی آر داس نے 1923ء کے کونسلوں کے انتخابات میں اعلان کیا تھا کہ بنگال میں اس وقت مسلمانوں کی آبادی چون فی صد ہے اگر کانگرس بنگال میں برسراقتدار آگئی تو بنگال کی 60 فی صد ملازمتیں مسلمانوں کو دی جائیگی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال میں بھی کافی حمایت کانگرس کو مل گئی۔

1937ء کے انتخابات میں کانگرس کو بہت بڑی کامیابی ہوئی ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں کانگرس کی حکومت تھی انکے نام یہ ہیں۔

یوپی، سی پی، بہار، اڑیسہ، مدراس، بمبئی، آسام، صوبہ سرحد، بنگال میں کرشک پرجا پارٹی کی حکومت بنی جس کے لیڈر مولوی فضل الحق تھے۔ پنجاب میں یونیسٹ پارٹی کی حکومت بنی جس کی لیڈر سر سکندر حیات تھے۔ سندھ میں یونائیٹڈ پارٹی کی حکومت بنی جس کے لیڈر سر غلام حسین ہدایت اللہ تھے۔ ان صوبائی حکومتوں کو صوبوں کا انتظام چلانے کے کل اختیارات تھےاور یہ صوبے اندرونی طور پر بڑی حد تک خود مختار تھے۔

سبھاش چندر بوس

انہیں ایام میں کانگرس کے اندر پھر گروپ بندی ہو گئی۔ سبھاش چندر بوس صدر کانگرنس بن گئے۔ سبھاش انتہا پسند لیڈر تھے اور وہ حصول مقصد کے لیے تشدد کے حامی تھے۔ جبکہ کانگرس میں عدم تشدد کے حامی شبھاش چندربوس کے صدر کانگرس بن جانے کے بعد کانگرس کے اعتدال پسند راہنماؤں نے انکے ساتھ تعاون نہیں کیا جسکی وجہ سے وہ کانگرس کی صدارت سے مستعفی ہو گئے اور انہوں نے کانگرس کے اندر ہی کانگرس فارورڈ بلاک بنا لیا۔ سبھاش چندربوس دو بھائی تھے دونوں کانگرس کے بڑے لیڈران میں شمار ہوتے تھے دوسرے بھائی کا نام سرت چند ربوس تھا بنگالی تھے اور ان کی بنگال کانگرس میں بڑی مقبولیت تھی۔ یہ دونوں بھائی قانون دان تھے۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران سبھاش چند ربوس براستہ کابل فرار ہو کر جرمنی چلے گئے۔ جرمنی میں جا کر انہوں نے ریڈیو پر تقریر کی اور اہل وطن کو آزادی کا سندیش دیا۔ 1942ء میں جب جاپان نے برما، ملایا اور دیگر مشرق بعید پر قبضہ کر لیا تو اس وقت تقریباً" ڈیڑھ لاکھ ہندوستانی فوج جاپانیوں کی قیدی ہو گئی۔ حکومت جاپان کے ساتھ مسٹر سبھاش چند ربوس نے رابطہ کیا اور پھر وہ جرمنی سے برما چلے

گئے۔ وہاں جا کر ڈیڑھ لاکھ قید ہندوستانی فوج کو جاپان سے رہائی دلائی اور انہیں پھر وہاں پر منظم کیا اور اس فوج کو آزاد ہند فوج کا نام دیا اور آزاد ہند فوج کے کمانڈرانچیف جنرل شاہنواز بنائے گئے اور وہ خود آزاد ہندوستان کی عارضی حکومت کے صدر بن گئے۔ دوران جنگ ہی مسٹر بوس کسی ہوائی حادثہ میں جان بحق ہو گئے اور جاپان کی شکست کے بعد آزاد ہند فوج کو ہندوستان میں لایا گیا اور اس فوج کے افسران گرفتار کر لیے گئے۔ جنرل شاہنواز' ڈھلو اور سہگل پر لال قلعہ دہلی میں مقدمہ چلایا گیا جس کا مقدمہ کانگرس نے خود لڑا۔ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی اور پنڈت نہرو نے وکالت کے فرائض انجام دیئے اور ان وکلاء کے معاون دیگر بے شمار کانگری وکلاء بھی تھے اور اس مقدمہ میں مندرجہ بالا جنرل شاہنواز' ڈھلو اور سہگل کو باعزت بری کر دیا گیا اور کانگرس کو اس میں بڑی کامیابی ہوئی۔

وزارتیں مستعفی ہو گئیں

صوبوں میں کانگرسی حکومتیں بن جانے کے بعد کانگرس کی پوزیشن ایک حکمران پارٹی کی سی بن گئی اور مرکز میں بھی کانگرس کے کافی ممبر تھے۔ اکثریت تو نہ تھی اس لیے مرکز میں وائسرائے کے نامزد ممبران کے علاوہ والیان ریاست کے نمائندگان بھی ہوتے تھے اور ساتھ ہی مسلم ممبران کی بڑی تعداد بھی وائسرائے ہند کے اشاروں کے ہی منتظر ہوا کرتے تھے۔ اس لیے کانگرس کو مرکز میں اکثریت نہ تھی۔ ہندوستان بھر میں ریاستوں کی تعداد 500 پانچ سو سے زائد تھی اور ان ریاستوں میں کل ہندوستان کی 35 فی صد سے زائد آبادی تھی اور ان ریاستوں سے چنے ہوئے مرکزی اسمبلی کے ممبران ہر حالت میں وائسرائے کے تابع فرمان ہی ہوا کرتے تھے۔ ان حالات میں گانگرس کی مرکزی اسمبلی میں اکثریت نہ تھی۔

1939ء میں برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ٹھیک تین دن بعد وائسرائے ہند نے بھی ہندوستان کی طرف سے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس اعلان جنگ کو کانگرس نے اچھا نہیں سمجھا۔ کانگرس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ہندوستان کے عوام کی نمائندہ جماعت کانگرس ہے وائسرائے نے ہندوستان کی طرف سے اعلان جنگ جرمنی کے خلاف کر دیا اگر حکومت ہند نے کانگرس سے پوچھ کر اعلان نہیں کیا تو کم از کم مرکزی اسمبلی سے ہی پوچھ لیا ہوتا تاکہ ہم حکومت ہند کو اعلان جنگ کرنے میں حق بجانب سمجھتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت برطانیہ اور اس کے نمائندے وائسرائے نے 40 کروڑ ہندوستانی عوام کو اعلان جنگ کا اتنا بڑا فیصلہ کرتے ہوئے پوچھا تک نہیں مشورہ کے قابل ہی نہیں سمجھا۔ اس مسئلہ پر کانگرس کے مختلف اجلاس ہونے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان کے جن آٹھ صوبوں کی کانگرس حکومتیں ہیں وہ مستعفی ہو جائیں۔

کرپس مشن انہیں ایام میں اور قبل بھی مسٹر کرپس جو کہ برطانوی حکومت میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے سیاست دان تھے اور سیاست میں انکی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ انکی ہی سیاسی چالوں سے

جرمنی نے برطانوی محاذ چھوڑ کر روس پر حملہ کر دیا تھا اور روس بھی اتحادی گروہ میں شامل ہو گیا تھا۔ مسٹر کرپس نے ہندوستان پہنچ کر لیڈران سے بات چیت کی۔ مسٹر جناح جو کہ مسلم لیگ کے صدر تھے اور کانگریسی لیڈران کے ساتھ بھی بات چیت کی مگر ناکام رہے۔ نئے حالات میں جاپان بھی جنگ میں شامل ہو چکا تھا۔ جاپان نے مشرق بعید کے تمام ممالک پر ماسوائے چین کے قبضہ کر لیا تھا۔ نئے حالات میں برطانوی حکومت چاہتی تھی کہ ہندوستانی لیڈران کے ساتھ کوئی سمجھوتہ ہو جائے مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ مسٹر کرپس کو ناکام واپس جانا پڑا۔ جاپان کے جنگ میں آ جانے کے بعد نئے حالات میں جنگ ہندوستان کے دروازے پر آ گئی تھی۔ کلکتہ پر جاپانی ہوائی جہازوں نے بمباری بھی کی تھی۔ نئے حالات میں ہندوستانی لیڈران بھی تشویش میں مبتلا ہو گئے۔

ان حالات میں کانگرس لیڈران نے سوچ و بچار شروع کیا۔ واردھا میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان سے انگریزی اقتدار ختم کیا جائے۔ جس کا مطلب تھا انگریزو ہندوستان چھوڑ دو۔

تحریک ہندوستان چھوڑ دو

یہ ریزولیشن جب اخبارات میں شائع ہوا تو لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا کہ انگریز حکومت کو وارننگ دی گئی ہے کہ وہ ہندوستان چھوڑ دیں اور یہ مطلب ٹھیک بھی تھا۔ یہ ہی ریزولیشن واردھا میں ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں پاس کیا گیا تھا اور مورخہ آٹھ اگست 1942ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں طلب کیا گیا جس میں یہ ریزولیشن کانگرس کی مرکزی کونسل نے منظور کرنا تھا۔ جب یہ ریزولیشن انگریزو ہندوستان چھوڑ دو ورکنگ کمیٹی نے منظور کیا اور اخبارات میں شائع ہوا تو سارے ہندوستان میں ایک بغاوت کی لہر دوڑ گئی۔ حکومت نے اسے کھلی بغاوت قرار دیا عوام میں بھی اسی قسم کے اثرات مرتب ہوئے۔ پنڈت نہرو اور گاندھی جی نے اس ریزولیشن کو عدم تشدد بغاوت قرار دیا۔

ایک انگریز خاتون جو کہ گاندھی جی کی بہت معتقد تھی جو میراں جی کے نام سے مشہور ہوئی وہ وائسرائے ہند کے پاس مندرجہ ریزولیشن کی وضاحت کے لیے گئی۔ وائسرائے نے میراں جی کو شرف ملاقات نہیں بخشا اور وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری نے میراں جی سے کہا کہ اس جنگ کی ہولناکی اور تباہی کے پیش نظر کانگرس کا یہ ریزولیشن حکومت ہند کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ اس لیے وائسرائے ہند گاندھی جی یا انکے کسی نمائندے سے ملاقات کرنے کو تیار نہیں۔ میرا جی نے کانگرس کا نقطہ نگاہ وائسرائے ہند کے پرائیویٹ سیکرٹری کو سمجھانے پر اکتفا کیا اور واپس آگئیں اس وقت کانگرس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد دہلی میں ہی موجود تھے۔ میراں جی نے تمام واقعات مولانا آزاد سے ذکر کیے اور پھر واردھا میں گاندھی جی کے پاس چلی گئی۔ میرا جی کا اصل نام مس بیلڈ تھا وہ برطانوی امیر البحر کی بیٹی تھی۔ مہاتما گاندھی سے بہت متاثر ہوئی تھی اور کئی سال سے گاندھی کے آشرم میں ہی رہتی

تھی اور آشرم کے لوگ انہیں میراں جی کے نام سے پکارتے تھے۔ گاندھی جی کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر مہادیو ڈیسائی نے ہی انہیں وائسرائے سے ملاقات کر کے مندرجہ ذیل ریزولیشن کی وضاحت کرنے کو کہا تھا۔ جبکہ وائسرائے ہند نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ کانگرس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تصنیف ہماری آزادی میں لکھتے ہیں کہ 14 جولائی جس روز کانگرس ورکنگ کمیٹی نے ہندوستان چھوڑ دو کا ریزولیشن پاس کیا اور آل انڈیا کانگرس کے اجلاس میں مورخہ 5 اگست تک کے درمیان کا عرصہ میں نے تمام ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا اور کانگرس لیڈران کو باور کرایا گیا کہ اگر تحریک چلی تو پرامن ہونی چاہیے اور عدم تشدد پر کاربند رہتے ہوئے تحریک چلائی جائے اور گاندھی جی کی ہدایت پر پوری طرح عمل کیا جائے۔ 1942ء میں کانگرس کا سارے ہندوستان پر اثر تھا اور پورے ہندوستان میں تحریک بڑے منظم طریقہ پر چلائی جا سکتی تھی۔ خصوصی طور پر بنگال' بہار' یوپی' سی پی' بمبئی اور دہلی تو پوری طرح تیار تھے۔ جب گاندھی جی کی نمائندہ میراں جی سے وائسرائے ہند نے ملنے سے انکار کر دیا تو گاندھی جی فکرمند ہوئے اور کہنے لگے کہ انگریز حکومت آسانی سے جھکنے والی نہیں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس 5 اگست کو ہوا اور 8 اگست آل انڈیا کانگرس کے اجلاس میں ورکنگ کمیٹی کا پاس شدہ ریزولیشن پیش کیا گیا۔ تو صدر کانگرس مولانا آزاد نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندوستانی قوم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ نہیں سکتی ہندوستان نے جمہوری ممالک سے تعاون کرنا چاہا مگر برطانوی حکومت نے باعزت تعاون کی راہیں بند کر دیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جاپانی حملہ آور ہندوستان کے دروازے تک آ چکا ہے اس لیے قوم اپنے اندر حملہ آور کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ برطانیہ اگر مناسب سمجھے تو ہندوستان کو خالی کر سکتا ہے جیسے اسنے برما' ملایا' سنگاپور کو خالی کر دیا ہے۔ ہندوستان کے باشندے ملک چھوڑ کر نہیں جا سکتے اس لیے کہ یہ انکا اپنا وطن ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنے میں اتنی طاقت پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ برطانوی زنجیریں توڑ سکیں اور نئے حملہ آور کو منہ توڑ جواب دے سکیں۔

8 اگست کی رات کو یہ ریزولیشن بھاری اکثریت سے منظور ہو گیا صرف کمیونسٹوں نے مخالفت کی تھی جنکی تعداد بہت ہی کم تھی۔

اسی رات کانگرس کے تمام لیڈران گرفتار کر لیے گئے۔ مولانا آزاد صدر کانگرس کو بمبئی میں مسٹر بھولا بھارتی ڈیسائی کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا اور دیگر تمام لیڈران بشمول گاندھی جی اور پنڈت نہرو گرفتار کر لیے گئے۔ گاندھی جی کو پونا میں سر آغا خان کے محل میں نظربند کر دیا گیا۔ باقی لیڈران کو قلعہ احمد نگر میں نظربند کر دیا گیا۔ قبل ازیں کانگرسی لیڈران نے ریزولیشن کی نقول دنیا بھر کے بڑے حکمرانوں کو بشمول امریکہ مسٹر روز ویلٹ کے روانہ کر دیں تھی۔ کانگرس کے لیڈران گرفتار ہو گئے تو سارے ہندوستان میں حصول آزادی کی تحریک چلی جس میں ہزاروں' لاکھوں لوگ جیلوں میں چلے گئے۔ تحریک پورے ہندوستان میں تھی کسی ایک علاقے تک محدود نہ تھی۔

بنگال' یوپی' بہار' اڑیسہ' سی پی' اور دہلی میں تو یہ تحریک تشدد کی شکل بھی اختیار کر گئی تھی۔

کئی جگہوں پر پولیس کے ساتھ مقابلہ بھی ہوا' ریلوے کی پٹریاں اکھیڑ دی گئیں' سرکاری عمارات کو جلا دیا گیا۔ دیگر صوبوں میں تحریک پرامن رہی۔ ہڑتالیں وغیرہ ہوئی' جلسے جلوس ہوتے رہے۔ گرفتاریاں ہوتی رہیں یہ تحریک ایک ماہ سے زائد وقت تک پورے ہندوستان میں چلتی رہی۔ کانگرس اور جمیعت علمائے ہند کے اور دیگر معاون جماعتوں کے لاکھوں لوگ قید ہوئے اور تحریک آزادی کی جدوجہد میں یہ تحریک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

شملہ کانفرنس

کانگرنس لیڈران کو 1942ء میں گرفتار کر کے قلعہ احمد نگر میں رکھا گیا تھا۔ 1945ء تک جب تک کہ یورپ کی جنگ ختم نہیں ہوئی تھی اور جرمنی کو واضح شکست نہیں ہو گئی۔ کانگرسی لیڈران قلعہ احمد نگر میں ہی قید رہے اس دوران بھی کانگرس کے صدر مولانا آزاد اور وائسرائے ہند کے درمیان ہندوستان کے معاملات کے سلجھاؤ کے لیے خط و کتابت ہوتی رہی۔ جرمنی کی شکست اور ہٹلر کی موت کے بعد تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے گے اور پھر سیاسی مسائل پر گفتگو کی ضرورت محسوس ہوئی اور وائسرائے ہند نے شملہ کانفرنس بلائی جس میں کانگرس کے علاوہ مسلم لیگ اور دیگر اقلیتی گروہوں کو شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔ جن میں سکھ شڈول کاسٹ' پنجاب کے وزیراعظم سر خضر حیات ٹوانہ اور نیشلسٹ مسلمانوں کا ایک گروپ بھی شامل تھا۔ کانفرس ہال میں وائسرائے ہند کی کرسی درمیان میں تھی۔ وائسرائے ہند کے دائیں مسلم لیگی لیڈران تھے' جبکہ بائیں جانب کانگرسی لیڈران بیٹھے تھے۔ کانفرنس میں دوران گفتگو مسٹر جناح صدر مسلم لیگ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے۔ اگر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل بنتی ہے تو مسلم نمائندے مقرر کرنے کا حق صرف مسلم لیگ کو ہی ہے دوسری جماعت کو مسلم نمائندہ مقرر کرنے کی اجازت نہ ہو گی۔

کانگرس نے یہ تجویز نہ مانی اور کہا کہ گانگرنس قومی جماعت ہے اور اسکی سوچ بھی قومی ہے اور اسے یہ حق ہے کہ اپنی نمائندگی کے لیے جسے چاہے مقرر کرے اسی نقطہ پر ہی شملہ کانفرنس ناکام ہو گئی۔

جنگ ختم ہو گئی جاپان نے ہتھیار ڈال دیے

شملہ کانفرنس ناکام ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ اپنے کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت منوانے پر بضد تھی اور دوسری کسی جماعت کو مسلمانوں کی نمائندہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔

مشرق بعید میں جنگ جاری تھی برما' ملایا' سنگاپور اور انڈونیشیا اور دیگر کئی ملکوں پر جاپان نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ جرمنی کی شکست ہو جانے کے بعد اتحادی فوجوں اور اقوام یورپ کی تمام تر توجہ مشرق بعید اور جاپان پر تھی جاپان کی فوجی قوت بہت زیادہ تھی اور خیال کیا جاتا تھا کہ اگر جاپان کو بہت جلد

بھی شکست ہوئی تو کم از کم دو سال لگیں گے اس لیے اتحادی فوجوں کا تمام رخ جاپان کی طرف ہی ہو گیا تھا۔

امریکہ نے ایٹم بم بنا لیا تھا اس وقت کسی کو بھی پتہ نہیں تھا کہ ایٹم بم کی طاقت کیا ہے اور یہ جنگ پر کس قدر اثر انداز ہو گا اس کا اندازہ شاید ایٹم بم کے موجد ملک امریکہ کو بھی نہ تھا چنانچہ امریکہ نے بغیر کسی وارننگ کے کہ جاپان ہتھیار ڈال دے ورنہ ایٹم بم گرایا جائے گا۔ بغیر کسی پیشگی وارننگ کے امریکہ نے ہیروشیما پر ایٹم بم گرا دیا جس کی تباہی سے ہیروشیما کا شہر نیست و نابود ہو گیا۔ ایک وقت میں 70000 ستر ہزار انسان لقمہ اجل بن گئے۔ ایک لاکھ سے زائد مہلک امراض میں مبتلا ہو گئے۔ چار دن کے بعد پہلے بم سے ذرا چھوٹا بم ناگا ساقی پر گرایا گیا جس سے پل جھپکتے ہی تقریباً 40000 چالیس ہزار انسان لقمہ اجل بن گئے اور ایک لاکھ کے قریب مہلک زخموں میں مبتلا ہو گئے۔ یہ دو ایٹم بم جنگ میں فیصلہ کن ثابت ہوئے اور جاپان نے جنگ میں شکست کو تسلیم کر لیا اور ہتھیار ڈالدیے

اعلان شکست کے بعد امریکن فوجیں جاپان میں اترنا شروع ہو گئیں۔ چند روز میں پورے جاپان پر امریکن فوج کا کنٹرول ہو گیا جو کچھ پھر فاتحین مفتوحہ ملک کے ساتھ کرتے ہیں وہی کچھ ہوا اور جاپانی فوجیوں پر مقدمات بھی چلائے گئے اور فتح کے جشن بھی منائے گئے۔

مشرق بعید کے جن ملکوں پر جاپان نے قبضہ کیا تھا ان ملکوں پر پہلے جو حکمران تھے وہ بھی حکمرانی کرنے پہنچ گئے۔ انڈونیشیا پر ہالینڈ کی حکومت تھی ولندیزی اپنی فوجی طاقت کے ساتھ انڈونیشیا گئے انڈونیشین عوام نے انکا مقابلہ کیا۔ تقریباً دو سال تک ولندیزوں اور انڈونیشی لوگوں کی جنگ رہی اور بلاخر ہالینڈ نے انڈونیشیا کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ جس وقت جاپان نے انڈونیشیا کو فتح کیا تھا تو انہوں نے انڈونیشیا کو آزادی دے دی تھی۔ ہالینڈ والے جاپان کی شکست کے بعد دوبارہ قبضہ کرنے آ گئے تھے جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور بلاخر ہالینڈ نے انڈونیشیا کی آزادی تسلیم کر لی۔

برما' ملایا' سنگاپور برطانیہ کے مقبوضات تھے۔ برطانوی فوجوں نے ان ملکوں پر قبضہ کر لیا۔ جس وقت 1942ء میں برما پر جاپان نے قبضہ کیا تھا اس وقت ڈیڑھ لاکھ ہندوستانی فوج برما میں رہ گئی تھی اور یہ فوج جاپانیوں کی قید میں ہو گئی تھی۔ کانگرس کے سابق صدر سبھاس چندر بوس جرمنی سے برما پہنچے۔ انہوں نے جاپان کے حکمران فوجی افسران کے ساتھ بات چیت کر کے ہندوستانی ڈیڑھ لاکھ فوج کو اپنے کنٹرول میں کر لیا اور جدید ترتیت کے ساتھ اسے منظم کیا۔ اسکا نام آزاد ہند فوج رکھا گیا اور اسکا کمانڈران چیف جنرل شاہنواز کو بنایا گیا۔ اس فوج کا مقصد یہ تھا کہ مسلح جدوجہد کے ساتھ ہندوستان کو آزاد کرائیں گے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے جدوجہد بھی شروع کر دی۔ جب جاپان کو شکست ہوئی تو آزاد ہند فوج بھی قید ہو کر ہندوستان لائی گئی۔ اسکے افسران پر لال قلعہ میں مقدمہ چلایا گیا۔ کانگرس نے ان مقدمات کی پیروی کی جن افسران پر سب سے پہلے مقدمات چلے ان میں جنرل شاہنواز' کرنل ڈھلو اور کرنل سہگل تھے۔ اس مقدمہ میں پنڈت نہرو بھی بطور وکیل پیش ہوئے اور دیگر وکلاء کا

بہت بڑا پینل تھا۔ تینوں مندرجہ بالا رہا کر دیے گئے۔

دیگر فوجی جوانوں اور افسران پر بھی مقدمات چلے سب کے سب بری کر دیے گئے۔ کرنل حبیب الرحمن صاحب کا مقدمہ انکی خواہش کے مطابق مسلم لیگ نے لڑا اور وہ پانچ سال کے لیے قید ہو گئے تھے۔ آزاد ہند فوج کے قیدی جوانوں کے حق میں پورے ملک میں مظاہرے ہوئے' جلسے جلوس نکالے گئے اور حکومت برطانیہ کو مجبور کر دیا گیا تھا کہ ان فوجی جوانوں کو رہا کرے۔

اقوام عالم میں جنگ کے دوران ہی یہ چرچا عام تھا کہ جنگ کے بعد نو آبادیاتی نظام ختم ہو جائے گا محکوم قوموں کو بھی آزادی مل جائے گی۔ یہ چرچا فوجوں میں بھی تھا پولیس اور دیگر محکموں میں بھی عام تھا لوگوں کو بھی یہ یقین ہونے لگ گیا تھا کہ اب ہندوستان آزاد ہونے ہی والا ہے۔ سیاسی لیڈران نیوی کی بغاوت پر حیران رہ گئے۔ بمبئی اور کراچی میں نیوی افواج نے آزاد ہندوستان کے نعرے لگائے اور انگریز کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ہم نے بھی اسی زمانے میں اخبارات میں پڑھا تھا کہ کراچی اور بمبئی میں نیوی فورس نے بغاوت کر دی ہے۔ مگر کانگرس کے اس وقت کے صدر مولانا آزاد نے اپنی کتاب ہماری آزادی میں لکھا ہے کہ جنگ کے دوران ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوگ فوج میں بھرتی ہوئے تھے کیونکہ جنگ کی ضرورت نے پرانا طریقہ بھرتی کا بدل ڈالا تھا اس لیے جہاں سے بھی فوجی بھرتی کے لیے لوگ ملتے بھرتی کر لیے جاتے تھے۔ حکومت برطانیہ کا یہ کہنا کہ جنگ کے بعد ہندوستان آزاد ہو جائے گا صحیح اور سچا مانتے تھے اس عقیدہ کی وجہ سے ان لوگوں نے جنگ کے دوران بڑی جانفشانی سے کام کیا۔ اب جب جنگ ختم ہو گئی تو وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ افواج میں قوم پرستی کی ایک نئی روح پیدا ہوئی تھی اور ان میں آزادی کا بہت جوش پیدا ہو گیا تھا جب کوئی کانگرسی لیڈر انہیں ملتا تو وہ اپنا جوش و خروش ان پر ظاہر کرتے تھے اور اپنی ہمدردی کانگرس کے ساتھ ظاہر کرتے تھے اور اگر کانگرس اور حکومت میں تصادم ہوا تو حکومت کا نہیں کانگرس کا ساتھ دیں گے۔ یہ خیالات صرف افسران تک ہی نہیں بلکہ معمولی سپاہی تک بھی تھے اور وہ قومی آزادی کو خوش آمدید کہنے کی لیے اپنے کو ہر وقت تیار رکھے ہوئے تھے اسی طرح پولیس کے افسران بھی کانگرس کی وفاداری میں کسی اور سے پیچھے نہ تھے۔ مولانا آزاد صدر کانگرس فرماتے ہیں کہ میں کلکتہ لال قلعہ سے گزر رہا تھا کہ میری گاڑی بھیڑ میں پھنس گئی تو پولیس کے سپاہیوں نے انہیں پہچان لیا اور بارکوں میں جو کہ قریب ہی تھیں گئے اور بہت سارے پولیس مین آ گئے اور انہوں نے مولانا کی کار کو گھیر لیا اور سلامی دی اور نعرے لگائے۔

ہندوستان کی تحریک میں آزادی بحری بیڑے کے افسران کی بغاوت سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت فوجی افسران اور جوان آزادی وطن کے کتنے پرجوش حامی بن چکے تھے اور یہ تحریک آزادی میں کوئی معمولی بات نہ تھی۔ فوج کے کچھ افسران گرفتار بھی کر لیے گئے ان پر بغاوت اور غداری کی مقدمات بھی قائم کئے گئے اور کانگرس نے فیصلہ کیا کہ فوج کے افسران کے خلاف کورٹ مارشل کے سلسلہ میں افسران بالا سے ملاقاتیں کیں۔ کمانڈر انچیف سے بھی ملاقات

کی گئی۔ جو لیڈران فوجی افسران اور جوانوں کے معاملات سلجھانے میں پیش پیش تھے ان میں مولانا آزاد صدر کانگرس، سردار پٹیل، مسز ارونا آصف علی بھی تھیں ان لیڈران نے فوجی جوانوں اور افسران کو کورٹ مارشل کے مقدمات سے بچایا اور انکی ہر قسم کی مدد کی۔

عام انتخابات

شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد ہندوستان بھر میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی الیکشن کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ پنجاب میں مقابلہ مسلم لیگ اور یونینسٹ کے درمیان تھا۔ مجلس احرار بھی مسلم لیگ کے خلاف تھی۔ مگر اسکی طاقت شہروں تک ہی محدود تھی۔ اس الیکشن میں صوبہ سرحد کے علاوہ سارے ہندوستان میں مسلم نشستوں پر 90 فی صد مسلم لیگ کامیاب ہوئی۔ پنجاب اسمبلی کی کل 180 نشستیں تھیں جن میں 94 مسلم نشستیں تھیں۔ الیکشن کے نتیجہ میں 79 مسلم نشستوں پر مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوئے' چودہ سیٹوں پر یونینسٹ پارٹی کامیاب ہوئی' 28 سکھ نشستوں پر اکالی پارٹی' یونیسٹ پارٹی کامیاب ہوئی۔ 50 ھندو نشستوں پر کانگرس کامیاب ہوئی باقی 6 نشستیں دیگر منارٹی کی تھیں۔ پنجاب میں وزارت اکالی پارٹی' یونینسٹ پارٹی اور کانگرس کی ملک سر حضر حیات کی زیر قیادت مخلوط بنی تھی اور ملک حضر حیات پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے تھے۔ بنگال کی تمام مسلم نشستوں پر مسلم لیگ ہی قابض ہو گئی تھی اور مسلم لیگ کی وزارت مسٹر سہروری کی

زیر قیادت بنی تھی - سندھ میں بھی مسلم لیگ کامیاب ہو گئی تھی اور وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ بنے تھے۔ سرحد مسلم صوبہ ہونے کے باوجود کانگرس الیکشن میں کامیاب ہوئی تھی اور وزارت ڈاکٹر خان صاحب کی بنی تھی۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے دو صوبوں بنگال اور سندھ میں مسلم لیگ وزارت بنی تھی۔ پنجاب میں مخلوط حکومت بنی تھی۔ دیگر ہندوستان کے تمام صوبوں یوپی' سی پی' بہار' اڑیسہ' مدارس' بمبئی' آسام اور صوبہ سرحد میں کانگرس وزارتیں بنی تھی۔ اس طرح کانگرس مجموعی طور پر پورے ہندوستان کے الیکشن میں کامیاب ہوئی۔ الیکشن میں مسلم لیگ کا نعرہ تھا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی جماعت ہے۔ حضورؐ کی جماعت ہے۔ مسلم لیگ کے علاوہ مسلم جماعتیں کافر ہیں' کافروں کی ساتھی ہیں۔ ایک طرف قرآن ہے ایک طرف گاندھی ہے۔ جو مسلمان ہیں وہ قرآن کو ووٹ دیں گے گاندھی کو ووٹ نہیں دیں گے۔ مسلم لیگ کو ووٹ دینا قرآن کو ووٹ دینا ہے۔

الیکشن کے بعد کانگرس ہندوستان کے بہت بڑے علاقہ پر حکمران بن گئی' وزارتیں بن گئیں۔ مرکز میں کانگرس کو حکومت بنانے کی دعوت دی گئی مگر مسلم لیگ کے تعطل کی وجہ سے کچھ دن بعد پنڈت نہرو نے مسلم لیگ کے بغیر ہی حکومت بنائی۔ پھر چند روز بعد مسلم لیگ بھی کولیشن گورنمنٹ میں شامل ہو گئی۔ مزید تفصیلات ہم تحریک خدائی خدمت گار کے باب میں لکھ آئے ہیں۔ اس لئے کسی مزید تفصیل کے بغیر کہ بالاخر 15۔اگست 1947ء کو ہندوستان آزاد ہو گیا اور جب ہندوستان آزاد ہوا اس

وقت ہندوستان کی گلی کوچوں میں لاشوں کے انبار لگ گئے۔ اس موقع کے لئے ہندوستان کی مشہور شاعرہ امرتا پریتم نے شعر لکھے۔ جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبراں وچوں بول
اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول
اک دھی موی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نو کہن
اٹھ درمنداں دیا دردیا تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وچھیاں لہو نال بھری چناب
اج سے کیدو بن گئے حسن تے عشق دے چور
اج کتھو لب کے لیاواں وارث شاہ اک ہور

خاکسار تحریک

خاکسار تحریک ایک وقت میں پنجاب کی سب سے زیادہ طاقتور تحریک تھی۔ خاکسار تحریک کے بانی حضرت علامہ عنایت اللہ خان المشرقی 1888ء میں امرتسر کے ایک علمی اور متمول گھرانے میں پیدا ہوئے اور انکے گھرانے کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ انیسویں صدی کے ساتویں عشرے میں جب سید

جمال الدین افغانی ہندوستان میں تشریف لائے تو پنجاب کے دورے پر جب وہ امرتسر پہنچے تو انکی میزبانی کا شرف علامہ صاحب کے گھرانے کو حاصل ہوا۔ جو انکے گھرانے کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا اور علامہ صاحب کی تحریک خاکسار میں جمال الدین افغانی کے افکار کی بہت زیادہ چھاپ نظر آتی ہے جسے کوئی بھی باشعور آدمی بہت جلد محسوس کر لیتا ہے بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ ہندوستان کی ہر مسلمان تحریک میں پان اسلام ازم کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے اور پان اسلام ازم کا ہی دوسرا نام غلبہ اسلام ہے۔ علامہ صاحب بلا کے ذہین تھے۔ 1904ء میں انہوں نے ایم اے امتیازی حیثیت کے ساتھ ہی نہیں بلکہ پنجاب میں اول پوزیشن حاصل کی اور انکی اس کامیابی پر گورنر پنجاب نے ان کے اعزاز میں دعوت دی اور ساتھ ہی اعلیٰ سرکاری عہدہ کی پیش کش کی جو کی علامہ صاحب نے قبول نہ کی اور مزید حصول تعلیم کے لئے انگلستان روانہ ہو گئے۔ وہاں کیمبرج یونیورسٹی کے کرائسٹ کالج میں داخل ہو گئے۔ پہلے ہی مقابلہ جس میں ستر کالج شریک تھے۔ آپ سب سے اول آئے اور اس کامیابی پر آپ کا ستر پونڈ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا گیا اور فاؤنڈیشن سکالر کا خطاب حاصل کیا۔ انہوں نے ادب میں' انجینئرنگ میں' ریاضی میں' سائنس اور دیگر علوم میں ایوارڈ حاصل کئے' انعام حاصل کئے' وظیفے حاصل کئے اور دنیائے علم میں اپنی ذہانت کا لوہا منوایا۔ انگلینڈ کے اخبارات نے علامہ صاحب کی بہت زیادہ تعریف کی اور انہیں ایک طالب علم کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ جو کہ ایک بہت ہی بڑا اعزاز تھا۔ انہیں حکومت کی طرف سے بہت بڑے بڑے عہدے پیش کئے گئے۔ اور بڑی سوچ بچار کے بعد انہوں نے سنٹرل گورنمنٹ آف انڈیا کے انڈر سیکرٹری کا عہدہ قبول کر لیا اور وہ بہت بڑے سرکاری افسر بن گئے۔ 1924ء میں آپ نے تذکرہ کتاب لکھی جس سے علامہ کو بہت شہرت ملی اور وہاں اہل علم کو علامہ صاحب کی تصنیف تذکرہ بہت پسند آئی اور اس کتاب میں قرآن کریم کی تشریحات جدید طریقہ پر کی گئیں۔

سنٹرل گورنمنٹ کی ملازمت چھوڑنے کے بعد پشاور اسلامیہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس اثناء میں امرتسر کی سکونت چھوڑ کر مستقل رہائش اچھرہ لاہور میں قائم کر لی اور پھر آپ نے 1931ء میں اسلامیہ کالج پشاور کی ملازمت بھی چھوڑ دی۔ ملت اسلامیہ کے دکھ درد کو دیکھتے ہوئے خاکسار تنظیم قائم کرنے کا پروگرام بنا لیا۔

خاکسار کنونشن

1951ء میں آپ نے خاکسار تحریک کا آغاز کیا۔ ہم خیال لوگوں کا ایک کنونشن بلایا گیا جس میں بشیر احمد صدیقی، حبیب اللہ سعدی اور دیگر بہت سارے ہم خیال اچھرہ میں علامہ صاحب کی رہائش گاہ میں جمع ہوئے اور اس میں خاکسار تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔

تحریک کا بنیادی مقصد یہ بیان کیا گیا کہ وطن کی آزادی کے لئے عوام میں جذبہ حریت پیدا کرنا اور نوجوانوں کو منظم کرنا۔ جو کچھ دیکھنے میں آیا وہ یہ تھا کہ تحریک نوجوانوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ خوبصورت نوجوان خاکی لباس میں ملبوس بازو پر سرخ چکر والا بیج، کندھے پر بیلچہ اٹھائے ہر روز شام کو پریڈ کرتے ہوئے سڑکوں بازاروں میں گزرتے بھلے لگتے۔ خوبصورت بیلچہ، چپ راست، چپ راست کی آواز اور ساتھ قدموں کی آواز ایک سہانا، روح پرور نظارہ ہوتا۔ پریڈ میں شامل نوجوانوں کا خوب سج دھج ہوتا یہ سب کچھ لوگوں میں ایک کشش پیدا کرتا اور کھنچتے ہوئے خاکساروں کی طرف چلے آتے۔ دیہاتوں میں بھی لوگ خاکساروں میں شامل ہونا شروع ہو گئے۔

انہی دنوں میں ابھی بچہ ہی تھا کہ راولپنڈی ضلع کے ایک گاؤں میں جانا ہوا۔ رات عشاء کے وقت تقریباً (50) پچاس نوجوان اپنے دیہاتی لباس میں ہی ایک نوجوان انکے آگے بیلچہ کندھے پر اٹھا کر آگے چل رہا تھا۔ باقی سب نوجوان اس کے پیچھے چپ راست چپ راست کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ غریب لوگ تھے۔ انکے پاس وردی بنانے کے لئے پیسے نہ تھے۔ وہ اپنے دیہاتی لباس میں ہی چپ راست کرتے جا رہے تھے۔ مگر یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ خاکساروں کے چمک دار بیلچے تلوار کی دھار کی طرح تیز ہوتے تھے اور تلوار کا کام بھی دیتے تھے۔

خاکسار تحریک کے اغراض و مقاصد

خاکسار تحریک کے نمایاں اغراض و مقاصد جو کہ مختصر لفظوں میں یہ ہیں۔

تنظیم اور پریڈ کے ذریعے اپنے آپ کو چاک و چوبند رکھنا۔ حرکت میں رہنا تاکہ جسم کے اعضاء ٹھیک طریقہ سے کام کرتے رہیں۔ غلبہ حاصل کرنے کے لئے مستعد رہنا۔ حرکت دنیاوی کامیابی کے لئے اور پھر عمل کے لئے اشد ضروری ہے۔ متحرک رہنا صحت کے لئے بھی اشد ضروری ہے۔

خاکسار تحریک کا مقصد حکمرانی حاصل کر کے اخوت مساوات پر مبنی حکومت قائم کرنا۔ جو شخص

خاکسار بن جائے اسکے لئے ضروری احکامات خدا اور رسولؐ پر اور روز قیامت پر یقین ضروری ہے۔ اس سے زیادہ گہرائی میں مذہب کے اندر جانا ضروری نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور کے وقت بھی ان ہی تین احکامات کا درس دیا گیا ہے۔ مسلم قوم کے ضروری ہے کہ بلا حیل و حجت امیر کی اطاعت کی جائے۔ ہر خاکسار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے امیر کی اطاعت کرے۔ جماعت خاکسار میں شمولیت کے بعد ہر خاکسار کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاکی لباس زیب تن کرے اور ہر روز اپنے محلہ یا گاؤں کی جماعت میں حاضر ہو کر حکم امیر بجا لائے۔ جس میں پریڈ اور خدمت یا جو بھی حکم امیر کرے اس پر عمل کرے۔ خاکسار کے لئے ضروری ہے کہ وہ جب بھی کسی خاکسار کو ملے یا کسی بھی شخص کو احترام پیش کرے تو وہ سپاہیانہ طریقہ پر سلامی پیش کرے۔

خاکساروں کے 24 اصول

کسی مسلمان کی مخالفت نہ کی جائے۔ ہمسایہ قوم اور دیگر اقوام کے ساتھ بہتر تعلق۔ مجاہدانہ سپاہیانہ صلاحیتوں کے ساتھ قوم کو طاقت ور بنانا۔ اپنے سالار کا حکم ماننا۔ اسلام کی راہ میں ہر وقت قربانی کے لئے تیار رہنا۔ وقت کی پابندی کرنا۔ سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈرنا۔ نیک عمل سے اپنی طرف لوگوں کو راغب کرنا۔ روحانی جذبات کو پیدا کر کے شیطانی جذبات کو کچلنا۔ بلا لحاظ مذہب ملت خدمت کرنا۔ نماز قائم کرنا اور باقی ارکان اسلام پر مضبوطی سے عمل کرنا۔ خود قطار میں کھڑے ہو کر لوگوں کو تنظیم کا درس دینا۔ فوج کی طرح سپاہیانہ زندگی گزارنے کا طریقہ اپنانا۔ ہر وقت چاک و چوبند رہنا۔ ہر قسم کے جدید اسلحہ کی تربیت حاصل کرنا اور بیلچہ ہر وقت اپنے پاس رکھنا۔ خاکی وردی اپنی گرہ سے بنانا اور دائیں بازو پر اخوت کا نشان لگانا۔ آپس میں جب بھی خاکسار ملیں سپاہیانہ طریقہ پر سلام کرنا اور دیگر مسلمانوں کو سلام کہنا۔ خاکسار اپنے خاکسار بھائی کی دکان سے خریداری کرے۔

مسلمانوں میں فرقہ بندی اور مذہبی عقائد پر بحث نہ کرے۔ مسلمانوں سے سیاسی عقیدہ پر بحث نہ کرے۔ کائنات فطرت کے نظام کی طرح خاموشی اختیار کرے اور نظام فطرت پر غور کرے۔ اگر مجموعی طور پر خاکسار تنظیم کے اغراض مقاصد اور اصولوں کا مختصر لفظوں میں ترجمہ کیا جائے تو وہ یہ چار بنتے ہیں۔

غلبہ اسلام - اطاعت امیر - خدمت خلق - سپاہیانہ تنظیم

انہی فکرو نظر کے اصولوں پر خاکسار تنظیم معرض وجود میں آئی اور بہت جلد ہی خاکساروں نے پنجاب سے نکل کر یو پی اور صوبہ سرحد میں بھی کافی اہمیت حاصل کرلی اور اس وقت خاکسار تنظیم شمال مغربی ہندوستان کی موثر اور طاقت ور تنظیم کی صورت میں سامنے آئی۔ جب یہ خاکسار تنظیم زوروں پر

تھی میں اس وقت بہت چھوٹا تھا لیکن ہم بازاروں میں ہر روز شام کے وقت چپ راست کرتے ہوئے منظم جلوس دیکھا کرتے تھے۔ خاکساروں کے جلوس یا پریڈ میں بہت ہی نظم و ضبط ہوتا۔ دیکھنے والے کو اگر صحیح صورت حال کا علم نہ ہو تو خاکساروں کی تنظیم کسی سرکاری تنظیم سے کم تر نظر نہیں آتی تھی۔ بڑے خوبصورت نوجوان بہترین خاکی وردیوں میں ملبوس کندھوں پر چمکدار بیلچے اٹھائے ہوئے جب چپ راست کرتے ہوئے بازاروں میں چلتے تھے تو لوگ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ حسینائیں تصوراتی دنیا میں کھو جایا کرتی تھیں۔ انکے رعب داب سے کائنات تھم جایا کرتی تھی۔ بازاروں میں سکوت طاری ہو جایا کرتا تھا۔ اک کشش تھی اک ولولہ تھا۔

1931ء سے لے کر 1940ء تک خاکسار پنجاب کی طاقت ور تنظیم تھی۔ جمہوریت پر تبصرہ کرتے ہوئے امیر خاکسار حضرت عنایت اللہ خان المشرقی نے فرمایا کہ موجودہ جمہوریت سرمایہ داروں کی جمہوریت ہے۔ اسمبلیوں میں ہر حالت میں سرمایہ دار ہی جاتے ہیں۔ صحیح جمہوریت کے لیے ضروری ہے کہ طبقہ وار حلقہ بندی کی جائے اگر سرمایہ دار ملک میں 5 فی صد ہیں تو انہیں اسمبلی میں پانچ فی صد نمائندگی ملنی چاہیے یعنی اگر اسمبلی کے 100 ممبر ہیں تو ان میں صرف پانچ فی صد سرمایہ دار ممبر ہونے چاہیے اگر درمیانے درجے کے 15 فی صد ہیں تو انہیں اتنی ہی نمائندگی ملنی چاہیے۔ 100 سو کی اسمبلی میں 15 ممبر ہونے چاہیے اگر اسی فی صد غریب لوگ ہیں تو انہیں 80 فی صد نمائندگی ملنی چاہیے۔ 100 کی اسمبلی میں 80 غریب ممبر ہو جاویں۔ اس قسم کی اسمبلی ہو تب جمہوریت چل سکتی ہے اور اسے جمہوری اسمبلی کہا جا سکتا ہے۔ موجودہ نظام جمہوریت میں غریب کی کوئی زندگی نہیں اور نہ اسکا کوئی پرسان حال ہے اور نہ ہی اس کی کوئی داد فریاد ہے۔ جس وقت علامہ صاحب نے خاکسار تحریک کی بنیاد رکھی اس وقت سیاست کے میدان میں قومی جماعت کانگرس تھی جس کی پالیسی عدم تشدد پر مبنی تھی اور اسکے لیڈر مہاتما گاندھی اور دیگر بہت سارے لیڈر تھے۔ جبکہ مسلمانوں میں اس وقت احرار اور جمیعت العلمائے ہند بھی عدم تشدد کی پالیسی پر کاربند تھیں اور انکی قیادت علمائے دین کے پاس تھی۔

علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک نے جب سپاہیانہ زندگی کے ساتھ آزادی کی جدوجہد کا نعرہ بلند کیا تو مسلم نوجوانوں نے حضرت مشرقی کو ہی نجات دہندہ سمجھ کر انہیں کی آواز پر چپ راست کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی انہوں نے وقت کی سیاسی جماعتوں کو بھی نشانہ تنقید بنایا اور فطری بات یہ تھی کہ ایک شخص اپنے آپ کو لیڈر پیش کرتا ہے تو ضروری ہے کہ اس وقت کی دیگر جماعتوں سے بد ظن کرے۔ ایسا کرنے سے ہی عوام کو اپنی طرف راغب کیا جا سکتا ہے۔ وہ کانگرس کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تمہارا زنانہ لیڈر گاندھی اس زنانہ قوم کا سردار ہے جس نے کبھی تلوار نہیں اٹھائی اور یہ ہندو قوم ہمیشہ ہی غلام رہی ہے۔ وہ عدم تشدد کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتا ہے اور وہ آزادی حاصل کرنے کے لیے قوم کو یہ سبق پڑھا رہا ہے کہ حکومت سے مار کھاتے رہو مگر ہاتھ نہ اٹھاؤ اور صرف حکومت کو کوستے رہو۔ جیسے عورتیں مردوں سے مار کھاتی رہتی ہیں اور کوستی رہتی ہیں۔ دیگر وہ فرماتے ہیں کہ چندہ

مانگنے والا رہنما چالاک اور ہوشیار ہے۔ قوم کو دھوکہ دے کر روپیہ بٹورنا چاہتا ہے اس چور اور بدمعاش کی تلاشی لی جائے تو اسکے گھر سے اپنا پیدا کیا ہوا کچھ نہ نکلے گا وہ سب کچھ چوری کا ہو گا۔ اسے ہتھکڑی لگا کر جہنم واصل کیا جانا چاہیے۔ وہ راہنما نہیں خطرناک ڈاکو ہے۔ خواہ اسکی تقریر تمہیں کتنی ہی بھلی معلوم ہو وہ اپنے آپکو سید زادہ کہے گا' محمد رسول اللہ کو نانا کہے گا' اپنے آپکو کملی والے کا نواسہ کہے گا' قادیان کے مرزا غلام احمد کو دجال کہے گا' کافر کہے گا' سب سے پہلے وہ خود کافر ہے وہ قادیانیت کو ختم نہیں کرنا چاہتا۔ وہ مرزا غلام احمد سے چندہ بٹور کر خود عیش و عشرت کی زندگی گزارتا ہے۔ احرار سے متعلق مزید وہ فرماتے ہیں بعض ادنی درجے کے تنخواہ دار کانگرسی کارکنوں نے کانگرس میں مزید نفع نہ دیکھتے ہوئے پنجاب کے ایک بڑے حصہ پر اچھا خاصا اثر پیدا کر لیا ہے۔ ہزاروں مسلمانوں کو جوش دلا کر چندے وصول کئے صدہا لوگوں کو حکومت سے ٹکرا کر انکے گھروں کو برباد کر دیا۔ سادہ لوح مسلمانوں کو کئی بار آزادی کے نام پر دھوکہ دیا۔ لیکن بانیان تحریک پیشہ ور یا ہوشیار جاہلوں کی ملی بھگت تھی۔ جن میں مولویت کی بے عملی کے علاوہ انتہا درجے کا لفنگا پن بھی تھا انکا کام روپیہ کمانے کے علاوہ کچھ نہیں تھا اس وجہ سے قوم کو ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکے۔ سر سید احمد خان اور وقارالملک اور سر آغا خان کی لیڈری کے بعد بھوکے بے علم اور بے رحم راہنماؤں کی یہ وبا ہندوستانی مسلمانوں کے خطرناک زوال کی ایک علامت ہے اور امید ہے کہ اب مسلمان ان پیشہ ور لیڈران کو رد کر دیں گے۔

یہ اوپر کی تحریرات علامہ صاحب کے فرمودات سے ہی اخذ کی گئی ہیں۔ وہ مولویت کی لیڈر شپ کے سخت خلاف تھے اور مولویت کے خلاف انکی اور بھی بہت تحریرات ہیں مگر اس وقت مقصد صرف علامہ صاحب کی سیاسی رجحانات کا ہی اندازہ کرنا ہے کہ آپکی سوچ کے دھارے کس طرف رواں دواں تھے۔

انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ قرآن کی جو یہ آیت ہے اللہ کے نیک بندے زمین کے وارث ہونگے۔ حکمران ہوں گے اس سے مراد ہے کہ جن لوگوں میں حکمرانی کی صلاحیت ہو گی وہ ہی زمین کے وارث ہونگے۔ دنیا پر حکمران ہونگے۔ انہوں نے مولویت کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا اور ایک کتابچہ لکھا تھا جس کا نام تھا مولوی کا غلط مذہب دو پیسے

اسی طرح وہ ایک تحریر میں فرماتے ہیں کہ جو ملاں گھر گھر کے باسی ٹکڑے پس خوردہ سالن میلے اور بدبودار کٹوروں میں کھا کر اپنی مسجد کے میلے اور بدبودار حجرے میں چھپا بیٹھا ہے مہینوں کی میلی اور جراثیم سے بھری مسواک سے دانت صاف کرنے کا دعوی کرتا ہے اور بدبودار پسینے میں بھرے ہوئے نجس کپڑوں کو پہن کر مہینوں تک سردیوں میں غسل نہ کر کے پاکیزہ اور مقدس بنا بیٹھا ہے۔ ناف کے بال خدا کے گھر میں پھینک کر خدا کے گھر کو ناپاک کرتا ہے۔ مذہب کے بہانے بے حیاؤں کی طرح اپنی

لاہور آمد پر جناب بھٹو کا استقبال ...... سابق ایم پی اے طارق وحید بٹ سے ہاتھ ملاتے ہوئے

شرم گاہ کو پکڑ کر لوگوں کو دکھاتا پھرتا ہے۔ جس ملاں نے تاریخ کا ایک صفحہ عمر بھر نہیں پڑھا اور تاریخ کے علم سے نفرت کرتا ہے وہ قرآن کریم کی ایک آیت کا ترجمہ نہیں کر سکتا مگر طوطے کی طرح قرآن کریم رٹ رہا ہے وہ قرآن کے مفہوم کو کیا سمجھے گا اور انہوں نے اپنی تحریرات میں کئی جگہ فرمایا کہ اقوام یورپ ہی خدا کے نیک بندے ہیں۔ جنہوں نے فطرت کے قوانین کو سمجھتے ہوئے تدبر اور غور کرتے ہوئے حکم خداوند کے مطابق ایجادات کی ہیں اور عوام الناس کو فائدہ پہنچایا ہے اور انہوں نے کئی بار فرمایا کہ فطرت کے علوم سے ہی لوگوں کے لیے انسانوں کے لیے فائدہ بخش راہیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

حضرت علامہ مشرقی مولویت کے خلاف تھے وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی ترقی میں مولویت حائل ہے۔ جب تک لوگوں میں سائنٹیفک علم کا رواج نہیں ہو گا جب تک لوگ جدیدیت کی طرف راغب نہیں ہونگے' جب تک لوگ پرانے دقیانوسی خیالات سے چھٹکارا حاصل نہیں کریں گے اس وقت تک ہندوستان کے مسلمان پسماندہ رہیں گے اور انکا مقدر کبھی نہیں سنورے گا۔

دیگر جماعتوں کے رضاکاروں کی پریڈ

(حضرت علامہ مشرقی کے خیالات اور افکار اور علامہ صاحب کا مولویت کے خلاف مہم کی وجہ سے مجلس احرار جس کی قیادت مولوی ہی کر رہے تھے اور پنجاب میں احرار بھی اس وقت مضبوط جماعت تھی۔ انہوں نے بھی اپنی رضاکار تنظیم قائم کر لی اب ہر روز شام کے وقت جہاں بازاروں میں خاکسار پریڈ کرتے تھے احرار رضاکاروں نے بھی اسی سج دھج سے ہر روز شام کے وقت بازاروں میں پریڈ شروع کر دی انکے جیش بھی چپ راست کرتے ہوئے بازاروں سے دھوم دھڑک سے ساتھ گزر رہے ہیں۔ پھر احرار والوں نے ایک اور بھی کام کیا کہ فوجی بینڈ بھی خرید لئے۔ اب شام کو جب احرار رضاکار پریڈ کرتے تھے تو انکے آگے بینڈ بھی بج رہا ہوتا تھا بینڈ کی وجہ سے احرار رضاکاروں کی پریڈ کو زیادہ پسند کیا جانے لگا۔ اس وقت شام کے وقت پریڈ ایک عام رواج سا بن گیا تھا لوگ بھی یہ سب کچھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے اب اس ساری دھوم دھام سے ہندو سکھ کیوں پیچھے رہ جاویں سکھوں نے ایک اسی قسم کی تنظیم اگنی دل کے نام سے قائم کر لی اور اگنی دل کے جیش بھی بازاروں میں پریڈ کر رہے ہیں بجہ کمبہ کمہ کر وہ بھی اپنے جیش کو حرکت میں لا رہے ہیں اب ہندو نوجوانوں بھی حرکت میں آ گئے وہ کیوں پیچھے رہ جاویں انہوں نے شکتی دل کے نام سے ایک رضاکار تنظیم قائم کر لی وہ بھی متحرک ہو گئے اب بازاروں میں سر شام پریڈ کرنے والے جیوش کا ہجوم ہو گیا اب سرکار کو فکر لاحق ہو گئی کہ کیا کیا جائے سکندر حیات اس وقت پنجاب کے وزیر اعظم تھے یونینسٹ کولیشن گورنمنٹ تھی حکومت میں ہندو سکھ بھی شامل تھے بڑے غورو فکر کے بعد حکومت اس نتیجہ پر پہنچی کہ تمام نیم فوجی

گروہ بندیوں کو خلاف قانون قرار دیا جائے۔

خاکسار اور ہٹلر

خاکساروں اور دیگر عسکری تنظیموں کو خلاف قانون قرار دینے کی وجوہ میں ایک وجہ یہ بھی تھی کی اس وقت فرانس، ہالینڈ، بیلجیم، جرمنی کے آگے سرنگوں ہو چکے تھے اور جنگ کے بادل مغربی دنیا پر گھرے سے گھرے ہوتے جا رہے تھے۔ خاکسار جماعت کے ساتھ وابستہ رضاکار لوگوں میں عوام میں یہ تاثر دیتے تھے کہ ہٹلر کی نازی پارٹی بھی خاکساروں کی ہی حلیف جماعت ہے اور ساتھ یہ بھی دیکھا گیا جرمنی کے چانسلر ہٹلر کی تصویر علامہ صاحب کے ساتھ بنی ہوئی ہے ہٹلر اور علامہ صاحب نے کندھے پر بیلچہ اٹھایا ہوا ہے اور پریڈ کر رہے ہیں۔ پھر خاکساروں کے کندھوں پر جو اخوت کا بیج ہے اس پر جو کراس لگے ہوئے ہیں وہ بھی جرمنی کی نازی پارٹی کے رضاکار کندوں پر جو بیج لگاتے تھے اسکے ساتھ ملتا جلتا ہے پھر اور بھی بہت ساری تصویریں جو اس زمانے میں خاکساروں کی دفاتر میں لگی ہوئی تھی یا خاکسار رضاکاروں کے گھروں میں لگی ہوتی تھیں ان سے یہ تاثر ملتا تھا کہ جرمنی کی نازی پارٹی اور ہندوستان کی خاکسار ایک ہی جماعت کی دو حصے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے وقت جرمنی کی طاقت دنیا کی واحد سپرپاور والی طاقت تھی فرانس جو اس وقت بھی سپرپاور تھا وہ صرف گیارہ دن میں ہی جرمنی کے آگے سرنگوں ہو گیا تھا ہندوستانی عوام میں یہ تاثر عام تھا کہ جرمنی کی شکست ناممکن ہے اور ہٹلر کا جرمنی ہر حالت میں کامیاب ہو گا اور فتح کی صورت میں ہندوستانی سیاست کی باگ ڈور نازی پارٹی کی حلیف جماعت خاکسار کے پاس ہو گی اور خاکساروں کی فوجی تربیت بھی ہٹلر کی فتوحات کا ہی ایک حصہ ہے۔ میں نے اس وقت 1944ء میں بھی بزرگ خاکساروں سے ہٹلر جرمنی اور خاکساروں کے تعلق کے بارے میں پوچھا تو وہ پورے یقین کے ساتھ تعلقات پر نازاں تھے اور وہ کہتے تھے کہ روس کا بیڑا غرق ہو جس نے جرمنی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کا راستہ نہیں دیا۔ ورنہ سارا ہندوستان ہی اس وقت پاکستان ہوتا۔ بزرگ خاکساروں کا یہ تاثر حقیقت پر مبنی نہیں اگر ہندوستان پر حملہ کرنا جرمنی کے لیے آسان ہوتا تو اسکے پاس روس کے علاوہ بھی کئی اور راستے تھے وہ ان دیگر راستوں سے بھی حملہ آور ہو سکتا تھا مگر یہ تمام راستے بھی اتحادی فوجوں کے قبضہ میں تھے۔ گو جرمنی نے یورپ کے بہت بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تھا مگر ایشیا پر بدستور اتحادی فوجوں کا ہی قبضہ تھا۔ بلکہ ایشیا کے زیادہ حصہ پر برطانیہ کا قبضہ تھا۔ جرمنی کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے لیے بہت زیادہ دشواریوں کا سامنا تھا۔ خاکسار جرمنی کی نازی پارٹی یا ہٹلر کو اپنا حلیف کہتے تھے مگر شواہد سے اس رفاقت کی تصدیق نہیں ہوتی پھر بھی حکومت کی نظر میں خاکسار مشکوک ہو

گئے تھے۔ اس وقت جنگ زوروں پر تھی حکومت کو جنگ کی فتح کے لیے معاونین کی ضرورت تھی۔ مگر خاکسار تحریک یہ تاثر دے رہے تھے کہ ہم جرمنی کے ساتھی ہیں حکومت کے لیے یہ تاثر بھی تشویس ناک تھا۔ یہی حالات پنجاب کی تمام عسکری تنظیمیں جن میں گانتی دل' اکالی دل' شکتی دل' احرار' خاکسار اور دیگر ہندو عسکری تنظیمیں شامل تھیں۔ حکومت پنجاب نے فروری 1940ء کو خلاف قانون قرار دیں اور پنجاب کی کسی تنظیم کو بھی برسرعام وردی پہن کر تنظیم کے ساتھ پریڈ کرنے کی اجازت نہ تھی، اور پریڈ کے ہال کو خلاف قانون قرار دیا گیا باقی ساری تنظیمیں تو خلاف قانون حکم کے نافذ ہوتے ہی اپنے پریڈ کے دھندے سے باز آ گئیں مگر خاکساروں نے اس حکم کو عملی طور پر نہ مانا اور خلاف ورزی کی حکم عدلی کی ٹھان لی

لاہور میں خاکساروں پر گولی چل گئی

حکومت پنجاب کے حکم کی حکم عدولی کے لیے خاکسار جماعت نے 19 مارچ 1940ء کا دن مقرر کیا۔ اس روز خاکساروں نے لاہور میں جمع ہو کر حکومت پنجاب کے حکم کی خلاف ورزی کرنی تھی۔ پروگرام اس طرح مرتب کیا گیا کہ بھاٹی دروازے کے اندر محلہ شیش محل نزد اونچی مسجد سے خاکساروں نے پریڈ کرتے ہوئے شاہی مسجد میں جانا تھا وہاں جمعہ کی نماز پڑھنی تھی اور وہاں سے 313 تین سو تیرا خاکساروں نے سروں پر کفن باندھ کر پریڈ کرتے ہوئے منٹو پارک جانا تھا یہ پروگرام خاکساروں نے اپنی ماتحت جماعتوں کو بھیج دیا تھا اور اس پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے لیے خاکسار لاہور میں آنا شروع ہو گئے تھے اور ضروری تعداد میں خاکسار مورخہ 1941 کو لاہور پہنچ گئے تھے۔ اور راہبر تحریک علامہ مشرقی حکومت کے ساتھ بات چیت بھی کر رہے تھے۔ بات چیت کی ناکامی کے بعد علامہ صاحب صدر مسلم لیگ مسٹر جناح سے بھی ملے انہیں صورت حال سے آگاہ کیا اور مسٹر جناح نے انہیں کہا کہ 23 مارچ کو لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس ہو رہا ہے وہاں اس معاملے کو سلجھانے کی کوشش کی جائے گی۔

مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا کچھ حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ کئی نوجوانوں کی جانیں لقمہ اجل بن گئیں۔ ہوا یوں کہ پروگرام کے مطابق خاکساروں نے اندرون بھاٹی نزد مسجد اونچی جمع ہونا تھا اور اس جگہ کے قریب ہی تھانہ ٹبی تھا۔ سی آئی ڈی کی رپورٹ کے مطابق خاکساروں کا جو پروگرام تھا اسکی روک تھام کے لیے انتظامیہ لاہور بھی مستعد تھی اور انہیں یہ بھی شک ہو چکا تھا کہ کانگرس اور احرار کے جلوسوں کی طرح خاکساروں کا جلوس عدم تشدد پر کاربند نہیں ہو گا۔ ہو سکتا ہے خاکسار تشدد سے کام لیں اس لیے انہوں نے تھانہ ٹبی میں پولیس کی نفری کو ناکافی سمجھتے ہوئے جو صرف 21 اکیس جوان جن کے پاس لاٹھیاں ہی تھیں مطمئن نہ تھے۔ انہوں نے مزید فورس منگوانے کا آرڈر پولیس لائن کو دے دیا ہوا تھا۔ پروگرام کے مطابق مقررہ جگہ خاکسار جمع ہونا شروع ہو گئے اور چار چار کی

قطاروں میں کھڑے تھے

پولیس افسران نے قطاروں میں کھڑے بیلچہ بردار خاکسار نوجوان سے پوچھا کہ ادھر کیا کر رہے ہو اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ پھر سالار جیش سے دریافت کیا تو اس نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا اطاعت امیر۔ اس گفتگو کے بعد پولیس افسران آپس میں گفتگو کر رہے تھے اور ملازمین کو ہدایات دے رہے تھے کہ بازار حکیماں کی طرف سے دوڑتے ہوئے 313 خاکسار نمودار ہوئے۔ قریب پہنچ کر انہوں نے سالار کے حکم سے تیز دھار بیلچے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ انگریز ایس ایس پی جس کے پاس اس وقت 21 اکیس جوان موجود تھے انہیں حکم دیا کہ خاکساروں کے جیش کو روکا جائے۔ اس پر خاکساروں نے پولیس رکاوٹ توڑنے کے لیے زور لگایا مگر وہ کامیاب نہ ہوئے کہ ایک دو مرتبہ انہوں نے مزید کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ سالار جیش کی آواز پھر بلند ہوئی "جیش فیدر بزن" خاکساروں کے پاس چمک دار بیلچے جو تلوار کی دھار سے زیادہ تیز تھے وہ ہوا میں بلند ہوئے اور پولیس پر حملہ آور ہو گئے۔ 21 پولیس ملازمین بھی زخمی ہو گئے اور ایس پی لاہور مسٹر گینس شدید زخمی ہونے کے بعد میو ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ سپاہی نیت رام موقع پر ہی مر گیا۔ مسٹر گینس خود اور دیگر پولیس افسران کی ہدایت کے مطابق جب پولیس کمک جائے وقوع پر پہنچی تو اس وقت تک پولیس کی لاٹھی بردار 21 نوجوانوں پر مشتمل فورس پر حملہ ہو چکا تھا اور وہ زخمی بھی ہو چکے تھے۔ خاکساروں نے ہیرا منڈی کی طرف بھاگنا شروع کر دیا آگے سے انگریز پولیس افسر مسٹر بیٹی بھی 250 پولیس جوانوں کے ساتھ مد مقابل آ گئے۔ خاکساروں نے انگریز پولیس افسر مسٹر بیٹی پر حملہ کر دیا وہ شدید زخمی ہو کر مر گیا۔ بقایا پولیس والوں نے بغیر کسی افسر کے حکم سے خاکساروں پر گولی چلانا شروع کر دی۔ خاکسار جیش بھاگنا شروع ہو گئے۔ جو خاکسار لاہور شہر کے تھے وہ تو بچ بچا کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے مگر جو باہر سے آئے ہوئے تھے وہ لوگوں کے گھروں میں پناہ لینے کے لیے داخل ہونے لگ گئے۔ کئی خاکسار طوائفوں کے مکانوں میں داخل ہو گئے۔

ایک انگریز پولیس افسر نے اپنے انگریز پولیس افسر کے قتل کا خوب بدلہ لیا جو خاکسار رنڈیوں کے کوٹھوں پر چڑھ گئے تھے اس انگریز افسر نے رنڈیوں کے کوٹھوں پر چڑھ کر چھپے ہوئے خاکساروں کو گولیوں کا نشانہ بناتا اور ساتھ وہ نیم مردہ خاکساروں کی لاشوں کو کوٹھوں سے نیچے پھینک دیتا۔ اس خونی تصادم میں 36 خاکسار مارے گئے اور بہت سارے زخمی ہوئے۔ مسلم لیگ کا اجلاس 23/3/40 کو منٹو پارک لاہور میں منعقد ہوا اور اس میں خاکسار مقتولین کے واقعہ پر افسوس کا اظہار کیا گیا۔ مسلم لیگی لیڈران نے زخمی خاکساروں کی عیادت بھی کی۔

اس تصادم کے بعد خاکسار جماعت کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ 184 ایک سو چوراسی خاکسار اس تصادم میں گرفتار کر لیے گئے۔ جو 21 زخمی خاکسار تھے انہیں عمر قید کی سزا دے کر کالا پانی بھیج دیا گیا۔

خاکسار ہیڈ کوارٹر ادارہ عالیہ پر حکومت نے قبضہ کر لیا علامہ مشرقی جو اس خونی ڈرامہ سے چند روز قبل دہلی چلے گئے تھے وہاں سے گرفتار کر کے واپس لائے جا چکے تھے۔ لاہور کی بہت ساری مساجد میں خاکساروں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ خاکساروں کا مرکز سنہری مسجد اور مسجد کشمیری بازار تھا انہیں مساجد میں خاکسار لاؤڈ سپیکر لگا کر تقریر حکومت کے خلاف کیا کرتا تھے۔ عبد الجبار نامی خاکسار زیادہ وقت حکومت کے خلاف تقریر کیا کرتا تھا وہ بہت اچھا مقرر تھا۔ مسجد میں مقیم خاکساروں کو کھانے کی تکلیف نہ تھی۔ اہل محلہ انکے لیے کھانا بھیج دیا کرتے تھے جب کبھی حکومت ان مسجدوں میں مقیم خاکساروں کا محاسبہ کرتی تو عورتوں کے ذریعے کھانا بھیج دیا جاتا تھا۔ وہ برقعوں میں چھپا کر کھانا مسجدوں میں لے جایا کرتی تھیں۔ مسجدوں میں داخل ہو کر خاکساروں کو گرفتار کرنا منع تھا۔ اس لیے پولیس مسجدوں میں داخل نہیں ہوتی تھی مگر مسجدوں کی ناکہ بندی بدستور جاری تھی۔ پولیس کی ناکہ بندی تو مسجدوں پر تھی خاکسار مسجد میں پناہ لیے ہوتے تھے کھانا انکو نہیں جانے دیا جاتا تھا جو چھپ چھپا کر لوگ عورتوں کے ذریعے یا کسی اور ذریعے سے بھیج دیتے۔ مگر پولیس بدستور مسجدوں کی ناکہ بندی کئے ہوئے تھی۔ حکومت نے ان علاقوں کے لیے جہاں خاکسار چھپے ہوئے تھے اس علاقے کے لیے ہنگامی حالات نافذ کر دی۔ ان پر آنسو گیس کے گولے پھینک کر شب خون مار کر مسجدوں کے تالے توڑ کر پناہ لیے ہوئے خاکساروں کو گرفتار کیا گیا۔ جنکی تعداد تین صد سے زائد تھی جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ خاکسار اپنا تعلق جرمنی کی نازی پارٹی اور ہٹلر سے ظاہر کرتے تھے۔ گورنمنٹ کے اس شک کے پیش نظر مزید تفتیش کی گئی مگر کوئی پیش رفت نہ ہوئی جن پناہ گزین خاکساروں کو مسجدوں سے گرفتار کیا گیا تھا وہ تین ماہ تک مسجدوں میں پناہ گزین رہے۔

انہیں ایام میں پنڈت نہرو لاہور میں تشریف لائے تھے انہوں نے ایک بیان میں حکومت کی اس پکڑ دھکڑ کی کاروائی کی مذمت کی تھی اور کہا کہ اگر حکومت کو کوئی شبہ ہے کہ خاکسار جماعت کا تعلق جرمن کی نازی پارٹی یا ہٹلر سے ہے تو الزام منظر عام پر لایا جائے اور اسکا مقدمہ کھلی عدالت میں چلایا جائے ورنہ یہ پکڑ دھکڑ اور خوف و ہراس بند کیا جائے اور دیگر یہ کہ گورنمنٹ نے جن علاقوں میں ہنگامی حالات نافذ کئے ہوئے ہیں وہاں خاکساروں کے علاوہ دیگر لوگ بھی رہتے ہیں اسی بہانے انہیں تنگ کیا جا رہا ہے۔ خوف زدہ کیا جا رہا ہے۔ اور حکومت کا تعزیری ٹیکس بھی قابل مذمت ہے۔ انہیں ایام میں حضرت مولانا احمد علی لاہوری نے بھی مسجدوں میں پناہ گزین خاکساروں کی ہمدردی میں ایک بیان دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ حکومت کا یہ اقدام مسجدوں کی ناکہ بندی کرنا قابل مذمت ہے اور حکومت کو یہ طریقہ ختم کر دینا چاہیے۔ حضرت مولانا احمد علی کو انہیں ایام میں ڈیفنس آف انڈیا کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔

1940 کو علامہ مشرقی دہلی میں تھے۔ انہیں اس حادثہ کی اطلاع شام کو دلی سے شائع ہونے

والے اخبار کے مطالعہ سے ہوئی۔ پولیس نے انہیں جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے گرفتار کر لیا۔ انہیں 46 ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا جس جگہ وہ ٹھہرے ہوئے تھے اس مکان کا سارا سامان بھی پولیس نے اپنے قبضہ میں لے لیا اور دہلی کی خاکسار تنظیم کو بھی خلاف قانون قرار دیا گیا۔ گرفتاری کے وقت خاکسار رہنما نے پولیس کے روبرو بیان دیا تھا کہ مجھے ڈیفنس آف انڈیا کے تحت نظر بند کیا جا رہا ہے حالانکہ میں نے جنگ میں حکومت برطانیہ کو پچاس ہزار خاکسار دینے کا وعدہ کیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے علامہ صاحب سے کہا کہ جیل میں آپ سے بہتر سلوک کیا جائے گا آپ کو سپیشل قیدی کے طور پر رکھا جائے گا۔ علامہ مشرقی کو گرفتار کر کے ولور جیل بھیج دیا گیا اور انہیں تین سال نظر بند رکھنے کے بعد رہا کر دیا گیا۔ خاکسار رضاکار روایت یوں بھی بیان کرتے ہیں کہ ولور جیل میں ہی مسٹر سی راج گوپال اچاریہ بھی قید تھے وہاں پر ہی انکی ملاقات مسٹر اچاریہ سے ہوئی اور علامہ صاحب نے انہیں اپنے رنگ میں رنگ لیا اور وہ پاکستان کے حامی بن گئے اور انہوں نے کانگرس ورکنگ کمیٹی میں تقسیم ہند کی حمایت کی تھی۔ ویسے تو حکومت یو پی کے ساتھ بھی خاکساروں کا تصادم ہوا مگر اس میں خاکساروں کو فائدہ پنجاب میں ہوا اس لیے کہ یو پی کی حکومت کانگرسی تھے اسکے خلاف پنجاب کے مسلم پریس نے زور دار پراپیگنڈہ کیا جس کا فائدہ خاکساروں کو بہت زیادہ ہوا اور پنجاب کے مسلم خاکساروں کے زیادہ حامی بن گئے مگر پنجاب کے حادثہ نے خاکساروں کی کمر توڑ کر رکھ دی اور خاکسار پھر پنپ نہ سکے۔

گولی چلنے کے بعد حالات

خاکسار جماعت کے ایک برگزیدہ جناب غازی عبدالصمد سراجدین صاحب نے سوال جواب کے انداز میں 1993ء میں ہی خاکسار جماعت کے حالات اقوال اور ذہنیت پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ غازی صاحب حیدر آباد دکن کے رہنے والے 1912ء میں پیدا ہوئے۔ ابتداء ہی میں حاکسار تحریک میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے 15 اگست 1982ء میں ایک پمفلٹ جاری کیا جس کی چند سطور ملاحظہ ہوں۔

وہ فرماتے ہیں کہ حادثہ لاہور کے بعد حضرت مشرقی ولور جیل میں تھے تو انکا مجھے حکم نامہ ملا کہ میری رہائی کا بندوبست کرو۔ جنوبی ہند کا دورہ کر کے 25000 ہزار رضاکار بھرتی کرو اور اور ولور جیل سے علامہ مشرقی کی رہائی کا بندوبست کرو۔ حکم نامہ ملنے پر میں محترم سید حسین جانباز' محترم عبدالارباب شور بی اے۔ محترم عبدالرزاق ذبیح کو ہمراہ لے کر جنوبی ہند کے تمام شہروں کا دورہ شروع کر دیا۔ اور خاکساروں کی بھرتی اور تنظیم عمل میں لاتا رہا۔ جلسہ ہائے عام میں تقاریر کر کے خاکسار تحریک کو عوام الناس سے روشناس کراتا رہا' حکومت ہند نے ہمیں گرفتار کرنے کے وارنٹ جاری کر دیے۔ ہم آگے

کام کر رہے تھے وارنٹ ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ آخرکار مدراس شہر جامع مسجد والا جاہی کے ایک لاکھ سے زائد عوام سے خطاب کر کے دفتر پہنچا تو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا گیا اور مدراس جیل میں قید کر دیا۔ اور علامہ صاحب کی رہائی کے متعلق جنوبی ہند میں خاکسار جماعتوں کو منظم کیا گیا مدراس' بنگلور' مالابار' ٹراونکور کے تمام بڑے بڑے شہروں میں خاکساروں کی بھرتی کے دفاتر قائم کیے گئے۔ بے پناہ عمل نے حکومت پر کافی دباؤ ڈالا دوسری طرف علامہ صاحب نے جیل میں تادم مرگ روزہ رکھنے پر انگریز کو مجبور کر دیا کہ وہ علامہ مشرقی کو رہا کر دے اور علامہ صاحب کو رہا کر دیا گیا۔ اسی پمفلٹ کے صفحہ نمبر10 پر غازی صاحب فرماتے ہیں کہ مجاہد اعظم حضرت علامہ عنایت اللہ خان المشرقی انگریزوں سے بزور طاقت اقتدار لینا چاہتے تھے وہ مزید فرماتے ہیں کہ اگر حضرت علامہ صاحب اپنے پروگرام میں کامیاب ہو جاتے تو پورا ہندوستان ہی پاکستان ہونا تھا یہ جناح والا لنگڑا لولا پاکستان نہ ہونا تھا۔ اسی پمفلٹ کے صفحہ آٹھ پر غازی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت علامہ صاحب اور خاکسار آئینی جدوجہد کے قائل نہ تھے۔ وہ انگریز سے بزور طاقت اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے وہ اسی پمفلٹ کے صفحہ سات پر فرماتے ہیں کہ 1940 کو خاکساروں پر حکومت کا جو تشدد ہوا تھا اسکی وجہ سے خاکسار تحریک کو بہت نقصان ہوا تعلیم یافتہ اور متمول گھرانوں کے نوجوانوں نے خاکسار تحریک سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور مجموعی طور پر خاکسار تحریک خصوصی طور پر پنجاب میں زوال پزیر ہو گئی۔

23 مارچ 1940ء کو لاہور مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے خاکساروں پر گولی چلنے کے واقعہ پر افسوس کا اظہار کیا گیا اور ساتھ ہی خاکساروں سے وعدہ کیا گیا کہ حکومت پنجاب سے انکی صلح کرا دیں گے۔ 19 اپریل کو بذریعہ تار مسٹر جناح سے درخواست کی گئی کہ ہم قرارداد لاہور کے نتائج کے منتظر ہیں کہ سکندر حیات سے ہماری صلح کرا دی جائے۔ مگر مسلم لیگ کے اجلاس میرٹھ میں یہ تجویز بھی زیر غور آئی کہ کیوں نہ خاکسار تنظیم کا امیر بہادر یار جنگ کو بنا دیا جائے۔'

28 جولائی روزنامہ انقلاب لاہور نے مندرجہ ذیل خبر شائع کی

تحریک خاکسار کے امیر علامہ عنایت اللہ خان المشرقی نے مدراس جیل سے سندھ کے خاکسار لیڈر علی احمد تالپور اور شیر اکبر کو ہدایت کی کہ وہ پنجاب کے وزیر اعظم سے مل کر ان سے درخواست کریں کہ

خاکسار حکومت سے تعاون کرنے کو ہر وقت تیار ہیں نیز پنجاب کے خاکساروں کو قانون کے احترام کی تاکید کریں۔

علامہ صاحب جنوری 1943ء کو رہا کیے گئے لاہور پہنچنے پر خاکساروں نے سٹیشن پر انکا استقبال کیا۔

رہائی کے ایک ہفتہ بعد علامہ صاحب 9 جنوری کو بادشاہی مسجد میں خاکساروں کو

نیا پروگرام دیا اس جلسہ میں ہندو سکھ مسلمان سب شریک تھے جلسہ گاہ میں ہندوؤں کا جھنڈا جس پر اوم لکھا ہوا تھا وہ بھی لہرا رہا تھا اس جھنڈے لہرانے کی رسم پنڈت امرناتھ جوشی نے ادا کی۔ اسکے علاوہ لالہ کلیان داس اور گیانی لال سنگھ نے بھی جلسہ کو خطاب کیا۔ حضرت علامہ صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ ہندو مسلم اتحاد سے ہی ملک آزاد ہو سکتا ہے آؤ سب ملکر 5 لاکھ رضاکار جانباز پیدا کریں جو کٹ مرنے کے لیے تیار ہوں تب ملک آزاد ہو گا۔ ورنہ جو آزادی ہمیں مانگنے سے ملے گی وہ عوام کو کوئی خوشی نہ دے سکے گی اس کا فائدہ ٹاٹوں اور برلوں کو ہی ہو گا۔

تقسیم ہند سے قبل راقم الحروف نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ خاکساروں کی پریڈ میں ہندو سکھ بھی ہوا کرتے تھے اور ہر رضاکار نے متبرک کتاب گلے میں ڈالی ہوتی تھی۔ ہندو رضاکار دوران پریڈ رامائن گلے میں ڈالے ہوتے تھے سکھ رضاکار دوران پریڈ گرنتھ صاحب اسی طرح مسلمان رضاکار قرآن کریم گلے میں ڈال کر پریڈ کیا کرتے تھے اور امیر جماعت ہر رضا کار کو اپنے مذہب پر چلنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔

1944ء میں اس وقت کے مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح پر بمبئی میں انکے گھر میں ہی چاقو سے قاتلانہ حملہ کیا گیا حملہ آور کا نام محمد رفیق تھا اور وہ لاہور مزنگ کا رہنے والا تھا اور اس کا خاکسار جماعت سے تعلق بتایا جاتا ہے۔ محمد رفیق مزنگوی وہیں موقع پر گرفتار ہو گیا تھا بمبئی میں مقدمہ چلایا گیا تھا اور محمد رفیق ملزم کو ارادہ قتل کے جرم میں پانچ سال قید ہوئی تھی اور وہ قید بھگتنے کے بعد ہندوستان میں رہ گیا تھا واپس لاہور پاکستان میں نہیں آیا تھا۔ خاکسار جماعت نے رفیق کے خاکسار ہونے کی تردید کی تھی اور علامہ عبدالصمد سراجدین صاحب نے بھی اپنے پمفلٹ میں لکھا ہے کہ رفیق مزنگوی کا خاکسار جماعت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ علامہ عبدالصمد سراجدین صاحب مزید اپنے پمفلٹ میں فرماتے ہیں کہ حیدر آباد دکن اور جنوبی ہندوستان میں جو خاکسار تنظیم ہم نے قائم کی تھی قاسم رضوی ایڈووکیٹ اس خاکسار تنظیم کے سالار تھے وہی خاکساروں کی عسکری تنظیم تقسیم ہند کے بعد اتحاد المسلمین بن گئی اور حیدر آباد کے مسلم نوجوان بہت زیادہ تعداد میں رضاکار بنے اور مجلس اتحاد المسلمین کے رضاکاروں نے ہی نواب حیدر آباد کو ہندوستان میں شامل ہونے سے روکے رکھا اور اسی جماعت کے سربراہ قاسم رضوی تھے اور حیدر آباد کے وزیراعظم میر لائق علی اور مرحوم بہادر یار جنگ کا تعلق بھی خاکساروں سے ہی تھا۔ اور اتحاد المسلمین کے رضاکاروں نے ہی ریاست حیدر آباد پر ہندوستان کا قبضہ روکنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں ہزاروں رضاکار شہید ہوئے تھے۔

تقسیم ہند اور خاکسار

علامہ مشرقی اور خاکسار اپنے مشن پر رواں دواں تھے کہ تقسیم ہند کی بات چیت آخری مرحلے میں داخل ہو گئی اب محسوس ہونے لگ گیا تھا کہ پاکستان بن کے رہے گا۔ 16 تا 23 اگست 1991ء کے

الاصلاح کے ایک مضمون کی چند سطور ملاحظہ ہوں۔

25 مارچ 1946ء کو جب کرپس مشن آیا تو اس موقع پر علامہ مشرقی صاحب نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ مجھے یقین ہے کہ جب تک پاکستان کو واضح طور پر تسلیم نہ کر لیا جائے اس وقت تک ہندوستان کی آزادی تسلیم نہ ہو گی۔ مسٹر جناح اگر پاکستان کے حصول میں پوری طرح مخلص ہیں تو میں نہایت کشادہ دلی سے ایک بار پھر انہیں خاکسار تحریک کی خدمات غیر مشروط طور پر پیش کرتا ہوں اور میں یقین دلاتا ہوں کہ میری اس پیش کش میں کوئی بد دیانتی ہرگز نہ ہو گی ہر خاکسار اس راہ میں جان کی بازی تک لگا دے گا۔ حضرت علامہ کی پر خلوص پیش کش کو قابل توجہ نہیں سمجھا گیا اور انکی التجا شیش محل کے بند دروازوں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ انکی آواز صدا بصحرا ہو کر رہ گئی۔ انکے درد مند دل کو بے رخی کی برچھیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ انکی قربانیوں کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ انکی بے بدل صلاحیتوں کو کچل کر رکھ دیا گیا۔ انکی پندرہ سالہ صبر آزما جدوجہد اس دیوار کو گرا نہ سکی جو فرنگی سیاست برہمن عیاری اور بعض مسلم لیگیوں کی مفاد پرستی نے انکے اور قائد اعظم کے درمیان کھڑی کر دی تھی۔ اسکے بعد علامہ مشرقی نے ایک فیصلہ کیا انہوں نے حکم دیا کہ 30 جون 1947ء تک تین لاکھ خاکسار دہلی میں جامع مسجد اور لال قلعہ کی درمیانی جگہ پر جمع ہو جائیں۔ اگر تین لاکھ خاکسار دہلی میں جمع ہو گئے تو پھر پروگرام بتایا جائے گا ورنہ تحریک کو ختم کر دیا جائے گا۔

تمام ہندوستان میں جہاں بھی خاکسار تھے وہ دہلی کی طرف گامزن ہو گئے۔ تلوار کی دھار سے زیادہ تیز چمک دار بیلچے کندھوں پر اٹھائے ہوئے مارچ کرتے ہوئے دہلی کی طرف رواں دواں تھے۔ اس وقت راقم الحروف کی عمر بیس سال تھی۔ 1945ء کے انتخابات میں حق رائے دہی بھی استعمال کیا تھا۔ سیاسی شعور بھی تھوڑا بہت تھا خاکسار رضاکار اس انداز سے دہلی کی طرف رواں دواں تھے جیسے کسی بہت بڑی مہم پر جا رہے ہیں۔ اس وقت تقریباً 48 سال گزر جانے کے بعد میں نے جب خاکساروں پر یہ مضمون لکھنے کا ارادہ کیا تو کئی بزرگ خاکساروں سے جو 1947ء میں دہلی میں جمع ہونے کی مہم میں شامل ہوئے ان سے پوچھا کہ دہلی کے اس اجتماع کا مقصد کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ خفیہ طور پر خاکساروں کو یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ ہر خاکسار بیلچے کے علاوہ دیگر اسلحہ جو بھی اسے مہیا ہو سکتا ہو ساتھ لے کر آئے اور ان بزرگوں نے فرمایا کہ ہم بھی پستول بندوقیں وغیرہ چھپا کر ساتھ لے کر دہلی گئے تھے اور انکا کہنا یہ تھا کہ دیگر تمام خاکسار بھی اسلحہ ساتھ لے کر دہلی گئے تھے۔ دہلی میں چونکہ تین لاکھ خاکسار جمع نہ ہوئے تھے اس وجہ سے علامہ مشرقی صاحب نے خاکسار تنظیم ہی ختم کر دی۔ اس سلسلہ میں میں نے کئی بزرگ خاکساروں کی رائے معلوم کی کہ اگر تین لاکھ خاکسار دہلی می جمع ہو جاتے تو پھر علامہ صاحب کا متوقع حکم کیا ہوتا تھا۔ ہر بزرگ خاکسار کی رائے تقریباً یہی تھی کہ اگر تین لاکھ مسلح خاکسار دہلی میں جمع ہو جاتے تو پھر پاکستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور پاکستان دہلی تک ہوتا اور ان تین لاکھ مسلح خاکساروں کے ذریعے مشرقی پنجاب اور دہلی پر قبضہ ہو جاتا اور پاکستان کی سرحدیں جمنا تک ہو جاتی تھی اور یہ مسلم قوم کی بد قسمتی تھی کہ خاکسار مطلوبہ تعداد میں دہلی نہ پہنچے ورنہ پاکستان دہلی تک

ہوتااور لال قلعہ پر پاکستان کا جھنڈا ہوتا اور کشمیر کا بھی کوئی جھگڑا نہ ہوتا۔ خاکسار جماعت توڑنے کا اعلامیہ جو خاکساروں میں تقسیم کیا گیا تھا اسکے آخر میں یہ شعر بھی لکھا گیا تھا۔

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی مگر ساحل سے نہ ٹکرائی

تنقید و تبصرہ

حضرت علامہ مشرقی امرتسر کے ایک علمی اور متمول گھرانے میں پیدا ہوئے وہ انتہائی ذہین نوجوان ثابت ہوئے۔ 16 سال کی عمر میں ہی انہوں نے ایم اے کر لیا اور پنجاب میں اول پوزیشن حاصل کی اور پھر وہ مزید علم حاصل کرنے کے لئے دیار غیر میں چلے گئے۔ وہاں بھی انہوں نے اپنی علمی قابلیت اور ذہانت کا لوہا منوایا۔ برطانیہ اور دیگر یورپ کے اخبارات نے ان کی قابلیت کی تعریف کی۔ جب تعلیم مکمل کر کے لندن سے واپس آئے تو ان کے نام کے ساتھ علمی کامیابی اور ڈگریاں اتنی تھیں کہ کوئی عام شخص کسی نام کے ساتھ چسپاں اتنی ڈگریاں دیکھنے کے بعد ڈگریوں کی اہمیت سے بھی انکار کر سکتا تھا۔

تعلیم مکمل کر کے جب واپس آئے تو گورنمنٹ آف انڈیا نے انہیں انڈر سیکرٹری شپ کی ملازمت پیش کی جو انہوں نے قبول کر لی اور دس سال تک گورنمنٹ آف انڈیا کے انڈر سیکرٹری رہے۔ پھر وہ درس و تدریس کی طرف متوجہ ہوئے وہ پشاور کے ایک کالج کے پرنسپل بن گئے۔ 1931ء تک وہ معلمی پیشہ کے ساتھ وابستہ رہے۔ پھر 1931ء میں معلمی کا پیشہ بھی چھوڑ دیا اور سیدھا سیاسیات میں آگئے اور اپنی خاکسار تحریک کی بنیاد رکھی۔ خاکسار تحریک بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھنا شروع ہوئی پنجاب سے نکل کر ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بھی منظم ہونا شروع ہو گئی۔ خاکساروں کے منشور میں مندرجہ ذیل پانچ حکم ہی تحریک کے بنیادی روح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سپاہیانہ زندگی - خدمت خلق - اطاعت امیر - غلبہ اسلام - بھائی چارہ - یہ پانچ حکم ہیں انکے گرد ہی خاکسار تنظیم کی چپ راست بیلچہ اور تمام سیاست گھومتی ہے۔ یہی پانچ اصول ہیں جن کے پھیلاؤ سے 24 اصول بن گئے ہیں اور اغراض و مقاصد بھی انہیں پانچ اصولوں کے گرد ہی گھومتے ہیں۔ ہم اس وقت علامہ صاحب کی زندگی اور انکی تحریک اور انکی جدوجہد اور مندرجہ پانچ اصول اور پھر کامیابیاں اور ناکامیاں اور انکی وجوہات پر بحث کریں گے۔ جو کچھ بھی ہم نے تحریک کو سمجھا ہے وہ پوری دیانت داری کے ساتھ پیش کرنے کے بعد موجودہ حالات اور وقت کے مطابق تنقید تبصرہ کریں گے۔ سب سے پہلے سپاہیانہ زندگی کے بارے بحث کریں گے۔ اور جو خاکسار جماعت کو ایک وقت میں عروج ملا ہے اس پر بات چیت کریں گے۔ 1931ء سے 1940ء تک خاکسار تحریک پر بہت ہی عروج تھا اور علامہ صاحب کی شخصیت اور انکی تحریک میں اس قدر کشش تھی کہ مسلم نوجوان کھنچتے ہوئے ان کی جانب چلے آتے۔ ہر روز شام کے وقت شہر میں خوبصورت نوجوان خوبصورت وردیوں میں ملبوس چپ راست کی آواز پر پاؤں کی زور دار آواز سے

چلتے تو ایک عجیب ہی منظر ہوتا۔ لوگوں سے داد تحسین الگ ملتی۔ سپاہیانہ فوائد سے بدن میں چستی آتی ہے اور لاکھوں نوجوان اطاعت امیر کے جذبے سے سرشار مستقبل کے حسین تصور میں گم اطاعت امیر میں سرگرداں رواں دواں تھے۔

خاکسار تحریک سے قبل اور اس وقت بھی دیگر جو جماعتیں آزادی کی جنگ جاری رکھے ہوئے تھیں۔ وہ عدم تشدد پر کاربند رہتے ہوئے آزادی کی جنگ لڑ رہی تھیں۔ اس پر اگر پولیس یا حکومتی ادارہ سختی کرتا تو وہ سختی سہ لیتے تھے۔ مگر سختی کا جواب سختی سے نہیں دیتے تھے۔ کانگرس' احرار' جمعیت العلمائے ہند سبھی عدم تشدد پر ہی کاربند تھے مگر خاکسار تحریک آزادی میں عدم تشدد کے قائل نہ تھے۔ 1940ء تک خاکسار کسی امتحان سے بھی نہیں گزرے تھے اور ان لوگوں نے کوئی تحریک نہیں چلائی تھی مگر انہیں عوام میں مقبولیت بہت مل رہی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ گاندھی جیسا زنخا لیڈر کیا آزادی لے کر قوم کو دے گا۔ جو عوام کو صرف سختی سہنے کا درس دیتا ہے۔ جب تک اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دیا جائے گا اس وقت تک ملک آزاد نہیں ہو گا۔ جب خاکساروں کے دیکھا دیکھی ہندو سکھ اور دیگر مسلم جماعتوں نے بھی سپاہیانہ پریڈ کرنا شروع کر دیا تو حکومت کے کان کھڑے ہو گئے۔ حکومت پنجاب نے سپاہیانہ پریڈ کرنے والی تنظیموں پر پابندی لگا دی۔ اب خاکساروں کے لئے امتحان کا وقت آ گیا کہ اب وہ کیا کریں اس لئے کہ دوسری جماعتوں کے پاس تو اور بھی پروگرام تھے وہ اپنے دوسرے پروگراموں کی طرف ہو گئیں۔ خاکسار جماعت کا سارا رعب ہی سپاہیانہ زندگی اور اور اطاعت امیر پر تھا۔ اس لیے انہیں سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ تحریک چلائیں گے۔ انہوں نے 19 مارچ 1940ء جمعہ کا دن مقرر کیا کہ انیس مارچ کو قانون کی خلاف ورزی کریں گے۔ مقررہ تاریخ کو خاکسار لاہور میں جمع ہوئے انہوں نے اپنے پروگرام کے مطابق شاہی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنی تھی اور پھر پریڈ کرتے ہوئے منٹو پارک جا کر پریڈ کرنی تھی۔ مگر اطاعت امیر نے پہلے ہی کام دکھا دیا۔ باوردی بیلچہ بردار خاکسار اندرون بھاٹی گیٹ جمع تھے اور کچھ خاکسار پریڈ کرتے ہوئے بازار حکیماں کی طرف سے آ رہے تھے آگے پولیس نے روکنا چاہا تو سالار جیش نے حکم دیا کہ (فیدر دست) خاکسار جیش نے بیلچے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ پولیس خاکساروں کو روکنا چاہتی تھی۔ وہ رک نہیں رہے تھے۔ وقفے میں سالار جیش نے حکم دیا کہ بیلچے پولیس کو مارو اب خاکساروں کے پاس تلوار کی دھار سے زیادہ تیز بیلچے تھے۔ انہیں بیلچوں سے وہ پولیس پر حملہ آور ہوئے۔ دو پولیس آفیسر مارے گئے اور 20 پولیس والے زخمی ہوئے۔ خاکسار جیش اطاعت امیر کے تحت ہیرا منڈی کی طرف بھاگ گئے۔ آگے آتشیں اسلحہ سے لیس 250 پولیس مینوں سے مقابلہ ہو گیا۔ ایک انگریز افسر مسٹر بیٹی کو ایک خاکسار نے بیلچے سے قتل کر دیا۔ پولیس نے خاکساروں پر گولی چلا دی۔ کوئی خاکسار اگر کسی کے گھر میں چھپا ہوا بھی پولیس کے ہتھے چڑا تو اسے بھی پولیس نے گولی مار دی۔ اس طرح 36 چھتیس خاکسار مارے گئے اور پچاس سے زائد زخمی ہوئے۔ 300 تین سو سے زائد گرفتار کر لئے گئے اور تمام خاکسار تحریک میں خوف پیدا ہو گیا۔ تحریک خاکسار اسی امتحان میں فیل ہو گئی اور لوگوں نے تحریک کے نزدیک آنا چھوڑ دیا۔ دیہاتوں میں

لوگوں نے گھریلو کام آنے والے بیلچے بھی پولیس کے ڈر سے ضائع کر دیے۔ جناب عبدالصمد سراجدین صاحب فرماتے ہیں کہ علامہ کو گرفتار کر کے ولور جیل مدراس میں بھیج دیا گیا۔ انہوں نے جیل سے حکم دیا کہ جنوبی ہند میں 25000 پچیس ہزار خاکسار بھرتی کئے جائیں اور مجھے بزور بازو رہا کرایا جائے۔ جناب علامہ سراجدین صاحب فرماتے ہیں کہ جنوبی ہند کے تمام صوبوں کا دورہ کیا۔ پچیس ہزار رضاکار ابھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ ہمیں گرفتار کر لیا گیا اور ہمیں مدراس جیل بھیج دیا گیا۔ اگر یہ پچیس ہزار رضاکار پورے ہو جاتے تو ضروری ہے کہ علامہ صاحب کو رہا کرانے کے لئے جیل پر حملہ آور ہونا تھا۔ پھر نجانے کتنی بے گناہ جانیں لقمہ اجل بنتی۔ علامہ عبدالصمد سراجدین صاحب فرماتے ہیں کہ حصول مقصد کے لئے علامہ صاحب کسی قانونی یا آئینی حدود کے قائل نہ تھے۔

دہلی میں تین لاکھ کا اجتماع

علامہ مشرقی نے 30 جون 1947ء کو ہندوستان کے خاکساروں کو حکم دیا کہ وہ تین لاکھ کی تعداد میں جامع مسجد دہلی کے سامنے جمع ہو جائیں اگر تین لاکھ خاکسار جمع ہو گئے تو پھر اگلا حکم دونگا اگر کم جمع ہوئے تو پارٹی توڑ دونگا جمع ہونے والے خاکساروں کی تعداد سوا لاکھ سے بھی کم تھی اس لیے علامہ نے خاکسار تحریک کو ہی ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ میں نے اس بارے میں کئی بزرگ خاکساروں سے رابطہ کیا جو کہ دلی کے سفر میں گئے تھے ان سے پوچھا اگر تین لاکھ خاکسار دلی میں جمع ہو جاتے تو پھر متوقع کیا حکم تھا جو علامہ صاحب خاکساروں کو کرتے وہ بزرگ خاکسار فرماتے ہیں کہ ہمارے بیلچے تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز تھے اور ساتھ ہی خفیہ طور پر ہمیں کہا گیا تھا کہ جو بھی اسلحہ مل جائے وہ بھی ساتھ لے کر جانا ہے۔ تمام خاکسار جو اس سفر میں گئے تھے وہ بیلچوں کے علاوہ آتشیں اسلحہ بھی چھپا کر ساتھ لے گئے تھے۔ اسی طرح میں نے کئی بزرگ خاکساروں سے رائے لی انکی تائید بھی مندرجہ بالا خاکسار بزرگ کے ساتھ تھی اور وہ کہتے تھے کہ اگر تین لاکھ خاکسار دلی میں جمع ہو جاتے تو پاکستان کا نقشہ یہ نہیں ہونا تھا جو اس وقت ہے۔ پاکستان دلی تک ہونا تھا دلی بھی پاکستان میں ہی ہونی تھی۔ دلی سے جمنا دریا پر پاکستان اور ہندوستان کی حد مقرر ہونی تھی اور انہوں نے مزید فرمایا کہ اگر تین لاکھ خاکسار دلی میں جمع ہو جاتے تو دلی پر اور مشرقی پنجاب پر خاکساروں نے دھاوا بول دینا تھا دلی اور مشرقی پنجاب پر قبضہ کرلینا تھا۔ اس طرح پورا پنجاب اور دلی بھی پاکستان ہی بن جانا تھا۔

آؤ ہم اس پر غور کریں کہ کیا اگر واقعی خاکسار دلی میں تین لاکھ نیم مسلح جمع ہو جاتے تو انکا مندرجہ بالا منصوبہ کہ دھاوا بول کر پورے پنجاب اور دلی پر قبضہ کرلینا تھا یہ قابل عمل بھی تھا ایسا ہو جانا ممکن بھی تھا۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ ہرگز نہیں یہ قابل عمل ہی نہیں تھا ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ برطانوی حکومت

نے ہندوستان کی دو بڑی پارٹیوں کانگرس اور مسلم لیگ کے باہم مشورہ سے تقسیم ہند کا فارمولہ منظور کیا تھا اور دونوں پارٹیوں کا ہی منظور کردہ باؤنڈری کمیشن تھا۔ جن علاقوں میں اکثریت سے مسلمان ہیں وہ پاکستان میں شامل ہونگے جن علاقوں میں غیر مسلم اکثریت سے ہیں وہ علاقے ہندوستان میں شامل ہونگے۔ اس فارمولے کے تحت ہی مشرقی پنجاب اور دلی ہندوستان میں شامل ہوئے تھے۔ دونوں بڑی پارٹیوں کے لیڈران نے اس فارمولے کو مان لیا تھا کہ راجے اور نواب اپنی مرضی سے جدھر چاہیں شامل ہو جائیں وہ ہندوستان کے ساتھ مل جائیں یا پاکستان کے ساتھ راجوں اور نوابوں کو مکمل اختیار ہو گا اور برطانوی حکومت نے تقسیم کا فارمولہ دونوں سے منظور کرایا تھا اور اس پر عمل درآمد بھی کرانا تھا۔ گو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تقسیم ہو چکی تھی مگر فوجوں کی کمان انگریز افسران کے ہاتھ میں ہی تھی آپ اس امر سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب مہاراجہ کشمیر نے ہندوستان میں شمولیت کا اعلان کیا تو کشمیر پر پاکستان نے اپنے قبضے کے لیے قبائلی لوگوں کو استعمال کیا تھا اس وقت کی پاکستانی فوج کے کمانڈرانچیف جو کہ انگریز تھے انہیں کہا گیا تھا کہ وہ کشمیر میں پاکستانی فوج داخل کریں مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا اسی طرح جو فوج انڈیا کے حصہ میں آئی تھی یا تو اسکے افسران انگریز تھے یا ہندو تھے اگر ہندو افسران ہی ہوتے تب تو وہ دلی کی مرکزی حکومت کا حکم ہر حالت میں مانتے اگر انگریز فوجی افسران بھی ہوتے کمانڈرانچیف انگریز ہی ہوتا تب بھی وہ سمجھوتہ کے مطابق ہی حکم مانتا اور ساتھ ہی اس وقت وائسرائے ہند بھی انگریز لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہی تھا۔

ایسی صورت میں اگر خاکسار دہلی میں تین لاکھ بھی جمع ہو جاتے وہ دلی اور مشرقی پنجاب پر دھاوا بھی بول دیتے تو انکی کامیابی کا امکان ایک فیصد بھی نہ تھا۔ اس لیے فوج اور دیگر سرکاری فورسز کے مقابلہ میں بیلچہ بردار فوج یا نیم مسلح جنکے پاس پستولوں یا بندوقوں جیسا آتشیں اسلحہ بھی ہو وہ نہتے ہی ہوتے ہیں نہتے لوگ تین لاکھ کی بجائے دس لاکھ بھی جمع ہو جائیں وہ مخالفانہ قبضہ کرنے کے لیے کسی صورت بھی فوج کے مقابلہ یا سرکاری فورسز کے مقابلہ میں فتح یاب نہیں ہو سکتے۔ اگر دھاوا بول کر خاکسار کسی جگہ پر قابض ہو بھی جاتے تو حکومت ہند کی فورسز نے انہیں کچل دینا تھا اور ہزاروں خاکسار لقمہ اجل بن جانے تھے۔ جبکہ 1940ء انیس سو چالیس میں جو کچھ خاکساروں کے ساتھ ہوا اسکی مثال بھی انکے سامنے تھی بیلچہ بردار خاکساروں نے (فیدر برن) کی آواز پر پولیس پر حملہ آور ہوئے دو پولیس مین قتل کر دئے اور چند ایک کو زخمی کیا تھا جسکے مقابلہ میں 36 خاکسار لقمہ اجل بنے اور پچاس سے زائد زخمی ہوئے اور تین سو سے زائد قید ہوئے جنہیں بہت بڑی بڑی سزائیں دی گئی اور خاکسار تحریک کی ساتھ ہی کمر ٹوٹ گئی۔

دلی والا دھاوا بولنے میں دلی یا مشرقی پنجاب کے کسی حصہ پر قبضہ کرنے کا تو معاملہ ہی مختلف تھا وہ تو اس وقت غیر ملک بن چکا تھا اسے آپ غیر ملک تسلیم کر چکے تھے۔ وہاں تو ایسی صورت میں مکمل طور پر بھارتی فوج نے خاکساروں کا صفایا کر دینا تھا اور خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ علامہ مشرقی کے بلاوے پر تین لاکھ خاکسار رضاکار جمع نہیں ہوئے ورنہ بہت بڑا قتل عام ہوتا ہزاروں سے بڑھ کر

لاکھوں بے گناہ لوگوں نے لقمہ اجل بن جانا تھا لیکن پھر بھی میں کہوں گا کہ علامہ مشرقی صاحب کی پرکشش شخصیت کا کمال تھا کہ انہوں نے جان نثار کر دینے والے ایک لاکھ سے زائد نوجوان ایک آواز پر دلی میں جمع کر لیے یہ بہت بڑی کامیابی بھی تاریخ کا ہی ایک حصہ بن گئی ہے۔

اخوت، خدمت خلق اور غلبہ اسلام

اخوت کا ہم اگر آسان الفاظ میں ترجمہ کریں تو بھائی چارہ ہی کہہ سکتے ہیں اور بھائی چارہ ایک پسندیدہ عمل ہے یہ بہت ہی اچھی بات ہے کہ آپ ہر ایک کے ساتھ اچھی طرح پیش آئیں جو آرام اور آسائش آپ اپنے لیے پسند کرتے ہیں وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کریں بھائی چارہ اور خدمت خلق کے لیے صرف مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ ہر انسان کے لیے ہونی چاہیے ہر انسان کو قابل عزت اور واجب الاحترام سمجھا جانا چاہیے اگر یہ جذبہ پیدا کر لیا جائے ہر انسان کی عزت کی جائے ہر انسان کا احترام کیا جائے تو یہ دنیا جنت بن سکتی ہے۔ دیگر علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ فرقہ پرستی نہیں ہونی چاہیے فرقے قابل مذمت ہیں حضور علیہ السلام کے وقت جو اسلام تھا صرف وہی اسلام ہونا چاہیے

حضور کے وقت حنفی، شافعی، مالکی نہ تھے شیعہ سنی بھی نہ تھے وہابی دیوبندی بھی نہ تھے مگر آج جو یہ فرقے بن گئے ہیں یہ قابل مذمت ہیں۔ پیغمبر جو مبعوث ہوتے ہیں وہ اپنے امتیوں کے لیے فرقہ کی بنیاد رکھتے ہیں دیگر ذیلی فرقے خود بخود معرض وجود میں آ جاتے ہیں امام ابو حنیفہ نے نہیں کہا کہ حنفی فرقہ بنایا جائے مگر اس وقت حنفی فرقہ بھی ہے حضرت علی یا حضرت امام حسین نے شیعہ فرقہ کی بنیاد نہیں رکھی تھی مگر اس وقت بہت بڑا فرقہ شیعہ ہے۔ نیک لوگوں کے افعال اقوال سے ہی فرقے معرض وجود میں آ جاتے ہیں۔ علامہ صاحب بذات خود فرقہ پرستی کے خلاف تھے مگر اس وقت خاکسار بھی ایک فرقہ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور جو شخص خاکساروں کے 24 چوبیس اصول اپنا لیتا ہے وہ خاکسار بن جاتا ہے اور جو راہبر تحریک یہ کہتا ہے کہ ہر خاکسار سپاہیانہ زندگی بسر کرے خاکی کپڑے پہنے اخوت کا بیج کندھے پر لگائے خاکسار کسی غیر خاکسار سے سودا نہ خرید کرے۔ یہ چند اصول ہی فرقہ پرستی کی بنیاد بنتے ہیں خاکسار بھی اسی طرح ایک فرقہ کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ آج انکی آپس میں فرقہ واریت کی شدت کم ہے۔ وقت کے ساتھ زیادہ ہوتی جائے گی۔

غلبہ اسلام

ہر مسلمان کی خواہش ہو گی کی غلبہ اسلام ہو اور یہ ایمان کا ایک حصہ بھی ہے کہ فتح اسلام ہو اور ہر میدان میں اسلام کی نام لیوا امت مسلمہ کو کامیابی ہو، جیت ہو گزشتہ 14 سو سال سے مسلمانوں میں بہت بڑے بڑے فاتحین بھی ہوئے ہیں۔ تاریخ انسانی میں امیر تیمور جیسا فاتح آج تک نہیں ہوا۔

جس نے مغرب میں مصر تک اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیے۔ شمال مغرب میں ماسکو اسکے زیر نگیں ہوا۔ جنوب مشرق میں چین پر بھی اس نے اپنی فتح کے جھنڈے گاڑھے اور جنوب میں ہندوستان تک وہ فاتح ہوا تاریخ انسانی میں اتنا بڑا فاتح آج تک نہیں ہوا۔ امیر تیمور کا پایہ تخت سمرقند تھا اور اسکی بے پناہ فتوحات نے سمرقند کو دنیا کا پایہ تخت بنا دیا۔ مگر جہاں وہ اتنا بڑا فاتح ہوا ہے وہاں اسکے ظلم کے چرچے بھی زبان زد عام ہیں اور دیگر فاتحین اسلام بھی بہت ہوئے ہیں۔ عثمانی ترکوں نے اپنی فتح کے جھنڈے یورپ تک گاڑ دیے۔ ان فتوحات میں ان مجاہدین اسلام کا بہت بڑا حصہ ہوتا تھا جو صرف ثواب کے لیے ان بادشاہوں کی فوج میں رضاکارانہ طور پر شامل ہو جایا کرتے تھے وہ فتح اسلام کے لیے غلبہ اسلام کے لیے جانیں بھی قربان کر دیا کرتے تھے مگر ان غازیان اسلام کے لیے کوئی مراعات نہ تھیں وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح ان ظالم مسلمان بادشاہوں کی چکی میں پستے رہتے تھے۔ سولہویں صدی کے آخر تک مسلم بادشاہوں کی فتوحات کا سلسلہ قائم رہا۔ جب اقوام یورپ نے سائنس میں کمالات حاصل کرنے شروع کر دیے۔ جب یورپ میں نئے نئے جنگی آلات بننے شروع ہو گئے' جب یورپ میں سائنس نے نئے نئے کمالات دکھانا شروع کر دیے۔ تب مسلم بادشاہوں کی فتوحات کا سلسلہ رک گیا۔ جہانگیری اور جہاں بانی پر سائنس اور ہنر مندی نے قبضہ کر لیا۔ اب فرسودہ جنگی آلات متروک ہو گئے تھے۔ بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کے پاس 12000 فوج مگر ساتھ ہی نئے جنگی آلات جو اس وقت تک بن کر میدان میں آ چکے تھے وہ تھیں چند توپیں ابراہیم لودھی کے پاس 200000 دو لاکھ فوج اور ہاتھی گھوڑے بھی تھے 12000 بارہ ہزار فوج نے توپوں کی مدد سے دو لاکھ فوج کو دوپہر تک شکست فاش دے دی اور بادشاہ ہند ابراہیم لودھی بھی مارا جا چکا تھا نئے جنگی آلات نے طاقت کا فلسفہ ہی بدل دیا اب طاقت ہے مضبوط معیشت سائنسی و صنعتی ترقی مضبوط معیشت کا دارو مدار بھی جدید ہنر مندی میں ہے۔ آپ بہتر سے بہتر مصنوعات بنا کر مارکیٹ میں پیش کریں گے دنیا کے لوگ خریدیں گے آپکے ملک میں دولت جائے گی آپ اور آپکا ملک بھی امیر ہو گا اور ساتھ ہی کوئی ملک جدید آلات بنا کر مارکیٹ میں پیش کرتا ہے دیگر اقوام خرید کرتی ہیں اور آپ دولت حاصل کرتے ہیں اور آپکی معیشت مستحکم ہوتی ہے۔

علامہ صاحب نے بہت علم حاصل کیا ہوا تھا وہ سائنس اور انجینئرنگ ریاضی اور دیگر علوم کے عظیم عالم تھے مگر آپ نے غلبہ اسلام چپ راست اور بیلچے میں سمجھ لیا اگر آپ اپنے حاصل کیے ہوئے علم کے مطابق ہی لوگوں میں شعور پیدا کرتے اور مسلم قوم میں ذہنی انقلاب بپا کرتے تو شاید مسلم قوم جدید علوم اور ترقی کی طرف گامزن ہو جاتی اور اسکا سہرا علامہ صاحب کے سر جاتا اور علامہ صاحب جدید مسلم قوم کے بانی بن جاتے مگر علامہ صاحب نے بھی لوگوں کو جذباتیت کی طرف ابھار کر اپنے پیچھے لگانے کی کوشش کی۔ آپ نے مولوی کا مذہب دو پیسے کا بچ کر لوگوں کو قدامت پسندی کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کی مگر خود بھی لوگوں کو قدامت پسندی کی طرف لے گئے۔

دونوں عالمی جنگوں میں جرمنی اور پھر جاپان نے بھی سائنسی اور صنعتی برتری کی وجہ سے ہی

دنیائے عالم کو چیلنج کیا تھا پھر جنگوں میں نئے نئے آلات جنگ سامنے آئے جس نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ترکی ایک وقت میں دنیا کی سپر طاقت مانی جاتی تھی۔ صنعتی اور سائنسی پسماندگی کی وجہ سے ہی ترقی پذیر ملکوں میں چلا گیا اور امریکہ کا حاشیہ بردار بن کر رہ گیا ہے۔

حضرت علامہ صاحب جنہیں بہت زیادہ علوم پر عبور تھا اور انکی شخصیت بھی پر کشش تھی وہ اگر امت مسلمہ کا صحیح تجزیہ کرتے تو عالم اسلام کے فکری انقلاب کے بانی ہوتے۔ گزشتہ صدی میں سر سید احمد خان نے کسی حد تک لوگوں میں صنعتی رجحانات کا پرچار کیا مگر انکی سرکار پرستی نے انکے صحیح خیالات کو لوگوں تک نہیں پہنچنے دیا اسکے بعد کسی لیڈر نے بھی عوام کو صحیح سمت کا تعین نہیں ہونے دیا۔ جذباتیت کی طرف ہی ابھارتے رہے۔ حضرت علامہ صاحب جیسا اہل علم لیڈر جن میں لوگوں کو اپنے پیچھے لگانے کی صلاحیت بھی موجود تھی وہ یہ کام آسانی سے کر سکتے تھے مگر افسوس کہ انہوں نے بھی لوگوں کو جذباتیت کی طرف ابھار کر اپنی لیڈری چمکانے کی کوشش کی مگر وہ بھی لوگوں کے دلوں میں گھر پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے لوگوں کو صحیح سمت نہ چلا سکے۔ مسلمان کو جدیدیت کی طرف راغب نہ کر سکے وہ بھی لوگوں میں غلبہ اسلام کا نعرہ لگا کر اپنی لیڈری چمکاتے رہے۔

انجمن اتحاد بلوچاں

انجمن اتحاد بلوچاں صوبہ بلوچستان کی سب سے قدیم اور پہلی سیاسی جماعت تھی پیشتر اسکے کہ ہم بلوچستان کی سیاسی جماعتوں کے حالات لکھیں ضروری ہے کہ بلوچستان کے معاشرتی اور سماجی حالات پر تھوڑی سی روشنی ڈال دیں۔ بلوچستان رقبہ کے اعتبار سے بہت بڑا صوبہ ہے تقریباً" ایک لاکھ بیس ہزار مربع میل سے زیادہ رقبے پر مشتمل یہ صوبہ ہے۔ مگر ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں آبادی بہت کم ہے۔ نصف صوبہ سے زائد پر خان آف قلات حکمران ہیں اور ان علاقوں میں بلوچی، بروہی، مکرانی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ریاست قلات کے حکمران پوری ریاست پر بلا شرکت غیرے حکمران تھے۔

ریاست میں کوئی سیاسی جماعت بنانے کی اجازت نہ تھی ریاست قلات کے دارلحکومت قلات اور مستونگ دو ہیں ان دونوں جگہ پر جہاں خان آف قلات ہو وہی دارالحکومت ہو تا تھا۔ پوری ریاست قبائل میں تقسیم ہے۔ چھوٹے بڑے ایک سو سے زائد قبائل ہیں۔ قدیم سرداروں کو جو اختیارات ہیں وہ زمانہ قدیم سے چلے آ رہے ہیں ریاست قلات بھی دو سو سال سے زائد عرصہ سے بلوچستان میں قائم ہے۔ انگریز جب بلوچستان پر حکمران بنے تو انہوں نے قدیم انتظامی ڈھانچہ کو قائم رکھا اگر کبھی ضرورت محسوس کی تو قبائلی سرداروں کو اور خان آف قلات کو کوئی ضروری ہدایت جاری کر دیں ورنہ وہ صرف اپنا اقتدار اعلیٰ ہی قائم رکھے ہوئے تھے۔

ہم اس وقت جو ٹی وی ڈرامے دیکھتے ہیں ان میں بلوچوں کو انگریز سرکار کے خلاف لڑتے دکھایا

جاتا ہے بلوچ قبائل کی یہ جنگ انگریزوں کے خلاف شعوری نہیں ہوتی تھی۔ یعنی ان جنگوں کے پیچھے کوئی سیاسی پروگرام یا کوئی سیاسی پارٹی نہیں ہوتی تھی بلکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے انگریز ہزاروں میلوں سے ہم پر حکمرانی کرنے کے لیے آیا ہے اور یہ کافر ہے اسکے خلاف جہاد کیا جائے اگر ایک فرد نے جنگ شروع کر دی تو تمام قبیلہ جنگ میں شامل ہو جاتا اور جنگ سالوں چلتی رہتی۔

بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ انگریز حکومت سڑکیں بنانا چاہتی ہے اور کوئی اصلاحات نافذ کرنا چاہتی ہے قبائلی سرداروں نے اسے اپنے لئے نقصان دہ سمجھتے ہوئے جنگ شروع کرا دی اور پھر اس میں کافی لوگ شہید ہو جاتے اور پھر سردار ہی جنگ بند بھی کروا دیتے اور انگریز سرکار سے مراعات بھی حاصل کرتے اور قبائلی سردار کبھی بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگوں میں تعلیم عام ہو لوگ پڑھ لکھ جائیں اس سے انکی سرداری خطرہ میں پڑ سکتی تھی۔ قبائلی سردار ہر حالت میں بوسیدہ روایات کو قائم رکھے ہوئے تھے ایک وقت میں انگریز سرکار نے ریاست قلات میں سے ہی الگ کر کے تین مزید ریاستیں لسبیلہ' مکران' خاران بنا دی گیں تو ریاست قلات کے لیڈروں نے مخالفت کی۔ ریاست قلات کو مزید ٹکڑوں میں تقسیم کر کے بلوچوں کو تقسیم نہ کیا جائے۔ برٹش بلوچستان جہاں پشتو بولی جاتی تھی وہ علاقہ بھی قبیلوں میں ہی تقسیم تھا اور وہاں پر بھی قبائلی نظام ہی رائج تھا۔ دیگر پورے ہندوستان میں بہت پہلے آئینی اصلاحات نافذ تھیں اور 1935ء میں ایک ایکٹ نافذ کیا جو 1935ء ایکٹ کے نام سے ہی مشہور ہے جس کے تحت ہندوستان کے برٹش علاقوں کو مکمل صوبائی خود مختاری دی گئی تھی۔ اور تمام صوبوں کو مکمل طور پر اندرونی خود مختاری حاصل تھی اور برٹش صوبوں کی کونسلیں عوام کے ووٹوں سے چنی جاتی تھی اور اسمبلیاں مکمل اختیارات رکھتی تھیں جبکہ بلوچستان میں لوگوں کو کوئی اختیارات حاصل نہ تھے اور نہ ہی کسی قسم کی آسانیاں تھیں اور نہ ہی عوام کو ووٹ دینے کا کوئی حق تھا بلوچستان کے لوگ متحدہ ہندوستان کے وقت بھی متحدہ بلوچستان کے حامی تھے اس سلسلہ میں 1932ء میں جیکب آباد میں ایک بلوچ کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں تمام بلوچ لیڈر شامل ہوئے جن میں عبدالعزیز کرد خان' عبدالصمد اچکزئی' سردار یوسف مگسی بھی شامل تھے۔ اس وقت بلوچستان کے سماجی حالات یوں تھے کہ ذرائع آمدورفت کے لئے پختہ سڑکیں صرف چند ایک تھیں باقی تمام راستے ناپختہ اور کچے تھے پورے بلوچستان میں صرف تین ہائی سکول ایک قلات میں اور دو کوئٹہ میں تھے۔ جن میں ایک خالصہ ہائی سکول تھا صرف ایک ہی سرکاری سکول تھا اور پورے بلوچستان میں صرف ایک انٹر کالج کوئٹہ میں تھا جو ایف اے تک تعلیم دیتا تھا۔ مستونگ' گلستان' سبی اور دیگر چند جگہوں پر مڈل سکول اور پورے بلوچستان میں پچیس تیس سے زیادہ پرائمری سکول نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچستان کے قدیم لیڈروں میں کوئی گریجویٹ نظر نہیں آئیگا۔ خان عبدالصمد خاں اچکزئی روائتی تعلیم صرف مڈل تک ہی حاصل کر سکے بعد میں انہوں نے پرائیویٹ پڑھ کر اعلیٰ علوم حاصل کیے۔ انجمن اتحاد کے سرکردہ لیڈروں میں جناب عبدالصمد' جناب یوسف مگسی اور جناب عبدالعزیز کرد بھی شامل تھے اور اس انجمن اتحاد پر زیادہ دیر تک عبدالعزیز کرد کے اثرات ہی پڑتے رہے بہتر ہو گا مختصر لفظوں میں ان لیڈروں کا تعارف بھی پیش کیا

جائے۔

یوسف مگسی

یوسف مگسی کو بلوچستان کی تحریک آزادی میں بہت بڑا مقام حاصل ہے اور اس وقت 1994ء میں بلوچستان کے وزیر اعلیٰ جناب ذوالفقار علی مگسی کے دادا تھے۔ وہ مگسی قبیلہ کے سردار تھے نواب تھے۔ سرکار کے ایوانوں میں انہیں بہت ہی عزت حاصل تھی۔ مگر وہ آزادی کے ایسے متوالے تھے سرکار برطانیہ کے خلاف تھے ہر وہ تحریک جو مرکزی ہندوستان سے آزادی کیلئے اٹھتی تھی اس کیلئے جدوجہد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ آزادی کی جنگ میں کانگرس کے ہمنوا تھے اور تحریک خلافت میں لیڈرانہ رول ادا کرتے۔ قبیلہ مگسی کے وہ سردار تھے مگر دیگر قبائل کے لوگوں میں بھی انہیں بہت عزت حاصل تھی۔ انگریزوں نے انہیں آزادی کی راہ سے ہٹانے کیلئے بہت کوششیں کیں مگر وہ آزادی کی جدوجہد میں بدستور آگے بڑھتے رہے۔ بلوچستان کے لوگ یوسف مگسی کو بلوچستان کا سب سے بڑا قائد سمجھتے ھیں انہوں نے برطانیہ اور دیگر یورپین ممالک کا دورہ بھی کیا تھا وہ جنگ آزادی میں حضرت مولانا شیخ الہند اور علی برادران سے متاثر تھے۔ وہ تن من دھن سے آزادی کی جنگ میں مصروف عمل تھے کہ 1935ء کی ایک رات وہ کوئٹہ ہی میں تھے کہ زلزلہ نے کوئٹہ کو تباہ کر دیا اور ہزاروں لوگ لقمہ اجل بن گئے اور یوسف مگسی بھی انہی شہداء میں شامل ہو کر مالک حقیقی سے جا ملے۔ اس وقت انکی قبر کوئٹہ شہر میں موجود ہے جس پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی چند روز ہوئے کچھ لوگ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ ذوالفقار علی مگسی سے ملے تھے اور مطالبہ کیا تھا کہ عظیم حریت پسند لیڈر یوسف مگسی کی قبر کو بلوچستانی یادگاروں کی طرح محفوظ کیا جائے اور قبر پر روضہ بنا دیا جائے' یادگار بنائی جائے۔

میر عبدالعزیز کرد' میر محمد اعظم شاہ

انجمن اتحاد بلوچستان کے لیڈر جناب عبدالعزیز کرد صاحب بھی بلوچ عوام میں کافی احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ میر عبدالعزیز کرد' میر محمد اعظم شاہ' ملک شاہ محمد یوسف زئی' سید امیر شاہ' میر احمد خاں ملا زئی' میر عبدالرزاق ملا زئی' ملک عبدالرحیم بھی بیک وقت تحریک آزادی کے ساتھ وابستہ تھے اور سرکاری ملازمت بھی کرتے تھے ان لوگوں نے وطن کی آزادی کے لئے بلوچ لوگوں کو خوشحال بنانے کیلئے سورہ یاسین پر دستخط کر کے حلف اٹھایا تھا کہ وہ وطن کی آزادی تک جدوجہد جاری رکھیں گے۔ میر عبدالعزیز کرد نے بہت تھوڑے عرصہ بعد ملازمت چھوڑ دی تھی اور وہ وطن کی آزادی کی جدوجہد میں ہمہ وقت مصروف ہو گئے۔ یوسف مگسی اس وقت جیل میں تھے انہوں نے جیل میں ہی سورہ یاسین کے حلف پر دستخط کر دیئے تھے۔ ان انجمن اتحاد بلوچستان میں عبدالعزیز کرد صاحب نمایاں حیثیت کے

ساتھ شامل تھے اور انجمن اتحاد کی قیادت انہی کے پاس تھی اور بلوچستان کی تحریک آزادی کی ساری جدوجہد میں جناب کرد صاحب کی قائدانہ شمولیت حاصل ہے۔ یہ انجمن اتحاد بلوچستان 1931ء میں قائم ہوئی تھی اس انجمن کے ایک مضبوط لیڈر خاں عبدالصمد خان بھی تھے جن کی زندگی بڑی جدوجہد کی عبارت ہے۔ عبدالصمد خان صاحب 1906ء میں گلستان میں اچکزئی قبیلہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی زندگی میں ہی حریت پسند تھے سکول کے زمانے سے ہی تحریک خلافت کے ساتھ ذہنی وابستگی تھی۔ 1918ء میں سکول کے بچوں کو ساتھ لے کر خلافت کے حق میں سرکار کے خلاف جلوس نکال۔ اسکول میں صرف آٹھ جماعت تک ہی تعلیم تھی مزید تعلیم کیلئے کوئی سکول کالج گلستان میں نہ تھا اور خان صاحب سکول سے نکلتے ہی آزادی کی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ وہ ذہنی طور پر کانگرس خلافت سے وابستہ تھے وہ خلافت کی تحریک کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے اور پہلی دفعہ وہ 1930ء میں قید کر دئے گئے وہ ایک سال قید رہے۔ رہا ہو کر آئے دیگر حریت پسندوں کے ساتھ ملکر انجمن اتحاد بلوچاں بنائی جدوجہد آزادی کے ساتھ ساتھ وہ بلوچوں کو متحد کرنے ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش میں لگ گئے اور جیکب آباد میں کل بلوچ اتحاد کانفرنس کا انعقاد کیا اور صدارت کی اور انکے ساتھ دیگر بلوچ لیڈر بھی اس کانفرنس میں شامل ہوئے۔ جولائی 1931ء میں خان عبدالصمد خان بمبئی گئے مہاتما گاندھی، محمد علی جناح، بادشاہ خان اور مولانا ظفر علی خان سے ملے اور اس ملاقات کے بعد وہ مکمل کھدر پوش لیڈر بن گئے اور کانگرس کے مکمل حامی بن گئے - خان عبدالصمد خان وطن کی آزادی کیلئے کانگرس کے ہمنوا تھے بلوچ حقوق کی جدوجہد میں بلوچستان کے پشتوں اور بلوچ جدوجہد میں انجمن اتحاد بلوچستان کے سرگرم کارکن تھے۔ 1933ء میں حیدر آباد میں منعقدہ بلوچستان کانگرس میں شرکت کی کانفرس سے واپس آئے تو گرفتار کر لئے گئے مقدمہ جرگہ میں پیش ہوا تین سال قید ہو گئی

کوئٹہ اور بلوچستان کے کسی شہر سے کوئی اخبار نہیں نکلتا تھا۔ کوئٹہ میں روزنامے اخبار لاھور سے جایا کرتے تھے اس زمانے میں زمیندار، انقلاب، ملاپ، پرتاب یہ حریت پسند اخبارات تھے لوگوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کرتے تھے خاص کر حریت پسندوں کے لئے زمیندار اخبار تو بہت ہی پسندیدہ تھا۔ یہی اخبارات پنجاب، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں جایا کرتے تھے ان خبارات کے اثرات نے ہی پشاور، صوبہ سرحد، کوئٹہ وغیرہ بلوچستان میں حریت پسند پیدا کئے۔ دانشور کہتے ہیں کہ فضائیں نمود پیدا کرتی ہیں مگر اثرات مٹی کے ہوتے ہیں۔ یہی اخبار پنجاب کے لوگ پڑھتے ہیں تو اکثریت سرکار پرست پیدا ہوتے ہیں اور یہی اخبار بلوچستان کے لوگ پڑھتے ہیں صوبہ سرحد کے لوگ پڑھتے ہیں حریت پسند پیدا کرتے ہیں جان پر کھیل کر بھی آزادی کا جھنڈا اونچا رکھنے کی ترغیب دیتے ہیں

انہی اخبارات کی خبر لالہ لاجپت رائے سائمن کمیشن کے خلاف مولانا ظفر علی خان کے ساتھ جلوس کی قیادت کرتے ہوئے پولیس لاٹھی چارج سے زخمی ہو کر شہید ہو جاتے ہیں تو بھگت سنگھ پر بدلہ لینے کے اثرات مرتب ہوتے ہیں بھگت سنگھ پولیس کو لاٹھی چارج کا حکم دینے والے انگریز ڈی ایس پی کو قتل کر دیتا ہے اسی اخبار کی خبر کے اثرات خود زمیندار اخبار کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان کے اکلوتے بیٹے

مولانا اختر علی خان پر یہ ہوتے کہ وہ اپنی ماں کے گلے لگ کر رو رو کر کہتا ہے کہ اماں ابو کو روکو کہ وہ سرکار کے خلاف جلسے نہ کیا کریں جلوسوں کی قیادت نہ کیا کریں اگر ابو کو کچھ ہو گیا تو میں بالکل یتیم ہو جاؤں گا میرا تو اور کوئی بھائی بھی نہیں ہے

انہی اخبارات نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں آزادی کے متوالے پیدا کیے جن کے آج تک اثرات ان علاقوں میں موجود ھیں۔ انہی اخبارات میں یوسف مگسی' عبدالصمد خان اچکزئی' عبدالعزیز کرد' عبدالکریم شورش اور دیگر بلوچ راھنماؤں کے زمیندار اور دیگر اخبارات میں مضامین بھی چھپتے تھے اور گیت بھی شائع ہوتے تھے۔ انجمن اتحاد بلوچستان کے تمام لیڈر اور ورکر پہلے تحریک خلافت کے ساتھ وابستہ تھے اور جدوجہد میں شامل تھے

انجمن وطن بلوچستان

انجمن وطن کے نام سے بلوچستان میں ایک سیاسی تنظیم 1938ء میں قائم کی گئی تھی۔ کوئٹہ میں کونشن ہوا جس میں زیادہ تعداد پشتون حریت پسندوں کی تھی اور سرگرمیوں کا علاقہ بھی پشتون ہی مقرر کیا گیا۔ پہلے صدر خان عبدالصمد خان اچکزئی منتخب ہوئے قبل ازیں خان عبدالصمد اچکزئی' بہار کے مولانا محمد شفیع داؤدی' مدارس کے سید مرتضیٰ بہادر اور پنجاب کے مولانا غلام رسول مہر کے کہنے پر دہلی میں مسلم کانفرنس میں شامل ہوئے تھے۔ اسی مسلم کانفرنس میں مسمانوں کیلئے چند تحفظات کے ساتھ مخلوط انتخابات کی سفارش کی گئی تھی اور اسی کانفرنس کی سفارشات کو مسلم لیگ کے بہت بڑے دھڑے نے نہیں مانا تھااور انہی سفارشات کو نہرو رپوٹ کا نام دیا گیا جو کہ بالاخر دریا برد کر دی گئی۔ خان عبدالصمد خان نے 1933ء میں بلوچ کانفرنس حیدر آباد میں شرکت کی۔ کانفرنس سے واپس آئے تو گرفتار کر لے گئے تین سال سزا جرگہ کی طرف سے سنا دی گئی۔ 1936ء میں جیل سے واپس آئے تو انکی دیرینہ جدوجہد کے عوض انہیں چھاپہ خانہ لگانے کی اجازت دیدی گئی اور انہوں نے کوئٹہ میں چھاپہ خانہ لگایا اور ساتھ ہی ھفت روزہ اخبار استقلال جاری کیا جس کے مضامین وہ خود ہی لکھا کرتے تھے انکے مضامین بہت ہی مقبول ہوئے۔ لاہور میں بھی انکا اخباراستقلال آیا کرتا تھا خان عبدالصمد کے علاوہ کوئٹہ کے مشہور ادیب ڈاکٹر خدائے داد اور عبدالکریم بھی استقلال میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ ڈاکٹر خدائے داد کا کہنا تھا ایک دفعہ انقلاب لاھور کے ایڈیٹر مولانا عبدالمجید سالک کوئٹہ تشریف لائے تو انہوں نے فرمایا تھا کہ استقلال کا انتظار ھم پورا ھفتہ لاھورمیں کرتے ہیں۔ پاکستان بن جانے کے بعد حکومت نے استقلال بند کر دیا تھا اور ایڈیٹر جناب خان عبدالصمد خان کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ 1939ء میں بادشاہ خان کو بلوچستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی اور بادشاہ خان بلوچستان تشریف لے گئے۔ خان عبدالصمد کے ساتھ مل کر بلوچستان کا تفصیلی دورہ کیا جس میں لوگوں نے دونوں کا بہت ہی احترام کیا۔ آزادی کی جدوجہد میں ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ 1942ء میں جب کانگرس نے ھندوستان چھوڑ دو کی تحریک شروع کی

تو انجمن وطن بلوچستان نے بھی تحریک میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ تمام لیڈران ورکر گرفتار کر لئے گئے دو سال بعد جب کانگرس کے لیڈر رہا ہوئے تو انجمن وطن کے گرفتار شدگان کو بھی رہا کر دیا گیا۔ 1946ء میں انڈین نیشنل کانگرس کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا کانگرس کی طرف سے صوبائی خود مختاری کا ریزولیشن پاس کیا گیا اس قرارداد کی بنا پر انجمن وطن کا کانگرس سے الحاق ہو گیا۔ کانگرس کی جدوجہد میں انجمن وطن بھی کانگرس کی معاون بن گئی۔ 1947ء میں حکومت پاکستان نے انجمن وطن کے صدر خان عبدالصمد خان اچکزئی گرفتار کر لئے گئے اور بہت مدت جیل میں رہے وطن کی آزادی انکے لیے مستقل غلامی کا سبب بن گئی۔ حکومت پاکستان نے انجمن وطن کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ انجمن کا ہفتہ وار اخبار استقلال بند کر دیا گیا پریس ضبط کر لیا گیا۔ انجمن وطن کے لیڈران ورکرز نے ایک نئی جماعت وروروے پختون کے نام سے جمہوری جدوجہد شروع کر دی

قلات نیشنل پارٹی

انجمن اتحاد بلوچاں ھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ پشتون اور برٹش علاقوں کے لوگوں نے خان عبدالصمد صاحب کی زیر قیادت انجمن وطن بلوچستان قائم کر لی تھی اور عبدالعزیز صاحب کرد کی زیر قیادت قلات نیشنل پارٹی بن گئی تھی۔ ویسے بلوچستان کے لوگ متحدہ بلوچستان کے حامی تھے۔ انگریز کے وقت بھی انکی کوشش تھی کہ بلوچستان متحد ہو جیسا کہ سابقہ سطور میں ذکر کیا گیا کہ جب ریاست قلات سے کاٹ کر خاران مکران کی الگ ریاستیں بنائی گئی تھیں تو اتحاد بلوچان نے قلات کو مزید ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ مگر انتظامی علیحدگی کے بعد ان کے لیے ضروری تھا کہ ریاست کے لیے الگ تنظیم قائم کریں۔ چنانچہ اسی ضرورت کے تحت قلات نیشنل پارٹی بنائی گئی تھی۔ 1938ء میں قلات نیشنل پارٹی قائم کرنے کیلئے مستونگ میں ایک کنونشن ہوا جس میں ایک سو کے قریب بلوچ لیڈر شامل ہوئے جن میں جناب عبدالعزیز کرد' میر غوث بخش بزنجو' عبدالکریم شورش' گل خان نصیر صاحبان' اور شہزادہ عبدالکریم بھی بعد میں نیشنل پارٹی کے ہمنوا بن گئے اور دیگر بلوچ لیڈران نے شرکت کی۔ محمود خان' خان آف قلات کسی بھی قسم کی سیاسی جماعت سازی کے خلاف تھے اور دیگر قبائلی سردار بھی جماعت سازی کے خلاف تھے وہ سمجھتے تھے کہ سیاسی جماعت بن جانے سے لوگوں میں سیاسی شعور پیدا ہو گا جو ان کے اقتدار کے منافی تھا اس لئے خان آف قلات کے ایماء پر قبائلی سرداروں نے اپنی فورس کے ذریعے سیاسی کنونشن پر حملہ کروا دیا۔ جس میں بہت سارے لیڈر اور ورکر زخمی ہو گئے۔ مگر نہایت ہی منظم طریقے سے لیڈران نے حملہ آوروں کا عدم تشدد سے مقابلہ کیا۔ حملہ آوروں کے آگے ہاتھ نہیں اٹھایا مگر بھاگے بھی نہیں اور کنونشن نے قلات نیشنل پارٹی کی تشکیل کا اعلان کر دیا۔ خان آف قلات محمود خان نے قلات نیشنل پارٹی کے لیڈروں کو ریاست بدر کر دیا اور پارٹی لیڈر کوئٹہ چلے گئے محمود خان' خان آف قلات کی وفات کے بعد جب خان احمد یار خان' خان آف قلات بنے تو انہوں

نے ریاست میں جماعت سازی کی اجازت دے دی اور نیشنل پارٹی کے لیڈران ریاست کے اندر داخل ہو گئے پھر بھی یہ طریقہ رہا کہ جب بھی خان آف قلات کبھی سیاسی لیڈران پر ناراض ہوتے تو ریاست میں داخلہ بند کر دیا کرتے تھے۔ قلات نیشنل پارٹی کی جدوجہد سے ریاست کی حدود میں شاہرائیں بہتر بنانے کی جدوجہد ہوئی جس میں انہیں بہت محدود کامیابی ہوئی۔ ریاست میں درس گاہیں بہت ہی کم تھیں اور درس گاہوں میں مدرس بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ نیشنل پارٹی کی توجہ دلانے سے درس گاہوں کی حالت کسی حد تک بہتر بنائی گئی

1941ء میں جودھ پور میں آل انڈیا سٹیٹ پیپلز کانگرس کا اجتماع ہوا آل انڈیا سٹیٹ پیپلز کانگرس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو اور جنرل سیکرٹری کشمیر کے شیخ عبداللہ تھے اس اجتماع میں قلات نیشنل پارٹی کا ایک وفد میر غوث بخش بزنجو کی قیادت میں جودھپور گیا اور بحیثیت پارٹی کے قلات نیشنل پارٹی آل انڈیا سٹیٹ پیپلز کانگرس میں شامل ہو گئی۔ اراکین وفد اور میر غوث بخش بزنجو سے پنڈت نہرو بہت متاثر ہوئے اور انکے خیالات کو بہت پسند کیا گیا۔ عبدالکریم شورش قلات نیشنل پارٹی کے کنونشن میں شامل ہوئے تھے اور ساتھ ہی وہ سرکاری ملازم تحصیل دار بھی تھے انہوں نے بعد میں سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا اور ہمہ وقت پارٹی کارکن بن گئے۔ مستونگ میں جب سرداروں کے ایجنٹوں نے نیشنل پارٹی کنونشن پر حملہ کیا تھا اس میں شورش صاحب شدید زخمی ہوئے تھے۔ نیشنل پارٹی کے لیڈراں عوام سے رابطہ کرنے کے لیے پیدل یا اونٹوں پر سفر کیا کرتے تھے۔ اس لے کہ بلوچستان میں آمدورفت کی حالت بہت ہی خراب تھی دور دراز علاقوں میں جانے کیلئے کچی سڑکیں بھی بہت ہی کم تھیں۔ عبدالکریم شورش صاحب نے 1941ء میں قلات نیشنل پارٹی کے اندرون ایک مزدور تنظیم بھی قائم کی گئی جس کے وہ جنرل سیکرٹری بنے اور ان کے ساتھیوں میں عبداللہ جان جمالدینی' انجم قزلباش' عین الاسلام' ڈاکٹر خدائے داد جیسے لوگ شامل تھے - عبدالعزیز کرد قلات نیشنل پارٹی کے پہلے صدر بنے وہ 1907ء میں مستونگ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ 1918ء میں ینگ بلوچ پارٹی قائم کی یہ خفیہ تنظیم تھی اور تحریک خلافت کے ساتھ وابستہ ہوئے اور وطن کی آزادی کی جدوجہد میں شامل ہو گئے یوسف مگسی اور دیگر لوگ بھی انکے ساتھی بن گئے اور ساتھ وہ لاھور کے روزنامہ آزاد میں مضمون بھی لکھتے تھے اور انکے مضامین بلوچ نوجوانوں کو بہت اپیل کرتے تھے کرد صاحب 1932ء میں گرفتار ہوئے اور انہیں تین سال قید بامشقت سنائی گئی

گل خان نصیر قلات نیشنل پارٹی کے نائب صدر بنائے گئے تھے گل خان نصیر بلوچی زبان کے شاعر اور ادیب تھے وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے قلات نیشنل پارٹی کے جنرل سیکرٹری ملک فیض محمد یوسف زئی بنائے گئے تھے نیشنل پارٹی کے منشور میں وطن کی آزادی کو اولیت دی گئی تھی

1941ء میں خان آف قلات نیشنل پارٹی پر پھر ناراض ہو گئے انہوں نے پارٹی لیڈراں کو ریاست بدر کر دیا اور پارٹی پر پابندی لگا دی گئی۔ آل انڈیا سٹیٹ پیپلز کانگرس کا اجلاس سرینگر میں پنڈت جواہر لال نہرو کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جس میں قلات نیشنل پارٹی کا وفد بھی شامل ہوا۔ ایک

قرارداد منظور کی گئی جس میں قلات حکومت کے اس اقدام کی مذمت کی گئی جس کے تحت قلات نیشنل پارٹی پر پابندی لگا دی گئی اور ریاست قلات کی حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ نیشنل پارٹی پر پابندی ختم کریں اور لیڈروں کو قلات میں داخل ہونے کی اجازت دیں اور دیگر ہر قسم کی پابندیاں بھی ختم کریں اور شہری آزادیاں بحال کریں حکومت قلات نے 1942ء میں قلات نیشنل پارٹی پر پابندی ختم کر دی اور پارٹی لیڈروں کو قلات سٹیٹ میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔ پارٹی نے اپنے اجلاس میں مطالبہ کیا کہ ریاست میں اشیائے صرف کی قیمتیں بہت زیادہ ہو گئی ہیں بلیک مارکیٹنگ کی روک تھام کی جائے۔ گراں فروشوں کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں - اور مطالبہ کیا کہ کنٹرول سسٹم سے اشیائے صرف بلیک مارکیٹ میں چلی جاتی ہیں تجویز پیش کی کہ اشیائے صرف وافر مقدار میں مارکیٹ میں لائی جائیں تاکہ لوگوں کو آسانی سے چیزیں مل جائیں اور بلیک مارکیٹنگ کا خطرہ بھی ختم ہو

ایک اور قرارداد میں ملک میں نظام شریعت نافذ کرنیکا مطالبہ کیا گیا تھا

ایک قرارداد میں کہا گیا کہ نیشنل پارٹی عوام پر کسی قسم کا ظلم برداشت نہیں کر سکتی اور نہ ہی کسی ایسی پالیسی کی حمایت کر سکتی ہے جس سے قلات کی مرکزیت ہی ختم کی جائے

ایک ریزولیشن کے تحت تعلیم کی ناگفتہ بہ حالت پر حکومت قلات کی توجہ دلائی گئی مطالبہ کیا گیا کہ ریاست میں تعلیمی نظام کو بہتر بنایا جائے جن سکولوں میں اساتذہ کی کمی ہے وہاں اساتذہ مہیا کئے جائیں اور مزید درس گاہیں جلد قائم کی جائیں

ایک اور قرارداد میں خان آف قلات سے مطالبہ کیا گیا کہ ریاست میں نمائندہ حکومت قائم کی جائے تا کہ ریاست قلات کے لوگ بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔ ایک قرارداد میں بلوچ اتحاد کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ قلات کی مرکزیت پر زور دیا گیا۔ خاران' مکران' لسبیلہ کی الگ ریاستیں بنائی جانے کی مذمت کی گئی اور بلوچستان کی منتشر حالت کو لوگوں کی ترقی میں رکاوٹ کہا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ بلوچستان کی ٹکڑوں کی تقسیم ختم کر کے متحد کیا جائے۔ بلوچستان کے لوگ ہمیشہ متحدہ بلوچستان کے حامی رہے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ متحدہ بلوچستان سے ہی بلوچ خوشحال ہو سکتے ہیں۔ قلات نیشنل پارٹی میں مذہبی لوگ بھی شامل تھے جن کی تعداد بہت زیادہ تھی موجودہ سینیٹر حافظ حسین احمد کے والد مولوی عرض محمد صاحب بھی قلات نیشنل پارٹی کے سرگرم رکن اور لیڈر تھے۔ قلات نیشنل پارٹی ملکی سیاست میں انڈین نیشنل کانگرس کی ہمنوا تھی اور سیاسی فکر بھی کانگرس جیسی رکھتے تھے۔ تحریک آزادی میں قلات نیشنل پارٹی کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں جیلوں میں گئے اور کئی لوگ آزادی کی جدوجہد میں قربان بھی ہو گئے

آخر کار قلات نیشنل پارٹی کی قربانیاں اور جدوجہد رنگ لائی اور ریاست قلات میں پارلیمانی طرز حکومت نافذ کیا گیا۔ دو ایوان بنائے گئے ایک ایوان بالا اور ایک ایوان زیریں۔ ایوان بالا میں قبائلی نمائندوں اور لیڈروں کو ممبر بنایا گیا جبکہ ایوان زیریں میں ہنر مند' تعلیم یافتہ' تجارت پیشہ اور دانشوروں کو ممبر بنایا گیا غیر مسلموں کو بھی نمائندگی دی گئی مگر یہ اسمبلیاں اس طرح خود مختار نہ تھیں جس طرح

ھندوستان کے دوسرے صوبوں کی تھیں کہ اسمبلی میں جو پارٹی بھی اکثریت حاصل کر لے وہی حکومت بنائے بلکہ یہ اسمبلیاں خان آف قلات کے فرمان کے تابع ہوتی تھیں اور خان آف قلات ہی حکومتی ذمہ داری کسی ممبر کے سپرد کر کے وزیر بنا دیا کرتے تھے مگر اسمبلیوں کی نمائندگی ہر طبقہ کو حاصل تھی خان کے حکم سے ہی قلات نیشنل پارٹی کے عبدالعزیز کرد صاحب کو ریاست کا وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ گل خان نصیر اور دیگر لیڈروں کو وزیر بنا دیا گیا تھا۔ نیشنل پارٹی کی وزارت نے بہت ساری اصلاحات کیں نظام تعلیم کو بہتر بنایا مگر وہ کوئی انقلابی تبدیلی نہ لا سکے قبائلی سردار کسانوں سے چھٹا حصہ لگان وصول کرتے تھے اور اب بھی کرتے ھیں جسے وہ شُشک کہتے ھیں وہ نیشنل پارٹی ختم نہیں کرا سکی

خان آف قلات کے ساتھ نیشنل پارٹی کے تعلقات 1947ء تک اچھے رہے خان آف قلات بھی آزادی وطن کی جدوجہد میں کانگرس کے معاون تھے جب پاکستان بن گیا تو ریاست قلات کی شمولیت کا مسئلہ پیدا ہو گیا قلات نیشنل پارٹی ریاست کی شمولیت پاکستان کے ساتھ نہیں چاہتے تھے چنانچہ میر غوث بخش بزنجو نے قلات اسمبلی میں پاکستان کے ساتھ ریاست کی شمولیت کی مخالفت کی تھی اور خان آف قلات بھی پاکستان میں شمولیت کے حق میں نہ تھے چنانچہ خان آف قلات نے ھندوستان میں ریاست کی شمولیت کی درخواست بھی کی تھی جسے ھندوستان نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ ھم چونکہ ریاست قلات کا کنٹرول حاصل نہیں کر سکتے اس لیے معذرت کے ساتھ ریاست کی شمولیت کی دعوت کو نہیں مان سکتے تھوڑی مدت ریاست قلات کسی ملک کے ساتھ شامل نہ ہوئی بالآخر ریاست قلات نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا جب حکومت پاکستان نے ریاستی کنٹرول حاصل کر لیا تو قلات نیشنل پارٹی کو خلاف قانون جماعت قرار دیا۔ لیڈران بشمول غوث بخش بزنجو' شہزادہ عبدالکریم' جناب عبدالعزیز کرد' گل خان نصیر گرفتار کر لئے گئے۔ گرفتاری سے قبل بلوچ لیڈران نے نئی جماعت کا اعلان کر دیا تھا جس کا نام تھا (استمان گل)

بلوچستان کی سیاسی پارٹیوں، تحریکوں کے حالات میں نے ڈاکٹر خدائے داد اور ڈاکٹر شاہ محمد مری اکابرین پروگریسو رائٹر ایسوسی ایشن کے تعاون سے لکھے ھیں میں ان اکابرین کا بہت شکر گزار ھوں

جمیعت علمائے اسلام

جمیعت علمائے ہند میں ہی کچھ اکابرین کی تحریک آزادی ہند میں رائے شیخ الہند حضرت محمودالحسن اور مولانا سید حسین احمد مدنی کے خلاف تھی۔ وہ لوگ تحریک آزادی ہند میں کانگرس کے ہمنوا نہ تھے۔ وہ مسلم لیگ کے نقطہ نظر کے حامی تھے۔ ویسے یہ حضرات تحریک آزادی میں متحرک بھی نہ تھے۔ کبھی کبھی جمیعت علمائے ہند کے اکابرین انہیں بھی اپنے ساتھ کسی کانفرنس یا جلسہ وغیرہ میں لے لیا کرتے تھے مگر مجموعی طور پر ان حضرات کا نظریہ کانگرس کی ہمنوائی نہ تھی۔ ان حضرات میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی نمایاں شخصیت کے حامل تھے۔ مگر یہ لوگ اپنی رائے الگ رکھتے۔ جمیعت العمائے ہند کے ساتھ ہوتے ہوئے اختلاف رکھتے تھے مگر مخالفت نہیں کرتے تھے۔ حضرت حکیم الامت اشرف علی تھانوی تو 1942ء میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ اس وقت ابھی مسلم لیگ متحرک جماعت بھی نہ ہوئی تھی۔ جب 1943ء میں مسلم لیگ متحرک ہوئی تو اس وقت مسلم لیگ نے علماء کو ساتھ ملانے کی ضرورت کا احساس کیا اور اس ضرورت کے پیش نظر حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ نے جمیعت علمائے ہند سے اختلاف کرتے ہوئے جمیعت علمائے اسلام ہند کی بنیاد رکھی اور وہی جماعت کے صدر بنے۔ مولانا احتشام الحسن تھانوی' مولانا ظفر احمد عثمانی' مفتی محمد شفیع' مولانا طاہر قاسمی' مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی' اور دیگر علماء اور معتقدین بھی کافی تعداد میں اور دیگر وہ علمائے دین جو مسلم لیگ کے سیاسی نقطہ نگاہ کے حامی تھے وہ بھی جمیعت علمائے اسلام میں شامل ہوئے۔ 1945ء کے انتخابات میں یہ علماء حضرات مسلم لیگ کے شانہ بشانہ تحریک پاکستان میں شامل ہوئے گو علمائے ہند کے مقابلہ میں ان علماء کی تعداد بہت کم تھی۔ مگر وہ اپنے وجود کی حیثیت سے موثر طاقت رکھتے تھے۔ مسلم لیگ نے الیکشن جیت لینے کے بعد حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ کو دستور ساز اسمبلی کا ممبر بنایا۔ دستور ساز اسمبلیوں کے ممبران کو منتخب صوبائی اسمبلی کے ممبران نے چنا تھا۔ پاکستان بن جانے کے بعد دوسرے مسلم لیگی لیڈروں کی طرح حضرت عثمانی بھی ہجرت کر کے پاکستان تشریف لے آئے اور کراچی میں ہی سکونت اختیار کر لی۔ حکومت نے انہیں شیخ الاسلام کا رتبہ دیا۔ ہر دینی معاملہ میں وہ حکومت کے مشیر تھے۔ مگر سیاسی طور پر جمیعت علمائے اسلام غیر متحرک ہو گئی تھی۔ جمیعت کے دیگر علماء بھی حکومتی عہدوں پر فائز ہو گئے تھے۔ لوگوں میں متحرک رہنے کے لئے ان کے پاس کوئی پروگرام نہیں تھا۔

1948ء میں جب کشمیر میں گوریلا جنگ ہو رہی تھی جس میں پاکستان پس پردہ تھا۔ جنگ لڑنے والے لوگوں کے ساتھ پاکستان کی ہمدردی تو تھی مگر اس جنگ کی ذمہ داری پاکستان قبول نہیں کرتا تھا۔ جماعت اسلامی کے اس وقت کے امیر حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ایک فتویٰ جاری کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ کشمیر کی اس گوریلا جنگ کو کسی صورت جہاد نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ جہاد علانیہ جنگ کو کہا جاتا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ملک کا مسلمان سربراہ اعلان کرے کہ ہم اس وقت فلاں ملک کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں۔ اس اعلانیہ جنگ میں جو لوگ شریک ہوں گے وہ

مجاہدین کہلائیں گے اور وہ جنگ ازروئے اسلام جہاد ہو گی۔ بغیر اعلان کے جنگ کو جہاد نہیں کہا جا سکتا۔

اس فتوے کا حکومت کی طرف سے دفاع حضرت عثمانی نے ہی کیا تھا۔ مودودی صاحب اور عثمانی صاحب کا کئی دن تک تحریری مناظرہ ہوتا رہا۔ حضرت عثمانی 1950ء میں اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ ان کی وفات تک تو جمیعت علمائے اسلام کا نام زندہ رہا ان کی وفات کے بعد اس جماعت کی ضرورت بھی باقی نہ رہی تھی۔ جمیعت علمائے اسلام بنائی بھی اس لئے گئی تھی کہ متحدہ ہندوستان کے وقت علمائے دیو بند تحریک آزادی میں کانگرس سے ہمنوا تھے۔ دارلعلوم دیو بند کا مسلم عوام پر کافی اثر تھا اس اثر کو زائل کرنے کے لئے مسلم لیگ نے ہی حضرت عثمانی اور تھانوی علمائے دین کو سیاست میں متحرک کیا اور کانگرسی علمائے دین جمیعت علمائے ہند کی ناکامی کے لئے پاکستان بن جانے کے بعد مسلم لیگ کو اس جماعت کی ضرورت بھی نہ رہی اور یہ جمیعت علمائے اسلام گوشہ گمنامی میں چلی گئی۔ بعد میں اس نام کو جمیعت علمائے ہند کے وہ لوگ جو پاکستان میں رہ گئے تھے انہوں نے اپنا لیا اور جمیعت علمائے ہند والے ہی پاکستان میں جمیعت علمائے اسلام کے نام سے سیاست کرنے لگ گئے۔ آج بھی جمیعت علمائے ہند کے علماء ہی پاکستان میں اس نام سے سیاست کر رہے ہیں۔

حیات مولانا مودودی

مولانا مودودی 1903ء میں اورنگ آباد کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید احمد حسن صاحب پیشہ وکالت سے وابستہ تھے مگر مذہب سے لگاؤ بھی تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کے والد صاحب نے پیشہ وکالت ترک کر دیا مگر بزرگوں کے کہنے پر پھر وکالت سے وابستہ ہو گئے۔ باپ نے نام ابوالاعلیٰ رکھا۔ آنکھ کھولی تو گھرانے کا مذہبی ماحول نظر آیا۔ تو اسی رنگ میں رنگین ہونے لگ گئے۔ چار سال کی عمر میں والد کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔ نماز اور دیگر مذہبی احکامات یاد کر لئے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی۔ حیدر آباد دکن میں تعلیمی نظام میں مڈل کو رشدیہ اور میٹرک کے امتحان کو مولوی کہتے تھے اور یہ تعلیم اردو میں ہوتی تھی۔ مودودی صاحب نے رشدیہ یعنی مڈل مولوی یعنی میٹرک بڑی اچھی پوزیشن میں پاس کیا۔ اورنگ آباد مدرسہ فوقانیہ سے انٹر میڈیٹ پاس کیا۔ ریاست حیدر آباد میں ذریعہ تعلیم اردو تھا اس لئے جدید علوم کیمیا' طبعیات' ریاضی' تاریخ پر انہوں نے عبور حاصل کر لیا ہوا تھا۔ مدرسہ فوقانیہ میں مودودی صاحب نے عربی زبان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی علوم بھی حاصل کر لئے تھے۔ مولانا اشفاق الرحمان کاندھلوی سے حدیث کا درس لیا۔ مولانا شریف اللہ صاحب سے فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ اخبار نویسی کی ضرورت نے انہیں انگریزی سیکھنے پر مجبور کر دیا۔ مولوی محمد فاضل سے انہوں نے انگریزی تھوڑے عرصہ میں سیکھ لی۔ انگریزی اخبارات اور رسائل کے مطالعہ سے انہوں نے بہت جلد انگریزی پر عبور حاصل کر لیا۔
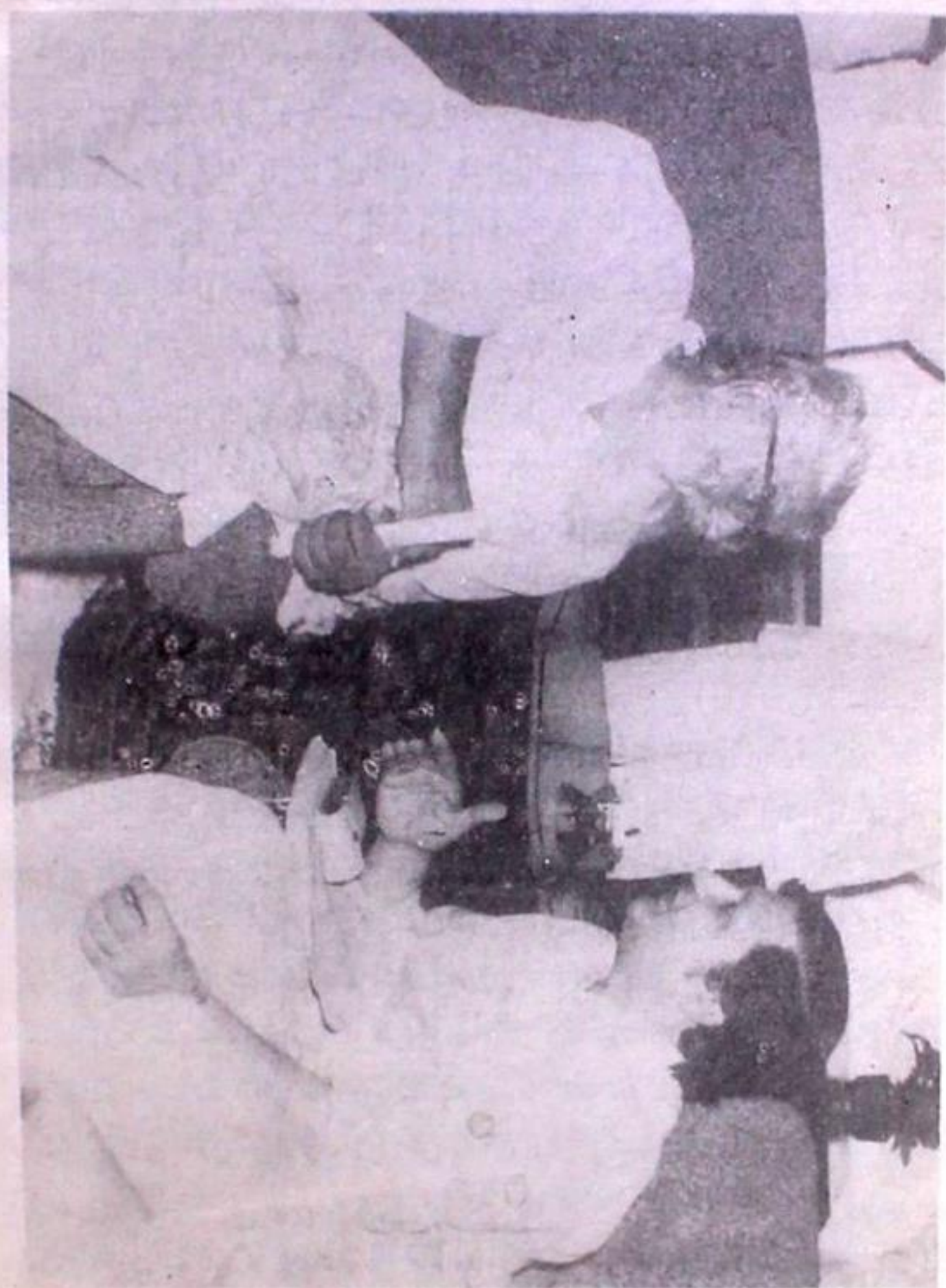
مودودی صاحب نے 1918ء میں عملی زندگی کا آغاز کر دیا وہ مدینہ بجنور کے نائب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ انکی عمر اس وقت صرف 16 سال کی تھی۔ 1920 میں مودودی صاحب "تاج" اخبار سے وابستہ ہوئے۔ اس کا اداریہ لکھتے رہے اس وقت خلافت تحریک زوروں پر تھی اور وہ اخبارات کے مضامین کے ذریعے تحریک خلافت کی حمایت کرتے تھے۔ تحریک خلافت کے دوران مودودی صاحب دہلی میں مفتی کفائیت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب سے بھی ملتے رہے۔ تفصیلی گفتگو بھی کرتے رہے۔ انہی ایام میں 1921ء میں اخبار مسلم میں انہیں نائب ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ ایڈیٹر منشی عبدالحمید صاحب تھے۔ 1924ء میں جمیعت علمائے ہند نے سہ روزہ اخبار الجمعتہ جاری کیا۔ مودودی صاحب اخبار کے نائب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ایڈیٹر عرفان صاحب تھے۔ مگر جب عرفان صاحب خلافت تحریک کے سلسلہ میں بمبئی چلے گئے تو مودودی صاحب الجمعتہ کے ایڈیٹر بن گئے۔ 1928ء تک الجمعتہ کے ایڈیٹر اخبار نویسی کے ساتھ ساتھ مطالعہ بھی جاری رکھا۔ انگریزی کے ساتھ جرمن بھی سیکھی۔ وہ ہندوستانی قومیت کے خلاف تھے۔ وہ مسلم قومیت کے حامی تھے۔ انکا نظریہ یہ تھا کہ جو شخص سوچ سمجھ کر دین قبول کرتا ہے وہ ہی صحیح مسلمان ہے باقی مسلمانوں کے گھر پیدا ہو کر مسلمان کہلوانے والے نسلی مسلمان ہیں۔

جماعت اسلامی

جماعت اسلامی کے بانی حضرت مولانا ابوالعلی ی مودودی تھے۔ 1931ء میں انہوں نے تصنیف تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ایک ہفت روزہ رسالہ ترجمان القرآن دہلی سے جاری کیا جس میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں دعوت اسلام دی۔ انکی دعوت خطاب مسلمانوں کی طرف ہی تھا۔ ان کی تحریرات بہت جاذب اور دلکش تھیں اور انہوں نے روائیتی مبلغین اسلام سے ہٹ کر فلسفیانہ انداز میں اسلامی دعوت فکر کی طرف اہل اسلام کو راغب کیا۔

انہوں نے اس وقت کی سیاسی جماعتوں کے نقطہ نگاہ اور تحریکات کو حرف تنقید بنایا اور خاص کر مسلم جماعتوں کو جو تحریک آزادی کی جدوجہد میں شریک تھیں۔ انہیں گول مول لفظوں میں راستے سے بھٹکے ہوئے گمراہ کہا گیا اور کہا گیا کہ موجودہ جماعتوں کا انداز فکر ہی غلط ہے آزادی حاصل کرنا بذات خود کوئی مقصد نہیں اور پھر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش جو کئی جلدوں پر مشتمل تھی لکھی گئی۔ اس میں تحریکات آزادی کو مسلمانوں کی سیاسی کشمکش کا نام دیا گیا اور مسلم عوام کو تحریکات آزادی سے ہٹ کر اپنی مخصوص اسلامی نظریات کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی گئی۔ انکا کہنا یہ تھا کہ ہم بھی چاہتے ہیں کہ وطن آزاد ہو مگر ایسی آزادی نہیں چاہتے جس طرح ترکی اور مصر یا ایران آزاد ہیں۔

1932ء میں جب رسالہ ترجمان القرآن جاری کیا گیا تو اس کی اشاعت اس انداز میں کی گئی کہ کالجوں، سکولوں، دینی مدارس، مسلم درس گاہوں اور مسلم اہل علم لوگوں تک رسالہ پہنچایا گیا اور ساتھ

ہی مندرجہ ذیل کتابیں بھی تصنیف کی گئیں اور منظم طریقہ پر مسلم عوام میں پہنچائیں گئیں۔ 1931ء سے 1941ء تک دیگر رسالہ جات کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں گئیں۔

حقوق الزوجین' اسلام اور ضبط ولادت' تنقیحات' رسالہ دینیات' سود' پردہ' خطبات' اسلام کا نظریہ سیاسی' اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر' تجدید احیائے دین' اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوئی' ایک اہم استفسار۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں' اسلام اور جاہلیت' نیا نظام تعلیم' انسان کا معاشی مسئلہ اور اسکا حل' مسلمانوں کی سیاسی کشمکش کئی جلدوں میں تھی - دین حق' مرتد کی سزا اسلامی قانون میں' اسلام کا اخلاقی نطقہ نظر' حقیقت شرک' حقیقت توحید' اشتراکیت اور نظام اسلام' شہات حق' دعوت دین اور اسکا طریقہ کار' جماعت اسلامی کی دعوت' بناؤ اور بگاڑ' حقیقت تقویٰ

اور پاکستان بن جانے کے بعد بھی مودودی صاحب نے بہت کتابیں لکھیں وہ بہت بڑے صاحب تصنیف تھے۔ اتنا بڑا مصنف شائد بیسوی صدی میں کوئی دوسرا نہ ہوا ہو وہ بہت بڑے صاحب مطالعہ تھے۔

انہوں نے مارکسزم کا مطالعہ کیا ہوا تھا۔ وہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو خوب سمجھتے تھے۔ یورپ کے دیگر فلاسفہ کو بھی انہوں نے پڑھا ہوا تھا وہ بہت بڑے عالم دین تھے۔ وہ روائتی ملائیت کے خلاف تھے۔ وہ آئمہ دین میں کسی کے مقلد نہ تھے۔ وہ دین کے معاملہ میں اپنی الگ رائے رکھتے تھے۔ وہ بامقصد آزادی کے قائل تھے وہ ابتدائی دس سال میں اپنی دانست کے مطابق صالحین کی تلاش میں رہے اور انہیں اپنے مقصد میں بہت کامیابی ہوئی۔ انکی تحریرات مسلم اہل علم میں بہت مقبول ہوئیں۔ ترجمان القرآن رسالہ کی اشاعت زیادہ ہوئی اور مقبولیت عام ہوئی۔ اسی رسالہ کے ذریعے لوگوں کی رائے معلوم کی جانے لگی مودودی صاحب کی دعوت فکر کو پسند کیا جانے لگا۔ ہمدرد اور متفقین کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہونے لگا مگر تنظیم قائم کرنے کا مرحلہ ابھی نہیں آیا تھا۔ سب سے پہلا تنظیمی قدم 1938ء میں اٹھایا گیا۔ لاہور میں ہی ایک چھوٹی سی میٹنگ بلائی گئی جس میں کل چار مندریجہ ذیل آدمی شریک ہوئے۔ سید ابو الا علیٰ مودودی' سید عبدالعزیز شرقی ملتان' مولانا صدر دین صاحب اور سید محمد شاہ صاحب مینیجر ترجمان القرآن تھے۔ ان چار لوگوں کی تنظیم سے ابتداء کی گئی۔ جماعت کی تنظیم عام جمہوری انداز سے نہ کی جاتی تھی جیسے کہ عام رواج ہے کہ ایک جماعت کا صدر سیکرٹری اور پھر دیگر عہدیدار بنائے جاتے ہیں۔ یہ مجوزہ جماعت صرف ایک امیر جماعت کے تحت ہونا تھی جیسے پرانے وقتوں میں ہوا کرتا تھا کہ کسی مملکت کا ایک بادشاہ یا کسی جماعت کا ایک امیر ہے۔ دیگر مودودی صاحب کا یہ بھی فلسفہ تھا کہ پیدائشی مسلمان صرف اس وجہ سے مسلمان ہے کہ وہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوا ہے۔ ایسے شخص کو دین کی حقیقت کا قطعی علم نہیں ہوتا جب تک ایسے لوگ جو دین کو مودودی صاحب کی تعلیمات کے مطابق لٹریچر کے مطابق حقیقت کے مطابق نہیں سمجھ جاتے جماعت بنانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور خام ذہن کے لوگ کسی بھی ملک میں معشیت انقلاب میں اچھے معاون ثابت نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان کا سارا لٹریچر رسالہ ترجمان القرآن دیگر پوری جدوجہد تحریک کی روح کے مطابق ورکر پیدا کرنے پر صرف ہوئی۔ جو شخص بھی ان کے پاس جاتا اور ان کی تعلیمات پر پسندیدگی کا اظہار

کرتا تو سوال جواب کے ذریعے اس کا امتحان لیا جاتا کہ واقعی وہ ان کی مجوزہ جماعت کا ممبر بن سکتا ہے۔ پھر خط و کتابت سے بھی منتظمین کو مذید ہدایات جاری کی جاتی تھی جب کوئی شخص ان کے امتحان میں کامیاب ہو جاتے تو اسے جماعت میں شمولیت کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ مودودی صاحب شائد کیمونسٹ پارٹی کے تنظیمی طریقہ کار سے متاثر تھے مندرجہ بالا طریقہ تنظیم کل کیمونسٹ پارٹی کی ہی کاپی ہے وہ بھی جب تک کوئی مارکسزم کی رازداری کو مقصد تنظیم کو صحیح سمجھ نہ لے اس وقت تک پارٹی ممبر نہیں بناتے تھے۔ اسی طرح جماعت سازی کرتے وقت سب سے پہلے اسی بات کو ملحوظ رکھا گیا جو شخص ارادہ ظاہر کرتا کہ مجوزہ جماعت میں شامل ہونا چاہتا ہے اس سے کلمہ شہادت سنا جاتا۔ اور اسکا مطلب اور مفہوم پوچھا جاتا۔ اگر وہ مطلب مودودی صاحب کی تعلیمات کے مطابق بتا دیتا تو اسے مجوزہ جماعت میں شمولیت کا جواز نامہ دیا جاتا تھا اور ان لوگوں کو صالحین کے القاب سے بھی نوازا جاتا تھا۔ جو ذرا اس سے کم علم یا کم سمجھ ہوتے انہیں منتفقین اور پھر ہمدرد کے القاب دیے جاتے تھے۔

1941ء دہلی میں ایک اجتماع مقصد جماعت کے ساتھ متفق حضرات کا بشمول مندرجہ ذیل حضرات کے تقریباً 70 لوگوں کا اجتماع ہوا جس میں حضرت مولانا منظور احمد نعمانی مدیر الفرقان بریلی' سید صبغتہ اللہ صاحب بختاری مدارس' سید محمد جعفر صاحب پھلواری' نذیر الحق صاحب میرٹھی' مستری محمد صدیق صاحب سلطانپور لودھی' ڈاکٹر سید نذیر علی صاحب زیدی آلہ آباد' محمد ابن علی صاحب علوی کاکوروی لکھنؤ' اس مجلس منتظمہ نے جماعت کا دستور تیار کیا اور جماعت کا نام جماعت اسلامی رکھا گیا۔ دستور کی تیاری میں بہت بحث سوچ بچار ہوا۔ تشکیل جماعت سے قبل حاضرین ممبران نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سب سے پہلے مولانا مودودی اٹھے اور کلمہ شہادت پڑھا اور کہا کہ لوگوں گواہ رہو میں آج از سر نو ایمان لاتا ہوں اور جماعت اسلامی میں شریک ہوتا ہوں۔ اس کے بعد حضرت مولانا منظور احمد نعمانی اٹھے انہوں نے بھی کلمہ شہادت پڑھا اور وہی الفاظ دہرائے جو مودودی صاحب کہ چکے تھے اور پھر تمام حاضرین جو اس وقت موجود تھے انہوں نے بھی باری باری کلمہ شہادت پڑھا اور مودودی صاحب والے الفاظ دہرائے۔ اس طرح جماعت اسلامی کی ابتدا کا مرحلہ تمہ ہوا اور جماعت اسلامی باقاعدہ معرض وجود میں آگئی اور سنا گیا ہے کہ اس وقت بھی جس شخص کو رکن جماعت بنایا جاتا ہے وہ حاضرین مجلس کے سامنے کلمہ شہادت پڑھتا ہے اور جو حضرت مودودی صاحب نے جماعت سازی کے وقت الفاظ کہے تھے وہی کہے جاتے ہیں اور اس عہد کو ہی حلف کا درجہ دیا جاتا ہے۔ جماعت اسلامی نے اپنے لیڈروں' ورکروں اور لکھاریوں کی تربیت کی سابقہ واعظین کا انداز تقریر بھی بدل ڈالا انہیں خاص انداز سے تقریر کرنے کا فن سکھایا گیا جو مدلل اور عالمانہ ہوتا تھا اور ہے۔ لکھنے والوں کی تربیت پر بھی حضرت مودودی صاحب کی چھاپ ہی نمایاں نظر آنے لگی۔ ورکران کو اس انداز سے تیار کیا گیا کہ وہ معاشرے میں نمایاں اور الگ الگ سے نظر آنے لگے۔ دوسری مذہبی جماعتوں کے راہنما مسکین مسکین عاجزی میں دبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جبکہ جماعت اسلامی کے لیڈران ورکران اور علماء اپنے آپ کو نہ ہوتے ہوئے بھی تڑے موشے سے معلوم ہوتے ہیں۔ بیک وقت وہ مذہبی راہنما اور جدیدیت

پروفیسر غفور احمد

میں کھبے ہوئے نظر آتے اور ساتھ ہی کسی قدر غرور اور تکبر میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مودودی صاحب کی کتابیں پڑھ لینے کے بعد وہ اپنے آپ کو عقل کل کے مالک سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

جماعت سازی کے بعد

جماعتی تنظیم مکمل ہو جانے کے بعد حضرت مودودی صاحب نے تمام ورکران لیڈران سے الگ الگ ملاقاتیں کیں ہر ورکر کی صلاحیت کا جائزہ لے کر ان کے مطابق انہیں ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ مودودی صاحب نے بحثیت امیر جماعت اسلامی اپنے ورکران اور ساتھیوں سے پہلا خطاب کیا اور انہیں وحدت فکر کا درس دیا اور مستقبل کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے کہا کہ وہ اسلامی انقلاب کے بنیادی پتھر کی حثیت رکھتے ہیں۔ انکی جدوجہد ہمت اور کوشش سے ہی وہ وقت ضرور آئے گا کہ دنیا میں حقیقی اسلامی حکومتیں قائم ہوں گی۔ جماعت اسلامی نے قائم ہونے کے بعد مختلف شعبہ جات قائم کئے جن میں علمی تعلیمی تربیتی نشرو اشاعت مالیات اور تنظیم جماعت وغیرہ بھی شامل تھے۔ امیر جماعت حضرت مودودی صاحب نے کارکنوں کو کئی ہدایات دیں جن میں یہ بھی شامل تھیں مقامی جماعتوں کے قیام کا طریقہ کار بتایا گیا۔ جماعت میں داخلے کا طریقہ کار بتایا گیا۔ مطالعہ لٹریچر کی اہمیت اور ضرورت پر ہدایات دی گئیں۔ مقامی کارکنوں میں تقسیم کار کا طریقہ بتایا گیا۔ ہفتہ وار اجتماعات اور دیگر بہت ساری ہدایات دی گئیں۔

1942ء جماعت میں اختلاف پیدا ہوئے حضرت مولانا منظور احمد نعمانی جو اس وقت ہندوستان بھر میں اپنے معتقد رکھتے تھے ان کا احترام اس وقت پورے ہندوستان میں تھا مولانا مودودی صاحب سے زیادہ شہرت رکھتے تھے جماعت میں بھی ان کے ساتھی کافی تعداد میں تھے۔ اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے حل تلاش کرنے کے لئے اکتوبر کے دوسرے ہفتے دہلی میں جماعت کا اجلاس بلایا گیا۔ یہ خطرہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ شائد جماعت ٹوٹ ہی جائے۔ بہت کوشش کی گئی کہ اختلاف دور ہو جاویں مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس اجلاس میں مجلس شوریٰ کے مندرجہ ذیل حضرات شریک ہوئے۔ مولانا ابوالحسن علی صاحب لکھنوٴ، محمد یوسف بھوپال، مولانا صبغۃ اللہ صاحب مدراس، مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب شرقی جالندھر، ملک نصراللہ خان عزیز لاہور، قاضی حمید اللہ صاحب سیالکوٹ، عبدالجبار غازی صاحب دہلی، محمد بن علی صاحب کاکوری، مولانا منظور احمد نعمانی صاحب بریلی، مولانا سید محمد جعفر صاحب کپور تھلہ، قمرالدین خان صاحب، عطاء اللہ صاحب تپوا کھالی۔

تین چار روز تک مجلس کا اجلاس ہوا۔ جماعتی اختلاف ختم کرنے کی لیے مختلف تجاویز پیش کی گئی۔ ان پر غور کیا گیا مگر جماعتی اختلاف رفع کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ آخری فیصلہ یہ ہوا کہ جو لوگ موجودہ صورت میں جماعت کے ساتھ نہیں چل سکتے تو آخری حل یہی ہے کہ وہ جماعت سے الگ ہو جاویں، چنانچہ مندرجہ ذیل حضرات نے جماعت اسلامی سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

مولانا منظور احمد نعمانی' مولانا سید محمد جعفر صاحب' خطیب جامع مسجد کپور تھلہ' قمرالدین صاحب سابق ناظم اعلیٰ جماعت اسلامی ہند' عطاء اللہ صاحب پتوا کھالی بنگال'

ان حضرات کے جماعت سے نکل جانے کے بعد مودودی صاحب جماعت کے مختار کل امیر بن گئے۔ جو لوگ جماعت میں باقی رہ گئے وہ انکے تابعہ فرمان تھے بلکہ اور نئے لوگ جن میں ملک نصراللہ خان عزیز اور امین احسن اصلاحی بھی شامل تھے وہ بھی جماعت اسلامی کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ یہ لوگ بھی بہت پڑھے لکھے اور لکھاری تھے جنکے لکھے کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ 1943ء تک جماعت اسلامی ہند کے ممبران کی تعداد سات سو کے قریب ہو چکی تھی۔ یہ 700 وہ لوگ تھے جنہیں جماعت اسلامی میں صالحین کا رتبہ حاصل تھا۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر ملکوں میں بھی جہاں مودودی صاحب کی کتابیں جاتی تھیں وہاں کے ممبران صالحین' ہمدردین' متفقین کا تخمینہ نہیں لگایا گیا تھا۔ اس وقت تک سندھ' بلوچستان' سرحد' بمبئی' وسط ہند کے علاقوں میں جماعت سازی نہیں ہوئی تھیں۔

اکتوبر 1943ء میں جماعت کا اجلاس در بھنگہ بہار میں ہوا جس میں یو پی اور بہار کے اراکین شریک ہوئے۔ مختلف تنظیمی امور زیر بحث آئے۔ کارکنان کو مزید ہدایات جاری کی گئی جماعتی طریقہ کار کو موثر بنانے کی ضرورت پر خصوصی توجہ دی گئی۔

جماعت اسلامی کے مرکز کی اشد ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ 1943ء کے آخر میں فیصلہ ہوا کہ پنجاب میں پٹھانکوٹ کے نزدیک جماعت اسلامی کا نیا مرکز قائم کیا جائے جس کا نام دارالاسلام رکھا گیا۔ مارچ 1945ء میں پنجاب' سندھ' کشمیر اور دیگر مغربی علاقوں کی جماعتوں کا اجتماع پٹھان کوٹ میں منعقد ہوا جس میں اور بہت سے لوگوں کے علاوہ امین احسن اصلاحی صاحب اور جناب امیر حسین صاحب دربھنگہ والے بھی شریک ہوئے۔ حاضرین اور مندوبین جو جماعت اسلامی کی رکنیت چاہتے تھے جماعت میں شامل ہونا چاہتے تھے مولانا مودودی نے تقریر کی انہیں جماعت کے حالات اور ہندوستان کے حالات سے آگاہ کیا دوسرے اجلاس میں جناب امین احسن اصلاحی صاحب نے تقریر کی۔ جماعت کے تیسرے اجلاس میں مختلف تجاویز جماعت کی ترقی کے لئے پیش کی گئی اتفاق رائے سے منظور کی گئی اور اس میں آمدن اور خرچ کا گوشوارہ بھی پیش کیا گیا جو 1941ء سے 1945ء تک کا تھا اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔

جماعت اسلامی نے متحدہ ہندوستان کے وقت اپنا ایک موقف پیش کیا تھا کہ ہندوستانی عدالتیں غیر اسلامی ہیں ان میں مقدمات پیش کرنا' وکالت کرنا' عدالتوں کا رکن بننا' از روئے اسلام حرام ہے۔ جو شخص کسی عدالت میں مقدمہ پیش کرتا ہے' وکالت کرتا ہے' مجسٹریٹ بنتا ہے' جج بنتا ہے' غیر اسلامی حکومت کا معاون بنتا ہے' نوکری کرتا ہے' وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ راقم الحرف کے کئی جاننے والے اس وقت بھی زندہ ہیں جنہوں نے اس وقت سرکاری ملازمت چھوڑ دی تھی۔ پاکستان بن جانے اور قرارداد مقاصد پاس ہو جانے تک جماعت اسلامی کا موقف یہی رہا۔ جماعت اسلامی کا مقصد اور مسلک بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں فکر و نظر عقیدہ' خیال' مذہب' اخلاق' سیرت و
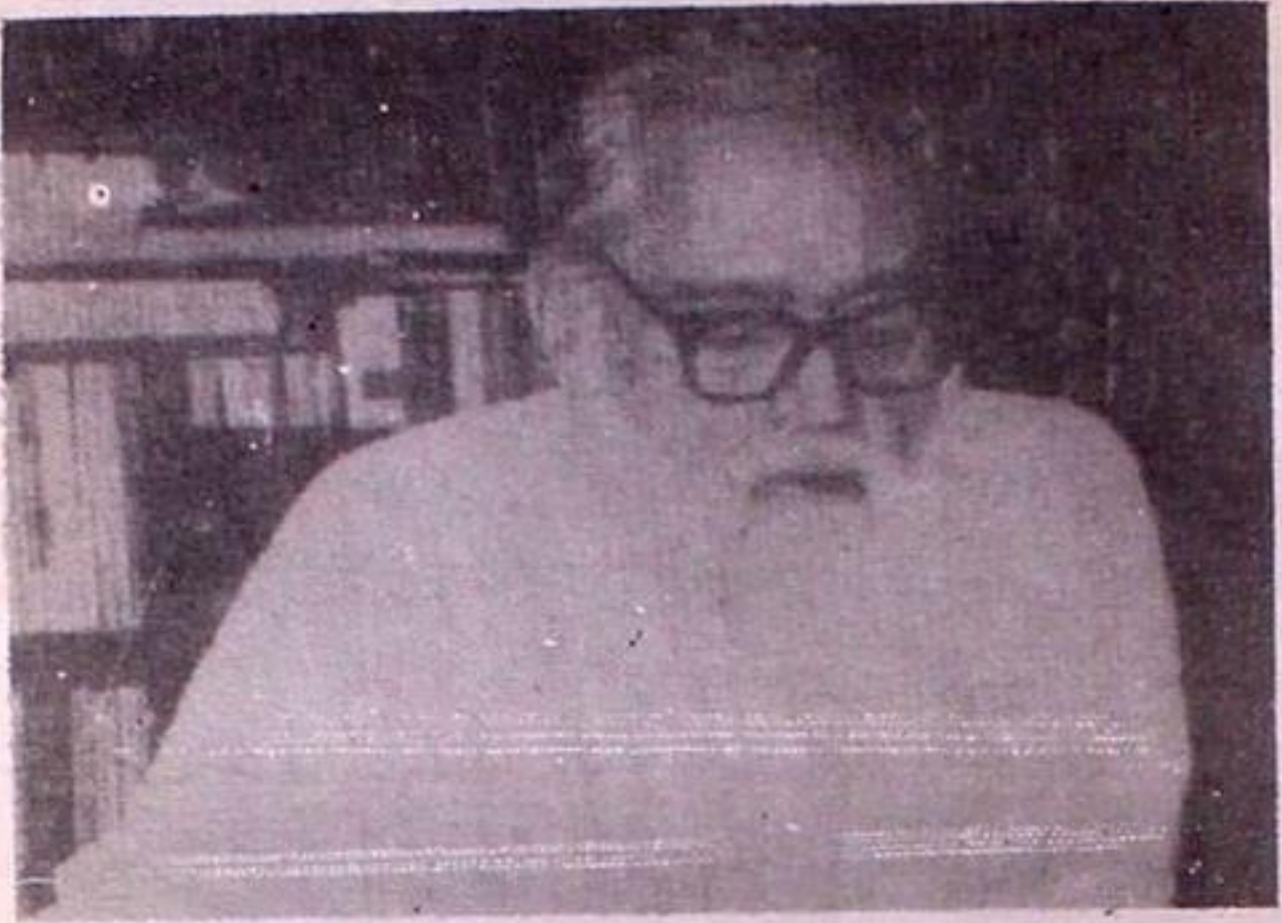
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بانی جماعت اسلامی پاکستان

کردار تعلیم و تربیت، تہذیب، ثقافت، تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست و قانون، عدالت، صلح و جنگ بین الاقوامی تعلقات سمیت سب خدائی بندگی اور ہدایت پر قائم ہوں۔ جماعت والے کہتے ہیں کہ یہ مقصد روز اول سے ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اگر یہ چاہا ہے کہ آزاد مسلم مملکت کا قیام ہو تو وہ اس لئے نہیں چاہا کہ ترکی، مصر یا ایران کی طرح ایک اور اسلامی ریاست قائم ہو جائے۔ ہمارے پیش نظر اسلامی مملکت قائم کرنے کا مندرجہ بالا مقصد ہے اور ہماری جدوجہد ہمیشہ ہی مندرجہ بالا رہے گی۔ حصول مقصد کے لئے ایک صالح جماعت کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لئے مولانا مودودی کی بہت ساری تصانیف سے استفادہ حاصل کر کے صالحین کی جماعت پیدا کی جا سکتی ہے جو دنیا میں اسلامی انقلاب لائے گی۔ اگر کسی شخص نے جماعت کی رکنیت کی درخواست دی تو کئی کئی ماہ تک امتحان کی منزل میں رکھا۔ جب لیڈران جماعت مطمئن ہو گئے کہ اب رکنیت کا امیدوار جماعت کے صالحین میں شامل کیا جا سکتا ہے تب وہ جماعت میں شامل کیا اور باقاعدہ رکن بنایا گیا۔ 1947ء میں تقسیم ہند کا فارمولا منظور ہو گیا۔ پاکستان بن جانے کا اعلان ہو گیا اور جماعت اسلامی بھی تقسیم ہو گئی۔ جماعت اسلامی کا مرکز پٹھانکوٹ کے قریب تھا۔ جو لاہور منتقل ہو گیا۔ نصف سے زائد اراکین - 385 اراکین جماعت پاکستان میں آ گئے اور باقی ہندوستان میں رہ گئے۔ اور ہندوستان کی 240 اراکین جماعت کو الگ کر دیا گیا اور تنظیم بھی کر دی گئی۔

پاکستان بن جانے کے بعد جماعت اسلامی کی سیاسی زندگی کا آغاز کیا گیا۔

انڈین کمیونسٹ پارٹی

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے کہ کانگرس ہمہ گیر جماعت تھی۔ جس میں ذیلی جماعتیں بھی تھیں جو تحریک آزادی میں تو کانگرس کے معاون تھیں مگر وہ الگ ایک اپنا تشخص بھی رکھتی تھیں اسی طرح جو لوگ کیمونسٹ نظریات رکھتے مارکسزم پر یقین رکھتے تھے وہ لوگ بھی کافی تعداد میں کانگرس میں موجود تھے۔ ان میں سکھوں کی تعداد زیادہ تھی اور مسلمان بھی کافی تھے۔ وہ لوگ جو 1914ء کی جنگ سے قبل یا اس دوران جنکا ذکر سابقہ ابواب میں آ چکا ہے وہ بیرون ملک گئے ہوئے تھے اور وطن کی آزادی کی جدوجہد بیرون ملک کر رہے تھے اور ساتھ ہی وہ لوگ بھی جو گاما گاٹا مارا جہاز لے کر اس میں اسلحہ ساتھ لئے ہوئے کلکتہ کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوئے تھے اور بہت سارے لوگ گرفتار ہو گئے تھے ان میں سے وہ لوگ جو بچ گئے یا وہ جو بیرون ملک کسی نہ کسی طریقہ پر آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ 1917ء کے روسی انقلاب کے بعد ان میں سے بہت سے لوگ کیمونسٹ نظریات کے حامی بن گئے اور جو لوگ وطن واپس آ گئے انہوں نے اپنا رابطہ کانگرس کے ساتھ کر لیا۔ مگر اندرونی طور پر یہ لوگ کیمونسٹ نظریات سے وابستہ تھے اور کانگرس کے اندر ہی ان کی جتھہ بندی تھی ان میں ہندوستان کے ہر علاقہ کے لوگ تھے جن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ جنہوں نے بعد میں کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ مگر ہم اس وقت پنجاب کے کیمونسٹوں کا اور ہندوستان کے چیدہ چیدہ لوگوں کا تذکرہ اور انکی سرگرمیوں کا ذکر کریں گے گزشتہ ابواب میں ہم نے ان لوگوں کا ذکر بھی کیا جو لوگ افغانستان گئے اور پھر روس چلے گئے اور انہوں نے مارکزم کا بغور مطالعہ کیا۔ ان میں بہت سارے لوگوں کے علاوہ مشہور عالم دین حضرت مولانا عبیداللہ سندھی بھی تھے وہ بھی روس گئے ہوئے تھے اور کیموزم سے متاثر بھی ہوئے تھے۔ وہ وطن واپس آ کر 1943ء میں فوت ہو گئے تھے۔ ہندوستان میں کیمونسٹ نظریات کے حامل لوگوں میں مسٹر ایم این رائے' سوہن سنگھ' جوش پورن سنگھ جوشی' سجاد ظہیر' صوفی غلام محمد ترک' فروز دین منصور اور دیگر لوگ بھی تھے۔ یہ سب لوگ کانگرس کے ساتھ تھے آزادی کی جدوجہد میں پوری طرح شامل تھے۔ جب یورپ میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو وائسرائے ہند نے بھی جنگ میں ہندوستان کی شمولیت کا اعلان کر دیا کانگرس نے حکومت کی جنگی پالیسی کی مخالفت کی اور اعلان کیا کہ وائسرائے کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ ہندوستانیوں سے پوچھے بغیر ہی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دے۔ ہندوستانیوں سے پوچھنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی سے جنگ میں شمولیت کا ریزرویشن کراتی اگر مرکزی اسمبلی جنگ میں شمولیت پر رضامند ہو جاتی تو کانگرس پابند تھی کہ وہ جنگ میں حکومت کی مدد کرے۔ موجودہ صورت حال میں کانگرس یورپ کی اس عالمی جنگ میں سرکار کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کریں گے اور عوام کو بھی کہیں گے کہ وہ بھی سرکار کے

سکھدیو

بھگت سنگھ،

راج گورو،

ساتھ جنگ میں تعاون نہ کریں اور ساتھ ہی سات صوبوں کی کانگرس وزارتیں مستعفی ہو گئیں اور فوجی بھرتی کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کر دی۔ تمام کانگرسی لیڈر بشمول کمیونسٹ لیڈروں کے گرفتار کر لئے گئے۔ 1941ء میں جب جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا تو جو ہندوستانی کمیونسٹ کانگرس کے ساتھ فوجی بھرتی کے خلاف ایجی ٹیشن کرتے ہوئے گرفتار ہوئے تھے انہوں نے جیلوں سے سرکار سے رابطہ کر کے اعلان کر دیا کہ جرمنی کا روس کے خلاف حملہ آور ہونے کی صورت میں یہ جنگ فاشٹ جرمنی کے خلاف عوامی جنگ بن گئی ہے اس لئے اس جنگ میں جمہوری طاقتوں کی مدد کرنے اور فاشٹ جرمنی کے خلاف لڑنا عوام کے لئے ضروری ہو گیا ہے۔ اس لئے ہم حکومت کی اس جنگ میں ہر قسم کی مدد کریں گے جو خدمت بھی ہمیں ملے گی ہم خوشی سے انجام دیں گے۔ تمام کمیونسٹ لیڈر ورکر رہا کر دیے گئے۔ فیض احمد فیض' ظفراللہ پوشنی اور بہت سارے لوگ فوج میں بھرتی ہو گئے۔ فیض احمد فیض کرنل کے عہدہ پر فائز ہو گئے اور انہوں نے فوجی خدمات انجام دیں بہت سارے کامریڈ جس میں میاں افتخار الدین بھی شامل تھے۔ وہ بھی ذہنی طور پر کیمونسٹ نظریات رکھتے تھے مگر وہ پنجاب کانگرس کے صدر تھے اس وجہ سے کانگرسی پروگرام سے بغاوت نہ کر سکے وہ بدستور کانگرس کی پالیسی کے ساتھ رہے جنگ کے خاتمہ پر ملک کے سیاسی حالات میں کافی تبدیلی آ چکی تھی۔ مسلم لیگ کافی طاقتور جماعت بن چکی تھی جب کانگرسی لیڈر پنڈت نہرو جیل سے رہا ہوئے تو انہوں نے بیان دیا تھا کہ جنگ کے خاتمہ پر برطانیہ تیسرے نمبر کی طاقت بن چکی ہے اس لئے اب ہندوستان آزاد ہو کر رہے گا۔ برطانیہ کا ہندوستان پر قبضہ بدستور قائم نہیں رہ سکے گا۔ ہندوستان کی آزادی کے آثار صاف نظر آنے لگے تھے۔ کانگرس میں شامل کیمونسٹوں نے فیصلہ کیا۔ متوقع تقسیم ہند کے پیش نظر کیمونسٹ پارٹی کو بھی تقسیم کر دیا جائے۔ فیصلہ ہوا کہ ہندو کیمونسٹ کانگرس میں ہی رہیں اور مسلمان کیمونسٹ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ جن میں میاں افتخار الدین' عطاءاللہ جہانیاں' جناب فیض احمد فیض' ظفراللہ پوشنی' سی آر اسلم' سجاد ظہیر اور دیگر بہت سارے کیمونسٹ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور پاکستان بن جانے کے بعد تک وہ مسلم لیگ کے ساتھ ہی وابستہ رہے۔

پریت نگر

سکھ کیمونسٹ راہنماؤں نے پیار و محبت کا اک مثالی معاشرہ قائم کیا ہوا تھا۔ ضلع امرتسر کے ایک قصبہ ویرو کے جس کے ارد گرد مسلمان دیہات تھے وہاں پر اکبر بادشاہ کے وقت کی 80 ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی ایک سرائے تھی جسکا قبضہ ایک ہندو پنڈت کے پاس تھا۔ اس سرائے کے گرد چھوٹی اینٹ کی دیوار بنی ہوئی تھی اور کھنڈر قسم کی کچھ عمارات بھی تھیں۔ کچھ کیمونسٹ لیڈروں نے اپنے وطن میں کیمونسٹ سماج بنانے کا پروگرام بنایا۔ ان لوگوں میں نمایاں مندرجہ ذیل لوگ تھے۔

پورن سنگھ جوشی' اچھر سنگھ' فوجا سکھ' بھلر ویر بھان سنگھ اور انکے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ یہ

لوگ پڑھے لکھے تعلیم یافتہ تھے۔ انہوں نے دنیا سے الگ کمیونسٹ سماج بنانے کا تجربہ کیا اکبری سرائے قابض پنڈت سے حاصل کی جو کچھ مکانیت وہاں بنی ہوئی تھی۔ اس کی مرمت کی مزید چھوٹی اینٹ کی جو بوسیدا دیوار بنی ہوئی تھی اس سے اینٹیں حاصل کیں اور گزارے کے لئے مکان بنائے گئے اور ایک چھوٹی سی بستی بن گئی جسکا نام پریت نگر رکھا گیا۔ وہاں ایک لائبریری بنائی گئی۔ جس میں بہت ساری کتابیں جمع کی گئیں۔ 80 ایکڑ زمین کو مشترکہ آباد کیا گیا۔ آمدن کا مشترکہ کھاتہ بنایا گیا اور ایک سوسائٹی قائم کی گئی۔ جس میں ایک سو سے زیادہ ممبر بنے جس میں تین مسلمان بھی شامل تھے۔ ممبران پر ایک شرط عائد تھی کہ چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں مگر ان کا مذہب انکی ذات تک ہی رہنا چاہیے۔ انکا مذہب سوسائٹی پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔ سوسائٹی کے تمام ممبران کے لئے ایک جگہ ہی کھانا تیار ہوتا تھا ایسی کوئی چیز نہیں پکائی جاتی تھی جو کسی بھی مذہب میں منع ہو اور سب ممبران مل کر کھانا کھاتے تھے۔ پریت نگر کی اس سوسائٹی کا ایک اخبار بھی شائع ہوتا تھا جسکا نام پریت لڑی تھا۔ جسکی اشاعت تین ہزار سے زائد تھی۔ اخبار کی آمدن بھی سوسائٹی کے کھاتہ میں ہی جمع ہوتی تھی یہ ایک مثالی گاؤں تھا۔ جس میں ملکیت نہ تھی تعصب نہ تھا لڑائی جھگڑا نہ تھا۔ گور بخش سنگھ اس سوسائٹی کے صدر تھے۔ یہ لوگ پڑھے لکھے تعلیم یافتہ تھے۔ کام کے وقت کام کرتے فرصت کے وقت مطالعہ کرتے۔ محبت پیار کے گیت گاتے۔ ہندوستان کے کمیونسٹوں کی ایک مثالی بستی تھی جب پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تو یہ بستی ایسی تھی جو امن چین کی نیند سو رہی تھی اسی سوسائٹی کے لوگوں نے ممبران نے نفرت بجھانے کی کوشش کی لوگوں میں امن و شانتی کا پیغام دیا۔ مسلمانوں کی زندگیاں بچانے کی کوشش کی۔ پریت نگر کے ان درویشوں نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر فسادات میں مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کی۔ یہ لوگ مسلمانوں کو گھروں سے نکال کر کیمپوں میں پہنچاتے۔ بچوں کے لئے دودھ مہیا کرنا اپنی طاقت کے مطابق مسلمانوں کی امداد کرتے۔ اس جدوجہد میں پریت نگر کے آٹھ درویش اپنی جانوں سے بھی گئے جن میں ایک فوجا سنگھ بھلر بھی تھا۔ یہ لوگ اپنے مشن پر مختلف وقتوں میں مارے گئے تھے۔ فوجا سنگھ بھلر کیمپ میں دوائیں دینے گیا تھا۔ کیمپ کے قریب سے سائیکل پر گزر رہا تھا مسلمان ملٹری کی گولی سے مارا گیا تھا۔ دیگر یہ کہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبران جہاں جہاں بھی تھے انہوں نے فرقہ وارانہ فسادات میں لوگوں کو بچانے کی کوشش کی ہمارے گوجرانوالہ میں بھی کمیونسٹوں نے جنمیں کامریڈ بشیر احمد' کامریڈ چاچا معراجدین اور دیگر کامریڈوں نے غیر مسلموں کو مسلم حملہ آوروں سے بچانے کی کوشش کی انکی زندگیاں بچائیں۔

کیمونسٹ نظریاتی طور مارکسزم کے حامی تھے وہ نجی ملکیت کے خلاف تھے۔ انکا نظریہ تھا ذرائع آمدن سرکاری ملکیت میں ہونے چاہئیں اور حکومت وقت کی ذمہ داری ہونی چاہئے کہ مملکت کے ہر شخص کے لئے رہائش کھانا آسائش کپڑا اور تمام ضروریات زندگی حکومت گے ذمہ ہونے چاہئیں۔ سابقہ سویت یونین' چین اور دیگر کیمونسٹ ممالک میں مارکسزم ہی رائج ہے وہاں پر کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہ تھی۔ مگر گورنمنٹ ہر شخص کے ضروریات زندگی کی ذمہ دار تھی اور جہاں بھی کیمونسٹ نظام حکومت

رائج ہے وہاں ہر شخص کی ضروریات کی ذمہ دار حکومت ہوتی ہے۔ 1948 میں جب چین میں کمیونسٹ انقلاب کامیاب ہو گیا۔ سارے چین میں کمیونسٹ حکومت قائم ہو گئی تو دنیا میں کمیونسٹ نظریات کے دعوے دار دو ملک بن گئے۔ دنیا کی کمیونسٹ پارٹیاں بھی تقسیم ہو گئیں کئی ملک اور پارٹیاں چین کے زیر اثر چلی گئیں کئی ملک اور پارٹیاں سوویت یونین کے زیر اثر ہی رہیں۔

یونیسنٹ پارٹی اتحاد پارٹی

یونینیسٹ پارٹی کے بانی پنجاب کے خطاب یافتہ رئیس زمیندار تھے۔ جن میں سر فضل حسین، سر محمد ظفراللہ، نواب سر مظفر علی قزلباش، سر فروز خان نون، سر چھوٹو رام، سر سندر سنگھ مجیٹھ، سر تیج بہادر سپرو، نواب شاہنوار آف ممدوٹ اور دیگر رؤسائے پنجاب تھے۔ یہ لوگ اپنے اپنے حلقوں کے اس وقت بادشاہ ہوا کرتے تھے۔ سیاسی پارٹیوں کے اثرات شہروں میں تو تھے مگر دیہاتوں میں لوگ انہیں وڈیروں کے حکم سے ہی حق رائے دہی استعمال کیا کرتے تھے۔ خصوصی طور پر مسلم رعایا تو بالکل ہی وڈیرا شاہی کے ہی زیر اثر تھی۔ چونکہ ملک میں بہت بڑی سیاسی جدوجہد کی وجہ سے عوام کو 1935ء ایکٹ کے تحت کچھ حقوق ملے۔ انکے لئے ضروری تھا کہ سیاسی پارٹیاں بنائی جاویں۔ اس وجہ سے یہ وڈیرا شاہی بھی مجبور ہوئی کہ اقتدار پر قابض رہنے کے لئے کہ سیاسی پارٹی بھی بنائی جائے خصوصاً مسلم وڈیرہ شاہی تو اس وقت مکمل طور پر دیہاتی مسلم ووٹروں پر پوری طرح مسلط تھی اور کسی قسم کا انہیں کوئی خدشہ نہیں تھا کہ کسی الیکشن میں ہار جاویں گے مگر ان وڈیروں نے 1935ء ایکٹ کے تحت یونیسٹ پارٹی قائم کی۔ یونینیسٹ مسلم ممبر مسلم لیگ کے بھی ممبر ہوا کرتے تھے مگر مسلم لیگ کو یہ اختیار دینے کو تیار نہ تھے کہ صوبائی معاملات میں مداخلت کرے 1937ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کے صرف ایک ممبر ملک برکت علی کامیاب ہوئے تھے صوبہ پنجاب کے چند مسلم ممبران کے علاوہ باقی سارے ہی یونینیسٹ پارٹی کے کامیاب ہوئے تھے۔ اس پارٹی کو کسی منشور کی ضرورت نہ تھی اس لئے کہ یہ لوگ بغیر منشور کے ہی الیکشن جیت سکتے تھے۔ مگر انہوں نے بھی اپنا ایک منشور پیش کیا جس میں کسانوں اور زمینداروں کے حقوق کا تحفظ کیا گیا تھا اور اعلان کیا گیا تھا کہ زمین کا مالیہ انکم ٹیکس کی بنیادوں پر لگایا جائے گا۔ ساہوکاروں کی لوٹ کھسوٹ سے لوگوں کو نجات دلائی جائے گی۔ زمینداروں کی آمدنی کو غلہ منڈیوں میں جو ناروا طریقوں سے لوٹا جاتا ہے اسکا تحفظ کیا جائے گا سر فضل حسین جو اس پارٹی کے بانی تھے اور ساتھ ہی وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھی تھے۔ مگر 1935ء ایکٹ سے قبل اسمبلیاں بہت زیادہ بااختیار نہ تھیں گورنر پر منحصر ہوتا تھا کہ اگر اسمبلی کوئی بل پاس بھی کر دے تو گورنر اسے مسترد کر سکتا تھا۔ مگر جو 35 ایکٹ کے بعد 1937 سے اسمبلیاں معرض وجود میں آئیں بالکل بااختیار تھیں۔

اس وقت تک یونینسٹ پارٹی کے بانی سر فضل حسین فوت ہو چکے تھے اور وزارت یونینسٹ اسمبلی پارٹی کے لیڈر جناب سر سکندر حیات نے بنائی تھی۔ انکی کابینہ میں بشمول انکے کل چھ وزیر تھے۔ وزیر اعلیٰ سردار سر سکندر حیات خان' سر خضر حیات خان ٹوانہ' میاں عبدالحیٔ آف لدھیانہ' سر سندر سنگھ مجیٹھ' سر چھوٹو رام' سر منوہر لال یہ کولیشن بڑی مقبول اور بڑی مضبوط کولیشن تھی جس پر کبھی بھی عدم اعتماد نہیں ہوا تھا۔ منشور کے مطابق جب انکم ٹیکس کی شرح پر مالیہ وصول کرنے پر غور کیا گیا تو یہ قابل عمل نہ تھا اس فائل کو بند کر دیا گیا۔ زمینداروں کی اجناس کی لوٹ کھسوٹ کو روکنے کے لیے مارکیٹ کمیٹیاں قائم کر دی گئی جو اس وقت بھی ہیں ہر مارکیٹ کمیٹی میں زمیندار' آڑھتی تولنے والوں کے نمائندے شامل ہوتے ہیں جو اجناس کی منڈیوں میں ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کی روک تھام کرتے ہیں اور ہر قسم کا کنٹرول بھی مارکیٹ پر کرتے ہیں۔ یہ مارکیٹ کمیٹیاں 1938ء میں معرض وجود میں آئی تھیں اور اس وقت بھی قائم ہیں دوسرا ساہو کاروں کے خلاف اور مقروض لوگوں کے حق میں بنایا گیا تھا کہ کوئی پراپرٹی زمین' مکان اگر کسی ساہوکار کے پاس رہن تھی تو وہ بیس سال رہن کے بعد خود بخود فق ہو جاتی تھی اس قانون کے پاس ہونے کے بعد زمینداروں' کسانوں کی جو زمینیں یا مکانات پشت ہا پشت سے ساہو کاروں کے پاس رہن پڑے ہوئے تھے وہ خود بخود فق ہو گئے تھے۔ لوگوں نے از خود جا کر ان جائیدادوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس قانون کا مقروض اور غریب لوگوں کو بہت فائدہ ہوا تھا۔

سردار سر سکندر حیات کی یونینسٹ گورنمنٹ بڑے احسن طریقہ پر چل رہی تھی لوگوں کا اس حکومت پر کافی اعتماد تھا۔ 1939ء میں جب عالمی جنگ لگ گئی ہندوستان بھی جنگ میں شامل ہو گیا تو یونینسٹ گورنمنٹ نے جنگ میں برٹش حکومت کی بہت امداد کی فوجی بھرتی میں معاونت کی۔ وزیر اعلیٰ سردار سکندر حیات نے اپنے بیٹوں کو فوج میں بھرتی کرا دیا۔ سردار شوکت حیات جو اس وقت بھی زندہ ہیں وہ فوج میں بھرتی ہو کر کیپٹن بنے۔ وہ سکندر حیات کے بیٹے تھے وہ جرمن کی قیدی ہو گئے تھے۔ سیاست کے معاملہ میں سکندر حیات کی پالیسی بھی سر فضل حق حسین والی ہی تھے وہ ملکی معاملات میں مسلم لیگ کے معاون تھے مگر پنجاب کے معاملات میں وہ خود مختار تھے وہ سمجھتے تھے کہ غیر مسلموں سے صلح سمجھوتہ کے بغیر پنجاب کا کاروبار حکومت چلانا آسان کام نہیں اس لیے کہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت بہت کم تھی۔

1943ء میں سر سکندر حیات وزیر اعلیٰ پنجاب اچانک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ انکی جگہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک سر خضر حیات خان ٹوانہ بنائے گئے اور ساتھ انکی کابینہ میں سر سکندر حیات مرحوم کے بیٹے سردار شوکت حیات کو بھی شامل کیا گیا تھا وہ اس وقت تک جرمن کی قید سے رہائی بھی پا چکے تھے اور پنجاب کابینہ میں شامل کرنے کے لیے ہی فوج سے واپس بلوایا گیا تھا۔ مگر تھوڑے عرصے بعد جب پنجاب اور پورے ہندوستان میں مسلم لیگ کا زور ہو گیا تھا تو سردار شوکت حیات خضر وزارت اور یونینسٹ پارٹی سے الگ ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اس موقع پر مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح سے سر خضر حیات ٹوانہ سے مسلم لیگ میں شمولیت کے لیے واضع موقف

اختیار کرنے کا مطالبہ کیا کہ وہ یا تو مسلم لیگ میں شامل ہو جاویں یا پھر بالکل الگ ہو جاویں۔ مگر سر خضر حیات کا موقف وہی پرانا سر فضل حسین والا اور سر سکندر حیات والا تھا کہ مرکزی ہندوستان کے معاملات میں وہ مسلم لیگ کے ساتھ ہیں اور پنجاب وزارت کا معاملہ وہ غیر مسلم اتحاد سے چلائیں گے مسلم لیگ اس وقت 1943ء میں ڈرائنگ روموں کی سیاست سے نکل کر تقسیم ہند کا فارمولا لے کر میدان عمل میں آ چکی تھی۔ یورپ میں جنگ کا خاتمہ ہونے کے اثرات بھی نمایاں نظر آنے لگ گئے۔ جرمنی کی فتوحات اب شکست میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ ہندوستان میں آزادی کا وقت قریب آتے ہوئے نظر آ رہا تھا۔ ان حالات میں مسلم لیگ کی مرکزی لیڈر شپ نے خضر حیات سے دو ٹوک فیصلے کیے جسکے یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کی راہیں الگ ہو گئیں دھیرے دھیرے یونینسٹ پارٹی کے وڈیرے مسلم لیگ میں شامل ہونا شروع ہو گئے۔ سرفیروز خان نون جو وائسرائے ہند کی کونسل کے ایگزیو کمیٹی کے ممبر تھے جنکا عہدہ مرکزی وزیر کے برابر تھا وہ یونینسٹ پارٹی چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ چوہدری سر محمد ظفر اللہ بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور مسلم لیگ کی طرف وڈیرا شاہی کی اڑان تیزی سے ہونے لگ گئی۔ 1945ء کے الیکشن میں یونینسٹ پارٹی نے مسلم لیگ کے خلاف انتخابات میں حصہ لیا۔ نام تبدیل کر کے یونینسٹ پارٹی کی بجائے زمیندار لیگ بھی رکھا مگر الیکشن میں کامیابی نہ ہوئی۔ پنجاب کی 95 مسلم نشستوں میں مسلم لیگ کو 79 نشستیں ملیں۔ جبکہ یونینسٹ پارٹی کے 14 ممبر کامیاب ہوئے۔ جن میں سر خضر حیات خان ٹوانہ' سر جمال خان لغاری' نواب سر مظفر علی خان قزلباش بھی شامل تھے۔ مجموعی طور پر پنجاب اسمبلی کی 184 نشستیں تھیں جن میں یونینسٹ پارٹی کو 14 ملیں' 1 مجلس احرار کو ملی اور 79 نشستیں مسلم لیگ کو ملیں غیر مسلم نشستیں کانگرنس 52 اکالی پارٹی 31 بقایا 7 نشستیں اقلیتی گروپوں عیسائی پارسی وغیرہ کی تھیں۔ کانگرس اکالی پارٹی اور یونیسنٹ پارٹی مل کر 97 ممبر بن جاتے تھے۔ ان تینوں پارٹیوں نے ملکر کولیشن حکومت بنا لی جس کے سربراہ اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک خضر حیات ٹوانہ بن گئے۔ اس کولیشن میں دیگر وزیروں کے علاوہ گوجرانوالہ کانگرس کے لیڈر لالہ بھیم سین سچر بھی تھے جو بعد میں ہندوستان صوبہ مدیہ پردیس کے گورنر بھی بنے تھے اور دوسرے وزیر بلدیو سنگھ بھی تھے جو بعد میں ہندوستان کے وزیر دفاع بھی بنے تھے۔ خضر کولیشن وزارت بڑے پر امن اور کامیابی کے ساتھ چلتی رہی اس دور میں پنجاب میں کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوئے اور حالات پورے کنٹرول میں رہے فروری 1947ء سے مسلم لیگ نے خضر حیات وزارت کے خلاف تحریک چلا دی۔ جس کے نتیجے میں 3/3/45 کو خضر وزارت مستعفیٰ ہو گئی اور ساتھ ہی پنجاب میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اٹھی چھ مارچ 1947ء کو راولپنڈی ڈویژن میں فساد ہوئے ہزاروں ہندو سکھ مارے گئے جب راولپنڈی کے زخمی اور لٹے ہوئے ہندو سکھ مشرقی پنجاب میں پہنچے تو وہاں فساد کی آگ بھڑک اٹھی تقسیم پنجاب اور تقسیم ہند کے بعد لاکھوں انسان لقمہ اجل بن گئے۔ یونینسٹ پارٹی نے پنجاب کی سیاست پر تقریباً" 16 سال کنٹرول کیا ہے حکمرانی کی ہے۔
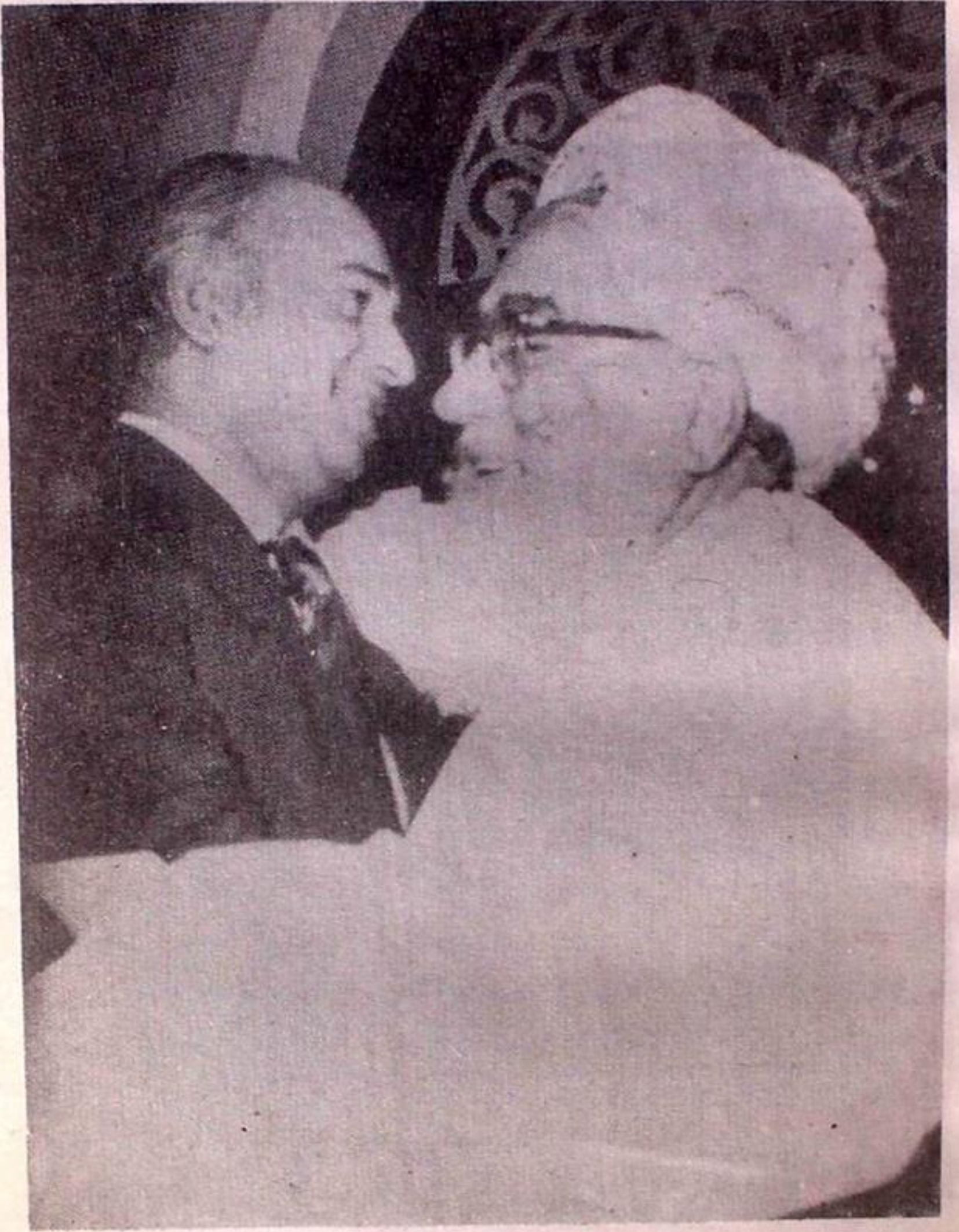
مولانا مفتی محمود اور ذوالفقار علی بھٹو

مولانا فضل الرحمٰن

کانگرس سوشلسٹ پارٹی

کانگرس سوشلسٹ پارٹی کانگرس کے اندر ہی ایک الگ تنظیم تھی اس کے مرکزی لیڈر جے پرکاش نارائین ڈاکٹر رام منوہر لوہیا تھے۔ جبکہ پنجاب میں کامریڈ مبارک ساغر' کامریڈ یوسف منشی' احمد دین اور لدھیانہ کے مولوی عبدالغنی ڈار تھے۔ منشی احمد دین خلافت تحریک کے وقت ترکی یورپ وغیرہ کا دورہ بھی کر چکے تھے باہر کی دنیا میں مختلف نظام حکومت بھی دیکھ چکے تھے کانگرس کے اندر سوشلسٹ تنظیم ایک مستقل تنظیم تھی اور نوجوانوں میں اسکا اچھا خاصا اثر تھا۔ پنجاب میں کامریڈ یوسف ' کامریڈ مبارک ساغر اور منشی احمد دین کی نوجوانوں میں کافی مقبولیت تھی۔ منشی احمد دین مقرر بھی بہت اچھے تھے امرتسر کے رہنے والے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت وہ پاکستان نہیں آئے۔ دہلی چلے گئے تھے اور ساری زندگی سوشلسٹ پارٹی کے ساتھ وابستہ رہے۔ کانگرس سوشلسٹ پارٹی والے مارکسزم کے سخت خلاف تھے اور نجی ملکیت کے خلاف بھی نہ تھے انکا نظریہ تھا کہ لوگوں کی نجی ملکیت ہوتے ہوئے فلاحی مملکت بنائی جانی چاہیے۔ وہ نظریاتی طور پر برطانیہ کی لیبر پارٹی اور فرانس کی سوشلسٹ پارٹی سے اپنا رشتہ قائم کرتے تھے۔ ہمارے گوجرانوالہ میں 1944ء میں جے پرکاش نارائین آئے تھے بہت بڑی سوشلسٹ کانفرنس شیرانوالہ باغ میں ہوئی تھی اسی کانفرنس میں ایک رنجیدہ واقع یہ ہوا کہ جے پرکاش نارائن کی آمد پر گولے چلائے گئے ایک خوبصورت نوجوان معراجدین کو گولے کی بارودی گیس کی وجہ سے ہارٹ اٹیک ہوا موقع پر ہی فوت ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے سارا پروگرام ہی سوگوار بن گیا تھا۔ سوشلسٹ نوجوان مقرر تمام جلسوں میں یہی کہا کرتے تھے کہ جس طرح یورپ کے لوگوں کا معیار زندگی ہے اسی قسم کا معیار زندگی ہندوستان کے لوگوں کا بھی ہونا چاہیے۔ ہندوستان کے لوگوں کی غربت ختم ہونی چاہئے اور آزادی کا مفہوم بھی سوشلسٹ پارٹی کے جلسوں میں یہی بتایا جاتا تھا۔ لوگوں میں آسودگی ہو گی معیار زندگی اونچا ہو گا لوگ خوش حال ہونگے۔ جس طرح مسلمانوں میں مذہبی آفاقی تصور ہے اس طرح سوشلسٹوں میں مذہبی آفاقی تصور نہیں تھا۔ بلکہ کانگرس میں بھی نہیں تھا اسی طرح 1943ء میں بھی گوجرانوالہ میں ایک کانگرس سوشلسٹ پارٹی کی تین روزہ کانفرنس ہوئی تھی جسکے ابتدائی اجلاس کو بہار کے مولوی عبدالباری نے خطاب کیا تھا۔ کانفرنس کے دوران دیہات سدھار اور غلط رسم و رواج کے خلاف ایک ڈرامہ بھی پیش کیا گیا جو لوگوں نے بہت پسند کیا تھا کانفرنس مین مشہور حریت پسند شاعر انور صابری نے نظمیں بھی پڑھی تھیں سارے ہندو سکھ مقررین نے تقاریر کیں تھیں۔ منشی احمد دین اس وقت جیل میں تھے وہ کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ کانفرنس کے اختتامی اجلاس کو میاں افتخارالدین نے خطاب کیا تھا۔ انہیں ایام میں کامریڈ یوسف ابھی جیل سے واپس آئے تھے بازار میں آٹا بہت منگا تھا۔ شیرانوالہ باغ میں جلسہ ہوا تھا جس میں کامریڈ نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر گندم نہیں ملتی تو جن گداموں میں گندم ہے وہ لوٹ لے جاویں اور لوگوں نے گندم کے کئی گودام لوٹ لیے تھے۔ پنجاب کے سوشلسٹ نوجوانوں میں منشی احمد دین اور کامریڈ یوسف کا بڑا احترام تھا۔ ایک دفعہ گوجرانوالہ سے کانگرس کی مرکزی کونسل کا ایک رکن منتخب کرنا تھا کامریڈ یوسف بھی کانگرس کی مرکزی

کونسل کی رکنیت کے امیدوار تھے نوجوانوں کی جدوجہد سے وہ بڑی اکثریت سے منتخب ہوئے تھے۔ پاکستان بن جانے کے بعد لدھیانہ کے مولوی عبدالغنی ڈار اور امرتسر کے منشی احمد دین اور دیگر بھی کئی سوشلسٹ کارکن بھارت میں ہی رہے اور کئی دلی بھی چلے گئے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے سوشلسٹوں کا ایک اجتماع گوجرانوالہ میں ہوا تھا جس میں کامریڈ مبارک علی ساغر کامریڈ یوسف کے علاوہ کئی مسلمان کامریڈ سوشلسٹ شامل ہوئے۔ پارٹی تنظیم کا اعلان بھی کیا گیا مگر پارٹی متحرک نہ ہو سکی پھر بعد میں کامریڈ یوسف گوجرانوالہ سے کراچی چلے گئے وہاں لیبر کورٹ کے جج بن گئے۔ کئی سال تک کراچی لیبر کورٹ کے جج رہے۔ اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں اور کراچی میں ہی رہتے ہیں باقی کامریڈ دھیرے دھیرے اس دار فانی سے رخصت فرما گئے۔ اب اس وقت پاکستان میں 1994ء میں منشی احمد دین اور جے پرکاش نارائین والے نظریات کی سوشلسٹ پارٹی بالکل نہیں ہے جو سوشلسٹ پارٹی اس وقت پاکستان میں ہے وہ مارکسٹ نظریات رکھنے والی پارٹی ہے۔ جسکی لیڈری لاہور کے سی آر اسلم عابد منٹو وغیرہ کرتے ہیں۔

اکالی پارٹی

اکالی پارٹی بھی پنجاب کی سیاست میں کافی متحرک رہی ہے ضروری ہے کہ مختصر لفظوں میں اس کا ذکر بھی کیا جائے۔ سکھوں کی زبان میں خداوند کریم کو سری آکال کہتے ہیں۔ سکھ جو ست سری آکال کا نعرہ لگاتے ہیں اسکا مطلب ہے سچا ہے نام اللہ کا اس حوالے سے اکالی پارٹی کا مطلب ہے اللہ والوں کی جماعت۔ بیسوی صدی کی تیسری دھائی میں اکالی پارٹی معرض وجود میں آئی تھی۔ ابتدائی دور میں یہ جماعت سیاسی نہ تھی بلکہ گردواروں کا انتظام کرنے والی جماعت تھی۔ گردواروں کے حصول کی جدوجہد اسکا اولین مقصد تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ چیدہ چیدہ گردواروں پر ہندو منتوں کا قبضہ تھا۔ پرانے واقعات میں بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہت سارے گردواروں پر منتوں کا قبضہ تھا۔ اسی کتاب میں شہید گنج کے باب میں بھی تحریر کیا گیا ہے کہ 1928ء میں جب گردوارہ شہید گنج منتوں کے قبضہ میں تھا تو انہوں نے مسلمانوں کو کہا کہ اگر وہ تین ہزار روپے دے دیں تو گوردوارہ شہید گنج کے احاطہ کے اندر جو مسجد ہے جو بعد میں مسجد شہید گنج کے نام سے موسوم ہوئی تھی وہ مسلمانوں کو دے دیتے ہیں مگر مسلمان نہیں مانے تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گوردوارہ شہید گنج بھی اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب گوردوارہ شہید گنج منتوں کے قبضہ میں تھا تو سکھ حصول گوردوارہ کی جدوجہد کرتے تھے جس کی پاداش میں انہیں قتل اسی گردوارہ میں کیا جاتا تھا۔ آل انڈیا اکالی پارٹی ماسٹر تارا سنگھ گروپ کے صدر سردار چھپال سنگھ 1982ء میں سکھ جتھہ کے ساتھ گردواروں کی یاترا کے لیے پاکستان آئے تھے۔ میں کسی شخص کی وساطت سے انہیں ملنے گیا۔ چند گھنٹے انکے پاس رہا تو وہ ننکانہ صاحب کے گردوارہ جنمستان کے ایک حصہ میں لے گئے۔ جہاں ایک مخصوص جگہ دکھاتے ہوئے انہوں نے مجھے کہا کہ جب منت گردوارے پر قابض تھے تو اس جگہ پر بہت سارے سکھوں کو شہید کیا گیا تھا۔ ان دونوں واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سکھوں کے گردواروں پر منتوں کا قبضہ 1930ء سے قبل تھا۔ اب یہ پتہ نہیں کہ

ہندو مہنتوں کا قبضہ گردواروں پر کیسے ہو گیا۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سکھ مذہب کے بانی حضرت گورو نانک سولوی صدی عیسوی میں ننکانہ ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انکے خدمت گار ہندو اور مسلمان بھی تھے۔ سکھ مذہب کی موجودہ شکل اٹھارویں صدی عیسوی میں سکھوں کے باہرویں گرو گوبند سنگھ نے دی۔ انہوں نے ہی مذہب کے پانچ قانون کچھا' کڑا' کرپان' کیس' کنگا ان پر عمل کرنے کا حکم دیا تھا یہ دور اورنگ زیب عالمگیر کا تھا۔ سکھ زیر عتاب تھے۔ سکھ چھپتے پھرتے تھے جنگلوں میں رہتے تھے= اس وقت از خود ہی سکھوں نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر حضرت گورو نانک کے کسی ہندو سیوک خاندان کے سپرد گردواروں کی دیکھ بھال کر دی ہو اور قانونی طور پر وہی ہندو مہنت گردواروں کے مستقل قابض ہو گئے ہوں یا مہاراجہ رنجیت سنگھ کے کسی حکم سے ہندوؤں کے کسی مخصوص خاندان کو گردواروں کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کیا گیا ہو اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں میں مذہبی علیحدگی کے باوجود سماجی طور پر کوئی زیادہ فرق نہیں ہے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ باپ ہندو ہے آگے سے بیٹا سکھ بن گیا کوئی حرج نہیں ایک ہی گھر میں رہ رہے ہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کے آپس میں شادی بیاہ ہوتے ہی رہتے ہیں - مرنا جینا رسم و رواج تہوار ایک ہی جیسے تھے۔ کوئی فرق نہیں تھا اور یہ امر واقع ہے کہ پرانے تاریخی گردوارے مہنتوں کی قبضہ میں ہی تھے اکالی پارٹی کا پہلا بنیادی مقصد یہ تھا کہ گردواروں کو ہندو مہنتوں سے واگزار کرایا جائے اس مقصد کے حصول کے لیے اکالی پارٹی کے سب سے پہلے جو لیڈر اور اکالی پارٹی کے پردھان سامنے آئے تھے سردار کھڑک سنگھ تھے۔ انکی قیادت میں اکالی پارٹی نے گردواروں کے حصول کے لیے جدوجہد شروع کر دی جیسا کہ میں نے پہلے بھی کئی ابواب میں ذکر کیا ہے کہ آزادی کی جدوجہد میں کانگرس کو مرکزی حیثیت حاصل ہی رہی ہے۔ 1930ء تک ہندوستان کی ہر جماعت کا رکن کانگرس کا رکن بھی ہوتا تھا اسی طرح اکالی پارٹی کے لوگ بھی وطن کی آزادی کی جدوجہد میں کانگرس کے 1936ء تک معاون رہے۔ لیکن گردواروں کی واگزاری کے لیے الگ جدوجہد اکالی پارٹی کے نام سے کرتے تھے۔ اکالی پارٹی کی بھی ذیلی تنظیم گردواروں پر بندھک کمیٹی بنائی گئی تھی۔ گردواروں پر بندھک کمیٹی سکھوں میں بہت مضبوط تنظیم تھی جو شخص گردواروں پر بندھک کمیٹی کا رکن ہو جاتا تھا اسکی حیثیت ایم این اے یا ایم پی اے سے کم نہیں ہوتی تھی۔ سکھ کانگرس کے ساتھ وابستہ تھے۔ سکھوں میں کمیونسٹ نظریات کے لوگ بھی کافی تھے۔ 1937ء کے بعد اکالی پارٹی نے سختی کے ساتھ پارٹی کی تنظیم شروع کر دی۔ اکالی پارٹی ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے بھی سامنے آ گئی اس وقت اکالی پارٹی منہتوں سے گردوارے واگزار کرا چکی تھے اور تمام گردواروں کا انتظام گردوارہ پر بندھک کمیٹی کے پاس جا چکا تھا اور اکالی پارٹی کی قیادت ماسٹر تارا سنگھ کے پاس جا چکی تھی اور ماسٹر تارا سنگھ نے اپنی سیاست کا لوہا منوا لیا ہوا تھا۔ 1940ء کی قرارداد پاکستان کے بعد مطالبہ پاکستان بھی کافی زور سے منظر عام پر آ چکا تھا ماسٹر تارا سنگھ بنیادی طور پر سکول ٹیچر تھے۔ ضلع راولپنڈی کے خالصہ ہائی سکول کلر کے ہیڈ ماسٹر تھے وہ ملازمت چھوڑ کر سیاست میں آئے تھے۔ ہمارے ایک بزرگ دوست جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں وہ فرماتے تھے کہ جب گورنمنٹ

ہائی سکول سانگھ ہل میں ٹیچر تھے تو ماسٹر تارا سنگھ سانگھ تشریف لائے۔ ایک سکھ سکول ٹیچر کے ہمراہ وہ بھی ماسٹر تارا سنگھ سے ملنے گئے۔ کافی باتیں ہوئی آخر میں میں نے پوچھا یہ جو پاکستان کا شور ہو رہا ہے اس کے متعلق کچھ ارشاد فرما دیں۔ انہوں نے جواب دیا پاکستان ضرور بن جائے گا اور تقسیم ہند میں لاکھوں لوگ قتل ہونگے۔ ماسٹر صاحب سے سوال کیا گیا کہ قتل عام کیوں ہو گا انہوں نے جواب دیا مسلم اور غیر مسلم میں اس قدر نفرت پیدا کر دی جائے گی کہ تم دونوں سکھ اور مسلمان دوست ہو اس وقت تم دونوں بھی آپس میں خون کے پیاسے ہو جاؤ گے۔ دوسری عالمگیر جنگ 1944ء میں ختم ہوئی انتخابات کا شورو غوغا شروع ہو گیا۔ اکالی پارٹی بھی پوری تیاری کے ساتھ الیکش کے کے میدان میں داخل ہو گئی۔ پنجاب کے الیکشن میں سکھ نشستوں پر اکثریت کے ساتھ اکالی امیدوار کامیاب ہوئے اور پنجاب اسمبلی میں انکی 30 نشستیں تھی۔ اکالی پارٹی کانگرس اور یونینسٹ پارٹی نے مل کر سر حضر حیات کی زیر قیادت حکومت بنائی۔ فروری 1947ء میں مسلم لیگ نے حضر وزارت کے خلاف تحریک چلائی۔ تین مارچ 1947ء کو حضر وزارت مستعفیٰ ہو گئی۔ 6-3-45 کو راولپنڈی ڈویژن میں فسادات ہو گئے۔ ہزاروں ہندو سکھ مارے گئے زخمی ہندو سکھ مشرقی پنجاب گئے تو وہاں بھی فساد ہو گئے۔ فسادات میں سکھوں کا اور مسلمانوں کا مقابلہ ہوا۔ ہند صرف قتل ہوتے رہے۔ مگر فسادات میں کم حصہ لیا۔ مغربی پنجاب میں مسلم لیگ اور مشرقی پنجاب میں اکالی پارٹی فسادات میں پیش پیش تھی سکھ سب مشرقی پنجاب چلے گئے۔ اس وقت 1994ء میں مشرقی پنجاب کی حکومت اکالی پارٹی کے پاس ہے۔

حصہ دوم

14 اگست 1947ء ہندوستان کی آزادی کا دن' ہندوستان کی تقسیم کا دن حساب کا دن ' قتل عام کا دن آزادی کے جشن کا دن' یوم آزادی کے دن سے قبل جب سالہا سال سے تحریک آزادی چل رہی تھی سیانے لوگ کہتے تھے کہ انگریز حکمران کہتے ہیں کہ ہم ہندوستان چھوڑ دیں گے۔ مگر ہندوستان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر جاویں گے۔ آزادی کے دن پنجاب پورے کا پورا جل رہا تھا۔ قتل عام ہو رہا تھا۔ ویسے تو فسادات مارچ 1947ء سے جب خضر حیات وزارت ختم ہوئی اس وقت سے شروع ہو گئے تھے مگر ان کی نوعیت اتنی تیز نہ تھی۔ مارچ کے دوسرے ہفتے میں روالپنڈی ڈویژن کے دیہاتوں میں بڑے ہی منظم طریقے سے ہندو سکھوں کا قتل عام ہوا جس میں ہزاروں ہندو سکھ قتل ہوئے تھے اور اس کے بعد مشرقی پنجاب اور امرتسر میں فسادات شروع ہو گئے مگر پھر تھم گئے۔ اکا دکا قتل کی وارداتیں ہونے لگ گئیں تھیں ویسے اگر ہم ذرا اور ماضی میں جاویں تو 1944ء سے ہی بمبئی اور کلکتہ میں قتل اور چھرا گھونپنے کی وارداتیں ہوتی تھیں اور ریڈیو پر باقاعدہ خبر کے طور پر سنایا جاتا تھا کہ بمبئی میں چھرا گھونپنے کی وارداتوں میں اتنے آدمی زخمی ہوئے اور مارے گئے ہر روز تین تین چار چار وارداتوں کی ریڈیو پر خبر سنائی جاتی تھی۔ بمبئی میں جو لوگ چھرا گھونپنے کی وارداتوں میں زخمی یا قتل ہوتے تو تاثر یہ بنتا تھا کہ مسلمان مارے گئے ہیں اور کلکتہ میں جو لوگ زخمی یا قتل ہوتے تاثر یہ ہوتا کہ ہندو مارے گئے ہیں اور ریڈیو کی ان خبروں کے ذریعے لوگوں کا ذہن بنایا جا رہا تھا کہ مستقبل قریب میں فرقہ وارانہ قتل عام ضرور ہو گا۔

16 اگست 1946ء کو مسلم لیگ نے ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا۔ مسلم لیگ کے جلسہ عام کلکتہ میں مسلم لیگ کے مقتدر لیڈر جناب سرفیروز خان نون نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ اگر ہندوؤں نے مطالبہ پاکستان منظور نہ کیا تو جو کچھ ہو گا وہ زمانہ دیکھے گا اور لوگ چنگیز اور ہلاکوں خان کی یادیں بھول جائیں گے اسی جلسے کے روز کلکتہ میں فرقہ وارانہ فساد ہوئے ہزاروں بے گناہ لوگ مارے گئے۔ کانگرس کے صدر حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کی کار پر بھی فسادی حملہ آور ہوئے اور بڑی مشکل سے ڈرائیور نے مولانا کی گاڑی اور ان کی جان بچائی اسی وقت بنگال میں مسلم لیگ کی حکومت تھی جناب سہروردی وزیر اعظم تھے یہ فساد کیونکر ہوا کس نے کرایا سیدھی سی بات ہے نفرت بڑھانے کے لئے فساد کرائے گئے تھے جس جماعت کو یا جس طاقت کو ہندو مسلم نفرت بڑھانے یا پیدا کرنے سے فائدہ ہوتا تھا اس جماعت اور طاقت نے فساد کرائے تھے اور آج تک بھی اگر کوئی ہندو مسلم فساد ہوتا ہے یہ فساد وہی جماعت یا طاقت کراتی ہے جس کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ پنجاب اور صوبہ سرحد میں فساد کرانے کی بہت کوشش کی گئی مسلم لیگی لیڈر بہار اور بنگال سے انسانی ہڈیاں لائے تھے پنجاب اور صوبہ سرحد میں مسلمانوں کو دکھا کر مشتعل کرتے تھے کہ یہ فلاں جگہ کے بے گناہ مسلمانوں جن کو ہندوؤں نے فلاں جگہ قتل کر دیا تھا یہ ان کی ہڈیاں ہیں اور مسلمانوں سے ان کے خون کا بدلہ لینے کی التجا کرتے تھے۔ جب تک پنجاب میں

خضر حیات کولیشن وزارت قائم رہی اس وقت تک تو پنجاب میں فساد نہ ہونے دیئے گئے۔ مگر خضر حیات کولیشن حکومت ختم ہوتے ہی فسادات شروع ہو گئے۔ مارچ کے دوسرے ہفتے میں راولپنڈی ڈویژن میں بھیانک فرقہ وارانہ فساد ہوئے تھے۔

نرجن داس بگا کا قتل

مگر مارچ کے آخر تک فسادات کنٹرول کر لئے گئے اکا دکا واقعات مختلف جگہوں پر قتل ہوتے رہے ہمارے گوجرانوالہ میں ریتانوالہ محلہ اور کرشن نگر کے درمیان ایک مسلمان مزدور مارا گیا تھا جس پر مسلمان مشتعل ہو گئے اس وقت گوجرانوالہ کانگرس کے صدر لالہ نرجن داس بگا مقتولین کے محلہ میں امن اور شانتی کا پیغام لے کر نہتے ہی ہاتھ جوڑتے ہوئے چلے گئے۔ یہ مسلمانوں کا محلہ تھا لوگوں نے کوٹھوں سے اینٹیں مار مار کر انہیں قتل کر دیا تھا۔ انہی ایام میں باؤنڈری کمشن بھی بن گیا تھا اور تقسیم ہند کا فارمولا مرتب کر لیا گیا تھا باؤنڈری کمشن نے دونوں ملکوں پاکستان اور ہندوستان کی حد بندی کا بھی اعلان کر دیا تھا۔ تقسیم ملک یقینی امر بن گیا تھا مشرقی اور مغربی پنجاب اور بنگال کے درمیان میں نئی حد بندی بن چکی تھی باقی صوبوں کی تو پہلے ہی حدیں بنی ہوئی تھیں جب 15 اگست کو اعلان آزادی ہوا تو پورے پنجاب میں قتل عام شروع ہو گیا جو ہندو سکھ مارچ کے فسادات میں پنڈی ڈویژن سے بچ کر مشرقی پنجاب گئے تھے انہوں نے وہاں پر مسلمانوں کے خلاف فسادات کی آگ بھڑکا دی اس طرح پورا پنجاب قتل عام کی آگ میں جلنے لگا۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام اور املاک کی لوٹ مار شروع ہو گئی اور مغربی پنجاب میں ہندو اور سکھوں کا قتل عام اور املاک کی لوٹ مار شروع کر دی گئی۔ 14 اگست سے قبل ہی افسران کے تبادلے ہو چکے تھے ہندو سکھ افسران ہندوستان منتقل ہو چکے تھے اور مشرقی پنجاب کے مسلمان افسران پاکستان میں منتقل ہو چکے تھے اب پاکستان میں تمام کے تمام افسران مسلمان تھے اور مشرقی پنجاب میں تمام کے تمام افسران ہندو سکھ تھے اور پورے پنجاب میں قتل عام اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ ہم نے گوجرانوالہ اور دیگر شہروں میں دیکھا کہ فسادات کی اور غیر مسلموں کے قتل عام کی حوصلہ افزائی مسلم لیگی لیڈروں اور افسران سرکار کر رہے تھے۔ راقم حروف نے اپنی آنکھوں سے غیر مسلموں کو قتل ہوتے دیکھا۔ بلا امتیاز رنگ نسل بچوں' بوڑھوں عورتوں جوانوں کو بڑی بے دردی سے موت کے منہ میں جاتے دیکھا۔ عورتوں کی عصمت دری اور لوٹ مار تو ایک عام سی بات تھی۔ ادھر پاکستان سے لٹتے مرتے ہندو سکھ بھارت جا رہے تھے ادھر بھارت سے لٹتے مرتے مسلمان پاکستان آ رہے تھے۔ پھر افسران قتل عام کی حوصلہ افضائی تو کرتے رہے مگر لوٹ مار پر پابندی لگا دی۔ اس لئے کہ جو لوگ بھارت سے لٹ کر آ رہے تھے ان کی آباد کاری کے لئے بھی گھریلو استعمال کی چیزوں کی ضرورت تھی اس لئے ہندو املاک حکومت کے قبضہ میں کئے

جانے لگے پاکستان میں رہنے والے ہندو سکھوں کے لئے کیمپ بنائے گئے۔ ہندو سکھ جانیں بچا کر کیمپوں میں پناہ لے رہے تھے کیمپوں کی حفاظت کے لئے سرکار کا انتظام تھا۔ وہاں پر پولیس اور دیگر فورسز حفاظت پر تعینات تھیں - گھربار چھوڑ کر لوگ کیمپوں میں پناہ لے رہے تھے راستے اور گزرگاہیں بھی محفوظ نہ تھیں راہ چلتے ہوئے غیر مسلموں کو پکڑ کر قتل کر دیا جاتا تھا ریل گاڑیوں میں مجاہدین مسلم لیگ سفر کرتے ہوئے لوگوں کو پوچھتے کوئی شکار ہے یعنی کوئی ہندو یا سکھ ہے اگر کسی شخص پر غیر مسلم ہونے کا شبہ گزرتا تو فورا اس کا طبی معائنہ کیا جاتا اگر وہ ختنہ ہوتا تو اس کو مسلمان سمجھ کر چھوڑ دیا جاتااگر ختنہ شدہ نہ ہوتا تو اسے قتل کر دیا جاتا بھارت میں بھی اسی طرح ختنہ شدہ لوگوں کو قتل کیا جاتا تھا۔ میں ریل گاڑی میں سفر کر رہا تھا گاڑی میں بہت رش تھا کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ تھی ایک بوڑھا شخص جس کی عمر تقریبا 60 سال ہو گی وہ بھی سفر کر رہا تھا اس پر مسافروں کو شک گزرا کہ یہ غیر مسلم ہے دیہاتی آدمی تھا اس سے جب پوچھا گیا کہ تم ہندو ہو تو اس نے جواب دیا کہ میں عیسائی ہوں پھر فیصلہ ہو گیا یہ ہندو ہے موت کے خوف سے عیسائی بن رہا ہے - بوڑھا دیہاتی تھا اس کی پگڑی سے اسے پھانسی دی گئی اور پھر اس کی لاش کو ریل گاڑی کے پہیوں میں پھینک دیا گیا اور قاتل ایک بے گناہ کو قتل کرکے مطمئن تھے کہ انہوں نے بہت اچھا کام کیا ہے اس طرح کے ان گنت واقعات ہوئے جنہیں ہم اگر لکھیں تو ان خونیں واقعات کے لئے کئی کتابیں بھی کم ہیں مگر ایک دو مخصوص واقعات جن کا تعلق میری ذات سے بھی ہے وہ عرض کئے دیتا ہوں اس سے آنے والی نسل بخوبی اندازہ کر سکتی ہے کہ 1947ء کے خونیں واقعات کس حد تک بھیانک تھے۔ راقم کو انہیں ایام میں منڈی بہاؤالدین کے قریب دو تین جگہ گھی خریدنے کے لئے جانا ہوا۔ ملکوال شہر نصف سے زیادہ جلا ہوا تھا اور جلی ہوئی عمارات سے دھواں ابھی نکل رہا تھا گوشت کے جلنے کی بھی سڑاہند آ رہی تھی پتہ چلا کہ بہت سارے غیر مسلم مکینوں کو بھی مکانون کے اندر ہی جلا دیا گیا تھا جن کی بو ابھی تک آ رہی تھی اسی علاقے کے ایک گاؤں میں گھی خریدنے گیا تو مسلم قاتلین کے نرغے میں آگیا مجھے بھی ہندو سمجھ لیا گیا اس لئے کہ میں نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی اس علاقے میں ہندو سکھ ہی شلوار قمیض پہنا کرتے تھے۔

مسلمان چادر کرتے پہنا کرتے تھے اور دیگر یہ کہ بیوپار بھی ہندو یا سکھ ہی کیا کرتے تھے دونوں شناختیں ہی ان کے نزدیک ہندوانہ تھیں اور مجھے دھر لیا گیا۔ اپنے تعلق علاقے کے لوگ کے ساتھ بتائے اور مولویت کا بھی جو کچھ سیکھا پڑا ہوا تھا وہ بھی بیان کیا مگر میرا چھٹکارا میرے مختون ہونے پر ہی ہوا۔ ہریہ ریلوے اسٹیشن پر بھی دھر لیا گیا کہ ہندو ہے اسے قتل کیا جائے۔ شلوار قمیض بھی پہنی ہوئی تھی جو کہ اس علاقے میں ہندوؤں کا پہناوا تھا اور بہت سارے ہجوم کو اپنی طرف اس طرح بڑھتے ہوئے دیکھ کر خوف زدہ بھی ہو گیا پیشتراس کے کہ لوگ مجھ پر حملہ آور ہوتے اسی ہجوم میں سے ایک عورت بول اٹھی کہ یہ آدمی تو ہریہ گاؤں میں مولوی الطاف کے گھر

مہمان آیا ہوا ہے تین دن سے انہی کے گھر میں ہے یہ ہندو نہیں ہے مسلمان ہے۔ تب میری جان چھوٹی اور اس سارے وقت میں میرے منہ سے کوئی بات نہیں نکلی اور مجھ پر خوف طاری ہو گیا ہوا تھا۔ پھر مولوی الطاف سے میں نے ایک چادر لی اور شلوار اتار کر سامان میں رکھ لی۔

مولانا سرفراز دھر لئے گئے

مشہور عالم دین حضرت مولانا سرفراز خان صاحب جو کہ اس وقت بھی 1994ء میں زندہ ہیں۔ دینی مدرسہ نصرت العلوم میں صدر مدرس ہیں۔ انہی ایام میں 1947ء میں وہ دینی تبلیغ کے لئے ضلع جہلم کے دیہاتوں میں گئے ہوئے تھے اس وقت وہ نوجوان تھے ریل گاڑی میں سوھاوا ضلع جہلم سے واپس آرہے تھے جس سیٹ پر وہ تشریف رکھتے تھے ان کے ساتھ والا مسافر سگریٹ نوشی کر رہا تھا حضرت نے تمباکو نوشی سے منع تو نہیں کیا مگر یہ کہا کہ بھائی سگریٹ کا دھواں دوسری طرف پھونکو سگریٹ نوش نے ساتھ والے مسافر کے کانوں میں کچھ کہا پھر بات آگے چلنا شروع ہو گئی اس زمانے میں سکھ مسافر عموماً تمباکو نوشی پر معترض ہوا کرتے تھے ایک شخص ہے کہ وہ تمباکو نوشی سے منع بھی کر رہا ہے اور اس نے داڑھی بھی رکھی ہوئی ہے بالوں کی کانٹ تراش کا ہی تھوڑا فرق ہے اس زمانے میں کئی سکھوں نے جا بچانے کے لئے کیس کٹوا دیئے تھے اور شکلیں بھی مسلمانوں کی طرح بنالی تھیں۔ اب مولانا سرفراز صاحب کا ہمراہی کو سگریٹ نوشی سے منع کرنا اور داڑھی بھی رکھے ہوئے ہونا یہ پختہ یقین کے ساتھ سمجھ لیا گیا کہ کوئی پڑھا لکھا سکھ ہے جان بچانے کے لئے اس نے کیس کٹوا دیئے ہیں کانوں کان سارے ڈبے میں یہ بات پھیل گئی کہ گاڑی کی اس ڈبے میں ایک سکھ ہے اور اسے ٹھکانے لگانا ہے۔ اب گاڑی کے مسافر حضرت مولانا سرفراز کے گرد ہو گئے کہ سکھ سردار صاحب جاسوسی کرنے کے لئے پاکستان میں رہ گئے ہو اور مولویوں کا بھیس بھی بنا لیا ہے پہلے تو مولوی صاحب حیران ہوئے پھر معاملے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے انہیں جان کا خطرہ بھی لاحق ہو گیا اور اپنی صفائی میں قرآنی آیات کی تلاوت کی نماز سنائی مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہو رہی تھی گاڑی کے تمام مسافر متفق تھے کہ یہ شخص سکھ ہے اور پڑھا لکھا سکھ ہے اور خطرناک سکھ ہے اسے جتنی جلدی ہو قتل کر دینا چاہئے۔ ابھی مولانا صاحب کو جان سے مار دینے کی تیاری ہو رہی تھی کہ گاڑی آہستہ ہو گئی فیصلہ ہوا اسٹیشن گزر جانے کے بعد سکھ کو قتل کر دیا جائے گا گاڑی دینہ سٹیشن پر کھڑی ہوئی کچھ مسافر گاڑی سے اترے کچھ نئے گاڑی پر سوار ہوئے گاڑی دینہ سٹیشن سے چل پڑی۔ گاڑی میں سوار ہونے والے نئے مسافروں کو بھی پتہ چلا کہ گاڑی کے اس ڈبہ میں ایک سکھ بھی ہے جسے قتل کیا جانا ہے انہی مسافروں میں ایک شخص مولانا سرفراز صاحب کو جانتا تھا اس نے چیختے ہوئے گاڑی کے مسافروں کو کہا کہ بھائیو جنہیں آپ سکھ سمجھ رہے ہیں یہ مشہور عالم دین مولانا سرفراز خان

صاحب ہیں تب ان کی جان چھوٹی اور موت و حیات کی کشمکش سے فارغ ہوئے۔ یہ روداد انہوں نے اس وقت کے اخبار روزنامہ آزاد میں شائع کی تھی۔ یہ سب قتل عام لوگوں میں نفرت بڑھانے کے لئے کیا گیا تھا۔ ہزاروں سالوں سے لوگ مل جل کر رہ رہے تھی ایک رنگ و نسل ایک ہی تہذیب و تمدن بود و باش ایک کلچر دکھ سکھ کے سانجی ایک دم جان کے ویری بن گئے۔ پاکستان یا تقسیم ہند کا فارمولا تو منظور ہو چکا تھا باؤنڈری کمیشن نے حد بندی بھی کر دی تھی پھر یہ قتل عام کیوں ہوا۔ اس کی صرف ایک وجہ نظر آتی ہے کہ تقسیم اور حد بندی زمین پر تو کرلی گئی تھی دلوں کی حد بندی ذرا مشکل نظر آ رہی تھی دلوں کی حد بندی قائم کرنے کے لئے یہ قتل عام کرایا گیا تھا جب مسلم پنجاب میں قتل عام شروع ہوا تو اس کے جواب میں غیر مسلم پنجاب میں قتل عام شروع ہو گیا۔ اور اس قتل عام میں لاکھوں انسان' بچے' بوڑھے' جوان' عورتیں قتل ہوئے۔ اور لاکھوں عورتیں اغواء ہوئیں تاریخ انسانی میں اس قدر بھیانک قتل عام کی مثال ہی نہیں ملتی۔

چنگیز خان اور ہلاکو خان منگولیا کے بادشاہ تھے کسی بھی ملک پر ان کا حملہ شاہی حملہ ہوتا تھا وہ فاتحین تھے وہ اگر کوئی ملک فتح کرتے تو قدیم قانون کے مطابق مفتوحہ رعیت کے ساتھ جو سلوک کیا کرتے تھے وہ بچوں بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہیں کیا کرتے تھے زندہ جلایا نہیں کرتے تھے پھر لوگوں کو پہلے سے پتہ چل جایا کرتا تھا۔ کہ چنگیز اور ہلاکو خان کی فوجیں حملہ آور ہو رہی ہیں لوگ اپنی زندگی کا بچاؤ وقت اور حالات کے مطابق کر لیا کرتے تھے۔ عورتیں بچے میدان جنگ سے دور جنگلوں میں بھاگ جایا کرتے تھے۔ چھپ جایا کرتے تھے مگر یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ ہندو سکھ مسلم ساتھ ساتھ صدیوں سے رہ رہے ہیں ایسا نفرت کا زہر بھر دیا گیا کہ انہوں نے ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ حملہ آوروں کی تو شناخت ہوتی تھی لوگ بچ باؤ کر لیا کرتے تھے مگر اس قتل عام کا کوئی علاج بھی نہیں تھا کیا پتہ کون دشمن ہے کون سجن ہے ایک انجانے شخص نے ہی دوسرے انجانے آدمی کو واسطے ثواب کے قتل کر دیا اور ساتھ مطمئن بھی ہو گیا کہ میں نے بہت نیکی کا کام کیا ہے۔ بہت ہی اوپر کی سطح پر ذہین لوگوں نے ایسی سازش تیار کی کہ لاکھوں معصوم اور بے گناہ لوگوں کو قتل کروا کر بھی قوم کے ہیرو بن گئے اور ثواب کے مستحق بھی بن گئے۔

جس وقت پاکستان کی تحریک چل رہی تھی لوگوں میں تقسیم ہند کی باتیں ہوتی تھیں تو مسلم لیگ کے علاوہ جو بھی سیاسی کارکن تھے وہ لوگوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان تقسیم ہو جائے گا اور پاکستان ایک الگ ملک بن جائے گا دونوں ملکوں کے لوگ ایک دوسرے ملک میں ویزے اور پاسپورٹ کے ذریعے جایا کریں گے۔ پاکستان کے حامی لوگ یہ نہیں مانا کرتے تھے ان کے ذہن میں پاکستان کا تصور کوئی افسانوی ملک یا ہندوستان میں رہتے ہوئے مسلمانوں کے لئے زیادہ آسانیاں حاصل کرنا تھیں بہرحال پاکستان کا مطلب کسی کو واضح سمجھ

نہیں آتا تھا۔ اور اس کے نتیجہ میں ہندوستان تقسیم ہوا - دس لاک انسان لقمہ اجل بنے دو کروڑ لوگ بے گھر ہوئے اور تبادلہ آبادی ہوا - لاکھوں عورتوں کی عصمتیں لٹیں اور برصغیر میں ہی ایک نیا ملک معرض وجود میں آگیا جس کا نام پاکستان ہے۔ زندہ تابندہ ہے۔

کشمیر

پاکستان بن جانے کے تقریبا دو ماہ بعد مہاراجہ کشمیر نے بھارت میں شمولیت کا اعلان کر دیا تو پاکستان کے لوگوں کو کچھ تشویش لاحق ہوئی۔ ریاستوں کا مسئلہ یوں حل کیا گیا تھا کہ والیان ریاس جس طرف شامل ہونا چاہیں ہو جاویں گے انہیں مکمل اختیار ہو گا اس اختیار کے تحت مہاراجہ کشمیر نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔ تاریخ کے طالب علم کو مسئلہ کشمیر سمجھانے کے لئے تفصیل کے ساتھ اسپر روشنی ڈالنا مناسب ہوگا۔

ہندوستان کی کل آبادی کا تیسرا حصہ ریاستوں پر مشتمل تھا جن کی کل تعداد 500 سے زائد تھی جن میں بڑی ریاستیں بہاولپور ، کشمیر، پٹیالہ، حیدر آباد اور دیگر بھی چند ایک تھیں باقی ہندوستان کے انگریزی علاقوں میں 1945ء کے الیکشن ہو چکے جن میں کانگرس اور مسلم لیگ واضح اکثریت سے کامیاب ہوگئیں۔ اور تقسیم ہند کا فارمولہ بھی منظور ہو گیا تو کانگرس نے یہ تجویز پیش کی کہ الیکشن کے ذریعہ ریاستوں کا فیصلہ بھی کر لیا جانا چاہئے۔ جس کو مسلم لیگ نے نہیں مانا اور قائد اعظم نے فرمایا کہ ریاستوں کا فیصلہ والیان ریاست ہی کریں گے اور مسلم لیگ بھی اسے منظور کرے گی مسلم لیگ کے دوسرے درجے کے لیڈروں اور ورکروں نے قائد اعظم کے ریاستوں کی شمولیت کے اصول پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے قائد سے سوال کیا کشمیر کا کیا ہو گا جس کا جواب قائد اعظم نے یہ دیا کہ کشمیر میری جیب میں ہے مگر ہم اس فیصلے سے حیدر آباد حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ چھوٹے درجے کے لیڈر اور ورکر مطمئن ہو گئے قائد اعظم کی بصیرت پر خوش بھی ہوئے کہ حیدر آباد اور کشمیر دونوں ہی پاکستان کو مل جاویں گے دیگر یہ کہ پچانوے فیصد مسلم عوام کو ریاست حیدر آباد و دکن کا محلے وقوع بھی نہیں پتہ تھا یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ اکثریت عوام کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں بس ایک ولولہ تھا ایک جذبہ تھا کہ پاکستان میں کشمیر کی شمولیت تو ہے حیدر آباد بھی مل جائے گا۔ قائد اعظم انتہائی پائے کے وکیل تھے اور ریاست کشمیر کے مہاراج کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات بھی تھے جب بھی کشمیر جاتے۔ مہاراجہ کشمیر کے ہی مہمان ہوا کرتے تھے۔ شیخ عبداللہ صاحب سابق وزیر اعظم کشمیر نے اپنی ایک کتاب میں قائد اعظم کا بڑے ہی اچھے انداز میں ذکر کیا وہ فرماتے ہیں کہ بخشی غلا محمد کاکوئی مقدمہ تھا اور قائد اعظم کو وکیل کیا گیا اس زمانے میں ایک ہزار روپیہ یومیہ فیس مقرر ہوئی ریاست کے ہائی کورٹ میں مقدمہ تھا۔ قائد اعظم کی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے مقدمہ

جیت لیا گیا۔ قائد اعظم وکیل بھی پائے کے تھے اور مہاراجہ کشمیر کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات بھی تھے اسی وجہ سے کشمیر کو جیب میں سمجھ لینا کوئی غلط بھی نہ تھا۔ مگر مسلم لیگ کے لیڈران نے لوگوں میں یہ تاثر عام کیا ہوا تھا کہ کشمیر تو ہماری جیب میں ہے ہی ہم نے تو حیدر آباد لینا ہے۔ اب عام لوگوں کو یہ تو پتہ تھا کہ کشمیر پنجاب کے ساتھ ہے اور اس میں آباد 80 فیصد مسلمان ہیں مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ حیدر آباد دکن کہاں ہے اور اس میں آباد کس مذہب کے لوگ ہیں مگر قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح ماہر قانون بابائے قوم تھے ان کو پتہ تھا کہ حیدر آباد جنوبی ہند میں واقع ہے اور حیدر آباد دکن کے ساتھ مشرقی پاکستان یا مغربی پاکستان کی کوئی سرحد نہیں لگتی اور نہ ہی دکن حیدر آباد کسی ساحلی سمندر پر واقع ہے اور نہ ہی مسلمان اکثریت کے ساتھ وہاں رہتے ہیں بلکہ 96 فیصد ہندو آبادی کی یہ ریاست ہے صرف یہاں کا نواب مسلمان ہے۔

حیدر آباد دکن کا حصول پاکستان کے لئے ناممکن تھا اس ناممکن کے لئے کشمیر کی ممکنہ ریاست کے حصول کو یہ کہہ کر ناممکن بنا دیا کہ ریاستوں کی شمولیت کا فیصلہ والیان ریاست ہی کریں گے اس لئے کہ مسلم لیگ کی سیاست کے پس پردہ خفیہ ہاتھ کام کر رہا تھا جس نے اشارہ دیا کہ ریاستوں کی شمولیت کا فیصلہ والیان ریاست پر چھوڑ دینا چاہئے۔ قائد اعظم نے اسی اشارے پر ریاستوں کے بارے میں مسلم لیگ کا فیصلہ سنا دیا۔ تقسیم ہند کا سیاسی فیصلہ یہ تھا کہ جن اضلاع میں مسلم اکثریت ہے وہ اضلاع پاکستان میں شامل ہوں گے اور غیر مسلم اکثریت والے اضلاع بھارت میں شامل ہوں گے مگر باؤنڈری کمشن کے اعلان میں ضلع گرداسپور سوائے تحصیل شکر گڑھ کے سارا ضلع ہی بھارت کو دے دیا گیا اس کے پس پردہ بھی خفیہ ہاتھ کام کر رہا تھا۔ جس نے کشمیر کی بھارت میں شمولیت کو بہت ہی آسان بنا دیا۔ ہماری مسلم لیگی دوست کہتے ہیں کہ اگر باؤنڈری کمشن فریب نہ کرتا تو کشمیر واقعی قائد اعظم کی جیب میں تھا۔ ان کی یہ صرف خام خیالی ہے خفیہ ہاتھ جو کام کر رہا تھا اس نے اپنی پلاننگ کے مطابق ہی کام کرنا تھا۔ دیگر گزارش یہ ہے کہ اگر ضلع گرداسپور بھارت کو نہ بھی دیا جاتا تب بھی بھارت کے مشرقی پہاڑی اضلاع کی سرحدات بھی کشمیر کے ساتھ لگتی تھیں۔ بھارت کشمیر میں داخل ہونے کے لئے وہاں سے بھی راستے بنا سکتا تھا۔ اور اس وقت بھی کٹھوعہ پل ضلع گرداسپور کے علاوہ بھارت کے مشرقی پہاڑی اضلاع سے بھی کشمیر کو راستے جاتے ہیں اور ان پر عام سفر ہوتا ہے۔ 1988ء میں میاں افتخار الدین سردار شوکت حیات خان اور دیگر ترقی پسند لیڈروں نے آزاد پاکستان پارٹی کی بنیاد رکھی تو گوجرانوالہ میں انہوں نے ایک جلسہ کیا راقم اس وقت سیاسی ورکر تھا میں نے چند ساتھیوں کے ساتھ میاں افتخار الدین اور دیگر راہنماؤں سے تبادلہ خیال ہوا اور دوران گفتگو انہوں نے فرمایا کہ ستمبر 1947ء میں جب مہاراجہ کشمیر نے ابھی تک کسی بھی ملک کے ساتھ شمولیت کا اعلان نہیں کیا تھا تو نیشنل کانفرنس کا ایک وفد بخشی غلام محمد اور جی ایم صادق پر مشتمل تھا وہ لاہور آیا میرے ساتھ انہوں نے آمد کی غرض غائیت بیان کی۔ میں انہیں ساتھ لے کر وزیر اعلیٰ پنجاب

نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ کے پاس گیا۔ انہوں نے نواب ممدوٹ صاحب کے آگے کشمیر کی پاکستان میں شمولیت کا پروگرام پیش کیا اور اپنے سیاسی مستقبل کے بارے وضاحت طلب کی۔ نواب صاحب نے قائد اعظم سے کراچی ٹیلیفون پر بات چیت کی اور کشمیری لیڈروں کی آمد کا ذکر کیا کشمیر کی پاکستان میں شمولیت اور اپنے سیاسی مستقبل کے تحفظ کی بات کی۔ قائد اعظم نے نواب ممدوٹ کو فرمایا کہ کشمیری وفد کو جواب دے دو ہم مہاراجہ کشمیر سے خود بات چیت کر کے اسے پاکستان میں شمولیت پر آمادہ کرلیں گے۔

مہاراجہ کشمیر نے بالآخر بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا اس اعلان کے بعد پاکستان نے قبائلی لشکر کشمیر میں داخل کر دیئے۔ انہوں نے لوٹ مار بھی شروع کر دی اور کشمیر کے کافی حصہ پر قبضہ بھی کیا مگر جب بھارتی فوجیں کشمیر میں داخل ہو گئیں تو قبضہ رک گیا۔ قبائلی پٹھان لوٹ مار میں بہت ہوشیار تھے کشمیری عوام ان سے عاجز آ گئے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اگر اس وقت ہندو راجہ نے مسلم اکثریت والی ریاست کا الحاق بھارت سے کر دیا تو فوج کشی کر کے ریاست کشمیر پر قبضہ کر لیا جاتا مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ شائد اس لئے کہ اسوقت کمانڈر انچیف انگریز تھا اور دیگر جرنیل بھی انگریز تھے اور کسی خفیہ ہاتھ نے انہیں کشمیر پر حملہ آور ہونے سے قبضہ کر لینے سے روک دیا ہو مگر بھارت کو شائد کسی خفیہ ہاتھ نے ریاست جوناگڑھ پر قبضہ کرنے سے نہیں روکا اس لئے کہ جوناگڑھ میں ہندو اکثریت سے تھے اور نواب مسلمان تھا اور اس نے پاکستان میں شمولیت کا اعلان کر دیا تھا مگر بھارتی فوج نے فوری طور پر آگے بڑھ کر ریاست جوناگڑھ پر قبضہ کر لیا تھا ریاست جوناگڑھ ساحل سمندر پر واقع تھی اور کراچی کے بہت قریب تھی اور پاکستان اس کا تحفظ کر سکتا تھا حملہ آوروں کو روک سکتا تھا مگر ایسا نہ کر سکا۔ شائد کسی خفیہ ہاتھ نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ قارئیں خفیہ ہاتھ کے بار بار تذکرے پر خفا تو ہوں گے مگر یہ مجبوری ہے اس لئے کہ متحد ہندوستان کے وقت بھی مسلم لیگ پس پردہ ہدایت پر چل رہی تھی پھر پاکستان کی 46 سال کی سیاسی زندگی میں خفیہ ہاتھ بدستور متحرک رہا اور تمام ہوش مند لوگ خفیہ ہاتھ کی طاقت کو تسلیم کرتے ہیں ہمارے ملک میں وہی سیاسی پارٹی یا سیاسی شخصیت سیاست میں کامیاب ہوتی ہے جو خفیہ ہاتھ تک رسائی رکھتی ہے اور خفیہ ہاتھ تک پہنچنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے اس کتاب کی دوسری جلد میں خفیہ ہاتھ کا تذکرہ ہر موقع پر آئے گا کیونکہ اس کے بغیر تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔

ہم کشمیر کا تذکرہ کر رہے تھے پاکستان اس جنگ میں خفیہ طور پر شامل تھا جبکہ بھارت علانیہ کشمیر میں اپنی فوجیں لے کر آ گیا تھا۔ اور پاکستان یہ جنگ گوریلا طریقہ پر لڑ رہا تھا بالآخر دو سال کی جنگ کے بعد جنگی بندی ہو گئی اور ایک کنٹرول لائن قائم کر دی گئی جو آج تک قائم ہے۔ 1948ء میں بھی حیدر آباد جس کے تصور میں ہم نے کشمیر کو متنازعہ بنا دیا تھا اس پر بھارت نے ایک چھوٹا سا حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور وہ بھارت کا حصہ بن گیا۔ پھر پکائی جتن سے چرخا دیا جلا'

آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا۔ اور آج 46 سال بعد بھی جبکہ کشمیر کے مسئلہ پر پاکستان اور بھارت میں دو جنگیں ہو چکی ہیں مگر کشمیر کا جھگڑا جوں کا توں بنائے فساد بنا ہوا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خفیہ ہاتھ پاکستان کے خلاف فیصلہ کیوں کرتا تھا۔ اس نے بھارت کا کوئی حصہ یا ہندو اکثریت والا کوئی علاقہ پاکستان کو کیوں نہ دے دیا اس کے پس پردہ یہ فلسفہ کار فرما تھا کہ وہ طاقتیں جو دنیا پر حکمران تھیں خفیہ ہدایات پہلے لندن سے آتی تھیں اور پھر واشنگٹن سے آنے لگ گئیں تقسیم ہند کی بڑی طاقتوں کے نزدیک کئی مقاصد تھے جن میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ لڑاؤ اور حکومت کرو۔ انہوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہی ہندوستان کو تقسیم کر دیا تھا وہ سمجھتے تھے کہ اگر ان دونوں ممالک کے درمیان کوئی وجہ تنازعہ نہ ہوگی تو یہ ملک پھر اکٹھے ہو جاویں گے اور ہمارے مفادات کو نقصان ہوگا اس وجہ سے کشمیر کو وجہ تنازعہ بنایا گیا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی ایسا تھا تو کوئی ہندو اکثریت والا علاقہ کیوں وجہ تنازعہ نہیں بنایا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کانگرس نے بڑی جدوجہد اور قربانیوں سے آزادی حاصل کی تھی وہ خفیہ ہاتھ کے آلہ کار بننے والے نہیں تھے اور انہوں نے تحریک آزادی ہند میں یہ ثابت کر دیا تھا۔ جبکہ مسلم لیگ کا بنیادی فلسفہ ہی انگریز سرکار کی تابعداری سے ہی حصول اقتدار تھا۔ دیگر یہ کہ اگر کوئی ہندو اکثریت والا علاقہ پاکستان میں شامل ہو ہی جاتا تو ہندو کانگرس فوری طور پر علاقے کو واپس لے لیتی جیسے جونا گڑھ اور مانا ودر جو کہ ہندو اکثریت کی ریاستیں تھیں۔ اور ان کے نواب مسلمان تھے ان مسلمان نوابوں نے پاکستان میں شمولیت کا اعلان کیا تھا مگر فوری طور پر بھارت نے آگے بڑھ کر جونا گڑھ اور مانا ودھر پر قبضہ کر لیا تھا اور ان ریاستوں کے نواب ہجرت کر کے پاکستان آ گئے تھے۔ جبکہ پاکستان کے حکمران خفیہ ہدایت پر چل رہے تھے اور فوج بھی انگریز جرنیلی کے ماتحت تھی اور وہ کشمیر پر اس وقت ہدایت کے مطابق فوج کشی بھی نہیں کر سکے تھے اس طرح کشمیر ہندوستان کو چلا گیا اور وجہ تنازعہ بن گیا۔

پاکستان کے سیاسی حالات

جب ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان بن گیا - 14 اگست کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس کراچی میں ہوا اس اجلاس میں ہندوستان کے وسرائے لارڈ مونٹ بیٹن نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو اختیارات حکومت منتقل کئے اور اعلان کیا گیا کہ 15 اگست کی رات 12 بجے ہندوستان آزاد کر دیا گیا ہے اور اس اعلان کے ساتھ ہی 15 اگست 12 بجے آزاد ہندوستان اور آزاد پاکستان کی حکومتیں معرض وجود میں آگئیں پاکستان کے پہلے گورنر جنرل مسلم لیگ کے اس وقت کے صدر قائد اعظم محمد علی جناح کو بنا دیا گیا اور آزاد پاکستان کی پہلی کابینہ نے جناب لیاقت علی خان صاحب کی زیر قیادت حلف اٹھایا۔ پاکستان کی پہلی کابینہ میں ایک ہندو وزیر مسٹر

جوگندر ناتھ منڈل اور قادیانی وزیر سر محمد ظفراللہ بھی شامل تھے۔ حکومت کے ایوانوں میں آزادی کے جشن منائے گئے اور چراغاں بھی کیا گیا۔ مارچ 1947ء میں جب خضر حیات وزارت پنجاب سے مستعفی ہو گئی تو پھر اس کے بعد پنجاب میں کوئی وزارت نہیں بنی تھی گورنر راج ہی نافذ تھا۔ پاکستان معرض وجود میں آ جانے کے بعد پنجاب میں گورنر راج ختم کر دیا گیا اور مسلم لیگ کے پہلی وزارت نواز افتخار حسین خان ممدوٹ کی زیر قیادت بنی جس میں اور بہت سارے وزیروں کی شمولیت کے ساتھ میاں افتخار الدین میاں ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات بھی شامل تھے۔ صوبہ سرحد میں متحدہ ہندوستان کے وقت 15 اگست 1947ء خدائی خدمت گار تحریک کے اشتراک سے کانگرس کی زیر قیادت ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت تھی مگر 15 اگست کو ہی ڈاکٹر خان وزارت برطرف کر کے مسلم لیگ کی وزارت خان عبدالقیوم خان کی زیر قیادت بنا دی گئی متحدہ ہندوستان کے وقت بنگال میں مسلم لیگ کی وزارت تھی جس کی قیادت جناب سہروردی کر رہے تھے مگر پاکستان بن جانے اور بنگال تقسیم ہونے کے بعد مشرقی بنگال کی وزارت تو مسلم لیگ کی ہی بنی مگر وزیر اعظم سر ناظم الدین بنائے گئے۔

بلوچستان کو اس وقت تک آئینی اصلاحیت نہیں ملی تھیں اس لئے وہاں نہ کوئی اسمبلی بنی تھی اور نہ کوئی وزارت ہی تشکیل ہوئی تھی۔ سندھ میں 14 اگست 1947ء سے قبل اور بعد میں بھی مسلم لیگ وزارت سر غلام حسین ہدایت اللہ کے زیر قیادت ہی کام کرتی رہی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ان انتظامی ڈھانچوں کے تحت کاروبار حکومت چل رہا تھا اور یہ دور افراتفری کا دور تھا لوگ غیر مطمئن تھے تبادلہ آبادی بڑے زوروں پر ہو رہا تھا دیگر سیاسی ڈھانچے شکست و ریخت کا شکار تھے۔ مسلم لیگ کے علاوہ متحدہ ہندوستان کے وقت کی جماعتیں بے اثر ہو گئیں پنجاب میں مجلس احرار منظم جماعت تھی اس کا اثر و رسوخ پنجاب کے کافی علاقہ میں تھا مگر وہ 1945ء کے الیکشن میں شکست کھا چکی تھی دیگر یہ کہ متحدہ ہندوستان کے وقت کی جماعتوں کا منشور الگ تھا نئے حالات میں انہیں منشور بھی تبدیل کرنا پڑتا تھا پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ نہیں چاہتی تھی کہ متحدہ ہندوستان کے وقت کی شکست خوردہ جماعتیں پھر ان کے مقابل پاکستان میں سیاست کریں۔ اس لئے ان جماعتوں کے لیڈران اور ورکران کو لعن طعن کیا جاتا کردار کشی کی جاتی پنجاب میں مجلس احرار نے لاہور میں ایک بہت بڑی کانفرنس کی جس میں اسے اعلان کرنا پڑا کہ مجلس احرار کو سیاسی جماعت کی حیثیت سے ختم کیا جاتا ہے۔ راقم بھی لاہور کے اس جلسہ میں موجود تھا۔ حضرت امیر شریعت سید عطاءاللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے واشگاف اعلان کیا کہ مجلس احرار کو بحیثیت سیاسی جماعت کے ختم کیا جاتا ہے احرار کے جس کارکن یا لیڈر نے سیاست کرنی ہے وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائے مجلس احرار آج سے صرف عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ کرے گی اور اس کے لئے مبلغ پیدا کرے گی اور تبلیغ کرے گی۔

احرار کے علاوہ پنجاب میں خاکسار تحریک بھی کافی اثر و رسوخ رکھتی تھی۔ مگر ان کا کوئی

سیاسی مشن اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ خاکسار رضا کار منظم ہو کر بیلچہ کندھوں پر رکھ کر چپ راست کی آواز پر بازاروں میں پریڈ کریں اور بازوؤں پر اخوت کا بیج باندھ لیں اور اطاعت امیر کا نظریہ لوگوں میں رائج کریں کسی ایک شخص کو جیش کا امیر بنا کر پریڈ کریں اور اس کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کریں۔ ویسے تحریک میں ان کے 24 نکات اور 14 اصول تو تھے مگر یہ نکات اور اصول لوگوں کی فہم سے بالاتر تھے۔ عوام کو بہت جلد اپنے ساتھ ملانے کی ان کے پاس بھی کوئی تدبیر نہ تھی اور ساتھ ہی یہ کہ پاکستان بن جانے کے بعد مسلم لیگی حکمرانوں کا مخالفین کی کردار کشی کا عمل اس قدر زور دار تھا کہ کوئی بھی غیر مسلم لیگی جماعت اس کے سامنے ٹک نہیں سکتی تھی۔

پنجاب میں یونینسٹ پارٹی بھی تھی جس کے لیڈر سر حضر حیات ٹوانہ تھے۔ حقیقت میں یہ جماعت عوامی نہ تھی بلکہ کولیشن جماعت جو پنجاب پر حکمران تھی اس کا نام یونینسٹ پارٹی تھا اس جماعت کے جو مسلم ممبران تھے ان میں سے اکثریت مسلم لیگ کے ممبر ہوا کرتے تھے پنجاب اسمبلی کے ممبران 1942ء سے قبل ایک ہی وقت میں مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے ممبر بن سکتے تھے چنانچہ سر فضل حسین سر سکندر حیات سر شاہنواز نواب اللہ یار دولتانہ اور دیگر لیڈران مسلم لیگ کے ساتھ ساتھ یونینسٹ پارٹی کے بھی ممبر تھے سر حضر حیات خان ٹوانہ قائد اعظم محمد علی جناح کی ذاتی اختلافات کی بناء پر سر حضر حیات مسلم لیگ سے الگ ہو گئے اور انہوں نے 1945ء کا الیکشن مسلم لیگ کے خلاف لڑا تھا اور ان کے اور ساتھی ممبران اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی وجہ سے پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے اور یہی یونینسٹ پارٹی کے 14 ممبران نے اکالی پارٹی اور کانگرس کے ساتھ مل کر 1945ء میں پنجاب حکومت بنائی تھی جو مارچ 1945ء تک قائم رہی مگر یونینسٹ پارٹی بحیثیت پارٹی کے عوام میں کوئی اثر رسوخ نہیں تھا۔ اس وجہ سے پاکستان بن جانے کے بعد یونینسٹ پارٹی کا عوام میں نام و نشان ختم ہو گیا اور یونینسٹ پارٹی کے تمام ممبران اسمبلی اور دیگر لوگ ماسوائے سر حضر حیات ٹوانہ کے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

عظیم انسان

پاکستان کے سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند کے وقت کے کچھ حالات لکھنا بھی بہت ضروری ہیں۔ 15 اگست 1947ء کو جب پاکستان کا اعلان ہو گیا تو کلکتہ میں فسادات کا بھنڈارہ کھل گیا اس سے قبل نواکھالی میں فسادات ہو چکے تھے مہاتما گاندھی نواکھالی جانے کے لئے جب کلکتہ پہنچے تو مسلمانوں نے انہیں روک لیا اور عرض کیا کہ اس وقت کلکتہ میں فسادات کا خطرہ ہے اور مسلمانوں کی زندگیاں خطرہ میں ہیں گاندھی جی نے فرمایا میں تو نواکھالی کے فسادات کو روکنے کے لئے آیا ہوں اگر آپ لوگ نواکھالی کے فسادات روکنے کا ذمہ لے لیں تو میں یہیں رک جاتا ہوں اس پر مسلمانوں نے کہا کہ ہم نواکھالی کے فسادات کو روکنے کی ذمہ داری لیتے

ہیں آپ کلکتہ میں رک جاویں تاکہ یہاں بے گناہ موت کے گھاٹ نہ اتارے جاویں - متحدہ بنگال کے وزیر اعظم جناب سہروردی کراچی گئے ہوئے تھے کہ دیکھیں پاکستان کی حکومت میں ان کے لئے کوئی جگہ ہے کہ نہیں جب وہ واپس اگست کی مہینہ میں کلکتہ واپس پہنچے تو ہر طرف خوف و ہراس تھا۔ مسلمان چھپتے پھر رہے تھے ہندو دندنا رہے تھے اور انہیں پتہ چل چکا تھا کہ گاندھی جی بھی کلکتہ میں ہیں وہ ان کے پاس گئے انہوں نے گاندھی جی سے اپیل کی کہ وہ کلکتہ کو فساد سے بچائیں۔ گاندھی جی نے سہروردی صاحب سے کہا کہ میں اس شرط پر کلکتہ کے فسادات کو روکنے کا بیڑا اٹھاتا ہوں کہ آپ بھی میرا ساتھ دیں گے۔ سہروردی صاحب مان گئے فیصلہ ہوا کہ بغیر پولیس کے بغیر فوج کے بغیر کسی ہتھیار کے خالی ہاتھ فساد زدہ علاقوں میں جاویں گے اور قتل عام کو روکنے کی کوشش کریں گے پروگرام کے مطابق ایک مسلمان مزدوروں کی بستی کو چنا گیا اور اس بستی میں جانے کا وقت مقرر کر لیا گیا مقررہ وقت پر سہروردی صاحب نہ آئے تو گاندھی جی خود ہی اس بستی کی طرف اپنے ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ اس بستی میں ایک پختہ مکان حیدری منزل جس کے مکین شاید پاکستان چلے گئے تھے وہ خالی تھا اس کی صفائی کرائی گئی اور گاندھی جی اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں مقیم ہو گئے بہت سارے بنگالی ہندوؤں نے اس بستی میں گاندھی جی کے داخل ہوتے وقت ان کا والہانہ استقبال بھی کیا تھا ان میں بہت لوگ ایسے بھی تھے جو گاندھی جی کی صلح کن پالیسی کے خلاف تھے بہت سارے عقیدت مند بھی تھے اور گاندھی جی پر اعتراض کیا گیا کہ آپ نواکھائی نہیں جاتے جہاں ہندوؤں کا قتل عام ہو رہا ہے آپ مسلمانوں کو بچانے کے لئے کلکتہ میں بیٹھ گئے - مگر گاندھی جی اپنے پروگرام کو جاری رکھے ہوئے تھے اتنی دیر میں پتہ چلا کہ سہروردی صاحب بھی باہر آگئے ہیں اور انہیں ہندوؤں نے باہر ہی روک لیا ہے گاندھی جی نے فوراً اپنا ایلچی بھیج کر سہروردی صاحب کو اندر بلا لیا۔ باہر بدستور ہندو شور مچا رہے تھے کہ ہزاروں ہندوؤں کے قاتل بنگال کے سابق وزیر اعظم سہروردی کو باہر نکالیں۔ گاندھی جی کے کہنے پر سہروردی گاندھی جی کے ساتھ ہی باہر لوگوں میں آئے لوگوں نے ان سے سوال کیا کہ گزشتہ سال آپ کی وزارت عظمیٰ کے وقت جو ہندوؤں کا قتل عام ہوا - ان کا ذمہ دار کون ہے سہروردی صاحب نے جواب دیا کہ ہم سب اس قتل عام کے ذمہ دار ہیں گاندھی جی سوال جواب کے وقت سہروردی کے ساتھ کھڑے رہے اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے - آخر گاندھی جی ہندو جنتا کے جوش و خروش کو ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور گاندھی جی اور جناب سہروردی کی کوشش اور ہمت سے ایک ہفتہ کے اندر ہی کلکتہ شہر میں پانچ ہزار ہندو مسلم مشترکہ جلوس نکالا گیا جس کا نعرہ تھا ہندو مسلم بھائی بھائی' گاندھی جی کی ہمت اور کوشش سے کلکتہ میں فسادات کا خطرہ ٹل گیا مگر گاندھی جی اس وقت تک کلکتہ میں رہے جب تک بالکل امن قائم ہو گیا اور کلکتہ کی زندگی معمول پر آ گئی۔

ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے گاندھی جی کو ہندوؤں کی کی طرف سے خط مل رہے تھے جس

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

میں کہا جا رہا تھا کہ پاکستان میں غیر مسلموں کا قتل عام کیا جا رہا ہے۔ آپ وہاں جا کر امن قائم کریں - ہندوؤں کی جانیں بچائیں ان ہزاروں خطوط میں ایک خط گاندھی جی کے بیٹے کا بھی تھا جس میں لکھا تھا کہ باپو جی آپ کلکتہ میں مسلمانوں کی زندگیاں بچانے کی بجائے نواکھائی میں جائیں مغربی پنجاب میں جاویں جہاں ہندوؤں کا قتل عام ہو رہا ہے مگر آپ ہیں کہ قاتل مسلمانوں کو بچانے کے لئے کلکتہ میں مرن برت رکھ کر بیٹھ گئے ہیں۔ اپنے بیٹے کا خط گاندھی جی نے سنبھال کر الگ رکھ لیا اور خاص خاص لوگوں کو وہ خط دیکھاتے تھے - گاندھی جی کلکتہ میں قیام امن کی جدوجہد کر رہے تھے ادھر پھر سے پنجاب میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی اور ساتھ ہی دہلی میں بھی مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا گاندھی جی کلکتہ سے دہلی آ گئے فسادات کی روک تھام کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ انہوں نے قیام امن کے لئے ہر حربہ استعمال کیا آخر انہوں نے مرن برت رکھ لیا جب تک مکمل امن نہیں ہو گا اس وقت تک کھائیں پئیں گے نہیں کئی روز تک گاندھی جی نے مرن بھرت رکھا مگر دہلی میں امن قائم نہ ہوا۔ آخر حکومت ہند نے پوری طاقت کے ساتھ فسادات کے خلاف کارروائی کی مگر پھر بھی کامیابی مکمل نہ ہوئی چند وزراء نے آ کر گاندھی جی سے کہہ دیا کہ امن قائم ہو گیا ہے آپ برت توڑ دیں مگر گاندھی جی نہ مانے۔ انہوں نے کہا کہ آپ مصلحت کے تحت جھوٹ بول رہے ہیں ابھی فسادات ختم نہیں ہوا گاندھی جی نے آزاد ہند فوج کے جنرل شاہنواز سے دہلی کی صورت حال کے بارے پوچھا جنرل شاہنواز نے کہا کہ ابھی فسادات بدستور ہو رہے ہیں گاندھی جی نے برت نہیں توڑا دہلی میں بلکل امن قائم ہو گیا ہے تب گاندھی جی نے مرن برت توڑا دہلی میں امن کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہر طرف امن ہو گیا تھا پنجاب میں قتل عام بدستور ہو رہا تھا مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب پوری طرح جل رہے تھے ہندوؤں اور سکھوں کی منظم جماعتیں اکالی پارٹی راشٹریہ سوک سنگھ اور جن سنگھ پوری شدت کے ساتھ مسلمانوں کے قتل عام کی حمایت کر رہے تھے ان کی معاونت وہ لوگ کر رہے تھے جو مسلم پنجاب سے لٹ کر کٹ کر مشرقی پنجاب اور دہلی پہنچ رہے تھے۔ اس صورت حال میں غیر مسلم فرقہ پرست جماعتوں نے گاندھی جی کے خلاف محاذ قائم کر لیا - گاندھی جی کو لعن طعن کیا جانے لگا۔ اخبارات میں اور دیگر طریقوں سے بھی گاندھی جی کی شخصیت کو مسخ کیا جانے لگا یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گاندھی کی تمام تر امن کوشش بھی اسی علاقہ تک محدود تھیں اور بھارت میں ہی لوگ ان کے معتقد تھے اور بھارت میں ہی مسلمان قتل ہو رہے تھے۔ وہاں ھی ان کی آواز کا اثر بھی تھا۔

گاندھی جی قتل ہو گئے

پاکستان میں اکثریت کے ساتھ لوگوں میں گاندھی جی کا احترام نہیں تھا جہاں کسی شخص کا

احترام نہ ہو وہاں گاندھی جی کی امن کی اپیل پر کون کان دھرتا اس لئے قدرتی طور پر گاندھی جی کی تمام جدوجہد جو کہ وہ فسادات کو روکنے کے لئے کر رہے تھے اس کا فائدہ بھارتی مسلمانوں کو ہی تھا۔ پاکستان میں اقتدار مسلم لیگ کے پاس تھا اور لوگ بھی مسلم لیگی لیڈران کی بات ہی مانتے تھے مگر یہ نہیں ہوا کہ گاندھی جی کی دیکھا دیکھی مسلم لیگی لیڈران بھی کوشش امن کرتے۔ بے گناہ ہندوؤں کی جانیں بچانے کی کوشش کرتے کسی بھی مسلم لیگی لیڈر نے غیر مسلموں کی جان بچانے کی جھوٹی اپیل بھی نہیں کی بلکہ فسادیوں کو لوٹ مار قتل غارت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے پاکستان پنجاب کی پولیس غیر مسلموں کو قتل کرنے لوٹنے کی حوصلہ افزائی کرتی تھی اور لوٹ کے مال میں حصہ بھی لیتے تھے۔ اس زمانے میں ایک مسلم لیگی لیڈر سید مصطفیٰ گیلانی بھی مشہور ہوئے تھے وہ راولپنڈی کے رہنے والے تھے پٹواری تھے۔ مقرر بہت اچھے تھے اس زمانے میں مسلم لیگ کو مقررین کی بہت سخت ضرورت تھی وہ ملازمت چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور پنجاب اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہو گئے۔ راقم الحروف نے اپنے کانوں سے سنا تھا کہ وہ ایک مجلس میں اپنی کارکردگی بیان فرما رہے تھے اور فخریہ بیان فرما رہے تھے کہ میری کوشش سے سینکڑوں غیر مسلم قتل ہوئے اور اس قتل عام کی پوری داستان بھی بیان فرمائی تھی۔ اور غیر مسلموں کے قتل عام کی کارروائی پر وہ بہت زیادہ فخر کرتے تھے۔ اس طرح ضلع راولپنڈی میں جب مارچ 1947ء میں غیر مسلموں کا قتل عام ہوا تو کچھ گرفتاریاں بھی عمل میں آئی تھیں جن میں راقم الحروف کا ایک رشتہ دار بھی گرفتار ہوئے تھے وہ مسلم لیگی تھے وہ بڑے فخر سے بیان کیا کرتے تھے کہ ہم نے اتنے غیر مسلم قتل کئے تھے اور پھر گرفتار ہو گئے تھے مگر چونکہ ہم سیاسی قیدی تھے اور جیل میں ہمارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جاتا تھا اور 14 اگست 1947ء کی بعد یہ سب قیدی چھوڑ دیئے گئے تھے اور انہیں غیر مسلم مقتولین کے لواحقین جب دہلی اور مشرقی پہنچے اور اپنے غم کی داستانیں بیان کرتے تو وہاں مسلمانوں کے خلاف قتل غارت شروع ہو جاتی یہ ایک ایسا شیطانی چکر شروع ہوا کہ لاکھوں انسان لقمہ اجل بن گئے اس ظلم اور بربریت کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی کسی مسلم لیگی لیڈر نے بھولے سے بھی اس خون خرابے کی مذمت نہیں کی' روکنے کی کوشش نہیں کی اگر کسی مسلم لیگی کے ذاتی تعلقات کسی غیر مسلم سے تھے تو اس نے اپنے تعلق کی بنیاد پر کسی غیر مسلم کو قتل ہونے سے بچایا ورنہ اور کوئی بچت کا ذریعہ نہیں تھا۔ دوسری جماعتوں کے کارکنوں نے کسی حد تک انسانی ہمدردی کے تحت غیر مسلموں کی خدمت بھی کی انکی جانیں بھی بچائیں۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے گاندھی جی انسانی ہمدردی کے مشن پر ڈٹے رہے اور مسلمانوں کو قتل عام سے بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ ہندو رائے عامہ گاندھی جی کے خلاف کافی حد تک ہو گئی فرقہ پرست گروپ اکالی پارٹی جن سنگھ راشٹریہ سیوک سنگھ کی گاندھی جی کے خلاف تحریک کامیاب ہو رہی تھی پھر ہندوستان کی آزادی کے تقریباً چھ ماہ بعد 30 جنوری 1948 جیسا کہ گاندھی جی ہر جلسہ میں لوگوں کو فرقہ پرستی کے خلاف درس دیا

کرتے تھے لوگوں کو مذہبی رواداری کا درس دیا کرتے تھے ایسی ہی باتیں سننے کے لئے لوگ ان کے آشرم برلا ہاؤس میں جمع تھے جب گاندھی جی لوگوں کو وعظ کرنے کے لئے آگے بڑے تو ایک ہندو نوجوان ناتھو رام گوڈسے نے گاندھی جی کو پہلے پرنام کیا پھر پستول سے ان پر تین فائر کر دیئے۔ گاندھی جی موت کی آغوش میں چلے گئے ناتھورام کو لوگوں نے پکڑ لیا اور پولیس کے حوالے کر دیا گاندھی جی کی موت ایک عظیم انسان کی موت تھی۔ ان کی موت پر ارتھی پر جو سب سے پہلی شخصیت پہنچی وہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد تھے وہ کسی سیاسی الجھاؤ اور فرقہ وارانہ فسادات کے تفکر میں الجھے ہوئے تھے وہ کسی مشورہ کے ملئے جب برلا مندر پہنچے تو لوگ آشرم کے باہر کھڑے تھے حالات کی غیر معمولی تبدیلی دیکھتے ہوئے وہ متفکر ہوئے لوگوں سے پوچھا کیا بات ہے جب پتہ چلا کہ گاندھی جی قتل ہو گئے ہیں تو وہ بہت افسردہ ہوئے گاڑی سے اترے سیدھے گاندھی جی کی میت پر گئے میت پر گاندھی کی پوتی افسردہ بیٹھی رو رہی تھی میت کو دیکھ کر امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد بھی بے ساختہ رو پڑے۔ آنسوؤں سے چہرہ بھیگ گیا پھر کانگرس لیڈران بھی آنا شروع ہو گئے۔ پنڈت نہرو نے جب قاتل دیکھا تو جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اس کے ساتھ الجھ پڑے۔ گاندھی جی کے قتل کی خبر جب دلی شہر میں پہنچی تو لوگ حیران ہوگئے سکتے میں آ گئے کہ یہ کیا ہو گیا گاندھی جی کے وحشیانہ قتل پر پورے ہندوستان میں کہرام مچ گیا گاندھی کی موت انسانیت کی موت تھی وحشت کی زندگی تھی ہندوستان میں بسنے والے مسلمان دلگیر ہوئے مسلم لیگ لیڈر تو انہیں فرقہ واریت کی آگ میں جھونک کر خود مسند اقتدار پر جلوہ گر ہونے کے لئے پاکستان آ چکے تھے اور یہاں پر بھی پوری آب و تاب کے ساتھ فرقہ واریت کا الاؤ جلا چکے تھے یہاں سے جو بچ کر ہندو سکھ بھارت جاتے تھے وہ بھارت جا کر فرقہ واریت کی آگ جلا رہے تھے جس میں مسلمان جل رہے تھے۔ مسلمانوں کی زندگیاں بچانے کے لئے ہی گاندھی جی جدوجہد کر رہے تھے۔ مگر فرقہ پرست درندوں نے ان کی یہ کوشش ایک آنکھ نہ بھائی تھی اسی فرقہ پرست فضاء نے ہی بلاآخر ایک عظیم انسان کو نگل لیا ان کی موت پر جہاں ہندو اکثریت رنجیدہ ہوئے کہ اب وہ ہونے والے ظلم کی شکایت کس کے پاس لے کر جاویں گے کیونکہ گاندھی جی کی ایک شخصیت تھی ان کا احترام تھا قوم ان کی ایک آواز پر ان کا احترام کرتی تھی۔ بھارتی حکومت نے گاندھی جی کے وحشیانہ قتل پر چالیس یوم تک سوگ منانے کا اعلان کیا دنیا بھر کی حکومتوں نے اس عظیم انسان کے وحشیانہ قتل پر سوگ منایا۔ اقوام متحدہ کا جھنڈا سرنگوں کر دیا گیا تین دن تک سوگ منانے کا اعلان کیا گیا۔ پاکستان کے گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی جناح نے گاندھی جی کی موت پر جو تعزیت کی ان کے الفاظ تھے کہ گاندھی جی ہندوؤں کے بہت بڑے لیڈر تھے پاکستان ان کی موت پر افسوس کا اظہار کرتا ہے۔

جماعت اسلامی پاکستان

جماعت اسلامی کے امیر مولانا مودودی اور ان کے ساتھی ہجرت کر کے لاہور پہنچ گئے۔ یونیورسٹی کے قریب انہیں ایک عمارت الاٹ ہوئی بمعہ اپنے ساتھیوں کے اس میں رہائش پذیر ہو گئے۔ چند روز بعد ان سے عمارت چھین لی گئی پھر ان لوگوں نے خیموں میں رہائش اختیار کر لی۔ چند روز خیموں میں رہنے کے بعد اچھرہ میں کرائے کے مکان میں چلے گئے اور انہیں جگہوں پر رہائش اختیار کر لی۔ پاکستان کے ابتدائی دور میں جماعت اسلامی کے اراکین کی تعداد 385 تھی۔ جماعت کے ارکان بڑی چھان بین کے بعد بنائے جاتے تھے ویسے جماعت کے ہمدرد کافی تعداد میں تھے۔ پاکستان بن جانے کے بعد جماعت اسلامی کی خوش قسمتی یہ ہوئی کہ یہ لوگ منظم تھے اور ان کی تربیت بھی خاص طریقہ پر کی گئی تھی اور پھر اس وقت سیاسی جماعت بھی صرف مسلم لیگ ہی تھی دیگر جماعتیں جو متحدہ ہندوستان کے وقت سیاست میں متحرک تھیں وہ 1945ء کے الیکشن میں شکست کھا چکی تھیں۔ اور صرف مسلم لیگ ہی کامیاب ہوئی تھی اس نے پاکستان بنا دیا تھا وہ ہی پاکستانی سیاست کے سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ مسلم لیگ کے حکم سے ہی کوئی جماعت پاکستان میں سیاست کر سکتی تھی اس لئے دیگر جماعتیں جس میں احرار جمعیت العلمائے ہند خاکسار خدائی خدمت گار اور دیگر بہت سارے گروپ شامل تھے ان کے ورکروں میں مایوسی آئی ان میں بہت سارے کارکن آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگے اقتدار پرست کارکن مسلم لیگ میں شامل ہو گئے جن میں احرار کارکن بھی شامل تھے بہت سارے احرار کارکن تحفظ ختم نبوت تبلیغی مشن پر کاربند ہوگئے اور بہت سارے احرار کارکن جماعت اسلامی میں بھی شامل ہو گئے۔ دیگر جماعت اسلامی کے کارکنوں کو جو امداد ملی وہ یوں بھی تھی کہ متحدہ ہندوستان کے وقت کی جو مسلم جماعت زیب داستان کے لئے ملک آزاد ہونے کی صورت میں اسلامی حکومت کا نام بھی لیتی تھی اس لئے جو لوگ حزب اختلاف میں رہنا چاہتے تھے اور اسلامی حکومتی نظام بھی انہیں مرغوب تھا۔ وہ بہت سارے کارکن جماعت اسلامی میں چلے گئے۔ راقم الحروف خود بھی ان ایام میں جماعت اسلامی کا ہمدرد رہا ہے اور 1950ء تک جماعت کے ساتھ ذہنی طور پر وابستہ تھا۔ جماعت کی دوسری خوش قسمتی یہ تھی کہ پاکستان کے شروع کے ایام میں مولانا مودودی کو ریڈیو پاکستان پر مختلف اسلامی موضوعات پر تقریر کرنے کے مواقع ملے جن سے مولانا مودودی کی شخصیت کے اثرات اور ان کی تعلیمات کے اثرات پڑھے لکھے لوگوں پر نمودار ہوئے اور جو لوگ سالہا سال سے اسلامی نظام حکومت کا مولوی حضرات سے سن رہے تھے انہیں مدلل طریقہ پر ریڈیو پاکستان سے مولانا مودودی کی تقریر سن کر جماعت کے قریب جانے کی کشش پیدا ہوئی۔ دیگر یہ کہ مہاجرین کیمپ میں کئی جگہوں پر جماعت کے کارکنوں کو انتظامات دیئے گئے اس وجہ سے بھی جماعت کے لوگوں میں اثر و رسوخ قائم کرنے میں بہت مدد ملی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مودودی
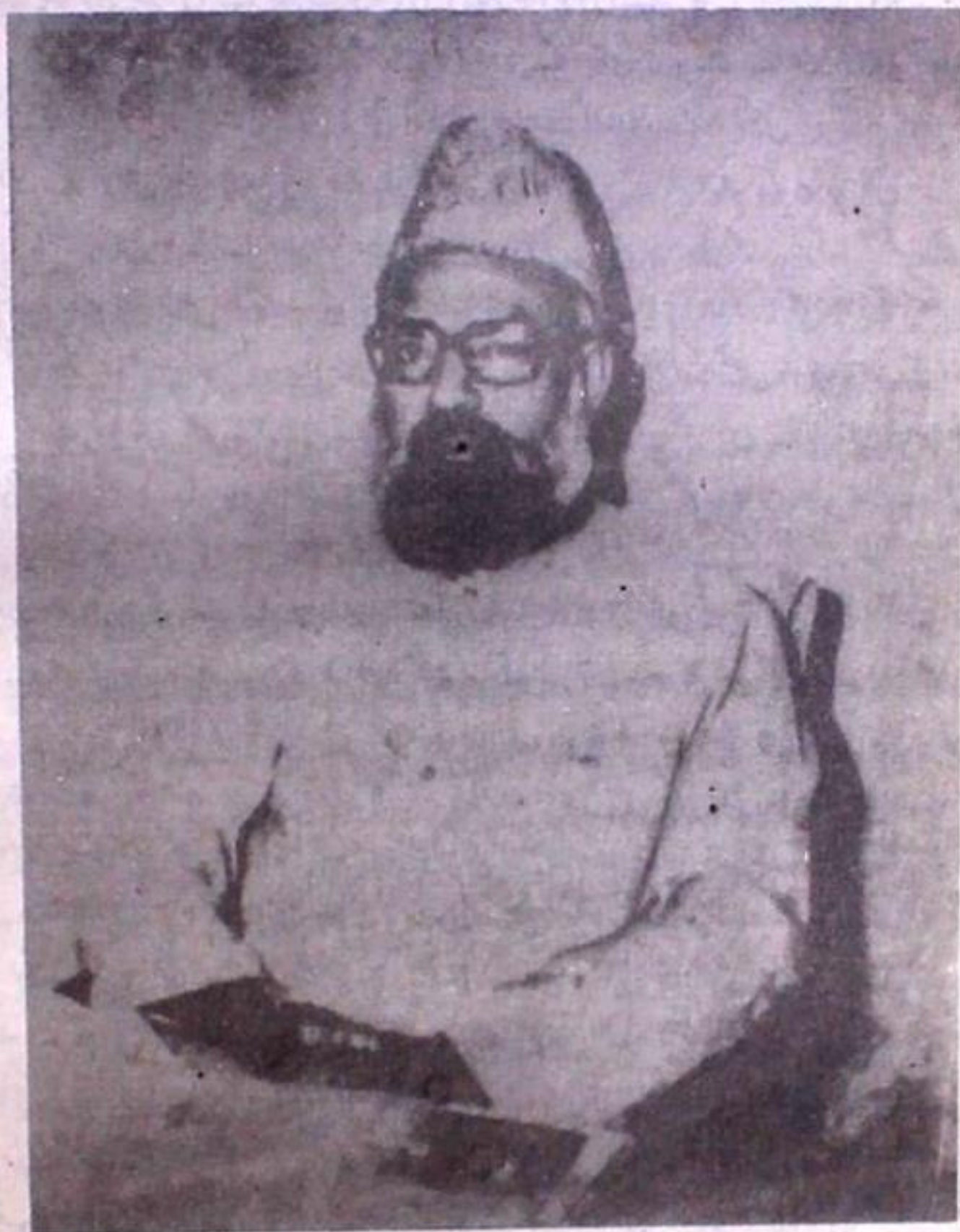
قاضی حسین احمد امیر جماعت اسلامی

صاحب کو تحریر اور تقریر کے ساتھ ساتھ انتظامی صلاحیت بھی کافی تھی اور جماعت کو بالکل اس انداز سے منظم کیا جس طرح کیمونسٹ پارٹی منظم کی جا رہی تھی اس شخص کو پارٹی کارکن بناتے تھے جو بہت سارے امتحانات میں کامیاب ہو جاتا تھا کئی سال تک کارکنوں کو پرکھ کے مرحلہ میں رکھا جاتا تھا۔

جماعت اسلامی کا سیاسی فلسفہ

جماعت اسلامی میں بہت سارے سرکاری ملازم ملازمتیں چھوڑ کر بھی داخل ہو گئے تھے انہی لوگوں میں دو صاحب میرے تعلق والے بھی تھے چودھری علی احمد 1945ء میں پولیس ٹریننگ کالج فلور میں استاد تھے۔ اور ان کا رتبہ سب انسپکٹر پولیس کا تھا انہوں نے مولانا مودودی کے لٹریچر سے متاثر ہو کر ملازمت چھوڑ کر پھلور میں پولیس ٹریننگ کالج کے قریب ہی نانبائی کی دکان بنا لی وہ خود ہی سالن روٹیاں پکاتے اور بہراگری بھی خود ہی کرتے ۔ کہاں تھانے داری کہاں بہراگیری مگر ایک مذہبی لگن نے انہیں اس راستے پر ڈال دیا۔ وہ پاکستان بن جانے کے بعد جماعت اسلامی کے ہما وقت کارکن بن گئے۔ اور جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے ممبر بھی بن گئے تھے اور وہ 1956ء میں قضائے الٰہی سے فوت ہو گئے۔ اس طرح ایک صاحب ابھی زندہ ہیں وہ انڈین نیوی میں ملازم تھے وہ بھی جماعت کا لٹریچر پڑھ کر نوکری سے فارغ ہو گئے تھے مگر وہ اس وقت جماعت اسلامی میں نہیں جماعت اسلامی کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ جو شخص سرکاری ملزم ہے اور وہ سرکار اسلامی سرکار نہیں ایسی سرکاری نوکری کرنی حرام ہے اور دیگر انہوں نے شروع وقت میں یہ بھی فتویٰ دیا تھا کہ جو شخص کسی غیر اسلامی عدالت میں اپنے حق کے لئے دعویٰ کرتا ہے، استغاثہ کرتا ہے انصاف کا طلب گار ہوتا ہے وکالت کرتا ہے۔ اسمبلی کا ممبر بنتا ہے یا ملازمت کرتا ہے یہ از روئے شریعت حرام ہے ایسا کرنے والا شخص مسلمان نہیں رہتا۔ کئی لوگوں نے سرکاری ملازمتیں چھوڑ دیں اور پھر اس وقت پاکستان میں سرکاری ملازمت جائز ہوئی جب لیاقت علی خان کے زمانہ اقتدار میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے قرار داد مقاصد پاس کر دی جس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کی ریاست اسلامی ہو گئی ہے آئندہ جو دستور پاکستان کا بنے گا وہ اسلامی ہو گا۔

مئی 1948ء کے ایام میں جماعت اسلامی پشاور کے اجتماع کے دوران ایک صاحب مسمی نبی بخش نظامی تشریف لائے انہوں نے جہاد کشمیر کے بارے میں پوچھا اس زمانے میں پاکستان کشمیر میں گوریلا جنگ لڑ رہا تھا تو مولانا مودودی صاحب نے فرمایا کہ حکومت پاکستان کو کھل کر بھارت کے خلاف اعلان جنگ کرنا چاہئے بغیر اعلان کے جنگ از روئے اسلام جائز نہیں اسی الزام میں مولانا مودودی کو گرفتار کیا گیا اور قید بھی ہوئی - جب تک پاکستان کا دستور 1956ء میں نہیں بن گیا تھا اس وقت تک تمام وزیر افسران گورنر گورنر جنرل ادنا سے اعلیٰ تک سرکاری ملازم فوجی جنرل

افسران اور دیگر وہ تمام لوگ جو حکومتی اداروں میں کسی ذمہ داری پر معمور ہوتے تھے وہ اعلان آزادی اور 1935ء ایکٹ کا حلف اٹھاتے تھے کہ جو کچھ بھی مندرجہ بالا ایکٹ کے تحت مجھ پر ذمہ داریاں ہوں گی وہ پوری کروں گا۔ 1948ء میں کسی صاحب نے پاکستان میں فوجی ملازمت کے متعلق جماعت کا حکم پوچھا تو جواب میں میاں طفیل محمد صاحب نے لکھا کہ جب تک حکومت اسلامی ہونے کا اعلان نہ کرے اس وقت تک فوجی ملازمت بھی جائز نہیں ان حالات میں جماعت اسلامی کے کئی لیڈر ورکر گرفتار کئے گئے انہیں جماعت کی طرف سے حکم ہوا کہ وہ گرفتاری سے نہ بچیں اور نہ ہی ہائی کورٹ میں رہائی کی کوشش کریں اور نہ ہی ضمانت دیں اور نہ ہی جرمانہ ادا کریں کچھ وقت جیلوں میں جماعت کے گرفتار شدگان کو کافی سہولتیں بھی دی گئیں مولانا مودودی اور جناب امین احسن کو ملتان جیل میں ایک جگہ کردیا گیا۔

بلا آخر 12 مارچ 1949ء کو دستور ساز اسمبلی پاکستان نے دستور کی وہ قرارداد مقاصد پاس کی جس میں خدا کی حاکیت کا واشگاف اعلان کیا گیا۔ اسکے بعد جماعت اسلامی نے حکومت پاکستان کی ملازمت اور عدالتوں میں حصول انصاف کی درخواست دعوئ عرضی دعوئ جائز قرار دیا۔ 28 مئی 1950ء کو مولانا مودودء اور دیگر لیڈروں کو ملتان جیل سے رہا کردیا گیا۔

ستمبر 1950ء میں دستور ساز اسمبلی نے بنیادی اصولوں کی سفارشات پیش کیں تو جماعت اسلامی نے انکی مخالفت کی اور 31 علماء جنکا نام پورے ملک میں احترام سے لیا جاتا ہے ان میں بریلوی' دیوبندی' اہلحدیث اور شیعہ علماء بھی شامل تھے۔ ان کی میٹنگ بلائی گئی جس میں اسلامی دستور کے بائیس نکات پیش کئے گئے جو متفقہ تھے جماعت اسلامی کا یہ بڑا کارنامہ تھا۔

جماعت اسلامی اور عام انتخابات

1951ء میں قیام پاکستان کے بعد پہلے انتخابات ہو رہے ہیں جماعت اسلامی بھی پہلی بار انتخابات میں حصہ لے رہی تھی۔ انتخاب کے متعلق سب سے پہلا نظریہ جو جماعت اسلامی نے پیش کیا وہ یہ تھا کہ جو شخص اپنے آپ کو از خود کسی منصب کے لئے پیش کرتا ہے وہ منصب کا اہل نہیں ہوگا۔ منصب کے اہل وہ شخص ہوتا ہے جسے لوگ منصب پیش کریں۔ اس کے لئے طریقہ کار یہ وضع کیا گیا کہ ہر حلقہ انتخاب کو سو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ پھر ہر حصہ سے ایک صالح شخص کو چنا جائے سو صالحیں مل کر ایک بہترین قسم کے صالح شخص کو منصب کے حصول کے لئے امیدوار نامزد کریں اس شخص کو کامیاب کرانے کے لئے چھوٹے صالحین مل کر کوشش کریں۔ اگر وہ صالح شخص کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو وہ اصل نمائندگی کا حق دار ہوگا۔ پنجاب میں اسی طریقے پر امیدوار کھڑے کئے گئے۔ ہمارے گوجرانوالہ میں بھی اسی طریقے کو اپنا گیا گوجرانوالہ شہر کا صوبائی اسمبلی کے لئے ایک حلقہ انتخاب تھا۔ سو صالحین کو سارے شہر سے چنا گیا سو صالحین

نے مل کر مولانا حنیف ندوی صاحب کو بطور امیدوار صوبائی اسمبلی نامزد کیا مگر یہ صاحب وہابی تھے اور ساتھ ہی وہ جماعت اسلامی کے متفق بھی نہ تھے وہابی کو عام سنی لوگ ووٹ دینے کو بھی تیار نہ تھے ساتھ ہی ان کا جماعت اسلامی کا متفق ہونا بھی ضروری تھا پھر خود بخود ہی جماعت اسلامی نے فیصلہ کر لیا کہ جماعت اسلامی کے متفق اور عالم دین مولوی محمد چراغ کو کھڑا کیا جائے فیصلے کے مطابق مولوی محمد چراغ صاحب جماعت اسلامی کے امیدوار برائے صوبائی اسمبلی قرار پائے اور انہیں کامیاب کرانے کی جدوجہد شروع کی گئی۔ نہایت منظم طریقہ پر کنویسنگ کی گئی صوبائی اسمبلی کی اس نشست پر چھ امیدوار انتخابات میں حصہ لے رہے تھے جن میں سٹی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری بھی تھے انتخابات کا جو طریقہ کار بنایا گیا تھا وہ یوں تھا کہ گوجرانوالہ شہر کو تقسیم ہند سے قبل کے نو مسلم وارڈوں میں تقسیم کیا گیا تھا ایک وارڈ کا ایک دن میں الیکشن ہوتا تھا تحصیل آفس میں پولنگ سٹیشن بنایا گیا تھا پہلے دن کے پولنگ نمبر 1 پر سرکاری امیدوار میاں منظور حسن تھے نمبر 2 پر جماعت اسلامی کے امیدوار مولوی محمد چراغ صاحب تھے باقی تمام امیدوار ان سے کم تھے اس رات مسلم لیگ کا سرکای امیدوار کے علاوہ تمام جماعتوں کے امیدوار شیرانوالہ باغ میں ایک مشترکہ جلسہ میں جمع ہوئے اس جلسہ میں نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ بھی شامل تھے یہ اس وقت مسلم لیگ چھوڑ کر جناح عوامی مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے ان کی اپیل پر تمام امیدوار جو مولانا محمد چراغ صاحب کے علاوہ تھے وہ جماعت اسلامی کے امیدوار حضرت مولانا محمد چراغ کے حق میں الیکشن سے دست بردار ہو گئے۔ یہ الیکشن سرکاری مسلم لیگ کے امیدوار اور اپوزیشن کے واحد امیدوار کے درمیان مقابلہ ہوا مسلم لیگ کا امیدوار الیکشن جیت گیا مگر اپوزیشن امیدوار مولوی محمد چراغ صاحب نے بھی کافی ووٹ حاصل کئے پورے پنجاب میں جماعت اسلامی نے 58 امیدوار الیکشن پر کھڑے کئے تھے جن میں صرف ایک امیدوار ساہیوال سے راؤ خورشید کامیاب ہوئے باقی تمام امیدوار ہار گئے جماعت اسلامی نے سارے پنجاب میں جو امیدوار کھڑے کئے تھے وہ اسی طریقہ کار پر کھڑے کئے گئے تھے جس طریقہ پر گوجرانوالہ کے امیدوار کو کھڑا کیا گیا تھا۔

پورے پنجاب میں اس الیکشن کے نتیجہ پر جماعت اسلامی کو دو لاکھ اٹھاون ہزار ووٹ ملے جماعت اسلامی کو زیادہ تر ووٹ مسلم لیگ مخالفت میں ملے جماعت کی ہمدردی میں نہیں ملے۔

حکومت پاکستان نے اعلان کیا کہ وہ 22 نومبر 1952ء کو دستوری سفارشات پیش کر رہی ہے جماعت اسلامی نے 21 نومبر کو سارے ملک میں یوم دستور اسلامی منایا جلسے، جلوس نکالے کراچی اس زمانے میں دارالحکومت تھا سب سے بڑا اور منظم جلوس کراچی میں نکالا گیا جو کہ قابل دید تھا۔ 1953ء کے شروع میں تحریک ختم نبوت بڑے زور سے چل رہی تھی جماعت اسلامی بھی تحریک میں معاون تھی اور تحریک میں جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالعلی مودودی سمیت کئی لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ مودودی صاحب کو مارشل کی فوجی عدالت نے سزائے موت کا حکم سنایا جو بعد

میں سزاء معاف کر دی گئی تقریبا ڈیڑھ سال مودودی صاحب اور ان کی ساتھی قید رہنے کے بعد 29 اپریل 1955ء کو رہا کر دیئے گئے۔ ان کی رہائی اور لاہور آمد پر جماعت اسلامی نے بہت شاندار استقبال کیا جماعت اسلامی کی جدوجہد زیادہ دستور اسلامی کے بارے ہی تھی اس کے لئے جلوس پر امن نکالے جاتے جلسے کئے جاتے ' پمفلٹ شائع کئے جاتے اسی جدوجہد میں مولانا مودودی نے جنوری 1956ء کو ڈھاکہ کا سفر کیا اور مشرقی بنگال کا مفصل دورہ کیا چالیس روز تک مشرقی پاکستان کے مختلف شہروں میں اجلاس کئے اور وہاں کی مذہبی سیاسی جماعتوں کے ساتھ دستور کے بارے رابطے کئے اور تقریبا پانچ سو علمائے دین و مشائخ کی کانفرنس ہوئی جس میں جداگانہ طریقہ انتخابات کا مطالبہ کیا گیا اور مشرقی بنگال کا نام مشرقی پاکستان رکھنے کی تجویز پیش کی کہ پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا جائے بلاآخر 23 مارچ 1956ء کو پاکستان میں دستور نافذ کر دیا گیا۔ اور پاکستان برطانیہ کی ڈومینین سے نکل کر آزاد پاکستان کہلانے کا حق دار بن گیا۔ 1956ء کے دستور کے متعلق چند باتیں عرض کر دینا بہت ہی ضروری معلوم ہوتی ہے قارئین کو پتہ ہی ہے کہ آبادی کے حساب سے مشرقی بنگال بڑا ہے اس کی آبادی 56 فیصد ہے اور مغربی پاکستان کی تمام صوبوں کو ملا کر 44 فیصد آبادی بنتی ہے پنجاب کا برسراقتدار طبقہ فوج نوکر شاہی نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان کے اقتدار پر بنگالی حاوی ہو جاویں یہی دستوری جھگڑا چل رہا تھا اسی جھگڑے کی بدولت خواجہ ناظم الدین وزارت ختم کی گئی تھی ون یونٹ کا طریقہ اپنایا گیا مغربی پاکستان کے لیڈران نے اور بہت ساری ضرورت کے علاوہ اس ضرورت کے پیش نظر ون یونٹ بنایا کہ برابری کی بنیاد پر دونوں یونٹ کی نمائندگی منوائی جائے بنگالی حاوی نہ ہو سکیں اور مجموعی طور پر اقتدار پنجابی لیڈروں فوج اور نوکر شاہی کے پاس ہی رہے شروع دن سے ہی خفیہ ہاتھ کا کارنامہ یہی تھا کہ کوئی بھی ایسا طریقہ نہ بنایا جائے جس سے اقتدار خفیہ ہاتھ سے نکل جائے ون یونٹ کیوں اور کیسے بنا اس کے متعلق کسی دوسرے باب میں تفصیل سے ذکر کریں گے اس زمانے میں جماعت اسلامی نے ون یونٹ کی سب سے زیادہ حمایت کی جو پارٹی ون یونٹ کے خلاف جلسہ کرتی تھی۔ جماعت اسلامی وہ جلسہ الٹ دیا کرتی تھی ون یونٹ کو وحدت پاکستان کا نام دیا گیا تھا جیسے ون یونٹ کی مخالفت خدا کی واحدنیت کی مخالفت ہے اور پنجاب کے عام لوگ بھی ون یونٹ کے سخت حامی تھے پنجاب کی اکثریت ون یونٹ کے خلاف کوئی کوئی بات سننا برداشت نہیں کرتی تھی۔ 1956ء کا آئین بن جانے کے بعد مغربی پاکستان کی وزارت نے ڈاکٹر خان صاحب کی زیر قیادت حلف اٹھایا اور آئین کی تحت پاکستان کے دیگر تمام صوبے ختم کر دیئے گئے تھے صرف دو صوبے رہ گئے تھے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان مرکز میں دونوں صوبوں کی نمائندگی برابر تھی جماعت اسلامی جنون کی حد تک ون یونٹ کی اور 1956ء کے دستور کی حامی تھی اور جماعت نے یہ محسوس کیا کہ دستور بن جائے کے بعد انہوں نے منزل کو پا لیا ہے اور اب پاکستان ترقی اور خوشحالی میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔

1956ء کا آئین نافذ ہو جانے کے بعد طریقہ انتخاب کا مسئلہ پیش آیا جماعت اسلامی کا نقطہ نظر تھا کہ جداگانہ انتخابات ہونے چاہئیں جبکہ مسلم لیگ کے علاوہ دیگر جماعتیں ری پبلکن پارٹی عوامی لیگ نیشنل عوامی پارٹی کرشک سرامک پارٹی والے کہتے تھے کہ مخلوط طریقہ انتخاب ہونا چاہئے اس مسئلہ پر ملک کے دونوں حصوں میں تصادم کی شکل بن گئی پارلیمنٹ نے مخلوط طریقہ انتخاب کا بل پاس کر دیا جماعت اسلامی اور مسلم لیگ اس کے خلاف تھی پورے ملک میں جماعت اسلامی اور مسلم لیگ نے تصادم کی شکل بنا دی بعد میں ملک کے دونوں حصوں کی اسمبلیوں میں یہی بل پیش ہوئے مغربی پاکستان اسمبلی نے جداگانہ طریقہ انتخاب کا بل پاس کیا جبکہ مشرقی پاکستان اسمبلی نے مخلوط طریقہ انتخاب کا بل پاس کیا۔ یہ تجویز بھی سامنے آئی کہ مغربی پاکستان اسمبلی نے جداگانہ طریقہ انتخابات کی تجویز پاس کی ہے اس لئے مغربی پاکستان میں جداگانہ طریقہ رائج کیا جائے اور مشرقی پاکستان نے مخلوط انتخاب کی تجویز پاس کی ہے وہاں مخلوط طریقہ انتخاب رائج کیا جائے یہ تجویز بھی جماعت اسلامی اور مسلم لیگ نے نہیں مانی یہ دور بڑا ہی ہنگامہ خیز دور تھا وزارتیں ٹوٹتی بنتی رہتی تھیں انہیں ایام میں مشرقی پاکستان اسمبلی میں ہنگامہ ہوا جس میں اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر قتل ہو گئے اور انہیں ایام میں ریپبکن پارٹی کے لیڈر جناب ڈاکٹر خان صاحب بھی قتل کر دیئے گئے تھے جماعت اسلامی کی پاکستان کی کسی بھی اسمبلی میں نمائندگی نہ تھی مگر جماعت اسلامی ایک منظم قوت تھی اور کالجوں میں بھی موثر تنظیم جماعت کی اسلامی جمعیت طلبہ بن چکی تھی اسی وجہ سے سٹریٹ قوت جماعت کی کافی مضبوط تھی جس کی وجہ سے جماعت لوگوں میں کافی متحرک بن چکی تھی اور اس کی آواز ہر مسئلہ پر سنائی دیتی تھی۔ انہی ایام میں مولانا مودودی حج بیت اللہ پر گئے دمشق میں موتمر عالم اسلامی کی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی اس میں مودودی صاحب مدعو تھے وہ کراچی سے بیروت پہنچے تو اخوان المسلمون کے لیڈروں اور کارکنوں نے ان کا استقبال کیا دیگر کئی لیڈروں سے انکی ملاقات ہوئی دمشق سے وہ سیدھے ہی مکہ مکرمہ گئے حج کے بعد وہ مدینہ منورہ گئے روضہ رسولؐ کی زیارت کے بعد وہ شاہ حسین کی دعوت پر اردن بھی گئے۔

اس دور میں جماعت اسلامی کے اندر فکری انتشار پیدا ہو گیا ڈاکٹر اسرار احمد کی زیر قیادت اچھا خاصا ایک گروہ جو یہ کہتے تھے کہ جماعت اسلامی کو سیاست اور الیکشن میں ملوث کر کے جماعت کو غلط راستے پر ڈالدیا گیا ہے اور جماعت انبیاء کے راستے سے ہٹ گئی ہے یہ فکری انتشار بڑھتے بڑھتے بحران کی شکل اختیار کر گیا اراکین جماعت کا ایک اجلاس ضلع رحیم یار خان کے ایک گاؤں جہاں ریل بھی جاتی تھی جی ٹی روڈ پر واقع ماچھی گوٹھ میں بلایا گیا تقریبا ایک ہزار کارکن اس اجلاس میں شریک ہوئے اجلاس تین دن تک جاری رہا مولانا مودودی کو انتشار پر قابو پانے میں کامیابی ہوئی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی زیر قیادت جماعت کے کارکنوں نے جماعت سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا مولانا مودودی کو متفقہ طور پر اعتماد کا اظہار کیا گیا اور انہوں نے جو جماعت

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اپنے رفقۂ کار کے ہمراہ

کی امارت سے استعفیٰ دیا ہوا تھا وہ بھی واپس لے لیا اس وقت ملکی سیاسی حالات کچھ اس قسم کے تھے کسی بھی حکومت کو استحکام نہیں تھا۔ محلاتی سازشیں عروج پر تھیں سازشوں کی وجہ سے حکومتیں اکھاڑ پچھاڑ بہت زیادہ تھی ایک رات پاکستان کے عوام گہری نیند سوئے ہوئے جب وہ صبح بیدار ہوئے تو سول حکومتوں کا بستر لپیٹا جا چکا تھا اور فوج نے اقتدار سنبھال لیا ہوا تھا اور مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

1958ء کا مارشل لاء

7 '8 اکتوبر 1958ء کی درمیانی رات کو ملک پر فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا ہوا تھا مارشل لاء کے پیش منظر اور پس منظر کے حالات ہم کسی اور باب میں بیان کریں گے۔ جماعت اسلامی سمیت ملک کی تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی مرکزی اور صوبائی حکومتیں اور تمام سول ادارے میونسپل کمیٹیاں ٹاؤن کمیٹیاں کارپوریشن ڈسٹرکٹ بورڈ مارکیٹ کمیٹیاں اور وہ ادارے جن میں عوام کے نمائندوں کا برائے راست عمل دخل ہو سکتا تھا۔ ان پر فوجی ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیئے گئے ہر قسم کا عوامی نمائندہ ادارت ختم کر دی گئی ان پر سرکاری انتظامیہ مقرر کر دی گئی جس رات مارشل لاء لگا صبح ہم جب اٹھے ریڈیو پر مارشل لاء کے بارے سنا اور 1956ء کا آئین بھی منسوخ کر دیا گیا تھا ہم ڈر کے مارے گھر سے باہر نہ نکلیں کہ شاید باہر نکلنے کی اجازت بھی ہے کہ نہیں جس شخص کی عمر پچاس سال ہی کم تھی اس نے پہلے کبھی مارشل لاء دیکھا ہوا نہ تھا ہم مارشل کو بھی کرفیو کی ہی کوئی شکل سمجھتے تھے ڈرتے جھجکتے باہر نکلے تو لوگ گھروں کے باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے پتہ چلا کہ باہر پھرنے کی گھومنے کی کوئی پابندی نہیں صرف قانون بدل گیا ہے سول حکومت اور قانون کی جگہ اب فوجی حکومت اور قانون ہو گیا ہے پتہ چلا کہ باہر جی ٹی روڈ پر فوجی ٹرک گھوم رہے ہیں فوج بھی گشت کر رہی ہے پھر ہمیں چند روز میں مارشل لاء اور سول لاء کے فرق کا بھی پتہ چل گیا اور کچھ ڈر خوف بھی کم ہو گیا جماعت اسلامی شروع میں تو دیگر جماعتوں یا سیاسی کارکنوں کی طرح فوجی حکومت کے خلاف ہی تھی مگر بعد میں انہوں نے ذہنی طور پر فوجی حکومت اور مارشل لاء کو قبول کر لیا تھا اور اس کو استحکام پاکستان کے لئے ضروری سمجھا جانے لگا دیگر سیاسی جماعتیں تو تقریباً خاموش ہی ہو گئیں تھیں مگر جماعت اپنے طور پر دیگر ناموں سے جمعیت طلبہ اور خدمت خلق کے دیگر طریقوں سے رابطہ عوام مہم جاری رکھے ہوئے تھی جب مارشل اٹھایا گیا تو جماعت اسلامی کے اپنے دفاتر پر صرف بورڈوں کی تبدیلی کی ہی ضرورت پیش آئی اور ان کا کام رواں دواں ہو گیا۔ اکتوبر 1962ء میں جب مارشل کو ختم ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے تو متحدہ اپوزیشن پارٹیز قائم ہو چکی تھی۔ اور انہوں نے ملک گیر رابطہ عوام مہم بھی شروع کر دی تھی اس وقت مسلم لیگ یا تو ایوب خان کے ساتھ تھی یا پھر خاموش تھی میدان

خان عبدالغفار خان اور دیگر ساتھی

میں صرف اس وقت دو پارٹیاں سامنے آئی تھیں راقم الحروف اس وقت نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ وابستہ تھا۔ گوجرانوالہ میں متحدہ اپوزیشن پارٹیز کے زیر اہتمام ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں اس وقت صرف دو پارٹیاں نیشنل عوامی پارٹی اور عوامی لیگ ہی پیش پیش تھیں جلسے میں مرکزی لیڈر شپ نے آنا تھا۔ جن میں جناب سہروردی شیخ مجیب الرحمان مولانا بھاشانی نوابزادہ نصراللہ خان عطاء الرحمان خان محمود علی قصوری اور دیگر چوٹی کی لیڈر شپ نے آنا تھا۔ راقم الحروف بھی منتظمیں جلسہ میں شامل تھا جلسہ کے دو روز قبل ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ گورنمنٹ کسی قیمت پر یہ جلسہ نہیں ہونے دے گی گوجرانوالہ سمیت پانچ چھ اضلاع کے غنڈوں کو پولیس نے جلسہ خراب کرنے کے لئے مدعو کر لیا ہوا تھا۔ لیڈران نے صبح دس بجے کے وقت بذریعہ ریل گاڑی گوجرانوالہ پہنچنا تھا متحدہ اپوزیشن پارٹیز کے ورکروں نے اور عوام نے ان کا استقبال کرنا تھا۔ صبح کے وقت ہی پولیس غنڈوں کو لے کر سٹیشن پر پہنچ گئی تاکہ خوش کن استقبال کی بجائے گالیوں سے غنڈہ گردی سے استقبال کیا جائے اور ان غنڈوں کے ہمنوا جماعت اسلامی کے ورکر اسلامی جمعیت کی پوری طاقت حافظ محمد اسحاق جو کہ اس وقت سٹوڈنٹ تھے اور اسلامیہ کالج کی اسلامی جمعیت طلبہ یونین کے صدر تھے وہ بھی پوری یونین کے ساتھ متحدہ اپوزیشن لیڈروں کے خلاف پولیس کی معاونت میں استقبال کو کراب کرنے اور جلسہ خراب کرنے میں سر توڑ جدوجہد کر رہے تھے۔ صبح دس بجے جب لیڈراں بذریعہ ریل گاڑی گوجرانوالہ پہنچے غنڈے جناب سہروردی پر حملہ آور ہوئے جنہیں ورکروں نے گھیرے میں لے لیا تھا ایک پستول کا فائر کیا گیا جو گولی عوامی لیگ کے ورکر جرانمدین کی ران پر لگی اور وہ زخمی ہو گیا سہروردی صاحب کو بڑی مشکل سے کار میں سوار کیا گیا کار پر غنڈوں اور جماعت اسلامی کے سٹوڈنٹس اور ورکروں نے پتھراؤ کیا مگر ڈرائیور کار کو بحفاظت لے جانے میں کامیاب ہو گیا غنڈوں کی قیادت پولیس کے حوالدار گلزار شکوری فرما رہے تھے اور ان کی معاونت حافظ اسحاق کی زیر قیادت جماعت اسلامی جمعیت طلبہ کے سٹوڈنٹ اور ورکر کر رہے تھے باقی لیڈر کاروں میں بیٹھ کر خواجہ صدیق الحسن کی کوٹھی سیٹلائٹ ٹاؤن میں چلے گئے۔ نواب زادہ نصر اللہ خان غنڈوں اور جماعت اسلامی کے ورکروں میں پھنس گئے انہیں بڑی مشکل سے حفاظت کے ساتھ نکالا گیا انہیں بھی دوسرے لیڈروں کے پاس پہنچایا گیا فسادی لوگ حافظ اسحاق اور گلزار حوالدار کی قیادت میں خواجہ صدیق الحسن کی کوٹھی پر بھی پہنچ گئے کوٹھی پر پتھراؤ کیا یہیں پر شیخ مجیب الرحمان نے سہروردی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ بابا تو مجھے اجازت دے میں اس غنڈہ گردی کا جواب مشرقی پاکستان میں دوں تاکہ یہ لوگ سیدھے ہو جاویں سہروردی نے مجیب الرحمان کی بات غصہ میں ٹال دی اور منع کیا کہ ایسی بات آئندہ مت کریں۔ متحدہ اپوزیشن لیڈروں کے خلاف سارا دن یہ ہنگامہ جاری رہا کبھی خواجہ صدیق الحسن کے مکان کے آگے نعرہ بازی کی جاتی کبھی پتھراؤ کیا جاتا غنڈوں کو پولیس کی قیادت ہر وقت میسر تھی حافظ اسحاق اس وقت 1994ء میں بھی جماعت اسلامی کے

ساتھ وابستہ ہیں اور درمیان میں کئی سال وہ گوجرانوالہ جماعت اسلامی کے امیر بھی رہے۔ رات کو متحدہ اپوزیشن پارٹیز کا جلسہ شیرانوالہ باغ می ہونا تھا انتظامات مکمل تھے جلسہ شروع ہونے سے قبل ہی پنڈال پر پولیس کے غنڈوں اور جماعت اسلامی کے ورکروں نے قبضہ کر لیا ہوا تھا سامعین جلسہ گاہ کے باہر کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے جماعت اسلامی نے پورے پاکستان میں پولیس اور سرکار کے ساتھ مل کر جمہوریت پسندوں کے جلسے خراب کئے ناکام بنائے۔ لوگ جلسہ گاہ میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ جلسہ گاہ میں گئے تو پٹائی نہ ہو جائے۔ آج تک اس قدر غنڈہ گردی جلسوں کو خراب کرنے کے لئے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ پولیس کی زیر قیادت جماعت کے ورکروں اور غنڈوں نے جلسہ گاہ کو تباہ کر دیا لائیٹیں توڑ پھوڑ دیں - سہروردی اور مجیب الرحمان جلسہ گاہ میں آئے ہی نہ تھے جو لیڈر آئے تھے وہ بھی غنڈہ گردی دیکھ کر چلے گئے جو کچھ بھی جلسہ گاہ میں پنڈال میں انتظام تھا وہ درہم برہم کر دیئے گئے - توڑ پھوڑ دیئے گئے ہزاروں روپے کا نقصان کر دیا گیا تھا کئی ورکر بھی زخمی ہوئے تھے اس ہنگامہ آرائی میں حافظ اسحاق سابق امیر جماعت اسلامی گوجرانوالہ بھی زخمی ہو گئے تھے انہوں نے منتظمین جلسہ پر پولیس میں پرچہ کرا دیا اور اس پرچے میں 15 ورکر عوامی لیگ اور نیشنل عوامی کے تھے جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا اور یہ مقدمہ ڈیڑھ سال اے ڈی ایم صاحب گوجرانوالہ کی عدالت میں چلتا رہا۔

آخر جب جماعت اسلامی بھی ایوب کے خلاف ہو گئی تو حافظ اسحاق کے ساتھ صلح ہو گئی اور مقدمہ سے دست بردار ہوئے تو مقدمہ ختم ہو گیا جماعت اس وقت تک صدر ایوب کی حامی رہی جب تک خود جماعت کے جلسہ لاہور کو حکومتی غنڈوں نے درہم برہم نہیں کر دیا اس جلسہ میں جماعت کا ایک کارکن بھی قتل ہو گیا تھا۔

جنرل ایوب کے دور حکومت میں عائلی قوانین نافذ کئے گئے جن کا مطلب تھا کہ 16 سال سے کم عمر لڑکی کی شادی نہ کی جائے یتیم پوتے اور نواسے کو وراثت کا حق دار بنایا گیا نکاح رجسٹرڈ کرانا ضرور قرار دیا گیا۔ تعداد ازواج پر پابندی لگا دی گئی کوئی شخص ایک سے زائد شادی چیئرمین یونین کونسل کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتا۔ ان قوانین کی جماعت اسلامی اور دیگر مذہبی جماعتوں نے بھرپور مخالفت کی اور اس کے خلاف پوری جدوجہد بھی کی۔

جماعت اسلامی کا اجتماع

22 اکتوبر 1963 کو لاہور میں جماعت اسلامی کا اجتماع ہونا قرار پایا اور اجتماع کی تیاری بڑی دھوم دھام سے شروع کی گئی مگر حکمران بھی اس اجتماع سے غافل نہ تھے وہ حسب سابق اس اجتماع کو بھی درہم برہم کرنے کے منصوبے بنا چکے تھے۔ 21 ستمبر 1963ء کو چیف سیکرٹری حکومت پنجاب نے مودودی صاحب کو ایک خط کے ذریعے یہ باور کرایا کہ آپ نے یہ کہا ہے کہ اگر ایوبی

حکومت کسی فرشتے کو بھی آئندہ الیکشن میں کھڑا کرے گی تو ہم اس کی مخالفت کریں گے بہتر ہے کہ آپ معذرت نامہ لکھ دیں ورنہ حکومت آپ کے خلاف کارروائی کرے گی اس پر مودودی صاحب نے چیف سیکرٹری کو جواب دیا کہ ہم معذرت نامے نہیں دیا کرتے سب سے پہلے جماعت اسلامی نے جلسہ کے لئے منٹو پارک کے استعمال کی جو درخواست دی ہوئی تھی وہ مسترد کر دی گئی اس کے متبادل بھاٹی اور ٹیکسالی کے درمیان والی جگہ پر اجتماع کی اجازت دے دی گئی اجتماع کے لئے انتہائی غیر موزوں تھی۔ جماعت کے اجلاس میں ہزاروں مندوبین باہر سے آنے تھے ان کے انتظام کا مسئلہ بڑا ہی اہم تھا۔ جس کے لئی یہ جگہ ناموزوں تھی۔ لاؤڈ سپیکر اس زمانے میں اجازت لے کر لگایا جاتا تھا۔ حکومت نے جماعت اسلامی کے اس بڑے جلسے کے لئے لاؤڈ اسپیکر کی اجازت نہ دی جماعت نے فیصلہ کیا کہ لاؤڈ سپیکر کے بغیر ہی جلسہ کیا جائے۔

اجتماع سے دو روز قبل وزیر داخلہ نے ایک بیان دیا جس میں جماعت پر ملک دشمن سرگرمیوں کا الزام لگایا گیا اور جماعت نے ایک قرار داد کے ذریعے ان الزامات کا تسلی بخش جواب دیا پھر کوئی اور حکومت کے حامی لیڈروں نے جماعت کے خلاف بیان دیئے۔ حکومت نے حسب سابق جماعت اسلامی کے اس اجتماع کو تہس نہس کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا اور پیشہ ور غنڈوں کی خدمات حاصل کر لی گئیں کہ اضلاع سے غنڈے جلسہ کو خراب کرنے کے لئے لاہور پہنچ گئے اور شہر لاہور کے غنڈے بھی ان کے معاون تھے۔ 25 اکتوبر 1963ء کو صبح نو بجے اجتماع شروع ہوا پنڈال میں ہزاروں لوگ جمع تھے پنڈال کی شمالی جانب سٹیج بنا ہوا تھا جس پر لیڈران کے درمیان مودودی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ ساڑھے نو بجے مودودی صاحب نے تقریر شروع کی پنڈال میں کہیں کہیں لوگ کھڑے تھے جن میں کوئی لوگ ہنگامہ کرنے والے تھے اور کوئی لوگ ڈر کر بھاگ جانے کے لئے کھڑے تھے۔ مودودی صاحب نے پہلے سے چھپی ہوئی تقریر پڑھنا شروع کی تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر جماعت کے ورکر تقریر کے وہی الفاظ لوگوں میں اونچی آواز میں منتقل کرتے جاتے تھے یہ اس لئے تھا کہ لاؤڈ سپیکر کی اجازت نہ ہونے کی وجہ سے یہ جلسہ بغیر لاؤڈ سپیکر کے ہو رہا تھا مگر جو لوگ غنڈہ گردی کے لئے حکومت نے بھیجے تھے وہ بدستور ہنگامہ کر رہے تھے اور گولیاں چلنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں پھر مزید گولیوں کی آوازیں بھی آنے لگیں جماعت کے ایک لیڈر نے مودودی صاحب سے کہا کہ حضرت آپ بیٹھ جاویں مودودی صاحب نے کہا کہ اگر میں بیٹھ گیا تو پھر کھڑا کون رہے گا۔ مودودی صاحب کی تقریر کے بعد جلسہ منتشر ہونے لگا تو پتہ چلا کہ جماعت کا ایک کارکن اللہ بخش قتل ہو چکا ہے۔ دوران جلسہ غنڈوں نے جلسہ کو درہم برہم کرتے ہوئے آتشیں اسلحہ سے فائر کئے کناتیں کاٹ دیں سائبان گرا دیے اور غنڈے نعرے لگا رہے تھے کہ تم غدار ہو ہندوؤں کے ایجنٹ ہو اور ساتھ وہ ہڑبونگ مچا رہے تھے اس دوران ایک غنڈے سینما کے گیٹ کیپر غلام محمد کی فائرنگ سے اللہ بخش قتل ہو گیا قاتل کو پکڑ کر پولیس کے حوالہ کر دیا گیا قتل کی یہ واردات جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر اور پھر

پورے ملک میں پھیل گئی قاتل پر ڈیڑھ سال تک مقدمہ چلا سیشن کورٹ نے سزائے موت دی اپیل پر ہائی کورٹ نے ملزم کو بری کر دیا اس واقعہ کے بعد جماعت اسلامی مکمل طور پر اپوزیشن کیمپ میں چلی گئی جماعت نے حکومت کے خلاف بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا حکوت کو جماعت کی یہ جسارت اچھی نہ لگی۔ 6 جنوری 1964ء جماعت اسلامی کو خلاف قانون جماعت قرار دیا اسی روز جماعت کے دفاتروں پر پورے ملک میں چھاپے مارے گئے لٹریچر پر قبضہ کیا گیا جماعت اسلامی کے 44 سرکردہ لیڈر ملک بھر سے گرفتار کر لئے گئے جماعت کا سرمایہ بھی ضبط کر لیا گیا۔ رسالہ ترجمان القرآن پر چھ ماہ کے لئے پابندی لگا دی گئی مولانا مودودی اور ان کے بارہ مرکزی ساتھیوں کو لاہور سے گرفتار کیا گیا تھا۔

جماعت کے خلاف قانون اور لیڈران جماعت کی گرفتاریوں کو مشرقی اور مغربی پاکستان کے ہائی کورٹوں میں چیلنج کر دیا گیا مشرقی پاکستان ہائی کورٹ نے حکومتی احکامات کو خلاف قانون قرار دیا جبکہ مغربی پاکستان ہائی کورٹ نے رٹ درخواست خارج کر دی کیس سپریم کورٹ میں چلا گیا سپریم کورٹ نے حکومت کے فیصلہ کے خلاف اپنا فیصلہ سنایا جماعت پر پابندی ختم کر دی گئی اور جماعت اسلامی کے تمام لیڈر رہا کر دیئے گئے۔ جماعت اسلامی اب پوری طرح متحدہ اپوزیشن پارٹیز کے معاون بن چکی تھی ملک کی پانچ سیاسی پارٹیوں نے باہمی اعتماد کے ساتھ کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز قائم کی تھی جس کا مخفف سی او پی تھا جس میں جماعت اسلامی عوامی لیگ کونسل مسلم لیگ نیشنل عوامی پارٹی کرشک سرامک پارٹی شامل تھی سی او پی نے 1965ء کے صدارتی الیکشن میں فیلڈ مارشل ایوب خان کے مقابلہ میں محترمہ فاطمہ جناح کو صدارت کے لئے کھڑا کیا تھا یہ الیکشن عوام سے براہ راست دو ووٹ سے نہیں تھا بلکہ بیسک ڈیمو کریسی کے 80000 ہزار ووٹوں سے صدر مملکت چنا جاتا تھا اس الیکشن میں ایوب خان کامیاب ہوئے انہیں تقریباً 52000 ووٹ ملے جبکہ محترمہ فاطمہ جناح کو اٹھائیس ہزار ووٹ ملے ایوب خان کے صدر منتخب ہونے پر کونسل لیگ اور دیگر ایوب خان کے حامیوں نے بہت خوشی منائی جشن کیا۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے دو امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوئی ہے بنیادی جمہوریت ایوب خان نے جب 1962ء کا آئین لوگوں کے سامنے پیش کیا تو اس میں اپنی حاکمیت کے تحفظ کے لئے بنیادی جمہوریت کا نظام نافذ کیا گیا پورے ملک میں تقریباً ایک ہزار کی آبادی کا ایک حلقہ بنایا گیا اس قسم کے پورے ملک میں اسی ہزار حلقے بنائے گئے اس ایک حلقے سے منتخب ہونے والے ممبر کو بی ڈی ممبر کہا جاتا تھا انہیں ممبروں کا ایک چھوٹا گروپ جس میں تقریباً دس ممبر ہوتے تھے وہ یونین کونسل ہوتی تھی وہ گاؤں کے چھوٹے جھگڑوں کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ نکاح طلاق کے جھگڑوں اور ایک ہزار تک کے لین دین کے مقدمات کے فیصلے بھی کیا کرتے تھے۔ جو شہروں میں یونین ہوتی تھی اسے یونین کمیٹی کہتے تھے یہی بی ڈی ممبر صوبائی اسمبلی کے ممبران کا انتخاب بھی کرتے تھے اور یہی ممبر صدر مملکت کا انتخاب بھی کیا کرتے تھے۔ ایوب خان نے یہ

نظام اس لئے رائج کیا تھا کہ ووٹ بہت کم ہوتے تھے حاکم وقت پولیس کے ذریعے ووٹروں پر دباؤ ڈال کر ووٹ حاصل کر سکتا تھا اور ایوب خان نے دونوں دفعہ پولیس کے ذریعے دھونس کے ذریعے لالچ کے ذریعے ووٹ حاصل کئے تھے۔ ایوب خان نے جب 1962ء کا آئین دیا تو اس میں سیاسی پارٹیوں پر سے پابندی اٹھا لی گئی تھی اسے اپنے لئے بھی ایک سیاسی پارٹی کی ضرورت تھی مسلم لیگ پر اس کی نظر انتخاب پڑی مسلم لیگ کے چند بڑے لیڈروں جن میں سردار بہادر خان ممتاز دولتانہ خان قیوم خان اور دیگر چند ایک لیڈر بھی شامل تھے انہوں نے مسلم لیگ پر قبضہ کرنے کی صدر ایوب کو اجازت نہ دی چنانچہ صدر ایوب اور ان کے سیاسی حواریوں نے چند مسلم لیگی اور دیگر لوگوں کا کنونشن بلا کر اپنی مسلم لیگ کا اعلان کر دیا اس صدر ایوب والی مسلم لیگ کو کنونشن مسلم لیگ کہتے ہیں صدر ایوب کے دور حکومت میں ایوب کی مسلم لیگ کنونشن مسلم لیگ ہی ہمیشہ بر سر اقتدار رہی تھی۔

6 ستمبر 1965ء میں جب پاک بھارت جنگ شروع ہوئی

تو مولانا مودودی نے قومی یکجہتی قائم رکھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اپنی خدمات حکومت پاکستان کو پیش کیں اور انہوں نے دو ماہ میں ریڈیو پاکستان سے چار مرتبہ قوم کو خطاب کیا اور لوگوں کو ثابت قدم رہنے اور جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی اپیل کی اور مودودی صاحب کی یہ تقریر ریڈیو پاکستان نے کئی مرتبہ براڈ کاسٹ کی جنگ بندی پر جب صدر پاکستان ایوب خان تیار ہو گیا تھا تو مودودی صاحب نے ایواب خان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ جنگ بندی قبول نہ کریں۔ مودودی صاحب نے جنگ بندی کے بعد متاثرہ علاقوں کا دورہ بھی کیا شہداء کی قبروں پر نماز پڑھی اور فوجی جوانوں کی حوصلہ افزائی کی۔

13 جنوری 1967ء کو عید الفطر تھی اس روز جمعہ تھا ایوب خان کو کسی نے کہہ دیا کہ ایک دن میں دو خطبے سربراہ مملکت پر بھاری ہوتے ہیں صدر ایوب خان نے روایت ہلال کمیٹی کو حکم دیا کہ وہ جمعرات کی عید کریں رویت ہلال والوں نے جمعرات کی عید کا اعلان کر دیا اس پر علمائے کرام نے اختلاف کیا بہت سارے علمائے دین بشمول مفتی محمد حسن نعیمی اظہر حسن زیدی مولانا احتشام الحق، مولانا غلام غوث ہزاروی اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی ان علماء حضرات نے کہا کہ چاند کے حساب سے عید جمعہ کو ہی ہوتی ہے جمعرات کا اعلان حکومت کا غلط فیصلہ ہے لوگ جمعہ کو ہی عید کریں۔ اس اختلاف کے باعث پاکستان میں دو عیدیں ہو گیئں مندرجہ بالا علماء حضرات کو حکومت کے اعلان کردہ عید کے تہوار کے خلاف لوگوں کو ورغلانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار شدگان نے عدالت کی طرف رجوع کیا بلا آخر حکومت نے علماء حضرات کو تقریبا دو ماہ بعد رہا کر دیا۔ 1968ء کے ابتداء میں ایوب حکومت کے خلاف لوگوں میں عام بے چینی پیدا ہو گئی تھی حزب اختلاف کی جماعتوں نے ایوب حکومت کے خلاف تحریک چلانے کے لئے اتحاد کر لیا جماعت اسلامی بھی اس اتحاد میں شامل تھی۔ 1968ء کے شروع میں ماہ جنوری میں ہی ایوب خان کی حکومت کے خلاف تحریک پوری شدت کے ساتھ چل پڑی تمام سیاسی پارٹیاں بشمول بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی کے حکومت کے خلاف برسرپیکار تھے۔ 24 جنوری کو ملک گیر ہڑتال ہوئی۔ 27 جنوری کو لاہور میں حزب اختلاف کی جماعتوں نے حکومت کے خلاف بہت بڑا جلوس نکالا۔ 5 فروری کو صدر ایوب نے حزب اختلاف کی جماعتوں کو مذاکرات کی دعوت دی۔ 14 فروری 1964ء کو ملک گیر ہڑتال ہوئی جماعت اسلامی اس تحریک میں شامل تھی ایوب حکومت نے حزب اختلاف کی جماعتوں کو مذاکرات کی دعوت دی جس کے جواب میں متحدہ اپوزیشن کی جماعتوں نے دو مطالبے کئے۔ نمبر ایک ہنگامی حالات ختم کئے جاویں نمبر دو شیخ مجیب الرحمان کو رہا کر کے

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد یحییٰ خان
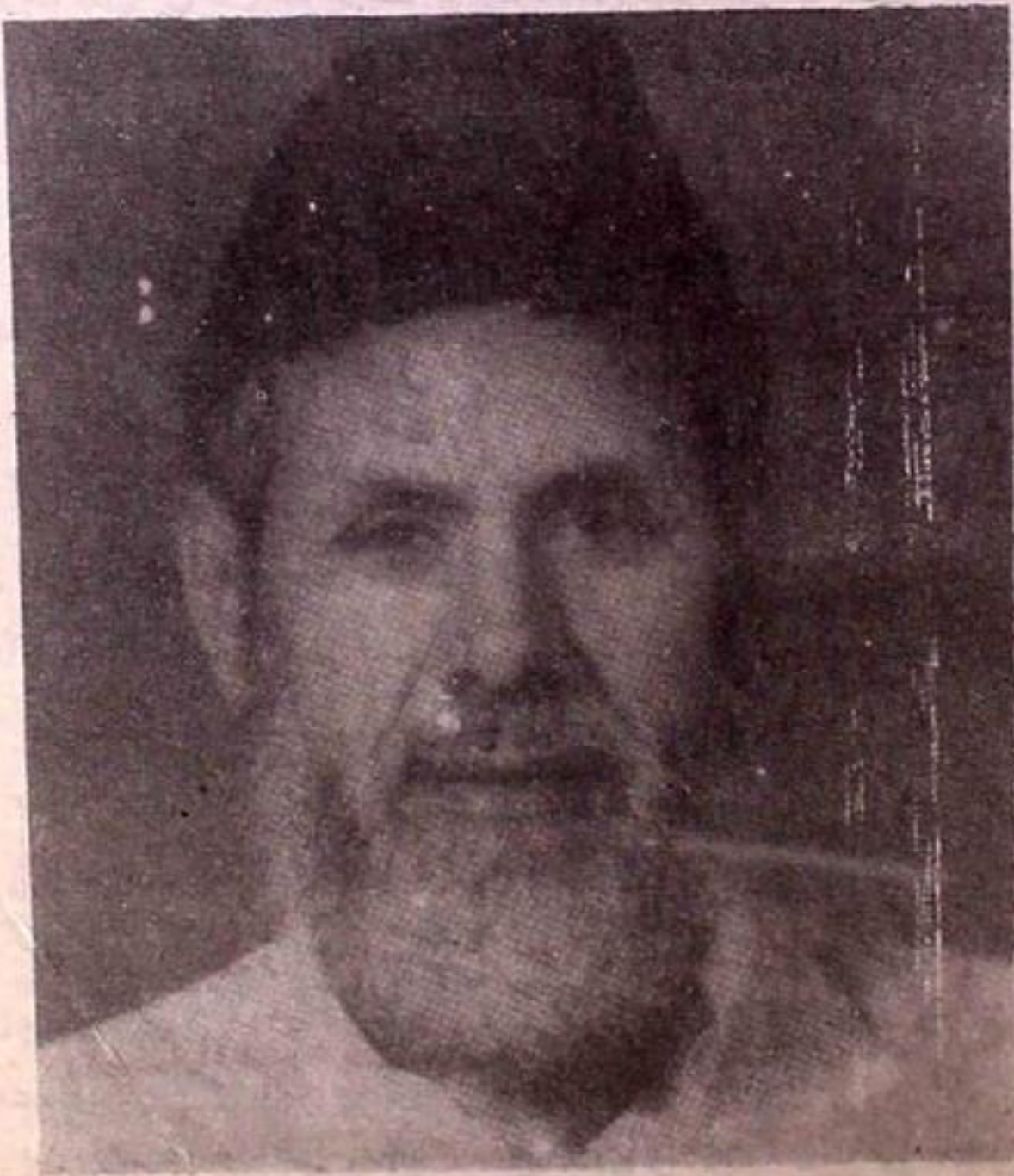
للکار ختم نبوت مولانا تاج محمود فیصل آباد

مذاکرات میں شامل کیا جائے جنہیں ایوب خان نے مان لیا۔ ہنگامی حالات ختم کر دیے گئے اور شیخ مجیب الرحمان کو رہا کر کے مذاکرات میں شامل کیا گیا۔ صدر ایوب نے 21 فروری 1964ء کو اعلان کیا وہ آئندہ صدارتی الیکشن میں کھڑے نہیں ہوں گے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی صدر ایوب کی انتظامیہ پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ گول میز مذاکرات حزب اختلاف کی جماعتوں کے لیڈران بشمول نواب زادہ نصر اللہ خان مولانا ابوالعلی مودودی چودھری محمد علی شیخ مجیب الرحمان حزب اختلاف کی جانب سے دو متفقہ مطالبات پیش کیے گئے یہ مطالبات تھے حق بالغ رائے دہی۔ وفاقی پارلیمانی نظام حکومت ایوب خان نے دو مطالبات مان لئے مگر حالات پھر بھی ٹھیک نہ ہوئے بھٹو جو مذاکرات میں شامل نہیں ہوئے تھے وہ بدستور تحریک چلا رہے تھے وہ کہتے تھے کہ ایوب خان کو فوراً صدارت سے الگ ہونا چاہیے۔ شیخ مجیب الرحمان نے کہا کہ آبادی کی بنیاد پر پارلیمنٹ میں نمائندگی ہونی چاہیے مرکز کو ٹیکس لگانے کا حق نہ ہو۔ نیول ہیڈ کوارٹر اور سپریم کورٹ ڈھاکہ مشرقی پاکستان میں ہو۔

25 مارچ 1968ء کی شام کو صدر محمد ایوب نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور اقتدار کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خان کے حوالے کر دیا۔ 1962ء کے آئین کے مطابق صدر کے مستعفی ہونے پر پارلیمنٹ کے سپیکر نے صدر بننا تھا۔ مگر صدر ایوب اپنے ہی آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فوج کے کمانڈر انچیف کے سپرد اقتدار کر کے خود اقتدار سے الگ ہو گئے۔

یحییٰ خان کا مارشل لاء اور جماعت اسلامی

25 مارچ 1964ء کو شام صدر ایوب کے استعفیٰ کے بعد یحییٰ خان صدارت کی کرسی پر جلوہ افروز ہو گئے انہوں نے قوم سے جو پہلا خطاب کیا وہ بڑا ہی بارعب تھا۔ اسی خطاب میں یحییٰ خان نے مغربی پاکستان کا ون یونٹ توڑ دینے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی مشرقی پاکستان کے ساتھ مساوی نمائندگی کا اصول ختم کر دیا ایک آدمی ایک ووٹ کے تناسب سے نئے انتخاب کرانے کا قوم کے ساتھ وعدہ کیا اور ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ سیاسی پارٹیوں نے نئے انتخابات کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جماعت اسلامی کے امیر مولانا مودودی نے یحییٰ خان سے ملاقات کر کے انہیں ون یونٹ توڑنے کے مضمرات بتائے مشرقی اور مغربی پاکستان کے مساوی نمائندگی کے اصول کے ختم کرنے کے مضمرات بتائے اور 1956ء کے آئین کی بحالی کا مطالبہ کیا مگر یحییٰ خان نے ان مشوروں پر کان نہیں دھرا۔ مولانا مودودی نے مشرقی پاکستان کا دو ہفتے کا دورہ کیا۔ اگست 1969ء ڈھاکہ یونیورسٹی میں تعلیمی پالیسی پر سیمینار ہوا وہاں اسلامی جمعیت طلبہ نے آواز بلند کی کہ یونیورسٹی میں اسلامیات اور نظریہ پاکستان کا لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جائے۔ طلبہ کے تصادم میں جماعت اسلامی کا حامی طالب علم عبدالمالک بھی مارا گیا۔

جماعت اسلامی نے ستمبر 1968ء میں پلٹن میدان ڈھاکہ میں جلسہ کرنا تھا۔ مودودی صاحب نے تقریر کرنی تھی مگر عوامی لیگ نے جلسہ کو ناکام بنا دیا خود مودودی صاحب بھی جلسہ گاہ تک نہیں پہنچ سکے اور کئی کارکن جماعت اسلامی کے زخمی بھی ہوئے۔ مگر انتظامیہ یہ جلسہ کرانے میں جماعت اسلامی کی کوئی مدد نہ کر سکی۔

مولانا بھاشانی نے 19 اپریل 1970ء کو ملک گیر ہڑتال کا نوٹس دیا ہوا تھا ہمارے گوجرانوالہ میں 18 اپریل رات کو روڑے والی مسجد میں جماعت اسلامی کا ایک اجتماع ہوا جس میں بھاشانی کی ہوئی ہڑتال کو ناکام بنانے کا پروگرام بنایا گیا تھا اجتماع سے واپسی پر راستے میں دال بازار کے چوک میں نیپ بھاشانی گروپ کا دفتر تھا ہجوم نے دفتر پر پتھراؤ کیا دفتر دوسری منزل پر تھا دفتر سے پتھراؤ کا جواب پتھراؤ سے دیا گیا ایک بوڑھا شخص محمد اسماعیل اینٹ لگنے سے ہلاک ہو گیا جس سے شہر گوجرانوالہ میں کشیدگی پھیل گئی۔ نیپ بھاشانی کے لوگ شہر میں بہت تھوڑے تھے ان پر خوف طاری ہو گیا یہ لوگ چھپ گئے نیپ کے سات ورکروں لیڈروں پر نامزد پرچہ کیا گیا اور گرفتار کر لئے گئے گرفتار شدگان کے نام غلام نبی بھلر' شیخ محمد اکرم' اسلم بٹ' عبدالرحمان تمیمی' حافظ زبیر ماسٹر عبدالغفور آغا غلام حیدر چوہان - ان پر بھٹو دور میں مقدمہ چلا سیشن کورٹ نے تمام ملزمان کو چودہ سال قید سخت کی سزا سنائی اور ہائی کورٹ نے تمام ملزم بری کر دیئے۔ یکم مئی 1970ء کو یوم مئی بڑی دھوم دھام سے منایا گیا سابقہ سالوں کے مقابلہ میں اس دفعہ یوم مئی کا جلوس زیادہ طاقت ور تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پیپلز پارٹی اس وقت کافی طاقت ور ہو چکی تھی پیپلز پارٹی نے بھی یوم مئی کے جلوسوں میں شرکت بڑی دھوم دھام سے کی۔ جماعت اسلامی نے یوم مئی کے مقابلہ میں 31 مئی کو یوم شوکت اسلام منانے کا پروگرام بنایا جو سارے پاکستان میں منایا گیا مسلم لیگ اور دیگر مذہبی سیاسی جماعتوں نے یوم شوکت اسلام میں جماعت اسلامی کے ساتھ پورا تعاون کیا اور یوم شوکت اسلام بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تمام بڑے بڑے شہروں میں جلوس نکالے گئے جھنڈے لہرائے گئے جشن منائے گئے۔ اس ساری کارروائی سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مذہب اسلام کو سوشلزم کے مدمقابل کھڑا کیا جا رہا ہے۔

1970ء کے الیکشن پورے ملک میں بڑی دھوم دھام سے منعقد ہوئے۔ بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی نے بڑی زور کے ساتھ الیکشن میں اسلامی سوشلزم کے نام پر حصہ لیا مغربی پاکستان میں الیکشن کے نتیجہ میں بھٹو کی پیپلز پارٹی کامیاب ہوئی۔ پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی کو اکثریت ملی بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کو دوسری سب جماعتوں پر فوقیت حاصل تھی جبکہ کل پاکستان یا۔ مشرقی پاکستان میں اکثریت عوامی لیگ کو حاصل ہو گئی تھی مرکزی اسمبلی کی کل 300 نشستوں میں سے عوامی لیگ کو 158 نشستیں حاصل ہوئی جبکہ پیپلز پارٹی کو 83 نشستیں حاصل ہوئی تھیں۔ نیشنل عوامی پارٹی کو سات نشستیں ملیں - جمعیت علمائے اسلام کو سات نشستیں جمعیت علمائے پاکستان کو 6 نشستیں اور جماعت اسلامی کو چار نشستیں حاصل ہوئیں تھیں - جماعت اسلامی کو تھوڑی نشستیں

ملیں مگر وہ یحییٰ خان کی مرکزی حکومت کے حامی تھے اور اس کی مشرقی پاکستان کی پالیسی کے حامی تھے جب یحییٰ خان کی مرکزی حکومت نے مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کیا تو جماعت نے مرکزی یحییٰ خان کی حکومت کی ہر طرح سے معاونت کی اور ان کی رضا کار نیم فوجی تنظیموں الشمس اور البدر نے مکمل طور پر مرکزی حکومت اور فوج کے ساتھ مل کر مشرقی پاکستان کے عوامی لیگیوں کے خلاف کارروائی کر رہے تھے اور بالآخر مشرقی پاکستان الگ ہو گیا دنیا کے نقشے پر بنگلہ دیش نامی ایک اور مملکت وجود میں آ گئی۔

بنگلہ دیش بن جانے کے بعد

سقوط ڈھاکہ کے تین دن بعد مسٹر ذوالفقار علی بھٹو جو اس وقت مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کے لیڈر تھے وہ واشنگٹن میں صدر امریکہ مسٹر نکسن اور وزیر خارجہ ولیم راجز سے ملے اور اگلے ہی روز وہ واپس اسلام آباد پہنچ گئے۔ اور پاکستان کے صدر کی حیثیت سے حلف اٹھا لیا چونکہ اس وقت مارشل لاء بھی لگا ہوا تھا اس لئے وہ پہلے سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا دیئے گئے۔ اور انہوں نے اس وقت مارشل لاء ختم نہیں کیا بلکہ سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھال لیا۔ جماعت اسلامی کے بانی اور امیر مولانا ابوالعلیٰ مودودی صاحب نے خرابی صحت کی بناء پر اکتوبر 1972ء میں جماعت اسلامی کی امارت سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا اور جماعت اسلامی نے متفقہ طور پر میاں طفیل محمد صاحب کو امیر جماعت منتخب کر لیا اور انہوں نے بحیثیت امیر جماعت اسلامی پاکستان حلف بھی اٹھایا - فروری 1973ء کو میاں طفیل محمد امیر جماعت اسلامی کو بھٹو حکومت نے گرفتار کر لیا اور ان کے ساتھ جیل میں بداخلاقی اور بدسلوکی کی گئی سپریم کورٹ نے میاں طفیل محمد کی ضمانت پر رہائی کے احکامات جاری کر دیئے میاں طفیل محمد تقریباً ایک ماہ جیل میں رہے تھے - 1973ء میں ہی جماعت اسلامی کے ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کو اپنے کلینک میں ہی قتل کر دیا گیا سابقہ عوامی لیگ کے سابقہ لیڈر خواجہ رفیق کو لاہور میں دن دھاڑے قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح اور بھی کئی لوگ انہی ایام میں سیاسی تشدد کا نشانہ بنائے گئے۔

1973ء میں ہی پاکستان میں حزب اختلاف کی جماعتوں نے متحدہ جمہوری محاذ بنا لیا جس میں پیپلز پارٹی کے علاوہ تمام جماعتیں شامل تھیں متحدہ جمہوری محاذ کے صدر نیشنل عوامی پارٹی کے ولی خان تھے جبکہ جنرل سیکرٹری جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد بنائے گئے حزب اختلاف کی تمام جماعتوں میں مکمل ہم آہنگی تھی اس وقت کی پارلیمنٹ میں بھی متحدہ حزب اختلاف تھی جس کے لیڈر جناب ولی خان تھے اس وقت پارلیمنٹ کے کل ممبران کی تعداد 140 (ایک سو چالیس) تھی جبکہ متحدہ حزب اختلاف کے ساتھ تقریباً چالیس ممبران تھے۔

نومبر 1976ء میں جماعت اسلامی نے عشرہ نفاذ شریعت منایا - 1977ء میں پاکستان کی حزب

اختلاف کی 9 جماعتوں نے پاکستان قومی اتحاد کے نام سے بھٹو حکومت کے خلاف تحریک چلائی۔ یہ تحریک تقریباً مسلسل چار ماہ تک چلتی رہی۔ جماعت اسلامی بھی اس تحریک میں شامل تھی تحریک کی وجوہات یہ تھیں کہ قومی اتحاد کی ساری جماعتوں نے مل کر 1977ء کے الیکشن میں حصہ لیا مگر الیکشن کے نتیجہ میں پھر بھٹو حکومت ہی برسراقتدار آگئی قومی اتحاد نے بھٹو حکومت پر دھاندلی کا الزام لگایا چار دن بعد ہونے والے صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن کا بائیکاٹ کیا اور حکومت کے خلاف تحریک چلا دی بلاآخر پانچ جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق بھٹو حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قابض ہوگئے۔

ضیاء الحق کی حکومت اور مودودی صاحب کی وفات

4 اور 5 جولائی 1977ء کی درمیانی رات کو اقتدار پر جنرل ضیاء الحق نے قبضہ کر لیا ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ 90 دن کے اندر ملک میں انتخابات کرانے کا اعلان کیا سیاسی جماعتوں نے الیکشن کی تیاری شروع کر دی مگر مسٹر بھٹو اور چند دیگر لیڈروں کو گرفتار کرکے مری میں پہنچا دیا گیا مگر چند روز بعد الیکشن میں حصہ لینے کے لئے گرفتار شدگان کو رہا کر دیا گیا تھوڑا عرصہ بعد حکومت نے الیکشن نامساعد حالات کا بہانہ بنا کر ملتوی کر دیئے۔ جماعت اسلامی پوری طرح حکومت کے ساتھ معاونت کرتی رہی ضیاء الحق کے کچھ ایسے اقدام بھی تھے جس کی وجہ سے علماء حضرات اور جماعت اسلامی ضیاء الحق کی حکومت کے معاون تھے۔ ان ایام میں جماعت کے امیر تو میاں طفیل محمد صاحب تھے مگر حقیقی امارت ابھی تک حضرت مولانا مودودی صاحب کے پاس ہی تھی انہیں کے عقیدت مند انہیں کے گرد عقیدت کا گھیرا بنائے رکھتے تھے ضیاء الحق کی حکومت میں جماعت اسلامی کو کافی احترام ملا۔ ضیاء الحق نے معاونت کے لئے جو کابینہ بنائی تھی اس میں پیپلز پارٹی اور نیشنل ڈیموکریٹ پارٹی کے علاوہ تمام پارٹیوں کے نمائندے شامل تھے۔ 27 مئی 1979ء کو مولانا ابو العلی مودودی صاحب بغرض علاج امریکہ روانہ ہو گئے تیمار داری کے لئے ان کے ساتھ ان کی اہلیہ اور ان کا بیٹا بھی ساتھ تھے۔ 2 اگست 1979ء تک انکی اچھی صحت کی خبریں ملتی رہیں مگر بعد میں ان کی صحت کی مشکوک خبریں آنے لگیں۔ 22 ستمبر 1979ء کو حضرت مولانا ابو العلی مودودی اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ ان کی میت کو پاکستان میں لایا گیا اور پورے عقیدت اور احترام کے ساتھ انہیں جماعت اسلامی کے مرکز منصورہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

ضیاء الحق افغانستان جماعت اسلامی

پاکستان کے سیاسی انقلاب کے تھوڑا عرصہ بعد افغانستان میں فوجی انقلاب آ گیا۔ داؤد خان کی صدارتی حکومت کو ایک فوجی انقلاب کے ذریعے ختم کر دیا گیا پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی نے اقتدار پر قبضہ کر لیا - سربراہ مملکت پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کے صدر نور محمد ترکئی بنا دیئے گئے۔ اس انقلاب کو اقوام یورپ نے اقوام عرب نے اچھا نہیں سمجھا اس لئے کہ اس انقلاب کے پس پردہ سویت یونین کی حمایت تھی۔ امریکہ کو فکر ہوا ہر قیمت پر انقلاب افغانستان کو ناکام بنانے کا پروگرام بذریعہ پاکستان بنایا گیا اور افغانستان میں مسلمہ مداخلت شروع کر دی گئی بدامنی کی وجہ سے لوگوں نے افغانستان سے بھاگنا شروع کر دیا کچھ وہ لوگ جو داؤد حکومت میں صاحب عزت تھے کچھ وہ لوگ جن کے پاس مال دولت تھی انقلاب کے وقت ہی بھاگ کر پاکستان آ گئے تھے مگر بعد میں لوگ بدامنی کی وجہ سے افغانستان سے نقل مکانی کر کے پاکستان آنا شروع ہو گئے مہاجرین کی تعداد بڑھتے بڑھتے لاکھوں تک پہنچ گئی۔ اور حکومت پاکستان نے ان مہاجرین کے لئے کیمپ بھی بنا دیئے جن میں رہائشی مکانات بھی دیئے گئے۔ اور ساتھ ان لوگوں کے لئے گزارہ الاؤنس بھی مقرر کیا گیا اور ساتھ ہی پاکستان میں ان کے لئے ہر قسم کی سہولیات بھی مقرر کی گئیں اس لئے افغانستان سے نقل مکانی کرنے والے لوگوں کو ہجرت میں بھی کشش نظر آئی اور زیادہ سے زیادہ لوگ پاکستان کی طرف ہجرت کرنے لگ گئے مہاجرین کی تعداد کئی لاکھ تک ہو گئی۔

چونکہ بانیان انقلاب مارکسزم کے حامی تھے اس لئے امریکہ اور اقوام یورپ جو مارکسزم کے خلاف تھے اور ساتھ ہی عرب ممالک نے بھی مہاجرین کی دیکھ بھال کے لئے پاکستان کی بھرپور امداد کی۔ پاکستان میں جماعت اسلامی عقیدتا سوشلسٹ نظریات کے خلاف تھی اور ساتھ ہی یہ بہت منظم جماعت تھی سب سے پہلے جماعت اسلامی ہی پاکستان کی سیاسی جماعت تھی جس نے اس مسئلہ پر ضیاء الحق کی حمایت کی اور افغانستان میں مداخلت کے لئے کمربستہ ہو گئی۔ جماعت اسلامی والے اس وقت پاکستان کے شہروں اور قصبات میں کیمپ لگاتے جس میں لوڈ سپیکر کے ذریعے لوگوں کو بتایا جاتا تھا کہ افغانستان میں کیمونسٹ حکومت عوام پر ظلم کر رہی ہے اور عوام بھاگ کر پاکستان آ رہے ہیں ان کی امداد کی جائے افغانستان میں مداخلت کا دیگر گروپوں سے الگ جماعت کا ایک گروپ تھا جس کی قیادت جماعت اسلامی کے معتمد خاص جناب حکمت یار کے ہاتھ میں تھی ان کے تمام فتوحات اور قبضہ جات دوسرے سے الگ تھا اور ضیاء الحق کی حکومت کا تعاون بھی بطور خاص انہیں حاصل تھا۔ بیرون ملک جو امداد افغانستان حکومت کے خلاف جنگ کے لئے آتی تھی اس میں سب سے زیادہ حصہ بھی جماعت اسلامی کے گروپ کو ہی حاصل ہوتا تھا افغانستان کی جنگ تیرا سال تک رہی اور آج بھی خانہ جنگی موجود ہے۔ جماعت اسلامی اس میں پوری طرح متحرک تھی اور آج بھی ہے جماعت کے متحرک لیڈروں نے اس جنگ میں کروڑوں

ڈالر بھی حاصل کئے اور سیاسی فائدے بھی حاصل کئے پاکستان کے اندر اس دوران جماعت اسلامی کا یہ کام تھا کہ تقریبا 18 سال کے نوجوانون کو جہاد افغانستان کے لئے بھرتی کیا جاتا انہیں گوریلا جنگ کی تربیت دی جاتی اور پھر انہیں جنگ کے لئے

افغانستان کی بھٹی میں جھونک دیا جاتا ۔ ہمارے گوجرانوالہ کے سینکڑوں ہزاروں نوجوانوں کو اس مقصد کے لئے جہاد اور شہادت کے حسین تصور میں مبتلا کر کے افغانستان بھیجا گیا اور سینکڑوں نوجوان گوجرانوالہ کے بھی اس جنگ میں لقمہ اجل بنےاور دوران افغانستان میں ترکئی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا ۔ حفیظ اللہ امین اقتدار میں آ گئے۔ پیپلز ڈیموکریٹ پارٹی بھی دو حصوں میں پرچم پارٹی اور خلق پارٹی میں تقسیم ہو گئی ۔ حفیظ اللہ امین خلق پارٹی کے تھے تھوڑے عرصے کے بعد پھر انقلاب آگیا حفیظ اللہ امین کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا ببرک کارمل برسراقتدار آ گئے ان کا تعلق پرچم پارٹی سے تھا اور ساتھ ہی سویت یونین کی فوجیں افغانستان میں داخل ہو گئیں مزید لوگ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔

اب امریکہ اقوام متحدہ یورپ اقوام عرب کی مداخلت مزید بڑھ گئی۔ زیادہ امداد دی جانے لگی پاکستان امریکہ کی نظر میں بہت ہی وقعت والا ملک بن گیا اس ساری امریکی اور دیگر امداد پر حکومت پاکستان کے ساتھ ساتھ جماعت اسلامی کے بھی کنٹرول میں تھی۔ جو لوگ گوریلا جنگ افغانستان میں لڑ رہے تھے ان میں سب سے بڑا گروہ جو حکمت یار کے زیر کنٹرول تھا وہ حقیقی معنوں میں جماعت اسلامی کی فورس بھی تھی۔ جماعت اسلامی کی بیرون ملک اور پاکستان سرحدات پر حکمت یار کے زیر کنٹرول فوج تھی اور اندرون ملک کالج یونین بھی جماعت اسلامی کی ایک بہت ہی مضبوط فوج تھی جسے ہر جگہ استعمال کیا جا سکتا تھا ان سارے حالات میں جماعت اسلامی نے اندرون ملک بہت زیادہ سیاسی فوائد حاصل کئے ۔ ضیاء الحق کی حکومت میں ان کے وزیر بھی لئے گئے جماعت کے ان وزراء پر ضیاء الحق حکومت کو بہت بڑا اعتماد تھا۔ جماعت کے نوجوانوں کو حکومتی عہدوں پر اچھی ملازمتیں ملیں کالجوں کی یونین میں جماعتی کارکنوں کو بہت طاقت حاصل تھی۔ انکی دھونس کالجوں کے طالب علموں پر مکمل کنٹرول رکھتی تھی۔ جماعت اسلامی کے وزراء پروفیسر غفور احمد' پروفیسر خورشید اور دیگر ذمہ دار لوگوں پر پولیس اور سرکاری حفاظت کے علاوہ جماعت کے کارکنوں بھی متعین ہوتے تھے وہ بھی ان وزراء کی کوٹھیوں پر حفاظتی ڈیوٹی دیا کرتے تھے ۔ ضیاء الحق کے اقتدار سے قبل بھی پاکستان کی درس گاہوں پر جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ کو کنٹرول حاصل تھا۔ وہ تقریبا ہر کالج اور یونیورسٹی پر دھونس کی اجارہ داری رکھتے تھے ۔ ضیاء الحق کے وقت درس گاہوں پر اسلامی جمعیت طلبہ کا مکمل کنٹرول تھا۔ اور ان درس گاہوں کے طالب علم جماعت کی مسلح فورس کی حیثیت رکھتے تھے درس گاہوں سے الگ افغان مجاہد فورس بھی جو حکمت یار کے کنٹرول میں تھی وہ بھی جماعت اسلامی کی ہی ایک مسلح فورس تھی۔ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات میں جماعت نے بڑے زور و شور سے حصہ لیا اور

جماعت کے مرکزی پارلیمنٹ میں آٹھ ممبر کامیاب ہوئے جن میں مولانا گوہر رحمان مولانا عبدالرزاق صاحب لیاقت بلوچ صاحب حافظ سلیمان بٹ صاحب بھی شامل تھے اور جماعت اسلامی حکومت کے ساتھ پوری طرح کی معاون تھی اور انہوں نے وزارتیں بھی حاصل کیں۔

اس دوران میاں طفیل محمد صاحب جماعت اسلامی کی امارت سے الگ ہو گئے ان کی جگہ صوبہ سرحد کے قاضی حسین احمد کو امیر جماعت اسلامی بنا دیا گیا ان کی امارت میں جماعت میں کئی بنیادی تبدیلیاں کیں انہوں نے جماعت کو عوامی بنانے کی بہت کوشش کی تقدس کا جبہ ذرا ڈھیلا کیا گیا مگر جماعت کی بنیادی ساخت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ حکمرانی اور کئی کامیابیاں ملنے کے بعد جماعت کے ذمہ دار افراد اور کارکنوں میں بھی رعونت اور نشہ اقتدار آیا مگر وہ اس قدر نہ تھا کہ عام لوگ ان سے مرغوب ہوتے۔

افغانستان کی جنگ بدستور جاری تھی جماعت اس میں بھرپور حصہ لے رہی تھی جماعت اسلامی کے عقیدہ اور پروگرام میں سب سے زیادہ اولیت سوشلزم کی مخالف کو دی گئی ہے حالانکہ پارلیمانی نظام جمہوریت بھی مغرب کا ہی نظام حکومت ہے اگر امرھم شورا بینھم کی آیت پڑھ کر پارلیمانی جمہوریت کو اسلامی کیا جا سکتا تو وجعلنا لکم ما فی الارض جمیعا" کی آیت پڑھ کر یا حضور کے وقت مال غنیمت صحابہ میں مساوی تقسیم ہوتا تھا کی دلیل سے سوشلزم کو بھی اسلامی کیا جا سکتا تھا۔ مگر ایسا نہیں کیا سوشلزم کے خلاف جماعت نے پورا محاذ بنایا اور اسی کو شاید اسلام کا بنیادی ستون سمجھ لیا گیا سوشلزم نظام معشیت میں ریاست کو مالی نقصانات تھے سٹیٹ مالی اعتبار سے دیوالیہ ہو جاتی تھی اسی وجہ سے سویت یونین نے نظام معیشت تبدیل کر دیا اور یورپ کے نظام معیشت کو ہی روس میں اپنا لیا گیا۔ افغانستان کی جنگ میں بھی سویت یونین کی معیشت کو نقصان ہوا تھا۔ اس لئے سویت یونین نے نظام سیاست اور نظام معیشت ہی تبدیل کر دیا۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی اقوام یورپ امریکہ اور دیگر غیر سوشلسٹ ملکوں کے ساتھ تعلقات بھی دوستانہ بنا لئے۔ دنیا سے سرد جنگ کا خاتمہ کر دیا گیا ایسی صورت حال کے پیش نظر امریکہ کی جنگی حکمت عملی بھی تبدیل ہو گئی اور جو گھیرا امریکہ نے سویت یونین کے خلاف بنایا ہوا تھا وہ توڑ دیا گیا اب امریکہ اور اقوام یورپ کو سوشلزم کے خلاف مسلمان ملکوں میں مخصوص ذہن رکھنے ولای مولویوں کی ضرورت نہ تھی۔ سویت یونین نے جب سوشلزم کو چھوڑ دیا تو اس کی مخالفت کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اس لئے ان لوگوں کو جو سوشلزم کے مبلغ تھے یا وہ لوگ جو سوشلزم کے خلاف کام کرتے تھے دونوں کی ضرورت ہی ختم ہو گئی اب جماعت اسلامی کے سامنے ولن ہی ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے جماعت کے سامنے کوئی نشانہ ہی نہیں اور اس کی اہمیت بہت ہی کم ہو گئی ہے امریکہ اور اقوام یورپ نے مشرقی یورپ کے ساتھ اقوام عرب نے اسرائیل کے ساتھ مل جل کر رہنے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے اس لئے اب جماعت اسلامی جیسی جماعتوں کی اہمیت مغربی ملکوں میں بہت کم ہو گئی ہے۔
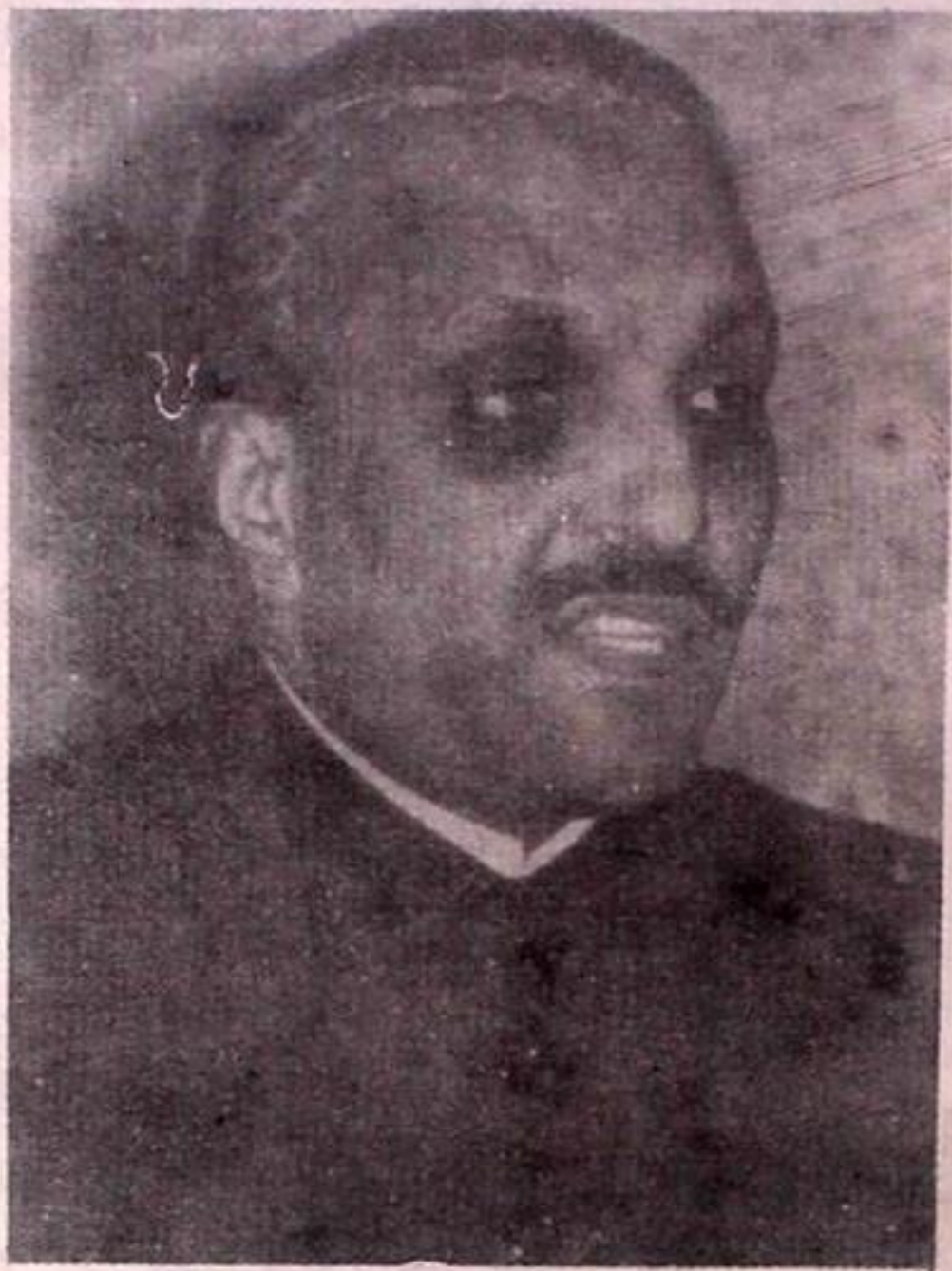
چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق

افغانستان کی اس جنگ میں جو 1978ء سے شروع ہو کر 1990ء میں ختم ہوئی اس میں لاکھوں لوگ لقمہ اجل ہوئے ان میں سو فیصد مسلمان مارے گئے کوئی غیر مسلم نہیں مرا۔ افغانستان کے لوگ مسلمان تھے جن کی حکومت میں مداخلت جن کے ملک میں مداخلت پاکستان سے کی جاتی تھی یہ سب مسلمان تھے۔ پاکستان سے جو لوگ مسلح مداخلت کرتے تھے وہ بھی مسلمان تھے۔ سویت یونین سے جو فوجیں افغانستان میں داخل ہوتی تھیں وہ بھی مسلمان تھیں وہ تمام فوجیں تاجکستان ازبکستان، ترکمانستان کے مسلمانوں پر مشتمل تھیں۔ اسی وجہ سے اس جنگ میں سو فیصد مسلمان ہی مرے ہیں مگر فائدہ امریکہ اور اقوام یورپ کو ہوا جن کا سیاسی دشمن سویت یونین مارا گیا۔ اور آج جماعت اسلامی اور وہ طاقتیں جو سویت یونین کے خلاف برسر جنگ تھیں وہ برملا یہ کہتی ہیں کہ سویت یونین کا ٹوٹ جانا بہت بڑا المیہ ہوا ہے۔ کہ اب دنیا میں صرف ایک طاقت کی حکمرانی ہو گئی ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر میں امریکہ جو چاہے وہی ہوتا ہے امریکہ کو دنیا میں کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔

جماعت اسلامی اور اسلامی جمہوری اتحاد

1988ء میں جماعت اسلامی بھی مسلم لیگ کے ساتھ اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل ہو گئی اسلامی جمہوری اتحاد کو اس الیکشن میں شکست ہوئی مگر جماعت اسلامی کے کچھ لوگ ممبر بن گئے جن میں لیاقت بلوچ، مولانا گوہر رحمان اور جناب فتح اللہ صاحب بھی شامل تھے مگر جماعت کا اصل کام افغانستان جنگ بدستور جاری رہی۔ اس 1988ء کے الیکشن میں ضیاء الحق فوت ہو چکے تھے اور پیپلز پارٹی نے کامیابی حاصل کی تھی اور بے نظیر بھٹو ملک کی وزیر اعظم بنی تھی۔ جماعت اسلامی جمہوری اتحاد کے ساتھ حزب اختلاف کے بنچوں میں بیٹھی رہی۔ 1990ء کے الیکشن میں جماعت اسلامی کو الیکشن میں اچھی خاصی کامیابی ہوئی اس وقت کی اسمبلی میں جماعت کو آٹھ نشستیں ملی تھیں مرکزی اسمبلی کے ممبران میں صاحب زادہ فتح اللہ انوار الحق صاحب، میاں عثمان صاحب، لیاقت بلوچ صاحب بھی شامل تھے پاکستان میں اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت بنی حکومت کے سربراہ جناب نواز شریف تھے جماعت اسلامی کے ممبران حکومت کے معاون تھے مگر وزیر نہیں بنے تھے۔

1993ء کے الیکشن میں جماعت اسلامی نے مسلم لیگ سے الگ ہو کر اپنے نشان پر اپنے جھنڈے پر الیکشن لڑا تھا۔ جس میں انہیں کامیابی بہت کم ہوئی قومی اسمبلی میں انہیں صرف تین نشستیں حاصل ہوئی انہیں دو کراچی سے ملیں تھیں جہاں ایم کیو ایم نے بائی کاٹ کیا ہوا تھا۔ اس

ایس ایم ظفر، پیر پگارا - نوابزادہ نصراللہ خاں

وجہ سے جماعت اسلامی کو کراچی سے یہ دو نشستیں مل گئیں یہاں پر مہاجرین نے بہت کم ووٹ
کاسٹ کئے تھے اور بہت کم ووٹوں سے جماعت کے یہ ممبر کراچی سے کامیاب ہوئے ہیں اس
وقت جماعت اسلامی پارلیمنٹ میں تین نشستیں ہیں۔ اور صوبہ سرحد میں دو نشستیں مرکزی
پارلیمنٹ میں جماعت اسلامی الگ اپوزیشن بنچوں پر ہے جبکہ سرحد اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے
حکومت کے ساتھ ہے جماعت اسلامی کی اس وقت عوام میں پوزیشن سابقہ وقت سے کم ہے اور
جماعت کے کارکنوں میں وہ جوش خروش پہلے والا نہیں ہے۔

مورخہ 9-4-94 کو قاضی حسین احمد نے کہا کہ پاکستان میں جو بھی تبدیلی آتی ہے اس میں فوج کا
عمل دخل ہوتا ہے۔ 1990ء بے نظیر کی حکومت بھی فوج نے ختم کی تھی۔ 93ء میں نواز شریف
کی حکومت بھی فوج نے ختم کی تھی۔ معین قریشی بھی فوج کی مرضی سے ہی آیا تھا کوئی حکومت
فوج کی مرضی کے خلاف برسراقتدار رہ ہی نہیں سکتی اگر کشمیر ہاتھ سے نکل گیا تو اس کی ذمہ
داری بھی فوج پر ہی ہوگی۔ حصول کشمیر کے لئے فوج کو کشمیر پر حملہ کر دینا چاہئے۔ اگر فوج نے
جنگ نہیں کرنی تو پھر فوج کی ضرورت کیا ہے اور سارا بجٹ فوج ہی کھا جاتی ہے۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید

مولانا داود غزنوی

جمعیت اہلحدیث

جمعیت اہلحدیث بنیادی طور پر ایک مذہبی جماعت ہے اور اہلحدیث الگ فرقہ بھی ہے عام اہلسنت مسلمانوں میں اور اہلحدیث میں بہت تھوڑا اختلاف ہے' اہلحدیث فقہ کو نہیں مانتے وہ امام ابو حنیفہ امام شافعی امام مالک امام احمد ابو حنبل کسی کی بھی تقلید نہیں کرتے وہ قرآن اور حدیث کا بغیر کسی درمیانی رابطہ کے ڈائریکٹ استفادہ کرتے ہیں اور اسی پر عمل پیرا ہوتے ہیں ان کے نزدیک کمزور سے کمزور حدیث قیاس سے بہتر ہے وہ کسی بھی فقہ کو نہیں مانتے یہ ایک مذہبی جماعت ہے انگریز کے دور حکومت میں جنگ آزادی کی سیاسی تحریکوں میں اہلحدیث علماء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا جن میں حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی' حضرت مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ' حضرت مولانا عبدالقادر قصور رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر بہت سارے علماء حضرات نے وطن کی آزادی کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ پھر تحریک پاکستان میں بھی حضرت مولانا ابراہیم صاحب میر سیالکوٹ نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر بھی جدوجہد کی اور دیگر علماء حضرات جو کسی سیاسی تحریک میں شامل تو نہ تھے مگر ان کا احترام اہلحدیث عقائد رکھنے والوں میں بہت تھا جن میں حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی صاحب بھی شامل تھے۔

پاکستان بن جانے کے بعد انہی لوگوں نے یا انہی علمائے اہلحدیث کے پس ماندگان نے 1955ء میں جمعیت اہلحدیث قائم کی جس کے پہلے صدر حضرت مولانا داؤد غزنوی صاحب بنائے گئے تھے اس وقت تک یہ جماعت صرف تبلیغ دین تک ہی محدود تھی۔ جماعت کے اکابرین قبل ازیں جب یہ انفرادی طور پر سیاست میں حصہ لیتے تھے تب سیاسی جماعتوں کے پلیٹ فارموں سے وہ سیاست میں حصہ لیتے رہے تھے اور اسمبلیوں کے ممبران بھی بنتے رہے تھے حضرت مولانا داؤد غزنوی کانگرس کے ٹکٹ پر 1945ء میں لیبر کی مخلوط سیٹ سے پنجاب اسمبلی کے ممبر بنے تھے اور بعد میں 1950ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہوئے تھے مگر جمعیت اہلحدیث کے پلیٹ فارم سے ابھی تک سیاست نہیں کی گئی تھی۔ مولانا داؤد غزنوی کے انتقال کے بعد حضرت مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ جمعیت اہلحدیث کے صدر بنے - 1968ء میں جب حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب فوت ہو گئے تو جمعیت اہلحدیث کے صدر حافظ محمد گوندلوی صاحب بنائے گئے تھے - جمعیت اہلحدیث 1970ء تک صرف مذہبی جماعت تھی سیاست کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ پہلی بار جمعیت اہلحدیث نے بطور سیاسی جماعت سیاست میں حصہ لیا اور 1970ء کے انتخابات میں اپنے امیدوار کھڑے کیے مگر صرف جمعیت اہلحدیث کو قومی اسمبلی کی ایک سیٹ قصور سے ملی اور ملک محمد علی قصوری پاکستانی پارلیمنٹ کے ممبر بن گئے۔

قبل ازیں 1964ء میں جمعیت اہلحدیث کی ایک کانفرنس ہوئی تھی جس کی صدارت مغربی پاکستان کے وزیر تعلیم جناب یاسین وٹو صاحب نے کی تھی۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ نے سیاست پر تقریر فرمائی تھی وزیر تعلیم یاسین وٹو صاحب ان کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

1977ء کے الیکشن میں جمعیت اہلحدیث کے ٹکٹ پر حضرت مولانا معین الدین لکھنوی قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ 1982ء میں جمعیت اہلحدیث دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی ایک جمعیت اہلحدیث تھی جبکہ دوسری جمعیت اہلحدیث مرکزی کے نام سے موسوم ہونے لگ گئی۔ جو مرکزی جمعیت اہلحدیث تھی اس کے صدر جناب حضرت مولانا معین الدین لکھنوی تھے اور سیکرٹری جنرل جناب فضل حق بنائے گئے تھے جبکہ جمعیت اہلحدیث کے صدر حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب گوجرانوالہ سیکرٹری جنرل علامہ احسان الٰہی ظہیر بنائے گئے تھے۔

1985ء کے غیر جماعتی انتخابات میں حضرت مولانا معین الدین لکھنوی قومی اسمبلی کے ممبر بنے۔ 1988ء کے جماعتی انتخابات میں بھی قومی اسمبلی کے ممبر حضرت معین الدین لکھنوی صاحب بنے۔ 1990ء میں پھر جمعیت اہلحدیث کے دونوں گروپوں کا ادغام ہو گیا۔ متحدہ جمعیت اہلحدیث نام رکھا گیا۔ اور دو صدر اور دو ہی جنرل سیکرٹری بنائے گئے۔ مولوی عبداللہ صاحب اور یحییٰ میر محمدی صاحب دو صدر بنے اور دو جنرل سیکرٹری جناب فضل الحق صاحب اور پروفیسر ساجد میر صاحب بن گئے۔ 1988ء میں بھی حضرت معین الدین لکھنوی قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے تھے۔ 1993ء کے انتخابات میں جمعیت کے ٹکٹ پر عبدالرزاق صاحب پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے جو اس وقت 1994ء میں بھی ممبر ہیں اور جمعیت کی تمام سیاست نواز شریف کے ساتھ کولیشن سیاست ہے اس کولیشن کی بدولت اس وقت پروفیسر ساجد میر صاحب پاکستان سینٹ کے رکن بھی ہیں جمعیت اہلحدیث مذہبی جماعت ہونے کے ساتھ سیاسی جماعت بھی ہے۔ منشور میں قرآن و سنت کی حکمرانی سرفہرست ہے۔ اس وقت جمعیت اہلحدیث کے راہنماؤں میں حضرت مولانا عبداللہ صاحب گوجرانوالہ حضرت مولانا معین الدین لکھنوی صاحب پروفیسر ساجد میر صاحب ہیں۔

کنونشن مسلم لیگ

1958ء پاکستان میں فوجی انقلاب اور مارشل لاء لگ جانے کے بعد ملک میں مکمل طور پر سیاسی پابندی لگا دی گئی تمام سیاسی جماعتیں خلاف قانون قرار دی گئیں۔ دہشت ناک فضاء قائم کر دی گئی لوگوں کو ایسا محسوس ہونے لگ گیا تھا کہ شاید واقعی ملک میں مکمل فکری انقلاب آ گیا ہے فوجی عدالتیں قائم کر دی گئیں۔ بازاروں مارکیٹوں پر ایسے احکامات نافذ کئے گئے کہ

کاروباری طبقہ خوف زدہ ہو گیا۔ راقم الحروف اس وقت صابن گھر میں ہی بنا کر فروخت کیا کرتا تھا۔ ایک ملازم ساتھ رکھا ہوا تھا فوری طور پر ڈی سی آفس سے احکامات نافذ ہو گئے کہ صابن 12 آنے سیر فروخت کیا جائے وہ صابن اگر تیار کیا جائے تو ایک روپیہ سیر سے زیادہ لاگت آتی تھی اب حکم ہے کہ 12 آنے سیر فروخت کیا جائے۔ سرکار کے مقررہ کردہ نرخ پر فروخت کرنے سے نقصان ہوتا تھا مگر حکم حاکم مرگ مفاجات والہ معاملہ تھا کچھ مال فروخت کیا کچھ روک لیا کہ شاید کوئی بہتر صورت نکل آوے۔ ریٹ مقرر کرنے کا کام ڈی ایف سی کے دفتر یا ڈی سی آفس کے ملازمین کرتے تھے جو ان کے جی میں آیا وہ لکھ دیا کہ اس ریٹ پر فروخت کریں اور ریٹ لسٹ دکان پر آویزاں کریں - راقم الحروف کے پاس کچھ صابن پڑا ہوا تھا کہ حالات ٹھیک ہو جاویں تو فروخت کریں اور نقصان سے بچ جاویں مگر کسی شاکی نے شکایت کر دی کہ صابن کا سٹاک پڑا ہوا ہے مگر فروخت نہیں کرتا۔ جب مجھے صورت حال کا علم ہوا تو میں نے فوری طور پر جو صابن پڑا ہوا تھا فروخت کر دیا اور مکمل طور پر بے فکر ہو گیا کئی دکانداروں کو گراں فروشی کے الزام میں گرفتار کیا گیا قید کی سزا سنائی گئی ایک نوجوان محمد بشیر کو گڑ چھ آنے سیر فروخت کرنے پر گرفتار کر کے چھ ماہ قید کی سزا سنائی گئی پھر بذریعہ لوڈ سپیکر سارے شہر میں اس سزا کی تشہیر کی گئی مذکور محمد بشیر جب چھ ماہ قید کی سزا بھگت کر جیل سے واپس آیا تو گڑ بارہ آنے سیر فروخت ہو رہا تھا کئی بڑے بڑے لوگوں کو گرفتار کیا گیا قید کئے گئے۔ تاکہ لوگ دہشت زدہ ہو جاویں۔ ہمارے گوجرانوالہ میں صدر بلدیہ حاجی محمد ابراہیم کو گرفتار کیا گیا اور ان پر کئی الزام لگائے گئے تقریباً ایک سال بعد رہا کر دیئے گئے ان ایام میں اگر کسی شخص کے پاس کوئی ناجائز تجارتی سامان پڑا ہوا تھا مارے خوف کے وہ ضائع کر دیا گیا تھا ان سارے حالات میں تاجروں کو صنعت کاروں کو سیاست دانوں کو ہراساں کیا گیا تھا مگر رشوت خور افسراں کو کچھ نہیں کہا گیا تھا بلکہ راشی افسران کی چاندی ہو گئی تھی وہ پہلے اگر ایک روپیہ رشوت لیتے تھے تو مارشل لاء میں دس گناہ زیادہ رشوت لینے لگ گئے - حکومت کا سارا کام یہی راشی افسران ہی کرتے تھے انہی کے ذریعے لوگوں کو دبایا جاتا تھا خوف زدہ کیا جاتا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد ہی حکومت کو اپنی پالیسی تبدیل کرنی پڑ گئی اس لئے کہ جن دکانداروں کے پاس مال تھا انہوں نے وہ فروخت کر دیا مگر آئندہ وہ مال نہیں لائے کارخانے بند ہو گئے جس ریٹ پر کوئی چیز حکومت فروخت کرنا چاہتی تھی دکاندار کو اسی وارے کا مال کہیں سے ملتا ہی نہیں تھا - چھوٹے کارخانے بھی حکومت احکامات کے ہوتے ہوئے چل نہیں سکتے تھے اور پھر حکومت نے پالیسی نرم کی لوگوں کو ترغیب دی جانے لگی کی وہ بلا جھجک کام کریں حکومت انہیں ہراساں نہیں کرے گی اور بلا آخر کاروبار زندگی آہستہ آہستہ معمول پر آگئی اور مقامی سیاسی لوگوں کو بھی اگر کسی کو گرفتار کیا ہوا تھا چھوڑ دیا گیا - اور ملک میں نیا جمہوری نظام رائج کیا گیا جس کا نام تھا بنیادی جمہوریت کا نظام اور جو سیاسی لوگ مقامی طور پر گرفتار کئے گئے تھے ان میں سے اکثر لوگ بعد میں حکومتی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اکتوبر

1958ء میں فوجی حکومت قائم ہوئی۔ 1960ء کے آخر میں بنیادی جمہوریتوں کے غیر جماعتی الیکشن کرائے گئے - بنیادی جمہوریت کا ایک حلقہ تقریباً ایک ہزار نفوس پر مشتمل ہوتا تھا جس میں سے ایک ممبر چنا جاتا تھا انہی ممبران سے صدر ایوب نے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا تھا انہیں ممبران نے صوبائی اسمبلیوں کے اور مرکزی اسمبلی کے ممبران کو چنا تھا۔ اس نظام جمہوریت میں جنرل ایوب خان کو خوبی یہ نظر آئی تھی کہ کسی حلقہ انتخاب میں ووٹ چند سو سے زائد نہیں ہوتے تھے ان ووٹروں کو پولیس یا دیگر سرکاری دباؤ کے تحت حکومت پارٹی اپنے حق میں کر سکتی تھی۔ صدر جنرل ایوب نے یہ نظام جمہوریت اپنایا تھا سارے ملک میں بنیادی جمہوریت کے ممبران کی تعداد 80000 تھی انہیں اسی ہزار ووٹوں سے 1961ء میں جنرل صدر ایوب نے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا تھا انہیں یونین کمیٹیوں اور یونین کونسلوں کے چیئرمین بلدیاتی اداروں کے ممبر اور چیئرمین بنتے تھے۔ اور انہیں بنیادی جمہوریت کے ممبروں اور دیگر سیاسی لوگوں کو کونشن مسلم لیگ میں شامل کیا گیا تھا تقسیم ہند سے قبل بھی مسلم لیگ حکومت کی معاون جماعت ہی ہوتی تھی مگر پاکستان بن جانے کے بعد تو پاکستانی حکمرانوں کی جماعت مسلم لیگ بن گئی تھی اب صدر ایوب کو بھی سیاسی جماعت کی ضرورت تھی انہوں نے بھی مسلم لیگ کو ہی اپنی جماعت بنا لیا جو لیڈر مسلم لیگ پر قابض تھے انہوں نے آواز بلند کی کہ مسلم لیگ کا بااختیار ادارہ وہ کونسل ہے جو 1958ء میں تھی۔ اس لئے اس کونسل کی اجازت کے بغیر مسلم لیگ ایوب حکومت کی حمایت نہیں کر سکتی اس کونسل کے ممبران میں چوٹی کے مسلم لیگی لیڈران شامل تھے جن میں سردار بہادر خان' میاں ممتاز محمد خان دولتانہ' خان عبدالقیوم خان' خواجہ ناظم الدین' جناب نور الامین چودھری محمد علی۔ اور دیگر سرکردہ لیڈر بھی شامل تھے ان لوگوں نے کونسل پر جنرل ایوب کا قبضہ نہیں ہونے دیا مگر جنرل صدر ایوب خان کا بغیر کسی سیاسی جماعت کے کام نہیں چل سکتا تھا انہیں اسمبلیوں کے ممبران کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے دیگر سیاسی احکامات لوگوں تک پہنچانے کے لئے عوام سے رابطہ قائم رکھنے کے لئے سیاسی جماعت کی اشد ضرورت تھی اس آڑے وقت میں ان کے کام چودھری خلیق الزمان آئے - چودھری خلیق الزمان صاحب کے مشورہ سے ہی مسلم لیگ کونشن بلایا گیا جس میں اکثریت مسلم لیگیوں کی شامل ہوئی اور ملک میں ہر سطح پر اقتدار پرست لوگوں نے کونشن لیگ کا ساتھ دیا اس میں شامل ہوئے اور جنرل ایوب کی حکومت کے معاون ہوئے - ملک میں اس وقت اخبارات مکمل حکومت کے کنٹرول میں تھے۔ نیشنل پریس ٹرسٹ قائم کر دیا گیا جس کے تحت بہت سارے اخبارات حکومت کے کنٹرول میں آ گئے تھے - وہی باتیں خبریں اخبارات میں آتی تھیں جو حکومت چاہتی تھی صرف ایک اخبار نوائے وقت جو مسلم لیگ کے مخصوص ذہن کا اخبار تھا وہ بھی صرف کونسل مسلم لیگ کی یا بہت تھوڑی دیگر خبریں شائع کرتا تھا ریڈیو پر اخبارات میں ہر طرف کونشن مسلم لیگ ہی نظر آتی تھی اور چودھراہٹیں بھی کونشن مسلم کے ساتھ ہی تھیں مگر عوام میں کونشن لیگ کی جڑیں نہ تھیں۔ چونکہ طریقہ انتخاب محدود تھا اس وجہ

سے انتخاب کے نتائج پر حکومت کو کنٹرول حاصل تھا مگر حکومت دنیا کو دکھانے کے لئے کچھ سیٹیں دیگر جماعتوں کو بھی دے دیتی تھی۔ 1961ء کے اسمبلیوں کے الیکشن میں مرکزی پارلیمنٹ میں اپوزیشن پارٹیوں کے تقریبا ایک تہائی ممبران کامیاب ہوئے۔ بہت سارے سرکردہ مسلم لیگی کونشن مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے ان میں جناب منظور قادر ایڈووکیٹ' شیخ خورشید احمد ایڈووکیٹ فضل قادر چودھری سابق وزیر اعظم محمد علی بوگرا عبدالمنعم خان جناب صبور خان جناب مسود صادق یہ لوگ وزارتوں پر بھی قابض ہو چکے تھے۔ مرکزی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر سردار بہادر خان تھے جو صدر ایوب کے سگے بھائی تھے۔ ان کے ساتھ دیگر اپوزیشن ممبروں کے علاوہ مفتی محمود صاحب جناب افضل چیمہ صاحب مولوی فرید احمد صاحب اور دیگر بہت سارے ممبر بھی شامل تھے سردار بہادر خان اپوزیشن لیڈر ہوتے ہوئے حکومت پر تنقید بھی کرتے تھے ان کی عمر رسیدہ ماں کو پتہ چلا کہ ایوب خان تو اس وقت ملک کا بادشاہ ہے۔ بہادر خان بادشاہی میں ایوب خان کے ساتھ جھگڑا کرتا ہے انہوں نے دونوں بھائیوں کو بلا لیا اور کہا کہ بیٹو بادشاہت پر جھگڑا نہ کرو آپس کا جھگڑا اچھا نہیں ہوتا بہتر ہے کہ دنوں بھائی بادشاہی آپس میں تقسیم کر لو ماں کی نصیحت اس زمانے کے لوگوں میں بہت مشہور ہوئی تھی۔ کونشن لیگ افسر شاہی کی زیر اثر تھی جس طرح پورے ملک پر جنرل ایوب کی حکمرانی تھی اسی طرح ہر شہر ہر ضلع قصبہ کے حکمران ہی اصل میں کونشن مسلم لیگ کو چلا رہے تھے اگر صدر ایوب کو کوئی سیاست دان پسند نہیں ہوتا تھا تو وہ اسمبلی کا ممبر نہیں بن سکتا تھا۔ اسی طرح اگر کسی ضلع کے افسر تحصیل تھانہ کے افسر کو کوئی شخص پسند نہیں ہوتا تھا وہ بی ڈی ممبر یا چیئرمین یونین کمیٹی یا چیئرمین یونین کونسل یا صدر بلدیہ یا صدر ڈسٹرکٹ کونسل نہیں بن سکتا تھا۔

کونشن مسلم لیگ کی ممبر شپ سب فرضی اور جعلی ہوتی تھی۔ حصول اقتدار کے لئے گورنمنٹ کی قربت والے لوگ اپنے پلے سے ممبر شپ فیس ادا کر کے ہزاروں لوگوں کو جعلی ممبر بنا لیا کرتے تھے۔ راقم الحروف نے بھی 1965ء میں بی ڈی الیکشن لڑا تھا میرا تعلق بھی اپوزیشن جماعت سے تھا میرے حریف کا تعلق بھی اپوزیشن کی جماعت سے تھا اس لئے گورنمنٹ نے ہمارے الیکشن میں مداخلت نہیں کی اور میں بی ڈی ممبر منتخب ہو گیا میں نے صدارتی انتخابات میں اپنا ووٹ مس فاطمہ جناح کو دیا تھا اور حکومت کی پالیسی تھی کہ کسی حد تک اپوزیشن پارٹیوں کے نمائندوں کو الیکشن میں کامیاب ہو جانے دیتے تھے اور جن لوگوں کو وہ سمجھتے تھے کہ ان کی کامیابی مقامی حکمرانوں کے لئے بھی قابل قبول نہیں انہیں بی ڈی ممبر نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ میرے ایک دوست چودھری محمد یعقوب مسلم جن کا روحانی تعلق چودھری محمد علی کی نظام اسلام پارٹی سے تھا وہ افسران پر تنقید وغیرہ بھی کرتے رہتے تھے انہیں بی ڈی ممبر بھی نہیں بننے دیا گیا تھا۔ افسران نے خود دھاندلی کرا کر انہیں ہروا دیا۔

1962ء کے آئین میں یہ بات درج تھی کہ کوئی شخص بھی صدارت کے عہدہ پر ہوتے

ہوئے صدارت کا الیکشن نہیں لڑ سکتا جب مس فاطمہ جناح نے صدارت کے لئے ایوب خان کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہونے کا اعلان کیا تو ایوب کو ہار جانے کا خطرہ پیدا ہوا تو فوری طور پر صدر جنرل محمد ایوب نے 1962ء کے آئین میں تبدیلی کر دی کہ صدر برسراقتدار رہتے ہوئے بھی الیکشن میں حصہ لے سکتا ہے۔ اور صدر جنرل محمد ایوب نے صدارت کے منصب پر رہتے ہوئے حکومتی اثر کے ساتھ صدارت پاکستان کا الیکشن جیتا تھا کنونشن مسلم لیگ نے اپنی ابتداء سے لے کر ایوب خان کے زوال تک کوئی جماعتی کونسل قائم نہیں کی اور نہ ہی کوئی جماعتی فیصلے ہی کئے جس سے حکومت کی راہنمائی کی گئی ہو۔ کنونشن مسلم لیگ اور صدر ایوب کے اقتدار کو 1965ء کی جنگ نے بہت نقصان دیا صدر ایوب جنگ میں امریکہ سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ پاکستان کی جنگ میں امداد کرے گا مگر ایسا نہ ہوا اس پر ایوب ذہنی طور پر امریکہ کے خلاف ہو گئے امریکہ کی مخالفت بھی صدر ایوب اور کنونشن لیگ کے زوال کا باعث بنی۔ صدر ایوب کے پہلے دور حکومت میں کنونشن مسلم لیگ کو کچھ اچھے لوگ بھی ملے تھے جن میں سابق وزیر اعظم پاکستان محمد علی بوگرا فضل قادر چودھری عبدالمنعم خان مگر دوسرے دور میں کنونشن مسلم لیگ اور صدر ایوب بڑی تیزی سے زوال پذیر ہوگئے۔ صدر ایوب کے زوال میں 1965ء کی جنگ کا بھی بہت حصہ ہے اصل بات یہ تھی کہ دوران جنگ یا جنگ کے بعد ریڈیو اخبارات کے ذریعے لوگوں کو یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ جنگ ہم جیت گئے ہیں اور ہندوستان کو شکست ہو چکی ہے مگر جب اعلان تاشقند ہوا تو اس میں واضح شکست پاکستان کی نظر آتی تھی۔ لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہو گیا کہ جنگ تو ہم جیت چکے تھے مگر ایوب خان نے کنونشن مسلم لیگ نے بات چیت کی میز پر بازی ہار دی ہے جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ جنرل ایوب ذہنی طور پر امریکہ کے خلاف ہو چکے تھے اوہ وہ سمجھنے لگ گئے تھے کہ امریکہ ہمارا دوست نہیں آقا ہے۔ اور انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی ہمیں دوست چاہیں آقا نہیں ظاہر بات ہے امریکہ نے بھی صدر ایوب کے خلاف ہی ہو جانا تھا پھر اندر سے ہی ان کے دشمن پیدا ہو گئے سب سے پہلے ان کا منہ بولا بیٹا مسٹر ذوالفقار علی بھٹو جو دس سال تک صدر ایوب کے ہر حکم کی تعمیل پالتو جانور کی طرح کرتا تھا وہ یک دم باغی ہو کر صدر ایوب کے مدمقابل آگیا۔ امریکہ سے اشیرباد بھی اسے مل چکی تھی وہ امریکہ کے حکمرانوں کو ہر قسم کی یقین دہانی کرا چکا تھا۔ سرکار کے اندر ایک بہت بڑا گروہ جو فوج میں بھی شامل تھا ذرائے ابلاغ نے اور دیگر سرکاری مشینری نے ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کو اجاگر بڑی تیزی کے ساتھ کرنا شروع کر دیا۔ متحدہ حزب اختلاف تو پہلے ہی صدر ایوب اور 1962ء کے آئین کے خلاف بھی مسلسل جدوجہد کر رہی تھی مگر مسٹر بھٹو نے جو اندر سے شب خون مارا وہ بہت ہی خطرناک وار تھا اور مسٹر بھٹو نے مغربی پاکستان کے لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ کنونشن لیگ کے جڑیں چونکہ لوگوں میں نہ تھیں اس وجہ سے پبلک مقابلہ میں کنونشن لیگ مات کھا گئی پبلک میں صرف متحدہ حزب اختلاف یا مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی ہی نظر آتی تھی اس صورت حال کو دیکھتے

مولانا عبدالحمید بھاشانی و دیگر ساتھی

ہوئے صدر پاکستان صدر کنونشن مسلم لیگ جنرل محمد ایوب خان نے 21 فروری 1969 کو یہ اعلان کیا کہ وہ آئندہ صدارتی انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے اس کے بعد انہوں نے 2 مارچ 1969ء کو کنونشن مسلم لیگ کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ مسلم لیگ کی قیادت کا بوجھ اب نہیں اٹھا سکیں گے کسی اور شخص کو کنونشن مسلم لیگ کا صدر بنایا جائے۔ 25 مارچ 1969ء کو جنرل صدر محمد ایوب نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور اقتدار جنرل یحییٰ خان کے حوالے کر دیا گیا۔ جنرل ایوب کے اقتدار سے ہٹ جانے کے بعد کنونشن مسلم لیگ کے صدر مشرقی پاکستان کے فضل قادر چودھری صاحب بنائے گئے مگر جس طرح جنرل ایوب کا اقتدار ختم ہو گیا تھا اس طرح کنونشن مسلم لیگ بھی فضاؤں میں تحلیل ہو گئی۔

آزاد پاکستان پارٹی

آزاد پاکستان پارٹی کے بانی میاں افتخار الدین تھے جو تقسیم ہند سے قبل کانگرس کے ساتھ وابستہ تھے اور 1944ء میں وہ پنجاب کانگرس کے صدر اور پنجاب اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ انہوں نے 1944ء میں پنجاب کانگرس کی صدات سے استعفیٰ دیا پنجاب اسمبلی کی ممبر شپ سے استعفیٰ دیا پھر کانگرس سے مستعفی ہو گئے اور ساتھ ہی وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ 1945ء کے الیکشن میں وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ انہوں نے ہی خضر وزارت کے خلاف تحریک کی ابتداء کی تھی پاکستان بن جانے سے قبل ہی انہوں نے کانگرس کا اخبار ٹریبون اور پریس اور ٹریبون بلڈنگ بھی خرید لی تھی اور اسی بلڈنگ میں انہوں نے پاکستان بن جانے کے بعد انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز اردو اخبار امروز جاری کیا یہ اخبار اور جگہ پروگریسو پیپر لیمٹڈ کے نام سے خریدی گئی تھی مگر اس میں میجر حصص میاں افتخار الدین کے ہی تھے راقم الحروف کی اس زمانے میں میاں افتخار الدین کے ساتھ علیک سلیک تھی میاں صاحب لاہور کے رئیس اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ ترقی پسند خیالات رکھتے تھے اور ان کا حلقہ احباب بھی ترقی پسند لوگوں پر مشتمل تھا پاکستان میں پنجاب کی پہلی وزارت نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے تھے میاں افتخار الدین کو وزیر مہاجرین کا قلمدان سونپا گیا تھا وہ بہت تھوڑا وقت وزارت پر فائز رہے حکمرانوں کے ساتھ ان کا اختلاف ہو جانے کی وجہ سے وزارت سے الگ ہو گئے اور انہوں نے پبلک سیاست پر اور اپنے اخبارات پر توجہ مرکوز کر دی پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر فیض احمد فیض تھے ایڈیٹر جناب مظہر علی خان تھے امروز کے ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی تھے اور دیگر اخبارات کا سارا عملہ ترقی پسند لوگوں پر مشتمل تھا۔

آزاد پاکستان پارٹی کا کنونشن 1949ء لاہور برکت علی محمڈن حال میں منعقد ہوا جس میں

پنجاب کے ترقی پسند خیالات رکھنے والے پرانے کانگرس اور مسلم لیگ ورکر لیڈر جمع ہوئے بشمول میاں افتخار الدین سردار شوکت حیات خان سید محمد قسور گردیزی سردار مظہر علی خان طاہرہ مظہر علی سید امیر حسین شاہ آف گجرات ریلوے مزدور لیڈر مرزا ابراہیم سی آر اسلم چودھری فتح محمد مولوی غلام محمد ہاشمی میاں محمود علی قصوری عابد حسن منٹو خاقان بابر اور دیگر بہت سارے لوگ جمع ہوئے اور پاکستان میں پہلی ترقی پسند جماعت بنائی گئی اس جماعت کا بنیادی نظریہ سیکولر ازم پر مبنی ترقی پسند خیالات کا حامل تھا۔ جماعت کی تنظیمی کمیٹی بنی جس کے سربراہ میاں افتخار الدین بنائے گئے ۔ کمیٹی کے دیگر ممبران میں سردار شوکت حیات میاں محمود علی قصوری سید قسور گردیزی سی آر اسلم مرزا محمد ابراہیم بھی شامل تھے ۔ پاکستان ابھی نیا نیا بنا تھا سیاست میں رواداری بڑی حد تک تھی۔ سیاسی جماعتوں کے ساتھ وابستہ لوگوں کا احترام اس وقت تک ابھی مختلف نظریات کے لوگوں میں تھا موجودہ حالات کی طرح تنگ نظری نہیں تھی۔ آزاد پاکستان پارٹی نے 1950ء کے صوبائی انتخابات میں اپنے امیدوار کھڑے کئے تھے ہمارے گوجرانوالہ میں آزاد پاکستان پارٹی کی طرف سے خاقان بابر ایڈووکیٹ امیدوار ممبر برائے صوبائی اسمبلی نامزد کئے گئے تھے مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ سارے پنجاب میں آزاد پاکستان پارٹی کے صرف ایک امیدوار گجرات شہر سے سید امیر حسین شاہ کامیاب ہوئے تھے باقی سارے ناکام ہوئے بعد میں اسمبلیوں کے ممبران نے بھی دستور ساز یا قومی اسمبلی کے ممبران کا چناؤ کرنا تھا اس چناؤ میں میاں افتخار الدین دستور ساز یا قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔ میاں افتخار الدین نے سرحد سے قومی اسمبلی کے ممبر جناب سعد اللہ خان کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ گویا آزاد پاکستان پارٹی کے قومی اسمبلی میں دو ممبر ہو گئے ۔ 1954ء میں جب مشرقی پاکستان اسمبلی کے انتخابات ہو گئے جس میں مسلم لیگ ناکام ہو گئی تو مشرقی پاکستان اسمبلی نے بھی مرکزی اسمبلی کا چناؤ کیا تو مشرقی پاکستان کے قومی اسمبلی دو ممبران کو بھی میاں افتخار الدین نے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس طرح آزاد پاکستان پارٹی کے مرکزی اسمبلی میں چار ممبر ہو گئے تھے آزاد پاکستان پارلیمانی پارٹی کے لیڈر میاں افتخار الدین تھے میاں افتخار الدین صاحب مطالع تھے ان کی ذاتی لائبریری میں ہزاروں کتابیں ہر موضوع پر تھیں۔

آزاد پاکستان پارٹی پنجاب تک ہی تھی مگر عوام میں کوئی اچھا اثر پیدا نہیں کر سکی پاکستان ٹائمز' امروز اخبارات کی وجہ سے ترقی پسندانہ رجحانات کے نت نئے مضمون چھپتے رہتے تھے ترقی پسند ادیب زیادہ انہیں اخبارات میں لکھتے تھے پرانے زمانے میں فیروز دین منصور صاحب حمید اختر صاحب احمد ندیم قاسمی ' خاقان بابر صاحب اور دیگر بہت سارے لکھاڑی پروگریسو پیپر لینڈ کے ساتھ وابستہ تھے اور لوگوں میں ان کی تحریریں پسند بھی کی جاتی تھیں۔ جناب لیاقت علی خان کے زمانہ وزارت 1950ء میں پنڈی سازش کیس کے متعلق بھی آزاد پاکستان پارٹی کے بعض کمونسٹ ممبروں ظفر اللہ پوشنی' میجر اسحاق اور دیگر کئی لوگوں پر الزام لگایا جاتا ہے۔

آزاد پاکستان پارٹی مزدور شعبہ میں متحرک تھی مرزا ابراہیم صاحب ریلوے مزدور یونین کے صدر تھے دیگر بہت ساری ٹریڈ یونینز بھی سی آر اسلم اور دیگر لیڈروں کے کنٹرول میں تھیں اور اس وقت تقریباً سارے پنجاب میں ہی ٹریڈ یونین کی سیاست آزاد پاکستان پارٹی کے ٹریڈ یونین گروپ ہی کرتے تھے۔ ہمارے گوجرانوالہ اس زمانے میں غلام نبی بھلر، کامریڈ بشیر فضل احمد ڈار وغیرہ ٹریڈ یونین میں نمایاں کام کرتے تھے اس طرح کسان کمیٹیاں بھی بنائی جا رہی تھیں۔ ہمارے گوجرانوالہ میں 1951ء میں بہت بڑی کسان کانفرنس ہوئی تھی جس کے ایک اجلاس کی صدارت سید امیر حسین شاہ ایم پی اے نے کی تھی یہ کانفرنس دو دن تک جاری رہی تھی کسانوں نے گوجرانوالہ شہر میں بہت بڑا جلوس نکالا تھا۔ آزاد پاکستان پارٹی ڈسٹرکٹ گوجرانوالہ کے صدر غلام نبی بھلر بعد میں نوشہرہ ورکاں کے علاقے میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے الیکشن میں بھی کھڑے ہوئے جس میں ناکام ہوئے تھے۔

اسی طرح ٹوبہ ٹیک سنگھ کے علاقہ میں چودھری فتح محمد بھی کسانوں میں کام کرتے تھے اور انہوں نے کئی دیہاتوں میں کسان کمیٹیاں بھی بنائی ہوئی تھیں۔ اور وہ کسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرتے رہے ہیں۔ آج 1994ء میں بھی چودھری فتح محمد کسان کمیٹیوں میں کام کر رہے ہیں۔ پرانے وقتوں 1950ء سے 1957ء تک یہ تمام کسان کمیٹیاں ٹریڈ یونینز اور دیگر یونینز آزاد پاکستان پارٹی کی کوشش سے ہی معرض وجود میں آئی تھیں آج آپ کو ٹریڈ یونینز ہر طرف رواں دواں نظر آتی ہیں۔ 1952ء آزاد پاکستان پارٹی کی ایک روزہ کانفرنس ملتان میں ہوئی جس میں بیرون پنجاب سے بھی لیڈران شریک ہوئے بلوچستان سے میر غوث بخش بزنجو سندھ سے غلام محمد لغاری حیدر بخش جتوئی سوبھو گیان چندانی اعجاز جتوئی ڈاکٹر اعجاز نذیر اور بہت سارے لوگوں کے علاوہ کیرالہ ہندوستان سے بھی ترقی پسند لوگ اس کانفرنس میں شریک ہوئے اس کانفرنس کا خطبہ استقبالیہ سید محمد قسور گردیزی صاحب نے پڑھا بشمول میاں افتخار الدین کے تمام لیڈران جن کا ذکر سابقہ سطور میں کیا ہے انہوں نے تقاریر کیں۔ 1954ء میں جب ممبر پارلیمنٹ سعد اللہ خان آزاد پاکستان پارٹی میں شریک ہوئے تو ملک معراج خالد سابق وزیر اعلیٰ پنجاب بھی آزاد پاکستان پارٹی میں شامل ہوئے تھے ترقی پسند لوگوں کی یہ جماعت پنجاب اور دیگر مغربی پاکستان میں کسی حد تک متحرک ہوئی اور پارٹی کی تحریک کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ میاں افتخار الدین صاحب کے دو اخبارات پاکستان ٹائمز اور امروز آزاد پاکستان پارٹی پالیسی کے زیر تابع لکھتے تھے اور اس زمانے میں پاکستان ٹائمز، امروز پنجاب کے مقبول ترین اخبارات تھے۔ ان اخبارات کی وجہ سے آزاد پاکستان پارٹی کو کوئی ترقی تو نہ ملی مگر لوگوں میں ترقی پسند اور سکولر رجحانات کو کسی حد تک تقویت ضرور ملی جس کا فائدہ آخر کار ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی نے اٹھایا۔

1957ء میں مغربی پاکستان کے ون یونٹ بن جانے کے بعد قوم پرست سیکولر چھ جماعتوں جن میں آزاد پاکستان پارٹی خدائی خدمت گار (سرخ پوش) سرحد ورورے پختون بلوچستان رستمان

گل، بلوچستان سندھ عوامی محاذ سندھ، سندھ ہاری کمیٹی سندھ ان چھ جماعتوں نے مل کر لاہور میں اجتماع کیا۔

ایک متحدہ جماعت پاکستان نیشنل پارٹی بنائی جو بعد میں مشرقی پاکستان عوامی لیگ کے مولانا بھاشانی اور گنا تنتری دل کے حاجی محمد دانش کے مل جانے کی وجہ سے نیشنل عوامی پارٹی بن گئی تھی۔

تحریک ختم نبوت

1953ء میں تحریک ختم نبوت شروع ہوئی جس میں ہزاروں لوگ قید ہوئے سینکڑوں لوگ پولیس تشدد گولی چلنے سے زخمی اور شہید ہوئے۔ یہ تحریک فرقہ احمدیہ کے خلاف مجلس احرار کی تحریک پر آل پارٹیز مجلس عمل نے چلائی تھی جس میں تمام مکاتب فکر کے علمائے دین شامل تھے۔ مجلس عمل کے مطالبات تھے کہ مرزایوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ کلیدی اسامیوں سے ہٹا دیا جائے اور سر ظفر اللہ کو وزارت خارجہ کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے بلاآخر یہی مطالبات پیپلز پارٹی کے عہد بھٹو کے دور حکومت میں منظور ہوگئے اور پاکستان کے 1973ء کی آئین میں شامل کر لئے گئے۔ مرزایوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا اور سرکاری قلیدی عہدوں سے ہٹا دیا گیا۔

فرقہ احمدیہ

مرزایوں کی تاریخ یوں ہے کہ ضلع گرداسپور کے قصبہ قادیان میں سکھوں کے دورے حکومت میں سکھ دربار کے جرنیل مرزا غلام مرتضیٰ کے بیٹے کے ہاں 1835 میں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام غلام احمد رکھا گیا مذکورہ خاندان قادیان کا رئیس خاندان تھا جس کا ذکر روسائے پنجاب میں بھی آتا ہے اور یہ خاندان سکھوں کے دور حکومت میں بھی حکومت کا تابع دار اور نمک خوار تھا اور انگریز دور حکومت میں بھی سرکار انگلشیہ کا وفادار اور تابعدار رہا ہے۔ مرزا غلام احمد 1865ء میں سیالکوٹ کے ڈی سی آفس میں ملازم ہو گئے اور چار سال تک ملازمت کی باپ کے انتقال کے بعد انہوں نے ملازمت چھوڑ دی اور دینیات کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ 1884ء میں انہوں نے اپنی مشہور کتاب براھین احمدیہ لکھی جو چار جلدوں پر مشتمل تھی کچھ مدت کے بعد اور کتابیں بھی لکھیں اور اسی زمانے میں مذہبی مناظرے عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے ساتھ کئے۔ 1882ء میں مرزا غلام احمد نے دعویٰ کیا کہ انہیں الہام ہوا ہے۔ 1888ء میں پھر انہوں نے کہا کہ وہ مامور من اللہ ہیں اور انہوں نے اپنے مقتدین سے بیت کرنے کا مطالبہ کیا۔ 1890ء میں انہوں نے کہا کہ وہ یسوع ناصری ہیں۔ تمثیل مسیح ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لئے مسیح ثانی امام مہدی ہیں۔

ہندوؤں کے لئے کرشن ہیں اور تمام انسانوں کے ہادی ہیں۔ 1901ء میں جماعت احمدیہ قائم کر دی گئی۔ اور جماعت احمدیہ کے ماننے والوں کی تعداد بھی معقول حد تک ہو گئی۔ 1909ء میں مرزا غلام احمد اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے ان کی جگہ جماعت کی امامت پر حکیم نور دین صاحب فائز ہو گئے اور جماعت احمدیہ کے خلیفہ اول بن گئے۔ اور ساتھ ہی جماعت میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ دو گروہ بن گئے ایک قادیانی گروہ جو مرزا صاحب کو ہی مسیح موعود علیہ اسلام مانتے تھے دوسرا لاہوری گروہ جو مرزا صاحب کو مجدد مانتے تھے۔ 1914ء میں حکیم نور دین صاحب کی وفات کے بعد مرزا بشیر الدین محمود صاحب جماعت احمدیہ کے خلیفہ ثانی بن گئے یہ دونوں گروہ غیر ممالک میں اور ملک میں اپنے عقیدہ کی تبلیغ پورے جوش و خروش کے ساتھ کرتے ہیں۔ 1930ء میں کشمیر میں ایک ہیجان پیدا ہوا۔ مہاراجہ کشمیر کے ظلم و بربریت کی وجہ سے لوگ بھاگ کر پنجاب میں آنا شروع ہو گئے۔ رؤسائے پنجاب جن کا اثر حکومت میں تھا انہوں نے کشمیری عوام کے مسائل حل کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کر دی جس میں دیگر لوگوں کے علاوہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نواب سر ذوالفقار علی خان خواجہ حسن نظامی نواب ابراہیم علی خان اور جماعت احمدیہ کے خلیفہ ثانی مرزا بشیر الدین محمود بھی شامل کئے گئے اور اس کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین صدر جماعت احمدیہ اور ناظم عبدالرحیم بنائے گئے۔ کشمیر کمیٹی کی وجہ سے مرزائی جماعت کا اثر و رسوخ کشمیری مسلمانوں پر بھی پڑنے لگا۔ علمائے ہند کشمیر کمیٹی میں مرزائیوں کے اثر کی وجہ سے فکر پید اہوئی پہلے بھی علمائے دین مرزائیت کے خلاف وقتاً فوقتاً تقاریر کرتے رہتے تھے۔ انہیں علماء دین سے ایک گروہ نے 1931ء میں مجلس احرار جماعت قائم کر لی اور یہ جماعت منظم طریقے پر وطن کی آزادی کے ساتھ ساتھ مرزائیت کے خلاف بھی مصروف عمل ہو گئی۔ قادیان جہاں مرزائیوں کا مرکز تھا وہاں پر دفتر مجلس احرار قائم کر لیا گیا۔ جہاں ہمہ وقت مبلغ رہنے لگ گئے جو مرزا بشیرالدین اور جماعت احمدیہ کے خلاف جلسے وغیرہ کرتے رہتے تھے اور ہر سال قادیانیت کی مخالفت میں بڑی کانفرنسیں کی جانے لگی۔ مرزائیت کی مخالفت قادیان کے اندر کرنے کی وجہ سے کئی بار احرار لیڈر اندیشہ نقص امن کے تحت گرفتار بھی کئے گئے۔ یہ تصادم 1947ء تک بدستور جاری رہا۔ متحدہ ہند کے وقت مجلس احرار اور دیگر علمائے ہند کے علاوہ دیگر مکتبہ فکر کے علماء اور مشائخ بھی مرزائیت کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ پیر مہر علی شاہ گولڑا شریف کا مناظرہ بھی جو انہوں نے مرزائیت کے خلاف چیلنج کیا تھا وہ بھی مشہور ہے۔ مرزائی مناظرے سے بھاگ گئے تھے۔ پاکستان بن جانے تک مرزائیت کے خلاف علماء کام تو کرتے رہے مگر کوئی تحریک پیدا نہ ہوئی چودھری محمد ظفر اللہ جو ویسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بھی تھے وہ مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈروں میں شمار ہوتے تھے بعض لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ تقسیم ہند کا فارمولے پر مسلم لیگ کو انہوں نے ہی آمادہ کیا تھا ان حالات میں ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ اور مسلم لیگ کامیاب ہو کر حکمران بھی بن گئی تھی مسلم لیگ کے مخالف جماعتیں جنہوں نے پاکستان یا تقسیم

ہند کی مخالفت کی تھی وہ غیر متحرک ہو گئیں اور انتشار کا شکار بھی ہوئی۔ مجلس احرار بھی پاکستان کے مخالف جماعتوں میں سے تھی اس پر بھی زوال آ گیا۔ کارکنوں میں مایوسی پیدا ہوئی۔ مستقبل بھی انتہائی مایوس کن تھا۔ احرار نے جنوری 1949ء لاہور میں ایک بہت بڑی دفاع پاکستان کانفرنس کی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ احرار کارکن جو سیاست کرنا چاہتے ہیں وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جاویں۔ آئندہ احرار صرف تبلیغی کام ہی کرے گی اور پھر اس کے بعد مجلس احرار نے بھرپور طریقہ سے مرزائیت کے خلاف پاکستان کی رائے عامہ کو بیدار کرنا شروع کر دیا جگہ جگہ اجلاس اور کانفرنسیں منعقد کیں مرزائیت اور مرزائی افسران وزراء کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنا شروع کر دی گئی۔ تقسیم ہند سے قبل بھی احرار قادیانیت کے خلاف میدان کے شہسوار تھے اس حوالے سے انہیں مرزائیت کے خلاف تحریک بنانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ اس تحریک بنانے میں احرار علماء بشمول حضرت امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری' قاضی احسان احمد شجاع آباد' ماسٹر تاج دین انصاری شیخ حسام الدین حضرت پیر فیض الحسن صاحب سجادہ نشین الو مہار شریف ضلع سیالکوٹ۔ مولانا غلام غوث ہزاروی مولانا محمد علی جالندھی اور دیگر بہت سارے علماء شامل تھے۔ احراری علماء کے علاوہ دیوبند مکتبہ فکر کے علماء کثرت سے بشمول مولانا غلام اللہ خان قاضی نور محمد صاحب قاضی شمس الدین صاحب سید عنایت اللہ شاہ بخاری گجراتی اور دیگر ان گنت علماء اس میں شامل تھے۔ تقاریر میں مسلمانوں کو مرزائیت کے خلاف تشدد پر بھی ابھارا جاتا تھا مرزائی چونکہ مرتد ہیں از روئے اسلام مرتد کی سزا قتل ہے۔ افغانستان کی حکومت نے 1903ء میں ایک مرزائی مرتد کو قتل کر دیا تھا ایک اور مرزائی عبداللطیف جو کہ قادیان میں رہ گیا تھا اور مرزائی ہو گیا تھا اسے نصف زندہ زمین میں دفن کیا گیا اور پھر سنگسار کر دیا گیا تھا ان وقتوں میں جب یہ خبر ہندوستان پہنچی تو ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا اس زمانے میں حکومت افغانستان کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک کتابچہ الشہاب جس میں کہا گیا کہ حکومت افغانستان کا یہ اقدام عین اسلام کے مطابق ہے یہ کتابچہ 1950ء سے قبل گوشہ گمنامی میں پڑا رہا اب یہ کتابچہ مجلس احرار کے ہاتھ لگ گیا اس وقت علامہ شبیر احمد عثمانی پاکستان کے شیخ الاسلام بھی بن چکے تھے اس لئے اس کتابچے کے دلائل پر بھی مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے اور مرتدین کو سزائے موت دینے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ 1948ء میں ہی دو احرار لیڈر شیخ حسام الدین اور مخدوم شاہ بنوری کو گرفتار کیا گیا اور بعد میں انہیں رہا کر دیا گیا۔ 1948ء میں تحریک کافی جاندار ہو چکی تھی۔ مرزا بشیر الدین محمود کوئٹہ میں موجود تھے کہ ان کے ایک حواری میجر محمود کو قتل کر دیا گیا تھا تحریک ختم نبوت میں مرزائیوں کے خلاف نفرت پیدا کی جا رہی تھی جو دن بدن زیادہ ہو رہی تھی۔ میجر محمود کے قتل کی کسی نے بھی ذمہ داری قبول نہیں کی آخر شبہ میں پکڑے جانے والے تمام لوگ رہا کر دیئے گئے۔ مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا بعد ازاں ہر جلسہ میں یہ مطالبہ کیا جاتا تھا پنجاب بھر میں ہر جگہ جلسے

ہو رہے تھے اور لوگوں کو ذہنی طور پر مرزائیت کے خلاف ابھارا جا رہا تھا سر ظفراللہ کو مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیانی اور دیگر مرزائی افسران کو حرف علامت بنایا جاتا تھا۔ اور عوام کو ان کے مذموم عقائد اور ارداوں کے متعلق آگاہ کیا جاتا تھا۔ مرزائیوں کے خلاف ان تقاریر کی وجہ سے لوگوں میں اب اشتعال پیدا ہوا ایک نوجوان محمد اشرف نے اوکاڑہ میں ایک مرزائی غلام محمد مدرس کو قتل کر دیا عدالت نے اس کو عمر قید کی سزا دی۔ اس طرح راولپنڈی میں ایک شخص ولایت خان نے بدر دین مرزائی کو قتل کر دیا۔ کراچی میں جماعت مرزائی کا ایک اجلاس ہوا جس میں مرزائیوں کے قتل کے خلاف شدید غم و غصہ کا اظہار کیا گیا اور حکومت سے مرزائیوں کی زندگی کے تحفظات کی اپیل کی گئی۔ 1951ء میں حکومت پاکستان کے خلاف ایک فوجی سازش کا انکشاف ہوا جسے بعد میں پنڈی سازش کا نام دیا گیا اس میں دیگر افسران کے علاوہ ایک میجر جنرل نذیر بھی شامل تھا جو کہ مرزائی تھا مجلس احرار نے پنڈی سازش کیس کو خوب اجاگر کیا اور ساتھ ہی میجر جنرل نذیر جو کہ اس سازش کا سرغنہ تھا اسے بھی اجاگر کیا گیا تحریک ختم نبوت کو مزید تقویت دینے کے لئے پنڈی سازش کیس نے بھی بہت معاونت کی۔

یوم تشکر

یوم تشکر میں احرار نے قرار داد لاہور جنوری 1948 کے تحت یہ فیصلہ کیا کہ 1951ء کے الیکشنوں میں وہ مسلم لیگ کو ووٹ دیں گے اگر مسلم لیگ نے کسی مرزائی کو ٹکٹ دی تو وہ مرزائی امیدوار کی مخالفت کریں گے الیکشن میں بھرپور طریقہ پر احرار نے مسلم لیگی امیدواروں کی امداد کی اور الیکشن 1951ء میں پنجاب میں بھرپور اکثریت سے مسلم لیگ کامیاب ہو گئی اور پنجاب حکومت کے وزیر اعلیٰ جناب ممتاز دولتانہ بنے۔ چونکہ پنجاب اسمبلی میں کوئی بھی مرزائی ممبر نہیں بنا تھا اس لئے مجلس احرار نے یوم تشکر منایا اور پنجاب کے تقریباً سارے شہروں میں جلسے کئے گئے جن میں احرار لیڈروں نے تقاریر کیں۔ قادیانی جماعت کے خلیفہ بشیر الدین محمود سر ظفراللہ میجر جنرل نذیر ور دیگر مرزائی حکام کی کردار کشی کی گئی۔ بازاروں میں جلوس نکالے گئے۔ احرار رضا کاروں نے اپنے فوجی بینڈ کے ساتھ بازاروں میں پریڈ کی بھیرہ میں مرزائیوں کی مسجد جلا دی گئی لیکن بعض جگہ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ مجلس احرار کے جلسوں کی صدارت افسران سرکار نے کی ملتان کی احرار کانفرنس کے ایک اجلاس کی صدارت ڈپٹی کمشنر نے کی دوسرے اجلاس کی صدارت ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر نے کی۔ مظفر گڑھ کے ڈپٹی کمشنر نے اور دیگر کئی افسران نے ختم نبوت کے اجلاس کی صدارت کی اس میں یہ بھی تاثر ملتا تھا کہ حکومت کے ہاں تحریک ختم نبوت کوئی غیر پسندیدہ عمل نہیں تھا۔ دوسری طرف خلیفہ بشیر الدین نے ان حالات میں شکایات حکام اعلیٰ کو کیں۔ تمام ملک میں احرار کانفرنسیں اجلاس ہوتے رہے ہیں اور مرزائیت کے خلاف سر

ظفر اللہ کے خلاف مرزا بشیر الدین خلیفہ کے خلاف مرزائی افسران کے خلاف الزام لگائے جاتے رہے اور مرزائی بھی جلسے کر کے الزامات کا توڑ نکالتے رہے علمائے دین جو احرار کے ساتھ وابستہ تھے وہ خطبہ جمعہ میں بھی مرزائیت کے خلاف تقاریر کرتے تھے جب تحریک کے اثرات زیادہ ہو گئے تو دیگر علماء حضرات نے بھی جمعہ کے اجتماعات میں مرزائیت کو اپنا موضوع بنانا شروع کر دیا۔ حکومت نے بعض وقت احرار اجتماعات کو دفعہ 144 کے تحت بند بھی کیا اور اس کے خلاف احتجاج بھی کرتے رہے اور ایک وقت میں حکومت نے اجتماعات جمعہ کو دفعہ 144 کے تحت بند کیا مگر گورنمنٹ کی اس پابندی کو احرار والوں نے زیادہ توجہ کا مستحق نہیں سمجھا اور وہ عقیدہ ختم نبوت کی تبلیغ مساجد میں کرتے رہے اور ان پر مقدمات بھی بنتے رہے قید بھی ہوتے رہے۔ راقم الحروف نے خود دیکھا کہ اس زمانے میں جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں مرزائیت کے خلاف یا مذہبی منافرت کے خلاف کئی بار پابندی لگائی گئی۔ علماء حضرات پر مقدمات بھی بنے مگر انہوں نے کوئی پرواہ نہیں کی اپنا کام کرتے رہے۔ جولائی 1952ء میں ایک اجتماع ختم نبوت پر عقیدہ رکھنے والے علماء کا لاہور میں منعقد ہوا اس میں ہر فرقہ کے علماء نے شرکت کی مشترکہ لائحہ عمل کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ کونشن بغیر کسی عملی پروگرام کے ملتوی ہو گیا۔

احرار راہنما تحریک کو آگے بڑھا رہے تھے جلسے ہر شہر میں ہو رہے تھے بعض اوقات احرار لیڈران کو گرفتار بھی کیا جا رہا تھا پھر رہا بھی کر دیا جاتا تھا۔ احرار راہنماؤں نے پبلک جلسوں میں مندرجہ ذیل مطالبات کی وضاحت حکومت سے طلب کرنی شروع کر دی نمبر 1 مسئلہ ختم نبوت کی تبلیغ و اشاعت، نمبر 2 احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا اعلان، نمبر 3 چودھری ظفر اللہ خان کی وزارت سے برطرفی حکومت نے ان مطالبات پر کوئی بھی رائے ظاہر نہیں کی۔

مئی 1952ء جہانگیر پارک کراچی میں مرزائیوں کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں سر ظفر اللہ خان وزیر خارجہ پاکستان نے بھی تقریر کرنی تھی اس وقت کے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو سر ظفر اللہ کا احمدیوں کے پبلک جلسہ میں تقریر کرنے کا ارادہ کوئی اچھا نہ لگا خواجہ صاحب نے سر ظفر اللہ کو منع کیا کہ وہ احمدیوں کے جلسہ عام میں نہ جائیں۔ جس کا سر ظفر اللہ نے جواب دیا کہ میں جماعت احمدیہ کے جلسہ میں تقریر کی شمولیت کا وعدہ کر چکا ہوں اس لئے ضرور جاؤں گا اگر کابینہ کو میرا یہ عمل منظور نہیں تو میں وزارت سے مستعفی ہونے کو تیار ہوں۔

سر ظفر اللہ خان نے جہانگیر پارک کے جلسہ جس میں عوام نہیں تھے خواص ہی زیادہ تھے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ کے وعدہ کے مطابق رسولؐ آتے رہیں گے اور دین محمدی کی آبیاری کرتے رہیں گے امت میں جو بھی پراگندہ خیالات رواج پائیں گے ان کی بیخ کنی کرتے

رہیں گے اس طرح مرزا غلام احمد قادیانی نبی ہیں جو امت محمدی میں احیائے دین کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور جماعت احمدیہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین کی آبیاری کرتی رہے گی۔
انجمن احمدیہ کے اس جلسہ نے کراچی میں فسادات پھوٹ پڑنے کا موقع دے دیا جلسہ میں حفاظتی انتظامات کافی کئے گئے تھے پھر بھی جلسہ پر پتھراؤ ہوا کئی لوگوں کو چوٹیں آئیں مگر قابو پا لیا گیا ایک گروہ نے شیزان ہوٹل جس کے مالک احمدی تھے شو روم پر پتھراؤ کیا گیا کئی گاڑیوں کے شیشے ٹوٹ گئے پولیس نے ساٹھ آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ کراچی کے مرزائیوں کے جلسہ اور سر ظفر اللہ کی تقریر کی وجہ سے پنجاب اور مغربی پاکستان کے دیگر جگہوں پر اظہار ناراضگی کیا گیا اور مرزا بشیر الدین خلیفہ تھے اور ان کے برادر نسبتی مسٹر بشیر احمد اور مسٹر صدیقی صاحبان نے اس واقع کی ساری ذمہ داری خواجہ ناظم الدین پر ڈالنے کی کوشش کی۔

کراچی میں آل پارٹیز مسلم کنونشن میں

کراچی سر ظفر اللہ اور مرزائیوں کے جلسہ کی وجہ سے حالات خراب ہو ہی چکے تھے مولانا لال حسین اختر نے تھیو سر جیکل ہال میں آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن طلب کر لیا۔ اس کنونشن کے دعوت نامے پر مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا جعفر حسین، مولانا محمد یوسف اور مولانا لال حسین اختر نے دستخط کئے۔ 2 جون 1952ء کو لال حسین اختر کے مکان پر کنونشن منعقد ہوا۔ اس کانفرنس میں مندرجہ ذیل مطالبات تشکیل دیئے گئے۔

1۔ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، نمبر 2 چودھری ظفر اللہ کو وزیر خارجہ کے عہدے سے الگ کر دیا جائے، نمبر 3 احمدیوں کو تمام کلیدی اسامیوں سے ہٹا دیا جائے ان مقاصد کے حصول کے لئے آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن طلب کیا جائے اس کانفرنس کی صدارت مولانا سید سلیمان ندوی نے کی ایک بورڈ بنایا گیا جس کے صدر سید سلیمان ندوی قرار پائے اور بورڈ کے ممبران مندرجہ ذیل مقرر کیے گئے۔

سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالحامد بدایونی، علامہ مفتی داد صاحب، علامہ احمد نورانی صاحب، ہاشم گزدر صاحب، مولانا احتشام الحق تھانوی، مفتی محمد شفیع صاحب، علامہ محمد یوسف صاحب کلکتوی علامہ سلطان احمد صاحب، مولانا لال حسین اختر صاحب، مولانا جعفر حسین صاحب، جمعیت علمائے پاکستان، جماعت اسلامی، جمعیت اہل سنت، اہلحدیث پنجاب سفیہ المسلمین، مجلس تحفظ ختم نبوت، جمعیت الفلاح، جمعیت علمائے اسلام تنظیم اہل سنت و الجماعت، جمعیت اہلحدیث ادارہ حقوق شیعہ پنجاب حزب اللہ مشرق پاکستان مجلس احرار۔

آل پارٹیز مسلم کنونشن، لاہور

خان عبدالولی خان غلام، مصطفےٰ جتوئی، غلام مصطفےٰ کھر، نواب زادہ نصراللہ خان، مولانا فضل الرحمٰن

چودھری ظفر اللہ کی تقریر نے کراچی کے واقعات کی رفتار کو تیز کر دیا۔ 3 جولائی کے زمیندار اخبار میں اشتہار شائع ہوا کہ 13 جولائی برکت علی اسلامیہ ہال میں تمام مذہبی جماعتوں کا ایک کونشن منعقد ہو گا جس میں علمائے خطیب پیر سجاد نشین اور مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈر کارکن شامل ہوں گے تاکہ عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے لئے ابتدائی لائحہ عمل تیار کیا جائے اس جلسے کا دعوت نامہ مولانا غلام غوث ہزاروی نے جاری کیا جس کے نیچے مندرجہ ذیل حضرات کے دستخط تھے۔

مولانا غلام محمد ترنم صدر جمعیت علمائے پاکستان پنجاب

مولانا مفتی محمد حسین صاحب جمعیت علمائے اسلام پنجاب لاہور

مولانا احمد علی امیر انجمن خدام الدین لاہور

مولانا محمد علی جالندھری ناظم اعلیٰ مجلس احرار اسلام پنجاب ملتان

مولانا سید محمد داؤد غزنوی صدر جمعیت اہلحدیث پنجاب لاہور

مولانا سید نور الحسن صاحب بخاری ناظم اعلیٰ تنظیم اہلسنّت والجماعت پاکستان لاہور

سید مظفر علی شمسی ادارہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان لاہور

5 جولائی 1952 جس روز کونشن ہونا تھا لاہور میں دفعہ 144 نافذ تھی لیکن چیف سیکرٹری کے زیر صدارت افسران کا ایک اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ کونشن میں رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہیے۔ کوئی مداخلت نہ کی جائے۔ اس کونشن میں تین مطالبات منظور کئے جائیں احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، چودھری ظفر اللہ کو وزیر خارجہ کے عہدے سے الگ کر دیا جائے، احمدیوں کو تمام کلیدی اسامیوں سے ہٹا دیا جائے۔ مندرجہ ذیل ارکان کی ایک مجلس عمل مرتب کی گئی تاکہ آئندہ لائحہ عمل کا فیصلہ کرے۔

مولانا ابوالحسنات محمد احمد جمعیت علمائے پاکستان صدر، مولانا امین احسن اصلاحی جماعت اسلامی نائب صدر، ماسٹر تاجدین انصاری مجلس احرار، شیخ حسام الدین مجلس احرار، مولانا عبدالحلیم قاسمی جمعیت علماء اسلام، مولانا محمد طفیل جمعیت علمائے اسلام، مولانا محمد بخش مسلم جمعیت علمائے پاکستان، مولانا غلام محمد ترنم حزب الاحناف، مولانا غلام دین حزب الاحناف، مولانا داؤد غزنوی جمعیت اہلحدیث، مولانا عطا اللہ حنیف جمعیت اہلحدیث، مولانا نصر اللہ خان عزیز جماعت اسلامی، حافظ کفائیت حسین ادارہ حقوق شیعہ، مظفر علی شمسی ادارہ حقوق شیعہ، مولوی نور الحسن بخاری تنظیم اہلسنّت والجماعت، صاحبزادہ فیض الحسن سجادہ نشین پنجاب، مولانا عبدالغفور ہزاروی انجمن سجادہ نشینان پنجاب، علامہ علاؤ الدین صدیقی، مولانا اختر علی خان مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش۔

11 مئی 1951ء کو ایک اجلاس ہوا جس میں چیف منسٹر چیف سیکرٹری فنانس سیکرٹری ڈائریکٹر تعلقات عامہ شریک ہوئے اجلاس میں قرار پایا کہ ایک محکمہ اسلامیات کا بورڈ مقرر کیا گیا چھ علماء

کا ایک بورڈ بنایا گیا - چیف سیکرٹری اس محکمہ کے حاکم اعلیٰ قرار پائے اس کی نگرانی اور مصارف کا انتظام محکمہ تعلقات عامہ کے سپرد کیا گیا مولوی ابراہیم علی چشتی ڈپٹی سیکرٹری مقرر ہوئے اس محکمہ کے حقیقی اخراجات ستمبر 52-1951ء میں 49815 تھے اور 53-1952ء میں 105435 تھے۔ 1951ء تا فروری 1953ء تک کل 72 اشخاص کو مختلف اخبارات اور رسالوں میں مضامین لکھنے پر معاوضے پیش کئے گئے جن میں مولانا ابو الحسنات محمد احمد، مولانا محمد بخش مسلم نے تحریک ختم نبوت میں نمایاں حصہ لیا مولانا حسنات صدر اور مولانا محمد بخش مسلم مجلس عمل کے رکن تھے۔ دیگر مندرجہ ذیل اشخاص کو سکولوں کالجوں میں تقاریر کرنے پر مقرر کیا گیا۔ اور انہیں سرکار کی طرف سے معاوضہ دیا گیا۔ مولانا محمد بخش مسلم، مولوی غلام دین، مولانا ابو الحسنات محمد احمد، صاحبزادہ فیض الحسن، علامہ علاؤ الدین صدیقی، مولانا غلام محمد ترنم، قاضی مرید احمد، حافظ کفایت حسین، پروفیسر عبدالحمید، مولانا سلیم اللہ خان، مفتی محمد حسین۔

یہ سب لوگ 1953ء میں تحریک ختم نبوت میں گرفتار بھی ہوئے اور تحریک کی مجلس عمل میں شامل بھی تھے۔

تحریک ختم نبوت کی حمایت میں مندرجہ ذیل اخبارات تھے اور ان اخبارت کو پنجاب سرکاری نے ڈیڑھ سال کے عرصہ میں دو لاکھ روپے کی امداد دی۔ زمیندار، وفاق، احسان مغربی پاکستان۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ آفاق اخبار کو ایک لاکھ، احسان اٹھان ہزار روپے مغربی پاکستان پندرہ ہزار روپے زمیندار کو پندرہ ہزار روپے زمیندار کو دیا گیا۔ ان اخبارات نے تحریک کو بڑھاوا دینے کے لئے بہت اہم رول ادا کیا اور یہ اخبارات مرزائیت کے خلاف نت نئی خبریں چھاپتے تھے مضامین چھاپتے تھے جس سے لوگوں میں مرزائیت کے خلاف ہیجان پیدا ہوتا تھا اور تحریک ختم نبوت میں شدت پیدا ہو رہی تھی۔

لاہور کنونشن کے بعد کراچی اور پنجاب میں علماء کی گرفتاریاں

سرگودھا اور گوجرانوالہ میں احرار لیڈران ورکران کے خلاف دفعہ 144 کی خلاف ورزی کے ضمن میں مقدمات چل رہے تھے۔ سرگودھا کے مقدمہ میں ماسٹر تاجدین انصاری صاحب کو اور شیخ حسام الدین صاحب کو قید کی سزا ہوئی تھی مگر 19 جولائی گوجرانوالہ میں بھی دفعہ 144 کی خلاف ورزی کا مقدمہ احرار لیڈران کے خلاف درج تھا وہ حکام بالا کی ہدایت پر واپس لے لیا گیا کہتے ہیں مقدمہ واپس لینے کا حکم چیف منسٹر نے دیا تھا اور ساتھ ہی ان کے حکم سے سرگودھا کے مقدمہ میں سزا یافتگان ماسٹر تاجدین اور شیخ حسان الدین جو پنجاب کی مختلف جیلوں میں قید تھے

نواب زادہ نصراللہ خان پارٹی ورکرز کے ساتھ

انہیں بھی رہا کر دیا گیا اور یہ بھی روایت ہے کہ 5 جولائی 1952ء کو صدر مجلس احرار مولانا غلام غوث ہزاروی اور مولانا اختر علی خان ایڈیٹر روزنامہ زمیندار چیف سیکرٹری پنجاب سے ملے اور انہیں یقین دلایا کہ اگر حکومت دفعہ 144 کے احکام واپس لے لے تو احرار انہیں یقین دلاتے ہیں کہ وہ مرزائیوں کے خلاف جو بھی تقاریر کریں گے وہ قانون کی حدود کے اندر کریں گے کسی قسم کا اشتعال پیدا نہیں کریں گے اور نہ ہی کوئی غیر قانون حرکت کریں گے اور حکومت پنجاب کو احرار اپنی حکومت سمجھتے ہیں اس لئے کوئی مشکل پیدا نہیں کریں گے۔ 22 جولائی 1952ء کو چیف منسٹر پنجاب کا ایک بیان سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا مجلس احرار کے لیڈران پنجاب نے اپنی پالیسی کے متعلق ایک تازہ اعلان کیا ہے جس میں یقین دلایا ہے کہ قانون اور انتظام کے قیام میں میری حکومت کے ساتھ مکمل تعاون کریں گے میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ مجلس احرار نے مان لیا ہے کہ پاکستان میں ہر عقیدہ کے لوگ رہتے ہیں اور ہر انسان کی جان مال کا تحفظ حکومت کا فریضہ ہے اور احرار حکومت کے انتظامی احکام کا احترام کریں گے دیگر یہ کہ مسجدوں میں واعظین مسئلہ ختم نبوت کا جو بیان کرتے ہیں حکومت دفعہ 144 کے ذریعے عاجز ہے کہ وہ علماء اور واعظین کو ان مسائل کے بیان کرنے سے روک سکے اس لئے مسجدوں میں مسئلہ ختم نبوت یا اور کسی دینی مسئلہ پر دفعہ 144 کے تحت پابندی کو ختم کیا جائے۔ حکومت کے اس اعلان کے بعد تحریک ختم نبوت کو بڑھاوا دینے کے لئے مسجدوں کا استعمال عام شروع ہو گیا اور حکومت کے کسی حکم کا اطلاق مساجد پر نہیں ہوتا تھا۔

کپ کا واقعہ

ضلع ملتان کے تھانہ کپ میں ایک واقعہ یوں ہوا پولیس کا خیال تھا کہ جلسے جلوسوں کی اجازت نہیں مگر انہیں منتشر کرنے کی اجازت بھی نہیں۔ ضلع ملتان کے تھانہ کپ کے انچارج نے ایک جلسہ عام اور جلوس منتشر کر دیا اس پر احساس ہوا تھانے دار مذکور بے ادب گستاخ ہے اور اس نے رسول پاک کی توہین کی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے دن تقریباً پانچ ہزار انسانوں کے ہجوم نے تھانہ کپ کو گھیر لیا اور گستاخ افسر کے تبادلے کا مطالبہ کیا جو اعلیٰ حکام اس وقت موود تھے انہوں نے ہجوم کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھانے کا جنگلہ ہجوم کے بوجھ سے ٹوٹ گیا اور مجمع تھانے کے اندر داخل ہو گیا۔ 15 پولیس والوں کا ایک دستہ مداخت بے جا کرنے والوں پر لاٹھی چارج کرنے کے لئے باہر نکلا لیکن ہجوم نے ان پر خشت باری کی پولیس مین تھانے کے اندر چلے گئے کچھ لوگوں نے تھانے کو آگ لگانے کی کوشش کی جس پر پولیس نے گولی چلا دی تین آدمی ہلاک اور تیرہ زخمی ہو گئے۔ ملتان فائرنگ کے خلاف احتجاج مقتولین اور مجروحین کے ساتھ اظہار ہمدردی کے لئے بہت جگہوں پر احتجاجی جلسے منعقد ہوئے آخر لاہور ہائی

کورٹ کے ایک جج صاحب نے تحقیقات کی اور فیصلہ دیا کہ پولیس گولی چلانے میں حق بجانب تھی۔ مجلس احرار نے مقتولین کا چہلم مورخہ 29 اگست 1952ء کو منانے کا اعلان کیا مگر ملتان انتظامیہ کو یہ پروگرام اچھا نہیں لگا۔ حکام بالا نے پروگرام چہلم میں مداخلت نہ کرنے کی ہدایت کر دی تھی اور چہلم کا پروگرام پرہجوم طریقہ پر منایا گیا۔ حکمران جماعت مسلم لیگ کے اکثریت لیڈروں نے بھی ختم نبوت یا احرار کے جلسوں کی صدارت شروع کر دی۔ بلکہ عقیدہ ختم نبوت کی حمایت میں تائید میں کتابچے پمفلٹ وغیرہ بھی چھپوا کر لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیئے۔ راقم الحروف خود دیکھا کرتا تھا کہ مجلس احرار کے جلسوں کی صدارت گوجرانوالہ میں کئی بار مسلم لیگی لیڈران نے کی اور تحریک کے ساتھ وہ اس وقت پوری معاونت کرتے تھے۔ بلکہ بعض وقت تحریک کے پروگرام بھی ان کی مرضی سے بنتے تھے دیگر شہروں میں بھی یہ صورت حال تھی گویا مسلم لیگ من حیث الجماعت تحریک ختم نبوت کی حامی تھی بہت تھوڑے مسلم لیگی تھے جو تحریک ختم نبوت کے ساتھ نہ تھے۔

وزیر اعلیٰ پنجاب کی تقریر

سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ نے جلسہ منعقد کر کے قرار دادیں منظور کیں۔ سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ نے مساجد پر دفعہ 144 کی پرزور مذمت کی تھی۔ سٹی مسلم لیگ مطالبہ کرتی ہے کہ 144 کے تمام مقدمات واپس لئے جائیں۔ سٹی مسلم لیگ ان لوگوں کو قانونی امداد دے گی جو مساجد میں دفعہ 144 کی خلاف ورزی میں گرفتار ہوئے ہیں۔ اسی قسم کی قراردادیں سرگودھا اور دیگر شہروں میں مسلم لیگ کے اجلاس میں کی گئی تھیں۔ پنجاب مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں مسئلہ ختم نبوت پر ایک ہی قسم کی چار قراردادیں پیش کی گئیں جن میں مطالبہ تھا کہ مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے مرزائیوں کو سرکاری کلیدی اسامیوں سے الگ کیا جائے۔ سر ظفر اللہ کو وزارت خارجہ سے ہٹایا جائے۔ جو اتفاق رائے سے منظور کی گئیں۔ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ جو پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھی تھے اور پنجاب مسلم لیگ کے صدر بھی تھے۔ انہوں نے اپنی پالیسی تقریر میں کہا کہ ختم نبوت پر جو دیگر مسلمانوں کا عقیدہ ہے وہی میرا بھی ہے مگر یہ معاملہ مرکزی حکومت کے اختیار کا ہے میں مطالبہ کرتا ہوں کہ دستور میں احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور دیگر جو مطالبات مسلم لیگ کونسل نے منظور کئے ہیں مرکزی حکومت فیصلہ کرنے کی مجاز ہے دیگر انہوں نے یہ بھی کہا کہ دنیا کی نظریں اس وقت پاکستان پر لگی ہوئی ہیں کہ یہ اسلام کا گہوارہ ہے اگر پاکستان میں اسلام نافذ ہو گیا تب ہی دنیا اسلامی حکمرانی پر یقین کرے گی کہ واقعی اسلام مکمل نظام حیات ہے۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ اسلامی حکومتوں میں اقلیتیں بھی ہوتی ہیں ان کے جان و مال کی حفاظت سٹیٹ کی ذمہ داری ہوتی ہے اس لئے میں تمام شہروں سے

اپیل کروں گا کہ وہ ہر شہری کی جان مال عزت کی حفاظت میں حکومت کے ساتھ معاونت کریں اور حکومت ہر حالت شہریوں کی جان کے تحفظ کی ذمہ داری پوری کرے گی۔ اور انہوں نے کہا کہ جو لوگ پاکستان میں رہتے ہوں حکومت کا فرض ہے کہ ان کے جان و مال عزت کا تحفظ کرے اور حکومت اقلیتوں کے تحفظ کو یقینی بنائے گی۔ نظام آباد کے مقام پر انہوں نے 25 اکتوبر 1952ء کو تقریر کی، فرقہ بندی کی مخالفت کی اور ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ جو شخص ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتا وہ مسلمان ہی نہیں مرزائیت کے متعلق جو مطالبات ہیں ان کا تعلق دستور سے ہے وہ مرکزی حکومت کے دائرہ اختیار میں ہے وہی اسے حل کرنے کی مجاز بھی ہے۔

بعد کے واقعات

جب تمام احکام امتناعی واپس لے لئے گئے اور سابقہ مقدمات بھی واپس لے لئے گئے۔ مقدمات میں سزایافتہ گان کی سزائیں بھی معاف کر دی گئیں تو کارکنان ختم نبوت کو کسی قسم کا دھڑکا نہیں رہا تو وہ زیادہ شدت کے ساتھ متحرک ہو گئے - 6 مارچ 1953ء سے قبل 390 جلسے منعقد ہوئے جن میں 167 جلسے صرف احرار والوں کے تھے۔ سید مظفر علی، شیخ حسام الدین صاحب حضرت سید فیض الحسن صاحب ماسٹر تاجدین انصاری، مولانا محمد علی جالندھری جو احرار کے ممتاز لیڈر تھے وہ جلسوں میں احمدیوں کے خلاف ہر قسم کے دلائل دہراتے اور احمدیوں کے خلاف سخت ترین الفاظ استعمال کئے جاتے ساتھ ہی اشتہارات کتابچے اخباروں میں مضامین بھی لکھے جاتے۔ چودھری سر محمد ظفر اللہ، مرزا بشیر الدین کے جنازے نکالے جاتے۔ فضاء دن بدن پراگندہ ہو رہی تھی۔ مصری شاہ لاہور میں ایک مرزائی پر حملہ کیا گیا۔ جھنگ کے ایک گاؤں میں احمدیوں اور غیر احمدیوں میں لڑائی ہوئی۔ جب خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان لاہور آئے تو ہڑتال ہو گئی جن لوگوں نے ہڑتال نہیں کی ان کے منہ کالے کئے گئے۔ جوتیوں کے ہار پہنائے گئے۔ 27 جولائی 1952ء کو لاہور مسلم لیگ کے دفتر کے باہر بلوہ ہو گیا جس میں 44 پولیس مین زخمی ہو گئے - سیالکوٹ میں احمدیوں کی مسجد کو آگ لگانے کی کوشش کی گئی۔ اخبارات بدستور احمدیت کے خلاف لکھ رہے تھے - زمیندار جو ان چار اخباروں میں ایک تھا جس کو پنجاب حکومت امداد کر رہی تھی وہ بڑے پرزور انداز سے مرزائیت کے خلاف لکھ رہا تھا۔ آزاد اخبار میں ایک مضمون چھپا جس پر مقدمہ چلایا جانا ضروری ہو گیا تھا مگر ہوم سیکرٹری اور چیف منسٹر کے کہنے پر اخبار کو صرف وارننگ کرنے پر اکتفا کیا گیا۔ اس اخبار نے 11 ستمبر 1952ء کو مطالبہ نمبر چھاپا تھا جو سارا احمدیوں کے خلاف ہی لکھا گیا تھا اور مرزا غلام احمد کو سانپ کی شکل میں دکھایا گیا تھا اور اسی اخبار آزاد کے اداریہ میں یہ الفاظ بھی لکھے گئے تھے یہ آخر کب تک ایک زانی، شرابی، غنڈے بدمعاش، مفتری کاذب، اور دجال کو نبی مسیح موعود احمد کے نام سے پکارا جاتا رہے گا اور ہمارے

کان سنتے رہیں گے۔ اس طرح آفاق اخبار بھی بڑے زور شور سے مرزائیت کے خلاف لکھ رہا تھا۔ احسان اور مغربی پاکستان نے بھی مرزائیت کے خلاف بھرپور انداز میں خبریں اور ادارتی نوٹ لکھے اور مندرجہ بالا اخبارات ہمہ وقت ہر اشاعت میں مرزائیت کے خلاف لکھ رہے تھے اور رائے عامہ مرزائیت کے خلاف بڑی تیزی کے ساتھ ہو رہی تھی۔ میلہ منڈی مویشیاں گلو شاہ ضلع سیالکوٹ میں بھی احراری عالم مولوی کرامت علی اور دوسرے روز اسی میلہ میں مولانا بشیر احمد پسروری نے مرزائیت کے خلاف تقریر کی اور لوگوں میں مرزائیت کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا گیا۔

16'15'14 نومبر 1952ء کو راولپنڈی میں آل پارٹیز مسلم کنونشن کے زیر اہتمام ایک تین رزہ کانفرنس ہوئی جس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری ماسٹر تاجدین انصاری شیخ حسان الدین قاضی احسان احمد شجاع آبادی مولانا محمد علی جالندھی نے مرزائیت کے خلاف مدلل تقاریر کیں اور مرزائیت کے خلاف لوگوں میں بہت جوش و خروش پیدا ہوا اور علماء کرام نے اپنی تقاریر میں واشگاف الفاظ میں کہا کہ مرزائی مرتد ہیں اور اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اس لئے مرزائی ازروئے اسلام واجب القتل ہیں۔ سر ظفر اللہ اور بشیر الدین محمود کی غداری کی وجہ سے ضلع گرداسپور بھارت میں شامل ہوا تھا ان جلسوں اور جلوسوں اخباری بیانات کتابچوں کی وجہ سے لوگوں میں مرزائیت کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی کئی جگہ لوگ مرزائیت چھوڑ کر دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل گئے۔ اس دوران قاضی احسان احمد شجاع آادی مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولانا اختر علی ایڈیٹر روزنامہ زمیندار لاہور بھی وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین سے ملے انہیں مرزائیت کے مسئلہ کی سنگینی کے متعلق بتایا اور مطالبات مان لینے پر قائل کیا خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان نے اراکین وفد کو یقین دلایا کہ ان کے مطالبات حقیقت پر مبنی ہیں مگر اس سلسلہ میں کچھ آئینی دشواریاں ہیں جن کو دور کئے بغیر مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اس مسئلے کو حل کرنے میں کچھ وقت لگے گا اور انہوں نے وفد کو مزید یقین دلایا کہ وہ بہت کوشش کریں گے کہ مسئلہ جلد از جلد حل ہو جائے۔

آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی

آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن بلانے کے لئے حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب نے 11 دسمبر 1952ء کو دعوت نامے جاری کر دیئے جس میں 16-17-18 جنوری 1953ء کو آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن بلانے کے دعوت نامے جاری کئے گئے۔ 16 جنوری 1953ء کو بعد نماز جمعہ مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کی مسجد میں اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں پاکستان کے بڑے بڑے علماء جمع ہوئے مسئلہ احمدیت پر بحث ہوئی۔ سبجیکٹس کمیٹی مرتب کی گئی ایک تحریری بیان میں مندرجہ

ذیل علماء کے نام درج ہیں جو اجلاس میں شریک ہوئے مولانا ابوالعلی مودودی صدر جماعت اسلامی لاہور' حاجی محمد امین امیر جماعت ناجیہ' خلیفہ حاجی صاحب ترنگ زئی پشاور' حضرت پیر سید شریف مشرقی بنگال ڈھاکہ 'مولانا راغب حسین ایم اے ڈھاکہ' مولانا عزیز الرحمان ناظم حزب اللہ ڈھاکہ' مولانا اطہر علی ڈھاکہ' مولانا سخاوت الانبیاء ڈھاکہ' مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی' مولانا محمد یوسف بنوری صدر مدرس درالعلوم ٹنڈو اللہ یار' مولانا شمس الحق وزیر معارف قلات' مولانا احمد علی صدر جمعیت علماء اسلام شیرانوالہ گیٹ لاہور' مولانا محمد حسن جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور' مولانا محمد ادریس صدر مدرس جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور' مولانا ظفر احمد سیکرٹری تعلیمات اسلامی بورڈ کراچی' مولانا سید سلیمان ندوی صدر تعلیمات اسلامی بورڈ کراچی' مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی کراچی سندھ' مولانا محمد شفیع مفتی دیوبند تعلیمات اسلامی بورڈ کراچی' مولانا مفتی صاحب داد خان مدرس سندھ مدرسہ کراچی' مولانا عبدالحامد بدایونی صدر جمعیت علماء کراچی' مولانا محمد یوسف کلکتوی صدر جمعیت اہل حدیث کراچی' مولانا محمد اسماعیل ناظم جمعیت الحدیث' مولانا محمد داؤد غزنوی ایم ایل اے صدر جمعیت اہل حدیث لاہور' مولانا محمد علی جالندھری سیکرٹری مجلس احرار ملتان' امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری' مولانا متین ناظم جمعیت علماء اسلام کراچی' مولانا احتشام الحق کنونیر آل پاکستان مسلم پارٹی کنونشن کراچی' مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیت علمائے پاکستان وصدر مجلس عمل لاہور۔

17 جنوری 1953ء کو نماز مغرب کے بعد سبجکٹس کمیٹی کا اجلاس اور 18 جنوری کو کنونشن کی دوسری نشست ہوئی جس میں درج ذیل قرار داد منظور کی گئی۔

نمبر 1 = حکومت سے کوئی امید نہیں کہ وہ اس مسئلہ کو مسلمانوں کی خواہش کے مطابق حل کرے اس لئے آل پارٹیز مسلم کنونشن اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ مطالبات جن میں مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے لئے سر ظفر اللہ کو وزارت خارجہ سے ہٹانے کے لئے اور حکومت کی کلیدی آسامیوں سے مرزائیوں کو ہٹانے کے لئے راست اقدام یقینی ہو گیا ہے۔

نمبر 2 = آل پارٹیز مسلم کنونشن مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ مرزائیوں کا سماجی بائیکاٹ کریں اور ہر قسم کے سماجی تعلقات مرزائیوں سے منقطع کر دیں۔

نمبر 3 = چونکہ ابھی تک وزارت سے سر ظفر اللہ کو ہٹایا نہیں گیا اس لئے آل پارٹیز مسلم کنونشن خواجہ ناظم الدین کی حکومت سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کرتی ہے۔

نمبر 4 = مذکورہ مطالبات کو عملی صورت دینے کی غرض سے کنونشن تجویز کرتی ہے کہ وہ دیگر مذہبی جماعتوں کو جنرل کونسل کا ممبر بنائے۔

نمبر 5 = جنرل کونسل مندرجہ ذیل آٹھ اصحاب کو مجلس عمل کا ممبر منتخب کرتی ہے۔

مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری' امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری' مولانا ابو العلی مودودی' مولانا عبدالحامد بدایونی' حافظ کفایت حسین' مولانا احتشام الحق تھانوی' ابو صالح محمد صغیر پیر صاحب

سرہینہ شریف مشرقی پاکستان' مولانا محمد یوسف کلکتوی۔ ان ممبران کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے مزید آٹھ ممبر نامزد کریں۔ مندرجہ ذیل مزید مجلس عمل کے سات آدمی نامزد کئے گئے۔ پیر غلام مجدد سرہندی' مولانا نور الحسن' ماسٹر تاجدین انصاری' مولانا اختر علی خان' مولانا محمد اسماعیل صاحب گوجرانوالہ' صاحبزادہ فیض الحسن' حاجی محمد امین آل پارٹیز مسلم مجلس عمل کی ممبران کی کل تعداد 43 تھی۔ اس اجلاس میں مجلس عمل نے ایک وفد ترتیب دیا کہ وہ وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین سے ملے اور اپنے مطالبات پیش کرے۔ وفد وزیر اعظم سے ملا اور ملاقات بہت اچھے ماحول میں ہوئی مگر وزیر اعظم نے مطالبات منظور کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ اس موقع پر جماعت اسلامی نے مجلس عمل کے اقدامات سے اختلاف کیا انکی رائے یہ تھی کہ اس موقع پر حکومت کے خلاف راست اقدام اٹھانا بے موقع ہے اور مزید جماعت اسلامی نے یہ بھی رویہ اختیار کیا کہ 22 جنوری 1953 کو وزیر اعظم سے مجلس عمل کے وفد کی ملاقات غیر آئینی تھی اور ملاقات کرنے والا وفد کنونشن کا صحیح نمائندہ نہ تھا۔ اور ساتھ ہی جماعت اسلامی نے اپنے ممبران کو ہدایت جاری کر دی کہ وہ راست اقدام کے کسی فارم پر دستخط نہ کرے جو مجلس عمل کے راست اقدام کی حمایت کرے گا اسے جماعت سے خارج کر دیا جائے۔ جماعت نے یہ سرکولر اپنی تمام ماتحت جماعتوں کو بھیجے تھے اور صرف دو اراکین جماعت نے جماعتی احکامات کی پرواہ نہیں کی تھی انہیں جماعت سے خارج کر دیا گیا تھا۔

وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ سے مزید ملاقات

خواجہ ناظم الدین 16 فروری 1953ء کو لاہور تشریف لائے ایک وفد ان سے ملنے گیا جس کے ممبران حسب ذیل تھے مولانا اختر علی خان ایڈیٹر زمیندار' مولانا ابو احسنات سید محمد احمد قادری' سید مظفر علی شمسی حافظ کفایت حسین ماسٹر تاجدین انصاری' خواجہ ناظم الدین نے مطالبات منظور کرنے سے معذرت چاہی۔

20 فروری کو ایک اور وفد جس میں مولانا محمد بخش مسلم صوفی غلام محمد ترنم سید مظفر علی شمسی اور حافظ کفایت حسین شریک تھے۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ سے ملاقات کی احمدیوں کے خلاف شکایات پیش کیں جن کا تدارک صوبائی حکومت کر سکتی تھی۔ وزیر اعلیٰ پنجاب نے شکایت کی تحقیق کرنے کا وعدہ کیا۔

21 فروری 1953ء کو مجلس عمل کا ایک وفد وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین کی خدمت میں حاضر ہوا جن میں مولانا سید سلیمان ندوی' احتشام الحق تھانوی مفتی محمد شفیع مولانا اختر علی

خان اور مولانا عبدالحامد بدایونی شامل تھے۔ وفد نے مطالبات پیش کئے اور یاد دلایا کہ ایک مہینہ گزر چکا ہے مگر ابھی تک حکومت نے مطالبات نہیں مانے اس ملاقات میں وزیر اعظم کے ساتھ سردار عبدالرب نشتر بھی موجود تھے۔ گفتگو کے دوران مولانا احتشام الحق تھانوی نے کاغذ کے ایک پرزے پر کچھ لکھ کر وفد کے ہمراہ ساتھیوں کو دکھایا۔ مولانا عبدالحاما بدایونی کے سوا باقی سب ممبران نے تائید میں سر ہلا دیا۔ دوسرے روز مولانا عبدالحامد بدیوانی نے خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کا وقت مانگا وقت ملنے پر خواجہ صاحب کے پاس مندرجہ ذیل ہمراہیوں کے ساتھ وزیر اعظم کے پاس پہنچے۔ ماسٹر تاجدین انصاری' مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری' سید مظفر علی شمسی ان کے ساتھ تھے۔ ملاقات کے وقت جناب نشتر بھی خواجہ صاحب کے ساتھ تھے۔ مطالبات تسلیم نہ ہوئے اور اراکین وفد کو بتا دیا گیا کہ نہ ہی مطالبات تسلیم ہو سکتے ہیں اور نہ ہی دستوری سفارشات میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔

ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ

26 جنوری 1953 کو مرکزی مجلس عمل کا ایک اجلاس کراچی میں ہوا جس میں مندرجہ ذیل حضرات نے شرکت کی ماسٹر تاجدین انصاری' صاحبزادہ فیض الحسن صاحب' سید نور الحسن بخاری' مولانا سلطان احمد صاحب' امیر جماعت اسلامی سندھ کراچی مولانا سید ابوالحسنات محمد احمد صاحب قادری مولانا عبدالحامد بدایونی' مولانا احتشام الحق تھانوی' سید عطاء اللہ شاہ بخاری محمد یوسف کلکتوی سید مظفر علی شمسی ان دس لیڈران کے اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ حکومت کو مطالبہ کی منظوری کے لئے ایک ماہ جو نوٹس مورخہ 22 فروری کو دیا تھا اس کی معیاد ختم ہو گئی تھی اور مزید چار دن بھی اوپر ہو گئے ہیں حکومت نے مسلم مجلس عمل کے مطالبات کو قابل توجہ نہ سمجھا اس لئے مجلس عمل نے تحریک چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ طریقہ کار یوں ہو گا کہ پانچ آدمیوں کا ایک وفد ہاتھوں میں مطالبات کا بینر اٹھایا ہو گا پر امن طریقہ پر وزیر اعظم کے دفتر یا کوٹھی پر جائیں گے وہاں مطالبات منوانے کے لئے دھرنا مار کر بیٹھ جائیں گے مطالبات مانے جانے کی صورت میں واپس آ جائیں گے۔ گرفتاری کی صورت میں مزید پانچ آدمی وزیر اعظم کی کوٹھی پر مطالبات منوانے کے لئے پہنچ جائیں گے۔ اور اس طرح گورنر جنرل ہاؤس پر بھی رضا کر بھیجے جائیں گے۔ مولانا ابوالحسنات صدر مجلس کو اس تحریک کا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا اسی روز شام آرام باغ میں مجلس عمل کی طرف سے جلسے کا اعلان بھی کیا گیا مجلس عمل کے مطالبات میں ایک مطالبے کا مزید اضافہ کیا گیا کہ ربوہ ضلع جھنگ میں جو اراضی برائے نام قیمت پر مرزائیوں کو دی گئی ہے ان سے واپس لی جائے اور مہاجرین میں تقسیم کی جائے دیگر یہ کہ مجلس عمل نے گزشتہ ماہ یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ کھانے پینے کی دکانوں پر بورڈ آویزاں کئے جائیں کہ مرزائیوں کے برتن الگ ہیں یعنی

ان کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک کیا جائے۔ اور یہ بھی فیصلہ کیا گیا تھا کہ مرزائیوں کو مسلمانوں کے قبرستانوں میں بھی دفن نہ کیا جائے۔ مسلمانوں کے کنوئیں سے پانی نہ بھرنے دیا جائے۔ مرزائیوں کی دکانوں پر پکٹنگ لگائی جائے۔ 16 فروری 1953ء کو وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین کی لاہور آمد پر سارے شہر میں ہڑتال کی گئی اور کالی جھنڈیوں سے استقبال کیا گیا۔

27 فروری 1953ء

تحریک میں شدت پنجاب میں فسادات

27 فروری 1953ء کو مجلس عمل کے ممبران کو کراچی میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ تحریک جاری کرنے کی ہدایات پنجاب کی مجلس عمل اور لیڈروں کو مل چکی تھی۔ پروگرام کے مطابق رضا کاروں کے چند دستے لاہور سے کراچی روانہ ہو چکے تھے۔ جو دستہ دو فروری کو غازی علم دین کی زیر قیادت کراچی روانہ ہوا تھا اسے پنجاب پولیس نے لودھراں ریلوے اسٹیشن پر گاڑی روک کر اتار لیا تھا باقی دو دستے جو سالار معراجدین اور پیر فیض الحسن صاحبان کی زیر قیادت کراچی روانہ ہو چکے تھے وہ منزل مقصود پر خیرت سے پہنچ گئے۔ تحریک کے دیگر سرکردہ لیڈران کو حکومت نے گرفتار کر لیا اور تحریک ختم نبوت لیڈران کے بغیر ہی بے ہنگم طریقے پر چالو ہو گئی۔ یقینی بات ہے کہ بے ہنگم طریقے پر چلنے والی تحریک بہتر نتائج کی بجائے نقصان دہ ہوتی ہے۔ لیڈران کی گرفتاریوں کی وجہ سے جلوس اور جلسے بے ہنگم طریقے سے ہونا شروع ہو گئے جو جس کے ذہن میں آتا وہی کچھ کرتا جاتا۔ عموی طور پر سارے پنجاب میں تحریک کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ خصوصی طور پر لاہور گوجرانوالہ سیالکوٹ' راولپنڈی لائلپور منٹگمری اور دیگر بہت سارے شہروں میں بدنظمی اور ابتری کا سیلاب اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ قابو سے باہر ہو گیا۔ اور بالآخر لاہور میں تاریخ پاکستان کے پہلے مارشل لاء کا جواز بنا سرکاری رپورٹ کے مطابق یہ واقع دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ تحریک ختم نبوت کا سب سے بڑا حمایتی اخبار زمیندار کے ایڈیٹران چیف جناب مولانا اختر علی خان کو جب پولیس گرفتار کرنے ائی تو انہوں نے فورا معافی مانگ لینے کی پیش کش کر دی۔ انہیں جب تھانہ سول لائن میں پولیس گرفتار کرکے لے گئی تو انہوں نے تحریری معافی مانگ لی جو ان کے سیاسی کیئریر پر ایک بدنام داغ لگ گیا جو ہمیشہ کے لئے ذلت امیز معافی تھی اس معافی کے الفاظ تحقیقاتی رپورٹ میں لکھے ہوئے ہیں اور پولیس نے ایڈیٹر زمیندار مولانا اختر علی خان کو معافی مانگ لینے کے بعد رہا کر دیا تھا۔ جب تحریک کے ساتھ وابستہ لوگوں کو مولانا اختر علی خان کے معافی نامے کا پتہ چلا تو ان کا گھیراؤ کر لیا گیا پتہ چلا کہ وہ اپنے آبائی گاؤں وزیر آباد کے قریب کرم آباد گئے ہوئی ہیں تو لوگ وہاں پہنچ گئے انہیں پکڑ کر لاہور لایا گیا مسجد وزیر خان میں پھر انہوں نے گرفتاری دینے کا اعلان کیا اور پھر بعد میں وہ گرفتار کر لئے گئے لاہور میں '27 فروی تک تو جلوس کے ساتھ لوگ گرفتاری پیش کرنے آتے پولیس انہیں گاڑیوں میں بیٹھا کر شہر سے باہر لے جا کر چھوڑ دیتی بعد میں دفعہ 144 نافذ کر دی گئی اور تحریک میں بھی شدت پیدا ہو گئی کئی طرف سے جلوس نکل کر آتے۔ گرفتار کئے جاتے یا لاٹھی چارج سے منتشر کر دیئے جاتے۔ تحریک

ختم نبوت کا مرکز مسجد وزیر خان بن چکا تھا۔ تحریک کی قیادت مولانا عبدالستار خان نیازی اور دیگر گمنام علماء کے ہاتھ میں تھی۔ 28 فروری کو حضرت مولانا احمد علی لاہور نے ایک سو رضا کاروں کی قیادت کرتے ہوئے دہلی دروازہ کے قریب گرفتاری پیش کی یہاں پر ہجوم نے پولیس کو ایک گاڑی پر پتھراؤ بھی کیا۔ یکم مارچ کے بعد شہر میں ہزاروں مختلف قسم کی افواہیں پھیل رہی تھیں۔ دہلی دروازہ کے ایک جلسہ میں ایک بچے کو پیش کیا گیا جو کہہ رہا تھا کہ میں نے خود پولیس کو قرآن شریف کی بے حرمتی کرتے ہوئی دیکھا اس نے پھٹے ہوئے قرآن کے اوراق پیش کئے اور کہا کہ پولیس نے ایک رضا کار پر تشدد کیا اور اس کے ہاتھوں میں قرآن تھا وہ پھاڑ کر پھینک دیا اور یہ اسی قرآن کے پھٹے ہوئے اوراق ہیں اس طرح کے اور کئی واقعات لوگوں میں گشت کرنا شروع ہو گئے کئی دفعہ ہجوم کو منتشر کرنے کے لئے پولیس کو ہوائی فائرنگ کرنا پڑی اور چند دفعہ سیدھی گولی بھی چلائی جس سے چند لوگ زخمی ہوئے اور دو تین مجموئی طور پر شہید بھی ہوئے۔ ایک واقعہ یوں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ چوک دالگراں میں رضا کاروں کا ایک جلوس تھا پولیس انہیں گرفتار کرنا چاہتی تھی وہ مزاحمت کر رہے تھے گرفتاری دینے والے رضا کار زمین پر بیٹھ گئے۔ پولیس نے جب انہیں اٹھانا چاہا تو وہ لیٹ گئے انہیں گھسیٹ کر پولیس گاڑی کی طرف لے جایا گیاایک رضا کار نے گلے میں حمائیل لٹکا رکھی تھی رضا کار کو گھسیٹنے کی وجہ سے حمائیل کی بے ادبی ہوئی یہ واقعہ بھی مزید اشتعال کا باعث بنا۔ غرض سارے پنجاب اور کراچی میں عموی طور پر خصوصی طور پر پنجاب میں بد نظمی انتہا کو تھی فوج نے لاہور اور دیگر شہروں میں گشت لگانا شروع کر دیا تھا مگر کوئی حکم جاری نہیں ہوا تھا کہ لاہور یا کسی اور شہر کو فوج کے حوالے کر دیا ہے یا مارشل لاء لگا دیا گیا ہے۔ ہم نے گوجرانوالہ میں بھی دیکھا تھا کہ دو تین یوم چند بکتر بند گاڑیاں شہر میں گھومتی رہیں۔ مگر انہوں نے کوئی کارروائی نہ کی تھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فوج شہروں میں گھومنے آئی تھی۔ راقم الحروف گوجرانوالہ میں رہتا تھا۔ ختم نبوت کے جلوسوں میں عقیدت کے ساتھ جاتا تھا جلوس شہر میں گھوم کر تھانے والے بازار میں تھانے کے آگے پہنچ کر گرفتاریاں پیش کرتے تھے۔ پولیس گرفتاری دینے والوں کے علاوہ شرکاء کے جلوس پر نظر ڈالتی انہیں اگر کوئی داڑھی والا ذہین قسم کا آدمی نظر آتا تو اسے بھی گرفتار کر لیتے۔ میں نے داڑھی رکھی ہوئی تھی مگر گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے گرفتار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس لئے پھر جلوس میں شامل ہونا چھوڑ دیا تھا گوجرانوالہ میں بھی بد نظمی بہت زیادہ تھی۔ تحریک ختم نبوت کا مرکز جامع مسجد شیرانوالہ باغ تھا وہیں پر جلسے ہوتے تھے تحریک کے متعلق احکامات بھی جاری کئے جاتے تھے۔ حکیم عبدالرحمان 1994ء میں بھی زندہ ہیں وہ گوجرانوالہ کے لئے تحریک ختم نبوت کے ڈکیٹر مقرر کئے گئے تھے اور شہر میں اس وقت احکامات ان کے چل رہے تھے۔ شہر کے علماء حضرات بشمول مولانا اسماعیل صاحب مفتی عبدالواحد صاحب قاضی شمس الدین صاحب اور دیگر علماء اور احرار لیڈر گرفتار ہو چکے تھے۔ مگر تحریک کا کوئی بھی ڈکیٹر خفیہ طور پر بنا لیا جاتا تھا۔ وہ احکامات دیتا اور اس پر عمل

ہوتا تھا۔ شہر کے معززین اور مسلم لیگی لیڈران کو مسجد شیرانوالہ باغ میں پکڑ کر لایا جاتا ان سے تحریک ختم نبوت کے حق میں بیان لیا جاتا اس وقت مرکز اور صوبے میں مسلم لیگ کی حکومت تھی مسلم لیگ ایم ایل اے میاں منظور حسن کو جامع مسجد شیرانوالہ باغ میں لایا گیا لاؤڈ سپیکر پر ان سے مسلم لیگی حکمرانوں کے خلاف تقریر کرائی گئی۔ شیخ آفتاب گوجرانوالہ مسلم لیگ کے صدر تھے انہیں پکڑ کر مسجد میں لایا گیا مسلم لیگی حکومت کے خلاف تقریر کرانی چاہی مگر شیخ آفتاب تحریک ختم نبوت کے تو حامی تھے مگر وہ مرکزی لیڈر شپ کو گالیاں نہیں دینا چاہتے تھے انہیں بے عزت بھی کیا گیا اور انہیں جلوس میں شامل کر کے گرفتار کرا دیا گیا۔ جب تک تحریک چلتی رہی وہ اندر ہی رہے بعد میں وہ حکومت کی مرضی سے باہر آ گئے۔ اس طرح ہر معزز شخص کو جیل میں دھکیلنے کی کوشش کی جاتی تھی اس وقت گوجرانوالہ شہر کے ڈپٹی کمشنر ملک عبدالقدوس تھے وہ بڑے اچھے آدمی تھے انہوں نے شہر میں کوئی سختی نہیں ہونے دی تھی۔ بے ہنگم ہجوم سٹیشن پر جا کر گاڑی روک لیتا کئی کئی گھنٹے گاڑی روک لی جاتی مگر پولیس سختی نہ کرتی تھی پھر ڈپٹی کمشنر صاحب یا کوئی دوسرا بڑا افسر ہجوم میں جاتا اور لوگوں کو سمجھاتا اور گاڑی چلوا دی جاتی تھی۔ گوجرانوالہ تحریک ختم نبوت میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو بظاہر تحریک کے حامی تھے مگر در پردہ حکومت کے آدمی تھے اور وہ معززین شہر میں بھی شمار ہوتے تھے مذہب اور عقیدت کے ساتھ بھی ان کا لگاؤ تھا ان کی خفیہ رپورٹ پر تحریک کے متحرک کارکنوں کو بڑی آسانی سے گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ تحریک کو شدت دینے کے لئے مختلف قسم کی خبریں لوگوں میں پھیلائی جاتی تھیں ایک خبر یہ بھی آئی تھی کہ جھنگ اور سرگودھا میں گولی چلنے سے سینکڑوں لوگ شہید ہو گئے فلاں جگہ یہ ہو گیا فلاں جگہ وہ ہو گیا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ حاکم جماعت کے لوگوں نے تحریک کے حق میں بیان دیئے تھے اور بعد میں وزیر اعلیٰ پنجاب نے اور مسلم لیگ پنجاب نے تحریک ختم نبوت کے حق میں بیانات دیئے جو تحریک میں تقویت کا باعث بنے۔ 2 مارچ کو ہجوم نے شام کے وقت کراچی جانے والی گاڑی سندھ ایکسپریس روک لی تین گھنٹے گاڑی رکی رہی ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پولیس لے کر آ گئے گاڑی چلوانے کی کوشش میں ہجوم نے ان پر اور پولیس پر خشت باری کی جس سے اے ڈی ایم اور چار پولیس والے معمولی زخمی ہوئے۔ اے ڈی ایم صاحب نے ہوائی فائرنگ کا حکم دیا ہجوم منتشر ہو گیا اور گاڑی روانہ ہو گئی کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔

8 مارچ کو مسلم لیگی لیڈران اور ممبران اسمبلی کو جامع مسجد شیرانوالہ باغ میں طلب کیا گیا اور ڈکٹیٹر کے حکم پر انہیں مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت جو ملک پر حکمرانی کر رہی تھی بھیجا گیا کہ وہ تحریک ختم نبوت کے مطالبات کے بارے اعلیٰ قیادت پر دباؤ ڈالیں اور ان کی رائے معلوم کریں گوجرانوالہ ضلع اور شہر میں تحریک ختم نبوت میں نمایاں کام کرنے والے لیڈران مندرجہ ذیل حضرات تھے۔ حضرت سید پیر فیض الحسن صاحب، حضرت مولانا محمد اسماعیل، حضرت مفتی

عبدالواحد صاحب' حافظ عبدالشکور صاحب کاموئکی' لطیف احمد چشتی کاموکے' کامریڈ عبدالکریم وزیر آبادی حکیم عبدالرحمان ڈکٹیٹر بھی شامل تھے۔

سیالکوٹ میں بھی تحریک ختم نبوت میں غیر معمولی واقعات ہوئے تحریک کی قیادت ضلع سیالکوٹ و دیگر ہزاروں لوگوں کے ساتھ حضرت مولوی بشیر احمد صاحب پسروری کرامت علی شاہ صاحب' منظور احمد شاہ صاحب' سائیں حیات محمد پسروری مولوی محمد حسین مولوی محمد علی کاندھلوی' مولوی حبیب احمد عبدالغفور بٹ صاحبان شامل تھے۔ دوسرے شہروں کی طرح سیالکوٹ میں تحریک کے مراکز مسجدوں میں ہی تھے۔ ہجوم در ہجوم لوگ جلوسوں میں شامل ہوتے گرفتاریاں پیش کرتے جلسے کرتے۔ ایک ہجوم نے پولیس پر خشت باری کی اور پولیس نے گولی چلا دی جس سے ایک آدمی شہید ہوا شہید کی نعش کو جلوس کی شکل میں سارے شہر میں گھمایا گیا اور بعد میں یہ جلوس سٹی مسلم لیگ کے دفتر پہنچا۔ خواجہ محمد صفدر ایم ایل اے صدر سٹی مسلم لیگ کو دفتر سے نکال لیا گیا ان کا منہ کالا کیا اور انہیں بازاروں میں پھرایا۔ آخر کرنل خوشی محمد نے انہیں ہجوم سے رہائی دلائی جلوس نعش اٹھائے ہوئے جناح پارک پہنچا جہاں پچاس ہزار لوگوں نے مولوی محمد یعقوب کی امامت میں متوفی کا نماز جنازہ ادا کیا۔ مولوی حضرات نے حکومت کے خلاف پرزور تقاریر کیں۔ 4 مارچ کو سیالکوٹ میں ایک جلوس پر فوج نے گولی چلا دی جس سے چار آدمی شہید اور کئی زخمی ہوئے۔ 6 مارچ کو پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے احکامات سے حالات یکسر بدل گئے اور تحریک میں پھر شدت آگئی۔ 10 مارچ کے احکامات جو افسران کو ملے جس میں تحریک کو کچلنے کا حکم دیا گیا تھا اس کے بعد سیالکوٹ میں بھی تحریک مدھم پڑ گئی اور حالات کنٹرول میں کر لئے گئے۔

راولپنڈی میں بھی تحریک شدت سے چلی جب کراچی میں تحریک زور پر تھی تو مولانا غلام اللہ خان 28 فروری کو گرفتار کر لئے گئے۔ دھڑا دھڑ جلوس اور جلسے منعقد ہونا شروع ہو گئے۔ ایک جلسہ لیاقت باغ میں پیر آف گولڑا شریف کی زیر صدارت منعقد ہوا یہ بہت بڑا جلسہ تھا جس میں لاہور سیالکوٹ میں گولی چلنے کی مذمت کی گئی۔ جب دوران تحریک حکومت پنجاب کا بیان آیا اور لوگوں نے سمجھ لیا کہ تحریک کامیاب ہو چکی ہے اور حکومت نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں تو لیاقت باغ کے جلسہ سے ایک بہت بڑا جلوس مری روڈ کی طرف چل دیا راستے میں احمدیوں کی ایک کار کو آگ لگا دی گئی اور ایک نوجوان کو احمدی سمجھ کر چھرا گھونپ دیا مضروف زخموں کی تاب نہ لا کر فوت ہو گیا۔ 8 مارچ کو گورنمنٹ کالج کے طالب علم مسعود ملک اور مولوی عبدالقدوس پونچھی کی زیر قیادت ایک جلوس کوتوالی تھانہ کے سامنے جمع ہو گیا تھانے پر خشت باری شروع کر دی۔ سٹی مجسٹریٹ کے حکم سے ہجوم پر گولی چلائی گئی ایک آدمی شہید ہو گیا اور چھ لوگ شدید زخمی ہوئے۔ دفعہ 144 نافذ کر دی گئی پانچ سو سے زائد لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ جلوس کے لیڈران جامع مسجد میں مورچہ بند ہو گئے اور گرفتاری کے لئے رضا کار بھیجتے تھے راولپنڈی کے ضلع میں مارچ کے تیسرے ہفتہ میں تحریک مدھم پڑ گئی اور پھر ختم ہو گئی۔ لائلپور میں بھی شدت کے ساتھ تحریک

چلی ہجوم نے ریلوے کی پٹڑی اکھیڑ دی - ہجوم کو وارننگ دی گئی کہ وہ منتشر ہو جائیں تعمیل حکم سے انکار ہونے پر پولیس نے گولی چلا دی جس سے چار آدمی شہید اور چودہ زخمی ہوئے انفرادی طور پر احمدیوں نے لائلپور میں گولی چلائی جس سے بعض بچے زخمی ہوئے۔ لائلپور میں تحریک کی قیادت مشہور احرار لیڈران جانباز مرزا مولوی فیروز میرداد حافظ عبدالقدیر مولوی عنایت اللہ نے کی تحریک ختم نبوت پورے پنجاب اور کراچی میں بڑے زور و شور سے چلی پنجاب کے تقریباً ہر ضلع شہر اور قصبہ سے احتجاجی جلوس نکالے گئے - زور شور سے تحریک لائی گئی ہزاروں لوگوں نے گرفتاریاں پیش کیں مگر تشدد کے واقعات مندرجہ بالا شہروں میں ہی ہوئے باقی ہر شہر قصبہ میں پرامن جلسے جلوس ہوتے رہے - لاہور مجموعی طور پر تحریک کا مرکز تھا لاہور سے ہی سارے پنجاب کو خبریں جاتی تھیں۔ لاہور میں یکم مارچ کے بعد کئی جگھوں پر گولی چلی بہت لوگ شہید اور زخمی بھی ہوئے۔

کارکنان تحریک اشتہارات کے ذریعہ لوگوں کو تاثر دے رہے تے کہ فلاں فلاں جگہ پولیس نے گولی چلائی لاٹھی چارج کیا اتنے آدمی شہید ہو گئے بہت سارے زخمی ہوئے لوگوں میں حکام کے خلاف نفرت پیدا ہو چکی تھی - لاہور میں ہی ایک پراسرار موٹر کار نے کئی جگہ اندھا دھند گولیاں چلائی لوگوں میں تاثر پیدا ہوا کہ احمدی ایسا کر رہے ہیں۔ ان حالات میں دفتروں کے سرکاری ملازمین نے کام چھوڑ دیا۔ ہڑتال کر دی سب سے پہلے سول سیکٹریٹ میں کام چھوڑ ہڑتال ہوئی۔ دفتری عملہ نے کام بند کر دیا پھر واپڈا والوں نے کئی جگہ کی بتی بند کر دی کئی جگھوں پر لوگوں نے پولیس مینوں سے بندوقیں و دیگر اسلحہ چھین لیا - لاہور شہر میں ہر روز کئی جگھوں پر گولی چلنے کے واقعات ہوئے کئی بے گناہ لقمہ اجل بنے تھے۔ پولیس کا ایک دستہ چند لاشوں کو گاڑیوں میں پوسٹ مارٹم کے لئے میو ہسپتال لے جا رہا تھا ہجوم نے پولیس سے لاشیں چھین لینے کی کوشش کی جس سے دو پولیس مین زخمی ہو گئے لاشیں چھیننے کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو پولیس کا ظلم زیادتی بتائیں۔ لاشوں کا جلوس نکالیں - پولیس کی کئی گاڑیوں کو آگ لگا دی گئی گوالمنڈی کی علاقہ میں دو تین دفعہ گولی چلی جس سے کئی زخمی و قتل ہوئے۔ میکلوڈ روڈ پر بھی کئی جگھوں پر گولی چلی - 4 مارچ کو ایک واقع یوں پیش آیا کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سید فردوس شاہ کو ٹیلی فون پر اطلاع ملی کہ لوگ دو پولیس افسروں کو اٹھا کر مسجد وزیر خان میں لے گئے ہیں۔ فردوس شاہ نے ایک مسلح دستہ پولیس ساتھ لیا اور مسجد وزیر خان کی طرف روانہ ہو گیا مسجد کے قریب ایک مشتعل ہجوم سے سید فردوس شاہ کا سامنا ہوا ہجوم پولیس پر حملہ آور ہوا سید فردوس شاہ قتل ہو گئے دیگر پولیس مین زخمی ہو گئے اسلحہ لوگوں نے چھین لیا۔ اس واقع نے حکام کو انتہائی قدم اٹھانے کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا۔

6 مارچ جمعہ کا دن تھا صبح سویرے ہی تمام اطراف سے جلوس مسجد وزیر خان میں پہنچنا شروع ہو گئے لوکو کیرج کی ورک شاپیں بند ہو گئیں۔ مزدور پوری تعداد میں تحریک سے ہمدردی کے طور

پر باہر نکل آئے غیض و غضب میں بپھرے ہوئے جلوس نے کوتوالی کا محاصرہ کر لیا پتھراؤ شروع کر دیا پولیس کو گولی چلانے کا حکم نہیں تھا اس ہجوم کو منتشر کرنے کے لئے آنسو گیس کے گولے پھینکے گئے اور لوگوں کی توجہ کسی اور طرف منتقل کر دی گئی۔ اور عام لوگ یہ بھی نعرے لگا رہے تھے فوج پولیس زندہ باد - بارڈر پولیس مردہ باد چیف سیکرٹری ہوم سیکرٹری صبح سیکرٹریٹ میں گئے تو ملازمین نے ہڑتال کی ہوئی تھی وہ تحریک کے مطالبات تسلیم کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے اور جو شہر میں گولی چلائی جا رہی تھی اسے بند کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اعلیٰ افسران نے سیکرٹریٹ کے عملہ سے بات چیت کی اور انہیں یقین دلایا کہ وہ تمام مطالبات گورنر تک پہنچائیں گے سیکرٹریٹ کے عملہ کے کہنے پر اسی وقت چیف سیکرٹری نے گورنر پنجاب کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ سیکرٹریٹ کے عملہ کے مطالبات کو دہرایا۔ اور بعد میں چیف سیکرٹری خود بھی گورنر صاحب کے پاس صورت حال آگاہ کرنے گئے۔ واپڈا کے ملازمین بھی ہڑتال پر تھے گورنر ہاؤس کی بجلی بھی کاٹ دی گئی تھی۔ شہر کی صورت حال نہایت تیزی کے ساتھ خطرناک شکل اختیار کر رہی تھی۔ ریلوے ملازمین نے انجن شیڈ میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کر لیا تھا کوئی انجن باہر نہیں آنے دیا جاتا تھا۔ لاہور اور مغلپورہ کے درمیان ریل کی پٹڑی توڑ دی گئی تھی شاہدرہ سے آنے والی ایک گاڑی راستے میں روک لی گئی تھی کئی جگہ ٹریفک سگنل توڑ دیئے گئے تھے لاہور شہر کے بہت بڑے حصہ خصوصی طور پر جی او آر اور دیگر جن جگہوں پر افسر رہتے تھے بجلی کاٹ دی گئی اور شہر کے بڑے بارونق حصہ پر اندھیرا چھا گیا تھا۔ اور ان ایام میں لاہور میں بے شمار جگہوں پر پولیس یا انتظامیہ نے گولی چلائی اور بہت لوگ لقمہ اجل بنے ہمارے گوجرانوالہ کے رضا کار بھی لاہور گئے ہوئے تھے ایک رضا کار نوشہرہ روڈ کا تھا وہ بھی لاہور میں گولی لگنے سے شہید ہو گیا تھا۔ بالآخر پنجاب حکومت نے اپنی پالیسی کا اعلان کر دیا پنجاب کے وزیر اعلیٰ جناب ممتاز دولتانہ نے مندرجہ ذیل پالیسی کا اعلان کیا۔ وزیر اعلیٰ پنجاب اپنی وزارت کی طرف سے اعلان کرتے ہیں کہ انکی حکومت تحفظ ختم نبوت کے لیڈروں سے فوری گفت و شنید کے لئے تیار ہے۔ وہ عوام سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ملک میں امن امان بحال کرنے میں ان کی امداد کریں۔ وہ عوام کو یقین دلاتے ہیں کہ فوج اور پولیس کو متشددانہ کارروائی فائرنگ وغیرہ نہیں کریں گی۔ تاوقتیکہ کسی کی جان مال کے تحفظ کا مسئلہ پیدا نہ ہو جائے اس مسئلہ پر صوبائی حکومت مرکزی حکومت سے گفت و شنید کر رہی ہے۔

میاں ممتاز دولتانہ بحیثیت صدر مسلم لیگ پنجاب مسلم لیگ کے مرکزی صدر کے سامنے پنجاب کے عوام کی طرف سے یہ مطالبات فوری توجہ کے لئے پیش کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ یہ قوم کے متفقہ مطالبات ہیں۔ مندرجہ بالا اعلان فوری طور پر سائیکلو سٹائل کرا دیئے گئے اور ہوائی جہاز کے ذریعے مسجدوں پر گرائے گئے مجلس عمل کے ڈکٹیٹر خلیفہ شجاع الدین کو بھی بھیجے گئے تھے اور یہی بیان مسلم لیگ کے اضلاع کی شاخوں کو بھی بھیجے گئے۔ اس وقت تک لاہور میں

بیس سے زائد احمدی قتل ہو چکے تھے اور سو سے زائد تحریک کے ساتھ وابستہ لوگ بھی لقمہ اجل بن چکے تھے۔ اور یقینی طور پر بیسوی صدی میں لاہور کی یہ سب سے بڑی تحریک تھی کئی بار کئی جگہوں پر گولی چلی اور بہت لوگ لقمہ اجل بنے اس سے قبل بیسویں صدی میں کسی تحریک میں لاہور میں اتنے لوگ شہید یا زخمی نہیں ہوئے تھے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب نے 6 مارچ کے مندرجہ بالا بیان کی پنجاب کے تمام اضلاع میں تائید کی گئی ہر جگہ سے اس کے حق میں قرار داد منظور کی گئی۔ 10 مارچ کو مسٹر دولتانہ وزیر اعلیٰ پنجاب نے 6 مارچ کا بیان واپس لے لیا اور انہوں نے کہا کہ 6 مارچ کو میں نے جو بیان دیا تھا وہ اس یقین کے ساتھ دیا تھا کہ پنجاب میں امن و امان بحال ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ قتل غارت لوٹ مار آتش زنی کے واقعات میں مزید اضافہ ہوا پاکستان کے مخالف تفرقہ پرواز گروہ پاکستان کی سلامتی کو نقصان پہنانے کی غرض سے تحریک تحفظ ختم نبوت سے فائدہ اٹھا کر حکومت کا نظم درہم برہم کر رہے ہیں۔ ان حالات میں لاہور کی صورت حال پر قابو پانے کے لئے مارشل لاء لگانا پڑا اور اب یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تحریک کے لیڈران کے ساتھ کسی قسم کی بات چیت کی جائے میں عوام سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ بحالی امن کے لئے حکومت کے ساتھ تعاون کریں۔ پنجاب کی مجلس عاملہ مسلم لیگ نے اس بیان کی تائید کی اور ماتحت جماعتوں کو گیارہ مارچ کی تائیدی قرارداد کی روشنی میں ہدایات جاری کر دیں۔ لاہور میں جن حالات کے تحت مارشل لاء نافذ کیا گیا وہ یہ تھے کہ نظم و نسق بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ قتل و غارت لوٹ مار آتش زدگی کے واقعات بالکل 1947ء کا نقشہ پیش کر رہے تھے کسی بھی شخص کی جان مال عزت محفوظ نہ تھی۔ پولیس انتظام بحالی کرنے میں ناکام ہو چکی تھی سید فردوس شاہ ڈی ایس پی کے قتل اور کئی پولیس والوں کے زخمی ہونے کے بعد پولیس حوصلہ ہار چکی تھی اور عوام عدم تحفظ کا شکار ہو گئے تھے۔ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میجر جنرل اعظم خان بنائے گئے فوج نے تحریک کو کچل دیا۔ اور تمام لیڈر گرفتار کر لئے گئے دہشت پھیلانے کے لئے انہیں بڑی بڑی سزائیں سنائی گئیں۔ مارشل لاء ختم ہونے کے بعد وہ سزائیں ختم کر دی گئی تھیں۔

میز انکوائری رپورٹ اور مذہبی رجحانات

لاہور میں مارشل لاء لگ جانے کے بعد تحریک ختم نبوت کو کچل دیا گیا لاہور اور دیگر پنجاب اور کراچی میں سینکڑوں کی تعداد میں بے گناہ لوگ لقمہ اجل بنے اور لاتعداد لوگ زخمی ہوئے ہزاروں لوگ جیلوں میں چلے گئے۔ لاہور اور بعض دوسری جگہوں میں تھوڑے عرصہ کے لئے سکوت مرگ طاری رہا پھر عام زندگی رواں دواں ہو گی تحریک جس مقام پر پہنچ گئی تھی اس کی ناکامی نے لوگوں کو مایوس کیا۔ سیاست کے دھاروں میں بھی کچھ وقت بعد تبدیلی آئی۔ جیسا کہ میں نے گزشتہ ابواب میں ذکر کیا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی جنھوں نے 1892ء میں نبوت کا

دعویٰ کیا تھا اور احمدیت نے ایک منظم شکل اختیار کر لی۔ دیگر مسلمانوں کے تمام فرقے مرزائیوں کو کافر سمجھتے تھے متحدہ ہندوستان کے وقت بھی انہیں عام مسلمان جن کا تعلق مذہب سے تھا وہ انہیں کافر سمجھتے تھے مگر اس وقت چونکہ تمام مذاہب کے لوگ یکجا رہتے تھے اس لئے سماجی طور پر مرزائی مسلمانوں میں ہی شمار ہوتے تھے مرزائیت کے خلاف علمائے دیو بند واضح الفاظ میں انہیں دائرہ اسلام سے خارج اور مرتد کہتے تھے۔ حضرت پیر مہر علی شاہ اور بریلوی علماء بھی انہیں کافر مرتد ہی کہتے تھے۔ مگر ان کے خلاف ایک منظم جدوجہد 1931ء میں مجلس احرار نے اپنے سیاسی پلیٹ فارم سے شروع کر دی تھی جو اپنے دیگر سیاسی پروگرام کے ساتھ رد مرزائیت کو بھی فریضہ کے طور پر اپنی جدوجہد میں شامل کر لیا تھا۔ ہر جلسہ ہر کانفرنس میں مرزائیت کے خطرات سے لوگوں کو آگاہ کیا جاتا تھا۔

پاکستان بن جانے کے بعد مرزائیت کا مرکز بھی پاکستان میں منتقل ہو گیا ضلع جھنگ کے شہر چنیوٹ کے قریب دریائے چناب کے مغربی کنارے پر ہزاروں ایکڑ رقبہ برائے نام قیمت پر حکومت سے مرزائیوں نے حاصل کر لیا وہاں پر ایک بستی تعمیر کر لی جس کا نام ربوہ رکھا گیا۔ یہ بستی ہی مرزائیت کا مرکز بنا دی گئی اور اس میں تمام رہائشی مرزائی ہی تھے۔ اس بستی میں مرزا بشیر الدین محمود کا خلافتی مرکز تھا۔ مرزائیت کے تنظیمی اور تبلیغی دفاتر بھی تھے اور اس وقت بھی ہیں۔ اور یہاں پر ہی ربوہ کے شمال کی طرف سڑک کے کنارے قبرستان ہے جسے مرزائی بہشتی مقبرہ کہتے ہیں اس قبرستان میں انہیں دفن کیا جاتا ہے جو وصیت کرتے ہیں کہ مجھے بہشتی مقبرہ میں دفن کیا جائے۔ وصیت کرنے والا اپنی جائیداد کا 16 فیصد حصہ جماعت احمدیہ کے فنڈ میں جمع کرانے کا پابند ہے جو وصیت لکھی جاتی ہے وہ جماعت احمدیہ میں رجسٹرڈ ہوتی ہے۔ ربوہ میں رہائشی لوگ 1974ء سے قبل سب مرزائی ہوا کرتے تھے چند قوانین جو جماعت احمدیہ کی طرف سے ہی جاری کئے جاتے تھے ان کی پابندی لازمی تھی۔

مرزائیوں کا عقیدہ عام مسلمانوں جیسا ہی ہے۔ نماز، روزہ، حج زکوۃ توحید کے پابند ہیں اور کلچرل طور پر بھی مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں مگر مرزا غلام احمد قادیانی نے جہاد کو حرام قرار دیا ہے۔ دیگر وہ یہ کہتے ہیں کہ شریعت محمدی کے وہ پابند ہیں۔ تجدید احیائے دین کی لئے وہ کہتے ہیں کہ خداوند کریم نے مرزا غلام احمد قادیانی کو مبعوث کیا ہے اور شریعت محمدی کے تحت ہر وقت ہر زمانے میں نبی آتے رہیں گے۔ دیگر ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ جو شخص مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی نہیں مانتا وہ کافر ہے دائرہ اسلام سے خارج ہے جہنمی ہے۔

متحدہ ہندوستان کے وقت مسلمانوں میں مرزائیوں کے خلاف اتنی شدت اس وجہ سے بھی نہ تھی ایک تو ہر مذہب کے لوگ اس وقت اکٹھے رہتے تھے۔ دیگر یہ کہ اس زمانے میں مرزائی مسلمانوں کی طرف سے خود بخود غیر مسلم آریہ سماجیوں عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں سے مناظرے کیا کرتے تھے۔ اور ایسے موقعوں پر عام مسلمان بھی مرزائیوں کے طرف دار ہو جایا

کرتے تھے۔ راقم الحروف نے خود ایک مناظرہ 1944ء میں دیکھا جو مرزائیوں اور دھریوں کا تھا۔ اس میں ہم مرزائیوں کے طرفدار تھے دھریوں کے خلاف نعرے بازی کرتے تھے۔ دیگر یہ کہ پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ تھی - تحریک پاکستان جہاں ہندوؤں کو برا کہا جاتا تھا قوم پرست مسلمانوں کو گولیاں دی جاتی تھیں وہاں لوگوں سے اسلامی حکمرانوں کے دعوے بھی کئے جاتے تھے۔ مسلم لیگ کی مرکزی لیڈر شپ تو مذہب سے بیگانہ تھی انہوں نے لوگوں سے اسلامی حکومت کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ مگر نچلی سطح پر مسلم لیگی کارکن یا مقرر اپنی تقاریر میں اسلامی حکمرانی کا نام لیا کرتے تھے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے جیسے بھی جذبات انہیں ابھارنے ہوتے تھے وہ ابھارتے تھے۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ اللہ یہ کسی لیڈر نے نہیں لگایا تھا بلکہ کارکنان کی ہی اختراع تھی۔ سیالکوٹ مسلم لیگ کے ایک جلسہ میں کسی کارکن نے یہ نعرہ لگا دیا تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ اللہ پھر یہ نعرہ پنجاب کا بن گیا۔ ہندوستان کی مسلم لیگی لیڈر شپ نے اپنا لیا - ذمہ دار مسلم لیگی لیڈر شپ نے کبھی نہیں کہا تھا کہ پاکستان ایک مذہبی حکومت ہو گی۔ بلکہ گیارہ اگست 1947ء کو بانی پاکستان قائد اعظمؒ محمد علی جناح نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں پاکستان کی پالیسی تقریر میں یہ کہا تھا کہ پاکستان میں تمام مذاہب کے لوگوں کو مکمل مذہبی آزادی ہو گی پاکستان میں ہر شہری کے برابر حقوق ہوں گے اور پاکستان میں بسنے والے لوگ نہ ہندو ہوں گے نہ مسلمان ہوں گے صرف پاکستانی ہوں گے انسان ہوں گے۔ تحریک ختم نبوت کا زیادہ زور پنجاب میں تھا اور پنجاب کا ہر علاقہ شہر اور قصبہ جات میں پوری شدت کے ساتھ لوگوں کی وابستگی تھی لوگ اس تحریک میں شامل ہونا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ نصف صدی سے لوگ مرزائیت کے خلاف علماء کی تقاریر سن رہے تھے لوگوں کے ذہنوں میں یہ تھا کہ مرزائی کافر ہیں، مرتد ہیں اور اس وقت پاکستان بن گیا ہے۔ یہ مسلمانوں کو ملک ہے دیگر کافر سب چلے گئے۔ یہ کیوں یہاں پر ہیں اور تحریک پاکستان میں بھی مسلم لیگ کے جلسوں میں پاکستان کا مطب کیا لا الہ اللہ کہا جاتا تھا اور اب پاکستان میں مرزائی مرتد کیوں ہیں۔ پاکستان کے مرکز اور صوبوں پر مسلم لیگ کی حکومت تھی۔

جیسے ہر جماعت میں دو گروہ ہوتے ہیں۔ اس طرح مسلم لیگ میں دو گروہ تھے ایک موثر گروہ ہر جگہ تحریک ختم نبوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ ہمارے گوجرانوالہ میں مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری میاں منظور حسین ایم ایل اے تحریک کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے جبکہ شیخ آفتاب صاحب صدر مسلم لیگ گوجرانوالہ تحریک سے کنارہ کش تھے مخالفت نہیں کرتے تھے۔

منظور گروپ کی ایگحت پر مجلس عمل کے ورکر انہیں تحریک ختم نبوت کے مرکز جامع مسجد شیرانوالہ باغ میں لے آئے انہیں پریشان بھی کیا گیا - وزیر اعظم کے خلاف تقریر کرنے کو کہا گیا جو انہوں نے نہ کی مگر گرفتاری پیش کر دی۔ ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئی انہوں نے

گرفتاری پیش کی دوسرے شہروں میں بھی اس قسم کے حالات تھے۔ میز انکوائری رپورٹ کے مطابق پنجاب مسلم لیگ کے ذمہ دار عہدیدار ایم ایل اے حضرات جن کا مسلم لیگ پر پورا کنٹرول تھا - 377 لیڈران نے تحریک ختم نبوت کا ساتھ دیا اور اپنی ہی مسلم لیگ کی حکومت کے خلاف کام کیا۔ گوجرانوالہ میں ان کی تعداد 43 تھی۔

مجلس احرار 1945ء کا الیکشن مسلم لیگ سے ہار چکی تھی اور پنجاب میں اسے کوئی بھی سیٹ نہ ملی تھی مگر پنجاب کے اکثر شہر اور قصبات میں احرار کا بہت کافی اثر تھا ورکر بہت زیادہ تھے۔ جو جیلوں میں جانے سے نہیں گھبراتے تھے۔ چھوٹے اور درمیانے طبقے پر احرار کا بہت اثر تھا۔ اور یہ لوگ مخلص بھی تھے کسی قربانی سے پہلو تہی بھی نہ کرتے تھے۔ آزادی کی سابقہ تحریکوں میں ان کی تربیت بہت اچھے طریقے سے کی گئی تھی۔ اس وقت تک ابھی سیاست کاروبار نہیں بنی تھی۔ حصول مقصد کے لئے قربانی دینا اور قربانی کا صلہ ذات خداوندی سے حاصل کرنے کا جذبہ عام تھا۔ دیوبندی عقیدہ فکر کے لوگ زیادہ تعداد میں مجلس احرار کے ساتھ تھے اور انہیں علماء نے لوگوں کو تحریک میں قربانیاں دینے کے لئے تیار کیا ہوا تھا۔ تحقیقاتی عدالت میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مجلس احرار کے لیڈروں نے تحریک کی ذمہ داری قبول کی تھی - حضرت سید عطا اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے عدالت میں قلندرانہ بیان دیا تھا کہ وہی اس تحریک کو منظم کرنے والے تھے وہی تحریک کی ساری ذمہ داری قبول کرتے ہیں اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میرے لئے اس تحریک میں قربانی دینا توشہ آخرت ہے اور مجھے فخر ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا مقصد حاصل کر لیا۔

تحریک ختم نبوت کا تمام زور لاہور کی جانب مڑ گیا تھا لاہور سے رضا کار جلوس بن کر کراچی کے لئے بھی جاتے تھے اور پنجاب کے دیگر اضلاع سے بھی رضا کار لاہور سے ہی آ رہے تھے اور لاہور مسجد وزیر خان ہی مرکز تھا۔ تحریک ختم نبوت میں مرکزی کردار ادا کرنے والے مجلس احرار کے تمام لیڈران جن میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری شیخ حسام الدین ماسٹر تاجدین انصاری' حضرت پیر فیض الحسن ' مولانا غلام غوث ہزاروی' مولانا غلام اللہ خان ' مولانا عبدالواحد صاحب گوجرانوالہ' مولانا محمد علی جالندھی ' مولانا مظہر علی اظہر بھی شامل تھے۔ مجلس عمل کے تمام لیڈران جن کا ذکر گزشتہ صفحات پر ہے جن میں حضرت مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری ' مولانا اختر علی خان' ایڈیٹر روزنامہ زمیندار مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش ' حضرت مولانا عبدالستار خان نیازی اور دیگر بہت سارے علماء حضرات تھے۔ لاہور شہر مکمل طور پر لاقانونیت کا شکار ہو چکا تھا پولیس مکمل طور پر ناکام ہو چکی تھی۔ شہر میں کئی مقامات پر گولی چل چکی تھی یہ بھی سنا گیا تھا کہ بعض دہشت پسند گروپ بھی بن چکے تھے :: مذموم مقاصد حاصل کرنے کے لئے انسانی جانوں سے کھیل رہے تھے موٹر گاڑیوں پر سوار دہشت پسند گروپ کے لوگ جہاں ہجوم دیکھا ان پر گولی چلا دی۔ کئی لوگوں کو قتل کر کے خود بھاگ جاتے۔ مجلس عمل یا تحریک کے معاون لوگ یہ کہتے تھے ،

کہ یہ کام مرزائی نوجوان منظم طریقہ پر کر رہے ہیں۔ تاکہ فساد زیادہ شدت اختیار کرے اور فوج جلد شہر کا کنٹرول سنبھال لے۔ اس دوران کئی مرزائی لوگ اور گھرانے بھی قتل کئے گئے جن کا ذکر کسی حد تک تحقیقاتی عدالت رپورٹ میں بھی درج ہے۔ سید فردوس شاہ ڈی ایس پی کے قتل کے بعد تو پولیس نے قطعی طور پر امن قائم کرنے کا ارادہ ہی ختم کر دیا۔ بالکل ہی ہتھیار ڈال دیئے سرکار نے دفعہ 144 نافذ کیا ہوا تھا۔ جس کو لوگوں نے قبول نہیں کیا کرفیو لگایا گیا وہ بھی غیر موثر ہو گیا تھا دیگر یہ کہ کرفیو اندرون شہر لگایا بھی نہیں گیا تھا۔ ان حالات میں بے شمار لوگ لقمہ اجل بنے غیر سرکاری شمار کے مطابق تو دس ہزار انسان اس تحریک میں کام آئے مگر حقیقت میں ایسا نہیں معلوم ہوتا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ سینکڑوں لوگ ضرور اس قتل عام میں زندگیاں گنوا چکے ہیں۔ جو کہ بہت ہی بڑے افسوس کا مقام ہے۔ 10 مارچ کو لاہور میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ جنرل اعظم خان مارشل ایڈمنسٹریٹر بنائے گئے تحریک ختم نبوت کو کچل دیا گیا۔ بہت لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ ان پر فوجی عدالتوں میں مقدمات چلائے گئے۔ لاہور اور پورے پنجاب میں دہشت پھیلا دی گئی۔ فوجی عدالتوں نے سخت سزائیں بھی سنائیں۔ تحریک کے آخری ڈکٹیٹر مولانا عبدالستار خان نیازی جو نواز شریف کی حکومت میں وزیر مذہبی امور بھی رہ چکے ہیں وہ روپوش ہو گئے تھے کئی روز بعد انہیں منٹگمری سے گرفتار کیا گیا تھا انہوں نے اپنی ہیئت بدلی ہوئی تھی۔ داڑھی منڈوا دی تھی فوجی عدالت نے مولانا عبدالستار خان نیازی۔ مولانا مودودی امیر جماعت اسلامی کو موت کا حکم سنایا جو بعد میں معاف کر دی گئی تھی۔ اسی فوجی عدالت میں دیگر لیڈران کو بھی پیش کیا گیا تھا جنہیں بہت ہی تھوڑی سزائیں دی گئی تھیں۔ حضرت امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے فوجی عدالت میں جو بیان دیا اس میں تحریک ختم نبوت کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی انہوں نے عدالت میں کہا تھا کہ اس تحریک کا بانی محرک میں ہی تھا اور مجھے فخر ہے کہ میں نے اپنی بخشش کے لئے اپنی ہمت کے مطابق یہ کام کیا اور یہی میرے لئے ذریعہ نجات ہے اسی طرح مجلس عمل کے دوسرے لیڈران نے بھی پوری جرات کے ساتھ عدالتی کارروائی کا سامنا کیا۔ لاہور میں مارشل لاء لگ جانے کے بعد مرکزی حکومت نے دولتانہ وزارت ختم کر دی ان کی جگہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک فیروز خان نون جو کہ اس وقت مشرقی بنگال کے گورنر تھے بنا دیئے گئے۔ حکومت نے مجلس احرار کو خلاف قانون جماعت قرار دیا اور اس کا تمام سرمایہ ضبط کر لیا گیا۔
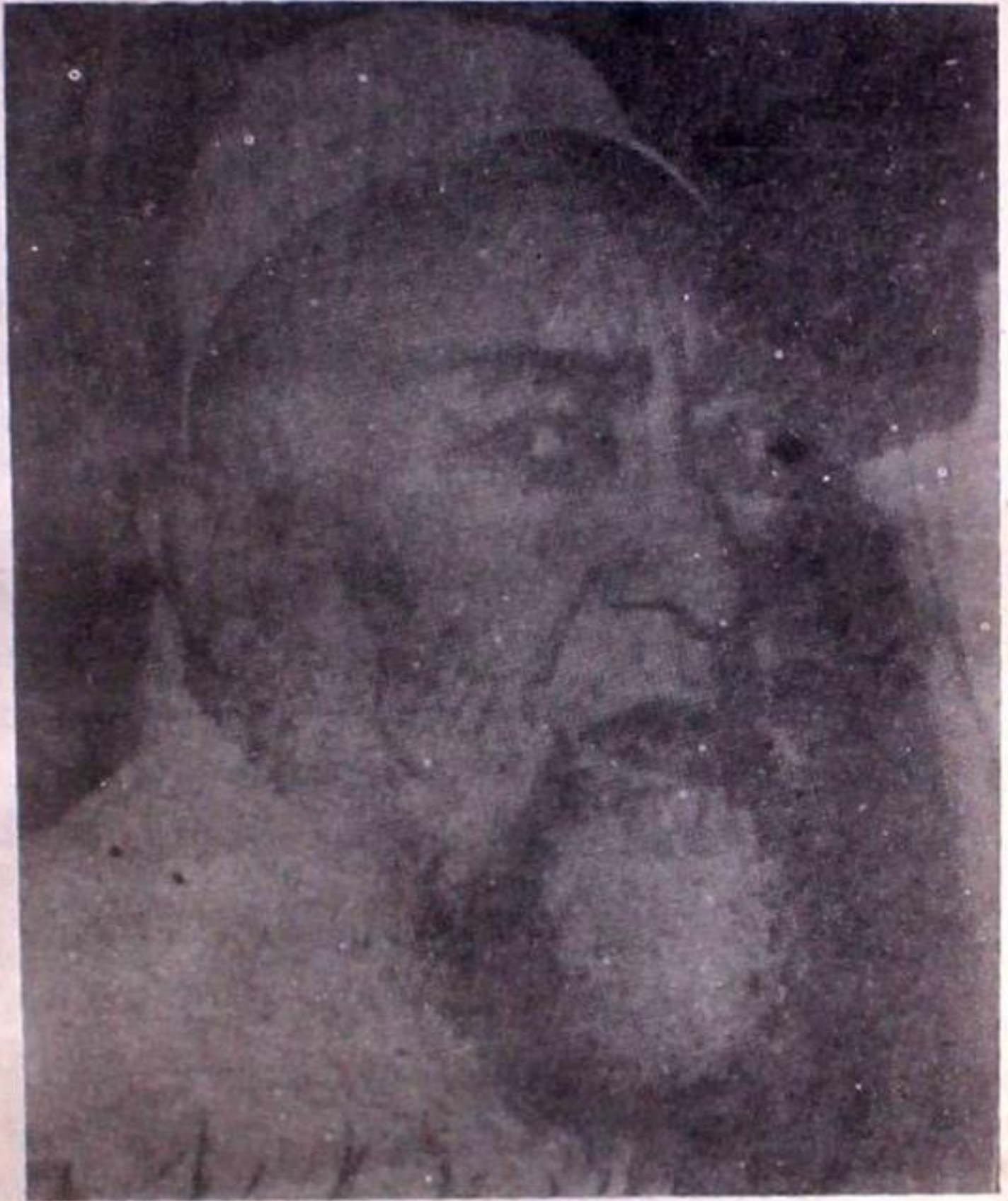
حضرت مولانا سید ابوالحسنات صدر مجلس عمل تحفظ ختم نبوت

تحریک ختم نبوت پر تنقیدی تبصرہ

تحریک ختم نبوت کو حکومت نے کچل دیا ہم نے غور کرنا ہے کہ حالات پر تحریک نے کیا اثرات چھوڑے ہیں۔ اس تحریک میں نمایاں تین کردار ہیں پھر ان میں آگے گروہ بندی الگ چیز بھی ہے۔

نمبر1 مجلس عمل تحفظ ختم نبوت بشمول آل پارٹیز مسلم کنونشن

نمبر2 حکومت پنجاب نمبر3 جماعت احمدیہ

نمبر4 مرکزی حکومت نمبر5 حکومت کا خفیہ ہاتھ

مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کئی گروہوں کو ملا کر ایک باڈی بنائی گئی تھی۔ مگر اس میں سب سے متحرک جو طاقت ہے وہ ہے مجلس احرار دیگر گروہ یا جماعتیں تحریک میں شامل تھیں اور انہوں نے قربانیاں بھی دی ہیں ان کی بہت بڑی جدوجہد ہے مگر اس تحریک کے بنانے والے چلانے والے مرزائیت کے خلاف مسلسل جدوجہد کرنے والے مجلس احرار ہی تھے جنہوں نے تحریک 1953ء کے آغاز سے نصف صدی قبل سے مختلف رویوں میں مرزائیت کی مخالفت کرتے رہے۔ 1914ء کی جنگ میں انگریز کے خلاف مجلس احرار کے اسلاف علمائے دیو بند نے سرکار انگلشیہ کے خلاف بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن اور مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ اس سلسلہ میں قید بھی ہوئے دیگر علمائے دیو بند نے انگریز حکومت کے ساتھ کسی قسم کی معاونت کو مسلمانوں کے لئے حرام قرار دیا تھا جبکہ مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان اس وقت سرکار انگلشیہ کی مدد فرما رہے تھے اور حکومت انگلشیہ اس وقت مرکز اسلام خلافت اسلامیہ کے خلاف برسرپیکار تھی یہ دونوں گروہ مختلف سمتوں کی طرف رواں تھے۔ بریلوی مکتبہ فکر کے بزرگان دین بھی مرزائیت کے خلاف کام کر رہے تھے حضرت پیر مہر علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ آف گولڑا شریف نے بھی مرزائیت کا تعاقب کیا انہوں نے اس صدی کے ابتداء میں مرزا غلام احمد قادیانی جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا انہیں جھوٹی نبوت کے خلاف مناظرے کا چیلنج کیا تھا اور مرزا صاحب مناظرے سے بھاگ گئے تھے دیگر علمائے دین بھی مرزائیت کے خلاف وقتاً فوقتاً کام کرتے رہے ہیں اہلحدیث علماء کرام بھی جدوجہد میں شامل رہے ہیں حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے مرزا غلام احمد سے مناظرہ اور مباہلہ بھی کیا تھا۔ اور وہ وقت کے ساتھ مرزائیت کے متعلق کام کرتے رہے ہیں مگر جس منظم طریقہ پر مجلس احرار نے مرزائیت کے خلاف 1930ء سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ مرزائیت کے خلاف احرار کی تحریک سے قبل عام مسلمانوں میں زیادہ نفرت نہ تھی بعض جگہوں مرزائیوں اور عام مسلمانوں میں رشتے ہو جایا کرتے تھے مگر جب سے احرار نے مرزائیت کا تعاقب شروع کیا ہے اس وقت سے مرزائیت کو اپنے ملک میں کھلے بندو چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ 1931ء میں احرار معرض وجود میں آئی۔ اس وقت

سے مسلسل وہ مرزائیت کے خلاف ہر جلسے میں آواز اٹھاتے رہتے اور مرزائیت کے مرکز قادیان میں جو کہ مرزا غلام احمد کا ملکیت قصبہ ہے وہاں جا کر بھی پاکستان سے قبل جلسے کرتے تھے کانفرنسیں کرتے تھے اندیشہ نقص امن میں قید ہوتے تھے۔ قربانیاں دیتے تھے جدوجہد کرتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ احرار 1945ء کے الیکشن میں ہار گئے تھے اور انہیں کوئی سیٹ بھی نہ ملی تھی انکوائری رپورٹ میں ان پر الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی ساکھ بحال کرنے کے لئے تحریک چلائی تھی اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ احرار نے اپنی ساکھ بحال کرنے کے لئے مرزائیت کے خلاف تحریک منظم کی تھی تب بھی احرار تمغہ بہادری کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کوئی نیا مصنوعی قدم نہیں اٹھایا بلکہ وہی کام جو وہ نصف صدی سے کر رہے تھے اسی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مردانہ وار میدان عمل میں آگئے۔

میز انکوائری رپورٹ میں کہیں اشارتاً بھی یہ نہیں کیا گیا کہ احرار لیڈروں کو کسی شعبہ حکومت سے کوئی مالی معاونت ملی ہو احرار لیڈر غریب لوگ تھے اپنے وسائل سے یا لوگوں سے چندہ لے کر انہوں نے تحریک چلائی۔ تحریک کے نتیجہ میں کوئی مادی فائدے کا امکان نہیں تھا۔ یہ تحریک ورکروں اور لیڈروں کے لئے صرف روز قیامت کے فائدے کے لئے ہی تھی دنیاوی فائدہ اس میں کوئی نہیں تھا۔ گو تحریک کو کچل دیا گیا مگر مرزائیت پر ایک کاری ضرب لگائی گئی کہ 21 سال بعد حکومت پاکستان نے مجبور ہو کر احرار اور مسلمانوں کے وہ تمام مطالبات جو تحریک ختم نبوت 1953ء کے تھے آئین کے حصہ بنا دیئے گئے یہ احرار اور تحفظ ختم نبوت کے مسلسل جدوجہد کا ہی نتیجہ تھا۔

تحریک کے دیگر فریق

تحریک ختم نبوت کا دوسرا فریق احمدی یا مرزائیت تھی۔ مرزا غلام احمد قادیانی رئیس قادیان تھے اس قصبہ کے مالک تھے خاندانی طور پر وہ ہمیشہ ہی حکمرانوں کے تابع فرمان رہے ہیں اور رؤسائے پنجاب میں ان کا شمار ہوتا تھا گھرانہ سرکار میں ان کی عزت پشت ہا پشت سے چلی آرہی تھی ان کے دادا مرزا غلام مرتضیٰ سکھ دربار مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جرنیل تھے۔ سکھوں کی حکومت کے خاتمے پر مرزا خاندان انگریز حکومت کے وفادار ہو گئے۔ باوجود کہ وہ رئیس قادیان تھے مگر وفاداری کو مستحکم کرنے کے لئے وہ سرکاری ملازم بھی ہوئے اور ضلع سیالکوٹ کے ڈی سی آفس کے ملازم تھے اور اے ڈی ایم کے ریڈر کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ انکی شخصیت پرکشش تھی ان میں ذہین لوگوں کو اپنے پیچھے لگانے کی صلاحیت موجود تھی۔ جب انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تو اچھے خاصے ذہین لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لیا حضور علیہ اسلام کا واضح فرمان

موجود ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا میں آخری نبی ہوں حضور کی زندگی میں مسلمہ نے دعوئی نبوت کیا تھا حضور نے فرمایا تھا کہ مسلمہ جھوٹا ہے حضرت ابو بکر کی خلافت کے زمانے میں مسلمہ اور دیگر مدعیان نبوت کے خلاف جنگ کی گئی اور انہیں قتل کر دیا گیا۔ گزشتہ 14 سو سال سے کئی لوگوں نے دعوئی نبوت کیا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں وہ زندہ نہ بچ سکے مرزا غلام احمد قادیانی کہتے ہیں کہ میں صاحب شریعت نبی نہیں ہوں میں حضرت محمد علیہ اسلام کی شریعت کو زندہ کرنے کے لئے، تقویت دینے کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں امت مسلمہ اس مسئلہ پر بہت حساس واقع ہوئی ہے گزشتہ ادوار میں کسی بھی دعوئی نبوت کرنے والے کو زندہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ مرزا غلام احمد کے دعوئی نبوت کے وقت ہندوستان پر چونکہ انگریز حکمران تھے ان کے دور حکومت میں ہر شخص کو مذہبی آزادی تھی ہر شخص اپنا نیا مذہب پیش بھی کر سکتا تھا کوئی روک ٹوک نہ تھی اس لئے مرزا غلام احمد نے دعوئی نبوت کر دیا اور حکومت کی طرف سے انہیں مکمل تحفظ دیا گیا بڑے بڑے ذہین لوگ مرزائیت میں شامل ہوئے پختہ یقین اور ایمان کے ساتھ انہوں نے عقیدہ قبول کیا۔ سر محمد ظفر اللہ بہت ذہین متحدہ ہندوستان کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے یہ عہدہ ہندوستان کی مرکزی وزارت کے برابر تھا مسلم لیگ میں شامل تھے تقسیم ہند کے وقت باؤنڈری کمشن کے ممبر بنائے گئے۔ پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ بنے بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کے معتمد خاص تھے۔ عالمی عدالت کے جج بھی بنائے گئے مگر مرزائیت پر وہ اس قدر پختہ تھے کہ اپنے محسن محمد علی جناح کی موت پر ان کا جنازہ بھی نہیں پڑھا۔ اور پوچھنے پر جواب دیا کہ میں کافر کا جنازہ نہیں پڑھ سکتا۔ روا داری کے طور پر بھی ایسا نہیں کیا کہ چلو نماز جنازہ میں کھڑے ہی ہو جاویں چاہے کچھ بھی نہ پڑھیں۔ اسی طرح نوبل انعام یافتہ عبدالسلام بھی مرزائی ہیں اور دیگر بہت سارے لوگ جو سرکاری عہدوں پر اس وقت فائز تھے وہ مرزائی تھے۔ مسلمانوں کے لئے خالص عقیدے کا مسئلہ تھا۔ حضور علیہ اسلام کے واضح فرمان کے مطابق کوئی پیغمبر میرے بعد نہیں آئے گا۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو نبی کہتا ہے اور جو لوگ کسی دیگر نبی کو مانتے ہیں وہ اسلام کے باغی ہیں وہ کسی مسلم مذہبی سٹیٹ میں مسلمان بن کر نہیں رہ سکتے اس لئے یہ ساری تحریک اسی عقیدہ کے گرد ہی گھومتی ہے اس بنیاد پر یہ تحریک چلی مگر مرزائی ایک رائی برابر بھی اپنے عقیدہ میں تغیر کرنے پر رضا مند نہیں ہوئے۔

حکومتیں اور خفیہ ہاتھ

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ تحریک ختم نبوت کے نتائج کیا بنے، کون سے اثرات چھوڑ کر تحریک ختم ہوئی اس کا فائدہ کیا ہوا کس کو ہوا، نقصان کس کو ہوا پنجاب کی صوبائی حکومت کیا چاہتی تھی۔ مرکزی حکومت کیا چاہتی تھی۔ خفیہ ہاتھ کیا چاہتا تھا اور اس کے نتائج کیا

سامنے آئے۔ پاکستان بن جانے کے بعد دستور کی تیاری کا مرحلہ جاری تھا قائد اعظم محمد علی جناح کی زندگی میں شاید دستور کی تیاری پر غور ہی نہیں کیا گیا اگر وہ اپنی زندگی میں دستور بنا جاتے تو شاید اس دستور پر ان کی زندگی میں کوئی جھگڑا نہ ہوتا یہ یقین اس لئے بھی ہے کہ انہوں نے ایسے کام اپنی زندگی میں کیے جن پر کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ مثلاً ہندوستان کی عارضی حکومت میں جو پنڈت نہرو کی قیادت میں بنی تھی اس میں مسلم لیگ نے بھی شمولیت کی اور اس کابینہ میں تمام مسلم لیگی وزیر مغربی پاکستان کے لئے گئے تھے مشرقی پاکستان کا ایک وزیر بھی شامل نہیں تھا مگر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اگر قائد اعظم کے وقت دستور بن جاتا تو شاید متفقہ دستور بن جاتا اور پھر بعد میں خان لیاقت علی خان بھی بھاری بھر کم شخصیت تھے۔ وہ بھی دستور سازی میں اہم کردار ادا کر سکتے تھے۔ مگر خواجہ ناظم الدین کمزور اور نرم دل شریف النفس شخصیت کے مالک تھے ان ایام میں بنگال اور مغربی پاکستان جس کی قیادت پنجاب کر رہا تھا کے درمیان دستوری جھگڑا چل رہا تھا مشرقی بنگال کی آبادی 56 فیصد تھی جبکہ مغربی پاکستان کی آبادی 44 فیصد تھی اس زمانے میں ہم اخباروں میں پڑھتے تھے کہ یہ بہت ناانصافی ہے کہ ایک طرف سارا مغربی پاکستان جس کی نمائندگی مرکز میں 44 فیصد اور صرف مشرقی بنگال جس کی نمائندگی مرکز میں 56 فیصد پھر کارٹون بھی دکھایا گیا تھا جس کے ایک پلڑے میں سارے مغربی پاکستان کے صوبے اس کا وزن کم ہے اور اوپر اٹھا ہوا ہے اور دوسرے پلڑے میں صرف مشرقی بنگال اس کا وزن زیادہ ہے اور نیچے بیٹھا ہوا ہے۔ یعنی مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان کے درمیان اختیارات کا جھگڑا چل رہا تھا۔ مارشل لاء سے مارشل لاء تک کے مصنف سید نور احمد راجہ غضنفر علی صاحب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ دستوری جھگڑے کے پیش نظر وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین تین دفعہ پنجاب کے لیڈروں سے بات چیت کرنے لاہور آ چکے ہیں مگر کسی معاملے میں تصفیہ نہیں ہوا۔ خواجہ ناظم الدین دستور سازی میں مشرقی بنگال کی نمائندگی آبادی کے حساب سے مانگتے تھے جبکہ مغربی پاکستان جس کی لیڈری پنجاب کے لیڈر ہی کر رہے تھے وہ مشرقی بنگال کو کسی قیمت پر سیاسی اختیارات میں حاوی نہیں ہونے دینا چاہتے تھے وہ چاہتے تھے کہ اگر مشرقی بنگال ایوان زیرین میں آبادی کے تناسب سے نمائندگی لے بھی لے تو ایوان بالا میں ایسی پوزیشن بن جانی چاہئے کہ دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں مغربی پاکستان کی اکثریت بن جائے یہ دستوری جھگڑا حل نہیں ہو رہا تھا دیگر ایک بین الاقوامی مسلہ بھی پیدا ہو چکا تھا وہ یوں کہ خان لیاقت علی خان اپنے دور حکومت میں امریکہ گئے تھے اور انہوں نے بین الاقوامی سیاست کے حوالے سے امریکہ کے ساتھ کچھ قول قرار بھی کئے تھے۔ بین الاقوامی حالات میں ان کی افادیت بھی مسلمہ تھی خواجہ صاحب اور ان کی کابینہ ابھی تک وفاداری بشرط استواری کے اصول پر چل رہے تھے وہ برطانیہ عظمیٰ کے اثر سے نکل کر امریکہ کے اثر میں جاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے۔ پاکستان کا حکمران طبقہ خفیہ ہاتھ ان دو مسلوں پر ضروری سمجھتا تھا کہ خواجہ ناظم الدین وزارت کی چھٹی

کرا دی جائے اس لئے ضروری تھا کہ ناظم الدین وزارت غیر مستحکم کی جائے۔ پاکستان کی دستوری حیثیت اس وقت یہ تھی کہ 11 اگست 1947ء کو کراچی میں دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا جس میں قائد اعظم محمد علی جناح کو دستور ساز اسمبلی کا متفقہ طور پر صدر منتخب کیا گیا - 14 اگست 1947ء کو دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا جس میں ویسرائے ہند لارڈ مونٹ بیٹن نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو حدود پاکستان کے تمام اختیارات منتقل کر دیئے قائد اعظم چونکہ دستور ساز اسمبلی کے قائد تھے اپنی خواہش پر ہی وہ گورنر جنرل بنا دیئے گئے ملکہ برطانیہ نے اس میں منظوری بھی دی دستور ساز اسمبلی کے نئے لیڈر جناب لیاقت علی خان بنے اور انہوں نے پاکستان کی پہلی وزارت بنائی۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی وفات پر پاکستان کی دستور ساز اسمبلی پارٹی کے لیڈر جناب لیاقت علی خان کی سفارش پر خواجہ ناظم الدین پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل بنائے گئے۔ جناب لیاقت علی خان کی وفات پر خواجہ ناظم الدین نے گورنر جنرل کا عہدہ چھوڑ کر دستور ساز اسمبلی کے لیڈر منتخب ہونے پر پاکستان کے وزیر اعظم بن گئے ان کی سفارش پر ملک غلام محمد گورنر جنرل بنا دیئے گئے۔ گورنر جنرل کے پاس وہ تمام اختیارات تھے جو ملکہ برطانیہ یا شہنشاہ برطانیہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ اگر گورنر جنرل یا صدر خواجہ ناظم الدین یا چودھری فضل الٰہی جیسا ہو تو وہ ایوان صدر یا گورنر ہاؤس میں مرغے ہی کھا سکتے ہیں - اگر ہوشیار چالاک صدر ہوں تو وہ پاکستان کے لوگ 47 سال سے دیکھ ہی رہے ہیں - غلام محمد گورنر جنرل ہوشیار چالاک تھے انہوں نے فوج کے ساتھ دیگر اصل حکمرانوں کے ساتھ ٹھیک ٹھاک روابط رکھے ہوئے تھے۔ خفیہ ہاتھ کے رموز کو بھی وہ سمجھتے تھے۔ مگر جس ماحول سے وہ گزر کر آئے تھے وہ آئینی اور قانونی ماحول تھا۔ شہنشاہ برطانیہ یا ملکہ برطانیہ نے کبھی بھی اپنے آئینی اختیارات کو استعمال نہ کیا تھا نہ ہی کبھی ویسرائے ہند کو آئینی اختیارات استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اب صورت حال یہ بن گئی تھی کہ پاکستان کے اصل حکمران فوج اور نوکر شاہی ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ اقتدار کی دھونس بنگال کے پاس چلی جائے اس صورت حال کے پیش نظر ضروری ہو گیا تھا کہ خواجہ ناظم الدین کی وزارت ختم کی جائے - خواجہ ناظم الدین وزارت کی طاقت مغربی پاکستان کی مسلم لیگی لیڈر شپ تھی مشرقی بنگال میں تو مسلم لیگ کا جنازہ نکل چکا تھا زبان کے مسئلہ پر جو مشرقی بنگال میں تحریک چلی تھی اس تحریک پر ڈھاکہ میں گولی چلی تھی جس میں 6 افراد شہید ہو چکے تھے شہداء کے جنازے کے ساتھ ہی مشرقی بنگال میں مسلم لیگ سیاست کا بھی جنازہ نکل چکا تھا۔ اب ضرورت تھی کہ مغربی پاکستان اور پنجاب میں بھی ناظم الدین حکومت کو غیر مستحکم کیا جائے اس وقت صرف مسلم لیگ ہی ایک سیاسی جماعت تھی اور وہ جماعت گورنمنٹ کی جماعت تھی۔ جناح عوامی مسلم لیگ آزاد پاکستان پارٹی یا جماعت اسلامی بھی بن چکی تھی مگر ان جماعتوں کی کوئی حیثیت نہ تھی اور نہ ہی ان میں کسی تحریک چلانے کا دم خم تھا اور نہ ہی سرکار کے خلاف تحریک چلانے کا تجربہ ہی رکھتی تھیں دیگر یہ کہ پنجاب کی مسلم لیگ لیڈر شپ مرکزی حکومت کو غیر مستحکم

کرنا چاہتی تھی مسلم لیگ کو ختم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجلس احرار چونکہ سیاست سے کنارہ کش ہو چکی تھی اور اب صرف مرزائیت کے خلاف تبلیغی کام ہی کر رہی تھی سیاست میں وہ مسلم لیگ کے حامی بن چکے تھے اور انہیں تحریک چلانے کا تجربہ بھی تھا۔ تحریک خلافت اور تحریک کشمیر ان کے نمایاں کارنامے بھی تھے پنجاب کی مسلم لیگی لیڈر شپ کے مجلس احرار کے ساتھ گہرے روابط بھی قائم ہو چکے تھے۔

مسلم لیگی لیڈر شپ نے مجلس احرار کے تبلیغی مشن میں بھی معاونت کی یقین دہانی کرا دی پھر راز و نیاز کی آنکھوں میں تحریک تحفظ ختم نبوت بھی پروان چڑھنے لگی۔ مخصوص مسلم لیگی لیڈر شپ اپنے سیاسی مقاصد کے لئے تحریک کے ہمنوا بنے ہوئے تھے جبکہ احرار صرف واسطے ثواب کے اور لوگوں میں اپنی سابقہ پوزیشن قائم رکھنے کے لئے تحریک میں آگے بڑھ رہے تھے اور وہ کچھ دلیر بھی تھے اس لئے تحریک میں ان کے ساتھی حکمران پارٹی کا ایک مضبوط گروپ بھی ہمنوا تھا۔

تحقیقاتی عدالتی رپورٹ کی آخری سطور میں کہا گیا ہے کہ ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس تحریک ختم نبوت کو کچل سکتے تھے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ میز انکوائری رپورٹ کا مندرجہ بالا تحقیق اور تجزیہ بالکل درست ہے مگر پس پردہ جو عوامل تھے ان کی وجہ سے تحریک بہت آگے جا چکی تھی۔ اس تحریک نے ساری حکومتی مشینری کو شل کر دیا تھا۔ لاہور جو تحریک کا سب سے بڑا گڑھ تھا جس کا پایۂ تخت مسجد وزیر خان تھی لاہور میں تحریک کی قیادت مسلم لیگی لیڈر کر رہے تھے خلیفہ شجاع الدین تحریک کے ڈکٹیٹر تھے اور مولانا عبدالستار نیازی تحریک کے روح رواں تھے انہی کے مشورہ اور قیادت سے تحریک جوالا مکھی بن چکی تھی کبھی کسی تحریک میں ایسا نہیں ہوا کہ حکومت پنجاب نے سب سے بڑے احساس ادارے سول سیکرٹیریٹ نے تحریک کی حمایت میں قلم چھوڑ ہڑتال کر دی ہو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی تحریک کی حمایت میں واپڈا نے شہر لاہور کو اندھیرے میں دفن کر دیا ہو۔ جی او آر جہاں مکھی بھی پر نہیں مار سکتی اندھیرے میں ڈوب گیا اور افسران بالا موم بتیاں ڈھونڈ رہے ہوں تاکہ اندھیرے کمروں میں روشنی کی جائے کبھی تاریخ میں گورنر ہاؤس اندھیرے میں نہیں ڈوبا جہاں شاہان پنجاب کا اجلاس موم بتیوں کی روشنی میں ہو رہا ہو اور گھبراہٹ کا یہ عالم ہو کہ کابینہ نے جو فیصلے تحریک کے متعلق کئے ہیں اس کے متعلق گورنر چندریگر یہ کہہ رہے ہوں کہ اس کی کاپی تحریک ختم نبوت کے ڈکٹیٹر خلیفہ شجاع الدین کو بھجوانا ہرگز نہ بھولئے گا پھر ریلوے اور ٹرانسپورٹ کی پہیہ جام ہڑتال تو ایک عام سی بات ہے یہ جو سب کچھ ہو رہا تھ یہ مذہب سے محبت کی وجہ سے تھا۔ یہ سرکاری افسر مذہب کے دیوانے اتنے نہ تھے یہ بہت ہوشیار لوگ تھے یہ پس پردہ اشارات کی وجہ سے تحریک کے ساتھ متحرک تھے ورنہ انہی لوگوں کے آباؤ اجداد تھے یا ان میں کئی لوگ خود بھی شامل تھے کہ انگریز سرکار کی وفاداری میں مذہبی احکامات کے ہوتے ہوئے خلافت ترکیہ اسلامیہ کے خلاف برسر جنگ تھے اور مقامات مقدسہ پر گولیاں بھی چلا رہے تھے۔

اس لئے سرکاری ملازمین میں مذہبی تقدس کی وجہ سی تحریک کے معاون نہ تھے بلکہ خفیہ اشارات کی وجہ سے بڑے زور و شور کے ساتھ تحریک کے معاون تھے۔ اور جوش و خروش سے حصہ لے رہے تھے۔ تحریک کی نعرہ بازی اور حرف ملامت وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین ہی تھے۔ نعرے جو وزیر اعظم کے خلاف لگائے جاتے تھے ان میں یہ نعرے بھی شامل تھے۔ چٹو وٹہ ہائے ہائے لک دا پیپا ہائے ہائے۔ قائد قلت مردہ باد ان نعروں کا مطلب یوں تھا خواجہ ناظم الدین بھاری بھر کم اور چھوٹے قد کے تھے اس لئے انہیں بطور گالی چٹو وٹہ کہا جاتا تھا سیاہ رنگ کے تھے اس لئے لک دا پیپا کہا جاتا تھا اس وقت بھی مہنگائی تھی اس لئے انہیں قائد قلت کہا جاتا تھا۔ یہ ساری تحریک مرزائیت کے خلاف تو تھی مگر مرکزی حکومت کو غیر مستحکم کیا جا رہا تھا لوگوں کا اعتماد خواجہ ناظم الدین کی حکومت سے ہٹ رہا تھا۔ 10 مارچ کو لاہور میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا جنرل اعظم خان مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا دیئے گئے۔

ہر طرف دہشت پھیلا دی گئی تمام اضلاع میں تحریک کچل دینے کے احکامات جاری کر دیئے گئے۔ اور سارے پنجاب میں بڑی تیزی کے ساتھ حالات معمول پر آ گئے۔ گرفتار شدگاہ کے متعلق طرح طرح کی خبریں آنے لگیں۔ راقم الحروف کے بھائی مفتی عبدالواحد خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ بھی تحریک میں گرفتار ہو چکے تھے ان کے متعلق سی آئی ڈی کے ملازمین سے پتہ چلا کہ وہ فوت ہو چکے ہیں اور ان کی موت کی وجہ یہ بتائی گئی کہ حکومتی کارندوں نے انہیں اذیت دینے کے لئے برف پر لٹایا ہوا تھا خون منجمند ہونے کی وجہ سے فوت ہو گئے ہیں تحریک میں شامل لوگوں کو گرفتار شدگاہ کی فکر لاحق ہو گئی خود آگے بڑھنا بھول گئے کبھی کسی کی خبر آ جاتی کہ فلاں گرفتار شدگاہ فلاں جیل میں اذیت کی وجہ سے فوت ہو گیا ہے۔ ہر طرف دہشت ناک اور وحشت ناک خبریں تھیں اور سارے پنجاب میں سکوت مرگ طاری ہو گیا - لاہور میں مارشل لاء 10 مارچ کو لگایا گیا تھا۔ ٹھیک اٹھتیس دن بعد 18 اپریل 1958ء کو غلام محمد گورنر جنرل نے خواجہ ناظم الدین وزارت برطرف کر دی۔ نئی وزارت بنانے کے لئے امریکہ میں پاکستان کے سفیر مسٹر محمد علی جنہیں خصوصی طور پر امریکہ سے لایا گیا تھا جو پاکستان کی پارلیمنٹ یا دستور ساز اسمبلی کے ممبر بھی نہ تھے۔ جب ریڈیو پر خواجہ ناظم الدین وزارت کی برطرفی کی خبر آئی تو لوگ بہت خوش ہوئے لوگ نئے وزیر اعظم چودھری محمد علی کو سمجھتے رہے۔ دو دن بعد اخبارات سے پتہ چلا کہ نئے وزیر اعظم بنگالی ہیں نوجوان ہیں اور امریکہ کے بااعتماد آدمی ہیں بوگرا مشرقی بنگال کے رہنے والے ہیں۔ اور دیگر یہ کہ اب پاکستان برطانوی اثر سے نکل کر امریکی اثر میں داخل ہو گیا ہے اور جب محمد علی بوگرا نے اپنی کابینہ کا اعلان کیا تو اس میں سرفہرست وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ کا نام تھا لوگ سر ظفر اللہ کا نام سن کر حیران بھی ہوئے مایوس بھی ہوئے۔ نئے وزیر اعظم جوان سال تھے امریکہ سے در آمد کئے گئے تھے اور حکومت پاکستان کی تمام پالیسی بھی امریکہ کے تابع ہو گئی ملک میں اس وقت کچھ گندم کی قلت تھی امریکہ سے گندم در آمد کی گئی اونٹوں پر گندم کی

بوریوں کا بند روڈ اور کراچی اور دیگر شہروں میں جلوس نکالے گئے۔ گندم کی بوریوں پر اور اونٹوں کے گلوں میں تختیاں ڈالی گئیں تھی جن پر لکھا ہوتا تھا تھینکیو امریکہ اور جو چیزیں امریکہ سے منگوائی جاتیں یا امریکہ کی معرفت ملک میں درآمد کی جاتی تھیں ان پر امریکہ کا شکریہ لکھا ہوتا تھا۔ غرض ملکی سیاست پر معیشت پر کلی طور پر امریکہ کی چھاپ نظر آنے لگ گئی اور پھر ساتھ ہی ہمارا ملک پاکستان امریکہ کے دفاعی معاہدوں سیٹو سنٹو اور بغداد پکٹ میں شامل ہو گیا اور جو کوشش خواجہ ناظم الدین دستوری کر رہے تھے وہ بھی پس پشت ڈال دی گئی اور بنظر غور دیکھا جائے تو سالمیت پاکستان پر خواجہ ناظم الدین کو برطرف کرنا پہلا وار تھا خواجہ صاحب کی سادگی ملاحظہ فرمائیں جب گورنر جنرل غلام محمد نے ان کی وزارت کو برطرف کیا تو انہوں نے فرمایا کہ گورنر جنرل غلام محمد چونکہ ان کی سفارش پر ہی گورنر جنرل بنے تھے اس لئے وہ انہیں برطرف کر ہی نہیں سکتے اور وہ سیدھے برطانوی سفارت خانے گئے اور انہوں نے برطانوی سفیر سے کہا کہ وہ ملکہ برطانیہ سے کہیں کہ گورنر جنرل غلام محمد سے کہہ کر میری برطرفی کا حکم واپس کرائیں مگر برطانوی سفیر نے خواجہ صاحب کو ٹال مٹول کر واپس بھیج دیا۔

تحریک ختم نبوت فوجی بوٹوں کے نیچے کچل دی گئی

تحریک ختم نبوت 1953ء میں مارشل لاء کے فوجی بوٹوں کے نیچے کچل دی گئی ہزاروں لوگ جیلوں میں چلے گئے سینکڑوں شہید ہوئے کئی مرزائی بھی مارے گئے بظاہر تحریک ختم ہو گئی تھی مگر اسیران ختم نبوت حوصلہ ہارنے والے کہاں تھے جب لوگ جیلوں سے واپس آئے تو انہوں نے مجلس تحفظ ختم نبوت کو دوبارہ زندہ کر دیا پھر اپنے مقصد میں رواں دواں مگر اب تحریک مدھم طریقے پر تھی اس میں گرفتاریاں بھی نہ تھیں نہ کوئی جنگ جدل نہ ہی کوئی مباہلہ مناظرہ اپنی ایک تبلیغی دفتر مرزائیت کے مرکز ربوہ کے قریب چنیوٹ میں تو تھا ہی بعد میں ربوہ میں بھی کھول دیا۔ ہر شہر میں ہر قصبہ میں مرزائیت کے خلاف جلسے ہوتے تھے مطالبات دھرائے جاتے تھے جدوجہد ہو رہی تھی پنجاب کے مرکز لاہور میں ختم نبوت کانفرنس کو حضرت امیر شریعت نے خطاب کیا اور اس زمانے میں حضرت پر فالج کا حملہ ہو گیا تھا مگر وجود پر ہر حملے کو پس پشت ڈال کر مرزائیت کے تعاقب میں سرگرداں امیر شریعت اپنی جان کی بازی اپنے مقصد پر لگا رہے تھے۔

شاہ صاحب نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا تحریک ختم نبوت زندہ ہے میں زندہ رہوں نہ رہوں تحریک ہمیشہ ہی زندہ رہے گی قیامت تک مرزائیت کا تعاقب کرتی رہے گی اور اسی دوران مئی 1956ء کو حکومت نے حضرت امیر شریعت پر پابندی لگا دی کہ وہ ملتان کی حدود سے باہر چھ ماہ

تک نہیں جا سکتے مئی میں ہی مولانا محمد علی جالندھری پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ 1956ء میں ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت میں امیر شریعت کو گرفتار کیا گیا زبان بندی کی گئی تو حضرت نے کہا ڈاکٹر خان جمہوریت کے دعوے دار بنتے ہو مگر میری زبان بندی کرتے ہو انہی ایام میں پیر آف گولڑا شریف نے بھی مرزائیت کے خلاف راولپنڈی میں تقریر کی تھی قبل ازیں 1955ء میں محمد نذیر نامی ایک نوجوان کو ایک مرزائی سکول ماسٹر کے قتل کے الزام میں سزائے موت ہو چکی تھی مگر کسی کو پتہ نہ تھا اچانک اخبارات میں خبر آئی کہ محمد نذیر کو 4 جنوری کو تختہ دار پر لٹکا دیا جائے گا سارے پنجاب میں کہرام مچ گیا جلسے کئے گئے مطالبہ کیا گیا کہ محمد نذیر کی سزائے موت منسوخ کی جائے حضرت امیر شریعت ان دنوں سخت بیمار تھے انہوں نے اپنا خط دے کر اپنے بیٹے عطا المنعم کو حسین شہید سروردی جو ان دنوں پاکستان کے وزیر قانون تھے انہیں عرض کیا گیا کہ وہ محمد نذیر کی سزائے موت منسوخ کر دیں۔ شاہ صاحب اور دیگر تحفظ ختم نبوت کی کوشش سے محمد نذیر کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ مرزائیت کا مرکز ربوہ پاکستان سے قبل بالکل غیر آباد رقبہ تھا جو حکومت سے معمولی قیمت ایک آنہ مرلہ کے حساب سے مرزائیوں کو منتقل کیا گیا تھا۔ اور مرزائیوں نے اس جگہ کو اپنا مرکز بنایا اور متبرک شہر کا درجہ دیا جو کہ اس وقت بھی قائم ہے۔ 1970ء میں پیر آف گولڑا شریف جناب حضرت محی الدین صاحب نے تحفظ ختم نبوت کو اپنے تعاون کا یقین دلایا یہ خط انہوں نے حضرت محمد یوسف بنوری اور مولانا محمد علی جالندھری کو بھیجے تھے۔ 1970ء کے الیکشن میں علماء کا ایک مضبوط گروپ مرکزی اسمبلی میں چلا گیا تھا۔ 1973ء کے الیکشن میں مسلمان کی جو تعریف علمائے نے کی تھی وہ تعریف ہی 1974ء کی تحریک ختم نبوت کا پیش خیمہ بنی دستور کے مطابق مسلمان کے لئے مندرجہ ذیل حلف لینا ہو گا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں خدا اور اس کی کتاب قرآن مجید پر مجھے پورا یقین ہے اور اس پر میں ایمان رکھتا ہوں کہ نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا قیامت پر رسول کی سنت پر قرآن پاک کے احکامات پر ایمان رکھتا ہوں۔

معاشرے پر عقیدہ ختم نبوت کی اس قدر گرفت تھی کہ ایک وقت میں صدر جنرل محمد ایوب اور جنرل اعظم کو بھی تردید کرنا پڑی کہ وہ مرزائی نہیں ہیں۔

29 اپریل 1973ء آزاد کشمیر اسمبلی کی قرارداد

یہ قرارداد 1973ء کی تحریک ختم نبوت کے لئے پہلا قطرہ ثابت ہوئی۔ ہوا یوں کہ آزاد کشمیر اسمبلی کے رکن جناب ریٹائرڈ میجر محمد ایوب حج پر گئے روضہ رسول پر بھی حاضری دی مسجد نبوی

میں انہیں خیال آیا اور انہوں نے حضور کے روضہ مبارک پر وعدہ کیا کہ واپس اپنے وطن کشمیر جا کر مرزائیت کے خلاف کام کروں گا۔ انہوں نے واپس آکر آزاد کشیر اسمبلی میں مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قراد داد پیش کر دی جو بلاالفاق منظور ہو گئی اور آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم نے توثیق بھی کر دی۔ اور اس قرار داد کی تشہیر اس وقت ہوئی جب یہ قرار داد پاس ہو کر اخبارات میں چھپ گئی اور ہر طرف سے آزاد کشمیر اسمبلی کو میار کباد پیش کی جانے لگی اور پھر تمام مکتبہ فکر کی مساجد میں آزاد کشمیر اسمبلی کی اس قرار داد کے حق میں جلسے اور تعریف وغیرہ کی قرار دادیں ہونے لگ گئیں اور ساتھ ہی حکومت پاکستان سے بھی مطالبہ کیا جانے لگا کہ وہ بھی آزاد کشمیر اسمبلی کی اقتدا کرتے ہوئے مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیں۔

تحفظ ختم نبوت کے زیر اہتمام ملتان میں ایک جلسہ ہوا جس میں مفتی محمود صاحب سابق وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد نے آزاد کشمیر اسمبلی کو خراج تحسین پیش کیا اور ایک بہت بڑے جلسہ میں مولانا تاج محمود صاحب نے بھی عوام کی طرف سے آزاد کشمیر اسمبلی کو مبارکباد پیش کی۔ راولپنڈی لائل پور کے بڑے بڑے جلسوں میں آزاد کشمیر اسمبلی کی تعریف اور تعریفی تاریں ارسال کی گئیں۔ پشاور میں بھی آزاد کشمیر کی قرار داد کے حق میں تعریفی جلسے ہوئے جس میں سردار عبدالقیوم اور آزاد کشمیر اسمبلی کی قرار داد کو سراہا گیا۔

سندھ اسمبلی میں جناب ظہور الحسن بھوپالی نے مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی قرار داد کا نوٹس دیا جس کو ایجنڈ میں ہی نہیں لایا گیا۔

بابو عبدالکریم شورش

واقع ربوہ

نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلبہ کا واقع بھی تحریک ختم نبوت 1974ء کا پیش خیمہ ہوا ربوہ ایک قصبہ ہ جو دریائے چناب کے کنارے واقع ہے جسے مرزائیوں نے ہی بنایا ہے۔ 1947ء میں تقسیم ہند کے وقت جو مرزائی ہندوستان قادیان سے پاکستان آئے تو اس وقت حکومت میں مرزائیوں کا اثر بہت زیادہ تھا سر محمد ظفر اللہ جو کہ اس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ بھی تھے مگر ان کا حکومت پر اثر حکومتی عہدہ سے بھی زیادہ تھا۔ وہ بانیان پاکستان میں شمار ہوتے تھے تقسیم ہند کے وقت جو باؤنڈری کمشن بنا تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے وہ اس کے نمائندہ تھے۔ مرزائی کہتے ہیں کہ مرزائیوں کے خلیفہ بشیر الدین محمود نے خواب میں دیکھا کہ وہ ربوہ والی جگہ پر آباد ہو جاویں تو فورا مرزائی حکام نے جو کہ اس وقت حکومتی عہدوں پر متمکن تھے ان کی کوشش سے مرزا بشیر الدین خلیفہ ربوہ کی خواہش پر ربوہ کی جگہ حکومت سے بہت ہی کم قیمت پر خرید کر لی گئی۔ ربوہ کی کل زمین 1034 ایکڑ ہے جس کی قیمت 10340 روپے حکومت کو اس وقت ادا کر کے مرزائیوں نے مذکورہ 1034 ایکڑ رقبہ پر ملکیت حاصل کر لی اور ربوہ شہر کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ ربوہ شہر چنیوٹ سے سرگودھا جاتے ہوئے تقریبا چار میل دریائی چناب گزر کر سڑک پر واقع ہے سڑک کے دائیں طرف پہاڑ کے دامن میں ایک بہت بڑی چاردیواری ہے جس کے اندر قبریں ہیں اس قبرستان کو مرزائی بہشتی مقبرہ کہتے ہیں اس میں ان مردوں کو دفن کیا جاتا ہے جو زندگی میں وصیت کرتے ہیں کہ انہیں بہشتی مقبرہ میں دفن کیا جائے وصیت کرنے والے کی جائیداد کا مخصوص معقول حصہ بحق جماعت احمدیہ وقف ہو جاتا ہے مدفون کی قبر پر وصیت نامہ کا نمبر لکھا جاتا ہے اسی قبرستان میں مرزا بشیر الدین محمود جماعت قادیانی کے خلیفہ دوم کی اور خلیفہ سوم مرزا ناصر احمد کی قبر بھی ہے رائیل فیملی کے مدفونین کی قبریں بہشتی مقبرہ کے درمیان میں واقع ہیں ان کے گرد بھی بہشتی مقبرہ کے اندر ہی الگ چاردیواری بنی ہوئی ہے بہشتی مقبرہ مدینہ شریف کی جنت البقیع کی نقل بنائی گئی ہے ایک اور قبرستان بھی ہے جس میں لوگوں کو دفن کیا جاتا ہے۔ جنہوں نے وصیت نہیں کی ہوتی۔ چنیوٹ سے جاتے ہوئے سرگودھا چنیوٹ روڈ سے بائیں جانب ربوہ شہر ہے جو مرزائیوں نے آباد کیا ہے اس میں مرکز مرزائیت کے دفاتر ہیں مرکز خلافت ہے مسجد مبارک ہے جسے مرزائی مسجد نبوی کا درجہ دیتے ہیں۔ مسجد مبارک* کی مغرب کی جانب خاندان مرزائی نبوت کے گھرانے ہیں تمام شہر میں مرزائی ہی آباد ہیں ان میں اگر کوئی جھگڑا ہو جائے تو ان کے فیصلے بھی مرزائی انتظامیہ ہی کرتی ہے۔ عام قوانین کے علاوہ اس شہر کے قوانین بھی ہیں جن کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ باہر سے کوئی بھی شخص اگر ربوہ جائے تو مختلف جگہوں پر کچھ قوانین لکھے ہوئے نظر آویں گے میں ایک دفعہ ربوہ کسی کاروباری سلسلہ میں گیا تو وہاں لکھا ہوا دیکھا کہ حدود ربوہ کے اندر سگریٹ پینا منع ہے میں نے کسی شخص کو بھی ربوہ میں

علانیہ سگریٹ پیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی کوئی سگریٹ کی دکان دیکھی یہ 1968ء کی بات ہے کہ جو شخص بھی ربوہ میں کسی کام کو جائے تو اہل ربوہ اسے تبلیغ کرنا عین فرض سمجھتے ہیں مجھے بھی بہت تبلیغ کی گئی مگر مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مرزائی عام مسلمان اصطلاحیں وہی استعمال کرتے ہیں جو حضور علیہ اسلام یا ان کے وقت مسلمان استعمال کرتے تھے جس طرح ہم حضور کے ساتھیوں کو صحابی کہتے ہیں مرزائی مربی کہتے ہیں جس طرح مسلمان حضور کی ازواج کو ام المومنین کہتے ہیں اسی طرح وہ بھی ازواج نبوت یا ازواج خلافت کو ام المومنین کہتے ہیں میں جب ربوہ گیا تھا تو مجھے کام تھا مرزا انور احمد صاحب کے ساتھ جو وہاں ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے اور لنگر انچارج بھی تھے میں ان کے دفتر میں اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا وہ کسی کام کے لئے باہر چلے گئے تھے تو ایک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تھوڑی دیر کے بعد میں نے ٹیلی فون اٹھایا اور کہا کہ مرزا انور صاحب نہیں ہیں اور میں مہمان میں ہوں اور مرزائی بھی نہیں ہوں مجھے ٹیلی فون پر سندیس دیا گیا کہ آپ لنگر مینجر سے کہہ دیں کہ ام المومنین حضرت طاہرہ آپا کے گھر چار مہمان ہیں ان کے لئے کھانا بھیج دیں یہی سندیس میں نے مرزا انور احمد کو بعد میں بتا دیا۔ ربوہ میں ہائی سکول بھی ہے اور ایک بہت بڑا کالج بھی ہے مرزائی طالب علم باہر سے بہت بڑھنے آتے ہیں۔ 1974ء کی تحریک ختم نبوت کو 29 مئی 1974ء کے واقع ربوہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے ہوا یوں کہ 22 مئی 1974 نشتر میڈیکل کالج کے طالب علموں کا ایک گروہ جن کی تعداد تقریبا 150 تھی بذریعہ چناب ایکسپریس شمالی پاکستان کے مطالعاتی دورہ اور سیر تفریح کی غرض سے روانہ ہو گئے گاڑی جب ربوہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو وہاں پر طالب علموں اور مرزائی مبلغین کا تصادم ہوا جس کے نتیجے میں عالمی سطح تک اس کی آواز بلند ہوئی مرزائی مبلغ یہ بالکل فرض سمجھتے ہیں کہ جو شخص بھی ربوہ میں آجائے اسے مرزائیت کی تبلیغ کی جائے اور نوجوانی کا بھی تقاضا ہے کہ کچھ شرارتیں وغیرہ کریں واقع یوں ہوا کہ جب 22 مئی کو چناب ایکسپریس چنیوٹ سے چل کر ربوہ پہنچی تو مرزائی مبلغین تبلیغ کرنے نشتر میڈیکل کالج کے طالب علموں کے ڈبہ میں داخل ہوئے انہوں نے الفضل اخبار کے پرچے دیئے اور تبلیغی انداز بھی اختیار کیا کچھ مبلغین نے پلیٹ فارم پر بھی طالب علموں کو الفضل کے پرچے دیئے اور مرزا صاحب کی تعریف اور شان بیان کی ایک طالب علم نے کہا کہ سنا ہے کہ جو شخص مرزائی ہو جاتا ہے اسے حوریں بھی دی جاتی ہیں ہمیں بھی کوئی حور دکھاؤ۔ دوسرے طالب علم بھی حوروں کے مطالبے پر ہمنوا بن گئے اس پر جھگڑا ہو گیا تلخ کلامی ہوئی۔ قریب ہی ایک گراؤنڈ میں مرزائی نوجوان فٹ بال کھیل رہے تھے وہ بھی جھگڑا سن کر آ گئے بات گالی گلوچ سے بڑھ کر ہاتھا پائی تک بھی پہنچ گئی مگر گاڑی نے وسل دے دیا مسافر طالب علم جو پلیٹ فارم پر تھے وہ گاڑی پر سوار ہو گئے۔ مرزائی جو گاڑی میں جھگڑا دیکھ کر چڑھے تھے وہ گاڑی سے نیچے اتر گئے گاڑی میں سوار طالب علموں نے مرزائیت کے خلاف نعرہ بازی بھی کی تحفظ ختم نبوت کے نعرے بھی لگائے اس واقع کو ربوہ کے مرزائیوں نے اپنی توہین سمجھا اور طالب علموں کے واپس آنے

کے پروگرام کے متعلق معلومات حاصل کرنے لگ گئے انہیں پتہ چل گیا کہ نشتر میڈیکل کالج کے طالب علم 29 مئی 1974ء کو بذریعہ چناب ایکسپریس ہی واپس جاویں گے ربوہ کے مرزائیوں نے واپسی پر ان طالب علموں سے بدلہ لینے کا پروگرام بنا لیا واپسی پر طالب علم بھی کچھ کم تھے بہت سارے طالب علم اپنے گھروں کو بھی چلے گئے تھے مگر جو طالب علم واپسی سفر چناب ایکسپریس پر کر رہے تھے ان کی نگرانی شروع کر دی گئی سرگودھا سے ہی کچھ لوگ چناب ایکسپریس پر سوار ہو گئے جن کے ارادے خطرناک اور مشکوک تھے طالب علم کچھ فکر مند تھے طالب علموں کی بوگی گاڑی کے آخر میں لگی ہوئی تھی ربوہ سٹیشن پر بہت بڑا ہجوم تھا جن کی تعداد پانچ چھ سو سے زیادہ تھی۔ لوگ ہاکیوں ڈنڈوں اور دیگر کند ہتھیاروں سے مسلح تھے گاڑی جب ربوہ سٹیشن پر پہنچی طالب علموں کے ڈبے ابھی پلیٹ فارم کے باہر ہی تھے کہ گاڑی کو ویکم کھینچ کر روک لیا گیا مرزائی جنتا کا ہجوم نعرے لگاتا ہوا طالب علموں کے ڈبے پر حملہ آور ہوا طالب علموں نے اندر سے دروازے کھڑکیاں بند کر لیں مگر ہجوم نے گاڑی کے دروازے اور کھڑکیاں توڑ دیں اندر داخل ہو کر طالب علموں کو مارنا شروع کر دیا بہت طالب علم زخمی ہوئے معمولی زخمیوں کو ابتدائی طبی امداد کے بعد فارغ کر دیا گیا جو طالب علم شدید زخمی ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔ عبدالرحمان محمد انور' ارباب عالم' رفعت باجوہ منصور' اسلم' عبدالخالق' خالد اختر' جنہیں ابتدائی طبی امداد کے بعد لائلپور کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ جو بہت وقت کے بعد صحت یاب ہوئے حملہ آور مرزائی احمدیت زندہ باد مسیح ماعود علیہ السلام زندہ باد حضرت مرزا صاحب زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔

طالب علموں کی یہ گاڑی جب لائلپور پہنچی تو شہر میں یہ خبر پہلے ہی پہنچ گئی تھی لوگ سٹیشن پر گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔

واقع ربوہ کے خلاف ہنگامے

ربوہ کے اس واقع کو اخبارات میں بہت تشہیر ہوئی ملکی اخبارات کے علاوہ غیر ملکی اخبارات نے بھی لکھا مرزائیت کے خلاف لوگوں میں کافی نفرت ہوئی اور ملک کے اندر ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی پنجاب حکومت نے واقعہ ربوہ کی عدالتی تحقیقات کرانے کے لئے یک رکنی کمشن قائم کر دیا۔ جسٹس ہمدانی کو تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا کئی گواہوں کے بیانات قلم بند کئے گئے 112 صفحات پر مشتمل تحقیقاتی رپورٹ جسٹس ہمدانی نے پنجاب حکومت کو پیش کی جو کچھ بھی ہم نے واقع ربوہ کے بارے میں لکھا ہے وہ جسٹس ہمدانی کمشن کی کارروائی سے اخذ کیا گیا ہے۔ واقع ربوہ کے اثرات سارے ملک پر پڑے واقعہ ربوہ کی خبر جب لائل پور پہنچی تو لائل پور کے تحفظ ختم نبوت کے لیڈران بشمول مولانا تاج محمود صاحب نے لائل پور کے ریلوے اسٹیشن پر ہی جلسہ منعقد کر دیا شہر میں منادی کرا دی گئی ہزاروں لوگ لائل پور کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے لوگوں

کو واقعہ ربوہ کی تفصیل سے آگاہ کیا گیا تھا اور جلسہ میں ہی لوگوں میں ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی جیسے ہی یہ خبریں ملک کے دوسرے حصوں میں پہنچیں۔ مرزائیوں کے خلاف نفرت کا اظہار کیا جانے لگا۔ پنجاب کے مختلف شہروں میں مرزائیت کے خلاف جلسے ہوئے جلوس نکالے گئے۔ لوگ مشتعل ہوئے گوجرانوالہ شیرانوالہ باغ میں ایک جلسہ ہوا جس میں حکیم عبدالرحمان اور دیگر لیڈران تحفظ ختم نبوت نے تقاریر کیں اور جلوس نکالا گیا جلوس ڈی سی آفس گیا اور ڈی سی کو اپنے مطالبات پیش کئے جن میں مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کا مطالبہ سرفہرست تھا جلوس کو منتشر کر دینے کا بھی اعلان کر دیا گیا مگر کچھ لوگوں نے جلوس کا رخ مرزائی عوام کی طرف موڑ دیا ضلع کچہری میں ایک مرزائی ایڈووکیٹ کے چیمبر کی کتابیں باہر نکال کر آگ لگا دی گئی ہجوم نے پھر شہر کا رخ اختیار کر لیا اور مختلف جگہوں پر مرزائی املاک کو لوٹا گیا اور آگ لگائی گئی۔ جن میں دروازہ ٹھاکر سنگھ کی دکان' بازار خرادانوالے کے پنوں کی ایک دکان بازار کسیرا کی پنسار کی دکان ریل بازار کی سنگر سونگ مشین کی دکان گھنٹہ گھر کا ایک دواخانہ بھی شامل ہے جن کو لوٹ کر آگ لگا دی گئی ان سارے ہنگاموں میں ملک بھر میں مرزائیوں کی بے شمار املاک کو لوٹا گیا آگ لگا دی اور بہت سارے مرزائی قتل بھی کر دیئے گئے جنکی تعداد محتاط اندازے کے مطابق بیس سے زائد تھی گوجرانوالہ میں راقم الحروف کا ایک واقف مرزائی محمد افضل بھی قتل ہو گیا تھا اور ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ پیپلز پارٹی کے بھٹو دور حکومت میں ہوا جب کہ مرزائیوں نے پوری جدوجہد اور پر خلوص دعاؤں کے ساتھ پیپلز پارٹی کو 1970ء کے الیکشن میں کامیاب کرایا تھا انہیں الیکشن کے دوران میری ایک مرزائی سے ملاقات ہو گئی مختصر ملاقات کے بعد انہوں نے ضروری کام سے جانے کا اصرار کیا تو میں نے کہا کہ کل الیکشن ہیں کاروبار بھی بند ہیں آپ کو کس کام کے لئے ضروری جانا ہے انہوں نے کہا کہ جماعت احمدیہ کی طرف سے ہدایت ہے کہ الیکشن میں پیپلز پارٹی کی بھرپور امداد بھی کرنی ہے اور رات کو جاگ کر خداوند کریم کے حضور پیپلز پارٹی کی الیکشن میں کامیابی کی دعا بھی کرنی ہے اس لئے مجھے جلدی ہے اور میں نے اس فریضہ کی ادائیگی میں جدوجہد کرنی ہے۔

مندرجہ بالا تحریک کے دوران ہی پھر مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک نے زور پکڑ لیا اور اخبارات میں بھی واقعات جو شائع ہوئے ان سے بھی تحریک کو تقویت ملی فوری طور پر مدیر چٹان آغا شورش کاشمیری مولانا تاج محمود لائلپوری اور مصطفیٰ صادق متحرک ہو گئے ان لوگوں نے مسٹر بھٹو سے بھی اس سلسلہ میں ملاقات کی اور بھٹو کو یہ مسئلہ حل کرنے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ کر لیا چنانچہ بھٹو صاحب نے اپنی ایک تقریر میں بھی ذکر کیا تھا کہ مجھے شورش صاحب اور دیگر لوگ ملے وہ کہتے ہیں کہ مرزائیت کا 90 سالہ معاملہ سدھار دیں تو آپ قوم کے ہیرو ہو جائیں گے اور پھر ساتھ ہی بھٹو صاحب نے مزاح کے موڈ میں کہا میں بہت ہیرو بن چکا ہوں اب کسی اور کو بھی ہیرو بن جانا چاہئے۔ اور ساتھ ہی ان ہنگاموں کے دوران مجلس تحفظ ختم نبوت

کے مرکزی لیڈران نے جن میں مندرجہ ذیل لیڈر بھی شامل تھے مولانا محمد یوسف بنوری' مولوی محمد شریف جالندھری' مولانا تقی عثمانی' مولانا عبدالرحیم' مولوی محمد یوسف لدھانوی' اپنا پورا دفتر ختم نبوت لے کر اسلام آباد جا کر ڈیرا ڈال دیا۔ اور ساتھ ہی مندرجہ ذیل علماء حضرات پر مشتمل مجلس عمل قائم کر دی گئی صدر مجلس عمل حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری سیکرٹری مجلس عمل محمود احمد رضوی سید امین گیلانی' مرکزی پارلیمنٹ میں قائم مقام اپوزیشن لیڈر مفتی محمود صاحب اس مجلس عمل کے زیرِ انتظام مرزائیوں کے خلاف پاکستان کی مرکزی اسمبلی میں کارروائی عمل میں آئی۔

پارلیمنٹ میں مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی کارروائی

ممبران پارلیمنٹ نے مندرجہ ذیل قرار داد پیش کرنے کی اجازت مانگی ہرگاہ کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قادیان کے مرزا غلام احمد نے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے نیز ہر گاہ نبی ہونے کا اس کا جھوٹا اعلان بہت سی قرآنی آیات کو جھٹلانے اور جہاد ختم کرنے کی کوشش اسلام کے بڑے بڑے احکام کے خلاف غداری تھی نیز ہرگاہ وہ سامراج کی پیداوار تھا اور اس کا مقصد مسلمانوں کے اتحاد کو تباہ کرنا اور اسلام کو جھٹلانا تھا نیز یہ کہ پوری امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرو کار چاہے وہ مرزا غلام احمد کی نبوت کا یقین رکھتے ہوں یا اسے اپنا مذہبی راہنما کسی بھی صورت مانتے ہوں دائرہ اسلام سے خارج ہیں نیز ہر گاہ ان کے پیرو کار چاہے انہیں کوئی بھی نام دیا جائے مسلمانوں کے ساتھ گھل مل کر اور اسلام کا ایک فرقہ ہونے کا بہانہ کرکے اندرونی اور بیرونی طور پر تخریبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

نیز ہرگاہ عالمی مسلم تنظیموں کی ایک کانفرنس میں جو مکہ مکرمہ کے مقدس شہر میں رابطہ عالم اسلامی کے زیرِ اہتمام 6 اور 10 اپریل 1974ء کے درمیان منعقد ہوئی اور جس میں دنیا بھر کے تمام مسلم تنظیموں اور اداروں کے وفود نے شرکت کی متفقہ طور پر یہ رائے ظاہر کی گئی کہ قادیانیت اسلام اور عالم اسلام کے خلاف ایک تخریبی تحریک ہے جو کہ ایک اسلامی فرقہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اب قومی اسمبلی کو یہ اعلان کرنے کی کارروائی کرنی چاہئے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار چاہے انہیں کوئی بھی نام دیا جائے یہ مسلمان نہیں اور قومی اسمبلی میں ایک سرکاری بل پیش کیا جائے تاکہ اس اعلان کو موثر بنانے کے لئے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر ان کے جائز حقوق و مفادات کے تحفظ کے لئے احکام وضع کرنے کی خاطر آئین میں مناسب اور ضروری ترمیمات کی جائیں۔

محرکین بل: جناب مفتی محمود صاحب، مولانا عبدالمصطفیٰ الازہری، مولانا شاہ احمد نورانی، پروفیسر غفور احمد، مولانا سید محمد علی رضوی، مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک، چودھری ظہور الٰہی، سردار شیر باز مزاری، مولانا محمد ظفر احمد انصاری، جناب عبدالحمید جتوئی، صاحبزادہ احمد رضا قصوری، جناب محمود اعظم فاروقی، مولانا صدر الشہید، مولانا نعمت اللہ صاحب، جناب عمرہ خان، مخدوم نور محمد، جناب غلام فاروق، سردار مولا بخش سومرو، سردار شوکت حیات خان، حاجی علی احمد تالپور، راؤ خورشید علی خان، رئیس عطا محمد مری، نواب زادہ میاں محمد ذاکر قریشی، جناب غلام حسن خان دھاندلا، جناب کرم بخش اعوان، صاحبزادہ میاں محمد نذیرِ سلطان، مہر غلام حیدر بھروانہ، محمد ابراہیم برق،

صاحبزادہ صفی اللہ' صاحب زادہ نعمت اللہ شنواری' ملک جہانگیر خان' عبدالسمان خان' جناب اکبر خان مہمند' میجر جنرل جمالدار' حاجی صالح محمد' جناب عبدالمالک خان' خواجہ جمال محمد گوریجہ۔
مندرجہ بالا اراکین پارلیمنٹ کے اجلاس پارلیمنٹ طلب کرنے پر اجلاس طلب کر لیا گیا جو سترہ دن تک جاری رہا جس میں جماعت احمدیہ کے خلیفہ مرزا ناصر احمد کو بھی طلب کر لیا گیا اور ساتھ ہی لاہوری فرقہ کے سربراہ مولانا صدر دین کو بھی طلب کر لیا گیا دونوں حضرات کو پارلیمنٹ میں 13 یوم تک سوال جواب کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔ اسمبلی کی ان ایام کی کارروائی تقریباً 7000 صفحات پر مشتمل ہے جو کہ خفیہ فائل ہے سرکار کی مرضی کے بغیر کوئی شخص دیکھ نہیں سکتا ہے جس انداز کی کارروای ہوئی وہ چند لفظوں میں بیان کی جاتی ہے۔ ممبران پارلیمنٹ کی درخواست پر پارلیمنٹ کا اجلاس بلا لیا گیا تحفظ ختم نبوت کا دفتر اسلام آباد میں قائم ہو چکا تھا مجلس عمل کے ممبران اور دیگر وہ ممبران پارلیمنٹ میں حصہ لینا چاہتے تھے انہیں مجلس تحفظ ختم نبوت والے دلائل سے مسلح کرتے' تھے بالکل ایسے ہی جیسے کوئی مدعی مقدمہ اپنے وکیل کو مقدمہ کی تیاری کراتا ہے اس طرح تحفظ ختم نبوت کا دفتر ممبران پارلیمنٹ کی تیاری کراتا ہے اور وہی سوال مرزا ناصر احمد خلیفہ جماعت احمدیہ سے کئے جاتے تھے ان میں یہ سوال بھی آیا تھا کہ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کا جنازہ سر ظفر اللہ نے کیوں نہیں پڑھا جس کے جواب میں کہا گیا کہ غیر احمد کافر ہیں ان کا جنازہ کسی احمدی کے لئے پڑھنا جائز نہیں یہ کارروائی انتہائی طویل ہے اور مرزا ناصر احمد 13 یوم تک سوال جواب کے مرحلے سے گزرے مختلف ممبران نے ہر قسم کے سوال کئے لاہوری فرقہ کے مولوی صدر دین سے بھی دو روز تک سوال جواب ہوتے رہے۔ 17 یوم تک اس بل پر کارروائی ہوتی رہی بلاآخر متفقہ طور پر پارلیمنٹ نے مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دیا اور یہ فیصلہ پارلیمنٹ کا تاریخ ساز فیصلہ تھا۔ اس ساری کارروائی میں مفتی محمود اور ان کی جماعت ہی پارلیمنٹ کی راہنمائی کرتی رہی جمعیت علمائے پاکستان کے علماء حضرت مولانا شاہ احمد نورانی اور ان کے ساتھی ممبران نے بھی بہت محنت کی جدوجہد کی۔
اس تاریخ ساز فیصلے پر ملک بھر کے مذہبی حلقوں میں اظہار تشکر منایا گیا پاکستان پارلیمنٹ کو مبارکباد پیش کی گئی اجتماعات جمعہ میں حکومت اور پارلیمنٹ کے اس اقدام کی تعریف کی گئی۔

اسلم قریشی کے گمشدگی کے حالات

1974ء میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دیا گیا مگر اس کے متعلق قانون سازی نہیں ہوئی تحفظ ختم نبوت والوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ مرزائیوں کا تعاقب جاری رہا۔ 1984ء میں سیالکوٹ کے مولوی اسلم قریشی اچانک گم ہو گئے تحفظ ختم نبوت والوں نے شبہ ظاہر کیا کہ اسلم قریشی کو مرزائیوں نے اغواء کر لیا ہے اس کے متعلق جلسے جلوس وغیرہ ہونے لگ گئے اور مطالبہ کیا

جانے لگ گیا کہ اسلم قریشی کے اغواء میں خلیفہ قادیان ربوہ مرزا طاہر احمد کو شامل تفتیش کیا جائے اس سلسلہ میں حکام بالا سے بھی علماء حضرات کی ملاقاتیں ہوئیں صدر پاکستان ضیاء الحق تک یہ بات گئی حکام نے تحقیقات کا وعدہ کیا اور مولوی اسلم قریشی کی برآمدی کا وعدہ کیا مگر فوری طور پر کچھ بھی نہ ہوا اس ضمن میں ضیاء الحق کو مرزائیت کے متعلق قانون سازی پر مجبور کیا گیا اور ضیاء الحق حکومت نے 26 اپریل 1984ء کو ایک آرڈی نینس جاری کیا جس کے تحت مرزائیوں کو مسلم شعائر استعمال کرنے پر پابندی لگا دی گئی اس آرڈی نینس کے تحت مرزائی اپنی عبادت کی عمارت کو مسجد نہیں کہہ سکتے۔ اذان نہیں دے سکتے، ام المومنین نہیں کہہ سکتے' ازواج مطہرات نہیں کہہ سکتے' صحابی نبی کہہ سکتے' اپنا تعلق اسلام کے ساتھ اور اسلام کا تعلق اپنے ساتھ نہیں کہہ سکتے' رضی اللہ عنہ نہیں کہہ سکتے' اس قانون کے باوجود مرزائی اپنے آپ کو غیر مسلم تسلیم نہیں کرتے۔ 1974ء کی تحریک میں 1984ء کی تحریک میں زیادہ مرزائی بیرون ملک چلے گئے امریکہ کینڈا اور دیگر یورپین ممالک میں انہیں سیاسی پناہ بڑی آسانی سے مل جاتی ہے جب اسلم قریشی گم ہوئے تو مرزا طاہر احمد خلیفہ ربوہ اور مرزائیوں کا کافی محاسبہ کیا گیا اور بالآخر خلیفہ طاہر احمد بھیس بدل کر ملک سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے وہ اس وقت برطانیہ میں مقیم ہیں اس وقت مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفاتر ملک اور بیرون ملک میں موجود تھے جو مسلم عوام کو مرزائیت کے خطرات کی متعلق آگاہ کرتے رہتے پمفلٹ کتابچے حصول مقصد کے لئے شائع کرتے رہتے ہیں جلسے بھی کرتے رہتے ہیں ربوہ میں بھی جو صرف مرزائیوں کا ہے کسی وقت شہر تھا تحفظ ختم نبوت کا دفتر ہے مسجد بھی ہے اور ہر سال جس وقت مرزائی اپنا سالانہ اجتماع کرتے ہیں مجلس ختم نبوت بھی جلسہ کرتے ہیں جمع ہوتے ہیں مرزائیت کے محاسبہ کے لئے مختلف پروگرام بنائے جاتے ہیں۔ 1992ء میں مولانا اسلم قریشی اچانک مل گئے سرکاری رپورٹ کے مطابق وہ ایران چلے گئے تھے اور آٹھ سال ایران میں مقیم رہے۔

تنقید تبصرہ

تحریک تحفظ ختم نبوت جو تقریبا چالیس سال سے مسلسل چل رہی ہے جس کا ایک عروج 1953ء میں تھا اور پھر 1974ء میں اور پھر 1984ء میں مرزائی غیر مسلم اقلیت بھی بن گئے اور جو مطالبات تحفظ ختم نبوت والوں نے پیش کئے وہ بھی حکومت نے مان لئے مگر مرزائیوں نے ان قوانین کو دل سے تسلیم نہیں کیا وہ بدستور اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور مسلم معاشرہ میں ہی شامل رہنا چاہتے ہیں مگر اس تحریک نے مرزائیوں کو جہاں پاکستان میں کچھ نقصان پہنچایا وہاں دنیا بھر میں انہیں فائدہ ہوا اب دنیا بھر میں مرزائیوں کو مظلوم سمجھا جاتا ہے امریکہ کینڈا یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں جہاں پاکستان کے لوگ آباد ہونے کے لئے لاکھوں روپے رشوت دینے کو ہر وقت تیار بیٹھے رہتے ہیں زندگی خطرات میں ڈال کر مال دولت گنوا کر ان ممالک میں آباد ہونے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ کامیاب نہیں ہوتے بعض وقت حصول مقصد کے لئے زندگی تک گنوا دیتے ہیں روپے پیسے ضائع ہو جانا تو معمولی بات ہے۔ وہاں مرزائیوں کو ان ترقی یافتہ ممالک میں آباد ہونے کی کھلی اجازت ہے وہ کسی ملک میں جا کر اپنے آپ کو مرزائی کہہ کر وہاں رہنے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر سکتے ہیں اسی تحریک کی وجہ سے مرزا طاہر احمد خلیفہ مرزائیت ملک سے فرار ہو کر برطانیہ میں پہنچ گئے۔ وہاں آباد ہو گئے اور وہاں پر ہی انہوں نے اپنا مرکز خلافت بھی بنا لیا ہے کروڑوں پونڈ لاگت سے برطانیہ میں انہوں نے سیٹلائٹ ٹی وی سٹیشن خرید لیا ہے وہاں پر سے ہی ڈش انٹینا کے ذریعے تمام دنیا میں اس وقت مرزائیت کی تبلیغ کر رہے ہیں مرزائیت کے لئے کام اگر پاکستان میں پانچ فیصد کرتے تھے اب وہ برطانیہ میں بیٹھ کر سو فیصدی کر رہے ہیں۔ ڈش انٹینا کے ذریعے تبلیغ کی جاتی ہے ایک ہی وقت میں دنیا بھر کے مرزائیوں کو ہر قسم کی ہدایات بھی کی جاتی ہیں پاکستان میں مرزائیوں نے اپنے گھروں میں ڈش انٹینا لگا رکھے ہیں وقت مقررہ پر دیگر لوگوں کو بھی اپنے گھر بلا لیتے ہیں مرزا صاحب کی زیارت کرتے ہیں اور احکامات سنتے ہیں وعظ سنتے ہیں اور مرزا طاہر احمد خلیفہ مرزائیت ہر وقت ہر گھر میں موجود ہوتا ہے اب تحفظ ختم نبوت والے اس خطرہ کو بھی محسوس کر رہے ہیں اور آنے والے وقت میں بھی اس بات کا خطرہ ہے کہ مرزائیوں کے خلاف پاکستان میں ایک خطرناک تحریک بھی چل سکتی ہے۔

خدائی خدمت گار

14 اگست 1947 کو پاکستان بن گیا ہندوستان تقسیم ہو گیا پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے حلف اٹھایا اور پاکستان کے سب سے بڑے حاکم بن گئے۔

گورنر جنرل بن جانے کے بعد قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے جو سب سے پہلا فرمان جاری کیا وہ یہ تھا کہ گورنر سرحد کو حکم دیا گیا کہ وہ ڈاکٹر خان کو وزارت سے برطرف کر دے اور اس وقت کے اپوزیشن لیڈر خان عبدالقیوم خان کو وزارت بنانے کی دعوت دیں سرحد اسمبلی کے کل 50 ممبر تھے جن میں مسلم ممبران کی تعداد 38 تھی۔ ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ 22 ممبر تھے جبکہ خان عبدالقیوم خان کے ساتھ 16 ممبر تھے۔ قائد اعظم کے حکم سے 22 ممبران والی وزارت برطرف کر دی گئی اور 16 ممبران والی وزارت کو اقتدا سونپ دیا گیا سرحد کے دارالحکومت پشاور میں بھی دیگر پاکستانی شہروں کی طرح جشن منایا گیا پاکستانی جھنڈے کو سلامی دی گئی۔ پریڈ کی گئی اس جشن میں خدائی خدمت گاروں کے لیڈران نے بھی شمولیت کی خواہش ظاہر کی مگر انہیں شامل نہیں ہونے دیا گیا دوسرے لفظوں میں پاکستان بن جانے کے بعد خدائی خدمت گاروں نے بھی ملک و ملت کی خدمت کی خواہش ظاہر کی جسے رد کر دیا گیا بادشاہ خان دستور ساز اسمبلی کے ممبر بھی تھے وہ کراچی میں دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہوئے اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے حلف اٹھایا پاکستان کے پہلے گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی جناحؒ سے ملاقات کی انہیں اپنی خدمات پیش کیں انہیں پشاور آنے کی دعوت دی اور انہیں عرض کیا کہ آپ سرداریاب جہاں پر خدائی خدمت گاروں کا مرکز ہے تشریف لائیں ہم سب آپ کے خدمت گزار ہوں گے اور تمام خدائی خدمت گار آپ کو اور پاکستانی جھنڈے کو بھی سلامی دیں گے قائد اعظم نے بادشاہ خان کی دعوت قبول کر لی اور انہوں نے خدائی خدمت گاروں کے مرکز سرداریاب تشریف لانے کا وعدہ بھی کر لیا۔ پروگرام کے مطابق قائد اعظم محمد علی جناحؒ پشاور تشریف لے گئے بادشاہ خان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ انہیں گورنر ہاؤس میں ملے۔ انہیں سرداریاب تشریف لانے کے لئے عرض کیا پروگرام کے مطابق سرداریاب جانا تھا مگر ابھی پروگرام زیر غور ہی تھا کہ قائد اعظم کی مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ میٹنگ ہوئی۔ میٹنگ کے بعد بادشاہ خان کو کہا گیا کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جاویں' تب قائد اعظم سرور یاب جاویں گے۔ بادشاہ خان نے جواب دیا کہ میں مسلم لیگ میں شامل نہیں ہو سکتا مگر میں سیاست چھوڑ دیتا ہوں۔ خدائی خدمت گار ہوں اور لوگوں میں تعمیری کام کروں گا سماجی کام کروں گا۔ مگر قائد اعظم نہیں مانے پشاور سے سرور یاب تک سارے راستے میں قائد اعظم کے استقبال کے لئے محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ سرخ جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ ہزاروں سرخ باوردی رضا کار راستے میں آنکھیں بچھائے منتظر تھے مگر قائد اعظم بادشاہ خان کی دعوت پر سرداریاب نہیں گئے اور بادشاہ خان کی دعوت کو ٹھکرا دیا۔

سرداریاب کو مسمار کر دیا گیا

قائد اعظم کے پشاور سے چلے جانے کے بعد حکومت نے پہلا کام یہ کیا کہ خدائی خدمت

گاروں کے مرکز سرور یاب کو مسمار کر دیا گیا تباہ کر دیا گیا بلڈوزر پھیر دیئے گئے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ سارے صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گاروں نے جو سکول بنائے ہوئے تھے یہ سکول آزاد سکول کے نام سے پکارے جاتے تھے وہ ختم کر دیئے گئے۔ اور عمارات خالی کر دی گئیں جو عمارات خدائی خدمت گاروں نے خود اپنی مدد آپ کے تحت بنائی تھیں وہ مسمار کر دی گئیں۔ پورے علاقے میں دہشت کی فضاء قائم کر دی گئی حالانکہ حکومت کے ان اقدامات سے قبل خدائی گاروں کا ایک بہت بڑا جلسہ سرور یاب میں ہوا تھا جس میں متفقہ قرار داد منظور کی گئی تھی ۔ کہا گیا تھا کہ صوبہ سرحد سے خدائی خدمت گاروں نے دیانت داری کے ساتھ پاکستان کی مخالفت کی تھی مگر اب پاکستان بن گیا ہے اور ہم خدائی خدمت گار تن من سے پاکستان کو تسلیم کرتے ہیں اور ہم پاکستان کی وفاداری اور خدمت کا عہد کرتے ہیں اور اس قسم کا حلف نامہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں بادشاہ خان قبل ازیں اٹھا چکے تھے۔

پیپلز پارٹی اور بھابڑا فائرنگ

1948ء کے آخر لاہور میں قوم پرست ورکروں لیڈروں کا کنونشن منعقد ہوا جس میں ایک ترقی پسند جماعت پیپلز پارٹی بنانے کا اعلان کیا گیا تھا جس کے صدر خان عبدالغفار خان بنائے گئے نائب صدر شیخ عبدالمجید سندھی جنرل سیکرٹری شیخ حسام الدین بنے تھے اس جماعت میں مسلم لیگ کے علاوہ پاکستان سے قبل کی سیاسی جماعتوں کے لیڈر اور ورکر شامل ہوئے تھے مگر یہ جماعت بہت جلد ہی گوشہ گمنامی میں چلی گئی اس لئے کہ انہیں ایام میں جب پیپلز پارٹی بنی تھی خدائی خدمت گاروں پر بہت ہی ظلم و بربریت ہوئی تھی اور اس جدید اور نوزائدہ پارٹی میں زیادہ طاقت ور گروپ خدائی خدمت گاروں کا ہی تھا اور حکومت نے اس پارٹی کو کچل دینے کا پروگرام بنا کر ان لوگوں پر طرح طرح کے تشدد کرنے کے نت نئے طریقے ایجاد کئے گئے۔

واقعات یوں ہوئے کہ بادشاہ خان بنوں جا رہے تھے راستے میں ایک سرنگ آتی ہے وہاں پر بادشاہ خان کی گاڑی روک کر گرفتار کر لیا گیا اور الزام لگایا گیا کہ بادشاہ خان فقیر ا یپی کو 80000 روپے دینے جا رہے تھے تاکہ وہ پاکستان کے خلاف جنگ کرے اس لئے بادشاہ خان کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور ان سے جو روپیہ بقول حکومت کے اسی ہزار روپے برآمد ہوا ہے وہ ضبط کر لیا گیا ہے اور بادشاہ خان کو پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا گیا ہے ان کی گرفتاری کے خلاف خدائی خدمت گاروں کا ایک جلسہ بھابڑا میں ہونا تھا کہ حکومت نے سارے صوبہ سرحد میں دفعہ 144 نافذ کر دی اور ہر قسم کے جلسے اور جلوسوں پر پابندی لگا دی گئی - چارسدہ کے قریب بھابڑا میں خدائی خدمت گاروں نے ایک مسجد میں جمع ہونا تھا - چھوٹے چھوٹے جلوس ہر طرف سے آ رہے تھے بڑا جلوس چارسدہ سے سالار امین جان کی زیر قیادت جا رہا تھا کہ پولیس نے گولی چلا

دی جس سے ایک سو سے زائد لوگ شہید ہوئے اور سینکڑوں زخمی ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ تک گولی چلتی رہی علاقہ کے رواج کے مطابق اگر کوئی دو فریق کی جنگ ہو جائے اور گولی چل جائے تو درمیان میں عورتیں آ جاتیں تو گولی چلنی بند ہو جاتی ہے مگر اس سرکاری فائرنگ میں عورتیں سروں پر قرآن رکھ کر میدان میں آ گئیں مگر پولیس نے عورتوں کو اور قرآن شریف کو بھی نشانہ بنایا جس سے کئی عورتیں بھی زخمی ہوئی تھیں۔ بعد میں جب تحقیقاتی عدالت قائم ہوئی تھی تو اس میں وہ قرآن شریف بھی پیش کئے گئے تھے جن پر گولیوں کے نشان تھے ان جلوسوں پر بلاوجہ ہی گولی چلائی گئی تھی یہ جلوس کسی سرکار کے دفتر عمارت یا حاکم پر حملہ آور نہیں ہونے جا رہے تھے انہوں نے ایک مسجد میں جمع ہو کر بادشاہ خان کی رہائی کی دعا مانگی تھی اور سب سے بڑا ظلم گولی چلنے کے بعد یہ ہوا کہ جو لوگ فائرنگ سے زخمی ہوئے تھے انہیں کسی سرکاری ہسپتال میں داخل نہیں کیا گیا تھا یہ زخمی اگر کوئی صحت یاب ہوا تو اپنے ذاتی علاج سے ہی صحت یاب ہوا ورنہ کئی زخمی بغیر علاج کے ہی موت کے منہ میں چلے گئے ہزاروں خدائی خدمت گاروں کو صوبے بھر سے گرفتار کر لیا گیا بے عزت کیا جاتا تھا ذمہ دار سرخ پوش لیڈروں کو لوگوں میں ذلیل کیا جاتا تھا کہ یہ ہندو کے ایجنٹ ہیں یہ کافر ہیں ڈاکٹر خان صاحب سابق وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد کو ہری پور کے ایک گاؤں میں نظر بند کر دیا گیا سرحد میں سرخ پوش تحریک کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ ڈاکٹر خان یحیٰ خان قاضی عطاء اللہ خان اور دیگر سرخ پوش لیڈروں کو اور دیگر ہزاروں ورکروں کو جیلوں میں اذیت ناک سزائیں دی گئیں قید تنہائی میں رکھا گیا غیر صحت مند غذائیں دی گئیں بہت سارے خدائی خدمت گار لیڈر ورکر جیلوں میں ہی موت کے منہ میں چلے گئے جن میں قاضی عطاء اللہ خان صوبہ سرحد کے سابق وزیر تعلیم بھی شامل تھے جنہوں نے موت سے چند گھنٹے قبل میو ہسپتال میں ملاقات کے لئے آنے والے مشہور قوم پرست لیڈر شورش کاشمیری سے گرتی ہوئی صحت اور دکھتے ہوئے جسم کی اذیت میں کہا تھا

خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے

قاضی عطاء اللہ خان بحالت قید میو ہسپتال لاہور میں وفات پا گئے تھے حکومت سرحد کے اس سارے ظالمانہ کھیل میں پنجاب کے اخبارات حکومت سرحد کے معاون رہے اور یہ اخبارات حکومت سرحد کی ہر ظالمانہ کارروائی کو جائز قرار دیتے تھے صرف پاکستان ٹائمز امروز ہی ایسے اخبارات تھے جو کبھی کبھی حقیقت حال بھی بیان کر دیا کرتے تھے باقی تمام اخبارات حکومت سرحد کی ہر کارروائی کے حامی تھے - بادشاہ خان کو جب 1948ء میں اس الزام میں گرفتار کیا گیا تھا کہ 80000 ہزار روپے فقیر ا ایپی کو دینے جا رہے تھے تا کہ فقیر ا ایپی حکومت پاکستان کے خلاف جنگ کرے یہ الزام جب تحقیقاتی عدالت کے روبرو پیش کیا گیا تو تحقیق کے بعد بادشاہ خان کو باعزت بری کر دیا تو عدالت میں بادشاہ خان نے کہا تھا کہ حکومت سرحد کے کارندے جو یہ کہتے ہیں انہوں نے میرے سے اسی ہزار روپے برآمد کئے تھے وہ ہی مجھے واپس دلوائے جاویں یہ روپے

تو حکومت سرحد خود مانتی ہے اس پر تحقیقاتی عدالت کے جج صاحب ہنس پڑے جو خدائی خدمت گار بھابڑا فائرنگ کے بعد ہزاروں کی تعداد میں گرفتار کئے گئے تھے انہیں پانچ پانچ سال تک قید اور کئی لوگوں کی جائیدادیں بھی ضبط کر لی گئی اور یہ دور تاریخ کا بدترین دور تھا جس میں ضمیر کے قیدیوں پر بے پناہ مظالم کئے گئے جس کی مثال پورے انگریزی دور حکومت میں نہیں ملتی۔

قیوم خان نے کئی لوگوں کو از خود افغانستان بھیج دیا تھا اور ان سے پختونستان کے بارے پراپیگنڈہ کرایا جاتا اور اس کی آڑ میں حکومت سرحد سرخ پوشوں پر مظالم کرتی۔ 1948ء میں جو حکومت سرحد نے بادشاہ خان کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کیا تھا اور 1951ء میں ان پر جو الزام تھے غلط ثابت ہوئے اور انہیں رہا کر دیا گیا تو فوراً ہی انہیں بنگال ریگولیشن کے تحت قید کر لیا گیا ۔ 1952ء میں انہیں پھر رہا کر دیا گیا ان پر صوبہ سرحد میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی اور انہوں نے اپنی رہائش ضلع اٹک کے علاقہ چھچھ کے گاؤں غور غوشتی میں رکھ لی انہیں ایام میں دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا اس میں وہ شامل ہوئے انہوں نے بڑی دلدوز تقریر کی ۔ انہوں نے ممبران اسمبلی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس ایوان کا ممبر ہوں آپ کا ساتھی ہوں ہمارے ساتھ جو گزشتہ پانچ سال میں ہوا آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے میں آپ کا ساتھی تھا۔ پتہ ہی کیا ہوتا کہ ہم پر کیا گزری ہم پر ظلم کے وہ پہاڑ گرائے گئے جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں انہوں نے اپنی داستان غم بڑی جرات سے بیان کی مگر پتھر کے ان جسموں پر شاید ہی اثر ہوا ہو۔

صوبہ سرحد میں الیکشن کرائے گئے جن میں خدائی خدمت گاروں کو تو الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت ہی نہ تھی مگر عوامی لیگ کے ٹکٹ پر بھی جو لوگ کھڑے ہوئے تھے انہیں بھی دھاندلی کے ساتھ ہرا دیا گیا۔ اور انہیں ایام میں گوجرانوالہ میں عوامی لیگ کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں ارباب عبدالغفور اور ثمین جان خان بھی تشریف لائے تھے انہوں نے قیوم وزارت کے ظلم و ستم کی داستان بیان کی جسے سن کر جلسہ گاہ کے لوگ آبدیدہ ہو گئے قیوم خان کی وزارت کا دور صوبہ سرحد کا بدترین دور تھا جس کی مثال پاکستان کے کسی دوسرے صوبہ سے دی ہی نہیں جا سکتی۔

1954ء میں جس وقت بادشاہ خان ضلع اٹک کے مقام غور غوشتی میں مقیم تھے اس زمانے میں گوجرانوالہ کا ایک عالم دین مولانا عبدالقیوم ہزاروی ان کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ اپنا روحانی تعلق ظاہر کیا اور گوجرانوالہ تشریف لانے کی دعوت دی جسے بادشاہ خان نے قبول کر لیا اور وہ گوجرانوالہ تشریف لائے وہ ایک ہفتہ گوجرانوالہ میں رہے ۔ راقم الحروف کو بھی ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا ہے ان سے کئی لوگوں نے ملاقاتیں کیں سیاسی حالات پر تبادلہ خیالات کیا ایک جلسہ میں ان کے اعزاز میں جامع مسجد کے خطیب مفتی عبدالواحد صاحب نے شیرانوالہ باغ میں کرایا تھا ۔ اس جلسہ میں انہوں نے فرمایا تھا کہ ایک اکیلا شخص کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جماعت ہی کوئی اچھا رول ادا کر سکتی ہے جس سے لوگوں میں خوشحالی آئے

اور مثبت نتائج برآمد ہوں ایک ہفتہ بعد وہ واپس غور غوشتی چلے گئے اور لوگوں نے ان کی خیالات کا بہت پسند کیا تھا۔

1954ء میں محمد علی بوگرا کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں صوبہ سرحد میں قیوم وزارت ختم کر دی گئی ان کی سفارش پر ہی صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ سردار رشید صاحب بنائے گئے جو کہ اس وقت صوبہ سرحد کے انسپکٹر جنرل پولیس تھے وہ پولیس کی نوکری چھوڑ کر صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بن گئے ان کی وزارت میں خدائی خدمت گاروں پر مظالم میں کچھ کمی ہوئی قیام پاکستان کے وقت میں قیدی خدائی خدمت گاروں کو رہائی ملی - بادشاہ خان کو بھی صوبہ سرحد جانے کی اجازت مل گئی جس روز بادشاہ خان صوبہ سرحد میں داخل ہوئے تو خدائی خدمت گاروں نے اٹک پل سے لے کر پشاور تک 49 میل لمبا بادشاہ خان کا جلوس نکالا گیا جگہ جگہ محرابیں بنائی گئیں جلسے کئے گئے اور اسی دوران یہ اعلان بھی مرکزی حکومت نے کیا کہ مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ملا کر ون یونٹ بنایا جائے گا جس کے پہلے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب ہوں گے اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر خان صاحب کو محمد علی بوگرا کی مرکزی وزارت میں وزیر ریلوے بنا دیا گیا۔

مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ملا کر ون یونٹ بنائے جانے کی تجویز بادشاہ خان اور خدائی خدمت گاروں نے مخالفت کی ان کا کہنا تھا کہ لوگوں کی مرضی کے خلاف صوبوں کو ختم کر کے ایک صوبہ مغربی پاکستان بنانا ملک و قوم کے لئے بہت بڑا نقصان ہے بادشاہ خان کو 1956ء کے دستور نافذ ہونے کے بعد اور ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت میں پاکستان کے دستور 1956ء اور ون یونٹ کی مخالفت کرنے پر گرفتار کر لیا گیا بغاوت کا مقدمہ بھی بنایا گیا۔ قید سخت کی سزا کے ساتھ چودہ ہزار روپے جرمانہ بھی کیا گیا اس قید سے بادشاہ خان 1957ء کو رہا ہوئے۔ تشکیل ون یونٹ کے بارے میں مغربی پاکستان کے تمام صوبے مخالف تھے پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک فیروز خان نون تھے انہیں کہا گیا کہ وہ پنجاب اسمبلی میں ون یونٹ بن جانے کے حق میں قرار داد منظور کرائیں مگر انہوں نے انکار کر دیا تو مرکز نے ملک فیروز خان نون کو اقتدار سے ہٹا کر عبدالحمید دستی صاحب کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی دستی وزارت نے پنجاب اسمبلی سے ون یونٹ کے حق میں قرار داد منظور کرائی - سندھ میں پیرزادہ عبدالستار کی حکومت تھی انہیں ون یونٹ کی قرار داد اسمبلی میں منظور کرانے کو کہا گیا انہوں نے انکار کر دیا تو ان کی وزارت ختم کر دی گئی ایوب کھوڑو نے ون یونٹ کے حق میں سندھ اسمبلی سے قرار داد منظور کرائی اس طرح سرحد میں سردار رشید کی حکومت کو ختم کر کے سردار بہادر خان کی حکومت قائم کی گئی اور انہوں نے سرحد اسمبلی سے ون یونٹ کے حق میں قرار داد منظور کرائی بلوچستان کو اس وقت ابھی آئینی اختیارات نہ تھے وہاں کوئی وزارت ہی نہ تھی بلوچستان برائے راست صدر اور مرکزی حکوم کے تحت تھا اس لئے بلوچستان کی رائے کو خود مرکزی حکومت نے ہی اپنی طرف ڈال لیا ون یونٹ مغربی پاکستان کے لوگوں کی مرضی کے خلاف ہی مسلط کیا گیا تھا جو بعد میں مغربی پاکستان اسمبلی نے ہی

ون یونٹ توڑنے کی قرار داد منظور کر دی اور یحییٰ خان کی حکومت میں ایک حکم کے تحت ون یونٹ ختم کر دیا گیا۔

بابو عبدالکریم شورش

رفیق احمد باجوہ ایڈووکیٹ

ارجن داس بگٹی

ریپبلکن پارٹی

1956ء کے آئین میں مغربی پاکستان کا ون یونٹ بنا دیا گیا تھا تمام چھوٹے صوبے ختم کر دیئے گئے تھے۔ 1955ء میں ہی ون یونٹ بنائے جانے کا اعلان کر دیا گیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا گیا تھا کہ ون یونٹ مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب ہوں گے اور گورنر جناب مشتاق احمد گورمانی ہوں گے صوبہ سرحد کے ایک سرخ پوش ورکر جناب غازی خان آف پبی بتاتے ہیں کہ 1955ء کے ایک دن شاہی باغ میں جہاں عبدالغفار خان صاحب کی رہائش تھی ڈاکٹر خان صاحب بھی انہیں کے پاس تھے اپنے گھروں میں گپ شپ کر رہے تھے تو انہیں کے کھیتوں میں ایک ہیلی کاپٹر اترا اس میں سے جناب سکندر مرزا نمودار ہوئے۔ سکندر مرزا ڈاکٹر خان صاحب کے اس وقت کے دوست تھے جب ڈاکٹر خان صاحب صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے اور سکندر مرزا پشاور کے ڈی مجسٹریٹ تھے چند منٹ ان لیڈران کی غیر رسمی باتیں ہوئیں چائے وغیرہ پی گئی پھر حسب پروگرام ڈاکٹر خان صاحب سکندر مرزا کے ساتھ جانے لگے تو بادشاہ خان نے روکا کہا کہ ان کے ساتھ اس طرح مت جاؤ یہ تمہیں دھوکہ دیں گے مگر ڈاکٹر خان صاحب سکندر مرزا کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر چلے گئے دوسرے دن خبر آئی کہ ڈاکٹر خان صاحب مرکز میں ریلوے وزیر بن گئے ہیں اس دن سے بادشاہ خان اور ڈاکٹر خان صاحب کی سیاسی راہیں الگ ہو گئیں۔ ڈاکٹر خان صاحب محمد علی بوگرا کی وزارت میں ریلوی کے وزیر رہے قیام پاکستان سے قبل ڈاکٹر خان صاحب کا لوگوں میں امیج اچھا تھا لوگ احترام کرتے تھے مسلم لیگی لیڈر لوگوں میں لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے کافی بدنام ہو چکے تھے وہ ڈاکٹر خان صاحب کو اپنے ساتھ اقتدار میں اس لئے بھی لائے تھے کہ ڈاکٹر خان صاحب بھی اکیلے کچھ کر تو نہیں سکیں گے یقیناً وہ بھی بدنام ہو جاویں گے جب تک دستور 1956ء کا مکمل نہ ہوا اس وقت تک ڈاکٹر خان صاحب مرکز میں وزیر رہے چودھری محمد علی کی وزارت میں وہ مرکز میں وزیر نہ تھے۔ 1956ء کے دستور کے ساتھ جو تبدیلی مغربی پاکستان میں آئی وہ یہ تھی کہ پہلے مغربی پاکستان 9 یونٹوں میں تقسیم تھا جن میں پنجاب سرحد سندھ بلوچستان و بہاولپور خیر پور اور دیگر فاٹا کے یونٹ تھے جو مرکز کے تحت تھے مندرجہ بالا یونٹوں کی اسمبلیاں بھی تھیں مگر ان کے ممبران کی تعداد زیادہ تھی جب کہ آئین کی مطابق مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبران کی تعداد 310 ہونا تھی طریقہ ایسا بنایا گیا کہ جس سے انہی منتخب ممبران میں سے 310 ممبر مغربی پاکستان کی اسمبلی کے لئے چنے گئے جن میں ڈاکٹر خان صاحب بھی ممبر بن گئے کئی جو سابقہ اسمبلیوں کے ممبران تھے وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبر نہ بن سکے مغربی پاکستان اسمبلی کی اکثریت ممبران کا تعلق مسلم لیگ سے تھا ڈاکٹر خان صاحب مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر تھے مگر خود مسلم لیگی نہ تھے تقریباً ڈیڑھ ماہ تو ڈاکٹر خان وزارت کا کام چلتا رہا مگر تھوڑے عرصہ بعد مسلم لیگ اسمبلی پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی جو لوگ ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ وزیر بن

گئے یا وہ جنہیں ڈاکٹر خان صاحب کے وزیر اعلیٰ رہتے ہوئے فوائد حاصل تھے وہ لوگ تو ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ رہے دوسرے ممبران اسمبلی نے ڈاکٹر صاحب کے خلاف محاذ قائم کر لیا کہ یا تو ڈاکٹر خان مسلم لیگ میں شامل ہو جاویں یا مسلم لیگ اسمبلی پارٹی سے الگ ہو جاویں حالانکہ ڈاکٹر صاحب کو اقتدار میں لانے والے بھی یہی مسلم لیگی لیڈران ہی تھے۔ پھر مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں ڈاکٹر خان سے کہا گیا کہ وہ قائد اعظم زندہ باد کہیں انہوں نے کہہ دیا مگر پھر بھی مسلم لیگ والے بضد تھے کہ وہ مسلم لیگ میں جب تک شامل نہیں ہوں گے ہم ان کے ساتھ نہیں چل سکیں گے۔ ڈاکٹر خان صاحب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشورہ کرکے اپریل 1956ء کے آخر میں ریپبلکن پارٹی کی بنیاد رکھی اس زمانے میں امریکہ میں بھی صدر ایزن ہاور کی زیر قیادت ریپبلکن پارٹی کی ہی حکومت تھی اور پاکستان کے ساتھ امریکہ کی تعلقات بھی بہت اچھے اور خوش گوار تھی اور پاکستان امریکہ کے ساتھ کئی معاہدوں میں شامل بھی ہو چکا تھا اس لئے یہ نام امریکہ کے ساتھ تعلقات کی ایک خوش گوار دلیل بن گیا ریپبلکن پارٹی کے ساتھ جو لوگ وابستہ ہوئے وہ اقتدار کے رازوں کو سمجھنے والے لوگ تھے ریپبلکن پارٹی کا مزاج سکولر تھا وہ سیاست میں مذہب کو استعمال نہیں کرتے تھے سر فروز خان نون جو بعد میں پاکستان کے وزیر اعظم بھی بنے نواب سر مظفر علی خان قزلباش کرنل سید عابد حسین خیر پور کے ممتاز احمد خان بہاولپور کے حسن محمود صوبہ سرحد کے سردار رشید جو بعد میں مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ بنے اور دیگر بہت سارے بڑے لوگ ریپبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے یہ بھی ایک واحد مثال ہے کہ سیاسی پارٹی بعد میں بنی مگر حکومت پہلے مل گئی اقتدار سے محروم مسلم لیگ گروہ حزب اختلاف میں چلا گیا مغربی پاکستان میں ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ تھے مرکز میں ریپبلکن پارٹی اور عوامی لیگ کولیشن حکومت بنی جس کے وزیر اعظم جناب حسین شہید شہروردی بنائے گئے پھر 1957ء میں ریپبلکن پارٹی اور کرشک سرامک پارٹی نے کولیشن حکومت بنائی س کے سربراہ سر فیروز خان نون بنے جناب نون مارشل لاء 1958ء تک پاکستان کے وزیر اعظم رہے۔ صوبہ مغربی پاکستان میں 1956ء سے ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت رہی بعد میں وہ حکومت سے الگ ہو گئے ان کی جگہ سردار رشید سابق وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ بنے یہ بھی ریپبلکن پارٹی کے ہی وزیر اعلیٰ تھے سردار رشید کے بعد سر مظفر علی قزلباش مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ بنے یہ بھی ریپبلکن پارٹی کے ہی وزیر اعلیٰ تھے۔ اکتوبر 1958ء کے مارشل لاء کے وقت تک مغربی پاکستان کی صوبائی حکومت پر ریپبلکن پارٹی کی حکومت رہی۔ بانی ریپبلکن پارٹی ڈاکٹر خان صاحب کو انکی رہائش گاہ پر لاہور میں ہی ایک شخص نے چاقو مار کر قتل کر دیا چاقو کے ایک وار سے ڈاکٹر خان صاحب جاں بحق ہو گئے ملزم موقع پر ہی گرفتار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر خان صاحب اپنے بھائی بادشاہ خان کے ساتھ تحریک آزادی کی جدوجہد میں شامل رہے۔ 1942ء کی ہندوستانی چھوڑ دو کی تحریک کے علاوہ کئی تحریکوں میں جیل بھی گئے انہوں نے 1937ء میں سر صاحبزادہ عبدالقیوم کی وزارت کے خلاف عدم اعتماد کر

کے انہیں شکست دے کر وزارت صوبہ سرحد پر قبضہ کیا تھا وہ قیام پاکستان سے قبل اپنے بھائی خان عبدالغفار خان کی جماعت خدائی خدمت گار تحریک میں شامل رہے قید بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور قیام پاکستان کے وقت تک وہ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ رہے وہ مخلص دیانتدار بہادر لیڈ تھے۔ ر-پبلکن پارٹی کی عوام میں جڑیں نہ تھی کوئی ممبر شپ نہ تھی۔ مگر 7 اکتوبر تک جب تک جنرل ایوب خان کا مارشل لاء نہیں لگ گیا اس وقت تک مرکزی حکومت پر پاکستان کے وزیر اعظم سرفیروز خان نون ہی تھے اور صلح کن وزیر اعظم تھے انہوں نے پاکستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے جذباتیت کا نعرہ کبھی بھی بلند نہیں کیا تھا۔ ان کی وزارت عظمیٰ کے دوران اخبار نویسوں نے ان سے حصول کشمیر کے لئے ہندوستان کے خلاف جنگ کرنے کے بارے سوال کیا تو ملک سر فیروز خان نون نے جواب دیا تھا کہ میں ہندوستان کے خلاف جنگ کرنے کا حامی نہیں ہوں اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے خلاف حصول مقصد کے لئے جنگ بہت ضروری ہے تو پھر پاکستان کا وزیر اعظم کسی اور کو بنا لیں میں پاکستان کے لئے جنگ کو فائدہ مند نہیں سمجھتا۔ جب اکتوبر 1958ء کو جنرل ایوب خان نے مارشل لاء لگا دیا تو اس وقت صوبہ مغربی پاکستان پر ر-پبلکن پارٹی کی حکومت تھی اور وزیر اعلیٰ نواب سر مظفر علی خان قزلباش تھے۔ ر-پبلکن پارٹی کے ساتھ شخصیات تھیں جن کے زیر اثر عوام تھے مگر عوام ہجوم عاشقاں کی طرح نہ تھے اور ر-پبلکن پارٹی کا عوام میں کوئی اچھا تاثر نہ تھا اس وجہ سے ایوب خان کے مارشل لاء کے بعد ر-پبکن پارٹی کو پھر کسی بھی شخصیت نے بحال نہیں کیا وہ لوگ جو ہمیشہ ہی حکومت کے ساتھ رہتے ہیں وہ ر-پبلکن پارٹی سے ہٹ کر صدر ایوب کی حمایت میں کونشل مسلم لیگ میں چلے گئے۔ اور ر-پبکن پارٹی ہمیشہ کے لئے ختم ہی ہو گئی۔ اور ڈاکٹر خان صاحب جو اس جماعت کے بانی تھے وہ 1958ء میں اپنے گھر میں ہی تشریف فرما تھے کہ ایک شخص جو کہ محکمہ مال کا ملازم رہ چکا تھا اس کے ہاتھوں قتل ہو گئے ان کا سوگ مغربی پاکستان میں کئی روز تک منایا گیا ان کی تقریب میں جگہ جگہ جلسے کئے گئے تعزیتی قراردادیں منظور کیں گئیں۔ ان سوگوار جلسوں میں قوم پرست لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

جمعیت علماء اسلام

جمعیت علماء اسلام متحدہ ہندوستان کی جمعیت علمائے ہند کا ہی تسلسل تھا۔ مگر درمیان میں یہ نام حضرت عثمانی کی جمعیت کے لئے ہونے لگ گیا تھا جیسا کہ ہم نے کتاب کے حصہ اول میں ذکر کیا ہے کہ علمائے دیو بند میں حضرت تھانوی اور حضرت عثمانی کے ماننے والے جمعیت علمائے ہند کی کانگرس نواز پالیسی کے خلاف تھے۔ مسلم لیگ کو ان علماء کی ضرورت 1945ء کے متحدہ ہندوستان کے آخری الیکشن میں پڑ گئی تو ان علماء حضرات ۔نے جمعیت علماء اسلام کے نام سے جماعت قائم کر لی اور مسلم لیگ کی الیکشن 1945ء میں حمائیت کی اور مسلم لیگ کامیاب ہو گئی تو حضرت عثمانی دستور ساز اسمبلی کے ممبر بھی بن گئے پاکستان بن جانے کے بعد حضرت عثمانی پاکستان تشریف لے آئے اور حکومت پاکستان نے انہیں شیخ الاسلام کے خطاب سے بھی نوازا اور دیگر جو جمعیت علمائے اسلام میں حضرت عثمانی کے ساتھی تھے انہیں بھی سرکار میں کافی نوازا گیا اور ساتھ ہی ان کی جمعیت سیاسی طور پر غیر متحرک ہو گئی دوسری طرف جمعیت علمائے ہند کے ماننے والے علماء دین کی پاکستان میں کافی تعداد موجود تھی خصوصی طور پر سرحد اور بلوچستان میں ان کو کافی اہمیت حاصل تھی مگر وہ زیر عتاب آ گئے۔ حکومت نے ان کی سیاسی حیثیت ہی تقریباً ختم کر دی اور انہوں نے سیاسی یتیم کی حیثیت اختیار کر لی۔ ویسے تو تمام جماعتیں مسلم لیگ کے علاوہ پاکستان بن جانے کے بعد سیاسی طور پر یتیم ہو گئیں تھی مگر سب جماعتوں سے زیادہ زیر عتاب خدائی خدمت گار ہوئے انہیں قید و بند کی صعوبتوں کے علاوہ موت کے گھاٹ بھی اتارا گیا بہت سارے خدائی خدمت گاروں کی جائیدادیں بھی ضبط کر لی گئیں اور بھی بہت زیادہ ظلم ان پر ہوا۔ مگر جمعیت والوں کو بھی کافی بدنام کیا جاتا رہا ہے مگر چونکہ جمعیت علماء کے ممبران مذہبی لوگ تھے ان کے پاس مساجد کی امامتیں بھی تھیں مذہبی لوگ اُن کے معتقد بھی تھے اس وجہ سے انہیں صعوبتوں میں کافی بچت رہی اور یہ لوگ کچھ نہ کچھ اپنی سیاست میں متحرک رہے۔

پاکستان بنا تو سرحد اسمبلی میں جمعیت علماء ہند کے دو ممبر تھے اور سرحد اسمبی کے سپکر نواب زادہ اللہ نواز خان بھی جمعیت علمائے ہند کے ٹکٹ پر ہی کامیاب ہوئے تھے۔ 1945ء میں ان کے الیکشن پر جمعیت علمائے ہند کے صدر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی بھی ڈیرہ اسماعیل خان تشریف لائے تھے اور نواب زادہ اللہ نواز خان صاحب کے حق میں جلسوں کو خطاب کیا تھا اور اس زمانے میں حصرت مدنی کا ڈیرہ اسماعیل خان میں بہت بڑا استقبال کیا گیا تھا جب پاکستان بن جانے کے بعد خدائی خدمت گاروں پر عتاب نازل ہوا ان کے دفاتر پر چھاپے مارے گئے تو اس وقت جمعیت کے دفاتروں پر بھی پولیس نے کارروائی کی مگر حکومت کو فائدہ کی بجائے نقصان ہوا۔ پشاور میں جمعیت کے دفتر پر پولیس نے چھاپہ مارا بہت ساری دفتر کی کتابیں قبضہ میں کر لی کچھ کتابیں باہر پھینک دیں ان میں دینی کتابیں بھی تھیں جن کی بے حرمتی دیکھ کر لوگ غمزدہ ہوئے

مشتعل ہوئے حکومت کے خلاف نفرت کا اظہار ہونے لگا۔ حکومت کو اس کارروائی سے نفع کی بجائے نقصان ہوا اور حکومت پھر محتاط ہو گئی جمعیت علماء والوں کو کہا کچھ نہیں جاتا تھا مگر بدنام ضرور کیا جاتا تھا ہندو کا ایجنٹ کہنا تو اس وقت ہر اس شخص کو کہا جاتا تھا جو مسلم لیگ کے ساتھ نہیں تھا۔ مگر چونکہ جمعیت کے اراکین اور لیڈر حضرات ایک سیاسی زندگی سے گزر کر آئے تھے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بالکل بے عمل ہو جانا بہت ہی مشکل تھا۔ جدید حالات میں نئی تنظیم سازی کے لئے مشورے و غور فکر ہونے لگ گیا۔

جمعیت علمائے پاکستان

بہت غور و فکر کے بعد علماء حضرات کے باہمی مشوروں کے بعد گوجرانوالہ میں علماء حضرات کا ایک کنونشن 1950ء میں حضرت مفتی عبدالواحد کی دعوت پر منعقد کیا گیا جس میں پنجاب سرحد اور مغربی پاکستان کے دیگر علاقوں کے علمائے حضرات شریک ہوئے جن میں حضرت مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری حضرت مفتی ضیا الحسن صاحب' حضرت مولانا عبدالحنان صاحب ہزاروی' حضرت مولانا گل بادشاہ صاحب' حضرت مولانا صاحبزادہ عبدالباری صاحب مولانا محمد اسماعیل صاحب گوجرانوالہ اور دیگر ملک کے مختلف حصوں سے علماء حضرات اس کنونشن میں شریک ہوئے دو روز تک مختلف اجلاسوں میں مختلف حالات پر غور و فکر کیا گیا بالآخر حالات کے جدید تقاضوں کے تحت جماعت کو منظم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جماعت کا نام جمعیت علمائے پاکستان رکھا گیا۔ دائرہ کار مغربی پاکستان تک محدود رکھا مگر مشرقی پاکستان میں بھی تنظیم قائم کرنے کی ضرورت کو مدنظر رکھا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ جیسے ہی مشرقی پاکستان کے علماء حضرات سے رابطہ ہو گا اس وقت ہی مشرقی پاکستان میں بھی جمعیت علمائے پاکستان کو منظم کیا جائے گا۔ اس کنونشن میں جمعیت علمائے اسلام کی صدارت کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی صاحب کو اور سیکرٹری جنرل کے لئے حضرت مولانا عبدالحنان ہزاروی کو نامزد کیا گیا اور انہیں اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی صوابدید کے تحت دیگر عہدہ دار نامزد کریں۔ تنظیم جمعیت علمائے پاکستان کی قائم ہو گئی مگر جماعت متحرک نہ ہو سکی اس کی وجہ سب سے بڑی یہ تھی کہ مسلم لیگ کا عوام پر بہت ہولڈ تھا اور دیگر جماعتوں کو بڑے منظم طریقوں سے بدنام کیا جاتا تھا جس کا علاج اس وقت تک کسی اور جماعت کے پاس نہ تھا اور حکومتی حربہ اس لئے بھی بہت کارگر تھا کہ ابھی پاکستان نیا بنا تھا لوگ ابھی فرقہ واریت کے زخم بھولے نہ تھے۔ ہندوستان سے آئے ہوئے لوگ خصوصی طور پر حکومتی حربے سے بہت جلد متاثر ہوتے تھے دیگر جمعیت علمائے پاکستان کی غیر متحرک ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بنی کہ 1950ء میں ہی قادیانیت کے خلاف تحریک منظم ہونا شروع ہو گئی تھی احرار اور جمعیت کے مزاج میں کوئی فرق بھی نہیں تھا خصوصی طور پر پنجاب
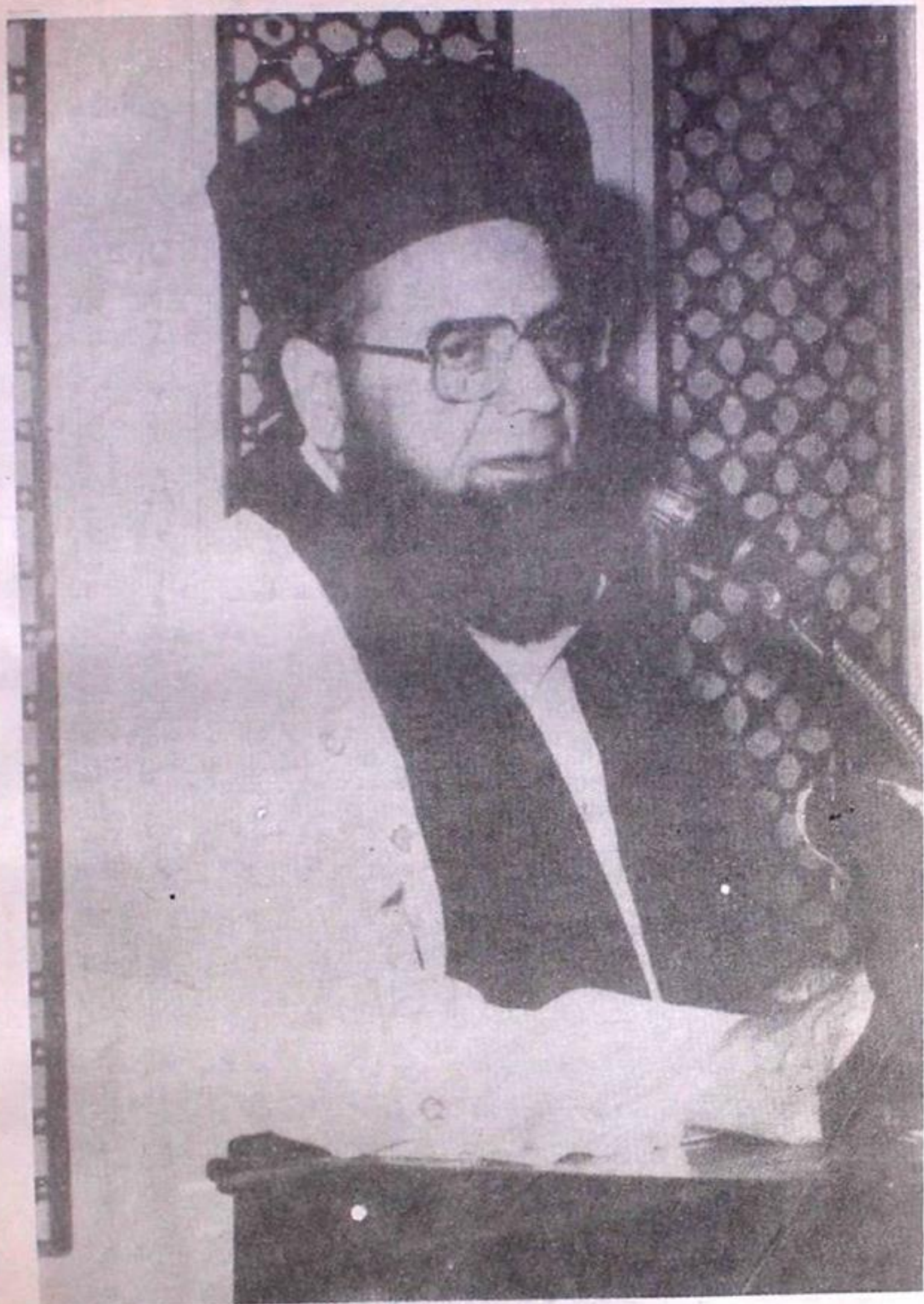
مولانا شاہ احمد نورانی

میں وہی علماء حضرات جمیعت علماء کے ساتھ تھے اور وہی علماء حضرات احرار کے ساتھ بھی تھے اس لئے علماء حضرات کی ساری توجہ قادیانیت کے خلاف تحریک کی طرف مرکوز ہو گئی اور جمعیت عملی طور پر غیر متحرک ہو گئی پنجاب کے علاوہ صوبہ سرحد بلوچستان میں حکومتی دباؤ ہی انہیں کچھ نہیں کرنے دیتا تھا۔ سرحد میں فقیرا ایپی حکومت پاکستان کے خلاف مسلح جنگ کر رہے تھے وہ پاکستان کو بھی انگریز حکومت کا تسلسل ہی سمجھتے تھے فقیرا ایپی کی نسبت بھی حضرت شیخ الہند کے ساتھ بیان کی جاتی تھی یہ وجہ بھی سرحد میں جمعیت کے کام میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی ان بہت ساری وجوہات نے جمعیت علماء پاکستان کو متحرک نہیں ہونے دیا اور بلاآخر جمعیت علمائے پاکستان فوت ہو گئی۔

جمعیت علمائے اسلام کا پہلا کنونشن

مندرجہ بالا وجوہات کی بناء پر اکابرین جمعیت نے نئے طریقوں پر جماعت کو منظم کرنے کا پروگرام بنایا سابقہ جمعیت علمائے ہند اور جمعیت علماء اسلام میں سوائے اس کے اور کوئی فرق نہیں تھا۔ جمعیت علمائے ہند والے کانگرس کے ہمنوا تھے جبکہ جمعیت علماء اسلام والے مسلم لیگ کے اور مطالبہ پاکستان کے حامی تھے اب جبکہ پاکستان بھی بن چکا تھا کانگرس کے ہمنوا جمعیت علمائے ہند والے ہندوستان میں رہ گئے ہوئے تھے اب علماء نے فیصلہ کیا کہ جمعیت علمائے اسلام کو ہی منظم کیا جائے اور سابقہ جمعیت علمائے ہند والے جو پاکستان میں ہیں اور جمعیت علمائے اسلام والے جو پاکستان میں ہیں مل جل کر کام کریں اور تمام علماء مل کر جمعیت علمائے اسلام کو ہی منظم کریں اور اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاویں۔

اس مقصد کے لئے 1954ء میں مفتی محمود صاحب جو اس وقت مدرسہ خیر المدارس ملتان میں معلم تھے انہوں نے علماء کا ایک کنونشن بلایا جس میں سارے مغربی پاکستان سے بہت سارے علمائے دین بشمول مندرجہ ذیل حضرات کے جمع ہوئے۔ مفتی محمد نعیم لدھیانوی' مولانا عبدالحنان صاحب ہزاروی' مفتی محمود احمد' حضرت مولانا عبداللہ درخواستی حضرت مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ مفتی عبدالواحد صاحب گوجرانوالہ ' حضرت مولانا غلام غوث حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی اور دیگر بہت سارے علماء حضرات جمع ہوئے جب تنظیم سازی کا مرحلہ آیا تو حضرت مولانا احمد علی لاہوری صاحب کا نام جمعیت علمائے اسلام کی صدارت کے لئے پیش کیا گیا تو حضرت نے فرمایا کہ میں اسلامی طریقہ کی تنظیم کا قائل ہوں اگر جماعت مجھے جمعیت علمائے اسلام کا امیر بناتی ہے تو بن جاؤں گا وگرنہ صدارتی طریقہ تنظیم کا میں قائل نہیں ہوں ان کے اس فرمان پر انہیں جمعیت علمائے اسلام پاکستان کا امیر بنا دیا گیا اور مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کو سیکرٹری جنرل بنا دیا گیا۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی اس

وقت احرار میں تھے انہیں مجبور کر کے جمعیت میں شامل کیا گیا اور جمعیت علمائے اسلام مغربی پاکستان کا امیر مقرر کیا گیا۔ ان ایام میں پاکستان کا دستور بن رہا تھا۔ اس کے لئے مختلف تجاویز پیش کی جا رہی تھیں۔ جمعیت نے بھی ایک دستوری کمیٹی بنائی جس کے ممبران میں جناب شمس الحق افغانی مفتی محمود صاحب، شیخ حسام الدین صاحب علامہ خالد محمود صاحب تھے اس دستوری کمیٹی نے کئی اجلاس کئے اور دستوری سفارشات مرتب کیں اور ملک بھر میں دستوری سفارشات کے حق میں جلسے کئے گوجرانوالہ میں بھی انہی ایام میں جمعیت کا ایک جلسہ دستوری سفارشات کے حق میں ہوا تھا اور اس جلسہ میں حضرت لاہوری بھی تشریف لائے تھے جمعیت کی دستوری سفارشات کی تائید اجتماعات جمعہ میں بھی کرائی گئیں تمام ملک میں ان دستوری سفارشات کی تائید میں رائے عامہ کو بیدار کیا گیا مگر مسلم لیگ حکومت نے ان دستوری سفارشات کو قابل توجہ ہی نہیں سمجھا اور 1956ء کا دستور نافذ کر دیا گیا۔ یہ دور بڑا ہی ہنگامہ خیز تھا۔ 1954ء سے قبل تو کوئی جماعت بھی مسلم لیگ کے آگے دم نہیں مار سکتی تھی مگر جب مشرقی پاکستان میں جگتو فرنٹ کے ہاتھوں مسلم لیگ کو عبرتناک شکست ہو گئی تو مغربی پاکستان میں بھی مسلم لیگ اپنے اندر سے ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگ گئی اور دوسری پارٹیوں کو بھی کچھ ہمت ملی اور سیاست کا جمود بھی ٹوٹنے لگ گیا۔

1856ء کا دستور نافذ ہونے کے بعد مغربی پاکستان کا ون یونٹ بھی بن گیا تھا چھوٹے صوبوں میں ون یونٹ کے خلاف ہیجان بھی پیدا ہوا سندھ سرحد بلوچستان میں ون یونٹ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ مگر جمعیت علماء اسلام والے اپنی سیاست کے ساتھ اپنی ڈگر پر ہی چل رہے تھے اور آنے والے الیکشن جو 1957ء میں متوقع تھے اس کی تیاری میں مصروف ہو گئے بعد میں حکومت نے الیکشن کی تاریخ کو مزید آگے بڑھا دیا اور ایسا محسوس ہونے لگ گیا تھا کہ شاید الیکشن ہی نہ ہوں اور پھر اکتوبر 1958ء میں ملک مارشل لاء کی نظر ہو گیا اور مستقل طور پر ہی ملک پر جنرل ایوب کی حکمرانی بن گئی اور تمام سیاسی جماعتیں خلاف قانون قرار دی گئیں۔ 1956ء کے دستور کو منسوخ کر دیا گیا اور صرف ایک شخص کی حکمرانی پاکستان پر قائم کر دی گئی کئی سیاسی لوگوں کو گرفتار بھی کیا گیا۔ اور بہت سارے سیاسی لوگوں کو ا۔بڈو کے تحت سیاست سے نااہل قرار دیا گیا اور ملک میں سے پبلک سیاست تقریباً ختم کر دی گئی جمعیت علماء اسلام نے نظام العلمائے کے نام سے سیاست کا کام تبلیغی طریقہ پر جاری رکھا۔ 1961ء میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری انتقال فرما گئے انکی جگہ تنظیم نو کی گئی۔

جمعیت علمائے اسلام کا دوسرا دور

حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے بعد جمعیت کے نئے امیر مولانا عبداللہ صاحب درخواستی

بنے اور جنرل سیکرٹری مفتی محمود احمد صاحب تھے۔ 1962ء کے دستور تک یہ جماعت نظام العلمائے کے نام سے لوگوں میں کام کرتی رہی جب ایوب حکومت نے پاکستان کو نیا دستور دیا اور سیاسی جماعتوں پر سے پابندی ختم کی گئی تو پھر جمعیت علمائے اسلام اپنے اصل نام سے لوگوں میں کام کرنے لگ گئی۔ ایوب حکومت نے ملک سے پرانا پارلیمانی نظام حکومت جو تقریباً نصف صدی سے رائج تھا ختم کر دیا اور نیا بنیادی جمہوریتوں کا نظام نافذ کر دیا گیا اس نئے نظام کے تحت لوگوں سے اسمبلیوں کے چناؤ کا حق چھین لیا گیا طریقہ یہ نافذ کیا گیا کہ ملک کو اسی ہزار حلقوں میں تقسیم کیا گیا جس میں ایک حلقہ تقریباً ایک ہزار نفوس پر مشتمل ہوتا تھا اس ایک حلقہ سے ایک شخص منتخب ہوتا تھا وہ ہی پنچایت کا یا یونین کمیٹیوں یا یونین کونسلوں کا ممبر ہوتا تھا۔ انہی ممبروں کے ووٹوں سے صدر مملکت چنا جاتا تھا صوبائی اور مرکزی اسمبلی کے ممبر بھی منتخب کئے جاتے تھے ایوب حکومت کو اس نظام میں خوبی یہ نظر آئی کہ وہ پولیس کے ذریعے اور دیگر ذرائع سے تھوڑے ووٹوں پر دباؤ ڈال کر اپنی مرضی کے لوگوں کو اسمبلی میں بھی منتخب کرا سکتے تھے۔ اور خود صدارت کے لئے بھی ووٹ بڑی آسانی سے حاصل کر سکتے تھے چنانچہ جب 1960ء میں بنیادی جمہوریتوں کے پہلی بار ممبر منتخب ہوئے تو جنرل ایوب نے ریفرنڈم کے ذریعے انہیں بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا تھا اور دنیا کو دکھا دیا تھا کہ وہ بھی جمہوریت کے ذریعے ہی منتخب صدر ہے کوئی آمر نہیں یہ جمہوری نظام بھی ایوب حکومت کی مجبوری تھی کہ اقوام یورپ غیر جمہوری حکومتیں پسند نہیں کرتے اور پاکستان کی اس فوجی حکومت کو جمہوری حکومت ترقی یافتہ ملکوں سے ہی قرضہ ملتا ہے اور انہیں کسی حد تک جمہوریت کے معاملہ میں مطمئن کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اور اس جمہوری نظام کے تحت صدر ایوب نے بنیادی جمہوریت کے ممبران سے اعتماد کا ووٹ بھی حاصل کر لیا اور اسمبلی کے ممبران بھی اپنی مرضی کے بنا لئے مگر ترقی یافتہ ممالک کو دکھانے کے لئے چند اپوزیشن ممبران کو بھی اسمبلیوں کا ممبر بن جانے دیا گیا جن میں مرکزی اسمبلی کے لئے جمعیت علمائے اسلام کے مفتی محمود صاحب ڈیرہ اسماعیل خان کی نشست سے منتخب ہو گئے اور ضلع ہزارہ کی ایک نشست پر مغربی پاکستان اسمبلی کے لئے حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی بھی منتخب ہو کر آ گئے اور ساتھ ہی مشرقی پاکستان سے مرکزی اسمبلی کے لئے پیر محسن الدین صاحب بھی آزاد ممبر کی حیثیت سے منتخب ہو گئے وہ بعد میں جمعیت علمائے اسلام میں شامل ہو گئے ان تین ممبران کی وجہ سے جمعیت علماء اسلام کی اہمیت بڑھ گئی اور جمعیت کا شمار بھی جاندار سیاسی پارٹیوں میں ہونے لگ گیا مفتی محمود صاحب کے بیانات اخبارات کی زینت بننا شروع ہو گئے۔ مارشل لاء کے وقت کے کئی قیدی اس وقت ابھی جیلوں میں تھے خصوصاً نیشنل عوامی پارٹی صوبہ سرحد کے کئی لوگ ابھی تک جیلوں میں تھے ان کے متعلق بھی مرکزی اسمبلی میں مفتی صاحب نے ان کی رہائی کے بارے حکومت کی توجہ دلائی اور مفتی صاحب ایک ہمہ گیر اپوزیشن لیڈر کی حیثیت اختیار کر گئے۔ حکومت نے اس وقت مسلم

خاندانی قوانین بنائے تھے جو کہ مسلم خاندانی اسلامی قوانین کے منافی تھے اس کے متعلق جمعیت علمائے اسلام نے بڑی جدوجہد سے حکومت کے بنائے ہوئے مسلم خاندانی قوانین کی مخالفت کی اور سارے ملک میں اسلامی مسلم خاندانی قوانین کی حمایت میں رائے عامہ کو منظم بھی کیا اور ساتھ ہی مغربی پاکستان اسمبلی میں حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب نے پوری تیاری کے ساتھ اسلامی مدعا بیان کیا جس سے حکومت کے ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی اور پورے ملک میں جمعیت علمائے اسلام کا وقار بہت بلند ہوا ان ایام میں مفتی محمود پیر محسن الدین اور مولانا غلام غوث ہزاروی صاحبان کی اسمبلیوں میں جدوجہد اور دیگر بہت سارے علمائے حضرات بشمول حضرت شمس الحق افغانی سید محمد یوسف بنوری حضرت درخواستی مفتی عبدالواحد گوجرانوالہ حضرت صوفی عبدالحمید صاحب گوجرانوالہ سید امین گیلانی اور دیگر ہزاروں علمائے کرام نے جمعیت علمائے اسلام کے منشور کے بارے تجاویز مرتب کیں اور ملک میں ان تجاویز کے حق میں جلسے کئے جلوس نکالے۔ حکومت تک آواز پہنچائی مگر حکومت نے جمعیت کی کسی بھی تجاویز کو قابل توجہ نہیں سمجھا اور جمعیت علمائے اسلام مسلم خاندانی قوانین جو حکومت کے تجویز کردہ تھے ان کی مخالفت کرتے رہے اور اپنے منشور کو عملی صورت میں کامیاب ہونے کی جدوجہد کرتے رہے۔ 1965ء میں ایوبی دستور کی بنیادی جمہورتیوں کے الیکشن ہونا قرار پائے حزب اختلاف کی جماعتوں کے گروپ سی او پی کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز نے بھی ایوب کے خلاف الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا ایوب کے مقابلے میں سی او پی نے مس فاطمہ جناح کو صدارت کے لئے نامزد کر دیا۔ دستور کے تحت صدارتی الیکشن میں برسراقتدار صدر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا مقتدر صدر صدارت چھوڑ کر ہی آئندہ صدارت کے الیکشن میں حصہ لے سکتا تھا اس صورت میں صدر ایوب کو اپنی کامیابی مشکوک نظر آتی تھی اس لئے 1962ء کی دستور میں ترمیم کی ضرورت پیش آ گئی حکومتی پارٹی کے ویسے تو مرکزی اسمبلی میں اکثریت تھی مگر دستوری ترامیم کے لئے دو تہائی اکثریت کی ضرورت تھی جس میں حکومت کو دو ووٹ کی ضرورت تھی حکومت کو حزب اختلاف کی جماعتوں سے دو ووٹ مل جاویں تو مرکزی اسمبلی میں دستوری ترمیم پاس ہو سکتی تھی۔ حکومتی پارٹی کونشن مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے پارلیمنٹ میں دستوری ترمیم بل پیش کر دیا اور ووٹوں کے ذریعے دستوری ترمیم پاس ہو گئی اور حکومتی پارٹی کو جن دو ووٹوں کی ضرورت تھی وہ دو ووٹ انہیں مفتی محمود صاحب اور پی ڈی پی کے افضل چیمہ صاحب نے دیئے تھے۔ مفتی صاحب کے اس ووٹ دینے کو لوگوں نے اچھا نہیں سمجھا تھا اور جمعیت علمائے اسلام کی ساکھ جو بہت ہی اچھی بن چکی تھی اسے دھچکہ لگا مفتی صاحب پر اعتراض ہونے لگ گئے کہ انہوں نے کیا نفع حاصل کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ افضل چیمہ صاحب تو بعد میں سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور وہ ہائی کورٹ کے جج بن گئے مگر مفتی صاحب نے ایوب کی حمایت کرنے کا عذر یہ پیش کیا کہ چونکہ حزب اختلاف کی جماعتوں نے صدارت کے لئے مس فاطمہ جناح کو نامزد کیا تھا اور امکان تھا کہ اگر صدارت چھوڑ کر جنرل ایوب صدارت

کا الیکشن لڑے تو مس فاطمہ جناح پاکستان کی صدر بن جاتی اسلامی نقطہ نگاہ سے عورت کا سربراہ مملکت بن جانا غلط ہے اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ پاکستان کا سربراہ مرد کو ہی رہنا چاہئے یہ ہی اسلامی نقطہ نگاہ سے بہتر تھا اس لئے میں نے دستوری ترامیم میں حکومتی پارٹی کے حق میں ووٹ دیا ہے۔ اور میں نے اس میں کوئی ذاتی فائدہ حاصل نہیں کیا ہے مفتی صاحب کا یہ استدلال ٹھیک تھا یا نہیں مگر مفتی صاحب کا کوئی ذاتی فائدہ ابھی تک کسی کو نظر نہیں آیا اور مفتی صاحب بعد میں بھی حزب اختلاف میں کافی باعزت اور محترم ہی رہے - 1965ء کے انتخابات میں مفتی صاحب اور مولانا غلام غوث صاحب اپنے اپنے حلقہ ہائے انتخاب سے قومی اور صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے مگر ملک کے صدارتی الیکشن میں جمعیت نے کوئی کسی طرف بھی سرگرمی نہیں دکھائی اور بالکل ہی غیر جانب دار رہی نہ فاطمہ جناح کی حمایت کی اور اور نہ ہی جنرل ایوب کی مخالفت کی تھی اور جنرل ایوب صدارتی الیکشن میں بڑی اکثریت سے کامیاب ہو گئے صدر جنرل محمد ایوب کو صدارتی الیکشن میں تقریباً پچاس ہزار ووٹ ملے تھے جبکہ مس فاطمہ جناح کو تقریباً تیس ہزار ووٹ ملے تھے انتخابات کے بعد جلد ہی بھارت کے ساتھ پاکستان کی جنگ ہو گئی جمعیت علمائے اسلام نے بھی جنگ میں حکومت کا ساتھ پاکستان کی ہر جماعت کی طرح دیا۔ اور بالا آخر جنگ کے بادل چھٹ گئے مطلع صاف ہو گیا اور سیاست کا میدان پھر سرگرم ہونا شروع ہو گیا حزب اختلاف کی جماعتوں کا کہنا تھا کہ میدان جنگ میں پاکستان جیت چکا تھا مگر صدر ایوب نے میز پر جنگ کی بازی ہار دی۔ بہرحال 1965ء کی جنگ سے صدر ایوب کی گرفت اقتدار پر ڈھیلی پڑ گئی تھی اور بتدریج ان کی گرفت کمزور ہو رہی تھی جمعیت علمائے اسلام فلی طور پر حزب اختلاف کی جماعتوں ڈیک کے ساتھ ہم آہنگ تھی اور جمہوریت کی اس جنگ میں برابر کی شریک ہو چکی تھی۔

تمام اپوزیشن پارٹیوں کی گروہ بندی ڈیک میں جمعیت علماء شامل ہو چکی تھی۔ صدر ایوب نے اپنے ڈولتے ہوئے صدارتی سنگاسن کو بچانے کے لئے اپوزیشن جماعتوں کے مطالبے پر گول میز کانفرنس بلائی گئی جس میں جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے پیر محسن الدین صاحب اور مفتی محمود صاحب شامل ہوئے تھے جمعیت نے ایوب خان کے خلاف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا بہت سارے کارکن گرفتار بھی ہوئے تھے اور کئی لوگ پولیس تشدد سے زخمی بھی ہوئے تھے حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحب پولیس تشدد سے زخمی ہوئے تھے۔ 1968ء میں ہی لاہور میں جمعیت علمائے اسلام کی پولٹیکل کانفرنس دہلی دروازہ میں زیر صدارت مولانا عبداللہ درخواستی صاحب منعقد ہوئی جس میں لیبر لیڈر بشیر بختیار صاحب نے جمعیت کے ساتھ سیاست میں تعاون کا اعلان کیا تھا اس کانفرنس میں ملک بھر سے ہزاروں علمائے کرام نے شرکت کی تھی جن میں حضرت درخواستی صاحب مفتی محمود صاحب مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب پیر محسن الدین صاحب مفتی عبدالواحد صاحب گوجرانوالہ اور حضرت یوسف بنوری اور سید امین گیلانی بھی شریک

ہوئے تھے۔ اس زمانے میں ایک جمعیت کی کانفرنس ڈیرہ اسماعیل خان میں بھی منعقدہ ہوئی تھی جس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی تھی۔ متحدہ اپوزیشن جماعتوں جن میں جمعیت علمائے اسلام بھی شامل تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو جو اس وقت ایوب خان سے الگ ہو کر اس کے خلاف متحرک ہو چکے تھے امریکہ کا دورہ کر کے واپسی پر انہوں نے اپنی نئی پارٹی پیپلز پارٹی کا بھی اعلان کر دیا تھا جس کے منشور میں اسلامی سوشلزم کو اولیت دی گئی تھی وہ بھی ایوب خان کے خلاف متحدہ اپوزیشن پارٹیز کے علاوہ ہی سرگرم عمل تھے۔

اتنی بہت ساری یلغار کے آگے صدر ایوب ٹھہر نہ سکے بلا آخر وہ پاکستان کی صدارت سے الگ ہو گئے اور انہوں نے اقتدار اس وقت کی چیف آف آرمی سٹاف جنرل یحیٰی خان کے حوالے کر دیا۔ اور جنرل یحیٰی خان نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا مگر سیاسی سرگرمیوں پر پابندی نہیں لگائی اور نہ ہی سیاسی جماعتوں کو پابند کیا گیا اور ساتھ ہی یحیٰی خان نے 1962ء کا دستور بھی منسوخ کر دیا مکمل جمہوریت کی بحالی کا اعلان کر دیا ون مین ون ووٹ کے تحت آئندہ الیکشن کروانے کا اعلان بھی کر دیا پارلیمانی نظام جمہوریت کے تحت آئندہ ہونے والے انتخابات کے لئے سیاسی پارٹیوں نے جدوجہد شروع کر دی ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت لوگوں میں کافی مقبولیت اختیار کر گئی اور ساتھ ہی انہوں نے لوگوں کی تکالیف کو دیکھتے ہوئے اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کیا قبل ازیں سوشلزم کا نام نیشنل عوامی پارٹی بھی لیتی تھی مگر عوام سندھ اور پنجاب میں انکے معاون نہ تھے مگر بھٹو کے اسلامی سوشلزم کو لوگوں نے بہت پسند کیا لوگ جوک در جوک بھٹو کی پیپلز پارٹی میں شامل ہونا شروع ہو گئے۔ اور اسی زمانے میں نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک بہت بڑی کانفرنس کی جس میں لاکھوں لوگوں نے شرکت کی اس سال یوم مئی کے جلوس بھی زیادہ پررونق ہوئے - لاکھوں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ملک کا مستقبل سوشلزم کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے اور اب کوئی طاقت پاکستان میں سوشلزم کو روک نہیں سکتی۔ اس وقت مولانا مودودی برائے علاج بیرون ملک گئے ہوئے تھے واپس آئے تو انہوں نے سوشلزم کا پاکستان میں عروج دیکھ کر بیان دیا کہ اسلامی سوشلزم کوئی چیز نہیں اسلام اسلام ہے سوشلزم کفر ہے۔ اور ساتھ ہی چند روز کے بعد مودودی صاحب کی تحریک سے ملک کے 113 علماء نے فتویٰ جاری کر دیا کہ سوشلزم کفر ہے جو لوگ سوشلسٹ نظریات رکھتے ہیں وہ کافر ہیں دائرہ اسلام سے خارج ہیں ملک کی فضاء اس قدر پرآشوب ہو چکی تھی کہ خانہ جنگی کے اثرات نظر آنے لگ گئے تھے لاہور میں کئی دوسرے شہروں میں کتب فروشوں کی ان دکانوں کا جلا دیا گیا تھا جن میں سوشلسٹ نظریات کا لٹریچر فروخت ہوتا تھا۔ اس انتہائی خطرناک دور میں جمعیت علمائے اسلام نے جبہ اور قبا کی پرواہ کئے بغیر میدان عمل میں چھلانگ لگا دی اور اعلان کر دیا کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے چاہے ہو کسی سوشلسٹ پارٹی کا ہی رکن کیوں نہ ہو وہ مسلمان ہے اور جو جماعت اس کے مسلمان ہونے پر شک کرتی ہے وہ خود ہی کسی بیرونی غیر مسلم طاقت

کے ایجنٹ ہیں۔ جمعیت علمائے اسلام کے اس عمل نے مسلمانوں کو بہت بڑے فتنے سے بچا لیا اور جمعیت نے صرف فتوئی ہی جاری نہیں کیا بلکہ جا بجا جلسے بھی کئے۔ حضرت مفتی محمود صاحب اور دیگر جمعیت کے علماء حضرات نے پورے ملک میں جلسے کئے ملک میں اٹھے ہوئے اس فتنہ کو ٹھنڈا کیا پوری کوشش اور محنت سے حالات کو ٹھیک کیا۔

مولانا اجمل خان

جمعیت علمائے اسلام کا تیسرا دور

یحییٰ خان کا دور حکومت انتہائی غیر یقینی حالات سے گزر رہا تھا۔ الیکشن کا اعلان بھی ہو چکا تھا سیاسی جماعتیں الیکشن کی تیاریاں بھی کر رہی تھیں - آنے والے حالات میں دھندلاہٹ نظر آ رہی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی مغربی پاکستان میں بڑی تیزی سے مقبولیت کی منزلیں طے کر رہی تھی وڈیرا شاہی زیادہ تر مسلم لیگ کے ساتھ ہی چمٹی ہوئی تھی۔ 1970ء کے الیکشن کی کوئی واضح صورت حال نظر نہیں آ رہی تھی بڑے بڑے جلسوں کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا تھا کہ پیپلز پارٹی ہی مغربی پاکستان میں کامیاب ہو گی مگر وڈیرا شاہی کے جھرمٹ کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا تھا کہ مسلم لیگ ہی اکثریت حاصل کرے گی مگر جمعیت علمائے اسلام کے متعلق کوئی ایسا شبہ نہیں تھا کہ یہ جماعت بھی الیکشن میں کوئی اہمیت حاصل کر لے گی۔ 1970ء کے الیکشن کے نتیجہ میں جمعیت علمائے اسلام کو مرکز میں 7 نشستیں حاصل ہوئیں، سرحد اسمبلی میں 4 اور بلوچستان اسمبلی سے 3 نشستیں حاصل ہوئی تھیں مفتی محمود صاحب ڈیرہ اسماعیل خان سے کامیاب ہوئے تھے بھٹو کی پیپلز پارٹی کو ان کے مقابلے کے لئے موزوں امیدوار نہیں ملا تھا اس بناء پر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے مفتی صاحب کے مقابلے میں کاغذات نامزدگی داخل کرا دیئے مگر مسٹر بھٹو مفتی صاحب کے مقابلہ میں شکست کھا گئے۔ اس الیکشن میں مغربی پاکستان میں اکثریت کے ساتھ پیپلز پارٹی کامیاب ہوئی تھی اور مشرقی پاکستان میں قطعی اکثریت عوامی لیگ نے حاصل کی تھی اسی الیکشن کے نتیجہ میں جب اکثریتی پارٹی عوامی لیگ کو حکومتی اختیارات نہیں دیئے گئے تھے تو پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا جس کا تفصیل سے تذکرہ ہم دیگر صفحات میں کریں گے۔ پاکستان بٹ جانے کے بعد موجودہ پاکستان پر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو فوجی سربراہ کی حیثیت سے اقتدار ملا یعنی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے صدر بھی تھے اور سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ اور صوبوں کو جو اختیارات تھے وہ بھی اسی نوعیت کے تھے بعد میں جب عارضی آئین کے تحت وزارتیں قائم کی جانے لگیں تو مفتی محمود صاحب نے صوبہ سرحد میں اپنے چار ممبروں کی حمایت مشروط کر دی اور اعلان کر دیا کہ جمعیت کے صوبہ سرحد کے ممبران اس جماعت کا ساتھ دیں گے جو انہیں صوبہ سرحد کا وزیر اعلیٰ بنائے گی۔ اس پر نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کی آل پاکستان کولیشن بنائے جانے کا اعلان ہو گیا۔ صوبہ سرحد اسمبلی کی کل 40 نشستیں تھیں اکثریت کسی جماعت کی بھی نہ تھی۔ نیشنل عوامی پارٹی کی 13 نشستیں اور جمعیت علمائے اسلام کی 4 نشستیں تھیں دیگر آزاد ممبر ملا کر جمعیت کولیشن نے اکثریت حاصل کر لی اور مفتی محمود صاحب کی زیر قیادت سرحد حکومت قائم ہو گئی۔ وزیر اعلیٰ مفتی محمود صاحب بن گئے مفتی صاحب صوبائی اسمبلی کے ممبر نہ تھے مگر وہ عارضی آئین کی تحت ایک مقررہ وقت تک بغیر اسمبلی کے ممبر کے بھی وزیر اعلیٰ بن سکتے تھے۔ اس لئے وہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ اس طرح بلوچستان اسمبلی

کی کل 20 نشستیں تھیں۔ نیشنل عوامی پارٹی کی 8 نشستیں تھیں اور جمعیت علمائے اسلام کی 3 نشستیں تھیں یہ مل کر گیارہ بن گئے اور دیگر آزاد ممبر بھی ان کے ساتھ مل گئے ان کی اکثریت ہو گئی اور نیپ جمعیت کی کولیشن حکومت بن گئی۔ اور صوبہ کے وزیر اعلیٰ سردار عطاء اللہ مینگل بنا دیئے گئے جن کا تعلق نیشنل عوامی پارٹی سے تھا یہ کولیشن حکومتیں تقریباً دس ماہ تک چلیں اور بعد میں مرکزی حکومت نے یہ حکومتیں ختم کر دیں ہوا یوں کہ ان صوبوں کے گورنر بھی انہی جماعتوں کے تھے بھٹو حکومت نے 1973ء کا آئین نافذ ہو جانے کے بعد بلوچستان کی نیپ حکومت پر مختلف فرضی الزامات لگانے کے بعد پہلے بلوچستان کے گورنر مسٹر غوث بخش بزنجو کو برطرف کر دیا اور جب دوسرے دن بلوچستان کے وزیر اعلیٰ سردار عطاء اللہ مینگل نے گورنر مسٹر بزنجو کو ہٹائے جانے کے خلاف نیپ اور جمعیت کا احتجاجی جلوس نکالا تو دوران جلوس ہی ریڈیو پر یہ خبر آ گئی کہ بلوچستان کی مینگل وزارت کو برطرف کر دیا گیا ہے اور جب یہ خبر صوبہ سرحد میں پہنچی تو احتجاج کے طور پر صوبہ سرحد کے گورنر ارباب سکندر اور وزیر اعلیٰ مفتی محمود صاحب بھی وزارت اور گورنری سے مستعفی ہو گئے مفتی صاحب نے اپنے دور وزارت میں تین اہم کام کئے۔ نمبر 1 اس وقت تک پاکستان میں شراب کھلے عام فروخت ہوتی تھی مفتی صاحب نے صوبہ سرحد میں شراب پر مکمل پابندی لگا دی۔ نمبر 2 کسانوں کو جو تقاوی قرضے دیئے گئے تھے ان کا سود معاف کر دیا تھا۔ نمبر 3 صوبہ سرحد میں اردو لازمی تعلیم قرار دی گئی تھی وزارت کے چھوڑ دینے پر مفتی صاحب کا احترام لوگوں میں زیادہ ہوا اور بعد میں جب ولی خان صاحب حیدر آباد سازش کیس میں قید ہو گئے تو مفتی صاحب کو مرکزی اسمبلی میں متحدہ اپوزیشن اسمبلی پارٹی کا لیڈر بنایا گیا تھا۔ وزارت سے ہٹ جانے کے بعد جمعیت علمائے اسلام نے رابطہ عوام مہم شروع کر دی سارے ملک میں مختلف جگہوں پر اجلاس اور کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ کئی جگہوں پر ورکروں اور لیڈروں کو گرفتار کیا گیا۔ مقدمات بھی بنائے گئے۔ ہمارے گوجرانوالہ میں اکتوبر 1975ء میں جمعیت کی ایک کانفرنس چھپڑ والی مسجد گھنٹہ گھر میں منعقد ہوئی۔ جس میں ملک بھر سے علماء حضرات شریک ہوئے جن میں حضرت مولانا عبداللہ درخواستی مولانا عبید اللہ انور مولوی محمد شریف وٹو مولوی محمد امین بجلی گھر سید امین گیلانی بہت سارے دوسرے علمائے حضرات شریک ہوئے دو روز تک یہ کانفرنس جاری رہی کئی مولوی حضرات پر حکومت کے خلاف تقاریر کرنے پر مقدمات بنا دیئے گئے اور ساتھ ہی حکومت پنجاب نے چھپڑ والی مسجد ار مدرسہ نصرت العلوم کو محکمہ اوقاف میں لینے کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا حکومت کے اس اعلان کے خلاف لوگوں نے تحریک چلا دی اس میں تقریباً دو سو لوگ گرفتار کئے گئے یہ سب کارروائی ایک صوبائی وزیر جو کہ گوجرانوالہ کے ہی رہنے والے تھے ان کی مرضی سے ہو رہی تھی مذکورہ وزیر کے پاس محکمہ جیل بھی تھا اور محکمہ اوقاف بھی اس لئے گرفتار شدگاہ کو جیلوں میں تنگ بھی کیا جاتا تھا۔ بلاآخر حکومت نے مدرسہ نصرت العلوم کو محکمہ اوقاف میں لینے کا فیصلہ واپس لے لیا۔

1974ء میں مرزائیت کے خلاف تحریک چل پڑی تو جس کو تفصیل کے ساتھ ہم تحریک ختم نبوت 1974ء کے عنوان میں تحریر کریں گے مگر مختصر لفظوں میں ہم ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں کہ تحریک ختم نبوت میں جو مجلس عمل بنی تھی اس کی قیادت حضرت مفتی صاحب ہی کر رہے تھے اور مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی پارلیمنٹ کی تمام کارروائی بھی حضرت مفتی صاحب کی زیر قیادت ہوئی تھی اور قومی اسمبلی کا اس تحریک پر جو 17 یوم کا اجلاس ہوا تھا خلیفہ قادیان مرزا ناصر احمد اور لاہور مرزائیوں کے قائد مولوی صدر دین کے خلاف تمام جواب سوال مفتی صاحب کی زیر قیادت ہی کئے گئے۔ اور بالا آخر مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا تھا اس سارے پروگرام کے روح رواں جمعیت علماء اسلام کے مفتی محمود صاحب اور ان کے ساتھی تھے۔ پیپلز پارٹی اور مسٹر بھٹو کے غیر جمہوری اقدامات کے خلاف جمعیت نے اپوزیشن کی متحدہ جماعتوں کا ہمیشہ ساتھ دیا۔ یو ڈی ایف میں وہ بھی شامل تھے حکومت نے جب اعلان کیا کہ وہ آئندہ انتخاب مارچ 1977ء میں کرائیں گے تو اپوزیشن جماعتوں نے پیپلز پارٹی کے خلاف مل کر الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا پاکستان قومی اتحاد نام کے پلیٹ فارم پر پاکستان کی نو سیاسی جماعتوں نے باہم مل کر الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا ان جماعتوں میں جمعیت علمائے اسلام بھی شامل تھی پاکستان قومی اتحاد کے صدر مفتی صاحب بنائے گئے تھی مفتی محمود صاحب نے الیکشن سے قبل ہی اعلان کر دیا تھا کہ اگر الیکشن میں دھاندلی کی گئی تو پاکستان قومی اتحاد دھاندلی والے نتائج کو تسلیم نہیں کریں گے اور حکومت کے خلاف تحریک چلائیں گے اسی طرح قومی اتحاد کے دوسرے لیڈر بھی یہی کہتے تھے کہ دھاندلی نہیں ہونے دیں گے اگر دھاندلی ہوئی تو جعلی الیکشن تسلیم نہیں کریں گے۔ 7 مارچ 1977ء کو قومی اسمبلی کے الیکشن ہوئے جن میں صرف صوبہ سرحد میں قومی اتحا کو زیادہ نشستیں ملیں مجموعی طور پر قومی اتحاد کو شکست ہوئی۔ 8 مارچ کے ایک ہنگامی اجلاس میں قومی اتحاد نے 10 مارچ کو ہونے والے صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن کا بائیکاٹ کیا اور الیکشن کے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور حکومت کے خلاف قومی اتحاد نے تحریک کا آغاز کر دیا جو کہ 5 جولائی 1977ء تک جاری رہی جس کے نتیجے میں پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہو گئی اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا اور ضیاء الحق حکمران بن گئے قومی اتحاد کی اس تحریک کا مزید ذکر کسی اور باب میں کریں گے۔

جمعیت علمائے اسلام ہزاروی گروپ

جمعیت علمائے اسلام کے حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی کا بھٹو دور حکومت میں مفتی محمود صاحب سے اختلاف ہو گیا تھا وہ بھٹو کی پیپلز پارٹی کے حامی تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ جمعیت سرحد میں حکومت سازی کے لئے نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ کولیشن حکومت بنائے۔ یہ اختلاف ان کا ایک قسم کا فروعی تھا منشور میں دونوں گروپوں کا کوئی اختلاف نہیں تھا بھٹو کے پورے دور حکومت میں یہ اختلاف دونون گروپوں میں موجود رہا حضرت ہزاروی پیپلز پارٹی کے خلاف نہ تھے جبکہ مفتی محمود صاحب اور ان کے ساتھی بھٹو کی پیپلز پارٹی کے خلاف تھے مفتی محمود قومی اتحاد کے لیڈر تھے اور انہوں نے بھٹو کے خلاف تحریک کی قیادت کی جبکہ حضرت ہزاروی بھٹو کے ہمدم اور حمایتی رہے مگر اس کے باوجود ہزاروی گروپ اور مفتی گروپ کے لوگ ہر دو گروپوں کے لیڈروں کا احترام کرتے تھے بالکل ایسے ہی جیسے ایوب کے دور حکومت میں تھانوی گروپ اور ہزاروی گروپ تھے جیسے بہت قدیم چلے جاویں تو جمعیت علمائے ہند میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے آپس کے اختلافات کے باوجود منشور یا حصول مقصد میں اختلاف نہ تھا۔ طریقہ کار میں کسی حد تک اختلاف تھا مگر احترام میں دونوں گروپوں کے رہبروں کا احترام ہر صورت قائم رکھا جاتا تھا۔ حضرت ہزاروی اور مفتی محمود صاحب کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد آج کے دور میں مولوی فضل الرحمان اور مولانا سمیع الحق صاحبان میں بھی یہی اختلافات ہیں اور ان اختلافات کی نوعیت بھی ذاتی پسند اور ناپسند کی ہے ورنہ دونوں گروپوں کا سیاسی مزاج ایک جیسا ہی ہے۔

جمعیت علمائے اسلام کا چوتھا دور

پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہونے کے بعد ضیاء الحق حکومت پر قابض ہو گئے مارشل لاء نافذ کر دیا گیا - 90 دن میں الیکشن کرانے کا اعلان کیا گیا قومی اتحاد کے لیڈروں اور پیپلز پارٹی کے لیڈران گرفتار کر لئے گئے مگر ساتھ ہی الیکشن کی تیاریوں کی بھی اجازت دی گئی تھی اور دونوں سیاسی گروہ 90 دن بعد کے الیکشن کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے جب مارشل لاء حکومت کو خفیہ انکوائری سے معلوم ہوا کہ اگر 90 دن بعد بھی الیکشن ہوئے تو پیپلز پارٹی ہی کامیاب ہو گی تو الیکشن ملتوی کر دیئے گئے اور مارشل لاء حکومت نے قومی اتحاد کی جماعتوں کو حکومت میں شمولیت کی دعوت دی اور جمعیت علمائے اسلام حکومت میں شامل ہو گئی جن کے مرکزی حکومت میں تین وزیر لئے گئے جن کے نام یہ ہیں۔ میج صادق کھوسہ ' حاجی فقیر محمد ' محمد زمان خان اچکزئی۔ قومی اتحاد کی جماعتوں نے اعلان کر دیا کہ پہلے احتساب بعد میں انتخاب۔ حکومت نے پیپلز پارٹی کی

چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کر یا اور دیگر بھی کئی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ 10 ماہ تک جمعیت علمائے اسلام کے وزیر حکومت میں رہے اور اس دوران نفاذ اسلام کے متعلق حکومت نے کئی آرڈی نینس جاری کئے جن میں حدود آرڈیننس اور شرعی عدالتوں کے نفاذ کے قوانین بھی شامل ہیں۔ 10 ماہ تک جمعیت علمائے اسلام حکومت میں رہے اور پھر الگ ہو گئے الگ ہونے کا عذر یہ پیش کیا گیا کہ ضیاء الحق کا وعدہ تھا اور وہ اس وعدے سے منحرف ہو گیا ہے اس لئے جمعیت حکومت سے الگ ہو گئی ہے ۔ جمعیت نے ضیاء الحق کے خلاف لوگوں میں کام شروع کر دیا اور حکومت کے خلاف تحریک بھی چلانے کی کوشش کی مگر ضیا الحق ہر لمحہ مصالحت کی کوشش کرتے رہے۔ اس مقصد کے لئے ضیاء الحق نے سعودی حکومت سے بھی امداد طلب کی سعودی حکومت نے رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل شیخ محمد ناصر علی حرکان کو اس مقصد کے لئے پاکستان بھیجا۔ جناب حرکان نے مفتی صاحب سے کئی ملاقاتیں کیں ضیاء الحق سے بھی رابطہ رہا مگر بات نہ بنی مفتی صاحب اور جمعیت کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا کہ اگر ضیاء الحق کی مارشل لاء حکومت الیکشن شیڈول کے مطابق کرانے کا اعلان کر دے بعد میں ہم تعاون بھی کر لیں گے مگر الیکشن کے بغیر کسی صورت میں بھی ضیاء الحق کی حکومت سے تعاون نہیں کریں گے مسٹر حرکان کی کوششیں ناکام ہوئی اور واپس چلے گئے۔ بعد میں جمعیت علمائے اسلام نے مارشل لاء کے خلاف ضیاء الحق کے خلاف تحریک منظم کرنے کا کام شروع کر دیا ۔ اسی دوران 1980ء میں مفتی محمود صاحب فوت ہو گئے مفتی صاحب کے انتقال کے بعد ڈیرہ اسماعیل خان میں مفتی محمود کانفرنس منعقد ہوئی جس میں تمام پاکستان کے مندوبین شریک ہوئے جمہوریت کے لئے مفتی صاحب کی جدوجہد کا تذکرہ زور و شور سے کیا گیا ۔ ضیاء الحق کی بداعمالیوں اور وعدہ خلافیوں کا ذکر بھی کیا گیا۔ مفتی محمود صاحب کی وفات پر پورے پاکستان میں کئی جگہوں پر جمعیت نے جلسے کئے کانفرنسیں کیں۔ مفتی محمود صاحب کی جمہوریت سے متعلق اسلامی خدمات کے متعلق ضیاء الحق کی وعدہ خلافیوں کے متعلق منافقت کے متعلق لوگوں کو بتایا گیا۔ اس دوران جماعت میں قیادت کا جھگڑا چل پڑا مفتی محمود صاحب کی وفات کے بعد ان کے قد کاٹھ کا جمعیت میں کوئی بھی عالم دین نہ تھا۔ مولوی فضل الرحمان دھیرے دھیرے مفتی صاحب کی سیاسی مسند پر قابض ہو گئے اور ان کے گروہ کی سرپرستی حضرت درخواستی نے بھی فرمانا شروع کر دی۔ اور اس موقع پر جمعیت دو گروہوں میں پھر تقسیم ہو گئی۔ ایک گروہ واضح طور پر حضرت عبدالحق اکوڑہ خٹک والوں اور بعد میں سمیع الحق کی زیر قیادت چلا گیا جبکہ بڑا گروہ جس میں بلوچستان کی جمعیت اکثریت سے شامل تھی فضل الرحمان گروپ میں چلے گئے۔

جمعیت علمائے اسلام

مولوی فضل الرحمان گروپ

1984ء میں جب ضیاء الحق حکومت نے غیر جماعتی الیکشن کرائے تو جمعیت علماء فضل الرحمان گروپ کے چھ ممبر کامیاب ہوئے مگر انہوں نے حکومت میں حصہ نہیں لیا کوئی وزارت قبول نہیں کی۔ فضل الرحمان بذات خود اور ان کے نمایاں ساتھی کوئی بھی الیکشن میں کھڑے نہ ہوئے تھے۔ مگر جمعیت جمہوریت کی کوشش برابر کرتی رہی جمعیت کے قومی اسمبلی کے ان ممبران میں بلوچستان کے حافظ حسین احمد تھے جو بعد میں سینٹ کے ممبر بن گئے۔ اور اس وقت 1994ء میں بھی وہ سینٹ کے ممبر ہیں۔ 1989ء میں انہوں نے سینٹ میں شریعت بل پیش کیا جو بغیر کسی مخالفت کے پاس ہو گیا اس پر جمعیت نے سارے ملک میں مطالبات شریعت منایا۔ اجتماعات جمعہ میں نفاذ شریعت کا مطالبہ کیا جلوس بھی نکالے مگر قومی اسمبلی میں شریعت بل کے بارے میں کوئی بھی کارروائی نہ ہو سکی۔ 1988ء کے جماعتی الیکشن میں جمعیت علمائے اسلام فضل الرحمان گروپ نے 6 نشستیں حاصل کیں مگر کسی حکومت میں شامل نہ ہوئے اس وقت مرکز میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی صوبہ سرحد میں فضل الرحمان گروپ 2 ممبر کامیاب ہوئے تھے۔ 1990ء کے الیکشن میں فضل الرحمان گروپ کے 4 ممبر کامیاب ہوئے۔ مگر فضل الرحمان خود کامیاب نہ ہو سکے اس الیکشن میں بلوچستان اسمبلی میں فضل الرحمان گروپ کے 6 ممبر کامیاب ہوئے جنہوں نے حکومت کی شمولیت میں کوئی نمایاں پالیسیاں اختیار نہ کی اس لئے کہ بلوچستان کی پوزیشن 1984ء سے یہی ہے کہ کوئی جماعت بھی واضح اکثریت حاصل نہیں کرتی اس لئے کولیشن حکومتیں بنتی ٹوٹتی رہتی ہیں سرحد اسمبلی میں دو ممبر کامیاب ہوئے جنہوں نے اپوزیشن کا ساتھ دیا۔

1993ء میں جمعیت علمائے اسلام فضل الرحمان گروپ نے مرکزی اسمبلی میں چار نشستیں حاصل کیں۔ فضل الرحمان صاحب خود بھی قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔ وہ اس وقت 1994ء میں پیپلز پارٹی کی بے نظیر حکومت کے ساتھ ہیں سرحد اسمبلی میں فضل الرحمان کا ایک ممبر ہے جو اس وقت پیپلز پارٹی کے ساتھ ہے۔ مولوی فضل الرحمان صاحب اس وقت حکومت کی امور خارجہ کی سٹینڈنگ کمیٹی کے چیئرمین ہیں یہ رتبہ ایک وزیر کے برابر ہے۔

اس وقت جمعیت علمائے اسلام کے لوگوں میں یہ لوگ شامل ہیں۔ حضرت مولانا عبداللہ درخواستی مولانا فضل الرحمان مولانا محمد اجمل خان امیر حسین شاہ گیلانی منظور چنیوٹی، مولانا اجمل قادری سید امین گیلانی، مولانا زاہد الراشدی۔

سرحد میں مولانا ایوب خان بنوری، مولانا حسن جان، مولانا علاوالدین، مولانا سمیع الحق
بلوچستان میں مولانا محمد خان شیرانی، مولانا عبدالواحد کاکڑ، حافظ حسین احمد۔
سندھ میں مولانا عبدالکریم بھر شریف والے، مولانا عبدالصمد حالے جی والے، ڈاکٹر خالد محمود سومرو - 1994ء میں حضرت مولانا عبداللہ درخواستی وفات پا گئے ان کی نماز جنازہ میں حکمران پیپلز پارٹی کے وزراء سمیت صدر پاکستان جناب فاروق احمد خان لغاری بھی شامل ہوئے اور بعد میں تعزیت کے لئے محترمہ بے نظیر بھٹو بھی گئیں۔ ان کی جگہ جمعیت علمائے اسلام کے قائم مقام امیر حضرت مولانا محمد اجمل خان بنائے گئے ہیں۔

سمیع الحق گروپ

حضرت مفتی محمود کے انتقال کے بعد جمعیت کی قیادت کے جھگڑے پر جمعیت دو گروپوں میں تقسیم ہوگئی یہ تقسیم پسند اور ناپسند کی تھی کوئی اصولی اختلاف نہیں تھا مولانا سمیع الحق کو سرحد اور پنجاب میں کسی حد تک حمایت حاصل تھی اور عمومی طور پر ہوا یوں ہے کہ اگر جمعیت فضل گروپ پیپلز پارٹی کی حامی ہے تو سمیع گروپ دوسرے گروپ کا حامی بن گیا بعض وقت دونوں گروپ آزادانہ پالیسی پر بھی گامزن ہوگئے اس وقت زیادہ مضبوط پوزیشن فضل الرحمن گروپ کی ہے جس میں شخصیات زیادہ ہیں اور حلقہ اثر بھی زیادہ ہے۔ سمیع الحق گروپ کو 1984ء کے غیر جماعتی الیکشن میں قومی اسمبلی کی 4 نشستیں ملیں تھیں۔ کامیاب ممبران میں مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک، مولانا شہید احمد صاحب اور مولانا نعمت اللہ صاحب بھی شامل تھے۔ سرحد اسمبلی میں مولوی عبدالباقی صاحب کامیاب ہوئے تھے۔

1988ء کے جماعتی الیکشن میں بھی سمیع گروپ کو مرکزی اسمبلی میں 4 نشستیں ملیں اور سرحد اسمبلی میں ایک نشست ملی تھی مگر وہ لوگ بھی اپوزیشن میں رہے حکومت کا ساتھ نہیں دیا۔ سینٹ میں غیر جماعتی الیکشن کے وقت سمیع الحق گروپ کا ایک ممبر تھا۔ 1990ء میں مزید ایک ممبر ہوگیا اور اس وقت سمیع الحق گروپ کے دو ممبر سینٹ میں ہیں۔

1990ء کے الیکشن میں مرکزی اسمبلی میں سمیع الحق گروپ کا ایک ممبر کامیاب ہوا اور پنجاب اسمبلی میں دو مولانا منظور چنیوٹی اور قاری سعید الرحمان کامیاب ہوئے اور نواز شریف حکومت کے ساتھی رہے۔ قاری سعید الرحمان کو پنجاب کی صوبائی حکومت میں شامل کیا گیا اور وزیر اوقاف بنائے گئے۔

1993ء جمعیت سمیع الحق گروپ کے دو ممبر ہیں اور نواز شریف کے ساتھ اپوزیشن میں ہیں۔ پنجاب اسمبلی میں سمیع الحق گروپ کا ایک ممبر ہے اور اپوزیشن کے ساتھ ہے۔

عوامی لیگ

عوامی لیگ کے بانی مسٹر حسین شہید سہروردی تھے یہ بھارتی بنگال کے ضلع مدنا پور کے رہنے والے تھے متحدہ بنگال کی آخری مسلم لیگی حکومت کے وزیر اعظم تھے۔ 1946ء میں کلکتہ میں ہندو مسلم فساد ہو گیا تھا اس وقت بنگال کے وزیر اعظم جناب سید حسین شہید سہروردی ہی تھے۔ اور اس فساد میں تقریباً پانچ ہزار لوگ مارے گئے تھے مقتولین میں زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھی اور ہندو الزام لگاتے تھے کہ فسادات مسلم لیگی حکومت بشمول مسٹر سہروردی نے کرائے ہیں۔

تقسیم ہند کے وقت تک مسٹر سہروردی بنگال کے وزیر اعظم رہے مگر پاکستان بن جانے کے بعد انہیں اقتدار سے بالکل خارج کر دیا گیا انہیں مرکزی حکومت میں کوئی جگہ نہ ملی اور شاید انہیں پاکستانی بھی تسلیم نہیں کیا گیا تھا وہ آخری وقت میں متحدہ بنگال کی بات بھی کرتے رہے وہ تقسیم بنگال کے بھی خلاف تھے۔

جب پاکستان بن جانے کا اعلان ہو گیا تو کلکتہ میں فسادات کا سخت خطرہ پیدا ہو گیا گاندھی جی نواکھالی کے فساد زادہ علاقوں میں لوگوں کو بچانے کے لئے جا رہے تھے کہ کلکتہ میں انہیں مسلمانوں کا ایک گروہ مسٹر سہروردی کی زیر قیادت ملا کہ کلکتہ میں سخت فسلوات کا خطرہ ہے۔ آپ یہیں رہ جاویں انہوں نے کہا کہ میں نواکھالی میں فسادات سے لوگوں کو بچانے کے لئے جا رہا ہوں۔ اگر آپ لوگ نواکھالی میں قتل عام کے آتش کدہ کو ٹھنڈا کرنے کا ذمہ لیں تو میں یہیں رہ جاتا ہوں اور ساتھی ہی اگر یہاں رہوں گا تو مسٹر سہروردی کو بھی میرا ساتھ دینا ہو گا۔ اس پر سہروردی نے نواکھالی کی بھی حامی بھرلی اور کلکتہ میں ساتھ رہنے کا وعدہ بھی کر لیا۔ چند روز گاندھی جی اور سہروردی سمیت مختلف لوگوں سے ملتے رہے گاندھی جی کے پاس ماننے والوں کا ہر وقت ہجوم رہتا لوگوں کو ذہنی طور پر مسلمانوں کے قتل عام کے خلاف تیار کرتے رہے ہندوؤں کا الزام تھا کہ گزشتہ سال کلکتہ میں جو لوگ قتل ہوئے ان کا ذمہ دار سہروردی ہے گاندھی جی کا کہنا یہ تھا کہ گزری باتوں کو بھول کر ہی ہم امن قائم کر سکتے ہیں دس دن کی جدوجہد کے بعد کلکتہ میں ہندو مسلم متحدہ جلوس نکالا گیا جس کا نعرہ تھا۔ ہندو مسلم بھائی بھائی یہ ہر روز کئی جگہوں سے نکلنا شروع ہو گئے اور بلا آخر کلکتہ اور بھارتی بنگال سے فسادات کا مسلمانوں کے قتل عام کا خطرہ ٹل گیا اور امن قائم ہو گیا بھارتی بنگال میں تو امن قائم ہو گیا مگر پنجاب میں دونوں طرف قتل عام زوروں پر تھا۔ گاندھی جی کی خواہش تھی کہ پنجاب میں بھی قتل عام بند کرایا جائے اس مقصد کے لئے انہوں نے سہروردی کو کراچی میں قائد اعظم کے پاس بھیجا کہ وہ مجھے اجازت دیں تو میں پنجاب کے دونوں حصوں میں قتل عام بند کرانے کی کوشش کروں۔ سہروردی کو قائد اعظم نے کورا جواب دے دیا تھا۔ عذر یہ پیش کیا تھا کہ گاندھی جی کس حیثیت سے پاکستان میں آنا چاہتے ہیں پہلے اپنے حیثیت کا تعین کریں پھر اجازت پر غور کیا جائے گا۔ سہروردی جب بنگال میں
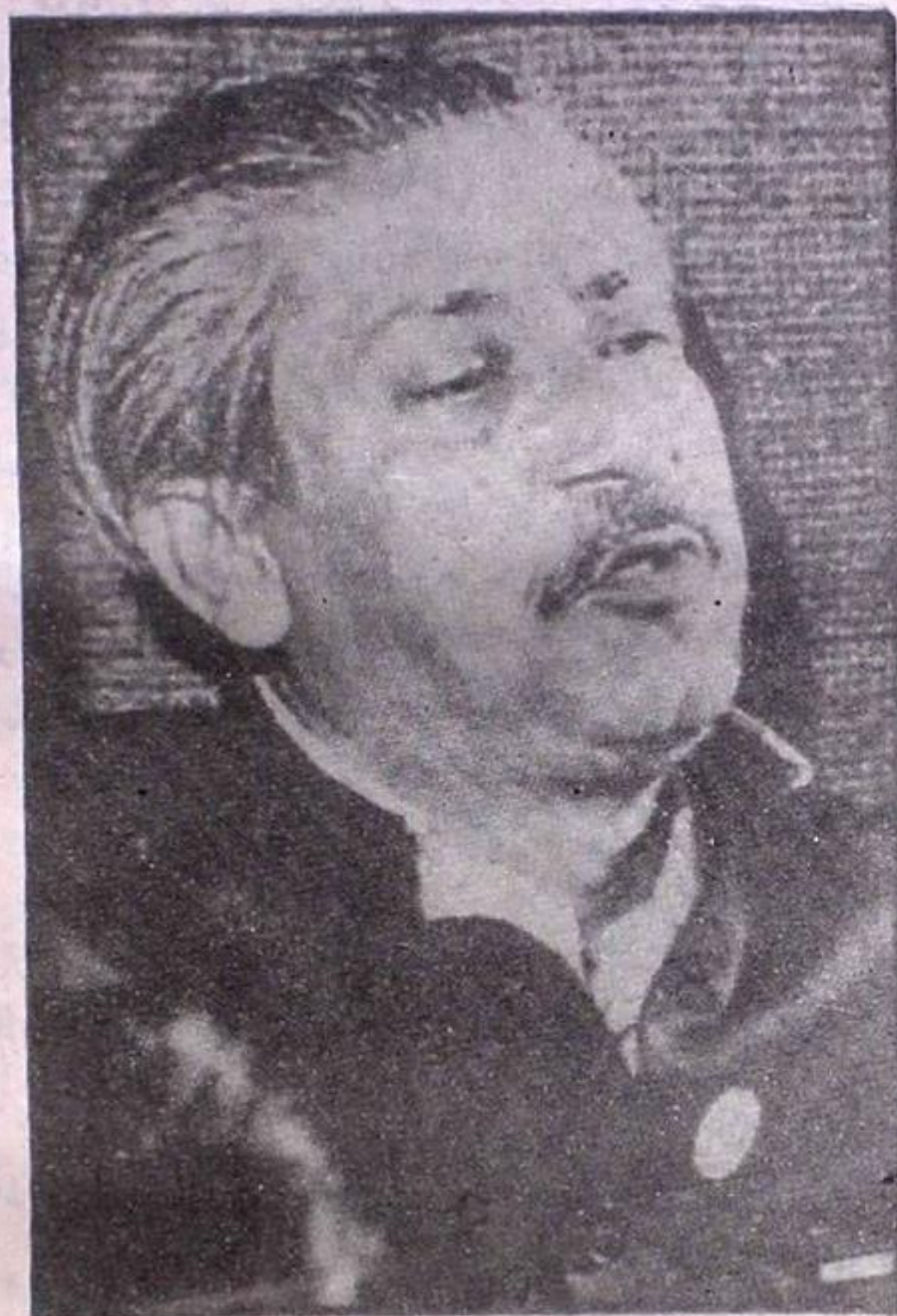
شیخ مجیب الرحمن بانی عوامی لیگ و بنگلہ دیش

مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے گاندھی کے ساتھ مل کر جدوجہد کر رہے تھے اس وقت پاکستانی اخبارات انہیں گاندھی کا چیلا ظاہر کر رہے تھے اور کارٹون میں انہیں ہندو دیکھایا جاتا تھا بھارتی بنگال میں امن قائم ہو جانے کے بعد گاندھی جی بھارت میں دیگر فسادات زدہ علاقوں میں چلے گئے دہلی بھی اس وقت مسلم قتل گاہ بنا ہوا تھا دہلی میں گاندھی جی نے مسلمانوں کے قتل عام کو روکنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی - بلا آخر یہ عظیم انسان جدوجہد میں خود قتل ہو گئے۔
سہروردی کچھ وقت بھارتی بنگال میں رہے انہیں اپنا سیاسی مستقبل وہاں تاریک نظر آیا اور پاکستان میں تو بھارتی پنجاب کے تمام مسلمان مغربی پنجاب میں آ گئے تھے اور مشرقی پنجاب میں علاقے کے جو مسلمان اسمبلی ممبر تھے وہ ہی مغربی پاکستان میں اسمبلی کے ممبر بن گئے اور سیاست میں ہندو مسلم الگ الگ ہو گئے مگر بنگال میں تبادلہ آبادی نہیں ہوا تھا اس لئے سہروردی مغربی بنگال اسمبلی کے ممبر تو تھے مگر وہ مشرقی پاکستان کی ڈھاکہ اسمبلی کے ممبر نہ تھے اس لئے پاکستان میں ان کی سیاسی حیثیت کی بنیاد نہ تھی انہیں اپنی سیاسی حیثیت خود بنانا تھی۔ پاکستان کی مرکزی دستور ساز اسمبلی کے بھی وہ ممبر نہ تھے اور انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ پاکستان میں مسلم لیگ کے علاوہ تقسیم ہند سے قبل کی کوئی سیاسی جماعت چل ہی نہیں سکے گی اس لئے انہوں نے ڈھاکہ میں ہی اپنی نئی جماعت عوامی مسلم لیگ کی بنیاد رکھ دی اور ابتدائی ساتھی ان کے ساتھ مولانا بھاشانی مولانا اطہر علی شیخ مجیب الرحمان جناب عطاء الرحمان خان تھے۔ پھر وہ مغربی پاکستان میں آئے انہوں نے مختلف شہروں کا دورہ کیا اس زمانے میں مسلم لیگ کے علاوہ صرف مقامی انجمنیں ہی متحرک تھی جن میں انجمن مہاجرین کے پلیٹ فارم پر ہی گوجرانوالہ تشریف لائے تھے اس وقت ان کی میزبانی انجمن مہاجرین گوجرانوالہ نے جس کی قیادت اس وقت ٹھیکیدار عبدالعزیز بزل احمد ایوبی حاجی صدر دین خلیفہ امام دین بقا وغیرہ کر رہے تھے انجمن مہاجرین کے زیر اہتمام جلسہ میں ہی انہوں نے گوجرانوالہ کے عوام کو خطاب کیا تھا وہ جلسہ گاہ کے سٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے - رئیس المہاجرین کے خطاب سے انہیں نوازا جاتا تھا ان کا تعارف رئیس المہاجرین سید حسین شہید سہروردی کے القاب سے کرایا جاتا تھا پھر انہوں نے جلسہ میں تقریر کی مہاجرین کے دکھ کو اپنا دکھ کہا اور ان کی تکلیف میں ہر قسم کی امداد کی یقین دہانی بھی کرائی اور گوجرانوالہ میں انہیں لوگوں کے ساتھ ان کا رابطہ مستقل ہو گیا - عوامی لیگ میں اور لوگوں کے ساتھ مندرجہ بالا لوگ بھی شامل ہوئے اس طرح جناب سہروردی مغربی پاکستان کے ہر شہر میں جلسے کرتے لوگوں کو عوامی لیگ میں شمولیت کی دعوت دیتے اور مغربی پاکستان میں عوامی لیگ اچھی خاصی منظم جماعت بن گئی -
اسی دوران لیاقت علی خان اور دولتانہ گٹھ جوڑ کی وجہ سے نواب افتخار حسین آف ممدوٹ کو پنجاب کی وزارت چھوڑنی پڑی اور ساتھ ہی انہوں نے مسلم لیگ بھی چھوڑ دی اور جناح مسلم لیگ کے نام الگ سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی۔ اور ساتھ ہی نواب ممدوٹ اور جناب سہروردی نے اپنی اپنی جماعتوں کو ختم کر دیا اور لاہور ریگل سینما میں ایک کنونشن 1949ء کے آخری ایام

میں ہوا جس میں دونوں جماعتوں کے نامور لیڈر اور ورکر جمع ہوئے جن میں جناب سہروردی پیر آف مانکی شریف غلام محمد خان لونڈخوڑ کمین جان نواب خان افتخار حسین آف ممدوٹ ملک غلام نبی خواجہ رفیق اور دیگر بہت سارے لوگ جمع ہوئے سٹیج پر لیڈران اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے جن میں سب سے اونچی کرسی جناب سہروردی کی دوسری کرسیاں ذرا نیچی تھیں پیر آف مانکی شریف ذرا نیچی کرسی پر تشریف فرما تھے - صوبہ سرحد سے ان کی مرید بھی کافی تعداد میں آئے تھے جو ہال میں بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے اپنے پیر کو نیچی کرسی پر دیکھا تو مشتعل ہو گئے جب سہروردی صاحب کو اس صورت حال کو پتہ چلا تو انہوں نے بڑی کرسی پیر صاحب کے لئے خالی کرنی چاہی تو پیر آف مانکی شریف اٹھے انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ آپ مشتعل نہ ہوں سہروردی صاحب ہماری مرضی سے ہی بڑی کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ اسی کنونشن میں عوامی مسلم لیگ اور جناح مسلم لیگ کو ملا کر جناح عوامی مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی اور 1950ء کے صوبائی اسمبلیوں کے الیکشنوں میں جناح عوامی مسلم لیگ نے حصہ لیا تھا۔

1950ء کے الیکشن میں پنجاب اور صوبہ سرحد میں جناح عوامی مسلم لیگ نے حصہ لیا تھا مگر کامیابی صرف چند لوگوں کو ہوئی جو نواب ممدوٹ کے ساتھی تھے نواب ممدوٹ خود کامیاب ہو گئے تھے وہ حلقہ سیالکوٹ سے کھڑے ہوئے تھے جو صاحب ہمارے گوجرانوالہ میں جناح عوامی مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے وہ ناکام ہو گئے تھے۔

نواب ممدوٹ کے چند ساتھی جو الیکشن میں کامیاب ہوئے تھے جب نواز ممدوٹ سیاست میں غیر متحرک ہو گئے تو وہ بھی سرکاری پارٹی میں باری باری شامل ہو گئے تھے گوجرانوالہ کے عوامی لیگی پرانے کارکن حاجی صدر دین صاحب کہتے ہیں کہ جناب سہروردی کارکنوں کے ساتھ بہت ہی ہمدردی رکھتے تھے۔ اپنے ساتھی کارکنوں سے کوئی فرق نہیں رکھتے تھے کارکنوں کے ساتھ بڑی جلدی بے تکلف ہو جایا کرتے تھے لاہور کی ایک میٹنگ میں کارکن جمع تھے۔ پیرمانکی شریف صاحب کا پشاور سے ٹیلی گرام سہروردی صاحب کو آیا کہ آپ پشاور تشریف لاویں اس وقت پشاور جانے کے لئے تیاری شروع ہو گئی۔ گاڑیوں کا بندوبست کیا گیا تمام کارکنوں کو ساتھ لے کر پشاور گئے پیر آف مانکی نے پشاور میں بہت شاندار استقبال کیا۔ اس روز صوبہ سرحد کے الیکشن ہونے تھے - حکومت کی دھاندلی کے بارے سہروردی صاحب کو بتانا تھا بہت سارے پولنگ اسٹیشنوں پر گئے حکومت سرحد کی دھاندلیاں سہروردی صاحب کو دکھائی گئیں اور پھر سہروردی صاحب نے اخباری بیان جاری کیا اور پنجاب میں آ کر تمام حالات لوگوں کو بتائے اس سارے سفر میں سہروردی صاحب اپنے ساتھی کارکنوں کے ساتھ گھل مل کر رہے اور بڑی بے تکلفی سے بعض وقت ساتھی کارکنوں کو بنگالی گیت بھی سناتے۔ کبھی لطائف بھی سناتے تھے اور ایک سرور کن ماحول میں ساتھی کارکنوں کے ساتھ وقت یادگار طریقے پر گزارا۔

بہت جلد نواب ممدوٹ سیاست میں غیر متحرک ہو گئے۔ وہ پنجاب اسمبلی کے ممبر تھے مگر وہ

عملی طور پر سیاست سے کنارہ کش ہو گئے پھر آہستہ آہستہ ان کے ساتھی جو پہلے مسلم لیگ میں ہی تھے وہ پھر سرکار کے ساتھ مل گئے۔

اس زمانے میں وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان امریکہ کے دورے پر گئے تھے اور ان کی امریکی دورے کو حکومت بڑی کامیابی کے ساتھ عوام میں پیش کر رہی تھی اور لیاقت علی خان کی کامیاب خارجہ پالیسی کے گن گائے جا رہے تھے۔ سہروردی صاحب نے لیاقت علی خان کے دورہ امریکہ پر تنقید کی اور کہا غریب ملک کے کروڑوں روپے لیاقت علی خان نے اپنی عیش عشرت کے لئے خرچ کئے ہیں اور اس دورے میں پاکستان کے لئے امریکہ سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا گیا۔

جب اخباری نمائندوں نے لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان کی دورہ امریکہ کے متعلق سہروردی خیالات سے آگاہ کیا تو جناب لیاقت علی خان نے جواب دیا کہ کتے بھونکتے رہتے ہیں کارواں چلتے رہتے ہیں۔ جناب سہروردی پاکستان میں حزب اختلاف کی علامت بن چکے تھی اور ان کی ذات حزب اختلاف کی ضرب المثل بن چکی تھی وہ ہر وقت حق صداقت کا الم بلند کئے ہوئے متحرک رہتے تھے وہ پاکستان کے واحد لیڈر تھے جو پاکستان کے دونوں حصوں میں جانے پہچانے جاتے تھے اور مشرقی پاکستان میں تو عوامی لیگ ایک طاقت بن چکی تھی کئی بار لاہور گوجرانوالہ اور مغربی پاکستان کے دیگر شہروں میں عوامی لیگ کے جلسوں میں یہ بات کہی جاتی تھی کہ مشرقی پاکستان کے آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ شکست کھا جائے گی مغربی پاکستان میں چونکہ مسلم لیگی حکومت بہت مضبوط تھی اس لئے مغربی پاکستان میں لوگوں کو ان کی اس بات کا یقین نہیں آتا تھا مگر حکومت مسلسل مشرقی پاکستان میں الیکشن ملتوی کر رہی تھی اس وجہ سے کچھ سیاسی لوگ عوامی لیگ کی مشرقی پاکستان میں طاقت ور ہونے کا یقین بھی کر لیتے تھے۔ آخر حکومت پاکستان نے 1954ء میں مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے انتخابات کا اعلان کر ہی دیا۔ یہ انتخابات مشرقی بنگال میں نو سال بعد ہو رہے تھے مغربی پاکستان کے لوگ اس یقین میں مبتلا تھے کہ مسلم لیگ ہی مشرقی بنگال میں جیت جائے گی مگر الیکشن کے نتائج نے لوگوں کو حیران کر دیا۔ مشرقی بنگال کی 301 نشستیں حزب اختلاف کے متحدہ محاذ جگنو فرنٹ نے جیت لیں اور جگنو فرنٹ میں مضبوط جماعت عوامی لیگ ہی تھی۔ باقی جماعتوں کی پوزیشن عوامی لیگ سے کم تر ہی تھی مشرقی بنگال کے الیکشن کے بعد مسٹر سہروردی اور عوامی لیگ کی حیثیت سابقہ ادوار جیسی نہ رہی وہ ایک طاقت ور جماعت کے لیڈر تھے وہ اب صرف حزب اختلاف نہ تھے بلکہ وہ حکمرانی کے اہل بھی بن چکے تھے۔ مشرقی پاکستان کے الیکشن کے نتائج پر علاقائی مسائل کے بہت زیادہ اثرات تھے مغربی پاکستان کے لیڈروں نے جب اردو کو قومی زبان بنانے کے بارے کہا تو مشرقی بنگال میں اس کا بہت ردعمل ہوا وہاں پر بنگالی زبان کے حق میں تحریک چلی اور یہ تحریک اس قدر زور دار تھی کہ بنگالی زبان کے حق میں ایک مشتعل جلوس پر حکومت نے گولی چلا دی جس میں 6 بنگالی طالب علم شہید ہو گئے اور کئی لوگ زخمی ہوئے اور جس جگہ گولی چلی تھی اور لوگ شہید ہوئے تھے۔ اس جگہ

پر یادگار تعمیر کی گئی جب جگتو فرنٹ نے الیکشن جیت لیا تو سب سے پہلے جلوس کی شکل میں ان شہیدوں کی یادگاہ پر سلامی دی اور عہد کی تجدید کی۔ جگتوفرنٹ کے اتحاد میں یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ بنگال کی وزارت کو شک سرامک پارٹی جو عوامی لیگ کے بعد دوسرے نمبر کی پارٹی تھی وزارت بنائے گی جگتو فرنٹ کے الیکشن جیت لینے کے بعد مولوی اے کے فضل حق نے وزارت بنائی۔ تھوڑے عرصہ بعد ہی مولوی فضل الحق کی وزارت کو مرکزی حکومت نے غداری کے الزامات لگا کر برطرف کر دیا۔ مشرقی بنگال کے لیڈران ہمیشہ ہی مغربی پاکستان کی مرکزی حکومت سے شاکی رہے اور مغربی پاکستان کے حکمران بشمول فوج کے انہیں اپنے زیر تسلط رکھنا چاہتے تھے جو کہ مشرقی پاکستان کے لیڈران ماننے کو تیار نہ تھے۔ 1954ء میں صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کے ذریعے مرکزی اسمبلی کا چناؤ کیا گیا۔ جس میں جناب سہروردی مرکزی اسمبلی کے ممبر بنے مشرقی پاکستان کی نمائندگی سب سے زیادہ عوامی لیگ کے پاس تھی انہیں ایام میں مرکزی حکومت بنی جس میں سہروردی صاحب کو وزیر قانون بنایا گیا تھا۔

عوامی لیگ کی حکمرانی

1954ء کے انتخابات جگتو فرنٹ کی کامیابی پھر اس میں عوامی لیگ کی مضبوط اور حکمران قسم کی جماعت کی حیثیت اختیار کر جانا مغربی پاکستان کے لوگوں پر بھی اثر انداز ہوئے بہت لوگ عوامی لیگ میں شامل ہوئے خصوصاً پرانے قوم پرست پنجاب میں جنکی قیادت نواب زادہ نصر اللہ خان شیخ حسام الدین اور بہت سارے احرار کارکن اور دیگر بہت سارے لوگ جن میں حامد سرفراز صاحب ایڈووکیٹ اور گوجرانوالہ کے خواجہ صدیق الحسن اور دیگر بہت سارے کارکن شامل ہوئے جناب شہید سہروردی جو قومی اسمبلی کے ممبر بن چکے تھے انہیں بوگرا وزارت میں وزیر قانون بنایا گیا سہروردی اور عوامی لیگ صوبائی خود مختاری کے حامی تھے اور مرکزی میں آبادی کے تناسب سے نمائندگی کے قائل تھے مگر جب انہیں ون یونٹ کی حمایت کرنے پر مرکزی قیادت جس کے پاس حکمرانی ہمیشہ ہی ہوتی ہے تیار کر یا اور ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ وہ اگر ون یونٹ کی سکیم کو مان لیں اور عوامی لیگ سے منوا لیں تو انہیں وزیر اعظم بنا دیا جائے گا۔ سہروردی صاحب نے مرکزی قیادت کی شرط تسلیم کر لی اور پھر وہ وزارت عظمیٰ کا انتظار کرنے لگے۔ قدرت اللہ شہاب اپنی کتاب شہاب نامہ میں لکھتے ہیں کہ سہروردی صاحب کا مجھے فون آیا کہ آپ گورنر جنرل سکندر مرزا سے پتہ کر کے بتائیں کہ وہ میری وزارت عظمیٰ کا کب حلف لے رہے ہیں۔ شہاب صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے سکندر مرزا سے سہروردی کی وزارت عظمیٰ کی حلف برداری کے متعلق پوچھا تو سکندر مرزا ہنس پڑے اور کہا کہ حلف ضرور ہو گا مگر سہروردی کا نہیں چودھری محمد علی کا جب سہروردی صاحب کو قدرت اللہ شہاب سے یہ جواب معلوم ہوا تو وہ افسردہ ہو گئے

اور کہنے لگے کہ پھر وہی محلاتی سازشیں، چودھری محمد علی کی وزارت عظمیٰ میں مولوی اے کے فضل الحق صاحب کو وزیر داخلہ بنایا گیا تھا انہیں تھوڑا عرصہ قبل مشرقی بنگال کی وزارت عظمیٰ سے الگ کرتے وقت غدار تک کہا گیا تھا۔ چودھری محمد علی تقریباً ایک سال پاکستان کے وزیر اعظم رہے پھر انہیں ہٹا دیا گیا۔ 1956ء میں جناب سہروردی صاحب عوامی لیگ اور ری پبلکن پارٹی کی کولیشن پارٹی کے لیڈر چنے گئے اور وہ پاکستان کے وزیر اعظم بنائے گئے ان کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں ہی امریکہ کے کہنے پر سویت یونین کے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لئے پاکستان ایران اور عراق ترکی ان چار ملکوں کے درمیان بغداد پیکٹ ہوا تھا اس بغداد پیکٹ نے بعد میں سینٹو کی شکل اختیار کر لی تھی سہروردی صاحب کے دور حکومت میں ہی برطانیہ فرانس اور اسرائیل نے مل کر نہر سویز اور مصر پر حملہ کر دیا تھا اور صرف دو دن میں ہی اتحاد فوجوں نے نہر سویز پر اور مصر کے بہت بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا تھا روس کے صدر کی دھمکی کی وجہ سے جنگ بند ہو گئی تھی اور مقبوضہ علاقے بھی اتحاد فوجوں کو خالی کرنے پڑے تھے۔ اس جنگ میں حکومت پاکستان کی حمایت حملہ آور برطانوی فوجوں کے ساتھ تھی اور سہروردی صاحب نے اسرائیلی اتحادی فوجوں اور ملکوں کے نقطہ نظر کی حمایت کی تھی سہروردی صاحب کی اس پالیسی کی وجہ سے عوامی لیگ کا ترقی پسند گروپ مولانا عبدالحمید خان بھاشانی کی زیر قیادت عوامی لیگ سے الگ ہو کر نیشنل عوامی لیگ پارٹی میں شامل ہو گیا تھا سہروردی وزارت عظمیٰ سے قبل ون یونٹ دونوں یونٹوں کی مساوی نمائندگی کے سخت خلاف تھے مگر وزیر اعظم بن جانے کے بعد ون یونٹ اور مساوی نمائندگی کے حامی بن گئے۔ سہروردی صاحب کی وزارت عظمیٰ تیرہ ماہ تک رہی صدر سکندر مرزا جو کہ ری پبلکن پارٹی کے ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ بانیوں میں شمار ہوتے تھے ان کے اشارے پر ری پبلکن پارٹی نے عوامی لیگ کی حمایت ترک کر دی اور سہروردی صاحب کی وزارت ختم ہو گئی اور تھوڑا عرصہ بعد مشرقی پاکستان کی حکومت بھی عوامی لیگ سے چلی گئی اور مشرقی پاکستان کی حکومت کرشک سرامک پارٹی کی قیادت میں ابو حسن سرکاری نے بنا لی تھی اور عوامی لیگ پھر حزب اختلاف میں چلی گئی۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مغربی پاکستان کی فوج اور حکمرانوں نے کبھی بھی مشرقی پاکستان کے لوگوں کو لیڈروں کو برابری کا درجہ نہیں دیا۔ اور مشرقی پاکستان کے لوگ یہ محسوس کرنے لگ گئے کہ وہ انگریز کی غلامی سے نکل کر مغربی پاکستان کی فوج کی غلامی میں آ گئے ہیں اس غلامی سے نجات حاصل کرنے کی خواہشات لوگوں کے ذہنوں میں پروان چڑھنا شروع ہو گئیں۔ اور اکتوبر 1958ء میں پاکستان پر ایک فوجی انقلاب جنرل ایوب کی زیر قیادت مسلط کر دیا گیا جس نے مشرقی پاکستان کے لوگوں پر احساس محرومی کو اور زیادہ گہرا کر دیا۔

جنرل ایوب کی فوجی حکومت اور مارشل لاء

اکتوبر 1958ء میں جنرل ایوب نے صدر سکندر مرزا کے حکم سے ملک میں سول حکومت ختم کرکے فوجی حکومت قائم کر دی۔ 1956ء کا آئین منسوخ کر دیا۔ مارشل لاء نافذ کر دیا گیا تمام سیاسی جماعتوں کو خلاف قانون قرار دیا گیا اور بہت سارے سیاسی لیڈروں بشمول مسٹر سہروردی اور عوامی لیگ و دیگر لیڈروں کے ایبڈو قانون کے تحت 6 سال کے لئے سیاست کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ چند ایک سیاست دانوں کے جن میں سہروردی بھی شامل تھے ا۔بڈو قانون کو چیلنج کیا باقی سب سیاست دان چپ چاپ سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔ سہروردی صاحب نے ا۔بڈو قانون کو چیلنج کیا عدالت کی طرف رجوع کیا اور متعلقہ عدالت میں بیان دیا کہ جو مجھ پر الزام لگائے گئے ہیں وہ سب غلط ہیں بے بنیاد ہیں صرف ایک الزام ہے جو مجھ پر نہیں لگایا گیا میں اس کا سزاوار ہوں وہ الزام یہ ہے کہ میں نے اپنی وزارت عظمیٰ کے وقت جنرل ایوب کی مدت ملازمت میں توسیع کیوں کی تھی۔ 1962ء میں جنرل ایوب نے اپنا ایک آئین نافذ کیا جس میں تمام اختیارات کا مرکز ہی جنرل ایوب کی ذات تھی اور سیاسی پارٹیوں پر سے پابندی ختم کر دی۔ عوامی لیگ نے 1962ء کا آئین نافذ ہونے کے بعد جو سیاسی حقوق جماعت سازی وغیرہ کے ملے تھے اس کے متعلق یہ موقف اختیار کیا کہ جب تک مکمل جمہوریت بحال نہ ہو جائے اس وقت تک سیاسی پارٹیاں بحال نہیں کرنی چاہئیں۔ بلکہ تمام سیاسی پارٹیوں کو مل کر مکمل جمہوریت بحالی کی جدوجہد کرنی چاہئے۔ عوامی لیگ کی اپیل کو صرف نیشنل عوامی پارٹی نے اپنایا اور وہ ہی اس وقت جمہوریت بحالی کی جدوجہد میں عوامی لیگ کے معاون بنے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے پاکستان میں رائے عامہ کو بیدار کرنے جلسوں وغیرہ کا پروگرام بنایا گیا سب سے پہلا جلسہ مغربی پاکستان میں بحالی جمہوریت کے لئے عوامی لیگ اور نیشنل پارٹی کے اشتراک سے گوجرانوالہ میں 20 ستمبر 1962ء کو شیرانوالہ باغ میں منعقد ہوا اس جلسہ میں عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی کے چیدہ چیدہ لیڈروں نے جمع ہونا تھا رات کو شیرانوالہ باغ میں جلسہ ہونا تھا دن کو لیڈروں نے اور کئی پروگراموں میں شامل ہونا تھا صبح دس بجے بذریعہ ریل گاڑی لاہور سے دونوں جماعتوں کے لیڈروں بشمول سہروردی صاحب کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچنے پر حکومتی غنڈوں نے پولیس کی زیر قیادت ہنگامہ شروع کر دیا سہروردی پر پستول کا فائر کیا گیا جو مس ہو گیا عوامی لیگ کے ایک ورکر چراغدین کی ران پر لگا اور ریلوے اسٹیشن سے ہی پولیس کی زیر قیادت غنڈہ گردی شروع کر دی گئی تھی بڑی مشکل کے ساتھ سہروردی صاحب کو ایک کار میں بیٹھا کر سیٹلائٹ ٹاؤن میں خواجہ صدیق الحسن کے مکان پر پہنچا دیا گیا باقی لیڈران کو بھی بڑی مشکل سے غنڈوں کی دست برد سے نکالا گیا اور خواجہ صدیق الحسن کی کوٹھی پر پہنچایا گیا پولیس کی قیادت میں غنڈوں کی ایک بہت بڑی ٹولی خواجہ صاحب کی کوٹھی پر بھی پہنچ گئی کوٹھی پر پتھراؤ کیا جس سے کوٹھی کے شیشے بھی ٹوٹ

گئے اندر کوٹھی میں سہروردی صاحب شیخ مجیب الرحمان صاحب میاں محمود علی قصوری اور دیگر بہت سارے لیڈران اور کارکنان بھی تشریف فرما تھے اس موقع پر شیخ مجیب الرحمان نے سہروردی صاحب سے کہا کہ بابا چھوڑ مغربی پاکستان کو تو مجھے اجازت دے میں ڈھاکہ پلٹن میدان میں اس غنڈہ گردی کا جواب دوں۔ سہروردی صاحب شیخ مجیب الرحمان کو بہت خفا ہوئے اس جلسہ کو ناکام بنا دیا گیا پولیس کی زیر نگرانی جلسہ گاہ کو تباہ کر دیا گیا تھا۔ تمام بلب ٹیوب لائٹیں شامیانے قناتیں تباہ کر دی گئی تھیں۔ منتظمین جلسہ کو اس زمانے میں بیس ہزار روپے نقصان کا ادا کرنا پڑا تھا۔ منتظمین پر کئی مقدمات بنا دیئے گئے۔ راقم الحروف پر بھی مقدمہ قائم کیا گیا دو سال تک مقدمہ کے جھنجھٹ میں پڑا رہا۔

عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی نے جمہوریت کی بحالی کے لئے پھر کوئی جلسہ مغربی پاکستان میں 1965ء تک نہیں کیا۔

پھر ایک روز 1964ء میں پاکستان اخبارات میں شہ سرخی کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی کہ بیروت کے ایک ہوٹل میں سہروردی ٹھہرے ہوئے تھے اسی ہوٹل میں سہروردی اپنے کمرہ میں پراسرار حالت میں مردہ پائے گئے۔ ان کی موت پر جو تبصرے ہوئے ان میں ان کی موت کو غیر طبعی موت قرار دیا گیا تھا۔ بعد میں حالات نے یہ ثابت کیا کہ سہروردی اس وقت واحد ایسے لیڈر تھے جن کا سیاسی قد کاٹھ اس وقت کے سیاسی لیڈروں میں سب سے اونچا تھا اور جنرل ایوب ان سے خائف بھی تھے اور انہیں اپنے راستے سے ہٹانا بھی چاہتے تھے۔ اور باقاعدہ منظم طریقے پر ان کی زندگی کا بیروت میں رہنے کا محاسبہ کیا گیا اور نہایت خفیہ طریقہ پر انہیں زہر دے کرہلاک کیا گیا تھا اس قتل کی سازش میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کی ذات پر بھی شبہ کیا جاتا ہے۔ بھٹو اس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ تھے اور جنرل ایوب کے بیٹے بھی بنے ہوئے تھے اور وہ سہروردی صاحب کی وفات کے وقت بیروت میں ہی موجود تھے۔

سہروردی صاحب کے بعد کی عوامی لیگ

جناب سہروردی صاحب کی وفات کے بعد عوامی لیگ عملی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی ایسا ہوا کہ عوامی لیگ کا ایک اجلاس جناب سہروردی کی وفات کے بعد لاہور میں منعقد ہوا جس میں مشرقی پاکستان سے شیخ مجیب الرحمان اور ان کے ساتھی بھی شریک ہوئے اس اجلاس میں شیخ صاحب نے 6 نکات پیش کئے ان چھ نکات میں مغربی پاکستان کی فوجی حکمرانوں اور سول بیورو کریٹ حکمرانوں سے مکمل نجات کا فارمولہ پیش کیا گیا۔ چھ نکات کے تحت پاکستان تو ایک رہ جاتا مگر مغربی پاکستان کے حکمرانوں کی بالادستی ختم ہو جاتی تھی اس اجلاس میں مغربی پاکستان عوامی لیگ کے گروہ کی قیادت نواب زادہ نصر اللہ خان کے پاس چلی گئی اور مشرقی پاکستان کے قائد شیخ

مجیب الرحمان صاحب بن گئے ان دونوں عوامی لیگ کا آپس میں رابطہ بھی بہت ہی کم تھا۔

1965ء میں جب جنرل ایوب خان آئندہ پانچ سالوں کے لئے صدارت کے امیدوار بنے تو ان کے خلاف پانچ جماعتوں کا متحدہ محاذ بنایا گیا ان پانچ جماعتوں میں عوامی لیگ نیشنل عوامی پارٹی کرشک سرامک پارٹی جماعت اسلامی کونسل مسلم لیگ شامل تھیں اور ان پانچ سیاسی جماعتوں نے صدر ایوب کے مقابلہ میں مشترکہ امیدوار مس فاطمہ جناح کو کھڑا کیا تھا الیکشن کے نتیجے میں مس فاطمہ جناح ہار گئی اور آئندہ پانچ سال کے لئے جنرل ایوب دوبارہ صدر منتخب ہو گئے۔ گوجرانوالہ کے مندرجہ بالا جلسہ کے بعد سہروردی صاحب کے فوت ہونے کے بعد بنگالی لیڈروں نے پاکستان کو متحد رکھنے کے بارے سوچنا ھی چھوڑ دیا تھا۔ اور مغربی پاکستان کے فوجی اور سول لیڈروں کے اس خیال نے تقویت پکڑ لی کہ اگر بنگالی درجہ دوم کے □ شہری بن کر رہ سکتے ہیں تو پاکستان متحدہ رہ سکتا ہے ورنہ پاکستان متحد رکھنے کی ضرورت نہیں۔ پھر بھارت کے ساتھ 1965ء کی جنگ نے اس خیال کو مزید تقویت دی یہ جنگ بھارت اور پاکستان کے درمیان تھی اور مغربی پاکستان کی سرحدات پر ہی لڑی گئی تھی اگر بھارت مشرقی پاکستان پر حملہ آور ہو جاتا تو وہاں پر بچاؤ کی کوئی سبیل نہ تھی برائے نام فوجی قوت وہاں تھی اور ایک مزید سوال مشرقی پاکستان کے لوگوں کے ذہنوں میں ابھرا کہ اگر بھارت واقعی مشرقی حصہ پر حملہ آور ہو ہی جاتا تو بچاؤ کی کیا صورت تھی اس پر مغربی پاکستان کے لیڈروں نے کہا کہ مشرقی پاکستان کے دفاع کی ذمہ داری حکومت چین نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی پھر مزید باتیں منظر عام پر آئیں کہ اگر کسی دیگر ملک نے ہی ہماری حفاظت کرنی ہے تو مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے کا کیا فائدہ پھر ایک دفعہ شیخ مجیب الرحمان نے یہ بھی کہا تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے ساتھ تعلق صرف پی آئی اے ہے باقی ہر تعلق ثانوی ہے صدر ایوب کے دور حکومت میں ہی شیخ مجیب الرحمان اور عوامی لیگ کے دیگر لیڈروں پر اگر تلہ سازش کیس بنا شیخ صاحب اور دیگر لوگ گرفتار کر لئے گئے انکوائری کے لئے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان کا ٹریبونل قائم کیا گیا تفتیش کی گئی ابھی ٹریبونل کی کارروائی جاری تھی کہ ایک ہجوم عدالت پر حملہ آور ہوا جج صاحبان نے بھاگ کر جان بچائی۔ مغربی پاکستان کے ایک جج ایس اے رحمان سیدھے واپس اپنے گھر لاہور پہنچے اور پھر واپس گئے ہی نہیں۔ ایوب کے دور حکومت میں ہی شیخ مجیب الرحمان پر اگر تلہ کیس واپس لے لیا گیا تھا اور جیل سے بھی رہا کر دیا گیا تھا اور وہ آل پارٹیز گول میز کانفرنس میں شریک بھی ہوئے تھے۔ اس وقت عوامی لیگ کی پوزیشن یہ تھی کہ مغربی پاکستان عوامی لیگ کے لیڈر نواب زادہ نصر اللہ خان تھے ان کا تعلق ذہنی طور پر تنظیمی طور پر مشرقی پاکستان عوامی لیگ سے کٹ چکا تھا۔ شیخ مجیب الرحمان کی ہر بات کی مغربی پاکستان عوامی لیگ مخالفت کرتی تھی۔ یحییٰ خان کے دور حکومت میں 1970ء میں جب پاکستان میں انتخابات ہوئے تو مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے انتخابات اکثریت سے جیت لئے۔ مرکزی کی تین سو سیٹوں میں 158 سیٹیں عوامی لیگ نے جیتی تھیں مسلم لیگ کے جناب نور الامین

ایک سیٹ پر اور ایک سیٹ پر راجہ تیری دیو رائے کامیاب ہوئے۔ ان الیکشنوں میں عوامی لیگ نے انتخابات بھی 98 فیصد ووٹوں سے جیتے تھے۔ عوامی لیگ نے 6 نکات کے نعرے پر الیکشن جیتے تھے جس کا مطلب مشرقی پاکستان پر مغربی پاکستان کی فوج کی بالادستی ختم کرنا اور اختیارات کا مرکز مشرقی پاکستان بنانا تھا جسے فوج نے نہیں مانا اور مغربی پاکستان میں جیتنے والی سیاسی جماعت پیپلز پارٹی نے نہیں مانا تھا۔ جب انتخابات کے بعد پاکستان کی مرکزی اسمبلی کا اجلاس ڈھاکہ میں بلایا گیا تو پیپلز پارٹی نے ڈھاکہ اجلاس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اور مسٹر بھٹو صاحب نے کہا کہ جو شخص ڈھاکہ سیشن میں جائے گا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ پیپلز پارٹی نے ڈھاکہ سیشن کا بائیکاٹ کیا۔ مغربی پاکستان کی چھوٹی جماعتوں کے لیڈر مفتی محمود احمد اور ولی خان ڈھاکہ گئے تھے مگر اسمبلی سیشن کے ایک روز قبل ڈھاکہ اسمبلی سیشن ملتوی کر دیا گیا صدر پاکستان جنرل یحییٰ خان بھی ڈھاکہ پہنچ چکے تھے۔ شیخ مجیب الرحمان سے حکومتی لوگوں کی بات چیت ہوئی مسٹر بھٹو بھی ڈھاکہ میں ہی تھے مشرقی پاکستان میں کاروبار زندگی معطل ہو چکا تھا۔ دفاتر بند تھے' بازار دکانیں بند تھیں ولی خان اور مفتی صاحبان بھی شیخ مجیب الرحمان سے ملے انہیں کہا کہ ہم پاکستان بنانے کے خلاف تھے آپ پاکستان بنانے والے تھے اب اگر پاکستان بن گیا ہے تو اسے توڑیں نہیں اس پر شیخ مجیب الرحمان نے جواب دیا کہ مفتی محمود خان صاحب میں کب پاکستان توڑ رہا ہوں میں صرف یہ کہتا ہوں کہ الیکشن ہو گئے ہیں ہم اکثریت میں ہیں ہمیں حکومت دیں اگر ہماری اکثریت میں شک ہے تو اسمبلی کا اجلاس بلا کر فیصلہ کرا لیا جائے پاکستان تو وہ توڑ رہے ہیں جو اکثریت کے فیصلے کو مانتے نہیں۔ جو فوجی طاقت کے بل بوتے پر ملک پاکستان پر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔

آخر حکومت پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کی بات چیت ناکام ہوئی شیخ مجیب الرحمان صاحب کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان لے آیا گیا اور صدر یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان کو فوج کے حوالے کر دیا فوجی کارروائی کی وجہ سے پہلے ہزاروں اور پھر لاکھوں لوگ قتل ہوئے ایک کروڑ کے قریب لوگ بھاگ کر بھارت میں داخل ہو گئے وہاں پر عوامی لیگ کے دیگر لیڈروں نے بنگلہ دیش کی عارضی حکومت قائم کر لی اور ایک رضا کار فوج مکتی باہنی کے نام پر قائم کر لی۔ بنگلہ دیش کی عارضی حکومت کے صدر جناب تاجدین بنائے گئے اور رضا کار فوج مکتی باہنی کے ذریعے چھاپہ مار جنگ شروع کر دی گئی اس جنگ میں مشرقی پاکستان کی تمام طاقتوں نے عوامی لیگ اور بنگلہ دیش کی آزادی کا ساتھ دیا۔ جبکہ مشرقی پاکستان کی جماعت اسلامی نے اپنی ذیلی تنظیموں الشمس البدر کے ساتھ حکومت پاکستان کی فوج کا ساتھ دیا۔ یہ جنگ تقریبا نو ماہ تک جاری رہی بلا آخر ہندوستان بھی اس جنگ میں شامل ہو گیا 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان کو شکست ہوئی مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور عوامی لیگ کی حکومت بنگلہ دیش پر بن گئی اور حکومت پاکستان نے بعد میں شیخ مجیب الرحمان کو بھی رہا کر دیا انہیں بذریعہ ہوائی جہاز لنڈن پہنچا دیا گیا اور شیخ صاحب لنڈن سے بنگلہ دیش پہنچ گئے اور بنگلہ دیش کے پہلے عارضی صدر تاجدین صاحب تھے شیخ صاحب

کے بنگلہ دیش پہنچنے پر انہیں مستقل صدر بنگلہ دیش بنا دیا گیا۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد مغربی پاکستان میں عوامی لیگ بالکل ہی ختم ہو گئی۔

مولانا عبدالحمید بھاشانی

پاکستان مسلم لیگ

پاکستان بن جانے کے بعد مسلم لیگ کی تنظیم نو کی ضرورت محسوس کی گئی قائد اعظم محمد علی جناحؒ جو مسلم لیگ کے سب کچھ تھے وہ گورنر جنرل پاکستان کے عہدے پر فائز ہو گئے صدر مملکت کے برابر یہ عہدہ تھا بظاہر وہ آئینی سربراہ ہی تھے مگر عملی طور پر وہ مسلم لیگ پر اور دیگر مملکت کے تمام اختیارات پر حاوی تھے۔ انہی دنوں جب کراچی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو اس میں مسلم لیگ کے لئے جناب سہروردی نے ہمہ گیر تنظیم بنانے کی تجویز پیش کی اس لئے کہ ہندوستان تقسیم ہو چکا ہے اور اب جو بھی لوگ پاکستان میں رہتے ہیں وہ کسی بھی عقیدہ یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں انہیں مسلم لیگ میں شامل کرنے کی پالیسی بنائی جائے۔ مگر قائد اعظم نے جواب دیا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ابھی مسلم لیگ صرف مسلمانوں کی جماعت ہی رہے گی - مارچ 1948ء میں قائد اعظم نے مشرقی بنگال کے ایک ہفتہ کا دورہ کیا اس میں مختلف جگہوں پر لوگوں کو خطاب بھی کیا - ڈھاکہ میں انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ پاکستان میں بنگالی بھی بہت سارے علاقے میں بولی جاتی ہے یہ بنگال کی زبان تو ہو سکتی ہی مگر سارے پاکستان کی سرکاری زبان صرف اردو ہی ہو گی قائد اعظم کی اس تقریر پر بنگالیوں پر اچھے اثرات پیدا نہیں کئے۔ انہی ایام میں دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا اس میں سرحد کے خدائی خدمت گار لیڈر خان عبدالغفار خان بھی شریک ہوئے تھے وہ دستور ساز اسمبلی کے ممبر بھی تھے انہوں نے اسمبلی میں پاکستان کی وفاداری کا حلف بھی اٹھایا تھا۔ ان کی دعوت پر قائد اعظم پشاور گئے تھے عبدالغفار خان نے ان کے استقبال کے لئے بڑا انتظام کیا ہوا تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس میں دونوں راہنماؤں کی بات چیت ہوئی بادشاہ خان نے انہیں خدائی خدمت گاروں کے مرکزی سرور یاب میں تشریف لانے کی دعوت دی اور انہیں سلامی دینے کے لئے سرخ پوش رضا کار بھی وہاں پر کافی جمع تھے - مگر قائد اعظم نے خان عبدالغفار خان سے صرف ایک ہی مطالبہ کیا تھا کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں جسے خان عبدالغفار خان نے نہیں مانا اور پھر سرحد کی حکومت نے ان پر عتاب نازل کر دیئے جو ایک بہت رنجیدہ داستان ہے۔

مسلم لیگ کو حکمرانی مل جانے کی وجہ سے نئے نئے مسئلے بھی پیدا ہوئے محروم اقتدار لوگ رنجیدہ بھی ہوئے اقتدار مل جانے کی وجہ سے بدعنوانی کے دروازے بھی کھل گئے۔ اور یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ مسلم لیگ کے علاوہ پاکستان سے قبل کی جماعتوں کو ان کے کارکنوں کو دوسرے درجے کا شہری بنا دیا گیا تھا ہر جلسہ میں اخبارات میں انہیں مطعون کیا جاتا تھا اور آج تک 50 سال گزر جانے کے بعد بھی یہ عمل جاری ہے۔ اس طرح سندھ کی مسلم لیگی حکومت میں بھی انتشار تھا قائد اعظم کے حکم سے مسٹر کھوڑو کو وزارت اعلیٰ سے ہٹا دیا گیا - پنجاب میں بھی وزارتی کشمکش زوروں پر تھی قائد اعظم کی مداخلت کے باوجود بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہوا۔

آخر میاں ممتاز دولتانہ سردار شوکت حیات نواب ممدوٹ کابینہ سے الگ ہو گئے میاں افتخار الدین پہلے ہی کابینہ سے الگ ہو چکے تھے یہ جو کچھ اکھاڑ پچھاڑ تھی یہ مسلم لیگ کے اندرونی انتشار کی وجہ سے تھی اس زمانے میں آل انڈیا مسلم لیگ ختم ہو چکی تھی مگر پاکستان مسلم لیگ ابھی ابتدائی تنظیمی مراحل سے گزر رہی تھی۔ اس زمانے میں پاکستان کا دارالحکومت کراچی تھا۔ کھوڑو کی وزارت ختم ہو چکی تھی مگر کراچی کے متعلق یہ تجویز منظر عام پر آ رہی تھی کہ کراچی کو صوبہ سندھ سے الگ کر کے وفاقی حکومت کے تحت کیا جائے جیسے دہلی پنجاب میں ہونے کے باوجود مرکزی حکومت کے کنٹرول میں ہے اس طرح کراچی کے متعلق بھی یہ کہا جانے لگ گیا کھوڑو چونکہ وزارت سے ہٹ چکے تھے اس لئے انہوں نے اس وقت کراچی کو مرکزی حکومت میں دینے کی مخالفت کی۔ دوسرا انہوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ سندھ میں مہاجرین کو زیادہ آباد نہ کیا جائے اس آباد کاری کی وجہ سے سندھ پر غیر سندھیوں کی اکثریت کا خطرہ پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے مسٹر کھوڑو نے سندھ مسلم لیگ سے کراچی کی علیحدگی کے خلاف قرار داد بھی منظور کرائی تھی۔ مگر چونکہ مسلم لیگ کے چیف آرگنائزر چودھری خلیق الزمان مقرر تھے۔ وہ ابھی تک مسلم لیگ کی تنظیم نو نہیں کر سکے تھے۔ اس لئے جہاں بھی مسلم لیگ کے لیڈر ورکر وغیرہ تھے وہ ان حالات میں اپنے آپ کو خود مختار سمجھتے تھے مسلم لیگ کی تنظیم نو میں کچھ دشواریاں اس وجہ سے بھی تھیں کہ پاکستان پنجاب سرحد سے غیر مسلم لٹ کر کٹ کر بھارت جا رہے تھے وہاں سے مسلمان لٹ کر کٹ کر پاکستان آ رہے تھے اس وجہ سے آنے والوں کی آباد کاری کا مسئلہ بھی بڑا اہم تھا زیادہ توجہ ان حالات کی طرف تھی اس وجہ سے مسلم لیگ کی تنظیم نو میں تیزی نہ ہو سکی دیگر ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ قائد اعظم کی زندگی میں مسلم لیگ کی تنظیم نو پر قائد اعظم کا اثر انداز ہونا یقینی امر تھا اس لئے چیف آرگنائزر نے شاید زیادہ عجلت اس وجہ سے بھی نہیں دیکھائی کہ مسلم لیگ کو جلدی منظم نہ کریں۔ قائد اعظم 11 ستمبر 1948ء کو اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔ ان کے وصال کے بعد مسلم لیگ کے چیف آرگنائزر چودھری خلیق الزمان صاحب نے شاید اپنے آپ کو زیادہ بااختیار محسوس کیا تو وہ اب تیزی سے مسلم لیگ کی تنظیم نو کرنے لگ گئے۔ قائد اعظم کے بعد دوسری ہمہ گیر شخصیت خان لیاقت علی خان کی تھی مگر ان کی شخصیت میں وہ رعب داب نہ تھا جو قائد اعظم کی شخصیت میں تھا اس وجہ سے مسلم لیگ کی تنظیم نو میں مسلم لیگ کے چیف آرگنائزر نے اپنے آپ کو بااختیار محسوس کرنا شروع کر دیا اور بلا آخر انہوں نے اپنی مرضی کی مسلم لیگ منظم کر لی اور خود ہی مسلم لیگ پاکستان کے صدر بھی بن گئے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان کو یہ مسلم لیگ والی تنظیم نو کچھ اچھی نہ لگی اور انہوں نے خود مسلم لیگ کی صدارت کے حصول کی جدوجہد شروع کر دی اور 1950ء میں مسلم لیگ کے دستور میں یہ ترمیم کرائی کہ کوئی شخص حکمران ہوتے ہوئے وزیر ہوتے ہوئے مسلم لیگ کا عہدہ دار بھی بن سکتا ہے اس دستوری ترمیم کے بعد لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان مسلم لیگ پاکستان کے صدر بھی

بن گئے اور اب پاکستان کے مختار کل تھے ان کی مرضی ہی ہر معاملہ میں چلتی تھی اور ساتھ ہی مسلم لیگ میں اور وزارتوں میں افسر شاہی کو بھی شامل کیا جانے لگ گیا اور ملک غلام محمد پاکستان کے وزیر خزانہ بنے اور کئی دوسرے افسر بھی مرکزی اور صوبائی وزارتوں میں شامل ہونا شروع ہو گئے مسلم لیگ کا بحیثیت جماعت کے حکمرانوں پر افسران پر کوئی اثر نہ تھا مسلم لیگ کی حیثیت ایک لیبل کی تھی جس افسر کا جس طاقت ور جاگیردار کا بس چلتا وہ مسلم لیگ کا لیبل لگا لیتا تھا۔ 1950ء میں مغربی پاکستان کی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ انتخابی مہم پر گوجرانوالہ میں وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان بھی آئے تھے شیرانوالہ باغ میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا لوگوں نے شکایت کی رشوت بہت زیادہ ہو گئی ہے انگریز کے دور حکومت میں اتنی رشوت نہ تھی اس پر لیاقت علی خان نے جواب دیا کہ رشوت لینے والے آپ کے مسلمان بھائی ہیں کوئی ہندو سکھ تو نہیں - قائد اعظم کے وصال کے تھوڑے عرصہ بعد ہی نواب ممدوٹ وزارت پنجاب میں ختم کر دی گی تھی۔ میاں ممتاز دولتانہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کے حامی بن چکے تھے اور بالا آخر نواب ممدوٹ نے مسلم لیگ بھی چھوڑ دی اور اپنی الگ پارٹی جناح مسلم لیگ بنا لی اور پھر بعد میں جناح مسلم لیگ کو سہروردی کی عوامی لیگ میں شامل کر دیا تھا۔ 1951ء کے انتخابات میں جو مغربی پنجاب میں ہوئے اور پھر بعد میں صوبہ سرحد میں بھی ہوئے۔ مسلم لیگ کے مقابلہ میں عوامی لیگ کے امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ ان الیکشنوں میں مسلم لیگ نے افسران کے ساتھ مل کر الیکشن جیتنے کا ہر حربہ استعمال کیا پنجاب میں چند ممبران نواب ممدوٹ کے حامی عوامی لیگ کے کامیاب ہوئے مگر بعد میں جب نواب ممدوٹ سیاست میں غیر متحرک ہو گئے یہ لوگ پھر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے سرحد میں مخالف ممبران کامیاب ہی نہیں ہونے دیا گیا تھا وہاں پر صوبہ کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان تھے وہ مقبول عام بھی نہ تھے مگر انہوں نے الیکشن جیتنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا مگر کسی مخالف کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ سندھ میں مسلم لیگ کے علاوہ چند وڈیروں کا گٹھ جوڑ بھی تھا جس کے سربراہ جی ایم سید تھے۔ اسی گروپ کا نام سندھ عوامی محاذ تھا جی ایم سید پیر الٰہی بخش غلام مصطفیٰ بھرگری بھی شامل تھے۔ انتخابات جیت لینے کے بعد خان لیاقت علی خان پورے پاکستان کے سیاہ سفید کے مالک بن گئے۔ ان کی شخصیت مسلمہ ہو گئی اب کوئی طاقت اور گروہ نہیں تھا جو مسلم لیگ اور لیاقت علی خان کی ہمسری کا دم بھر سکے صوبوں میں حکومتیں ٹھیک طریقہ پر چل رہی تھیں۔ پنجاب میں ممتاز دولتانہ وزیر اعلیٰ تھے سرحد میں خان عبدالقیوم خان کی حکمرانی تھی سندھ میں بھی مسلم لیگی حکومت تھی مشرقی بنگال میں مسلم لیگ کی سابقہ حکومت جناب نور الامین صاحب کی تھی اور مرکز میں خان لیاقت علی خان کی مضبوط حکومت تھی۔ 1951ء کی ایک شام ریڈیو پر یہ خبر نشر ہوئی کہ پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت عی خان کو راولپنڈی کمپنی باغ میں جلسہ کو خطاب کرنے لگے ہی تھے کہ گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ گولی مارنے والا سید اکبر نامی کوئی قبائلی نوجوان تھا۔ جب لیاقت علی خان تقریر کرنے کے لئے مائیک پر تشریف لائے انہوں نے

خواجہ ناظم الدین

ابھی دو لفظ ہی کہے تھے کہ پبلک میں سامنے بیٹھے ہوئے سید اکبر نے پستول سے فائر کر کے لیاقت علی خان کو قتل کر دیا تھا موقع پر ہی پولیس کی گولی سے سید اکبر بھی قتل ہو گیا تھا۔ جناب لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان صدر پاکستان مسلم لیگ کی میت کو کراچی لایا گیا اور انہیں قائد اعظم کے مزار کے احاطہ میں ہی سپرد خاک کر دیا گیا۔

صدر مسلم لیگ خواجہ ناظم الدین کی حکومت

جناب لیاقت علی خان کی وفات کے بعد سیاست کا ایک نیا دور شروع ہو گیا پاکستان میں قائد اعظم اور لیاقت علی خان جیسے قدر آور شخصیت نہ رہی تھی اس وجہ سے سازشوں کا ایک جال بچھنا شروع ہو گیا۔ قائد اعظم کی وفات کے بعد گورنر جنرل کے عہدہ پر خواجہ ناظم الدین متمکن ہوئے۔ مگر لیاقت علی خان کی وفات کے بعد خواجہ ناظم الدین نے گورنر جنرل کے عہدے کو بے وقت سمجھتے ہوئے چھوڑ دیا اور خود پاکستان کے وزیر اعظم بن گئے تمام انتظامی اختیارات ہی وزیر اعظم کے پاس تھے خواجہ صاحب کو اس میں کشش نظر آئی اور گورنر جنرل کا عہدہ چھوڑ دیا اور اپنی جگہ کابینہ کے ایک وزیر سابق سرکاری افسر ملک غلام محمد کو گورنر جنرل بنا دیا اور شاید انہوں نے محسوس کیا کہ ملک غلام محمد ان کا تابع دار ہی رہے گا اس لئے کہ پاکستان کی ساری حاکمیت عملی طور پر ان کے پاس ہی رہے گی۔ مگر خواجہ صاحب کے خلاف بہت جلد سازشوں کے جال بچھانا شروع ہو گیا سب سے پہلے مشرقی پاکستان میں زبان کے مسئلہ پر انہیں مشکلات پیش آئیں۔ قائد اعظم نے 1948ء میں کہا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اور دو ہو گی اس زبان کے مسئلہ پر مشرقی بنگال میں اضطراب پیدا ہو گیا جو بنگال گیر تحریک کی شکل اختیار کر گیا جلسے جلوس بھی ہوئے۔ ڈھاکہ میں زبان کے مسئلہ پر ایک جلوس پر حکومت نے گولی چلا دی جس سے چھ طالب علم شہید اور کئی زخمی ہو گئے اس جگہ کو بنگال کے لوگوں نے یادگار بنا لیا اور یہ ایک مستقل تحریک زبان کی مسئلہ پر جاری ہو گئی۔

خواجہ صاحب صاف دل شریف النفس پابند صوم صلوات تھے وہ سمجھتے تھے جیسا میں ہوں دیگر لوگ بھی ویسے ہی ہوں گے اور وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ جیسے وہ پارلیمنٹ اور وزیر اعظم لیاقت علی خان کے تابع فرمان گورنر جنرل تھے ویسے ہی ملک غلام محمد بھی ہوں گے مگر ایسا نہ ہوا بہت جلد ملک صاحب نے ملک کے اصل حاکموں سے رابطے بڑھا لئے۔ فوجی جرنیلوں محکموں کے سیکرٹری صاحبان سے برائے راست رابطہ پیدا کر لیا سازشوں کا جال بچھانا شروع ہو گیا لیاقت علی خان امریکہ کا دورہ کرنے کے بعد امریکہ کے ساتھ نئے بین الاقوامی حالات کے مطابق تعلقات استوار کرنے پر غور کر رہے تھے جبکہ خواجہ صاحب ابھی برطانیہ کی طرف ہی ہاتھ جوڑ کر کھڑے تھے وہ بین الاقوامی تبدیلی کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ان حالات میں خفیہ ہاتھ نے اپنے

کمالات دکھانے شروع کر دیئے۔ اس وقت مصر میں برطانی فوجیں قابض تھیں مصر نے برطانیہ سے فوجیں نکالنے کا مطالبہ کیا جس کی تائید بھارت نے بھی کی مگر پاکستان کی حکومت نے مصر کے مطالبے کی تائید نہ کی اس وقت ملک کی وزارت عظمیٰ کے ساتھ مسلم لیگ کے صدر بھی خواجہ ناظم الدین ہی تھے لوگوں نے پاکستان کی اس پالیسی کو اچھا نہیں سمجھا۔ خواجہ ناظم الدین وزارت کو مشرقی بنگال میں نمک کی قلت کے اثرات کا بھی سامنا کرنا پڑا سمندری پانی سے نمک بنایا جاتا تھا جس کے لئے حکومت سے اجازت لینا ضروری تھی وہ صرف چند لوگوں کے پاس تھی۔ یہ نمک کی قلت بھی خواجہ صاحب کی حکومت کو کمزور کرنے کا سبب بنی۔ سندھ میں گندم کی قلت نے بھی خواجہ صاحب کے لئے پریشانی پیدا کر دی اور ساتھ ہی سندھ میں مسلم لیگ کی حکومت اور گورنر شیخ دین محمد کے مابین مخالفت شروع ہو گئی۔ آخر گورنر سندھ شیخ دین محمد وزیر اعظم سے ملے انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا مگر وزیر اعظم انہیں مطمئن نہ کر سکے اور گورنر سندھ مستعفی ہو گئے اس طرح کی اور کئی سازشیں تھیں جن سے انتظامی ڈھانچہ مسلم لیگ کا تنظیمی ڈھانچہ انتشار اور بددلی شکار ہو گیا تھا ان سب عوامل کے پسِ پردہ خفیہ ہاتھ کام کر رہا تھا جس کا بنیادی مقصد پاکستان کی سیاست کی سمت بدلنا تھا۔ ملک میں گندم کی قلت پیدا ہو گئی امریکہ نے اس قلت کو دور کرنے کے لئے ڈیڑھ کروڑ ڈالر کا قرض دیا ملک کی اقتصادی حالات بتدریج خراب ہو رہے تھے خواجہ صاحب میں قوت فیصلہ کی کمی کی وجہ سے حکومتی پالیسی پر سرکاری افسر حاوی ہو رہے تھے گورنر جنرل ملک غلام محمد اور بڑے افسروں کا گٹھ جوڑ خواجہ ناظم الدین کو بے بس کر رہا تھا۔

مسلم لیگ کے اندر بھی خواجہ صاحب کے خلاف سازشوں کا جال بچھایا جا رہا تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ پاکستان کے آئین کا تھا قائد اعظم کے وقت اگر اسے سلجھا لیا جاتا تو شائد احسن طریقے پر حل ہو جاتا یا پھر وزیر اعظم لیاقت علی خان کی بھی بھاری بھرکم شخصیت تھی وہ بھی شائد آئینی مسئلہ حل کر ہی لیتے مگر خواجہ صاحب کے لئے یہ بہت گھمبیر مسئلہ بن گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کے لیڈران اپنی آبادی کثرت کی وجہ سے حاکمیت میں اپنا حصہ مانگتے تھے جبکہ مغربی پاکستان کی فوج اور سول حکمران پاکستان کی حاکمیت پر قابض تھے اور وہ کسی قیمت پر بنگالیوں کا اقتدار تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے اس کے لئے کہ مختلف تجاویز منظر عام پر آئیں مگر ہر تجویز مقصد مندرجہ بالا کے گرد ہی گھومتی تھی اور آئینی بحران ختم نہیں ہو رہا تھا۔ اور سازشیں بدستور جاری تھیں اور خواجہ صاحب کی وزارت کے زمانہ میں اقتدار عملی طور پر گورنر جنرل اور ان کے ساتھی افسران کے پاس ہی تھا۔

1953ء کے شروع کراچی میں طلباء نے اپنے مطالبات کے حق میں تحریک چلائی وزیر تعلیم فضل الرحمان کے گھر پر جلوس لے کر گئے دوسرے دن بھی طلبا نے حکومت کے خلاف جلوس نکالا پولیس نے جلوس پر گولی چلا دی سات طالب علم شہید اور بہت سارے زخمی ہوئے۔ پھر اس

محمد علی بوگرہ

کے بعد مارچ میں تحریک ختم نبوت بھی خواجہ ناظم الدین کی حکومت کے خلاف ہی چلائی گئی تھی جس کا ذکر ہم نے بہت طوالت سے دوسرے باب میں کیا ہے۔ خواجہ ناظم الدین کی حکومت بنیادیں ہلا دینے میں یہ تحریک بھی بہت معاون ثابت ہوئی۔ خواجہ ناظم الدین کی مرکزی حکومت کے خلاف جو کچھ بھی ہو رہا تھا یہ ان کی جماعت جس کے وہ صدر تھے مسلم لیگ کے تعاون سے ہی ہو رہا تھا اس ساری کارروائی میں مسلم لیگ بحیثیت جماعت کے کمزور ہو رہی تھی اور نوکر شاہی مضبوط ہو رہی تھی لاہور میں مارشل لاء لگ گیا تھا ملک فیروز خان نون پنجاب کے وزیر اعلیٰ بن گئے تھے اب نوکر شاہی نے خواجہ صاحب کی وزارت کا گھیرا تنگ کر دیا تھا۔ پنجاب کی وزارت ملک فیروز خان نون کو خواجہ صاحب نے بطور خاص مشرقی بنگال کی گورنری سے ہٹا کر پنجاب کی وزارت عظمیٰ دی تھی اس طرح خواجہ صاحب نے سمجھ لیا کہ پنجاب کو انہوں نے اپنے قابو میں کر لیا ہے مگر ایک روز گورنر جنرل نے خواجہ ناظم الدین وزارت کو برطرف کر دیا پاکستان میں پہلی مرتبہ کسی گورنر جنرل نے منتخب سیاسی وزیر اعظم کو برطرف کیا تھا۔ خواجہ صاحب کو جب اپنی برطرفی کا پتہ چلا تو انہوں نے فرمایا کہ گورنر جنرل غلام محمد کا یہ اقدام غیر آئینی ہے کیونکہ ان کی سفارش پر ہی ملکہ معظمہ نے ملک غلام محمد کو گورنر جنرل بنایا تھا۔ برطانوی سفارت خانہ سے خواجہ صاحب نے رابطہ کیا مگر کورا جواب ملا گورنر جنرل غلام محمد نے فوج اور سول فورسز سے مشورہ کرکے ہی یہ قدم اٹھایا تھا اور ساتھ ہی مسلم لیگ بھی خواجہ ناظم الدین کو مسند سے ہٹانے میں گورنر جنرل اور افسران کی معاون تھی۔ اس خالص مسلم لیگی حکومت کو مسلم لیگی لیڈران کی سازش سے ہی ختم کیا گیا تھا۔

مسلم لیگ اور محمد علی بوگرا کی حکومت

17 اپریل 1953ء کو گورنر جنرل ملک غلام محمد نے ناظم الدین وزارت کو برطرف کر دیا اور ساتھ ہی اسی روز محمد علی وزارت کا اعلان کر دیا گیا۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ اب چودھری محمد علی پاکستان کے وزیر اعظم بن گئے ہیں مگر بعد میں پتہ چلا کہ یہ محمد علی بنگالی ہیں اور امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے اور وہ پارلیمنٹ کے ممبر بھی نہ تھے انہیں بطور خاص امریکہ سے منگوا کر وزیر اعظم پاکستان بنایا گیا ہے یہ چونکہ بوگرا کے رہنے والے تھے اس وجہ سے یہ محمد علی بوگرا کے نام سے مشہور ہوئے ان کی کابینہ بھی وہی خواجہ ناظم الدین والی ہی تھی صرف دو وزیر تبدیل ہو گئے تھے محمد علی بوگرا کی وزارت بنتے ہی پاکستان پر امریکہ کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہو گئے انہیں ایا میں پاکستان میں گندم کی قلت تھی امریکہ سے گندم منگوائی گئی تھی اونٹوں پر گندم لاد کر ان کے گلے میں تھنکیو امریکہ کی تختیاں لٹکائی گئی تھیں۔ جو چیز بھی امریکہ سے یا امریکہ کی معرفت کسی اور جگہ سے منگوائی جاتی تھی تو امریکہ کے شکریہ کے طور پر تشہیر خوب کی جاتی

تھی۔ محمد علی بوگرا کی وزارت بھی مسلم لیگی وزارت ہی تھی اور انہیں مسلم لیگ کا صدر بھی بنا دیا گیا اور کابینہ کے تمام وزراء بھی مسلم لیگی ہی تھے۔ محمد علی بوگرا کی وزارت پارلیمانی طریقہ پر بنائی گئی - دستور ساز اسمبلی کے ممبران بھی مسلم لیگی ہی تھے۔ مگر عملی طور پر ملک غلام محمد گورنر جنرل تمام اختیارات پر حاوی تھے۔ انہیں کے حکم سے اور مشورہ سے کابینہ مرتب کی جاتی تھی وہ ہی تمام نظام حکومت پر حاوی تھے وہ ہر وقت بااختیار فوجی و سول افسران کو اپنے زیر اثر رکھتے تھے ہر آنے والے وقت کی منصوبہ بندی انہیں کے مشورہ سے کرتے تھے۔ پارلیمنٹ کی حیثیت ایک نمائشی ادارہ کے سواء کچھ نہ ہوتی تھی۔ محمد علی بوگرا ان حالات میں گورنر جنرل سے خوف زدہ رہنے لگے وہ اپنے پیش رو خواجہ ناظم الدین کی برطرفی دیکھ چکے تھے۔ وہ اس فکر میں مبتلا ہو گئے کہ کہیں انہیں بھی خواجہ صاحب کی طرف وزارت سے برطرف ہی نہ کر دیا جائے اس فکر کے پیش نظر اس ایکٹ میں ترمیم کرنے کی کوشش کی جس کے تحت گورنر جنرل کو لامحدود اختیارات تھے بالآخر محمد علی بوگرا نے جرات کر کے پارلیمنٹ کو اعتماد میں لے کر انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ 1947ء کو دفعہ 9-10-10 ب اور 17 منسوخ کر دی جس کے تحت غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین وزارت برطرف کی تھی اس دفعہ کے منسوخ ہونے کے بعد چند روز کے لئے دونوں سربراہان مملکت کے درمیان امن اور آشتی پیدا ہوئی محمد علی بوگرا کی وزارت کچھ وقت کے لئے بچ گئی۔

مغربی پاکستان کے صوبوں میں انتخابات 1951ء میں مکمل ہو چکے تھے جبکہ مشرقی بنگال کے لوگ بھی انتخابات کا مطالبہ کر رہے تھے مشرقی بنگال کے لیڈر مولانا عبدالحمید خان بھاشانی جو اس وقت عوامی لیگی لیڈروں میں شمار ہوتے تھے ان کی ساتھ جناب سہروردی اور دیگر مشرقی بنگال کے لیڈران مغربی پاکستان کا دورہ کر کے لوگوں کو باور کراتے تھے کہ حکومت مشرقی بنگال میں الیکشن اس وجہ سے نہیں کراتی کہ وہ مسلم لیگ کو انتخابات میں شکست فاش ہو جائے گی۔ آخر سابقہ انتخابات کو نو سال گزر چکے تھے انتخابات کرانے کے مطالبات نے بھی زور پکڑ لیا - بالآخر مارچ 1954ء میں مشرقی بنگال میں الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا گیا۔ الیکشن کے نتائج جب سامنے آئے تو لوگ انگشت بدنداں رہ گئے - 310 کی مشرقی بنگال اسمبلی میں مسلم لیگ کو صرف 9 نشستیں ملیں بقیہ 301 نشستیں حزب مخالف کے متحدہ محاذ نے حاصل کیں جن میں سب سے بڑی پارٹی عوامی لیگ اور دوسری بڑی پارٹی کرشک سرامک پارٹی تھی جس کے لیڈر مولوی فضل الحق تھے۔

مسلم لیگ نے مشرقی بنگال کا یہ الیکشن جیتنے کے لئے بہت جدوجہد کی مغربی پاکستان کے مسلم لیگی لیڈر بشمول مس فاطمہ جناح کے مسلم لیگ کی حمایت میں مشرقی بنگال گئے تھے جلسے بھی کئے تھے سرکاری اثر و رسوخ بھی استعمال کیا تھا مگر مسلم لیگ کی شکست کو کوئی تدبیر نہ بچا سکی۔ متحدہ محاذ نے 21 نکات پر الیکشن لڑا تھا جس میں نمایاں نقطہ صرف ایک تھا کہ مشرقی بنگال کی مکمل اور زیادہ سے زیادہ خود مختاری تھا مشرقی بنگال کے لوگوں میں بھی یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ پختہ ہو گیا تھا کہ مغربی پاکستان کے افسران ہی انگریز کے چلے جانے کے بعد اب مشرقی بنگال پر حکمران

بن چکے ہیں اس احساس کو زائل کرنے کی کبھی بھی مغربی پاکستان کے لیڈروں افسروں فوجی جرنیلوں نے کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ یہ احساس مغربی پاکستان کے بااختیار لیڈروں افسروں جرنیلوں کی ہر حرکت سے بڑھتا ہی جا رہا تھا بلا آخر پاکستان 1971ء میں دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ مشرقی بنگال کے جب الیکشن متحدہ محاذ نے جیت لئے تو بعض مغربی پاکستان کے لوگوں کی ملکیت صنعتی اداروں میں فسادات بھی ہوئے کئی لوگ مارے بھی گئے اور لوگوں میں مغربی پاکستان کے خلاف رجحانات کو تقویت ملی۔ مشرقی بنگال کی وزارت کرشک سرامک پارٹی کے مولوی فضل الحق صاحب نے بنائی تھی تھوڑے وقت بعد ہی ان کی وزارت پر غداری کے الزامات لگا کر برطرف کر دی گئی اور صوبہ میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔

مسلم لیگ کی مخلوط حکومتیں

1956ء کا دستور

24 اکتوبر 1954ء کو گورنر جنرل ملک غلام محمد نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی توڑ دی اس حکم کے خلاف اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین خان نے عدالت کی طرف رجوع کیا ہائی کورٹ کے بعد سپریم کورٹ میں کیس گیا سپریم کورٹ نے گورنر جنرل ملک غلام محمد کے حکم کو جائز قرار دیا ساتھ ہی یہ حکم بھی جاری کر دیا کہ نئی دستور ساز اسمبلی کا چناؤ کیا جائے مگر اس دوران وزیر اعظم محمد علی بوگرا نے نئی وزارت تشکیل دے دی تھی جس میں مسلم لیگ کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی کابینہ میں لیا گیا جن میں جناب حسین شہید سہروردی ڈاکٹر خان صاحب جنرل سکندر مرزا کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان بھی شامل تھے پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد یہ پہلی وزارت تھی جس میں غیر مسلم لیگیوں کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ پہلی وزارتوں میں بھی افسران شامل ہوتے تھے مگر ان پر مسلم لیگ کا لیبل لگا دیا جاتا تھا۔ اور وہ قبول بھی کر لیا کرتے تھے مگر اس بوگرا وزارت میں ڈاکٹر خان صاحب اور مسٹر سہروردی کے علاوہ مشرقی بنگال کے کئی وزیروں نے مسلم لیگ لیبل قبول ہی نہیں کیا اس موجودہ دور میں بڑی شدت کے ساتھ دستور کی ضرورت کو محسوس کیا جانے لگا دستور کی تیاری میں سب سے بڑا جھگڑا پاکستان کے مشرقی اور مغربی علاقوں میں نمائندگی اور اختیارات کی تقسیم کا تھا حقیقت حال یہ تھی کہ آبادی 56 فیصد مشرقی پاکستان میں تھی۔ جبکہ حکمرانی پر اختیارات پر فوج پر مرکزی سرکاری ملازمتوں پر مغربی پاکستان کے لوگ قابض تھے مشرق والے اپنی آبادی اور ووٹ کے اعتبار سے حصول اختیارات کا مطالبہ کر رہے تھے مغرب والے جن اختیارات پر حکمرانی پر قابض تھے وہ دینا نہیں چاہتے تھے آخر فیصلہ یہ ہوا کہ مغربی پاکستان کے تمام صوبوں ریاستوں کو ملا کر ایک یونٹ ایک صوبہ بنا دیا جائے اور اس طرح پاکستان کے دو صوبے بن جاویں گے جن کے نام ہوں گے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان مرکز میں دونوں یونٹوں کی نمائندگی برابر ہو گی۔

اس نمائندگی کی بنیاد پر 1956ء کا آئین بنایا گیا۔ لیکن مغربی پاکستان کے ون یونٹ بنائے جانے پر مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبے جو پنجاب کے علاوہ تھے مخالف ہو گئے چھوٹے صوبوں کی مخالفت کو دور کرنے کے لئے مغربی پاکستان کا پہلا وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد کے ڈاکٹر خان صاحب کو بنانے کا اعلان کیا گیا مگر اس کے باوجود مغربی پاکستان کے ون یونٹ کی مخالفت بدستور جاری رہی۔ قبل ازیں گورنر جنرل غلام محمد نے مرکزی اسمبلی توڑ دی تھی۔ جون 1955ء کو دوبارہ دستور سازی اسمبلی تشکیل دی گئی اور اس دستور ساز اسمبلی میں پاکستان کے دونوں حصوں کی نمائندگی برابر کی تھی۔ نئی دستور ساز اسمبلی کے بن جانے کے بعد چودھری محمد علی پاکستان کے وزیر اعظم بنے یہ

بھی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے ہی مخلوط حکومت کے سربراہ بنے۔ اور انہیں ایام میں ایک اور تبدیلی بھی آئی کہ گورنر جنرل ملک غلام محمد زیادہ بیمار ہو جانے کی وجہ سے عارضی طور پر اقتدار سے الگ ہو گئے قائم مقام گورنر جنرل سکندر مرزا بنائے گئے اور جلدی مستقل طور پر صدر پاکستان سکندر مرزا ہی بنا دیئے گئے۔ اور ملک غلام محمد کی مستقل چھٹی ہو گئی۔ چودھری محمد علی نیا آئین تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ 23 مارچ 1956ء کو پاکستان کا آئین نافذ کر دیا گیا اور مغربی پاکستان کا ایک صوبہ بھی معرض وجود میں آ گیا۔ اس صوبے کے گورنر نواب مشتاق احمد گورمانی وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب بنائے گئے۔ ڈاکٹر خان صاحب مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبر بھی مسلم لیگی ممبران کے تعاون سے ہی بنے تھے اس وقت مغربی پاکستان کے سارے صوبوں میں مسلم لیگی حکومتیں ہی تھیں اور مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا لیڈر بھی انہیں بنایا گیا تھا حالانکہ وہ خود مسلم لیگی نہ تھے صوبہ مغربی پاکستان کی وزارت بہت تھوڑا وقت ہی چلی تھی کہ مسلم لیگ کا اجلاس سردار عبدالرب نشتر کی زیر صدارت ہوا جس میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے ڈاکٹر خان صاحب کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور کر دی یہ ایسی صورت حال تھی کہ حکمران جماعت سے ایک مضبوط گروہ کے لئے پریشانی پیدا ہو گئی اس وقت حکومت سکندر مرزا نواب گورمانی وغیرہ کے ہاتھ میں تھی انہیں کا گروہ مضبوط تھا مسلم لیگ کے لیڈر سردار عبدالرب نشتر کے ساتھ وابستہ لوگ کوئی زیادہ طاقت نہیں رکھتے تھے۔

ڈاکٹر خان صاحب اور نواب مشتاق احمد گورمانی نے نئے سیاسی پارٹی ری پبلکن پارٹی بنانے کا اعلان کر دیا بہت سارے مسلم لیگی ممبران اسمبلی ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے جب مسلم لیگ نے اسمبلی میں ڈاکٹر خان صاحب کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی تو اس تحریک پر دونوں پارٹیوں مسلم لیگ اور ری پبکن پارٹی کے برابر ووٹ ہوئے تو سپیکر اسمبلی نواب ممتاز قزلباش کے کاسٹنگ ووٹ پر ری پبلکن پارٹی جیت گئی اور ڈاکٹر خان کی وزارت بچ گئی۔ ڈاکٹر خان صاحب تھوڑا عرصہ مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ رہے بعد میں وہ از خود وزارت اعلیٰ مغربی پاکستان سے الگ ہو گئے ان کے جانشین سابق وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد سردار عبدالرشید بنے تھے اور مسلم لیگ بعد میں مغربی پاکستان کی حاکمیت میں مارشل لاء 1958ء تک حزب مخالف کے بنچوں پر ہی بیٹھتی رہی۔ مرکز میں مسلم لیگ کی چودھری محمد علی کی وزارت تھی اور مسلم لیگ کے صدر سردار عبدالرب نشتر تھے مگر مغربی پاکستان اسمبلی میں مسلم لیگ کی تقسیم کے بعد مرکز میں بھی مسلم لیگ تقسیم ہو گئی اور سنٹرل پارلیمنٹ کے نصف سے زائد ممبر ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے اور مرکزی میں مسلم لیگ کی چودھری محمد علی کی وزارت ختم ہو گئی۔

ستمبر 1956ء میں عوامی لیگ اور ری پبلکن پارٹی کی کولیشن حکومت جناب حسین شہید سہروردی کی زیر قیادت بنائی گئی سہروردی صاحب تقریباً ایک سال تک ملک کے وزیر اعظم رہے اس دوران مکمل طور پر مسلم لیگ حزب اختلاف میں چلی گئی مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں کے

حسین شہید سہروردی
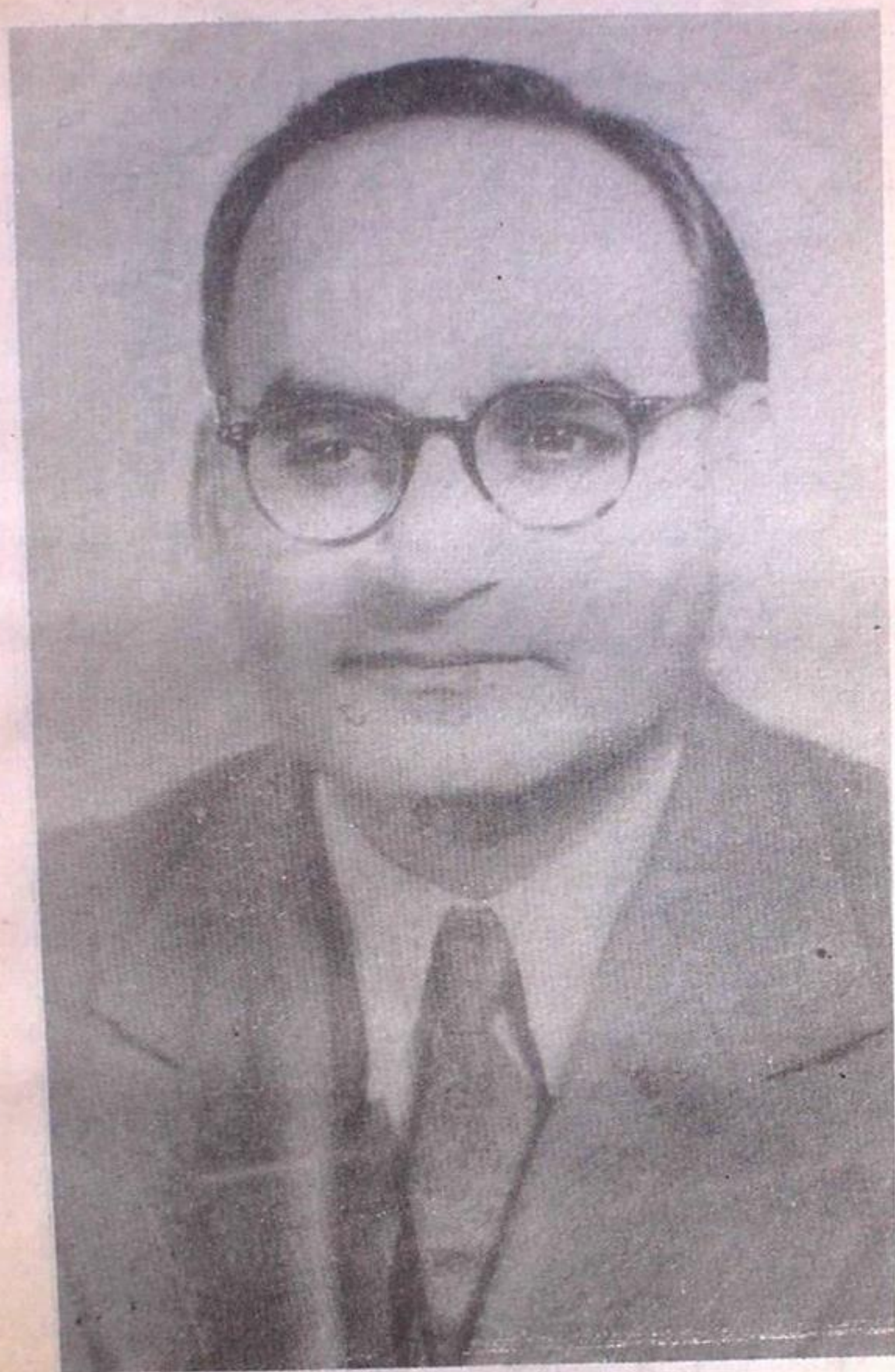
چودھری محمد علی

لوگوں اور مشرقی پاکستان کے ترقی پسند لوگوں نے ایک نئی جماعت نیشنل عوامی پارٹی بنائی تھی یہ جماعت ون یونٹ کے خلاف تھی مغربی پاکستان اسمبلی میں نیشنل عوامی پارٹی کے گیارہ ممبر تھے انہوں نے دونوں بڑی جماعتوں مسلم لیگ اور ریپبلکن پارٹی کو اعتماد میں لیتے ہوئے ون یونٹ توڑنے کی قرار داد پیش کی یہ قرار داد سندھ کے جناب جی ایم سید نے پیش کی تھی یہ قرار داد اکثریت کے ساتھ مغربی پاکستان اسمبلی نے پاس کر دی مغربی پاکستان اسمبلی کے تین سو فیصد کے ہاؤس میں صرف چار ووٹ قرار داد کے خلاف پڑے تھے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے ووٹنگ میں حصہ ہی نہیں لیا تھا جبکہ نیشنل عوامی پارٹی اور ریپبلکن پارٹی نے قرار داد کے حق میں ووٹ دیئے تھے۔ اور اس قرار داد کے پاس ہو جانے کے بعد سیاست میں غیر یقینی کے حالات پیدا ہو گئے اور مستقبل کے متعلق نئی قیاس آرائیاں ہونے لگ گئیں پاکستان مسلم لیگ عملی طور پر تقریبا ختم ہو گئی تھی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ممبران حصول وزارت کے لئے پارٹیاں تبدیل کرتے رہتے تھے کسی ممبر کا کوئی پتہ نہ ہوتا تھا صبح کو وہ مسلم لیگ کے ساتھ ہے شام کو کسی اور پارٹی میں شامل ہوتا تھا۔

1957ء میں سہروردی وزارت مرکز میں ختم ہو گئی یہ وزارت ریپبلکن پارٹی اور عوامی لیگ کی کولیشن تھی تو صدر پاکستان سکندر مرزا نے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر جناب آئی آئی چندریگر کو وزارت بنانے کی دعوت دی یہ وزارت مسلم لیگ اور کرشک سرامک پارٹی کی مخلوط حکومت تھی یہ مخلوط حکومت صرف 41 یوم تک اقتدار میں رہی اور پارلیمنٹ میں اعتماد کا ووٹ حاصل نہ کرنے کی وجہ سے مستعفی ہو گئی۔ اور اس کے بعد مرکز میں پھر عوامی لیگ اور ریپبلکن پارٹی کی مخلوط حکومت بن گئی جو مارشل لاء پر 1958 تک قائم رہی۔ ملک فیروز خان نون وزیر اعظم پاکستان بنے اور مسلم لیگ مکمل طور پر حزب اختلاف میں چلی گئی مسلم لیگ نے اس زمانے میں رابطہ عوام مہم شروع کر دی تھی اس زمانے میں مسلم لیگ کے صدر سردار عبدالرب نشتر فوت ہو چکے تھے ان کی جگہ صدر خان عبدالقیوم خان بن چکے تھے۔ آئین میں طریقہ انتخاب کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے علاوہ تمام جماعتیں جو اس وقت تھیں وہ مخلوط طریقہ انتخاب کی حامی تھیں آئندہ آنے والے انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا مگر تاریخ مقرر نہیں ہوئی تھی خیال تھا کہ 1958ء میں ہی الیکشن ہو جاویں گے۔ طریقہ انتخاب کا مسئلہ بڑے زوروں پر لوگوں میں وجہ تنازعہ بنا ہوا تھا مشرقی پاکستان اسمبلی نے مخلوط طریقہ انتخاب منظور کر لیا مغربی پاکستان اسمبلی نے جداگانہ طریقہ انتخاب منظور کیا مگر مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کہیں بھی کسی جگہ بھی مخلوط طریقہ انتخاب ماننے کو تیار نہ تھے پورے زوروں پر لوگوں میں تنازعہ انتخاب تھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ اور جماعت اسلامی پوری طاقت سے جلسے وغیرہ جداگانہ طریقہ انتخاب کے حق میں کر رہے تھے۔ اسی سلسلہ میں صدر مسلم لیگ خان عبدالقیوم خان کا جہلم سے گجرات تک 32 میل لمبا جلوس نکالا گیا تھا گوجرانوالہ میں بھی مسلم لیگ کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا تھا جس

میں سردار بہادر خان نے کہا تھا کہ جداگانہ طریقہ انتخاب نظریہ پاکستان کے عین مطابق ہے اس لئے ہم ہرگز کوئی دوسرا طریقہ انتخاب نہیں مانیں گے۔ راقم الحروف نے اس جلسہ میں پہلی بار نظریہ پاکستان کا لفظ سنا تھا انہیں ایام میں ریپبلکن پارٹی کے بانی ڈاکٹر خان صاحب کو ان کی رہائش گاہ پر قتل کر دیا گیا تھا ان کا قتل بھی سیاسی منافرت کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔

یہ دور انتہائی منافرت اور ہیجانی دور تھا اور شاید منافرت اور ہیجان کی حوصلہ افزائی کی جا رہی تھی مشرقی پاکستان اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر کو اسمبلی کے اندر ہی قتل کر دیا گیا تھا جماعت اسلامی اور مسلم لیگ جوں جوں جداگانہ طریقہ انتخاب پر زیادہ زور لگاتی جا رہی تھیں انتخابات اتنے ہی بڑی تیزی کے ساتھ آگے جا رہے تھے مسلم لیگ والے یہ بھی کہتے تھے کہ فوج ہمارے ساتھ ہے۔ پھر ایک روز لوگ جو صبح سویرے اٹھے تو فوجی گاڑیاں سڑکوں پر گشت کر رہی تھیں سول حکومت ختم ہو چکی تھی فوجی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ملک میں مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا۔

جنرل ایوب کی حکومت اور مارشل لاء

سات اکتوبر 1958ء کو لوگ صبح سویرے اٹھے تو ملک سے سول حکومت کی بساط لپیٹی جا چکی تھی۔ مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا تمام سیاسی جماعتیں خلاف قانون قرار دی گئیں تھیں۔ ریڈیو اور اخبارات پر صرف فوجی احکامات ہی سنائی دیتے تھے پاکستان کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ایوب بن چکے تھے صدر ابھی سکندر مرزا ہی تھے انہی کے حکم سے ملک میں مارشل لاء لگایا گیا تھا اور دیگر کارروائی بھی انہی کے حکم سے ہوئی تھی۔

27 اکتوبر 1958ء کو سکندر مرزا کو بھی صدارت سے الگ کر دیا گیا اب صرف پاکستان کے واحد فرماں روا جنرل ایوب خان تھے کئی سیاسی لوگوں کو گرفتار بھی کیا گیا تھا ہم نے سابقہ سطور میں لکھا ہے کہ مسلم لیگ والے یہ کہتے تھے کہ فوج ہمارے ساتھ ہے شاید اس ضمن میں مسلم لیگ کے صدر خان عبدالقیوم خان اور جنرل ایوب میں کوئی بات چیت ہوئی ہو۔ اور خان عبدالقیوم خان نے جو تاثر دیا وہ یہی تھا کہ یہ انہیں کا کام ہے مگر خان صاحب بھی گرفتار کر لئے گئے اور گرفتار کرنے والے افسران کو انہوں نے کچھ ڈانٹا بھی تھا' مگر گرفتاری کے بعد جب انہیں حقیقت حال کا آئینہ دیکھایا گیا تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور مارشل لاء حکومت سے معافی مانگ لی چند روز قبل ہی ان کا جلوس گجرات سے جہلم تک 32 میل لمبا نکلا تھا تو اس معافی نامے کے بعد اخبارات نے لکھا تھا کہ خان قیوم خان کا 32 میل لمبا جلوس اور 64 میل لمبا معافی نامہ صدر مسلم لیگ خان عبدالقیوم خان کو معافی نامے کے بعد رہا کر دیا گیا اور جب تک ایوب خان برسراقتدار رہے خان قیوم نے سیاست میں حصہ نہ لیا اور نہ ہی کوئی سیاسی بیان ہی دیا صدر ایوب کو جب ایک سیاسی جماعت کی ضرورت ہوئی تو انہوں نے مسلم لیگ پر قبضہ کرنا چاہا مگر مسلم لیگی لیڈران نے ایسا نہیں کرنے دیا تو جنرل ایوب نے مسلم لیگیوں کو بشمول چودھری خلیق الزمان کو اپنے مطلب کے لئے چند لوگوں کا کنونشن بلا لیا الگ مسلم لیگ بنا لی جس کو کنونشن مسلم لیگ کہا جانے لگا۔ جس کا تذکرہ الگ کیا گیا ہے۔ پرانی مسلم لیگ کے لیڈران جن میں سردار بہادر خان سردار شوکت حیات خان میاں ممتاز دولتانہ خواجہ ناظم الدین تھے مسلم لیگ کا جھنڈا اٹھائے ہوئے جمہوریت کی جدوجہد کرتے رہے ان میں سردار بہادر خان جو جنرل ایوب کے بھائی بھی تھے وہ پاکستان کی پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کے لیڈر بنے۔ اور 1962ء میں ملک سے مارشل لاء اٹھنے کے بعد وہ جمہوریت کی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ اس وقت مسلم لیگ عام جلسوں میں 1956ء کے آئین کی بحالی کا مطالبہ کرتے تھے جس کے تحت بالغ رائے دہی سے تمام انتخابات کا مطالبہ سرفہرست تھا۔ چونکہ کونسل مسلم لیگ نے ڈھاکہ میں ایوب خان کی حمایت نہیں کی تھی۔ اسی کونسل کے اجلاس میں خواجہ ناظم الدین کو مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا تھا۔ جو 1964ء میں خواجہ صاحب کی وفات تک رہی۔ مسم لیگ کونسل کے صدر خواجہ صاحب کی وفات کے بعد

مشرقی پاکستان کے میر محمد افضل مسلم لیگ کے صدر رہے۔ 1965ء میں صدارتی انتخابات ہوئے ان انتخابات میں بنیادی جمہوریت کے ممبران نے ھی ووٹ استعمال کرنا تھا انہیں کے ووٹوں سے صدر پاکستان بنایا جانا تھا اس الیکشن میں صدر ایوب کے مقابلہ میں متحدہ اپوزیشن سی او پی نے جس میں نیشنل عوامی پارٹی مسلم لیگ عوامی لیگ جماعت اسلامی اور نظام اسلام پارٹی شامل تھی۔ محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا الیکشن میں ایوب خان نے سرکاری افسران کے ذریعے مداخلت کے ذریعے دھاندلی کی محترمہ فاطمہ جناح الیکشن ہار گئیں۔ صدر ایوب پاکستان کے صدر منتخب ہو گئے اور مسلم لیگ غیر متحرک ہو گئی۔ اور چند وڈیروں تک ہی محدود ہو گئی۔ 1967ء میں مسلم لیگ کا صدر میاں ممتاز دولتانہ صاحب کو بنایا گیا مگر 1970ء میں وہ بھی صدارت سے الگ ہو گئے۔

1970ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو مشرقی پاکستان میں کوئی سیٹ نہ ملی جبکہ مغربی پاکستان پارلیمنٹ میں سات ممبر کامیاب ہوئے جن میں گجرات کے چودھری ظہور الٰہی بھی شامل تھے۔ سرحد کے خان عبدالقیوم خان نے مسلم لیگ کا الگ دھڑا بنا لیا اس کا نام مسلم لیگ قیوم گروپ رکھا گیا کونسل مسلم لیگ کی شکست کے بعد صدر مسلم لیگ دولتانہ سیاست سے الگ ہو گئے اور بھٹو حکومت نے انہیں برطانیہ میں سفیر بنا کر بھیج دیا۔ اور کونسل مسلم لیگ مزید بد عملی اور انتشار کا شکار ہو گئی۔ فیصل آباد کے زاہد سرفراز نے ایک دھڑا الگ بنا لیا اور سیالکوٹ کے خواجہ صفدر نے الگ دھڑا بنا لیا بھٹو کے دور حکومت میں مسلم لیگ کی سیاست پر سردار شوکت حیات چودھری ظہور الٰہی زاہد سرفراز اور خواجہ صفدر قابض تھے ان لوگوں کے بیانات اور نام کبھی کبھی اخبارات کی زینت بنتے رہتے۔ بھٹو حکومت کے خلاف ہر تحریک میں چودھری ظہور الٰہی اور زاہد سرفراز سامنے نظر آتے رہے۔ سردار شوکت حیات بھٹو کے آخری دور حکومت میں پیپلز پارٹی میں بھی شامل ہو گئے تھے اور وہ 1977ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے ممبر بنے تھے اسی الیکشن کے خلاف قومی اتحاد نے تحریک چلائی تھی جس کے نتیجہ میں بھٹو اقتدار ختم ہو گیا تھا مسلم لیگ بھٹو دور حکومت میں ماضی کی یادگار بن کر رہ گئی تھی۔ مشرقی پاکستان میں تو پہلے ہی مسلم لیگ ختم ہو چکی تھی اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بھی بن چکا تھا مغربی پاکستان میں بھی بڑی حد تک مسلم لیگ غیر متحرک ہو چکی تھی روایتی زمیندار اور جاگیردار جو مسلم لیگ کے بڑے ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے وہ بھی بھٹو کی پیپلز پارٹی میں شام ہونا شروع ہو گئے تھے۔
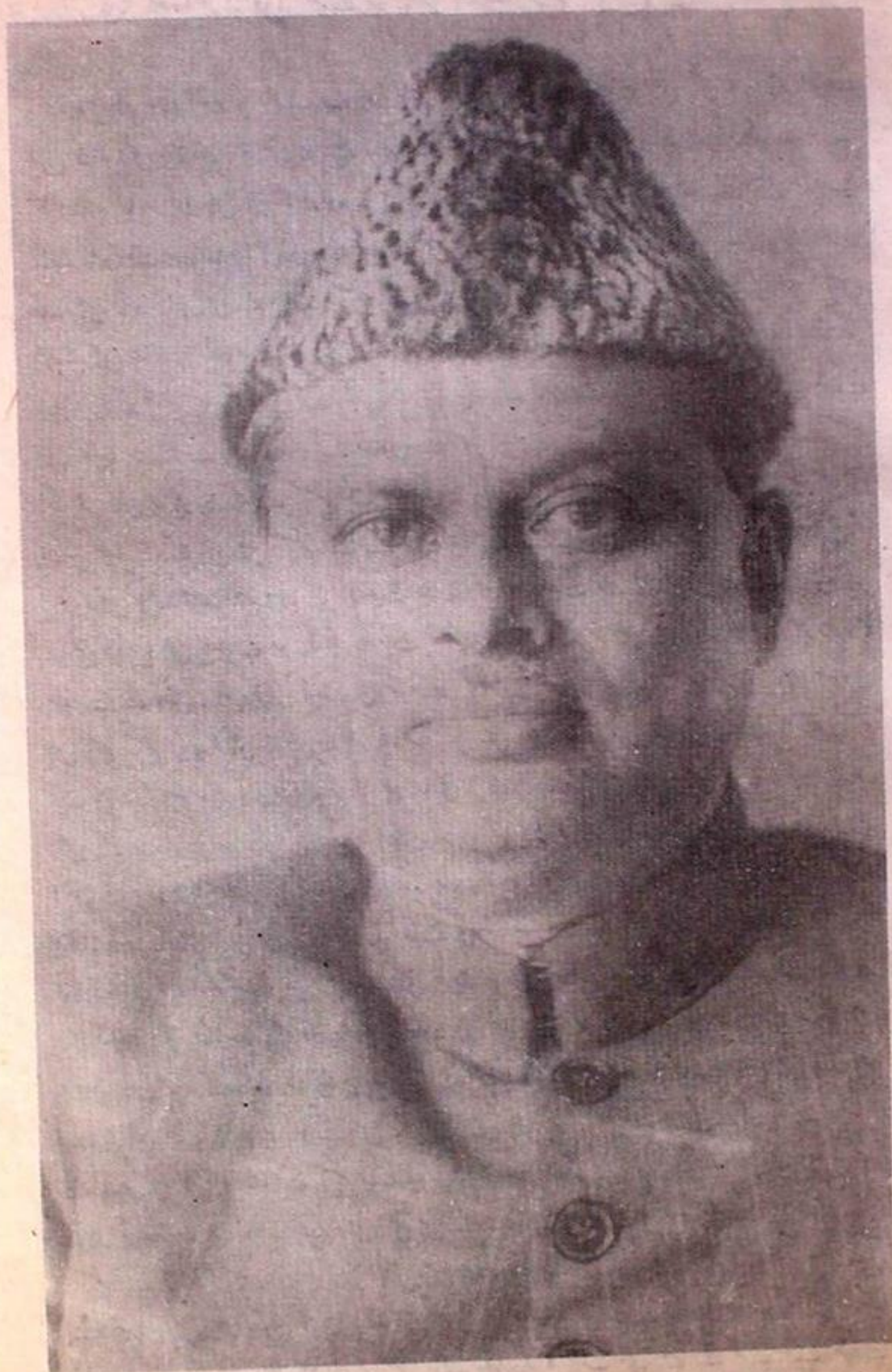
ضیاء الحق کا دور حکومت اور مسلم لیگ

1977ء قومی اتحاد کی تحریک کے بعد پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ کمانڈر انچیف جنرل ضیاء الحق اقتدار پر قابض ہو چکے تھے پہلے تو ضیاء الحق نے 90 دن کے اندر انتخابات کرانے کا اعلان کیا مگر بعد میں ان کا ارادہ بدل گیا اور انتخابات غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیئے گئے۔ کچھ وقت بعد ضیاء الحق کی فوجی اور مارشل لاء حکومت نے شورائی نظام ملک میں نافذ کر دیا ملک میں تابعہ دار قسم کے پرانے مسلم لیگیوں کو مجلس شوریٰ پاکستان کا ممبر بنا دیا گیا اس مجلس شوریٰ میں جماعت اسلامت اور تابع دار قسم کے پیپلز پارٹی کے لوگوں کو بھی شامل کیا گیا تھا مگر زیادہ پرانے مسلم لیگی گھرانوں سے مجلس شوریٰ کے لوگ نامزد کیئے گئے تھے اور اس مجلس شوریٰ میں تقریباً سب لوگ ہی حکومت کے معاون تھے اور حکومت بنائی گئی جس کے سربراہ پرانے مسلم لیگی محمد خان جونیجو بنائے گئے مسلم لیگ کے کھیت کی خوب آبیاری کی گئی۔ 1985ء میں غیر جماعتی الیکشن کرائے گئے جن میں مسلم لیگ کے لوگ اکثریت سے کامیاب ہو گئے مگر جماعت اسلامی کو سیٹوں میں اچھا خاصہ حصہ دیا گیا۔ جمعیت علمائے اسلام جمعیت علمائے پاکستان کے لوگ بھی غیر جماعتی الیکسن میں کامیاب ہوئے مگر حکومت مسلم لیگ کی ہی مرکز میں بنی۔ محمد خان جونیجو سربراہ حکومت تھے پنجاب میں نواز شریف کی حکومت تھی اور سرحد میں ارباب جہانگیر اور دیگر صوبوں میں بھی مسلم لیگ اچھی خاصی طاقتور جماعت بن چکی تھی صدر جنرل ضیاء الحق نے بلاآخر مسلم لیگ کی جونیجو حکومت کو برطرف کر دیا غیر جماعتی انتخابات سے معرض وجود میں آنے والی اسمبلیاں بھی ختم کر دی گئی۔ نئے انتخابات کا اعلان کر دیا گیا پہلے تو جنرل صاحب نے جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کا اعلان کیا مگر بعد میں جب صدر ضیاء الحق کو معلوم ہوا کہ جماعتی بنیاد کے تحت انتخابات سے پیپلز پارٹی ہی برسراقتدار آ جائے گی تو انہوں نے جماعتی طریقہ پر انتخابات کرانے کا ارادہ ملتوی کر دیا پھر اعلان کیا کہ غیر جماعتی طریقہ پر ہی انتخابات ہوں گے تھوڑے وقت کے بعد جنرل ضیاء الحق بہاولپور کے قریب ہوائی حادثہ میں جاں بحق ہو گئے نئے سربراہ مملکت صدر غلام اسحاق خان بن گئے۔ اور جماعتی بنیادوں پر نئے انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔ 1988ء میں ملک بھر سے جماعتی بنیا پر انتخابات ہوئے جس کے نتیجہ میں پیپلز پارٹی کامیاب ہو گئی۔ مگر دوسرے نمبر پر انتخابات میں کامیاب جماعت مسلم لیگ ہی بنی مرکز اور سندھ میں پیپلز پارٹی کو اکثریت مل گئی اور نواز شریف صاحب پنجاب کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ جبکہ بلوچستان میں مخلوط حکومت بنی خلاف توقع مسلم لیگ کو جماعتی بنیادوں پر اس الیکشن میں بہت کامیابی ہوئی مرکز میں مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے ممبران میں چند لوگوں کا فرق تھا پیپلز پارٹی کی مرکزی حکومت کو مضبوط حکومت نہیں کہا جا سکتا تھا مسلم لیگ کی اس کامیابی کو بعض لوگ دھاندلی کا کرتب بھی کہتے تھے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ نواز شریف اور ضیاء الحق مرحوم کی شخصیت نے مسلم لیگ کو پاکستان میں دوبارہ زندہ کر دیا

تھا اور نواز شریف پیپلز پارٹی کی لیڈر بے نظیر بھٹو کے مدمقابل شخصیت بن کر ابھرے۔ بیسویں صدی کی آخری دھائی میں نواز شریف نے اپنی شخصیت کا لوہا منوا لیا تھا۔ گو نواز شریف حزب اختلاف میں تھے مگر پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کا وزیر اعلیٰ بھی تھے ان کی سیاسی حیثیت مسلمہ تھی دیگر یہ کہ پاکستان کی سیاست پر نوکر شاہی اور فوج کا بھی تسلط رہا ان طاقتوں کے ساتھ مسلم لیگ کے تعلقات میں بہت زیادہ اولیت ہوتی ہے اور کسی وقت بھی مسلم لیگی لیڈران تعلقات کو خراب نہیں ہونے دیتے ہیں۔

1990ء کے انتخابات اور مسلم لیگ

1990ء میں اچانک خبر نہیں کیا ہوا پیپلز پارٹی کی حکومت اچھی بھلی چل رہی تھی صدر غلام اسحاق نے تمام اسمبلیاں اور حکومتیں توڑ دیں۔ آئندہ انتخابات کا اعلان کر دیا۔ نگران وزیر اعظم پاکستان سندھ کے غلام مصطفیٰ جتوئی بنائے گئے اور الیکشنوں کی تیاری دھوم دھام سے ہونے لگ گئی الیکشن کے نتائج میں اسلامی جمہوری اتحاد جو کہ مسلم لیگ کا ساتھی اور حامی دھڑا تھا کامیاب ہو گیا۔ مرکز میں اسلامی جمہوری اتحاد یعنی کہ مسلم لیگ کو تقریباً دو تہائی اکثریت مل گئی پنجاب میں بھی مسلم لیگ کی ہی اکثریت ہوئی سرحد میں عوامی نیشنل پارٹی اور مسلم لیگ نے مل کر حکومت بنائی۔ سندھ اور بلوچستان میں بھی مسلم لیگ کولیشن حکومتیں بنی۔ 1945ء کے الیکشن کے بعد 1990ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ جس کی مثال سابقہ چالیس سالوں میں نہیں ملتی۔ اور ساتھ ہی نواز شریف کی شخصیت بھی مسلمہ قومی لیڈر کی بن گئی مسلم لیگ اور نواز شریف کی حکومت بڑے احسن طریقہ پر چل رہی تھی نوکر شاہی کے ساتھ فوجی جرنیلوں کے ساتھ مسلم لیگ والوں کے روابط بھی اچھے تھے حکومت بھی نواز شریف کی مرکز میں اور صوبوں کی حکومتیں بھی چل رہی تھیں اچانک نواز شریف کی حکومت غیر مستحکم ہونا شروع ہو گئی خبریں آنے لگ گئیں کہ صدر غلام اسحاق نواز شریف کی مسلم لیگی حکومت کے ساتھ نہیں رہے پھر خبریں مزید خرابی تعلقات کی آنے لگ گئیں انہیں ایام میں پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بے نظیر بھٹو امریکہ کے دورہ پر روانہ ہو گئیں وہاں پر انہوں نے پاکستان کے خالص اور اصل حکمرانوں سے بات چیت کی جب وہ واپس پاکستان تشریف لائیں تو ہوائی اڈہ پر نواز شریف کی حکومت کی جانب سے ان کا استقبال کیا گیا انہیں حکومتی گاڑی پیش کی گئی جو انہوں نے قبول نہیں کی اور صدر پاکستان کے بلاوے پر وہ اسلام آباد چلی گئیں اور صدر کے ساتھ انہوں نے ہر قسم کے قول قرار کئے اور پھر ایک دن صدر غلام اسحاق نے مسلم لیگی نواز شریف کی حکومت برطرف کر دی اور آئندہ 90 روز میں الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا نگران وزیر اعظم میر بلخ شیر مزاری کو بنا دیا گیا۔ نواز شریف کی مسلم لیگ پارٹی نے پاکستان کی سپریم کورٹ میں صدر اسحاق کے حکم کے خلاف رٹ دائر کر
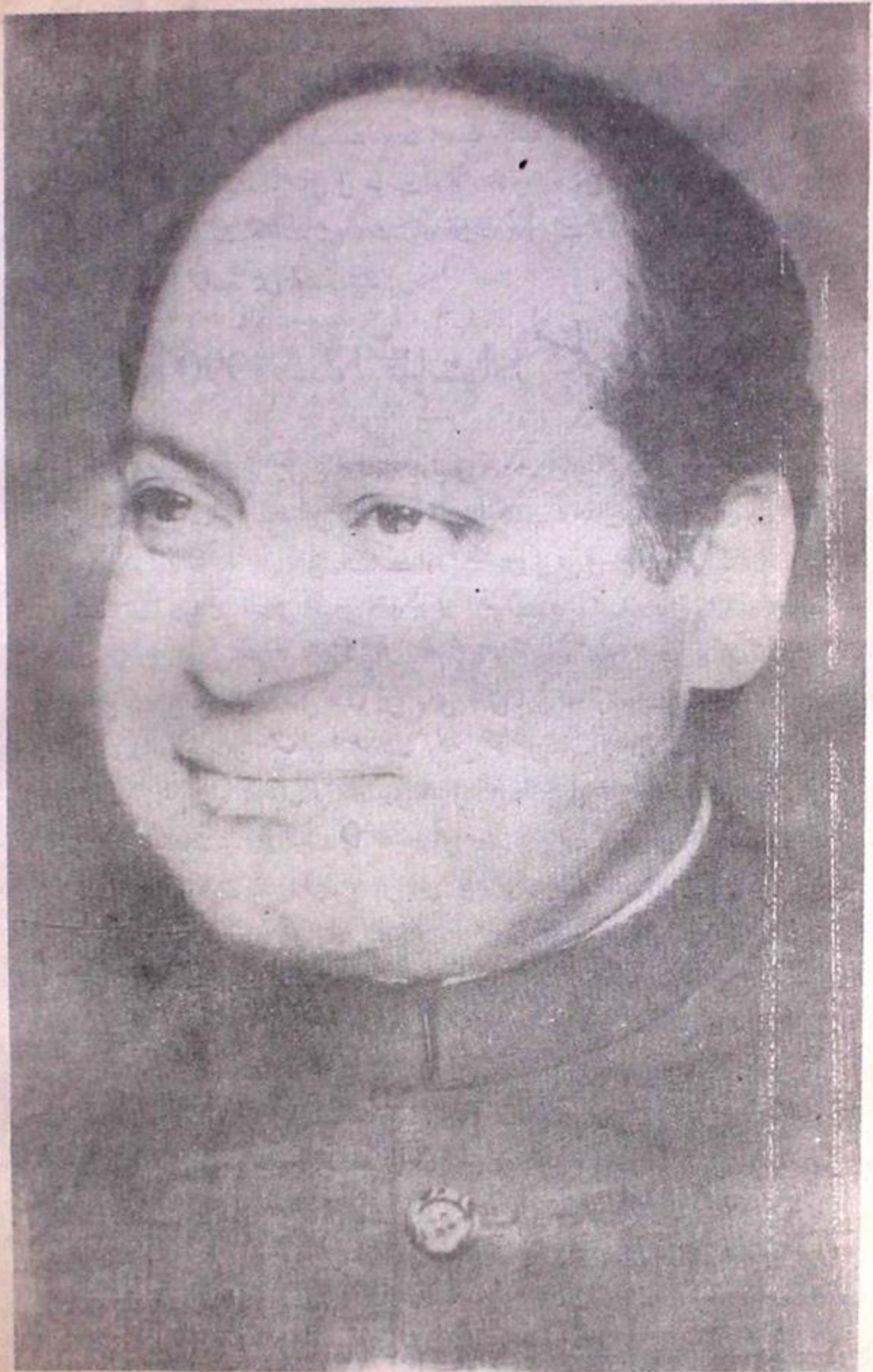
میاں محمد نواز شریف

دی سپریم کورٹ نے 40 یوم کے اندر نواز شریف کی رٹ درخواست منظور کرتے ہوئے مسلم لیگ کی نواز شریف حکومت بحال کر دی اور یہ تاریخ میں پہلا واقع تھا کہ سپریم کورٹ نے سربراہ مملکت کے حکم کے خلاف فیصلہ کیا اور برطرف شدہ حکومت کو دوبارہ مسند اقتدار پر بیٹھا دیا گیا۔

مگر نواز شریف کی حکومت ختم کرنے کا فیصلہ اوپر کی سطح پر ہو چکا تھا مسلم لیگ میں ہی پھوٹ ڈلوا دی گئی وزراء نے حکومت سے الگ ہونا شروع کر دیا مسلم لیگ میں جونیجو گروپ الگ بن گیا جس کے صدر حامد ناصر چٹھہ بنا دیئے گئے۔ پنجاب اسمبلی میں میاں منظور احمد وٹو جونیجو مسلم لیگ کے لیڈر بنے جونیجو مسلم لیگ والے انتخابات میں پیپلز پارٹی کے ساتھ تعاون میں شامل ہو گئے۔ فوجی دباؤ اور امریکن دباؤ کے تحت نواز شریف کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ اقتدار سے الگ ہو جائیں آخر نواز شریف اس دباؤ کے آگے ٹھہر نہ سکے سمجھوتہ کے ساتھ بات چیت کے ساتھ فیصلہ کے تحت معین قریشی جو کہ امریکہ میں رہتے تھے انہیں نگران وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ اور نواز شریف حکومت مستعفی ہو گئی - 90 روز میں آئندہ الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا گیا الیکشن کی تیاریاں دھوم دھام سے شروع ہو گئیں اور وزیر اعظم معین قریشی نے تمام سیاسی جماعتوں کو یقین دہانی کرا دی تھی کہ الیکشن میں دھاندلی نہیں ہو گی اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس 1993ء کے الیکشن میں کسی بھی سیاسی گروپ نے یا پارٹی نے دھاندلی بدعنوانی کا الزام نہیں لگایا اگر کوئی دھاندلی اور بدعنوانی کا الزام لگایا بھی گیا ہے تو وہ کہیں کہیں مقامی حکمرانوں پر لگایا گیا حکومت پر دونوں گروپوں نے بدعنوانی اور دھاندلی کا الزام نہیں لگایا۔

1993ء کے انتخابات اور مسلم لیگ

1993ء کے انتخابات بڑے پر امن ماحول میں ہوئے دھاندلی بدعنوانی کے الزامات سرکار پر نہیں لگائے گئے اگر کوئی بدعنوانی ہوئی بھی ہے تو وہ مقامی سطح تک ہی ہوئی کراچی حیدر آباد میں ایم کیو ایم کا زور ہے مگر اس جماعت نے قومی اسمبلی کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا اس لئے کراچی اور حیدر آباد ان شہروں میں جہاں اردو بولنے والے رہتے ہیں وہاں ان لوگوں نے ووٹ نہیں ڈالے تھے اس وجہ سے ان جگہوں سے قومی اسمبلی کے ممبر پیپلز پارٹی جماعت اسلامی یا دیگر جماعتوں کے لوگ ہو گئے مگر صوبائی اسمبلی کے الیکشن میں مہاجر قومی موومنٹ نے بائی کاٹ نہیں کیا تھا۔ اس وجہ سے ان جگہوں پر تمام صوبائی اسمبلی کے ممبر مہاجر قومی موومنٹ کے ہی ہوئے ہیں مرکز میں اور پنجاب سندھ میں پیپلز پارٹی اور انکی حامی جمعیت جونیجو مسلم لیگ کو کامیابی ہوئی اس وجہ سے مرکز میں حکومت پیپلز پارٹی کی مس بے نظیر کی بنی اور وہ وزیر اعظم پاکستان بنیں۔ پنجاب جونیجو لیگ کے ساتھ کولیشن بنائی گئی اور وزیر اعلیٰ پنجاب منظور احمد وٹو بنے اور سندھ میں بھی پیپلز پارٹی کے عبداللہ شاہ وزیر اعلیٰ بنے سرحد اور بلوچستان میں کسی جماعت کی اکثریت نہ تھی اس وجہ سے کولیشن حکومتیں بنی۔
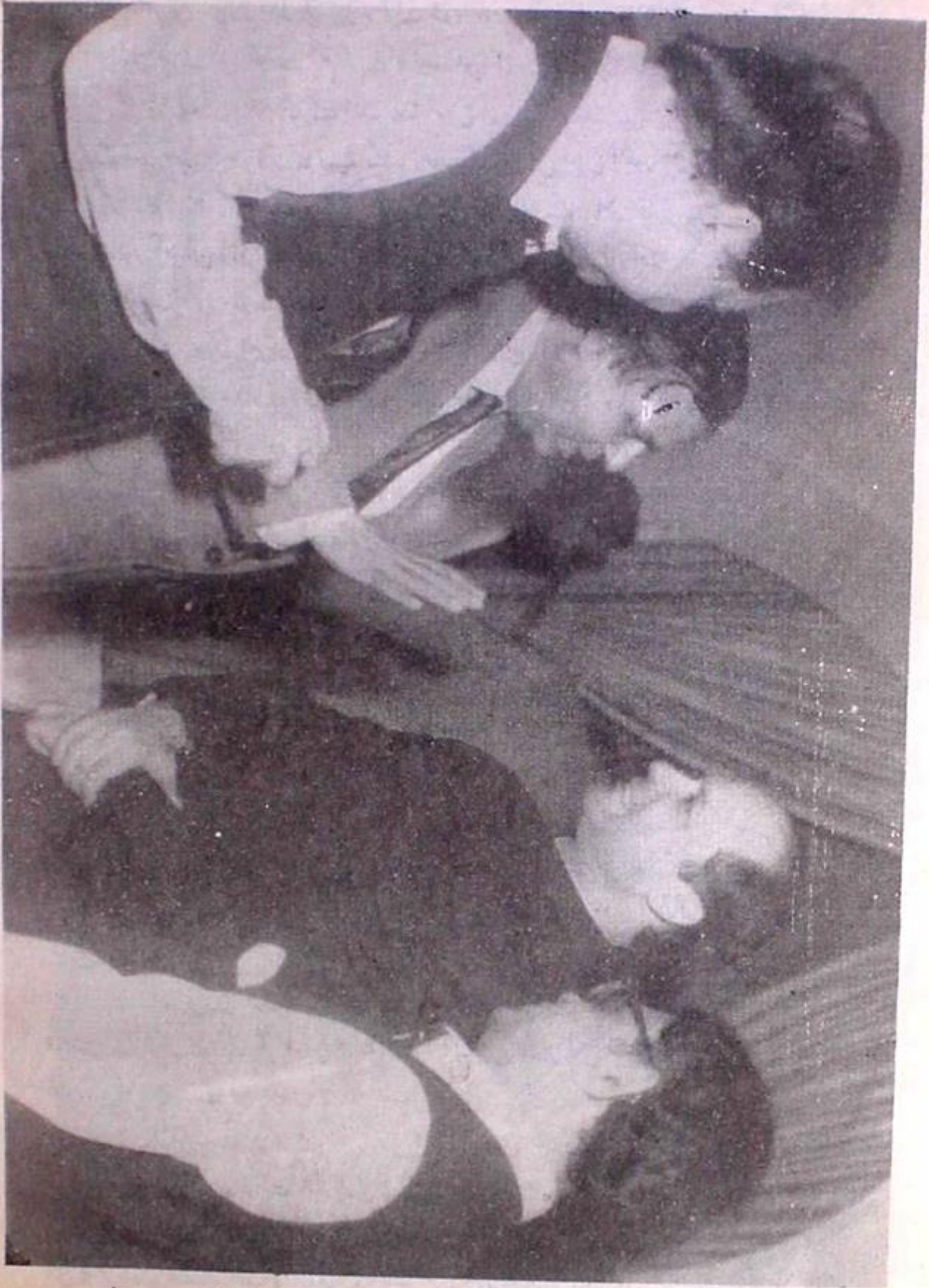
میاں محمد نواز شریف دیگر ساتھیوں کے ساتھ

مسلم لیگ جونیجو گروپ

محمد خان جونیجو ایوب کے دور حکومت میں کونشن مسلم لیگ میں شامل تھے اور مغربی پاکستان کے صوبائی وزیر بھی تھے ایوب کے دور حکومت میں وزارت سے ہٹ جانے کے بعد وہ گوشہ گمنامی میں چلے گئے۔ اور سیاست میں غیر متحرک ہو گئے وہ سندھ کے بہت بڑے زمیندار تھے وہ خطرات والی سیاست کے آدمی نہ تھے وہ بچ بچاؤ اور محفوظ سیاست کیا کرتے تھے اور وہ سندھ کے روحانی اور سیاسی پیشوا حضرت پیر آف پگاڑا کے معتقد خاص تھے۔ 1985ء میں غیر جماعتی انتخابات کرائے گئے اور پارلیمانی نظام حکوم قائم کیا گیا سندھ کے لوگوں میں ذوالفقار علی بھٹو کے تختہ دار پر لٹکائے جانے کے بعد احساس محرومی قائم ہو جانا قدرتی بات تھی اس احساس محرومی والے تاثر کو ختم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ سندھ کے ہی کسی شخص کو وزارت اعظمیٰ کی گدی پر بیٹھا دینا ضروری سمجھا گیا۔ شنید ہے کہ پیر آف پگاڑا نے ہی صدر جنرل ضیاء الحق کو مسند اقتدار پر محمد خان جونیجو کو بٹھانے کا مشورہ دیا تھا انہیں کے مشورہ سے جناب محمد خان جونیجو پاکستان کے وزیر اعظم بن گئے اور وہ 1988ء تک پاکستان کے وزیر اعظم رہے اور یہ ان کا انتظامی اقتدار بلاشرکت غیر تھا۔ جنرل ضیاء الحق نے ان پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے انہیں مکمل بااختیار اور مارشل لاء کے تابع وزیر اعظم پاکستان بنا دیا تھا انہیں کے عہد میں مارشل لاء ختم کیا گیا تھا انہیں کے عہد حکومت میں پاکستان کے آئین 1973ء میں آٹھویں ترمیم کی گئی تھی جس کے تحت صدر مملکت کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ قلم کی ایک جنبش سے وزارت توڑ سکتا ہے پارلیمنٹ صوبائی حکومتیں صوبائی اسمبلیاں توڑ سکتا ہے اور پھر صدر جنرل ضیاء الحق نے 1988ء میں انہیں اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے محمد خان جونیجو کی حکومت کو پارلیمنٹ کو صوبائی اسمبلیوں کو صوبائی حکومتوں کو یک جنبش قلم ختم کر دیا تھا اور صدر ضیاء الحق بھی بعد میں ہوائی حادثہ میں جاں بحق ہو گئے تھے محمد خان جونیجو سیاست میں پھر غیر متحرک ہو گئے تھے اور 1992ء میں اس دارفانی سے رحلت فرما کر مالک حقیقی سے جا ملے۔ 1993ء میں نواز شریف کی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کے لئے مسلم لیگ سے کچھ لوگ توڑ لئے گئے یہ وہ لوگ تھے جو مرکزی اور صوبوں میں وزارتوں پر بھی قابض تھے ممبران اسمبلی بھی تھے ان میں سرفہرست جناب حامد ناصر چٹھہ صاحب' سردار آصف احمد علی' منظور احمد وٹو صاحب' صوبہ سرحد کے میر افضل صاحب اور دیگر بہت ساری شخصیات شامل تھیں اور پیپلز پارٹی نے انہیں آئندہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ممبر بننے میں تعاون کا بھی یقین دلایا تھا مسلم لیگ کے ان وزراء اور ممبران اسمبلی نے مسلم لیگ کے ساتھ غداری کر کے مسلم لیگ حکومت توڑنے کی سازش میں شریک ہو کر نواز شریف کی خالص مسلم لیگ کی حکومت کو ختم کرنے میں مسلم لیگ کے مخالفین کے آلہ کار بنے پھر ان لوگوں نے جنہوں نے اپنے آپ کو مسلم لیگ جونیجو گروپ کا نام دیا ہوا تھا انہوں نے پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر 1993ء کے انتخابات میں
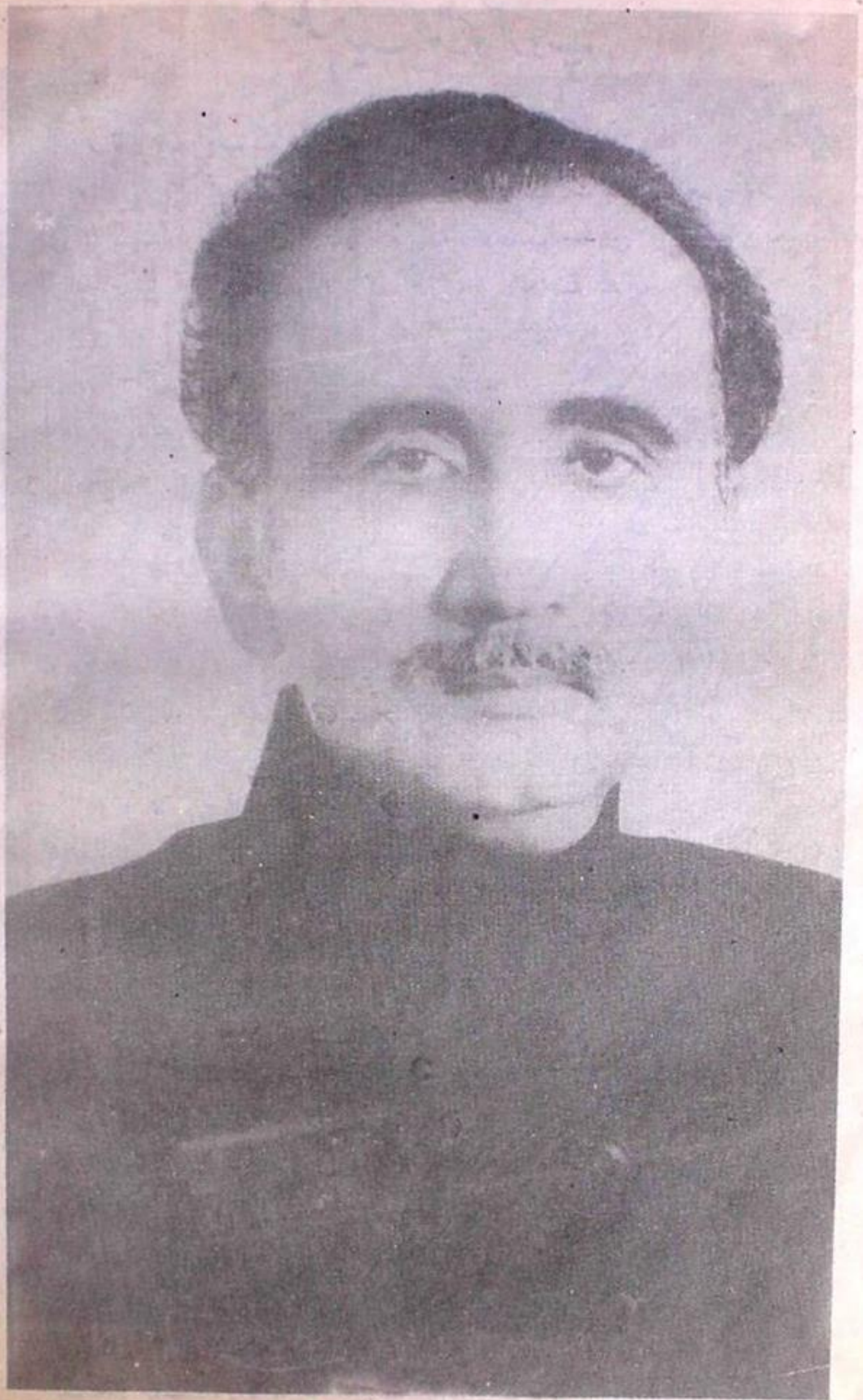
محمد خان جونیجو

حصہ لیا۔ سنٹرل پارلیمنٹ میں ان کے 6 ممبر ہیں پنجاب اسمبلی میں 15 ممبر ہیں اور پنجاب کی حکومت بھی مسلم لیگ جونیجوگروپ کے پاس ہے۔ اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھی مسلم لیگ جونیجو گروپ کے جناب منظور احمد وٹو ہیں اور کابینہ بھی مسلم لیگ جونیجو گروپ اور پیپلز پارٹی کی کولیشن حکومت ہے دونوں پارٹیوں کے وزراء تناسب کے لحاظ سے ہیں اس طرح مرکزی کابینہ میں بھی باوجود اس بات کے کہ مسلم لیگ جونیجو گروپ کے بہت تھوڑے ممبر ہیں پھر بھی پیپلز پارٹی نے انہیں مناسب وزراتیں دے رکھی ہیں۔

اس وقت 1994ء میں پیپلز پارٹی کے ساتھ مسلم لیگ جونیجو گروپ مکمل معاون ہے اور دونوں گروپ مل کر حکمرانی کر رہے ہیں جونیجو گروپ کہلوانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بیسویں صدی کے ان سالوں میں ضیاء الحق کے علاوہ مسلم لیگ کی مقتدر شخصیت محمد خان جونیجو ہوئے ہیں اس وجہ سے باغیان مسلم لیگ کے اپنے گروپ کے ساتھ اچھی اور مقتدر شخصیت کی ضرورت تھی انہیں یہی نام اچھا لگا ااس لئے اپنے گروپ کو جناب جونیجو صاحب مرحوم کے ساتھ جوڑ دیا۔ مطمئن ہو کر سیاست کرنے لگ گئے اور دیگر یہ کہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ جونیجو گروپ کی حکومت کو خفیہ ہاتھ کی حمایت بھی حاصل ہے۔

پیپلزپارٹی اور بھٹو کا خاندانی پس منظر

پاکستان پیپلزپارٹی کے بانی جناب ذوالفقار علی بھٹو تھے وہ لاڑکانہ صوبہ سندھ کے رہنے والے تھے ان کے والد سر شاہنواز بھٹو وہاں کے زمیندار تھے لاڑکانہ کے نزدیک ان کے نام کا ریلوے سٹیشن سر شاہنواز بھٹو بھی ہے وہ خاندانی آباؤ اجداد سے سیاست دان تھے انگریز کی فرمانبرداری میں خطابات اور زمین حاصل کیں تھیں۔ 1936ء سے قبل جب صوبہ سندھ بمبئی کے ساتھ ہی تھا اس وقت سر شاہنواز بھٹو صوبہ بمبئی کے وزیر بھی تھے۔ 1937ء کے الیکشن میں وہ شیخ عبدالمجید سندھی سے صوبائی اسمبلی کی ممبری ہار گئے تھے اور پھر انہوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی جب پاکستان بنا تو اس وقت سر شاہنواز بھٹو ریاست جوناگڑھ کے وزیر اعلیٰ تھے انہیں کے وقت میں ریاست جوناگڑھ نے پاکستان میں شمولیت کا اعلان کیا تھا اور پھر ہندوستان نے ریاست پر قبضہ کر لیا تھا۔ 1958ء میں جب پاکستان کے اقتدار پر مارشل لاء کے ذریعہ جنرل ایوب قابض ہو گئے تو ان کو ان سیاسی خاندانوں کی ضرورت محسوس ہوئی جو انگریز کے وفادار تو تھے مگر پاکستان کی سابقہ حکومتوں میں شامل نہ تھے تو ان کی نظر لاڑکانہ سندھ کے بھٹو خاندان پر پڑی اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو انہوں نے اپنی سیاسی فرزندی میں قبول کر لیا اور انہیں پہلے وزیر مملکت بنایا گیا اور پھر انہیں جلدی ہی قدرتی وسائل کی وزارت کا قلمدان سونپ دیا گیا اور اپنی صلاحیت محنت اور شخصی وجاہت سے بہت جلد صدر جنرل ایوب کے منظور نظربن گئے اور جنرل ایوب کو ڈیڈی کے نام سے اور جنرل صاحب انہیں بیٹا کے نام سے پکارنے لگ گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو انگلستان کی آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ تھے اور اس یونیورسٹی میں وہ لیکچرار بھی رہے تھے۔ وہ خوبصورت ذہین نوجوان تھے جنرل ایوب کو جب سیاسی پارٹی کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے چند پرانے مسلم لیگیوں کو بشمول چودھری خلیق الزمان کے اپنے ساتھ ملا لیا اور ایک کونشن کے ذریعے مسلم لیگ اپنی الگ بنا لی تھی جس کے صدر جنرل ایوب خود ہی بن گئے اور جنرل سیکرٹری مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو بنایا گیا تھا انہوں نے ہی کونشن لیگ کو منظم کیا تھا اور ساتھ ہی وزارت کا قلمدان بھی انہیں کے پاس تھا اور صدر ایوب کے فرمانبردار تابعدار اور سعادت مند فرزند تھے۔ وہ ہروقت اپنے سیاسی والد کے اشارہ ابرو کے منتظر رہتے تھے اور صدر ایوب کو بھی ان پر بہت ہی زیادہ اعتماد تھا شاید وہ گوہر ایوب اختر ایوب اور دیگر فرزندوں کو مسٹر بھٹو جیسا باسعادت فرزند نہیں سمجھتے تھے اور پھر صدر ایوب نے انہیں اور ترقی دی وزارت خارجہ کا قلمدان ان کے حوالے کر دیا وزارت خارجہ کی اہمیت تمام وزارتوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ 1965ء میں صدر ایوب نے جب محترمہ فاطمہ جناح سے صدارتی الیکشن جیت لیا اس جیت نے صدر
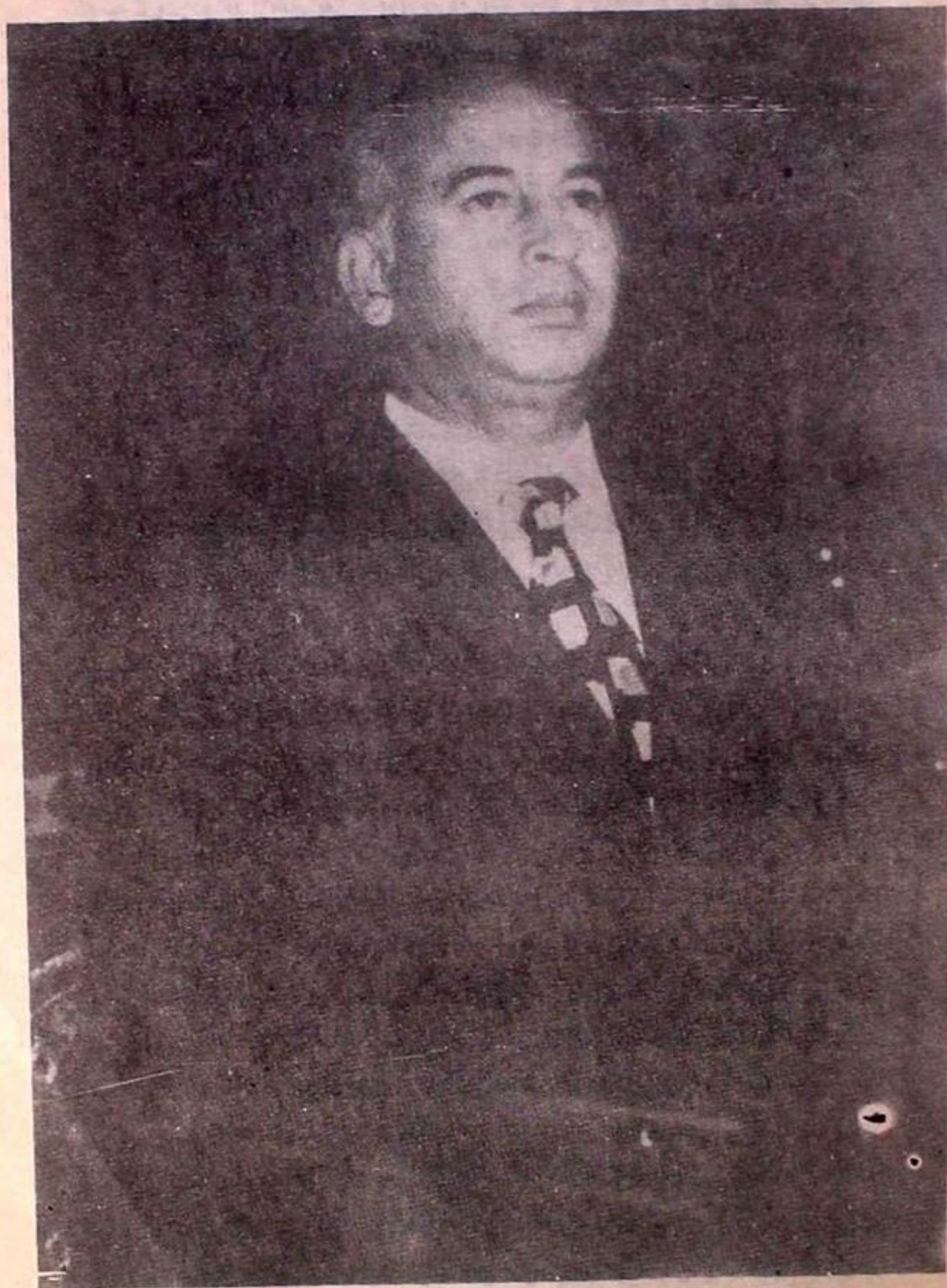
ذوالفقار علی بھٹو

ایوب میں زیادہ خود اعتمادی پیدا کر دی اور وہ اپنے آپ کو ہیرو کا درجہ دینے لگ گئے صرف انتخابات جیت لینے سے تو کوئی شخص ہیرو نہیں بن جاتا۔ ہیرو کے لئے کوئی غیر معمولی کارنامہ بھی کرنا ہوتا ہے اور ان کے سامنے میدان موجود تھا اور کشمیر میں گوریلا جنگ شروع کر دی گئی اور صدر ایوب کے سب سے بااعتماد مشیر ذوالفقار علی بھٹو ہی تھی اور صدر ایوب کو یقین دلایا گیا تھا کہ اگر گوریلا جنگ یا سیدھی جنگ کشمیر میں کر دی جاتی ہے اور کشمیر پر قبضہ بھی کر لیا جاتا ہے تو بھارت کچھ نہیں کر سکتا اور بھارت قطعی طور پر بین الاقوامی سرحد کو نہیں چھیڑ سکتا اس لئے بے فکری کے ساتھ کشمیر میں مسلح مداخلت کر دینی چاہئے کشمیر کی اس جنگ میں ابتدائی طور پر پاکستان کو کچھ کامیابی ہوئی درا حاجی پیر وغیرہ پر پاکستان افواج نے قبضہ بھی کر لیا تھا اس پر بھارت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے ایک بیان میں کہا تھا کہ پاکستان نے بھارت پر حملہ کر دیا ہے اور اس جنگ میں ہم اپنی مرضی کا محاذ جنگ کھولیں گے اور پھر بھارتی فوج نے لاہور اور سیالکوٹ کے علاقوں میں جنگی محاذ کھول دیئے اور بہت سارے ان علاقوں پر قبضہ بھی کر لیا چونڈہ کے محاذ پر بہت گھمسان کی جنگ ہوئی جس کی مثال دوسری جنگ عظیم میں بھی نہیں ملتی تیرہ دن کی جنگ کے بعد اعلان جنگ بندی ہو گیا اس جنگ کے دوران اور بعد میں وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کو سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقاریر کرنے کا موقع ملا یہ تقاریر بذریعہ ٹیپ ریڈیو پاکستان سے بھی نشر کی جاتی تھیں اور لوگوں میں ان تقاریر کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ اور لوگوں میں یہ تاثر قائم ہو گیا تھا کہ وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو ہی پاکستانی عوام کی امید کی کرن ہے اور بھٹو تقاریر کی جا بجا تعریف ہونے لگ گئی اور ریڈیو پاکستان پر یہ تقاریر کئی بار نشر ہوئیں مستقل جنگ بندی کے لئے بھارت اور پاکستان اور سویت یونین کے سربراہان مملکت کی تاشقند میں ایک کانفرنس ہونا قرار پائی اور اس کانفرنس میں صلح نامہ تیار کیا گیا جس کا نام تھا اعلان تاشقند اور آئندہ جنگ نہ کرنے کا اعلان کیا گیا اس اعلان تاشقند پر بھارت کے وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کے دستخط ہوئے - پاکستان کے صدر جنرل ایوب اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے دستخط ہوئے سویت یونین کے وزیر اعظم مسٹر کوسیمن اور وزیر خارجہ کے دستخط ہوئے ازبکستان کے صدر قربانوف کے دستخط ہوئے۔ پاکستان کے لوگ یہ توقع کئے ہوئے تھے کہ تاشقند میں کشمیر پاکستان کو مل جائے گا جب ستمبر 1965ء جنگ بند ہوئی تھی لوگوں میں یہ تشہیر کی گئی تھی کہ پاکستان جنگ جیت گیا ہے اور فوج نے فتح حاصل کر لی ہے مگر اعلان تاشقند میں فتح کہیں دور دور تک بھی نظر نہیں آتی تھی۔ بلکہ واضح شکست ہی نظر آ رہی تھی لوگوں میں یہ تاثر عام ہوا کہ میدان جنگ میں تو پاکستان جیت گیا ہے مگر سیاست کی ٹیبل پر جنگ ہار دی گئی ہے اور اخبارات کے ذریعے یہ تاثر دیا جانے لگ گیا کہ یہ غداری ہوئی ہے اور یہ غداری ایوب خان نے کی ہے اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے منع کرنے کے باوجود ایوب نے اعلان تاشقند پر دستخط کئے ہیں اور اس جنگ میں صدر ایوب کو امریکہ کی امداد کی توقع تھی جو نہ ملی جس پر وہ امریکہ کے

خلاف ہو گئے اور انہوں نے ایک کتاب لکھی جو امریکہ کے خلاف تھی کہ پاکستان کو دوست چاہییں مالک نہیں چاہییں۔ اس پر امریکہ بھی صدر جنرل ایوب خان کے خلاف ہو گیا ایوب جب امریکیوں کی نظر سے گر گیا تو فوج کے جرنیل بھی ان کے حامی نہ رہے ہر طرف سے ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کو اجاگر کیا جانے لگا اس زمانے میں سید اشفاق علی کا لکھا ہوا ڈرامہ تلقین شاہ ریڈیو پاکستان پر بہت مقبولیت حاصل کئے ہوئے تھا اس ڈرامے میں بھی اشارات کے ذریعے ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت مقبول عام کرنے کی بہت کامیاب کوشش کی۔ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمان عوامی لیگ کے لیڈر تھے وہ چھ نکات کی وجہ سے کافی مقبولیت حاصل کر چکے تھے چھ نکات میں مشرقی پاکستان والے دیگر مطالبات کے علاوہ پاکستان کی اتنی بڑی فوج کو غیر ضروری سمجھتے تھے اور عوام پر لوگوں پر بلاوجہ بوجھ سمجھتے تھے اور خیال کیا جاتا تھا کہ اگر شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ پاکستان کے الیکشن میں کامیاب ہو جاتی ہے تو پاکستان میں فوج کا مستقبل تاریک ہو جائے گا اس لئے امریکہ کے بعد پاکستان کے اصل حکمران فوج کو بھی ضرورت تھی کہ کوئی پبلک لیڈر ایسا پیدا کیا جائے جو مشرقی پاکستان کے لیڈران کے ساتھ معاملات میں فوج کا معاون ہو فوجی جرنل اس کو جو کہیں وہ پبلک نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اس پر کاربند ہو جاوے اس وقت فوج کو اس مقصد کے لئے ذوالفقار علی بھٹو سے بہتر کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا۔ اس وجہ سے اس وقت جی ایچ کیو کے ایوانوں میں ذوالفقار علی بھٹو سے بہتر بھی کوئی شخصیت نہ تھی۔ اور نتیجہ میں حرف بحرف یہ امر صحیح ہوا کہ جب 1970ء کے الیکشن کے بعد مشرقی پاکستان کے لیڈروں کے ساتھ سیاسی معاملات کی بات چلی تو ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی ساری صلاحیت یحییٰ خان اور فوج کے تابع کر دی تھی جس طرح یحییٰ حکومت کہتی تھی اس طرح ذوالفقار علی بھٹو کرتے تھے بلاآخر پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کو اجاگر مختلف طریقوں پر کیا جا رہا تھا ریڈیو اخبارات ہر روز نت نئے طریقے سے انکی شخصیت کو اچھے طریقوں سے پیش کر رہے تھے اخبارات میں یہ خبر مسٹر بھٹو بذریعہ ریل گاڑی راولپنڈی سے لاہور جائیں گے ہر ریلوے اسٹیشن پر لوگوں نے استقبال کئے۔ گوجرانوالہ میں جب لوگوں نے ریلوے اسٹیشن پر بھٹو زندہ باد کے نعرے لگائے تو وہ ریل کے ڈبے کی کھڑکی پر آئے انہوں نے لوگوں کی طرف دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کی تلقین کی لاہور میں بھی ان کا بہت بڑا استقبال ہوا وہاں پر بھی انہوں نے اشارہ سے لوگوں کو خاموش رہنے کی تلقین کی وہ دیکھ رہے تھے کہ لوگ انہیں کس قدر پسند کرتے ہیں۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اس وقت وزارت سے مستعفی ہو چکے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو مغربی پاکستان کے عوام میں اپنی بہت زیادہ مقبولیت دیکھ کر وہ اصل حکمران جو پاکستان پر شروع سے درپردہ حکمران ہیں۔ امریکی لیڈروں سے اشیرباد لینے امریکہ چلے گئے پاکستان کے ساتھ معاملات میں متعلقہ امریکی حکمرانوں سے بات چیت کی ان سے قول قرار کئے اور اُن کے حکم سے وہ پاکستانی سیاست میں داخل ہونے کا حکم نامہ لے کر واپس وطن میں آ گئے۔ اور انہوں نے

دھوم دھڑکے کے ساتھ سیاست میں داخل ہونے کا پختہ عزم کر لیا راولپنڈی میں کالج کے طالب علموں نے حکومت کے خلاف احتجاج کیا ہوا تھا جلوس نکالا ہوا تھا اس تحریک کی قیادت فوجی جرنیلوں کے بچے بھی کر رہے تھے۔ یہ جلسہ اور جلوس اعلان تاشقند کے خلاف تھا جس میں پولیس کی لاٹھی چارج سے چند طالب علم زخمی بھی ہوئے تھے اس ہنگامے کی قیادت آگے بڑھ کر مسٹر بھٹو نے سنبھال لی اور اعلان کیا کہ تاشقند میں جو کچھ ہوا ہے اس کی حقیقت میں عوام پر واضح کروں گا لوگ پہلے ہی اعلان تاشقند پر نفرت کا اظہار کر رہے تھے جب مسٹر بھٹو نے بر سر اعلان یہ کہا کہ اعلان تاشقند کی حقیقت لوگوں پر واضح کروں گا تو عوام مسٹر بھٹو کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے۔ اس سے قبل ڈھاکہ میں پی ڈی ایم ' پاکستان ڈیموکری موومنٹ کا اعلان بھی کیا جا چکا تھا۔ جس میں حزب اختلاف کی تمام جماعتیں بشمول عوامی لیگ نیشنل عوامی پارٹی ' ولی گروپ' نظام اسلام پارٹی کونسل مسلم لیگ جماعتی اسلامی جمہوریت کی جدوجہد کا اعلان کر چکی تھیں اور ان تمام جماعتوں کا متفقہ مطالبہ صرف ایک ہی تھا کہ 1956ء کے آئین کے تحت حق بالغ رائے دہی پر انتخابات کرائے جائیں اور بی ڈی نظام ختم کیا جائے پی ڈی ایم والے یہ سمجھتے تھے کہ حق بالغ رائے دہی کے طریقہ انتخاب سے خود بخود ہی ایوب حکومت ختم ہو جائے گی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم پاکستان اور سجاد بخاری چیف ایڈیٹر روزنامہ مساوات

پیپلز پارٹی قائم ہو گئی

مگر ذوالفقار علی بھٹو صدر جنرل ایوب کو اقتدار سے ہٹانے کی بات پہلے کرتے تھے تبدیلی نظام کی بات بعد میں کرتے تھے مشہور دانشور ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر میں اس زمانے میں وکلاء ادیب دانشوروں کی ہفتہ وار میٹنگ ہوا کرتی تھی جس میں ملکی بین الاقوامی ادبی سیاسی حالات پر تبادلہ خیال ہوا کرتا تھا ڈاکٹر صاحب نے اس ہفتہ وار اجتماع میں ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو بھی مدعو کیا۔ اور مسٹر بھٹو جے اے رحیم کے ساتھ مورخہ تیس نومبر 1967ء کو لاہور میں ڈاکٹر مبشر صاحب کے گھر میں اس ادبی سیاسی اجتماع میں شامل ہوئے یہ اجتماع 6 گلبرگ لاہور میں منعقد ہوا جس میں پیپلز پارٹی کی بنیاد مورخہ یکم دسمبر 1967ء کو رکھی گئی تھی جس کے راہنما اصول منظور کئے گئے۔

اسلام ہمارا دین ہے ' جمہوریت ہماری سیاست ہے' سوشلزم ہماری معیشت ہے' طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں' پی ڈی ایم بھی جمہوریت کی جدوجہد کر رہی تھی اور نواب زادہ نصراللہ خان مجموعی طور پر پی ڈی ایم کے لیڈر تھے جمہوریت کی یہ تحریک ان کی قیادت میں چل رہی تھی مگر بھٹو اندرون خانہ جرنیلوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور امریکہ کی حمایت بھی انہیں حاصل تھی اس لئے مسٹر بھٹو اور پیپلز پارٹی زیادہ خود اعتمادی کے ساتھ تحریک میں آگے بڑھ رہے تھے وہ روٹی کپڑا اور مکان کا نعرا بھی ساتھ ہی لگا رہے تھے وہ اپنی موومنٹ کو سوشلسٹ موومنٹ کے روپ میں پیش کر رہے تھے بہت سارے سوشلسٹ نظریات رکھنے والے لوگ بھی ان کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ پیپلز پارٹی یکم دسمبر 1967ء کو بنی اور پہلے چیرمین بھی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ہی بنے اور سیکرٹری جنرل جے اے رحیم بنائے گئے تھے پارٹی کے بانی ارکان میں ڈاکٹر مبشر حسن جے اے رحیم ' محمد حنیف رامے' غلام مصطفیٰ کھر اور دیگرلوگ بھی شامل تھے۔ پارٹی کا دوسرا کنونشن 1969ء میں ہالہ کے مقام پر ہوا جس میں دوسرے بہت سارے لوگوں کے علاوہ سندھ کے لیڈران وڈیرے جن میں پیر آف ہالہ غلام مصطفیٰ جتوئی اور دیگر بہت سارے لوگ شامل ہو گئے۔ تحریک جمہوریت کے دوران بھٹو گرفتار کر لئے گئے تحریک میں جمود آگیا تو ریٹائرڈ ایئرمارشل اصغر خان سیاست کے میدان میں آ گئے انہوں نے بھٹو کی جمہوری تحریک کو بہت سہارا دیا اور تحریک جمہوریت کی راہنمائی کرنے لگ گئے۔ اور لیڈران میں جنرل جیلانی بھی فوج سے الگ ہو کر سیاست میں شامل ہو گئے اور تحریک جمہوریت کی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ پی ڈی ایم کی جماعتیں بھی جمہوریت کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں مگر ایسا محسوس ہوتا تھاکہ پی ڈی ایم کی جماعتیں عوام کے ایک مخصوص طبقہ مخصوص علاقوں پر ہی اثر رکھتی تھیں مگر پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی کا اثر کافی گہرا محسوس کیا جانے لگ گیا تھا یحیٰ خان کے دور حکومت میں نیپ بھاشانی گروپ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک کسان کانفرنس کی جس میں پیپلز پارٹی

کے ساتھ وابستہ لوگوں نے بھی کثیر تعداد میں شرکت کی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی یہ کسان کانفرنس بہت زیادہ کامیاب ہوئی لاکھوں لوگوں نے کانفرنس میں شرکت کی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پاکستان سرخ ہو گیا ہے پیپلز پارٹی کی سرگرمیوں سے یہ یقین ہو گیا تھا کہ پاکستان سوشلسٹ نظریات کا ملک بن چکا ہے اور اب کوئی طاقت پاکستان کو اس راہ سے ہٹا نہیں سکتی۔ پیپلز پارٹی کے جلسوں میں سوشلسٹ انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے تھے اور ساتھ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ پیپلز پارٹی انقلابی پارٹی ہے انتخابی پارٹی نہیں اور یہ بھی کہتے تھے کہ ہم انتخاب صرف رواجاً لڑ رہے ہیں ورنہ ہماری منزل سوشلسٹ انقلاب ہے انہیں ایام میں صدر جنرل ایوب خان نے ملک میں بدامنی کو ختم کرنے کے لئے تمام اپوزیشن پارٹیوں کی گول میز کانفرنس بلائی جس میں پی ڈی ایم کی تمام جماعتوں نے شرکت کی مگر نیپ بھاشانی گروپ اور پیپلزپارٹی نے ایوب کی گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ کیا اس گول میز کانفرنس نے جو متفقہ مطالبات ایوب خاں کو پیش کئے وہ مان لئے گئے مگر امن پھر بھی قائم نہیں ہوا اب پی ڈی ایم کی جماعتوں نے تو اعلان کر دیا کہ ان کے مطالبات مانے جا چکے ہیں تحریک ختم کی جاتی ہے مگر پیپلز پارٹی بدستور تحریک چلا رہی تھی اور سرکاری ملازمین نے بھی اپنے مطالبات میں جلوس نکالنے شروع کر دیئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بااختیار حکومتی اداروں نے ایوب خان کو اقتدار سے ہٹانے کا مکمل فیصلہ کر لیا ہے اور بل آخر ایوب خان اقتدار یحیٰی خان کے حوالے کر کے خود حکومت سے الگ ہو گئے۔

پیپلز پارٹی یحییٰ خان عوامی لیگ

ایوب خان کے اقتدار سے الگ ہونے کے بعد ملک کی عنانِ حکومت یحییٰ خان کے ہاتھ آ گئی انہوں نے اپنی پہلی تقریر میں جب ریڈیو پاکستان سے قوم کو خطاب کیا تو انداز خطابت ایسا تھا جیسا کوئی فاتح مفتوح قوم کو خطاب کرتا ہے پہلی ہی تقریر میں انہوں نے قوم کے آگے بہت بڑے مسئلے کو حل کر دیا وہ یوں کہ مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبے ون یونٹ کے خلاف تھے اور الگ صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کر رہے تھے صدر یحییٰ خان پہلی ہی ریڈیائی تقریر میں مغربی پاکستان کے ون یونٹ توڑنے کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی مرکز میں برابر کی نمائندگی کا اصول ختم کر دیا اور ایک آدمی ایک ووٹ کے اصول پر آئندہ الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا گیا ان اعلانات کے ساتھ ہی پاکستان کے گزشتہ پندرہ سال کے سیاسی مسائل کا حل کر دیا گیا اب کوئی دستوری جھگڑا پاکستان کے صوبوں اور مرکز کے درمیان نہیں رہ گیا تھا اب سیاست کا آئندہ راہ سیدھا ہو گیا تھا۔ کہ جو پارٹی بھی مرکز یا صوبے میں اکثریت حاصل کرتی ہے وہی پارٹی حکمرانی کے اہل بن جاوے گی اور اسے حکومت مل ہی جائے گی۔ اقتدار حاصل کرنے والی جماعت پر کچھ حدود قیود بھی لگائی گئیں تھیں جن میں ایک یہ بھی تھی کہ حصول اقتدار کے 120 یوم کے اندر اسے آئین لازمی بنانا ہوگا۔

الیکشن کی تیاریاں بڑے زور سے جاری تھیں راقم الحروف ان وقتوں میں نیشنل عوامی پارٹی ولی خان گروپ سے وابستہ تھا میاں محمد علی قصوری ہماری لیڈر تھے ایک روز اخبارات میں خبر پڑھی گئی کہ میاں قصوری صاحب پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں گوجرانوالہ کے ہم چند دوست پیپلز پارٹی میں وجہ شمولیت پوچھنے گئے تو ہمیں بھی پیپلز پارٹی میں شامل کر لیا گیا ہم جب نیشنل عوامی پارٹی چھوڑ کر پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے تو ہمیں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی ہم ذہنی طور پر نیشنل عوامی پارٹی اور پیپلز پارٹی کو ایک جسم کے دو حصے سمجھتے تھے منشور الگ نہ تھا مزاج بھی اس وقت تک ایک ہی تھا پارٹی تبدیلی کا ہمارے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی شرمندگی تھی۔ ہم بھی پیپلز پارٹی کے جلسوں میں جانا شروع ہو گئے اگر سٹیج پر تقریر کرنے کا موقع ملتا تو تقریر بھی کرتے تھے عوام بھی پیپلز پارٹی میں ہجوم در ہجوم شامل ہو رہے تھے چھوٹے سے چھوٹے جلسے میں ہزاروں لوگ جمع ہو جایا کرتے تھے جب کبھی ذوالفقار علی بھٹو کسی جلسے میں آ جاتے تو لاکھوں کا مجمع ہوتا۔ فوج اور سرکاری افسران اور اہل کار کثرت کے ساتھ پیپلز پارٹی کے حامی تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ الیکشن میں دھاندلی اور بدعنوانی نہیں ہو گی لوگوں میں بھٹو کی روٹی کپڑا اور مکان کے نعرے پر اس قدر یقین تھا کہ وہ شخص جس کا مکان اپنا نہیں تھا وہ سمجھتا تھا کہ اگر پیپلز پارٹی جیت گئی تو جس مکان میں وہ رہ رہا ہے وہ مکان اسی کا ہو جائے گا پیپلز پارٹی کے الیکشن جیت جانے کی صورت میں مزدور کارخانے اور کسان زمین کی ملکیت کا اپنا حق سمجھنے

لگ گئے تھے۔

مسٹر بھٹو کی طرف لوگ دیوانہ وار کھنچے چلے آ رہے تھے وہ بہت اچھے عوامی مقرر تھے ان کی اردو تقریر میں گرائمر کی غلطیاں ہوتی تھیں وہی گرائمر کی غلطیاں ان کی تقریر کی خوبصورتی بھی ہوتی تھیں وہ سٹیج پر اس انداز سے لوگوں کو مخاطب کر کے سیاسی رقص کرتے تھے کہ نوجوان ان کے گرویدہ ہو جایا کرتے تھے وہ عوامی لیڈر بھی تھے مگر عوامی مقرر زیادہ تھے وہ سیاست میں حصول اقتدار کو نصب العین سمجھتے تھے وہ بلاشبہ وادی سندھ کے مقبول ترین راہنما تھے اس خطہ میں جتنی عوامی حمایت انہیں ملی وہ کسی لیڈر کو آج تک نہیں ملی۔ 1970ء کے آخر میں پاکستان میں جنرل الیکشن ہوئے سنٹرل پارلیمنٹ کی تین سو نشستیں تھیں۔ مشرقی پاکستان 160 اور مغربی پاکستان 140 نشستیں تھیں مشرقی پاکستان کی 158 نشستوں پر عوامی لیگ قابض ہو گئی دوسرے نمبر پر مغربی پاکستان کی 81 نشستوں پر پیپلز پارٹی کا قبضہ ہو گیا پیپلز پارٹی کو مغربی پاکستان میں صوبہ پنجاب اور سندھ میں ہی اکثریت حاصل ہوئی مغربی پاکستان میں الیکشن جیت لینے کے بعد جب فاتحانہ انداز میں مسٹر بھٹو لاہور پہنچے تو ان کا پیپلز پارٹی نے بہت بڑا شاہانہ استقبال کیا تھا راقم الحروف بھی جلوس میں شامل تھا۔ اور سارے شہر لاہور میں فاتحانہ جلوس نکالا گیا تھا جب جلوس اسمبلی ہال کے سامنے پہنچا تو اس وقت مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے تقریر کی تھی جس میں فرمایا کہ پاکستان کے الیکشن میں ہمیں جیت نہیں ہوئی مگر سندھ اور پنجاب کی اسمبلیوں کی چابیاں میری جیب میں ہیں مرکز کی کوئی بھی حکومت ہمیں نظر انداز نہیں کر سکے گی۔ جو کچھ پنجاب اور سندھ کہے گا وہی ہوگا۔

عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں چھ نکات کے ایشو پر انتخاب جیت لیا تھا چھ نکات کے منشور میں مکمل صوبائی خود مختاری کے ساتھ فوج کی بالادستی جو ملک پر ہر وقت مسلط رہتی ہے اسے کم کرنے کا اعلان کیا گیا تھا پاکستان کی فوجی حکومت کسی قیمت پر ملک کا اقتدار اعلیٰ بنگالیوں کو دینے پر تیار نہ تھی اور مسٹر بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی یحییٰ خان کی فوجی حکومت کے معاون تھے چنانچہ مسٹر بھٹو نے ایک واضح بیان میں کہا تھا کہ پاکستان میں تین طاقتیں ہیں عوامی لیگ، پیپلز پارٹی، اور فوج ان تینوں طاقتوں کی ہم آہنگی کے بغیر کوئی حکومت قائم نہیں ہو سکے گی۔ جنوری 1971ء میں مسٹر بھٹو نے پیپلز پارٹی کا چھ رکنی وفد غلام مصطفیٰ کھر کی زیر قیادت ڈھاکہ میں عوامی لیگ کے ساتھ سیاسی افہام و تفہیم کے لئے روانہ کیا تقریباً ایک ہفتہ پیپلز پارٹی کے یہ لیڈر ڈھاکہ میں رہے ہر روز ان کی خبریں اخبارات کی زینت بنتی کبھی یہ کہا جاتا چھ میں پانچ نکات پر پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ میں سمجھوتہ ہو گیا ہے پھر ایک روز اخبارات میں یہ پڑھ کر حیرانگی ہوئی کہ پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے درمیان قطعی کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا اور پیپلز پارٹی کے لیڈر جو ڈھاکہ گئے ہوئے تھے وہ واپس کراچی پہنچ گئے ہیں۔

یحییٰ خان مرکزی پارلیمنٹ کا اجلاس نہیں بلا رہے تھے کہ جب تک دونوں بڑی سیاسی

جماعتیں کوئی دستوری سمجھوتہ پارلیمنٹ کے باہر کر لیں تب اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے۔ عوامی لیگ کے شیخ مجیب الرحمان کہتے تھے کہ مرکزی پارلیمنٹ کا اجلاس بلایا جائے دستوری فیصلے کرنے کی جگہ پارلیمنٹ ہے وہیں دستوری فیصلہ ہو گا۔ ادھر پیپلز پارٹی کے جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی کراچی کی تقریر میں شیخ مجیب الرحمان کو مخاطب کر کے کہا کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے الیکشن جیتا ہے مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے الیکشن جیتا ہے۔ ادھر تم ادھر ہم پھر انہوں نے ایک تقریر میں کہا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی الگ الگ اسمبلیاں ہونی چاہئیں الگ الگ اجلاس ہونے چاہیں۔ انہیں ایام میں شیخ مجیب الرحمان سے اخبار نویسوں نے پوچھا کہ پیپلز پارٹی نے آپ کے ساڑھے پانچ نکات پر اتفاق رائے ہو گیا تھا وہ آدھا نقطہ کون سا تھا جس پر سارا سمجھوتہ ہی ختم ہو گیا تھا اس پر شیخ مجیب الرحمان نے کہا تھا کہ پیپلز پارٹی کے لیڈران نے چھ نکات پر سرے سے بات چیت ہی نہیں کی تھی وہ تو جتنے دن ڈھاکہ میں رہے اقتدار میں اپنے حصے کی بات کرتے رہے وزارتوں کی بات کرتے رہے کہ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کی کولیشن حکومت میں پیپلز پارٹی کو کتنی وزارتیں ملیں گی ان ایام میں شیخ مجیب الرحمان مسلسل صدر پاکستان سے پارلیمنٹ کے اجلاس کا مطالبہ کرتے رہے جبکہ جناب بھٹو اور صدر یحیٰی خان پارلیمنٹ کے باہر سیاسی اور دستوری سمجھوتہ کی بات کرتے رہے۔ جنوری 1971ء کے آخری ایام میں صدر یحیٰی خان نے ڈھاکہ میں 28 فروری 1971ء کو پارلیمنٹ کا اجلاس بلانے کا اعلان کر دیا ڈھاکہ سیشن بلائے جانے سے قبل یحیٰی خان اور مسٹر بھٹو کی لاڑکانہ میں اور اس کے علاوہ بھی ایک سے زائد ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔

پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا

ڈھاکہ میں پارلیمنٹ کا اجلاس بلائے جانے کے بعد سیاست میں مزید گرمی پیدا ہو گئی عوامی لیگ اور مشرقی پاکستان کے لیڈروں نے حکومت کی طرف سے ڈھاکہ سیشن بلائے جانے کے حکومتی اعلان کی تعریف کی جبکہ پیپلز پارٹی نے ڈھاکہ سیشن بلائے جانے کی مذمت کی لاہور منٹو پارک میں پیپلز پارٹی کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اعلان کیا جو ممبر پارلیمنٹ ڈھاکہ سیشن میں شامل ہو گا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ مگر مغربی پاکستان کی دیگر چھوٹی پارٹیاں بھٹو کے نقطہ نظر کے حامی نہ تھی نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈر ولی خان نے ایک سے زائد بار یہ بیان دیا کہ سیاسی اور دستوری جھگڑے سلجھانے کے لئے اسمبلیاں ہوتی ہیں ان میں جا کر ہی ایسے جھگڑوں کو خوش اسلوبی سے ختم کیا جا سکتا ہے ایئر مارشل اصغر خان پارلیمنٹ کے ممبر نہ تھے مگر ان کا پبلک میں کافی احترام تھا انہوں نے بھی اسمبلی کے اجلاس میں ممبران کو جانے کی تلقین کی جمعیت علمائے اسلام کی بھی پارلیمنٹ میں سات ممبران تھے انہوں نے بھی بھٹو کے نقطہ نگاہ کی حمایت نہ کی مگر سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ الیکشن ہو جانے کے بعد سے لے کر اجلاس ڈھاکہ بلائے جانے کی تاریخ تک ان دو ماہ میں مسٹر یحییٰ خان مسلسل فوج مشرقی پاکستان منتقل کر رہے تھے اور پولیس بھی مغربی پاکستان سے بھیجی جا رہی تھی ایسی خبریں آنے لگ گئیں تھیں کہ مشرقی پاکستان کی فوج اور پولیس شاید مغربی پاکستان کے حکمرانوں کو نہ مانیں۔ فروری کے آخر میں ڈھاکہ سیشن کے التواء کا اعلان صدر یحییٰ نے کر دیا اس کے ساتھ ہی پیپلز پارٹی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور مشرقی پاکستان میں احتجاجی جلسے اور جلوس نکلنے شروع ہو گئے اس ساری صورت حال کو فیس کرنے کے لئے مغربی پاکستان کے لیڈران پارلیمنٹ کے ممبران شخصیات ڈھاکہ جانا شروع ہو گئے جو لیڈر اور شخصیات ان دنوں ڈھاکہ گئے تھے ان میں صدر یحییٰ خان بشمول فوجی جرنیلوں اور مشیروں کے ذوالفقار علی بھٹو بشمول پیپلز پارٹی کے لیڈروں کے ایئر مارشل اصغر خان ولی خان صدر نیشنل عوامی پارٹی مفتی محمود جنرل سیکرٹری جمعیت علمائے اسلام اور بہت سارے لیڈر اور شخصیات ڈھاکہ پہنچ گئیں۔

28 فروری 1971ء کو پلٹن میدان میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں شیخ مجیب الرحمان خطاب فرما رہے تھے کہ حکومتی تشدد سے مارے جانے والے لوگوں کی چھ لاشیں جلسہ میں آئیں جس سے جلسہ گاہ کے لوگ مزید مشتعل ہو گئے مگر شیخ مجیب الرحمان انہیں صبر کی تلقین کرتے رہے۔ چار مارچ 1971ء کو سیاسی لیڈران کی بات چیت ناکام ہو گئی اس وقت مشرقی پاکستان پر حکومت پاکستان کا کنٹرول بالکل نہیں تھا حکومتی کنٹرول قائم کرنے کے لئے مشرقی پاکستان کو فوج کے حوالے کر دیا گیا جس سے لاکھوں انسان لقمہ اجل بنے جس کا ذکر تفصیل سے عوامی لیگ کے باب میں بھی کیا گیا ہے مغربی پاکستان کے تمام لیڈرا ڈھاکہ سے واپس آ گئے جناب ذوالفقار علی

بھٹو نے واپسی پر کراچی کے ہوائی اڈہ پر کہا تھا کہ خدا کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا۔ دسمبر 1971ء تک مشرقی پاکستان میں گوریلا جنگ جاری رہی جس سے لاکھوں لوگ لقمہ اجل بنے مشرقی پاکستانی عوام تقریباً ایک کروڑ لوگ بھاگ کر بھارت چلے گئے تھے وہاں سے حملہ آور ہو کر گوریلا جنگ لڑ رہے تھے آخر یہ جنگ پاک بھارت جنگ کی شکل اختیار کر گئی حکومت پاکستان نے سلامتی کونسل سے بھارت کی شکایت کی کہ وہ پاکستان پر حملہ آور ہوا ہے سلامتی کونسل کے اجلاس میں پاکستان کی نمائندگی کے لئے ذوالفقار علی بھٹو گئے تھے مشرقی پاکستان کی رضا کار فوج مکتی باہنی صرف رضا کاروں پر مشتمل نہ تھی مشرقی پاکستان کی مسلح فورسز نے بھی بشمول عوامی لیگ کے رضا کاروں کے مکتی باہنی کی شکل اختیار کر لی تھی نومبر 1971ء میں مکتی باہنی نے مشرقی پاکستان کے بہت بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ حکومت پاکستان نے یہ سمجھتے ہوئے کہ اس قدر طاقت ور حملہ بھارتی فوج کی معاونت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس کا توڑ کرنے کے لئے مغربی پاکستان میں بھی محاذ جنگ کھول دیا اور جنگ پاک بھارت کے درمیان باقاعدہ شروع ہو گئی۔ سلامتی کونسل میں پاکستان نے بھارت پر حملہ آور ہونے کا الزام لگایا یہی الزام بھارت نے پاکستان پر بھی لگایا اس بحث کے دوران پاکستان پر عوامی لیگ کے ساتھ سیاسی سمجھوتے کے لئے کہا گیا جسے پاکستان نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے اس لئے کوئی دوسری طاقت مداخلت نہیں کر سکتی اور ادھر مشرق محاذ جنگ سے باقاعدہ بڑی تیزی کے ساتھ پاکستانی افواج کی پسپائی کی خبریں آ رہی تھیں مکمل شکست پاکستان کو بہت نمایاں نظر آ رہی تھی اس موقع پر حکومت پولینڈ کے نمائندے نے سلامتی کونسل میں ایک قرار داد پیش کی جس میں حکومت پاکستان سے عوامی لیگ کے ساتھ سیاسی سمجھوتے کا مطالبہ کیا گیا اس قرار داد کو پاکستان کے نمائندے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے سلامتی کونسل کے اجلاس میں پھاڑ دیا تھا اور وہ خود اجلاس سے واک آؤٹ کر کے باہر آ گئے تھے یہ قرار داد ہی پاکستان کو متحد رکھنے کی آخری کوشش تھی جسے پھاڑ دیا گیا تھا اور ساتھ اسی روز چند گھنٹے بعد مشرقی پاکستان میں بھارتی فوج اور مکتی باہنی کے آگے پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اور پاکستان کے 90 ہزار فوجی بھارت کی قید میں چلے گئے جنہیں بعد میں بھٹو دور حکومت میں شملہ معاہدے کے تحت بھارت کی قید سے رہا کرایا گیا تھا۔ حمود الرحمان کمشن نے سقوط مشرقی پاکستان کی ذمہ داری مندرجہ ذیل جرنیلوں پر لگائی ہے، صدر جنرل یحییٰ خان، جنرل عبدالحمید، لیفٹنٹ جنرل پیر زادہ میجر جنرل عمر، لیفٹیننٹ جنرل گل حسن میجر جنرل میٹھا ان جرنیلوں پر مقدمہ چلانے کی سفارش بھی کی گئی ہے۔
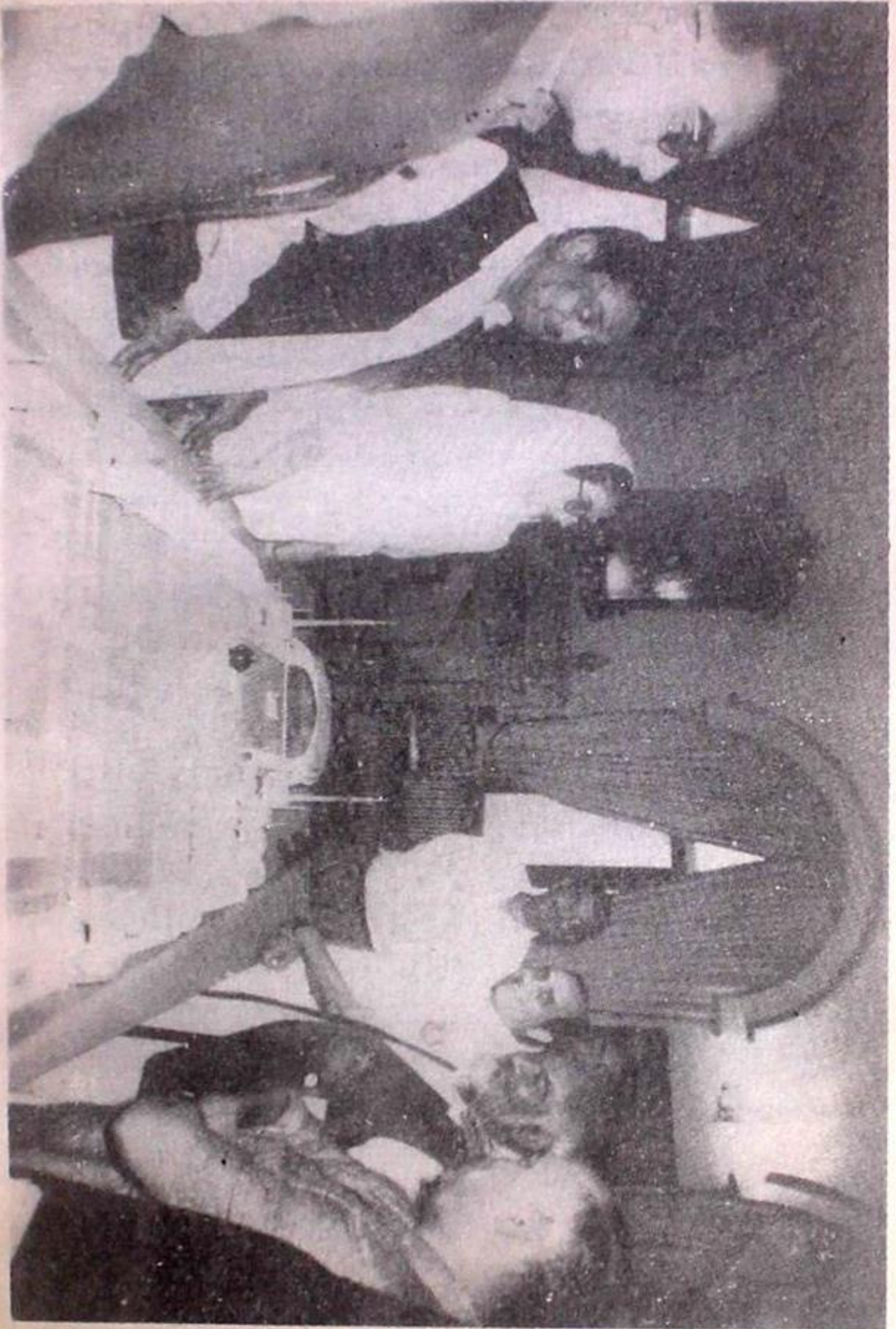
محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم پاکستان، میاں منظور وٹو وزیراعلیٰ پنجاب، چودھری الطاف حسین گورنر پنجاب اور دیگر ساتھی

پیپلز پارٹی کی حکمرانی

سکوت ڈھاکہ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد پاکستان میں یحیٰی خان کی فوجی حکومت کے خلاف لوگوں میں عام نفرت کا اظہار کیا جانے لگا چند شہروں میں یحیٰی خان کی فوجی حکومت کے خلاف مظاہرے بھی ہوئے کچھ فوجی لیڈروں جن میں ایئر مارشل اصغر خان بھی شامل تھے فوجی جرنیلوں نے جن میں جنرل گل حسن خان بھی شامل تھے جناب ذوالفقار علی بھٹو جو اس وقت نیو یارک میں تھے رابطہ کیا اور انہیں کہا گیا کہ وہ پاکستان میں تشریف لا کر اقتدار پر قبضہ کر لیں۔ بھٹو وقت ضائع کئے بغیر پاکستان اسلام آباد آگئے اور انہوں نے پاکستان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا حلف اٹھایا اور پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکمرانی قائم ہو گئی لوگ اس وقت بداعتمادی کا شکار تھے مشرقی پاکستان کے چلے جانے کے بعد پاکستان کے عوام عدم تحفظ کا شکار تھے اور لوگوں میں یہ باتیں عام تھیں کہ خبر نہیں پاکستان رہتا بھی ہے کہ نہیں ایک کارخانے کا مزدور ایک تانگے کا کوچوان ایک بہت چھوٹا چھابڑی فروش ہر شخص کے چہرے پر لکھا ہوا نمایاں نظر آتا تھا کہ خبر نہیں آنے والے وقت میں کیا ہو گا۔

پاکستان میں اس وقت آئین نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ 1956ء کا آئین ایوب خان نے منسوخ کر دیا تھا اور 1962ء کا آئین جو ایوب خان نے ہی بنایا تھا وہ بھی یحیٰ خان کو اقتدار دیتے وقت ایوب خان نے خود ہی منسوخ کر دیا تھا اور مارشل لاء کے تحت ہی یحیٰ خان کو اقتدار منتقل کیا گیا تھا اور یحیٰی خان نے بھی مارشل لاء کے تحت ہی جناب بھٹو کو اقتدار منتقل کر دیا اور مسٹر بھٹو پاکستان کے صدر بھی تھے اور ساتھ ہی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو جب اقتدار میں آئے تو ان کے مقابل کوئی جاندار حزب اختلاف نہ تھی حقیقی معنوں میں وہ اس وقت طاقت ور اور پاکستان کے واحد حکمران تھے فوجی جرنیل اس وقت شکست کے زخم چاٹ رہے تھے لوگوں کے دلوں میں فوجی جرنیلوں کے لئے کوئی اچھے جذبات نہ تھے۔ دیگر اپوزیشن پارٹیوں میں نیشنل عوامی پارٹی کی پوزیشن سب سے بہتر تھی مرکز میں تو اس کے ممبروں کی تعداد سات ہی تھی مگر صوبہ سرحد کی اسمبلی میں اس کی پوزیشن مضبوط تھی جبکہ بلوچستان اسمبلی میں نیشنل عوامی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل تھی لیکن گزرے ہوئے 20 سالوں میں نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے لیڈروں کی اس قدر کردار کشی کی جاتی رہی تھی کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی وقعت ہی نہ تھی پاکستان پارلیمنٹ کی اس وقت 140 نشستیں تھیں پیپلز پارٹی کو الیکشن میں تو بیاسی نشستیں ملیں تھی مگر آزاد ممبر ملا کر پیپلز پارٹی کو تقریباً ایک سو ممبران کی حمایت حاصل تھی دیگر چھوٹی جماعتوں نیشنل عوامی پارٹی کے آٹھ ممبروں کو ملا کر متحدہ حزب اختلاف کو تقریباً چالیس ممبران کی حمایت حاصل تھی۔ اس طرح پیپلز پارٹی کو پاکستان کا آئین بنانے اسے دو تہائی اکثریت سے پارلیمنٹ منظور کرانے میں کوئی امر مانع نہ تھا متحدہ حزب اختلاف نے پارلیمنٹ کے اندر اور

باہر ایک جمہوری محاذ قائم کر لیا تھا جس کا نام رکھا گیا تھا یو ڈی ایف متحدہ جمہوری محاذ اور اس کا صدر نیشنل عوامی پارٹی کے صدر جناب ولی خان صاحب کو بنایا گیا تھا۔ آئین سازی میں مسٹر بھٹو کو کوئی امر مانع نہیں تھا مگر وہ چاہتے تھے کہ پارلیمنٹ کے تمام ممبران کے مسودہ آئین پر دستخط ہونے چاہئے۔ وہ متحدہ محاذ کی ہر بات آئین کے سلسلہ میں مانتے جاتے تھے انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کی کولیشن کو صوبہ سرحد اور بلوچستان کی حکومتیں بھی دیں صوبہ سرحد اور بلوچستان کی گورنریاں بھی نیشنل عوامی پارٹی کو دی گئیں یہ وزارتیں اور گورنریاں دس ماہ تک رہیں جب 1973 کا آئین بن گیا اور آئین پر تمام ممبران پارلیمنٹ کے دستخط بھی ہو گئے اور 23 مارچ 1973ء کو پاکستان کا آئین نافذ ہو گیا تو مسٹر بھٹو نے حزب اختلاف کے ساتھ رویہ بدل لیا آئین میں ترمیم دو تہائی اکثریت سے کی جا سکتی تھی۔ جب آئین نافذ ہو گیا تو آئین کی جو شقیں پیپلز پارٹی اور مسٹر بھٹو کو منظور نہیں تھیں وہ ترامیم پارلیمنٹ میں پیش کر کے منظور کر لی گئیں اور اس طرح پیپلز پارٹی نے متفقہ طور پر آئین بھی منظور کرا لیا اور اپنی مرضی کی ترامیم بھی کر لیں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو انتہائی متکبر اور خود سر شخصیت کے مالک تھے کسی بہت ہی اچھی شخصیت کو بے عزت کر دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا میاں محمود علی قصوری پیپلز پارٹی کے نائب صدر تھے ان کا احترام ہر مجلس میں کیا جاتا تھا وہ باوقار اور باعزت شخص تھے وہ پاکستان کے چوٹی کے قانون دان تھے وہ پیپلز پارٹی میں تھے پارلیمنٹ کے ممبر بنے وزیر بھی بن گئے ۔ راقم الحروف بھی انہی کی وجہ سے پیپلز پارٹی میں شامل ہوا تھا مسٹر بھٹو کہتے او قصوری تون میری وجہ سے پارلیمنٹ کا ممبر بنا اور وزیر بنا ہے اس اوئے کو قصوری صاحب برداشت نہیں کر سکتے تھے انہوں نے وزارت کو لات مار دی اور پیپلزپارٹی بھی چھوڑ دی۔ راقم الحروف نے بھی اسی زمانے میں پیپلز پارٹی چھوڑ دی۔ مسٹر بھٹو نے کئی بہت بڑے لوگوں کو بھی بے عزت کیا جنہوں نے اس وقت اور بعد میں جب پیپلز پارٹی برسراقتدار ہی تھی پارٹی سے الگ ہو گئے جن میں مختار رانا احمد رضا قصوری جے اے رحیم ڈاکٹر مبشر حسن اور دیگر بہت سارے لوگ بھی شامل تھے یہ صرف پیپلز پارٹی تک ہی ان کا رویہ محدود نہ تھا دوسرے لیڈروں کو شخصیتوں کو بے عزت کرنا بھی ان کا محبوب مشغلہ تھا ولی خان صاحب مفتی محمود صاحب چودھری ظہور الٰہی اور کئی دوسرے لوگوں کو لیڈروں کو انہوں نے بے عزت کیا اور خود بھی ان سے بے عزت ہوئے پارلیمنٹ میں گالی گلوچ ہاتھا پائی تک بھی بات گئی۔ نیشنل عوامی پارٹی کے دو گورنر ارباب سکندر اور غوث بخش بزنجو کو گورنری سے برطرف کر دیا گیا اور ساتھ ہی بلوچستان کی سردار عطاء اللہ خان مینگل وزارت اور صوبہ سرحد کی مفتی محمود وزارت سے احتجاج مستعفی ہو گئے ان دونوں صوبوں میں پیپلز پارٹی بڑی اقلیت میں کامیاب ہوئی تھی صوبہ سرحد کی اسمبلی میں صرف دو ممبر پیپلزپارٹی کے تھے اور بلوچستان میں پیپلز پارٹی کا کوئی بھی ممبر نہیں تھا مگر چند آزاد ممبران کو اپنے ساتھ شامل کر کے اقلیت کی وزارتیں بنا دی گئیں اور نیشنل عوامی پارٹی کے اسمبلی ممبران کو

گرفتار کر لیا گیا اور دو تین ممبران اسمبلی بلوچستان کے قتل بھی ہو گئے تھے۔

ان حالات میں متحدہ جمہوری محاذ نے ملک گیر احتجاج شروع کر دیا جس جگہ بھی جمہوری محاذ جلسہ کرتا پیپلز پارٹی والے حکومت کی مدد سے جلسے خراب کر دیتے حزب اختلاف کا جلسہ کہیں بھی نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ 23 مارچ 1974ء کو راولپنڈی لیاقت باغ میں متحدہ جمہوری محاذ کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں صوبہ سرحد سے ہزاروں کی تعداد میں سرخ پوش رضا کار اور عوام شریک ہوئے اس جلسے کو منتشر کرنے کے لئے فیڈرل سیکورٹی فورس اور پیپلز پارٹی کے رضا کار شامل ہوئے ابھی جلسہ شروع ہی ہوا تھا کہ ہوائی فائرنگ شروع ہو گئی تھی اور ساتھ ہی سرخ پوش رضا کاروں کو گولیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ راقم الحروف بھی اس جلسہ میں شامل تھا بڑی مشکل سے جلسہ گاہ سے بھاگ کر جان بچائی اپنی آنکھوں سے سرخ پوش رضا کار گولیوں سے مرتے ہوئے تڑپتے ہوئے دیکھے تھے تقریباً چار سو کے قریب لوگ زخمی ہوئے تھے جن میں اکثریت سرخ پوش رضا کار تھے اور آٹھ مرے ہوئے لوگوں کی لاشیں تھیں جو جلسہ گاہ میں فیڈرل سیکورٹی فورس اور پیپلزپارٹی کی گولیوں کا نشانہ بنے تھے لاشیں اٹھانے کے لئے ان کے پاس چارپائیاں نہیں تھیں فولڈنگ کرسیوں پر لاشیں ڈال کر وہ اپنی بسوں تک لے گئے تھے پھر وہ بسوں میں ڈال کر لاشیں پشاور وغیرہ لے گئے تھے۔ بیس کے قریب پشاور کے نیشنل عوامی پارٹی والوں کو جو بسیں جلسہ گاہ کے قریب تھیں انہیں جلا دیا گیا تھا۔ قبل ازیں جب نیشنل عوامی پارٹی کی بلوچستان حکومت ختم کی گئی تھی تو عراقی سفارت خانے سے اسلحہ برآمد ہوا تھا ان کا الزام نیشنل عوامی پارٹی پر لگایا گیا تھا کہ انہوں نے یہ اسلحہ ملک میں گڑ بڑ کرنے کے لئے عراق سے منگوایا ہے۔ موچی دروازہ لاہور میں ایک پبلک جلسہ کیا گیا جس میں نواب اکبر بگٹی وعدہ معاف گواہ بنا تھا کہ یہ اسلحہ واقعی نیشنل عوامی پارٹی نے ہی ملک میں بدامنی پیدا کرنے کے لئے منگوایا تھا اور اس کے معاوضہ میں بلوچستان میں میر غوث بخش بزنجو کی گورنری ختم کی گئی تھی سردار عطاء اللہ مینگل کی وزارت ختم کی گئی تھی اور بلوچستان میں گورنر راج قائم کر دیا گیا اور گورنر نواب اکبر بگٹی کو بنا دیا گیا تھا انہیں ایام میں صوبہ سرحد میں پیپلز پارٹی کے لیڈر حیات محمد خان شیرپاؤ پشاور یونیورسٹی کے ایک اجلاس میں شریک ہونے گئے تھے پروگرام کے دوران سٹیج پر ہی دھماکہ ہوا حیات محمد شیرپاؤ جاں بحق ہو گئے گرفتار نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈروں ورکروں کو کیا گیا اس روز جناب ولی خان اپنے ذاتی کام کے لئے لاہور آئے ہوئے تھے ان کے ساتھ ان کا بیٹا بھی تھا واپسی پر گوجرانوالہ کے قریب انہیں گرفتار کر لیا گیا اور دیگر نیشنل عوامی پارٹی کے بہت سارے لوگ گرفتار کر لئے گئے۔

اور حکومت نے نیشنل عوامی پارٹی کو خلاف قانون جماعت قرار دیا اور ساتھ ہی عدالت سے اس اقدام کی تائید حاصل کرنے کے لئے سپریم کورٹ میں ریفرنس پیش کر دیا گیا سپریم کورٹ نے بھی حکومتی اقدام کی توثیق کر دی اور حکومت نے نیشنل عوامی پارٹی کو خلاف قانون کر دینے کے اقدام عدالتی تائید کے ساتھ نافذ کر دیا۔ بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کے لوگوں پر فوج چڑھا

دی گئی اور ہزاروں لوگ حکومتی تشدد سے موت کے منہ میں چلے گئے اور نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈروں پر مقدمات قائم کر دیئے گئے جس کا تذکرہ ہم نیشنل عوامی پارٹی کے باب میں کریں گے۔

پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد

ذوالفقار علی بھٹو آمرانہ ذہنیت کی شخصیت تھے انہیں قدرت نے وہ عوامی طاقت حمایت دی جس کی مثال اس دھرتی میں نہیں ملتی اس بڑی کامیابی سے ان کا غرور اور بھی بہت سارا بڑھ گیا ان کے نزدیک بڑی سے بڑی شخصیت کی کوئی وقعت نہ تھی وہ ہر اپوزیشن لیڈ کی تضحیک کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے وہ افسران کو بھی کوئی اہمیت نہ دیتے تھے اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے مخالف قوتیں بھی منظم ہونا شروع ہو گئیں نیشنل عوامی پارٹی کو خلاف قانون قرار دیا جا چکا تھا ان کے لیڈر گرفتار کئے جا چکے تھے ان پر حیدر آباد ٹریبونل قائم کیا جا چکا تھا ان پر اس انداز سے مقدمات قائم کئے گئے تھے کہ وہ تمام زندگی بھی مقدمات اور عدالتوں کے چکر سے نکل ہی نہیں سکتے تھے اس جماعت کو منتشر کیا جا رہا تھا مگر کچھ لوگوں نے اس انتشار کو بچانے کے لئے نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے نام سے تنظیم قائم کر لی جس سے نیشنل عوامی پارٹی کے ورکر منتشر ہونے سے بچ گئے۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف پاکستان کی جماعتوں نے اتحاد قائم کیا جس کا نام قومی اتحاد تھا جس میں مسلم کانفرنس نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی مسلم لیگ جمعیت علمائے اسلام جمعیت علمائے پاکستان ، جماعت اسلامی تحریک استقلال ، خاکسار تحریک پاکستان جمہوری پارٹی شامل تھی۔ یہ اتحاد لاہور میں رفیق احمد باجوہ ایڈووکیٹ کے گھر میں بنا تھا قومی اتحاد کا صدر جمعیت علمائے اسلام کے مفتی محمود صاحب کو بنایا گیا تھا جبکہ جنرل سیکرٹری جمعیت علمائے پاکستان کے رفیق احمد باجوہ صاحب ایڈوکیٹ بنے تھے قومی اتحاد کا ایک جھنڈا بنایا گیا جو سبز رنگ کا تھا اور اس پر نو ستارے بنے ہوئے تھے نو ستارے نو جماعتوں کی علامت تھی جو قومی اتحاد میں شامل ہوئی تھیں قومی اتحاد بنائے جانے کا مقصد یہ تھا کہ الیکشن 1977ء میں پیپلز پارٹی کے خلاف متحدہ جماعتوں کا ایک ممبر کھڑا کیا جائے بھٹو نے الیکشن کا اعلان کر دیا ہوا تھا جن کی تاریخ 7 مارچ 1977ء کی قومی اسمبلی کے انتخابات کی مقرر کی گئی تھی اور گیارہ مارچ 1977ء کو صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن کی تاریخ مقرر کی گئی تھی اور الیکشن مہم دونوں جانب سے زوروں پر شروع کر دی گئی تھی جلسے جلوس تقاریر بڑے زور شور سے شروع ہو گئے تھے۔ انہیں دنوں گوجرانوالہ میں قومی اتحاد کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں تقریر کرتے ہوئے جمعیت علمائے پاکستان کے صدر حضرت مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا تھا کہ بھٹو حکومت نے جمعہ کو چھٹی کا جو اعلان کیا ہے یہ جولائی 1977ء کو پہلے ہفتہ میں جمعہ کی پہلی چھٹی ہو گی جولائی کے پہلے جمعہ کو پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہو چکی ہو گی پیپلز پارٹی الیکشن ہار جائے گی اگر دھاندلی

کر کے الیکشن جیتے لئے تب بھی 7 جولائی 1977ء کو بھٹو اور پیپلز پارٹی کی حکومت نہیں ہو گی۔
الیکشن کے دوران قومی اتحاد والے جو کچھ سیاست کے مستقبل کے بارے کہتے تھے اس سے محسوس ہوتا تھا کہ پیپلز پارٹی الیکشن ہار جائی گی مفتی محمود صاحب نے الیکشن مہم کے دوران کہا تھا کہ اگر پیپلز پارٹی نے الیکشن میں دھاندلی کی تو قومی اتحاد تحریک چلائے گی اور یہ کہ ایئر مارشل اصغر خان نے ایک سے زیادہ بار یہ کہا تھا کہ بھٹو کے اقتدار کا خاتمہ لکھا جا چکا ہے اور بھٹو کو کوہالہ آزاد کشمیر میں دریا کے پل پر پھانسی دی جائے گی لیکن الیکشن کے نتائج کے بارے میں پیپلز پارٹی والے بہت ہی مطمئن تھے وہ کہتے تھے کہ لوگ ہمارے ساتھ ہیں اور بعد کے نتائج سے یہ ثابت ہوا کہ لوگ پیپلز پارٹی کے ساتھ تھے آج 17 سال گزر جانے کے باوجود پاکستان کے عوام کثرت سے پیپلز پارٹی کے ساتھ ہیں - سات مارچ 1977ء کو جب قومی اسمبلی کے الیکشن ہو رہے تھے - راقم الحروف نے اپنے حلقہ سیٹلائٹ ٹاؤن میں ووٹ ڈالا تھا اس حلقے میں قومی اتحاد کا ووٹ زیادہ تھے - اپنا خیال تھا پیپلز پارٹی والے اس حلقہ سے 20 فیصد سے زائد ووٹ نہیں لیں گے جبکہ شام کو اس حلقہ سے پیپلز پارٹی نے 38 فیصد سے زائد ووٹ لئے تو مجھے یقین ہو گیا کہ الیکشن پیپلز پارٹی نے جیت لیا ہے اور پھر پیپلز پارٹی کی جیت کا اعلان بھی ہوا اور دھاندلی کا الزام بھی لگایا گیا مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ کہ اگر چند سیٹوں پر پیپلز پارٹی دھاندلی نہ بھی کرتی تب بھی پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی نے الیکشن جیتا ہوا تھا۔ سات مارچ کے نتائج میں صوبہ سرحد میں سارے ممبر قومی اتحاد کے ہی کامیاب ہوئے تھے اور بلوچستان میں بلوچ لیڈر جیلوں میں بند تھے اور نیشنل عوامی پارٹی خلاف قانون ہونے کی وجہ سے اور دیگر کئی وجوہات کی بناء پر قومی اتحاد نے بائیکاٹ کیا ہوا تھا اس وجہ سے اگر پیپلز پارٹی جو چند سیٹوں پر پنجاب اور سندھ میں دھاندلی کی گئی اگر نہ بھی کرتی تو بھی جیت چکی تھی۔

7 مارچ 1977ء کے دن الیکشن کے نتائج اور قومی اتحاد کی شکست کے بعد 10 مارچ کو ہونے والے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا قومی اتحاد نے بائیکاٹ کر دیا۔ اور ساتھ ہی حکومت کے خلاف تحریک کا اعلان کر دیا گیا اور تحریک شروع ہو گئی۔

ملک کا 98 فیص تجارتی طبقہ قومی اتحاد کے ساتھ بڑی منظم طریقہ پر الیکشن کی دھاندلی کے خلاف تھا سارے ملک میں منظم تحریک چل رہی تھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پس پردہ حکمران اب تحریک کی کوئی زیادہ مخالفت نہیں کر رہے اگر حکومتی اہل کار چاہتے پاکستان کے اصل حکمران نوکر شاہی اور فوج چاہتی تو تحریک کو کچل دیا جا سکتا تھا مگر تحریک پر کبھی کبھی لاٹھی چارج بھی ہوتا تھا کہیں کہیں گولی بھی چلتی تھی مگر تحریک رواں دواں تھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جس جگہ گولی چلنی ہوتی تھی باقاعدہ ماحول پیدا کیا جاتا تھا نامور لوگوں پر لیڈروں پر خاص لوگوں پر گولی نہیں چلائی جاتی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تحریک خفیہ ہاتھ کے اشاروں پر چل رہی تھی اور ایسے لوگ جو ایک پولیس کے سپاہی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر سکتے تھے وہ بہت بڑے

افسران کے آگے بھنگڑا ڈال رہے ہوتے تھے۔

پھر تحریک کو نظام مصطفیٰ کا نام دیا گیا اور پھر تحریک کے جلوسوں میں صرف کلمہ طیبہ کا ہی ورد ہوتا تھا غرض یہ بات سو فیصد درست تھی کہ قومی اتحاد کی اس تحریک کے پیچھے خفیہ ہاتھ کارفرما تھا تین ماہ تک مسلسل تحریک جاری رہنے کے بعد ماہ جون میں جب قومی اتحاد کی اس تحریک میں کمزوری کے آثار نمایاں ہونے لگ گئے تو سرکاری مشنری بھی علانیہ تحریک کی حمایت کرنے لگ گئی ریڈیو ٹیلی ویژن پر سے قومی اتحاد کی خبریں بڑھ چڑھ کر نشر ہونے لگ گئیں۔ اور آخر پانچ جولائی کی رات کو جنرل ضیاء الحق کی زیر قیادت فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور تمام لیڈروں بشمول مسٹر بھٹو کے گرفتار کرکے مری کے ریسٹ ہاؤس میں نظر بند کر دیئے گئے۔

ذوالفقار علی بھٹو اور پیر پگاڑا

پیپلز پارٹی اور ضیاء الحق کی فوجی حکومت

پیپلز پارٹی کی حکومت کا تختہ الٹ کر جنرل ضیاء الحق کمانڈر انچیف افواج پاکستان نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تمام لیڈران کو گرفتار کر لیا گیا اور انہیں مری ریسٹ ہاؤس میں نظر بند کر دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنی پہلی نشری تقریر میں اعلان کیا تھا کہ 1973ء کے آئین کے مطابق 90 روز کے اندر پارلیمنٹ کے انتخابات کروائے جائیں گے۔ چند روز بعد نظر بند لیڈروں کو الیکشن مہم کے لئے رہا کر دیا گیا اور دونوں گروپ قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی نے الیکشن مہم بڑی تیزی سے شروع کر دی۔ شروع شروع میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ الیکشن واقعی ہو جائیں گے مگر جب جنرل ضیاء الحق کو یہ معلوم ہونے لگ گیااور خفیہ رپورٹوں کے ذریعے بھی جب ضیاء الحق کو پختہ یقین ہو گیا کہ 90 روز کے اندر ہونے والے الیکشنوں میں بھی پیپلز پارٹی ہی اکثریت سے کامیاب ہو گی تو حکومت نے الیکشن غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیئے اور پیپلز پارٹی کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا گیا اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا مگر بعد میں ان پر نواب احمد خان قصوری کے قتل کے الزام میں مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ وقوعہ ایسے قائم کیا گیا کہ احمد رضا قصوری جو کہ پیپلز پارٹی کا راندہ درگاہ ممبر پارلیمنٹ تھا جو کہ منہ پھٹ بھی تھا نیم پاگل بھی تھا جس کو قتل کرانے کے لئے فیڈرل سیکورٹی فورس کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی ایک رات وہ کسی دعوت سے واپس آ رہے تھے ان کی کار پر فائرنگ کی گئی جس سے احمد رضا قصوری تو بچ گئے مگر ان کے والد نواب احمد خان قصوری قتل ہو گئے۔ پولیس نے استغاثہ اس طرح قائم کیا تھا کہ بھٹو صاحب اپنے مخالف احمد رضا قصوری کو قتل کرانے کے لئے فائرنگ کرائی تھی قدرتی طور پر احمد رضا قصوری بچ گئے اور ان کے والد قتل ہو گئے احمد رضا قصوری نے ایف آئی آر میں وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو اس قتل کا ملزم نامزد کیا تھا۔ اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف سٹی مجسٹریٹ لاہور کی عدالت میں قتل کا مقدمہ پولیس نے دائر کر دیا سٹی مجسٹریٹ لاہور نے سماعت کے اختیارات سے بڑا مقدمہ ہونے کا عذر پیش کرتے ہوئے مقدمہ واپس کر دیا۔ یہی مقدمہ لاہور کی سیشن عدالت میں پیش کیا گیا۔ سیشن جج نے بھی عدم اختیارات کا عذر پیش کرتے ہوئے مقدمہ واپس کردیا بلا آخر یہ مقدمہ ہائی کورٹ میں پیش کیا گیا ہائی کورٹ نے نواب محمد احمد خان قصوری کے قتل کی سماعت کے لئے پانچ ججوں کا ٹریبونل قائم کر دیا سماعت مقدمہ شروع ہو گئی درمیان میں دو ججوں کو تبدیل بھی کیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف اس مقدمہ کی سماعت کرنے والے ٹرابیونل کے چیئرمین جناب مولوی مشتاق صاحب تھے اس مقدمہ میں دیگر شہادتوں کے علاوہ فیڈرل سیکورٹی فورس کے افسران جنھوں نے قتل کیا تھا ان میں مسٹر مسعود محمود ڈائرکٹر فیڈرل سیکورٹی فورس وعدہ معاف گواہ بن گئے۔ دیگر افسران جن میں جناب عباس صاحب آئی جی فیڈرل سیکورٹی فورس بھی شامل تھے انہوں نے عدالت میں اقرار جرم کرتے ہوئے کہا تھا کہ نواب محمد احمد خان قصوری

کو ہم لوگوں نے وزیر اعظم پاکستان کے حکم کے مطابق جس میں کہا گیا تھا کہ احمد رضا قصوری ممبر پارلیمنٹ جو میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے اسے ٹھکانے لگا دیا جائے قتل کر دیا جائے ہم نے مسٹر بھٹو کے حکم کے مطابق مسٹر احمد رضا قصوری کو قتل کرنا تھا اسی وجہ سے ہم نے ان کی گاڑی پر فائرنگ کی تھی احمد رضا قصوری کی بجائے ان کے والد محمد احمد خان قتل ہو گئے تھے سیکورٹی فورس کے افسران مذکورہ نے اپنے تمام بیانوں میں اقبال جرم کیا اور عذر یہ پیش کیا کہ ہمیں چونکہ وزیر اعظم پاکستان نے حکم دیا تھا اس لئے ہم بے گناہ ہیں اگر قتل مذکورہ کا کوئی گناہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف ذوالفقار علی بھٹو کا ہی ہو سکتا ہے اگر قتل مذکورہ قتل بلا ارادہ ہے تو ارادہ صرف مسٹر بھٹو کا ہی تھا وہی اس کے سزاوار ہو سکتے ہیں۔ پیپلز پارٹی کی طرف سے مقدمہ کی پیروی جناب یحیٰی بختیار ایڈووکیٹ نے کی اور آخر کار ہائی کورٹ کے اس فل بنچ نے جناب ذوالفقار علی بھٹو اور فیڈرل سیکورٹی فورس کے مندرجہ ملزم ملازمین اور افسران کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا مقدمہ سپریم کورٹ

ہائی کورٹ کے حکم سزائے موت کے خلاف جناب ذوالفقار علی بھٹو کے وارثان اور پیپلز پارٹی نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی سماعت اپیل کے لئے ایک فل بنچ تشکیل دیا گیا جس میں جج صاحبان کی تعداد گیارہ تھی اول ذوالفقار علی بھٹو نے سپریم کورٹ کے جج صاحبان پر عدم اعتماد کا اظہار کیا مگر بعد میں جج صاحبان نے جناب بھٹو کو یقین دلایا کہ وہ اس مقدمہ قتل میں انصاف کریں گے ہرگز جانب دار نہیں بنیں گے اور جناب بھٹو سے کہا گیا کہ وہ اگر اس مقدمہ کے سلسلہ میں مزید کوئی بیان یا شہادت صفحہ مثل پر لانا چاہتے تو وہ بھی عدالت سنے گی۔

اس یقین دہانی پر مسٹر بھٹو نے عدالت عالیہ سپریم کورٹ کے ساتھ تعاون کا فیصلہ کر لیا اور انہوں نے عدالت میں تحریری بیان بھی دیا جس میں مقدمہ مندرجہ بالا کے تمام محرکات بیان کئے اور عدالت عالیہ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ مقدمہ مندرجہ بالا صرف مجھے قتل کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے ورنہ میں بے گناہ ہوں اور یہ کہ احمد رضا قصوری کے ساتھ میری کوئی پرخاش نہ تھی اسے قتل کر کے میں کوئی بھی مقاصد حاصل نہیں کر سکتا تھا اور اس بیان میں قومی اتحاد کی تحریک کا ذکر بھی کیا گیا اور اس بیان کی روشنی میں بھٹو صاحب نے راولپنڈی جیل میں ایک کتاب بھی لکھی تھی جو کہ اس زمانے میں ہندوستان سے شائع ہوئی تھی اس میں یہ سب باتیں بیان کی گئیں تھیں اور اس میں یہ اعتراف بھی کیا گیا تھا کہ اگر میں نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ نہ بگاڑتا تو شاید معاملات اس حد تک آگے نہ چلے جاتے میں نے گزشتہ صفحات میں لکھا ہے کہ بھٹو حکومت میں سب سے زیادہ ظلم کا نشانہ نیشنل عوامی پارٹی کو بنایا گیا تھا اس جماعت کے

لیڈران پر بہت بڑے بڑے مقدمات بھی قائم کیے گئے تھے بہت سارے لوگ جن میں سردار عطاء اللہ خان مینگل کا صاحب زادہ بھی شامل ہے قتل کر دیئے گئے تھے جب بھٹو پر مقدمہ قتل بن چکا تھا بھٹو جیل میں تھا تو جنرل ضیاء الحق نے حیدر آباد ٹریبونل ختم کر کے نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈران پر سے تمام مقدمات بھی ختم کر دیئے گئے تھے تو نیشنل عوامی پارٹی کے صدر جناب ولی خان نے ایک بیان میں کہا تھا پہلے احتساب کیا جائے اور بعد میں انتخاب کرائے جائیں ضیاء الحق کو ولی خان کی یہ بات بہت پسند آئی انہوں نے انتخابات ختم کر کے احتساب کا عمل جاری کیا تھا اور ایسے ہی ایک موقع پر ولی خان نے بھٹو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا سانپ فوجی کے بوٹ کے نیچے ہے اگر سانپ کچلا گیا تو فوجی بچ جائے گا' اگر سانپ بچ گیا تو فوجی کو ڈس لے گا۔ انہیں حالات کی روشنی میں شاید مسٹر بھٹو نے اپنے بیان میں اور اپنی آخری تصنیف میں یہ اقرار کیا تھا کہ اگر ولی خان سے نہ بگاڑتا تو بات بن سکتی تھی۔ آخر سپریم کورٹ نے بھٹو کی اپیل خارج کر دی اور لاہور ہائی کورٹ کا فیصلہ بحال رکھا مسٹر بھٹو کو ایک اور موقعہ درخواست نظر ثانی کا دیا گیا درخواست نظر ثانی کا مطلب یہ تھا کہ مقدمہ بالا میں کوئی ایسا امر جو صفحہ مثل پر نہ آیا ہو وہ بھی اگر نظر ثانی میں پیش کیا جا سکتا ہو تو وہ بھی پیش کر دیا جائے۔ نظر ثانی کی درخواست عدالت سپریم کورٹ نے متفقہ طور پر خارج کر دی۔ اور ہائی کورٹ کا فیصلہ متفقہ طور پر بحال رکھا گیا اور اس دوران جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دونوں بیٹے ملک سے باہر جا چکے تھے بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھی نظر بندی کی زندگی گزار رہی تھیں آخری ضابطہ کارروائی کے تحت سزائے موت کے ملزم کو اپنے عزیز و اقارب سے ملاقات کا آخری موقعہ دیا جاتا ہے اس آخری ملاقات کے لئے 3 اپریل 1979ء کو بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر کو راولپنڈی جیل میں لایا گیا جب ملاقات ختم ہوئی تو انہیں پتہ چلا کہ یہ ان کی مسٹر بھٹو سے آخری ملاقات تھی وہ دونوں ماں بیٹی راولپنڈی جیل سے روتی کرلاتی ہوئیں واپس بذریعہ ہوائی جہاز لاڑکانہ بھیج دی گئیں اور چار اپریل کو آدھی رات کے وقت مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا موت کے اس عمل نے پاکستان میں بسنے والے کثیر تعداد کو سوگوار بنا دیا بیرون ملک بھی بھٹو کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا صبح ہونے سے قبل ہی بھٹو صاحب کی میت بذریعہ ہوائی جہاز لاڑکانہ کے قریب گڑھی خدا بخش میں جہاں انہیں دفن کرنا تھا پہنچا دی گئی۔ اور ان کے چند رشتہ داروں نے ان کی نماز جنازہ اور آخری رسومات میں شرکت کی اگر جنازہ میں عام لوگوں کو شامل ہونے کی اجازت ہوتی تو لاکھوں لوگ جنازے میں شریک ہوتے اور شاید کئی ان کے ماننے والے ان پر نچھاور بھی ہو جاتے۔

پیپلز پارٹی اور بھٹو خاندان

ضیاء الحق کے اقتدار پر قبضہ کر لینے کے بعد بھٹو اور ان کے خاندان پر عتاب نازل ہونا شروع ہو گئے۔ بھٹو گرفتار ہوئے مقدمہ قتل میں انہیں موت کی سزا ہوئی اور وہ اس دنیا میں نہ رہے۔ مگر بھٹو خاندان بھی زیر عتاب ہو گیا مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو افغانستان چلے گئے اور پھر وہاں سے دیگر ممالک میں چلے گئے۔ بیگم نصرت بھٹو بے نظیر بھٹو ملک میں رہتی تو عموماً نظر بند رہتی۔ جب کبھی نصرت اور بے نظیر بھٹو لوگوں میں جاتیں تو لوگ دیوانہ وار ان کی طرف جاتے ان کی عزت کرتے احترام کرتے حکومت کو بھٹو خاندان کا یہ احترام اچھا نہیں لگتا تھا اور اس لئے بھٹو مستورات 1986ء تک نظر بند رہیں۔ اور کارکنان پیپلز پارٹی بھی زیر عتاب ہی رہے ہزاروں کارکنان کو پابند سلاسل کیا گیا لاکھوں کارکن بھاگ کر بیرون ملک چلے گئے ملک کے اندر جو لوگ پیپلز پارٹی کے خلاف تھے وہ لوگ قومی اتحاد کی جماعتوں میں شامل تھے عوام میں تجارت پیشہ لوگ اکثریت کے ساتھ پیپلز پارٹی کے خلاف تھے اور یہی لوگ ضیاء الحق کے حامی بھی کسی حد تک تھے قومی اتحاد کے لیڈران وقت بے وقت الیکشن کروانے کا ضیاء الحق سے مطالبہ کرتے رہتے تھے کیونکہ 1977ء کی تحریک بھی الیکشن کی دھاندلی کے خلاف ہی چلائی گئی تھی مگر ضیاء الحق کو مسلسل یہ خفیہ رپورٹیں مل رہی تھیں کہ کہ لوگ بھٹو کی موت کے بعد بھی پیپلز پارٹی کے ساتھ ہی ہیں اس وجہ سے وہ الیکشن کروانے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ 1981ء میں ملک بھر میں غیر جماعتی طور پر بلدیاتی انتخابات کرائے گئے جن میں اکثریت پیپلز پارٹی کے لوگ ہی کامیاب ہوئے ان نتائج کو دیکھ کر جنرل ضیاء الحق نے الیکشن کرانے کے مطالبہ پر توجہ کرنا چھوڑ دی اور کہنا شروع کر دیا گیا کہ پارلیمانی نظام جمہوریت مغرب کے لوگوں کا کافروں کا طریقہ کار ہے اس لئے ملک میں شورائیت کا نظام رائج کیا جائے گا۔ اور پھر ایک مجلس شوریٰ مرکز میں قائم کی گئی جس کے ممبران کو وہ مکمل اختیارات تھے جو سابقہ دور میں پارلیمنٹ کو حاصل ہوتے تھے۔ شوریٰ کے ممبر پیپلز پارٹی اور نیشنل ڈیموکریٹ پارٹی کے علاوہ تمام جماعتوں سے لئے گئے تھے پیپلز پارٹی کے صرف وہ لوگ ہی لئے گئے تھے جو ہر حاکم کے ساتھ ہر دور میں رہتے ہیں مگر نیشنل ڈیموکریٹ پارٹی نے مجلس شوریٰ میں شامل ہونے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ وہ مجلس شوریٰ میں شمولیت کو غیر جمہوری فعل سمجھتے تھے قبل ازیں جب مارشل لاء کی حکومت نے بلدیاتی الیکشن کرائے تھے اس میں ہمارے گوجرانوالہ کی میونسپل کمیٹی کی 32 سیٹیں تھیں جن میں پیپلز پارٹی کے لوگوں کی 22 نشستیں تھیں مگر میونسپل کمیٹی کا صدر پیپلز پارٹی کا آدمی نہیں بننے دیا گیا تھا کمیٹی کے کچھ پیپلز پارٹی کے ممبران کی عدالتی حکم سے ممبری ہی ختم کر دی گئی تھی اور کچھ ممبر ایسے تھے جو سرکاری ممبران

کے ساتھ ہی مل گئے صدر بلدیہ مسلم لیگی بن گیا تھا یہی صورت حال سارے ملک میں ہوئی تھی۔
جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے 1984ء میں غیر جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرائے جس میں انفرادی طور پر لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا مسلم لیگ کے ورکروں لیڈروں جماعت اسلامی نے جمعیت علمائے اسلام جمعیت علمائے پاکستان اور سوائے نیشنل ڈیمو کریٹ پارٹی کے تمام جماعتوں پیپلز پارٹی کے اقتدار پرست لوگوں نے بھی حصہ لیا جو ہر حکومت میں شامل ہو جایا کرتے ہیں پھر ان میں سے بہت سارے پارلیمنٹ کے ممبران اسمبلیوں کے ممبران مسلم لیگ میں شامل ہو گئے مرکز اور صوبوں میں مسلم لیگی حکومتیں بن گئیں ان میں سے کئی لوگ جو پیپلز پارٹی کے تھے وہ بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور بعد میں جب پیپلز پارٹی کی حکومت بنی تو یہ لوگ پھر واپس پیپلز پارٹی میں آ گئے۔ بھٹو مرحوم کی وفات کے بعد سے لے کر جب تک پیپلز پارٹی اقتدار میں آ گئی اس وقت بیگم نصرت بھٹو بے نظیر بھٹو بدستور یہی کہتی رہیں کہ کہ بھٹو مرحوم کو دنیا کی ایک بہت بڑی طاقت نے مروایا ہے وہی طاقت ہماری دشمن ہے مرتضٰی بھٹو اور شاہنواز بھی بیرون ملک یہی تاثر دیتے رہے کہ ہمارا دشمن امریکہ ہے۔ مرتضٰی بھٹو اور شاہنواز بھٹو زیادہ وقت کابل میں ہی رہے پھر شام اور لیبیا وغیرہ بھی گئے ان دونوں بھائیوں نے کابل میں ہی شادیاں کی تھیں شاہنواز بھٹو بعد میں فرانس چلے گئے جہاں انہیں زہر دے کر مروایا گیا تھا تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ان کی کابلی بیوی بھی قتل کی سازش میں شریک تھی اور فرانس کی پولیس نے شاہنواز قتل کیس میں ان پر یہ الزام عائد کیا تھا اور انہیں اعانت قتل میں سزا بھی ہوئی تھی۔
مرتضٰی بھٹو زیادہ وقت مسلم ملکوں میں ہی رہے انہیں ایام میں پاکستان سے ایک طیارہ بھی اغواء کیا گیا تھا جسے کابل ہوائی اڈے پر اتارا گیا تھا جس میں سے ایک پاکستان نوجوان افسر کو قتل کر دیا گیا تھا اس طیارے کے اغواء اور جو اس طیارہ میں کابل کے ہوائی اڈہ پر پاکستانی نوجوان افسر قتل ہوا تھا ان کا الزام بھی مرتضٰی بھٹو پر لگایا گیا طیارہ اغواء کرنے والوں نے مطالبہ پیش کیا تھا کہ ہم الذوالفقار تنظیم کی لوگ ہیں اور انہوں نے پاکستانی جیلوں میں پیپلز پارٹی کے تقریبا 300 قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا تھا جنہیں حکومت پاکستان نے رہا کر دیا تھا طیارہ اور مسافروں کو شام کے ہوائی اڈہ پر طیارہ اغواء کنندگان سے رہا کرا لیا گیا تھا اور پھر اس طیارہ کے تمام مسافروں کو مکہ شریف لے جا کر عمرہ کرایا گیا تھا اور بعد میں انہیں منزل مقصود پر روانہ کر دیا گیا تھا اور اس دوران بھٹو بیگمات جب بھی وہ ملک کے اندر ہوتیں تو گھر میں نظر بند رہتی تھیں اور کبھی بیرون ملک بھی چلی جاتی تھیں۔ اس دوران ملک کے اندر کئی تشدد کے واقعات بھی ہوئے حکومت نے تشدد کے ان واقعات کے الزام پیپلز پارٹی پر ہی لگائے کئی لوگ شک کی بناء پر جیلوں میں پھانسیوں پر بھی چڑھا دیئے گئے اور کئی نوجوانوں کو بہت بڑی بڑی سزائیں دی گئیں تھی۔ چیف جسٹس مولوی مشتاق اور ان کے ساتھ ہی چودھری ظہور الٰہی بھی تھے ان کی کار پر آتشیں اسلحہ سے حملہ

کیا گیا ڈرائیور سمیت تینوں شخصیات موقع پر ہی لقمہ اجل بن گئے تھے اس شک میں کئی پیپلز پارٹی کے ورکر پکڑے گئے جن میں عبدالرزاق جھرنا بھی شامل تھا جنہیں سزائے موت دی گئی اور بڑی بڑی قید کی سزائیں دی گئیں ہر وہ شخص جو سیاسی سوجھ بوجھ رکھتا تھا وہ کہتا تھا کہ پیپلز پارٹی کی پالیساں امریکہ کو پسند نہ تھیں اس وجہ سے جناب بھٹو کو سزا موت بھی ہوئی اور پیپلز پارٹی زیر عتاب بھی آئی۔ اور کئی بار بیگم نصرت بھٹو نے کہا کہ ہم پر عتاب امریکہ کی جانب سے ہے اور ہم اصولوں پر کبھی بھی کسی سے بھی سودے بازی نہیں کریں گے۔ انہیں ایام پیرس میں شاہنواز بھٹو کو زہر دے کر ہلاک کرنے کا واقع ہوا اس کا الزام بھی بیگم نصرت بھٹو نے امریکہ اور پاکستان کی فوجی حکومت پر لگایا - بھٹو خاندان بدستور امریکہ پر الزامات لگا رہا تھا مگر ساتھ ہی یہ خبریں بھی آنا شروع ہو گئیں کہ مس بے نظیر بھٹو صاحبہ امریکہ یاترا کو جا رہی ہیں اسی موقعہ پر شاید حبیب جالب نے بے نظیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ امریکہ نہ جا کڑے مگر مس بے نظیر بھٹو صاحبہ امریکہ گئیں اور امریکی حکومت سے قول قرار کئے اور شاید امریکی حکومت نے ضیاء الحق حکومت کو اشارہ کر دیا اور ضیاء الحق نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ آئندہ انتخابات جماعتی بنیادوں پر کرائیں گے امریکہ کے اشارے پر پیپلز پارٹی کو گرین سگنل دے دیا گیا۔

جب بے نظیر بھٹو امریکہ سے لاہور کے ہوائی اڈے پر مورخہ 10 اپریل 1986ء کو پہنچی تو لاکھوں لوگوں نے ان کا استقبال کیا ہوائی اڈہ سے لر کر منٹو پارک تک لوگ ہی لوگ جمع تھے آج تک کسی بھی شخصیت کا اتنا بڑا استقبال نہیں ہوا تھا اس لاکھوں کے ہجوم میں چند لوگ ایسے بھی تھے جو امریکہ کا جھنڈا جگہ جگہ جلا رہے تھے اور یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ پیپلز پارٹی امریکہ کے خلاف ہے اس لئے اس بہت بڑے استقبال میں امریکہ کا جھنڈا جلایا جا رہا ہے۔ مگر دوسرے ہی دن مس بھٹو نے تردید کر دی کہ ہم نے امریکی جھنڈا نہیں جلایا امریکی جھنڈے حکومت نے پیپلز پارٹی کے امریکہ کے ساتھ تعلقات کو خراب کرنے کے لئے جلائے ہیں۔

اس روز منٹو پارک میں لاکھوں کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے ضیاء الحق کی حکومت کو للکارا اور کہا کہ آج کا پیپلز پارٹی کا یہ عظیم اجتماعات ضیاء الحق کی حکومت کے ریفرنڈم ہے آج عوام کا یہ عظیم اجتماع خالی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی یہ اہلیت رکھتا ہے کہ وہ ایوان اقتدار پر قبضہ کر لے مگر ہم اقتدار کے حصول کے لئے روایتی طریقہ ہی اپنائیں گے اور حکومت سے مطالبہ کریں گے کہ وہ ملک بھر میں جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرائے اور عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار منتقل کریں پھر مس بھٹو نے ملک بھر کا دورہ کیا سارے ملک میں بے نظیر بھٹو کا والہانہ استقبال کیا گیا لوگوں نے بڑھ چڑھ کر پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا۔ جنرل ضیاء الحق نے پہلے کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرائیں گے مگر بھٹو خاندان کی یہ عوامی پذیرائی دیکھی تو جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانے کا ارادہ ترک کر دیا پھر کہنا شروع کر دیا کہ اگر مجھے پاکستان کے الیکشن ہزار دفعہ بھی

کرانے پڑے تب بھی غیر جماعتی بنیادوں پر ہی الیکشن کرائیں گے اور پاکستان کی جماعتی سیاست پھر ایک دفعہ جمود کا شکار ہو گئی۔ 1987ء کے آخر میں محمد خان جونیجو حکومت کو برطرف کر دیا گیا جونیجو حکومت پر بددیانتی اقرباء پروری کا الزام بھی لگایا گیا تھا مگر ضیاء الحق کسی قیمت پر بھی جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانے کے لئے تیار نہ تھے اس دوران پیپلز پارٹی کی سیاست پر حکومت کی جو گرفت تھی ڈھیلی پڑنا شروع ہو گئی لوگوں میں بھی جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانے کا مطالبہ زور پکڑنے لگ گیا حکومت امریکہ اور سیاسی اجارہ داروں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان میں جماعتی بنیادوں پر جنرل الیکشن ہونے چاہئیں۔ آخر 17 اگست 1988ء کو جنرل ضیاء الحق بہاولپور کے قریب ایک ہوائی حادثہ میں جاں بحق ہو گئے اور ان کی جگہ مسند صدارت پر متمکن ہونے والے غلام اسحاق خان نے پاکستان میں جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا۔ قصر صدارت کے اس اعلان نے ملکی سیاست کا رنگ ہی بدل دیا جلسے جلوس اشتہارات بینر پیپلز پارٹی پوری طاقت کے ساتھ الیکشن میں حصہ لینے کے لئے میدان عمل میں آ گئی دیگر پارٹیوں نے بھی الیکشن حکمت عملی میں مناسب تبدیلی کر لی۔ دسمبر 1988ء میں ہونے والے الیکشنوں میں ملکی سطح پر پیپلز پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی مگر پنجاب میں نواز شریف اور جنرل ضیاء الحق کی حمایتی مسلم لیگ کو اکثریت حاصل ہو گئی صوبہ سرحد میں کسی جماعت کی اکثریت نہ بن سکی اس طرح بلوچستان میں بھی کوئی جماعت اکثریت حاصل نہ کر سکی جبکہ سندھ میں پیپلز پارٹی کو واضح اکثریت حاصل ہو گئی۔

حکمران پیپلز پارٹی

16 اکتوبر 1988ء کے جنرل الیکشن میں کامیابی کے بعد مرکز میں پیپلز پارٹی کو اکثریت حاصل ہو گئی اور مس بے نظیر بھٹو صاحبہ نے بحیثیت وزیر اعظم پاکستان حلف اٹھایا اور گیارہ سال بعد پیپلز پارٹی دوبارہ برسراقتدا آ گئی اور حکومت نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ضیاء الحق کے دور حکومت میں پیپلز پارٹی کے جو کارکن جیلوں میں تھے یا جن پر مقدمات بنے ہوئے تھے ان کی رہائی اور مقدمات ختم کرانے کی طرف توجہ دی گئی اور بہت جلد اس کام سے نپٹ لیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے بہت سارے کارکن بیرون ملک تھے جو واپس آ گئے بہت سارے کارکنوں پر مقدمات بنے ہوئے تھے وہ ختم کیے گئے بہت سارے کارکن جیلوں میں بہت لمبی قیدیں کاٹ رہے تھے۔ وہ رہا کر دیئے گئے - اس طرح پیپلز پارٹی عتاب کے دور سے نکل کر حکمرانی کے دور میں داخل ہو گئے۔

مرکز میں پیپلز پارٹی کو اکثریت حاصل تھی مگر حکمرانی کو مضبوط کرنے کے لئے ایم کیو ایم کو اور عوامی نیشنل پارٹی کو بھی ساتھ ملا لیا ایم کیو ایم کو سندھ میں بھی حکومت میں شریک کیا گیا مگر شروع ہی سے پیپلز پارٹی نے اپنے حلیف جماعتوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ایم کیو ایم سندھ حکومت میں شامل تھی مگر حیدر آباد میں پکہ قلعہ کے علاقہ میں مہاجرین پر گولی چلائی گئی جس سے بہت لوگ مارے گئے اور ایم کیو ایم سندھ حکومت سے علیحدہ ہو گئے اس طرح صوبہ سرحد میں عوامی نیشنل پارٹی اور پیپلز پارٹی کا اتحاد ہوا تھا کہ صوبہ سرحد کی کولیشن حکومت کی صورت حال میں وزیر اعلیٰ پیپلز پارٹی کا ہو گا اور گورنر عوامی نیشنل پارٹی کا ہو گا مگر جب سرحد میں شیرپاؤ حکومت بن گئی اور سرحد حکومت نے دیگر ممبران اسمبلی سے رابطہ استوار کر لیا اپنے ساتھ ملا لیا تو عوامی نیشنل پارٹی کا وعدہ ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا گورنر بھی ان کا نہیں بنایا اور جو وزیر بنا رکھے تھے ان کے اختیارات بھی چھین لئے گئے اور پھر عوامی نیشنل پارٹی بھی پیپلز پارٹی سے الگ ہو گئی۔

پنجاب میں نواز شریف کی مسلم لیگی حکومت تھی جو بڑی طاقت کے ساتھ چل رہی تھی - وزیر اعظم پاکستان مس بے نظیر بھٹو صاحبہ نہ چاہنے کے باوجود کہ نواز شریف کی مسلم لیگی حکومت انہیں پسند نہ تھی مگر وہ اس حکومت کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے افغانستان کے مسئلہ پر بھی پیپلز پارٹی کی پالیسی ضیاء الحق حکومت جیسی ہی تھی مداخلت بدستور جاری رہی خانہ جنگی ہوتی رہی بے گناہ لوگ مرتے رہے کٹتے رہے مگر پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی - یعنی پالیسی کے اعتبار سے ضیاء الحق کی حکومت اور پیپلز پارٹی کی حکومت میں کوئی فرق نظر نہیں آیا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ خفیہ ہاتھ اپنی پوری طاقت سے بے نظیر بھٹو حکومت سے وہی پالیسی جاری رکھنے پر متحرک تھا جو سابقہ ضیاء الحق کے دور میں موجود تھی۔

بے نظیر بھٹو کی حکومت بڑی مستحکم طریقہ پر چل رہی تھی خبریں آنا شروع ہو گئیں کہ پیپلز

پارٹی کی حکومت ختم ہو رہی ہے بظاہر کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی تھی جس سے یہ محسوس کیا جا سکتا ہو کہ واقعی بے نظیر حکومت جا رہی ہے۔ پارلیمنٹ کا اعتماد بھی پیپلز پارٹی کو حاصل تھا عدم اعتماد کا کوئی خطرہ بھی نہیں تھا ایک روز راقم الحروف نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کسی اخبار نویس نے صدر پاکستان غلام اسحاق خان سے سوال کیا کہ کیا آپ بے نظیر حکومت کو ختم کر رہے ہیں پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں توڑ رہے ہیں اس کے جواب میں صدر غلام اسحاق خان نے یہ کہا کہ میں آئین کے علاوہ کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا اور پاکستان کے آئین 1973ء میں آٹھویں ترمیم ہو جانے کے بعد صدر کو یہ اختیارات ہیں کہ کوئی بھی الزام لگا کر پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں اور حکومت توڑ دیں اور جب صدر کے پاس اختیارات ہوں تو وہ کسی وقت بھی کسی بھی حکومت کو توڑ سکتا ہے۔ چنانچہ 20 ماہ بعد 6 اگست 1990ء کو صدر غلام اسحاق خان نے ایک فرمان جاری کیا جس کے تحت مرکزی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں مرکز اور صوبوں کی حکومتیں توڑ دیں اور ایک نگران حکومت قائم کر دی جس کے سربراہ نیشنل پیپلز پارٹی کے غلام مصطفیٰ جتوئی بنائے گئے۔ وزیر اعظم جتوئی نے اعلان کر دیا کہ وہ 90 روز کے اندر الیکشن کرائیں گے اور یہ الیکشن منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہوں گے۔ اور اس طرح پیپلز پارٹی کی حکومت 20 ماہ رہنے کے بعد ختم کر دی گئی۔

1990ء کے الیکشن اور پیپلز پارٹی

مس بھٹو کی حکومت ختم ہو جانے کے بعد نگران وزیر اعظم نے 90 روز کے اندر الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا اور پورے ملک میں الیکشن کی تیاریاں بڑی دھوم دھام کے ساتھ شروع ہو گئیں عام تاثر یہ پیدا ہو گیا تھا کہ پیپلز پارٹی کو 1990ء کے الیکشن میں جیت نہیں ہو گی اور تاثر اس وجہ سے موجود تھا کہ اگر دوبارہ بھی پیپلز پارٹی نے ہی اقتدار میں آنا ہوتا تو اس کی حکومت ختم ہی کیوں کی جاتی اور الیکشن کے نتائج نے یہ ثابت کر دیا کہ مندرجہ بالا خدشات صحیح تھے اس الیکشن میں اسلامی جمہوری اتحاد کو بشمول اس کی اتحاد جماعتوں کے 200 کے ہاؤس میں 130 نشستیں ملیں جبکہ پیپلز پارٹی اور اس کی اتحادی جماعتوں کو 50 سیٹیں ملیں۔ اسلامی جمہوری اتحاد واضح اکثریت کے ساتھ الیکشن میں کامیاب ہو گیا اور ملک کے وزیر اعظم جناب نواز شریف بن گئے پیپلز پارٹی نے الزام لگایا کہ الیکشن میں دھاندلی اور بدعوانی ہوئی ہے جعلی ووٹ ڈالے گئے ہیں۔

پورا ۹۱ء کا سال ان بیانات پر کہ 1990ء کے الیکشن میں اسلامی جمہوری اتحاد نے دھاندلی کی ہے۔ 18 نومبر 1992 کو نواز شریف حکومت کے خلاف تحریک 'لانگ مارچ چلانے کا اعلان کر دیا گیا۔ جلسے کیے گئے جلوس نکالے گئے اخباری بیانات میں حکومت کو غاصب قرار دیا گیا اس
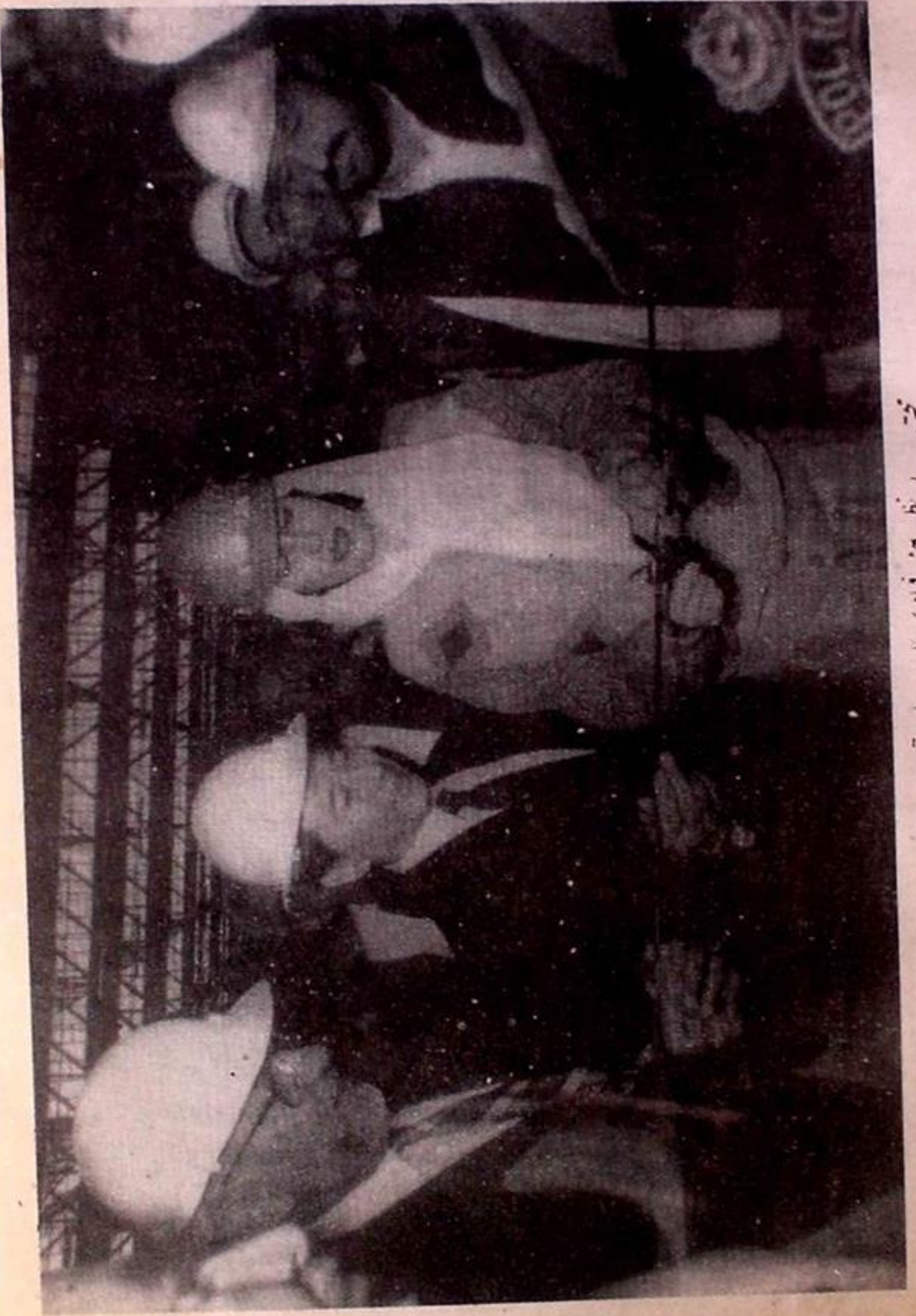
محترمہ بے نظیر بھٹو فیکٹری کا دورہ کرتے ہوئے

لانگ مارچ تحریک میں پاکستان جمہوری پارٹی جمعیت علمائے اسلام تحریک استقلال اور دیگر چھوٹے گروپ بھی شامل تھے۔ نواب زادہ نصر اللہ خان مولانا فضل الرحمان، ریٹائر ایئر مارشل اصغر خان عوامی نیشنل پارٹی حقیقی کے افضل خان بھی پیپلز پارٹی کے ساتھ شامل تھے اور تحریک بڑے زور کے ساتھ چلائی گئی تھی مگر ناکام ہو گئی۔

مس بھٹو نے کہا کہ لانگ مارچ ہمارا جاری ہے اور جاری رہے گا انہیں ایام میں مس بھٹو امریکہ گئیں امریکی حکام سے بات چیت ہوئی وعدے وعید ہوئے واپسی پر مس صاحبہ نے ایک اخباری بیان میں کہا کہ امریکی حکومت پاکستان کو دہشت گرد قرار دے گی پاکستان کو کشمیر میں دہشت گردی بند کر دینی چاہئے۔ دیگر امریکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ پاکستان ایٹمی جنگی پروگرام بند کر دے اگر امریکی حکم نہ مانا گیا تو پاکستان کو دہشت گرد بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور امریکہ پاکستان کو منتشر بھی کر سکتا ہے۔ مس بھٹو کی امریکہ سے واپسی پر نواز شریف وزیر اعظم پاکستان نے سرکاری گاڑی بھیج کر ان کی عزت افزائی کی اور ساتھ ہی ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جسے مس بھٹو نے مسترد کر دیا اور صدر اسحاق کی بھیجی ہوئی گاڑی پر سوار ہو کر ان سے ملنے چلی گئیں۔ پھر خفیہ ہاتھ نے نواز شریف حکومت کو غیر مستحکم کرنا شروع کر دیا سب سے پہلے مسلم لیگ کی حکومت سے مسلم لیگی لیڈر حامد ناصر چٹھہ نے بغاوت کر دی اور وہ نواز شریف حکومت پر الزام لگاتے ہوئے مستعفی ہو گئے ان کی بعد کئی وزیر مستعفی ہوئے پھر صدر اسحاق نے 18-4-93 کو نواز شریف حکومت ہی ختم کر دی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں بھی توڑ دی گئیں نواز شریف حکومت نے سپریم کورٹ میں صدر پاکستان کے احکام کو چیلنج کر دیا۔ سپریم کورٹ نے 25-5-93 کو نواز شریف اور پارلیمنٹ بحال کر دی۔ لاہور ہائی کورٹ نے پنجاب اسمبلی بھی بحال کر دی جو 7 منٹ کے بعد گورنر پنجاب نے توڑ دی۔ حکومت کی اکھاڑ پچھاڑ کی سازش اتنی بڑھ چکی تھیں کہ بلا آخر فوجی مداخلت اور امریکہ حکومت کی منشا کے مطابق 18-7-93 کو وزیر اعظم پاکستان نواز شریف حکومت اور صدر پاکستان غلام اسحاق خان بیک وقت پاکستان کے اقتدار سے الگ ہو گئے قائم مقام وزیر اعظم معین قریشی جو امریکہ سے ہی سیدھے آئے تھے جس مقصد کے لئے آئے تھے بنا دیئے گئے اور قائم مقام صدر سینٹ کے چیئرمین جناب وسیم سجاد بنا دیئے گئے اور 90 دن کے اندر الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا گیا۔ 6-10-93 کو پارلیمنٹ کے انتخابات کی تاریخ مقرر کی گئی الیکشن 1993ء کے نتیجہ میں پیپلز پارٹی نے الیکشن جیت لیا اور مورخہ 19-10-93 کو بحیثیت وزیر اعظم پاکستان کے بے نظیر بھٹو نے حلف اٹھایا۔

پیپلز پارٹی اقتدار میں تیسری دفعہ آ گئی

پیپلز پارٹی کی انتخابات میں کامیابی کے بعد بے نظیر صاحب نے مورخہ 19-10-93 کو بحیثیت

وزیر اعظم پاکستان حلف اٹھا لیا اور پیپلز پارٹی کو 98 نشستیں مرکزی پارلیمنٹ میں حاصل ہوئیں۔ جونیجو لیگ جو پیپلز پارٹی کی حلیف جماعت بھی تھی اسے 6 نشستیں حاصل ہوئیں دیگر اور بھی کئی چھوٹے گروپ جو پیپلز پارٹی کے حامی تھے وہ بھی کامیاب ہوئے اس طرح پیپلزپارٹی کو واضح اکثریت مرکزی پارلیمنٹ میں حاصل ہو گئی جبکہ نواز شریف مسلم لیگ کو سنٹر پارلیمنٹ میں 73 نشستیں حاصل ہوئیں دیگر چھوٹے گروپوں سے بھی اتحاد ہوا اس حیثیت سے اپوزیشن بھی مرکز میں مضبوط بن گئی۔ پیپلزپارٹی کی زیادہ اکثریت کی وجہ سے صدر پاکستان بھی پیپلز پارٹی کے ہی بن گئے۔ پیپلز پارٹی اس وقت پوری قوت کے ساتھ پاکستان پر حکمران ہے۔

نواز شریف کی زیر قیادت مس بے نظیر بھٹو حکومت کے خلاف تحریک چلانے کی کوشش کی گئی ٹرین مارچ بھی کیا گیا جس کا طریقہ یہ تھا کہ نواز شریف اور ان کے ساتھیوں نے کراچی سے ماہ ستمبر 1994ء میں بذریعہ ٹرین پشاور تک کا سفر کیا ہر سٹیشن پر جہاں گاڑی کھڑی ہوتی تھی لوگوں کو خطاب کیا جلسہ کیا یہ ان کا دورہ کسی حد تک کامیاب رہا پھر 10 ستمبر 1994ء میں ہی ہڑتال عام کرائی جو کامیاب ہوئی۔ پھر ماہ اکتوبر میں پہیہ جام ہڑتال کرائی گئی جو کسی حد تک کامیاب ہوئی۔

اب اس وقت ماہ نومبر میں اخبارات کسی حد تک دونوں بڑی پارٹیوں پیپلزپارٹی اور مسلم لیگ نواز گروپ کے درمیان اخباری حد تک جنگ ہو رہی ہے اور بے نظیر بھٹو کے خلاف کسی تحریک کی کامیابی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ پاکستان کی سیاست میں خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہے اس خفیہ ہاتھ کی حرکت سے ہی پاکستان میں کوئی سیاسی تبدیلی آتی ہے۔
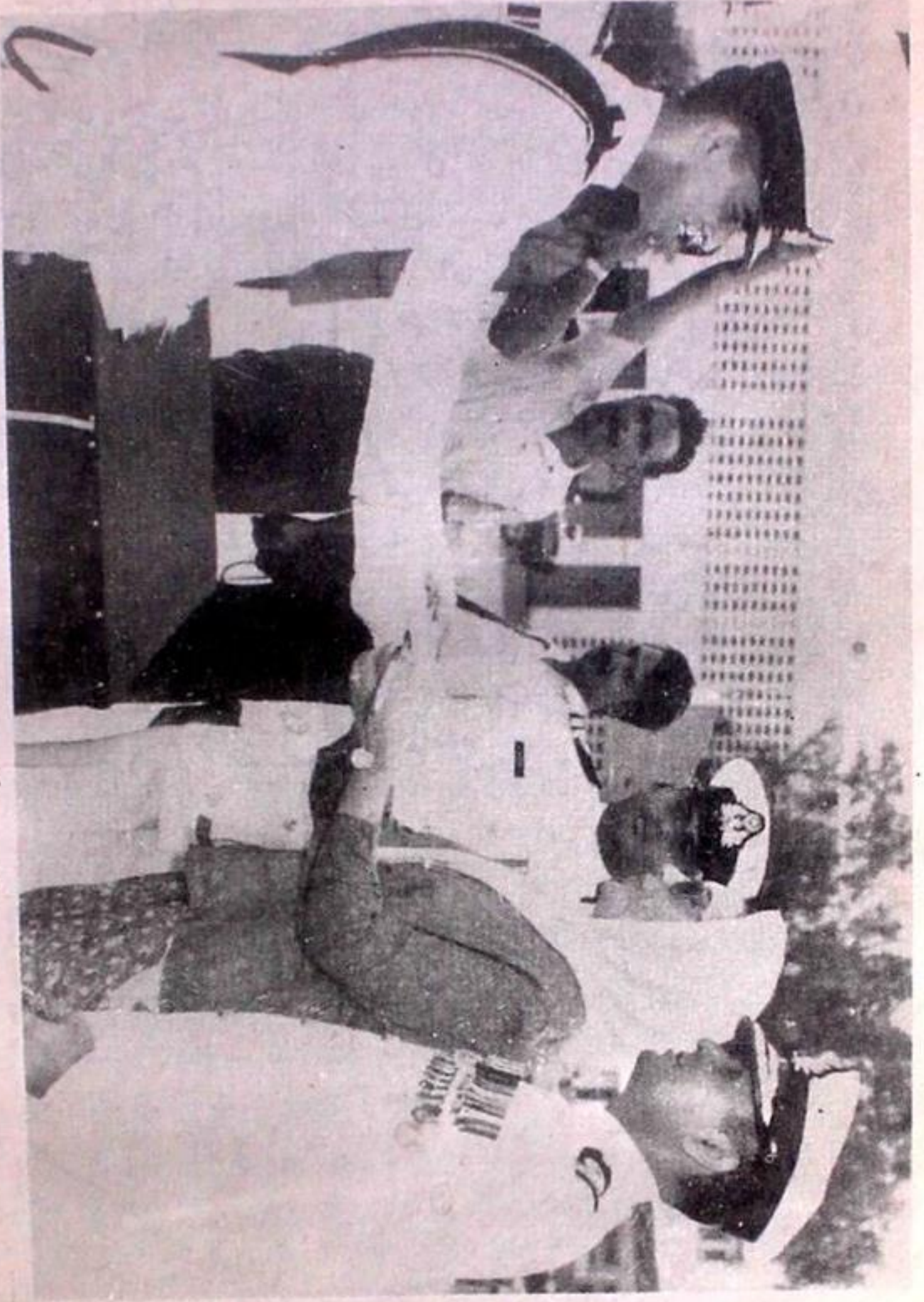
محترمہ بے نظیر بھٹو نیوی کے جوانوں کے ساتھ

نیشنل پیپلز پارٹی

نیشنل پیپلز پارٹی کا کنونشن ماہ اگست 1986ء کو لاہور میں منعقد ہوا تھا اس کنونشن میں پیپلز پارٹی کے ناراض لوگ جنہیں بھٹو بیگمات اہمیت نہ دیتی تھیں مگر وہ سیاسی قد کاٹھ کی وجہ سے ملکی سطح پر اپنی شخصیت کے علاوہ بھاری بھر کم شخصیتیں مندرجہ ذیل بھی تھیں جن میں سب سے بڑی شخصیت جناب غلام مصطفیٰ جتوئی کی تھی اور مولانا کوثر نیازی اپنی پروگریسو پیپلز پارٹی سمیت اور جناب حنیف رامے اپنی مساوات پارٹی سمیت اور دیگر حضرات جن میں جناب غلام مصطفیٰ کھر سابق وزیرِ اعلیٰ پنجاب چودھری ارشاد صاحب سابق وزیرِ پنجاب مشہور قانون دان جناب ایس ایم ظفر اور دیگر بہت سارے نامور لوگ شامل ہوئے جو لوگ نیشنل پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے انہیں پیپلز پارٹی میں کافی اہمیت حاصل تھی اور پارٹی کا منشور بھی وہی تھا جو تقریباً پیپلز پارٹی کا ہے منشور میں شرافت کی سیاست کا عہد کیا گیا تھا چاروں صوبوں کو مساوی حقوق دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ منشور میں بوڑھوں کی زندگی میں بنیادی تحفظ کا وعدہ کیا گیا تھا صنعت اور زراعت کو ترقی دینے کا عہد کیا گیا تھا ہر حالت میں منشور کو پر کشش بنایا گیا تھا۔

پاکستان نیشنل پیپلز پارٹی کے صدر جناب غلام مصطفیٰ جتوئی بنائے گئے جبکہ پنجاب کے صدر غلام مصطفیٰ کھر بنائے گئے نیشنل پیپلز پارٹی کی اٹھان بہت زیادہ تھی مگر پارٹی لوگوں میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی موت کے باوجود لوگ بھٹو گھرانے سے عقیدت بدستور رکھے ہوئے تھے۔ لوگوں کی بھٹو گھرانے سے عقیدت طلسماتی حد تک تھی عوام کو بھٹو خاندان سے الگ کرنا بہت ہی مشکل کام ہو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ نیشنل پیپلز پارٹی سے لوگوں نے شخصیات نے الگ ہونا شروع کر دیا سب سے پہلے جناب غلام مصطفیٰ کھر نے نیشنل پیپلز پارٹی چھوڑ دی جس سے پارٹی میں انتشار پیدا ہو گیا اور دیگر کئی لوگوں نے بھی پارٹی سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا جن میں حنیف رامے بھی شامل تھے۔ نیشنل پیپلز پارٹی نے 1988ء کے الیکشن میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کی جتوئی صاحب بھی نواب شاہ والی قومی اسمبلی کی سیٹ سے ہار گئے پنجاب ضلع مظفر گڑھ کے دو قومی اسمبلیوں کی سیٹوں پر غلام مصطفیٰ کھر کامیاب ہوئے تھے انہوں نے ایک سیٹ چھوڑ دینی تھی ان کی چھوڑی ہوئی سیٹ پر کھر صاحب نے جتوئی صاحب کو الیکشن پر کھڑا ہونے کی دعوت دی جو انہوں نے منظور کر لی۔ اور کھر صاحب کی کوشش اور ہمت سے جتوئی صاحب مظفر گڑھ کی اس قومی اسمبلی کی سیٹ سے کامیاب ہو گئے اور قومی اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ اس الیکشن میں پیپلز پارٹی نے جتوئی صاحب کو ہرانے کی بہت کوشش کی مگر جتوئی صاحب کھر کی امداد کی وجہ سے کامیاب ہو گئے۔ جتوئی صاحب ضلع نواب شاہ کے بہت بڑے رئیس ہیں۔ ہزاروں ایکڑ زرخیز اور بہترین زمین کے مالک ہیں مندرجہ بالا الیکشن میں جو گاڑیاں استعمال ہوئیں ان میں 19 گاڑیاں ان کی اپنی ملکیت تھیں اور وہ قدیم سیاسی اور مقتدر گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔
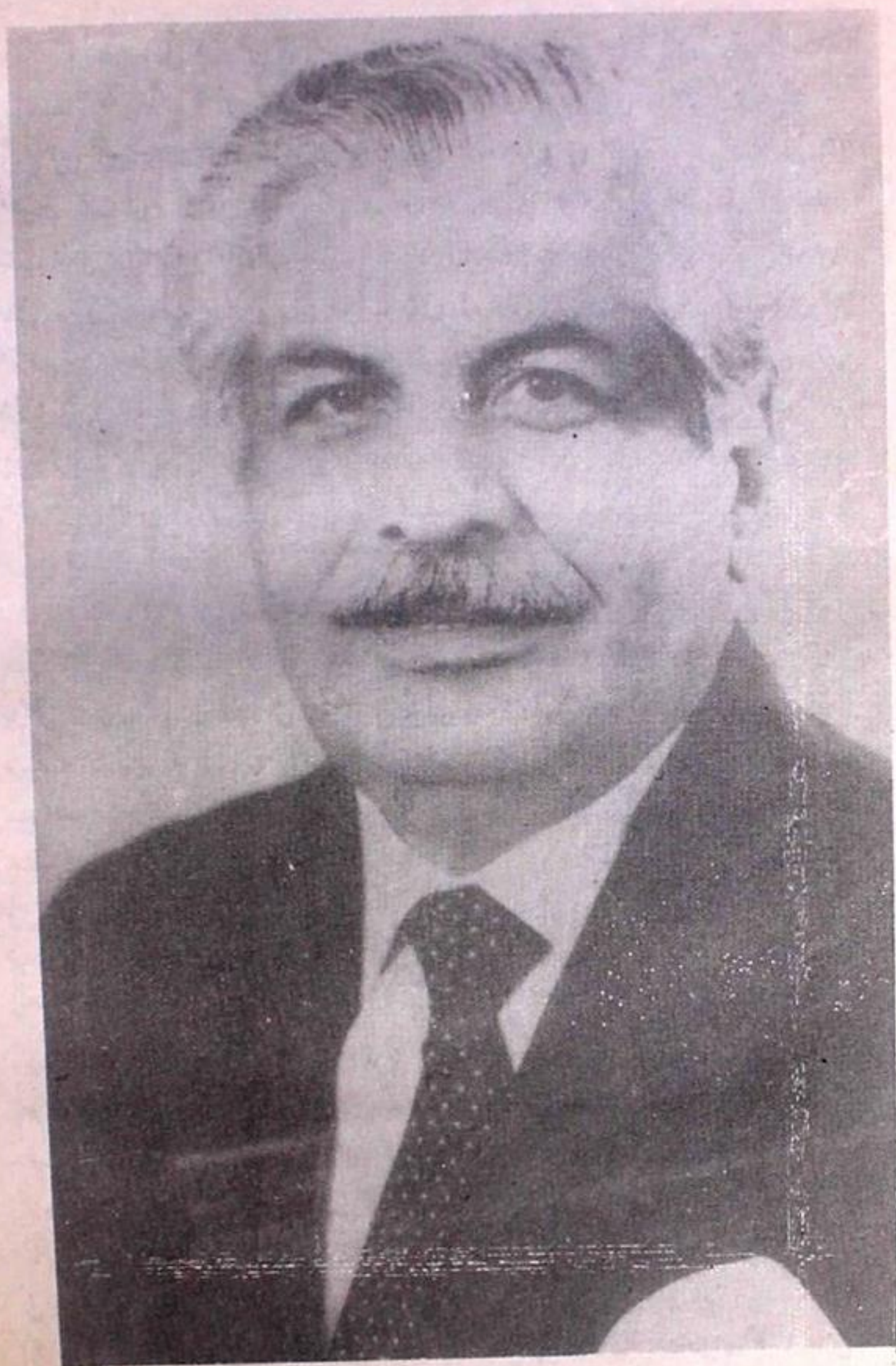
غلام مصطفےٰ جتوئی

1956ء کی مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبر بھی تھے ہر اسمبلی میں وہ یا ان کے خاندان کا کوئی فرد ممبر ہوتا ہے بھٹو نے جب پیپلز پارٹی بنائی تو انکی دعوت پر وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے تھے پیپلز پارٹی کی حکومت کے ابتدائی دور میں وہ مرکزی کابینہ میں شامل تھے بھٹو صاحب نے ممتاز بھٹو صاحب کو سندھ کی وزارت اعلیٰ سے ہٹا کر جتوئی کو سندھ کا وزیر اعلیٰ بنایا تھا اور بھٹو صاحب کی زندگی میں وہ پیپلز پارٹی کے بڑے لوگوں میں شمار ہوتے تھے بھٹو کی موت کے بعد بھی انہیں پیپلز پارٹی کا بڑا ہی سمجھا جاتا تھا مگر بھٹو بیگمات کی خودسری کی وجہ سے جتوئی صاحب کو پیپلز پارٹی چھوڑنا پڑی اور انہوں نے نیشنل پیپلز پارٹی قائم کر لی۔ 1988ء میں کھر صاحب کی چھوڑی ہوئی مظفر گڑھ کی سیٹ سے وہ قومی اسمبلی کے ممبر بنے اور متحدہ اپوزیشن پارٹیز نے انہیں قومی اسمبلی میں متحدہ حزب اختلاف کا لیڈر بنا لیا اور وہ اپنی شخصیت کی وجہ سے پارلیمنٹ میں اپوزیشن لیڈر بن گئے اور مختلف وقتوں میں انہوں نے پارلیمنٹ میں اپنی مثبت تجاویز پیش کیں اور قومی تعمیر ترقی میں حصہ لیا۔

متحدہ حزب اختلاف کا لیڈر بن جانے کی وجہ سے ان کی شخصیت بلند بالا ہوئی مزید لوگ نیشنل پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے مگر ہجوم عاشقاں وہ اپنے گرد جمع نہ کر سکے۔

1990ء میں صدر غلام اسحاق خان نے پیپلز پارٹی کی بے نظیر حکومت ختم کر دی اور 90 روز کے اندر الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا اور پاکستان کے نگران وزیر اعظم جناب جتوئی صاحب بنائے گئے وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھانے کے بعد اعلان کیا گیا کہ آنے والے الیکشن منصفانہ اور غیر جانب دارانہ ہوں گے۔

جتوئی صاحب 1990ء کے الیکشن میں پنجاب کے ضلع نارووال کے حلقہ سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے نواب شاہ کے حلقہ سے بھی ان کے دو ممبر قومی اسمبلی کے اور سندھ میں صوبائی اسمبلی کے گیارہ ممبران کامیاب ہوئے تھے جناب جتوئی صاحب کے بیٹے غلام مرتضیٰ جتوئی سندھ حکومت میں وزیر بھی بنائے گئے تھے۔ 1990ء کے الیکشن کے نتائج میں اسلامی جمہوری اتحاد جس میں سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ تھی جس کے لیڈر نواز شریف تھے اور دیگر چھوٹی چھوٹی جماعتوں بشمول جماعت اسلامی کے پیپلز پارٹی کے خلاف مل کر حصہ لیا تھا اور اسلامی جمہوری اتحاد نے پارلیمنٹ کے 207 کے ہاؤس میں سے 130 نشستیں حاصل کی تھیں۔ جبکہ پیپلز پارٹی نے 41 نشستیں حاصل کی تھیں۔ بقایا بتیس دیگر آزاد اور چھوٹی علاقائی جماعتوں نے حاصل کیں تھیں مگر پاکستان کے وزیر اعظم محمد نواز شریف بنائے گئے تھے اور پاکستان کے مسلمہ لیڈر بھی جناب نوا شریف کو مان لیا گیا اور اقتدار کے اس تمام عمل کو جناب جتوئی نے بخوشی قبول کیا۔

جتوئی صاحب کی وزارت عظمیٰ میں ہونے والے انتخابات کو ملک کی سب سے بڑی جماعت پیپلز پارٹی نے مسترد کر دیا اور الزام لگایا کہ انتخابات 1990ء میں وسیع پیمانے پر دھاندلی کی گئی ہے

اس لئے یہ تمام انتخابات جانبدارانہ تھے اور اس وقت کی حزب اختلاف نے انتخابات کے خلاف لانگ مارچ نام کی تحریک چلائی جو کامیاب نہ ہوئی مگر تحریک بدستور جاری رہی اور جتوئی صاحب نے بھی ایک اخباری بیان میں اقرار کیا تھا کہ الیکشن 1990ء میں دھاندلی ہوئی ہے۔

1993ء میں صدر غلام اسحاق خان نے نواز شریف کی حکومت پارلیمنٹ چاروں صوبائی اسمبلیاں توڑ دیں اور نئے انتخابات کرانے کا اعلان کیا گیا۔

1993ء کے انتخابات میں غلام مصطفیٰ جتوئی صاحب صدر نیشنل پیپلز پارٹی حلقہ نوشہرہ فیروز سندھ سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اور سندھ اسمبلی میں بھی انکے دو ممبر کامیاب ہوئے جن کا تعلق بھی جتوئی قبیلہ سے ہی ہے اور وہ سندھ کولیشن حکومت میں پیپلز پارٹی کے ساتھ شامل ہیں - غلام رسول جتوئی اس وقت سندھ میں وزیر مال بھی ہیں۔

نیشنل پیپلز پارٹی کی عوام میں مقبولیت نہیں شہروں میں کہیں کہیں تنظیمیں قائم ہیں - جہاں کہیں بھی لوگ نیشنل پیپلز پارٹی میں شامل ہیں وہ گنتی کے لوگ ہیں اور مخصوص لوگ ہی شامل ہیں۔

نیشنل پیپلز پارٹی کے منشور اور پروگرام میں دوسری جماعتوں سے ہٹ کر کوئی نئی بات نہیں ہے یہ پارٹی بھی کشمیر کے مسئلہ اور دیگر مسائل پر ہندوستان کے خلاف جنگ کی حامی ہے جتوئی صاحب انگلینڈ کے تعلیم یافتہ ہیں سندھ کے بہت بڑے روسا میں شمار ہوتے ہیں۔

تحریک استقلال

تحریک استقلال کے بانی چیئرمین ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان ہیں وہ 1968ء میں ایوب حکومت کے آخری دور میں سیاست کی وادی خار زار میں داخل ہوئے متحدہ اپوزیشن پارٹیز اور بھٹو کی پیپلز پارٹی صدر ایوب کی حکومت کے خلاف تحریک چلا رہے تھے۔ بھٹو گرفتار ہو گئے تو تحریک میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ ایئر مارشل اصغر خان نہیں چاہتے تھے کہ جمہوریت کی تحریک ناکام ہو وہ گرتی ہوئی آمریت کی دیوار کو آخری دھکا دینے کے لئے سیاست میں داخل ہو گئے اور انہوں نے تحریک جمہوریت اور بھٹو کی کامیاب حمایت کی جس سے آمریت کے محل میں شگاف پڑ گئے اور اس وقت تک وہ تحریک جمہوریت کی مردانہ وار حمایت کرتے رہے آخر آمریت کا بت پاش پاش ہو گیا۔ اور انہوں نے سیاست میں کسی پارٹی میں شامل ہونے کی بجائے اپنی الگ پارٹی بنا لی جس کا نام جسٹس پارٹی رکھا گیا۔

مگر تھوڑے وقت بعد ہی جسٹس پارٹی نظام اسلام پارٹی عوامی لیگ نواب زادہ نصر اللہ خان گروپ اور دیگر چھوٹے گروپوں نے مل کر الگ جماعت بنا لی جس کا نام پاکستان جمہوری پارٹی رکھا گیا اور پہلے صدر نواب زادہ نصر اللہ خان بنائے گئے۔ تھوڑے عرصہ بعد ایئر مارشل صاحب کا پاکستان جمہوری پارٹی کے دیگر لوگوں سے اختلاف ہو گیا تو ایئر مارشل صاحب نے اپنی الگ جماعت بنا لی جس کا نام تحریک استقلال رکھا گیا جس کا پہلا کنونشن 1970ء میں راولپنڈی کے فلیش مین ہوٹل میں منعقد ہوا جس میں سینکڑوں مندوبین شریک ہوئے گوجرانوالہ سے بھی کئی لوگ اس کنونشن میں شریک ہوئے تھے جن میں مشہور صحافی عظیم مرزا بھی شامل تھے۔

منشور میں غیر طبقاتی معاشرہ قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا عدل و انصاف قائم کرنے کا عہد کیا گیا۔ تحریک استقلال نے قومی اور بین الاقوامی سیاست میں ہمیشہ مثبت رویہ اختیار کیا ہے۔

1970ء کے انتخابات میں تحریک استقلال بالکل نوازئیدہ تھی الیکشن میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر سیاست میں ایئر مارشل صاحب نے حقیقت پسندانہ رول ادا کیا جب یحییٰ خان حکومت نے عوامی لیگ کے الیکشن جیت جانے کے باوجود انہیں اقتدار منتقل نہیں کیا جا رہا تھا تو اس وقت تحریک استقلال نے یحییٰ حکومت پر زور دیا کہ وہ عوامی لیگ کو اقتدار منتقل کرے ورنہ پاکستان ٹوٹ جائے گا۔ مغربی پاکستان کی سیاسی جماعتوں میں نیشنل عوامی پارٹی اور تحریک استقلال نے ہی حقیقت پسندانہ طرز عمل اختیار کیا تھا جو یحییٰ حکومت نے نہیں مانا اور پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔

مغربی پاکستان ہی صرف پاکستان رہ گیا تھا جس میں ذوالفقار علی بھٹو برسراقتدار آئے جناب بھٹو صاحب کے خلاف سیاست دانوں کا نظریہ یہ تھا کہ وہ آمرانہ ذہنیت رکھتے ہیں کچھ ان کے

ایئر مارشل اصغر خان

اقدام بھی آمرانہ دیکھنے میں آئے تھے ان کے خلاف متحدہ اپوزیشن پارٹیز نے قومی اتحاد کے نام پر تحریک چلانے کا اعلان کیا تحریک استقلال بھی قومی اتحاد میں شامل تھی۔ 1977ء میں جب قومی اتحاد نے الیکشن میں حصہ لیا تو ایئر مارشل اصغر خان کراچی کے حلقہ سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے مگر دھاندلی ہو جانے کی وجہ سے صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن کا بائیکاٹ کر دیا گیا تھا اور قومی اتحاد نے تحریک چلا دی تھی جس میں ایئر مارشل اصغر خان نے اپنی تقریر میں کئی جگہ پر یہ کہا تھا کہ مسٹر بھٹو کو کوہالہ کے پل پر پھانسی دی جائے گی جب سے تحریک استقلال بنی ہے اس وقت سے آج تک ایئر مارشل ہی اس جماعت کے چیئرمین ہیں کوئی دوسری اتنی بھاری بھر کم شخصیت اس جماعت میں داخل نہیں ہوئی کہ وہ جماعت کی سربراہی کا بوجھ اٹھا سکے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قومی اتحاد کی تحریک جو 1977ء میں بھٹو حکومت کے خلاف چلائی گئی تھی اس میں تحریک استقلال کے چیئرمین جناب ایئر مارشل اصغر خان نے فوج کے افسران کو خط لکھے تھے کہ بھٹو عوام کا اعتماد کھو چکے ہیں اور جو حکمران عوام کا اعتماد کھو چکا ہو اس کا حکم ماننا سرکاری افسران کے لئے ضروری نہیں ہوتا۔ ایئر مارشل نے اس خط کی تردید نہیں کی ایئر مارشل اصغر خان صاحب کے مندرجہ ذیل ساتھی بھی تحریک جمہوریت میں ان کے ساتھ رہے ہیں عمر اصغر بیگم ثریا اسلام راجہ محمد افضل صاحب' باقر رضوی گجرات' اکرم ناگرہ شیخوپورہ' ملک حامد سرفراز ایڈووکیٹ لاہور' رانا مقبول حسین لاہور اور مشہور قانون دان میاں محمود علی قصوری مرحوم بھی ایئر مارشل اصغر خان کے ساتھ ہی سرگرم عمل رہے۔

بھٹو کے خلاف تحریک کے نتیجہ میں جنرل ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور مارشل لاء ملک پر مسلط کر دیا گیا - 90 روز کے اندر الیکشن کرانے کا اعلان کیا گیا جو بعد میں غیر معینہ عرصہ کے لئے ملتوی کر دیئے گئے تحریک استقلال اور دیگر جماعتوں نے مل کر جمہوریت کو حاصل کرنے کے لئے ایم آر ڈی نامی تنظیم قائم کی تحریک استقلال اور ایئر مارشل صاحب نے ایم آر ڈی میں شامل ہو کر جمہوریت کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور حکومت نے تحریک استقلال کے چیئرمین جناب ایئر مارشل اصغر خان کو نظر بند کر دیا وہ 1985ء تک نظر بند رہے۔ اور حکومت نے اسی دوران ملک میں غیر جماعتی انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ تحریک استقلال نے غیر جماعتی انتخابات میں حصہ نہیں لیا۔ تحریک استقلال غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی کی حامی ہے کشمیر کا تنازعہ حل ہونے کی صورت میں بھارت کے ساتھ بہتر تعلقات کی حامی ہے۔

ایئر مارشل اصغر خان اور تحریک استقلال کی پوری تاریخ میں ایک بات واضح ہے کہ ملکی سیاست کے معاملہ میں انہیں جو پروگرام بھی اچھا لگا اس پر عمل پیرا ہو گئے - سازشوں کے ذریعے اقتدار میں آنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ یہاں پاکستان میں اقتدار میں آنے کے لئے اقتدار میں شمولیت کے لئے خفیہ ہاتھ تک رسائی حاصل کی جاتی ہے مگر ایئر مارشل اصغر صاحب پر کوئی اس قسم کا الزام نہیں ہے۔ تحریک استقلال نے ایم آر ڈی میں شامل ہو کر جمہوریت کی جدوجہد کی

1988ء میں پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر انتخابات میں حصہ لیا مگر کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ایئر مارشل صاحب نے ہی صرف ایک سیٹ پر نواز شریف کے مقابل قومی اسمبلی لاہور کی سیٹ پر کاغذات داخل کرائے تھے مگر کامیاب نہ ہوئے۔ 1990ء کے الیکشن میں بھی تحریک کو کوئی سیٹ نہیں ملی - 1993ء کے انتخابات میں نواز شریف کے ساتھ مل کر الیکشن میں حصہ لیا گیا۔ پنجاب اسمبلی میں تحریک استقلال کے دو ممبر اس وقت سید ظفر علی شاہ راولپنڈی ، انیس الرحمان نارووال سے ہیں۔

پاکستان خاکسار اسلام لیگ

پاکستان بن جانے کے بعد یکم جولائی 1948ء کو خاکساروں کو اسلام لیگ کا نام دے دیا گیا اور لیاقت علی کی حکمرانی کے دور میں ہی علامہ صاحب کو گرفتار کر لیا گیا چند ماہ بعد رہا کر دیئے گئے۔ اسلام لیگ کا منشور تین طبقات پر مشتمل بنایا گیا تھا اس میں ملک کی پارلیمنٹ کے لئے 80 فیصد غریب عوام کو نمائندگی دی گئی تھی۔ 15 فیصد متوسط طبقہ کو اور 5 فیصد امیر طبقہ کو نمائندگی دی گئی تھی مگر اسلام لیگ نے خاکسار تحریک کی ڈگر سے ہٹ کر کوئی کام نہیں کیا تھا وہی پریڈ وہی وردی وہی بیلچہ وہی چپ راست تھی۔

1957ء میں ری پبلکن پارٹی کے صدر ڈاکٹر خان صاحب قتل کر دیئے گئے تھے قتل کے اس جرم میں عطاء محمد نامی ایک ریٹائرڈ پٹواری موقع پر ہی گرفتار کر لیا گیا تھا مگر شبہ سازش کی بناء پر حضرت علامہ مشرقی صاحب کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا مگر انہیں چند ماہ بعد چھوڑ دیا گیا۔ 1957ء میں ہی ہندوستان کو باور کرانے کے لئے واہگہ بارڈر پر کیمپ لگائے گئے جس میں خاکسار تحریک کثیر تعداد میں شامل ہوئے جس میں بقول راوی بشیر احمد شریف خاکسار کے علامہ صاحب نے حکم دیا تھا کہ جو شخص ہندوستان ہندوستان کی باؤر پولیس والوں کے 10 سر اتار کر لائے گا اسے اسلام لیگ کی قیادت سونپ دی جائی گی اور مندرجہ ذیل حضرات نے باڈر پار کیا' نمبر 1 چوہدری محمد خورشید صاحب' نمبر 2 ظفر حیدر صاحب' نمبر 3 اصغر حیدر صاحب' نمبر 4 محمد اسحاق عربی' نمبر 5 شیخ علی محمد صاحب ان پانچ حضرات نے بارڈر کراس کیا اور ہندوستانی فوج کے گشتی دستے پر حملہ آور ہوئے دس بھارتی فوجیوں کے سر بمعہ اسلحہ کے لے آئے اور ان میں سے چوہدری خورشید خالد صاحب کو علامہ صاحب نے اسلام لیگ کا صدر بنا دیا اور انہیں پانچ خاکساروں کی سفارش پر دسمبر 1961ء کو راولپنڈی ایورگرین ہوٹل میں خاکسار تحریک کو دوبارہ اجراء پر اجلاس ہوا مزید کارروائی کے لئے جناب خورشید خالد کو ذمہ داری سونپی گئی۔

حضرت علامہ عنایت اللہ خان المشرقی نے 27 اگست 1963ء کو لاہور میں وفات پائی ان کے سوگ میں تمام سیاسی جماعتوں کے اکابرین شریک ہوئے جگہ جگہ ان کے سوگ میں جلسے کئے گئے مغفرت کی دعائیں مانگی گئیں۔ علامہ صاحب کی نماز جنازہ مولانا عبدالستار نیازی صاحب نے پڑھائی تھی۔

علامہ صاحب نے اپنی وفات سے قبل ہی اپنی جائیداد کا ایک ٹرسٹ قائم کر دیا تھا مگر پتہ چلا ہے کہ علامہ صاحب کے وارثان نے ٹرسٹ جائیداد قائم نہیں رہنے دیا مختلف طریقوں سے علامہ صاحب کی چھوڑی ہوئی جائیداد کو وارثان نے اپنے نام منتقل کرا لیا ہے۔

علامہ صاحب کی زندگی میں ہی خاکسار جماعت کا دوبارہ اجراء کر دیا گیا ان کی موت کے بعد تحریک خاکسار چار حصوں میں تقسیم ہو گئی ایک روایت خاکسار یہ بھی کرتے ہی کہ انہوں نے

وصیت کی تھی کہ ان کی موت کے بعد ان لوگوں میں سے کسی ایک کو جماعت کا امیر بنا دیا جائے۔ جی ایم سید، غلام مصطفیٰ بھرگڑی، غلام علی تالپور، ڈاکٹر محمد اسماعیل نامی پیر نواب سرور بودلا، حاجی محمد سرفراز ان چھ اشخاص میں سے صرف اس وقت حاجی سرفراز صاحب ہی خاکسار تحریک کے ساتھ وابستہ تھے انہیں جماعت کا سربراہ اور علامہ صاحب کا جانشین بنا دیا گیا تھا۔ علامہ صاحب کی وفات کے بعد جماعت خاکسار چار حصوں میں تقسیم ہو گئی جن میں ایک گروپ کے سربراہ علامہ صاحب کا بیٹا حمید الدین مشرقی ہیں دوسرے گروپ کے راہنما اشرف خان صاحب ہیں ایک اتحاد گروپ بھی ہے جو سب گروپوں کو اکٹھا کرنا چاہتا ہے مگر وہ بھی ایک گروپ کی شکل اختیار کر گیا ہے کچھ اور لوگ بھی ہیں جو ہر گروپ سے الگ تھلگ ہیں بیلچہ خاکی وردی کو ہی راہنما سمجھتے ہیں۔ اس وقت 1994ء میں خاکسار تحریک کی صورت حال یہ ہے کہ جب کوئی بزرگ خاکسار تحریک وفات پا جاتا ہے تو ان کے جنازے پر جمع ہوتے ہیں سلامی دیتے ہیں جنازہ کے ساتھ پریڈ کرتے ہیں فوجی انداز سے سلامی دیتے اور خاکساروں کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ خاکسار تحریک کی شکل ایک فرقہ یا برادری کی بن گئی ہے خدمت خلق کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اگر ایک بھی خاکسار کہیں جا رہا ہو تو اسکی چال ڈھال سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخص خاکسار جماعت سے ہی وابستہ ہوگا تین تہوار خاکسار باقاعدگی سے مناتے ہیں۔ 19 مارچ 1940ء کو لاہور میں خاکساروں پر گولی چلی تھی اس لئے 19 مارچ کا دن ہر سال منایا جاتا ہے۔ 25 اگست 1891ء کو علامہ مشرقی کا یوم پیدائش ہے اس لئے 25 اگست کا دن ہر سال منایا جاتا ہے۔ 27 اگست 1963ء کو علامہ صاحب نے وفات پائی تھی اس لئے 27 اگست کا دن ہر سال منایا جاتا ہے۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی

پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد مشرقی پاکستان کے الگ ہونے بنگلہ دیش بن جانے کے بعد رکھی گئی تھی سوشلسٹ پارٹی بنائے جانے کی وجہ یہ بنی اس جماعت میں کثرت سے وہ لوگ شامل ہوئے تھے جن کا تعلق ماضی میں نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ سے تھا جب بنگلہ دیش بن گیا تو نیشنل عوامی پارٹی کے دونوں گروپوں کو خلاف قانون قراردیا جا چکا تھا۔ بھاشانی گروپ کے لوگوں کی زیادہ تعداد مشرقی پاکستان میں تھی۔ مغربی پاکستان میں یہ لوگ کہیں بھی طاقت نہیں رکھتے تھے دیگر یہ کہ بنگلہ دیش کی موومنٹ میں عوامی لیگ کے ساتھ بھاشانی گروپ بھی پاکستان کے فوجی حکمرانوں کی سیاست کے خلاف تھی بنگلہ دیش الگ بھی ہو چکا تھااس لئے نیپ بھاشانی گروپ کے نام سے سیاست چل ہی نہیں سکتی تھی نیپ کے اس گروپ نے لاہور میں کونشن کیا جس میں نیپ بھاشانی گروپ کے اکثر کارکن جن میں سی آر اسلم ایڈووکیٹ عابد حسن منٹو ایڈووکیٹ جناب بشیر احمد ایڈووکیٹ خواجہ رفیق صاحب لاہور انیس ہاشمی کراچی' کنیز فاطمہ صاحبہ کراچی' محمد قسور گردیزی ملتان' میاں محمود احمد ایڈووکیٹ فیصل آباد' چودھری فتح محمد ٹوبہ ٹیک سنگھ اور دیگر بہت سارے لوگ جمع ہوئے تھے اس اجتماع میں پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی منشور میں مارکسزم کو اولیت دی گئی اور تمام مسائل کا حل سوشلزم کو قرار دیا گیا۔ سوشلسٹ پارٹی آف پاکستان کے پہلے صدر سی آر اسلم اور جنرل سیکرٹری عابد حسن منٹو قرار دیئے گئے۔ پارٹی کا زیادہ کام مزدوروں میں کیا گیا۔ پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن مزدوروں کا ادارہ تھا جس کی تنظیم آل پاکستان تھی اور دیگر ٹریڈ یونین بھی زیادہ تعداد میں سوشلسٹ پارٹی کے کنٹرول میں تھیں کسان محاذ پر چودھری فتح محمد صاحب ٹوبہ ٹیک سنگھ والے بھی کافی متحرک تھے مگر کسانوں میں بھی کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ 1988ء میں عابد حسن منٹو اور دیگر بہت سارے لوگ سوشلسٹ پارٹی سے الگ ہو گئے انہوں نے عوامی جمہوری پارٹی کے نام سے ایک پارٹی بنا لی دیگر یہ کہ سویت یونین کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے بھی سوشلسٹ پارٹی کا مستقبل تاریک ہو گیا اور ساتھ ہی سوشلزم کا مستقبل بھی پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں مخدوش ہو گیا اس کے باوجود سوشلسٹ پارٹی ابھی زندہ ہے مگر کافی حد تک غیر متحرک ہو چکی ہے ماضی کے واقعات کے سارے ہی زندہ یا نیم جان ہے۔

پاکستان جمہوری پارٹی

پاکستان جمہوری پارٹی اپنے لیڈر کے نام سے پہچانی جاتی ہے نواب زادہ نصر اللہ خان اس پارٹی کے ہمہ وقت صدر یا سربراہ ہیں۔ آل پاکستان جمہوری پارٹی کی بنیاد 6 جون 1969ء کو لاہور میں رکھی گئی تھی۔ آج کی طرح اس وقت بھی سیاسی جماعتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ یہ تحریک بن گئی تھی کہ سیاسی پارٹیاں کم ہونی چاہئیں۔ اس تحریک میں پیش پیش ایئر مارشل اصغر خان اور چودھری محمد علی وغیرہ تھے ہم خیال جماعتوں کو آپس میں ضم کرنے کی تحریک چلائی گئی مگر سب سے پہلے مسلم لیگ کے صدر جناب دولتانہ نے فرمایا کہ مسلم لیگ پاکستان کی خالق جماعت ہے اور کسی صورت بھی مسلم لیگ اپنا تشخص ختم نہیں کر سکتی۔

مگر چند ایک دوسری جماعتوں نے آپس میں ادغام کا فیصلہ کر لیا جن میں عوامی لیگ کے نواب زادہ نصر اللہ گروپ نظام اسلام پارٹی ایئر مارشل اصغر خان کی جسٹس پارٹی اور دیگر چھوٹے گروپ بھی شامل تھے۔ جن کا پہلا کونشن لاہور گلبرگ میں محمد صابر جعفری صاحب کی رہائش گاہ جگ مگ ہاؤس میں منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل شخصیات کے علاوہ تقریباً 200 مندوبین بھی شریک ہوئے تھے۔ شخصیات جو شامل تھیں ان کے نام ہیں جناب نواب زادہ نصر اللہ خان، عوامی لیگ، ایئر مارشل اصغر خان جسٹس پارٹی، چودری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان نظام اسلام پارٹی مولانا فرید احمد صاحب مولانا اطہر علی اور ہمارے گوجرانوالہ سے بھی مندوبین شامل ہوئے تھے جن میں چودھری محمد یعقوب صاحب مسلم صراف خان ظہیر الدین خان بھی تھے۔

مندوبین کے ذہنوں پر طویل آمریت کے سائے اثر انداز تھے جمہوریت کی چاہت ہر ایک کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لئے پارٹی کے منشور میں جمہوریت کو اولیت دی گئی اور پارٹی کا نام بھی پاکستان جمہوری پارٹی رکھا گیا اور پہلے صدر نواب زادہ نصر اللہ خان بنائے گئے مگر تھوڑے ہی وقت میں پارٹی انتشار کا شکار ہونے لگ گئی۔ ایئر مارشل اصغر خان پاکستان جمہوری پارٹی سے الگ ہو گئے انہوں نے اپنی نئی جماعت تحریک استقلال بنا لی۔ چودھری محمد علی بہت جلد سیاست سے کنارہ کش ہو گئے گوشہ تنہائی میں چلے گئے اور عبادت گزار خدا کے بندے بن گئے۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد نظام اسلام پارٹی کے بنگالی لیڈر ویسے ہی الگ ملک کے باشندے بن گئے دیگر وہ لوگ جو مغربی پاکستان میں پارٹی کے ساتھ تھے ان میں سے بھی بہت سے لوگ نواب زادہ نصر اللہ صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے یا پارٹی میں کوئی فائدہ نہ دیکھتے ہوئے الگ ہو گئے اور بلا آخر پاکستان کی جمہوری پارٹی میں نواب زادہ صاحب اور ان کے ساتھی ہی نمایاں نظر آنے لگ گئے اور اب اس وقت 1994ء میں پاکستان جمہوری پارٹی کو عرف عام میں نواب زادہ نصر اللہ کی پارٹی کہتے ہیں بہتر ہو گا کہ ہم نواب زادہ صاحب کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالیں قارئین کو تاریخ کے اس گوشے کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو جائے گا۔

نواب زادہ نصراللہ خان کی زندگی اور سیاست

نواب زادہ نصراللہ خان جوانی میں ہی سیاست کے افق پر نمودار ہو گئے تھے سب سے پہلے ان کا نام 1945ء میں منظر عام پر آیا جب وہ آل انڈیا مجلس احرار اسلام کے جنرل سیکرٹری بنے تھے اور دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ ایک نوجوان حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی جماعت مجلس احرار جس کے حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ صدر بنے تھے۔ نوجوان نواب زادہ نصراللہ خان اسی جماعت کے جنرل سیکرٹری بن گئے پھر بہت جلد ملک تقسیم ہو گیا پاکستان بن گیا احرار نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی مگر نواب زادہ صاحب ذہنی طور پر احرار کے ساتھ ہی وابستہ تھے انہوں نے سیاست میں عوامی لیگ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا بہت جلد عوامی لیگ میں بہت سارے لوگ اپنے ہمنوا بنا لئے اور مغربی پاکستان عوامی لیگ کے سرکردہ راہنماؤں میں شامل ہو گئے - 1958ء میں جب ملک میں مارشل لاء لگ گیا تو سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی مگر نواب زادہ صاحب کو جب موقعہ ملتا وہ جمہوریت کی بات کرتے تھے - 1962ء میں جب مارشل لاء ختم ہوا تو اس وقت قومی جمہوری محاذ ان ، ڈی ، ایف قائم کرنے کے لئے نواب زادہ نصراللہ خان نے بہت زیادہ کوشش کی 5 سیاسی جماعتوں نے مل کر قومی جمہوری محاذ قائم کر لیا اور جمہوریت کی جدوجہد شروع کر دی - اس سلسلہ میں جمہوریت کی بحالی کے لئے ایک بہت بڑا جلسہ گوجرانوالہ میں بھی منعقد ہوا تھا نواب زادہ نصراللہ خان اور جناب سہروردی مجیب الرحمان بہت سارے لیڈر شامل ہوئے تھے اس جلسہ کے پروگرام پر سہروردی پر ایک قاتلانہ حملہ بھی ہوا تھا جس میں وہ بال بال بچ گئے تھے اور نواب زادہ نصراللہ خان جمہوریت کی جدوجہد میں پیش پیش سہروردی صاحب کی موت کے بعد مغربی پاکستان عوامی لیگ کی تمام تر ذمہ داری نواب زادہ نصراللہ خان پر ہی آگئی تھی سہروردی صاحب کی وفات کے بعد اور سیاسی حالات کی تبدیلی کی وجہ سے این ڈی ایف کے اثرات کم ہوتے نظر آنے لگ گئے جمہوریت کی جدوجہد کے لئے ایک نئے اتحاد کی ضرورت کا احساس ہوا۔ تو ایک نیا اتحاد سی او پی کمبائن اپوزیشن پارٹیز کے نام پر قائم کیا گیا جس میں نوابزادہ نصراللہ خان نمایاں نظر آنے لگ گئے سی او پی کے اتحاد نے ہی 1965ء کے صدارتی الیکشن میں ایوب خان کے مقابلہ پر مس فاطمہ جناح کو صدارتی امیدوار کھڑا کیا تھا - ایوب خان 1965ء کے صدارتی الیکشن تو جیت گئے صدر تو منتخب ہو گئے تھے مگر انہی سی او پی نے بہت زیادہ پریشان کیا تھا اور وہ جن سیاست دانوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے ان کی طاقت کے وہ معترف ہو گئے - ایوب کے خلاف صدارتی الیکشن میں اور سی او پی کو منظم کرنے میں نوابزادہ نصراللہ خان نے بہت جدوجہد کی اور بہت مصیبتیں اٹھائیں۔

ایوب کے دور حکومت میں کئی دفعہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ 1966ء میں دائیں بازو کی چار جماعتوں نے نیشنل کانفرنس بلانے کا فیصلہ کیا جس میں مسلم لیگ جماعت اسلامی نظام اسلام پارٹی نے شمولیت کی ۔ مشرقی پاکستان کو کوئی جماعت بھی اس میں شامل نہ ہوئی اس کانفرنس کا مقصد تھا کہ اعلان تاشقند کے خلاف تحریک چلائی جائے نواب زادہ نصر اللہ خان نے خود جا کر مشرقی پاکستان سے شیخ مجیب الرحمان کو نیشنل کانفرنس میں شمولیت کے لئے ساتھ لائے اس کانفرنس میں شیخ مجیب الرحمان نے اپنے چھ نکات پیش کئے اور کہا کہ ہم زیادہ دیر تک اب فوج کے غلام نہیں رہ سکتے چھ نکات کی سب نے مخالفت کی اور نواب زادہ نصر اللہ خان نے مغربی پاکستان عوامی لیگ کا الگ گروپ بنا لیا اور مشرقی پاکستان عوامی لیگ سے اپنی سیاست بالکل الگ کر لی۔ اور نیشنل کانفرنس کے انعقاد پر حکومت نے نواب زادہ نصر اللہ خان کو اور دیگر لیڈران کو گرفتار کر لیا تھا۔

جمہوریت کی بحالی کے لئے ایک نیا اتحاد پی ڈی ایم قائم کیا جس میں بھاشانی این اے پی کے علاوہ مغربی پاکستان کی تمام جماعتیں شامل تھیں اور اس اتحاد کے صدر نواب زادہ نصر اللہ بنائے گئے مگر اس اتحاد میں نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ شامل نہیں تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو بھی میدان عمل میں آ چکے تھے وہ بھی پی ڈی ایم میں شامل نہ تھے اس صورت حال کے پیش نظر نواب زادہ نصر اللہ صاحب بنگال کے بھاشانی سمیت دیگر سیاسی پارٹیوں کے راہنماؤں سے رابطے کئے بلا آخر جمہوری مجلس عمل کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت جمہوریت کے حصول کے لئے ایک نئے ولولے کے ساتھ جدوجہد شروع کی گئی جمہوری مجلس عمل کے صدر بھی نواب زادہ نصر اللہ خان ہی بنائے گئے ۔ آخر جمہوریت کی جدوجہد میں بھی زیادہ طاقت آگئی اور ایوب خان مجبور ہو گئے کہ وہ سیاست دانوں سے مذاکرات کریں اور حالات کو بدتر ہونے سے بچائیں۔ انہوں نے جمہوری مجلس عمل کے صدر نواب زادہ نصر اللہ خان کو مذاکرات کی دعوت دی۔ نواب زادہ نصر اللہ خان اور دیگر لیڈروں کے اصرار پر شیخ مجیب الرحمان کو قید سے رہا کر کے مذاکرات میں شامل کیا گیا۔

جمہوریت کی اس جدوجہد میں نواب زادہ صاحب کی شخصیت اپوزیشن لیڈر کی بن گئی اور نواب زادہ نصر اللہ خان کو مسلمہ پاکستان عوام نے پاکستان کی سیاسی جماعتوں نے پاکستان کا جمہوریت پر سب سے زیادہ ثابت قدم اور قربانیاں دینے والا رہنما قرار دیا گیا۔ ایوب امریت کے خلاف سب سے زیادہ جدوجہد بھی نوابزادہ نصر اللہ صاحب نے ہی کی تھی۔

ایوب خان کا دور حکومت ختم ہوا یحییٰ خان اقتدار میں آ گئے مگر نواب زادہ نصر اللہ کی جدوجہد جاری رہی۔ 1969ء میں ہی انہوں نے پاکستان جمہوری پارٹی بنائی جس کے وہ صدر بنے اور آج بھی وہ اس جماعت کے صدر ہیں۔

جب بھٹو کی غیر جمہوری رویہ کے خلاف آل پارٹیز اتحاد یو ڈی ایف بنایا گیا تو نواب زادہ

نصر اللہ خان اس میں بھی رواں دواں تھے جدوجہد میں سب سے آگے تھے۔

بھٹو اور پیپلز پارٹی کے غیر جمہوری ہتھ کنڈوں کے خلاف پاکستان کی 9 جماعتوں کا قومی اتحاد بنا اس میں بھی نواب زادہ نصر اللہ خان برہنہ تلوار کی طرح میدان عمل میں موجود تھے - جنرل ضیاء الحق کے غیر جمہوری حکومت کے خلاف بھی نواب زادہ صاحب میدان عمل میں آ گئے اور ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کیں مگر ارادوں میں کمزوری نہیں آنے دی پھر اس پچاس سالہ جدوجہد میں حصول منصب کے لئے کوئی کوشش نہیں کی صرف جدوجہد کو ہی سرمایہ بنائے رکھا۔ ان پر اپنے عظیم قائداور مرشد حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے اثرات تھے کہ وہ بھی تمام زندگی آزادی کی جدوجہد میں مصیبتیں برداشت کرتے رہے حصول منصب کا کبھی سوچا بھی نہ تھا آج نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب قومی اسمبلی کے ممبر بھی ہیں - بے نظیر بھٹو کی حکومت نے انہیں کشمیر کی کمیٹی کا چیئرمین بھی بنایا ہوا ہے اور وہ اس سلسلہ میں ممالک دنیا کا دورہ بھی کرکے آئے ہیں یہ چھوٹا سا منصب بھی آج انہوں نے 1994ء میں قبول کیا ہے کیا پتہ کہ یہ چھوٹا سا منصب بھی یہ کتاب منظر عام پر آنے سے پہلے ہی چھوڑ کر پھر جدوجہد کے عمل میں آ جاویں۔ پاکستان جمہوری پارٹی بھی نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب کا ہی دوسرا نام ہے - ان کی زندگی کے عوامل ہی پاکستان جمہوری پارٹی کا سرمایہ ہیں۔
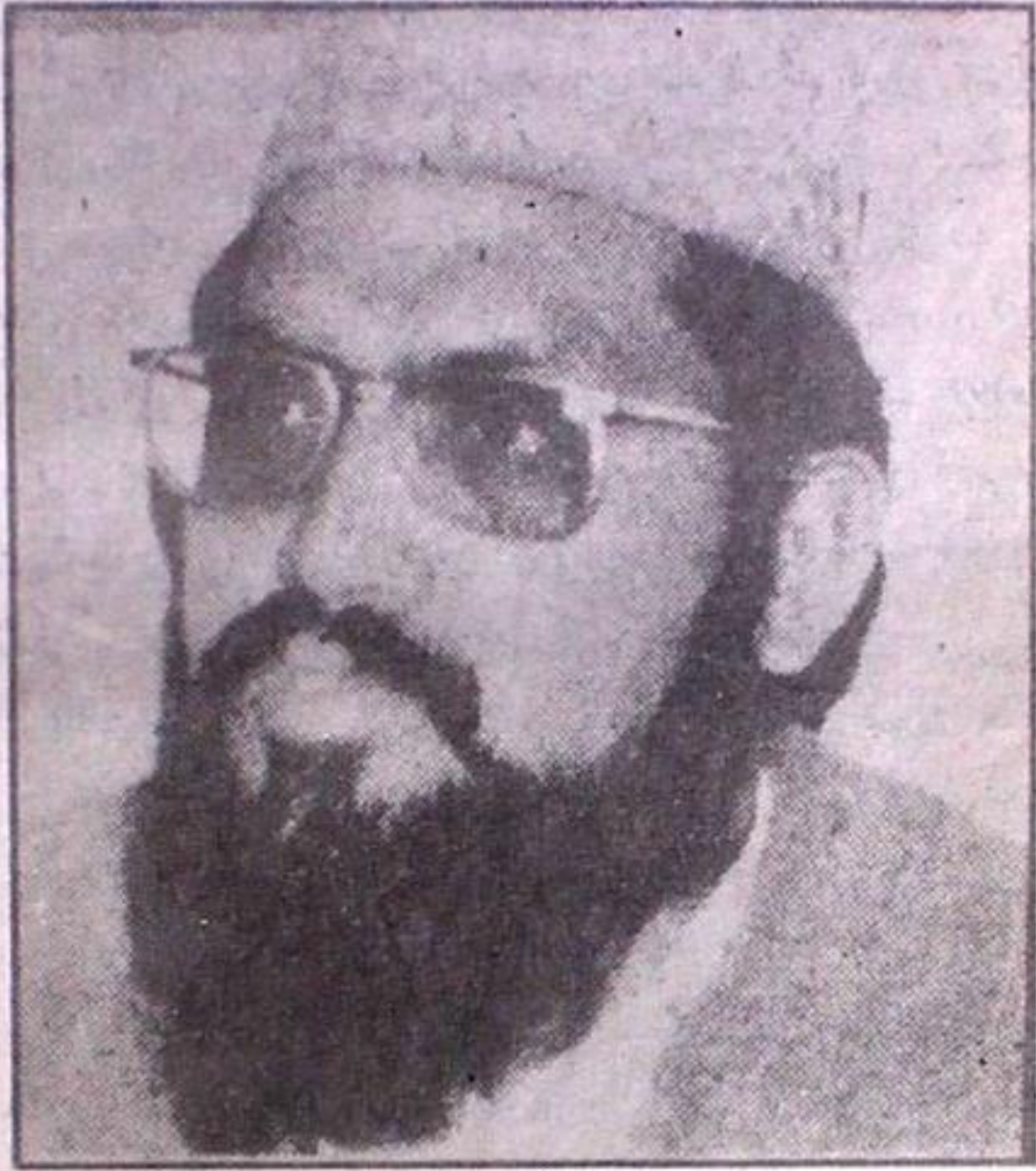
مولانا اعظم طارق

سپاہ صحابہ پاکستان

سپاہ صحابہ پاکستان کی ابتداء شہر جھنگ صوبہ پنجاب میں ہوئی اس کے بانی حضرت مولانا حق نواز جھنگوی تھے۔ ابتداء میں یہ جماعت شہر و ضلع جھنگ تک ہی محدود تھی۔ انجمن سپاہ صحابہ اس کا نام تھا جھنگ کے شہر و ضلع میں شیعہ فرقہ سے تعلق رکھنے والے زمیندار، جاگیرداروں کی چودھراہٹیں کافی مضبوط ہیں جن میں عابدہ حسین کا شاہ جیونا گھرانہ، فیصل صالح حیات کا گھرانا، عارف سیال امان اللہ سیال گھرانہ، بھروانہ گروپ ان سب شیعہ گھرانوں کی پنجاب اور ضلع جھنگ کی سیاست پر کافی گرفت ہے اب سنی چودھراہٹوں کو ضرورت تھی کہ سیاست پر جو شیعہ جاگیرداروں کا قبضہ ہے اسے کمزور کرنے لئے فرقہ واریت کو ہوا دی جائے - سنی مولوی حضرات اور خصوصی طور پر دیوبندی مکتبہ فکر کے علماء پہلے ہی شیعہ عقید کے خلاف کافی پختہ ذہن رکھتے ہیں اب ضلع جھنگ کی سیاسی ضرورت کے تحت شیعہ سنی فرقہ واریت کو زیادہ ہوا دی جانے لگی۔ مولوی حق نواز جھنگوی نے پاکستان میں سب سے پہلے حضور کے صحابہ اکرام کی بے حرمتی کے خلاف انجمن سپاہ صحابہ قائم کی پورے پاکستان کی طرح ضلع جھنگ میں بھی سنی عوام کی تعداد زیادہ ہے الیکشن چودھراہٹوں پر قبضہ زیادہ شیعہ فرقے کے لوگوں کا تھا - انجمن سپاہ صحابہ کی ابتداء میں سنی چودھراہٹوں نے امداد کی اور وہ ہمہ وقت انجمن سپاہ صحابہ کے معاون رہتے - 1986ء کے غیر جماعتی الیکشن میں قومی اسمبلی کی نشست پر پہلی مرتبہ انجمن سپاہ صحابہ کے سرپرست اعلیٰ مولانا حق نواز جھنگوی کھڑے ہوئے اور ناکام ہو گئے - تھوڑا عرصہ بعد وہ قتل کر دیئے گئے ان کی جگہ سپاہ صحابہ کے سرپرست مولانا ایثار القاسمی بن گئے - مولانا قاسمی 1988ء کے الیکشن میں ضلع جھنگ کی قومی اسمبلی کی نشست پر جمعیت علمائے اسلام سمیع الحق گروپ کے ٹکٹ پر مگر عملی طور پر سپاہ صحابہ کی طاقت کے بل بوتے پر کھڑے ہوگئے اور شاہ جیونا گھرانے کو الیکشن میں شکست دے کر قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے اور سپاہ صحابہ کی یہ پہلی سیاسی فتح تھی اور ساتھ ہی قاسمی صاحب پنجاب اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہو گئے مگر آئین کے مطابق صرف ایک ہی اسمبلی کی ممبری رکھ سکتے تھے انہوں نے پنجاب اسمبلی کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا مگر چند ماہ بعد مولانا ایثار القاسمی قتل کر دیئے گئے۔ ان کی جگہ جماعت سپاہ صحابہ کے سرپرست مولانا اعظم طارق بنا دیئے گئے۔ جھنگ کی سیٹ پر ضمنی الیکشن میں مولانا اعظم طارق قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے اس کے بعد اس وقت 1994ء میں بھی اس سیٹ پر مولانا اعظم طارق ہی قومی اسمبلی کے ممبر ہیں اور صوبائی اسمبلی کے دو ممبر بھی ضلع جھنگ کے ان حلقوں میں سپاہ صحابہ کے ہی ہیں جن کے نام شیخ حشمت علی اور ریاض حشمت جنجوعہ ہیں۔

سپاہ صحابہ منظر عام میں آنے لی وجہ سے تشدد کا عنصر شیعہ سنی فرقوں میں غالب آچکا ہے اس وقت تک سنی شخصیات جن میں مولانا حق نواز مولانا ایثار القاسمی، سابق گورنر سرحد جنرل

فضل الحق صاحب مختار سیال عبدالصمد آزاد ' سید صادق حسین شاہ ان سنی حضرات کے علاوہ تقریبا مختلف جگھوں اور وقتوں میں تقریبا ایک سو سنی لوگ قتل ہو چکے ہیں جبکہ علامہ عارف الحسینی پشاور ایرانی سفارت کار صادق گنجی کے علاوہ تقریبا ایک سو شیعہ لوگ بھی قتل ہو چکے ہیں ۔ سپاہ صحابہ کی شاخیں تقریبا پاکستان کے تمام اضلاع میں شہروں میں موجود ہیں۔ اس تصادم میں طریقہ یہ اختیار کی گیا ہے کبھی کسی مسجد میں نمازیوں پر اندھا دھند فائرنگ کرکے یا بم مار کر بے گناہ سینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے کبھی یہ عمل شیعہ اجتماع میں یا امام بارگاہوں میں دھرا کر شیعہ لوگوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔

جون 1994 ء میں ایران کے شہر مشہد میں روضہ امام علی رضا پر دھماکہ سے ایک سو سے زائد لوگ قتل ہو گئے اور بے شمار زخمی ہو گئے۔ حکومت ایران نے اس کارروائی کا الزام سپاہ صحابہ پر لگایا ہے۔ جماعت سپاہ صحابہ کی کوشش سے حکومت پاکستان نے ہر سال یکم محرم کو یوم شہادت حضرت فاروق اعظم کا دن مقرر کیا ہے اور اس روز سارے پاکستان میں سرکاری تعطیل ہوتی ہے ۔ حضرت فاروق اعظم کے جلوس شہروں اور قصبات میں احترام کے ساتھ نکالے جاتے ہیں۔

تحریک جعفریہ پاکستان

تحریک جعفریہ بنیادی طور پر شیعہ فرقہ کی تنظیم ہے مگر چونکہ شیعہ فرقہ کے افراد کی تعداد ملک میں کم ہے اس وجہ سے یہ فرقہ بذات خود کوئی سیاسی تحریک پیدا نہیں کر سکتا۔ تقسیم ہند سے قبل بھی کل ہند شیعہ پولٹیکل کانفرنس تھی جس کا مرکز لکھنؤ میں تھا شیعہ فرقہ کے ساتھ ملک کے نام ور لوگ کئی ریاستوں کے نواب جن میں خیرپور کے نواب چھتاوی کے نواب کے علاوہ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح پاکستان کے سابق صدر جنرل محمد یحیٰ خان اور دیگر بہت سارے نامور شخصیات شامل تھیں مگر آل انڈیا شیعہ پولٹکل کانفرنس اور بعد میں 1970ء مین قائم ہونے والی شیعہ پولٹیکل کانفرنس جو بنیادی طور پر بھی صرف فرقہ شیعہ کی ہی تنظیم تھی اس میں۔کوئی سیاسی منشور وغیرہ یا سیاسی جدوجہد شامل نہ تھی مگر یہ تنظیمیں سیاسی جماعتوں کے ساتھ تعاون کر کے اپنے کچھ اراکین اسمبلیوں کے لئے منتخب کرا لیتی ہیں۔ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے علاوہ دوسری جماعتوں میں بھی شیعہ حضرات نے شامل ہو کر نام پیدا کیا ہے۔ آل انڈیا مجلس احرار کے سیکرٹری جنرل حضرت مولانا مظہر علی اظہر مسلم لیگ کے راہنما پنجاب کے سابق وزیر تعلیم شیخ کرامت علی صاحب نواب سر مظفر علی خان قزلباش، حضرت جوش ملیح آبادی اور پھر تحریک ختم نبوت کے وقت جناب مظفر علی شمس اور حافظ کفایت حسین نے بھی نام پیدا کیا ہے اس کے علاوہ جھنگ کے شاہ جوانہ گھرانہ کے کرنل عابد حسین اور ان کی بیٹی محترمہ عابدہ حسین اور دیگر بہت سارے نامور لوگ شیعہ حضرات میں اور سامنے آئے ہیں اور جب 1970ء میں سیاسی ہنگامے زوروں پر تھے تو شیعہ حضرات نے ملت جعفریہ کو پھر منظم کیا اور پیپلز پارٹی کی حمایت کی گئی۔ مگر صحیح طریقہ پر تحریک جعفریہ کو جنرل ضیاء الحق کے اقتدار میں منظم کیا گیا جب جنرل ضیاء الحق نے پیپلز پارٹی کا زور توڑنے کے لئے مذہبی اور علاقائی پارٹیوں کی حوصلہ افزائی شروع کی تو اس وقت تحریک جعفریہ نے بھی منظم ہو کر اپنی فقہ اور عقیدہ کو مطالبات کی شکل میں پیش کرنے کی ابتداء کی اس وقت تحریک جعفریہ کا نام تحریک نفاذ فقہ جعفریہ رکھا گیا تھا ملت جعفریہ کا پہلا کونشن 1979ء اپریل میں بھکر کے مقام پر ہوئی تھی تحریک جعفریہ کے پہلے سربراہ جناب مفتی جعفر حسین صاحب بنائے گئے اور مفتی صاحب نے اپنے پہلے خطاب میں فرمایا کہ ملت جعفریہ پاکستان میں اسلامی نظام حکومت کی جدوجہد کے لئے قائم کی گئی ہے اسلامی نظام حکومت کی جدوجہد میں 22 نکات متفقہ طور پر حکومت کو پیش کئے گئے تھے اس میں بھی شیعہ فرقہ کی تائید حاصل تھی۔ مفتی صاحب نے مزید فرمایا کہ کوئی فقہ دوسری فقہ پر مسلط نہیں کی جانی چاہئے اور ہمارا مطالبہ اسلامی جمہوری اور آئینی ہے مفتی صاحب نے جنرل ضیاء الحق کی حیثیت کو غیر آئینی قرار دیا اور 1973ء کے آئین کی بحالی کا پرزور مطالبہ کیا اور مفتی صاحب نے مذہبی امور کے وزیر محمود اے ہارون سے ایک ملاقات میں واضح کیا کہ صدر پاکستان کی پالیسیاں اور طرز حکومت اپنے اقتدار کے
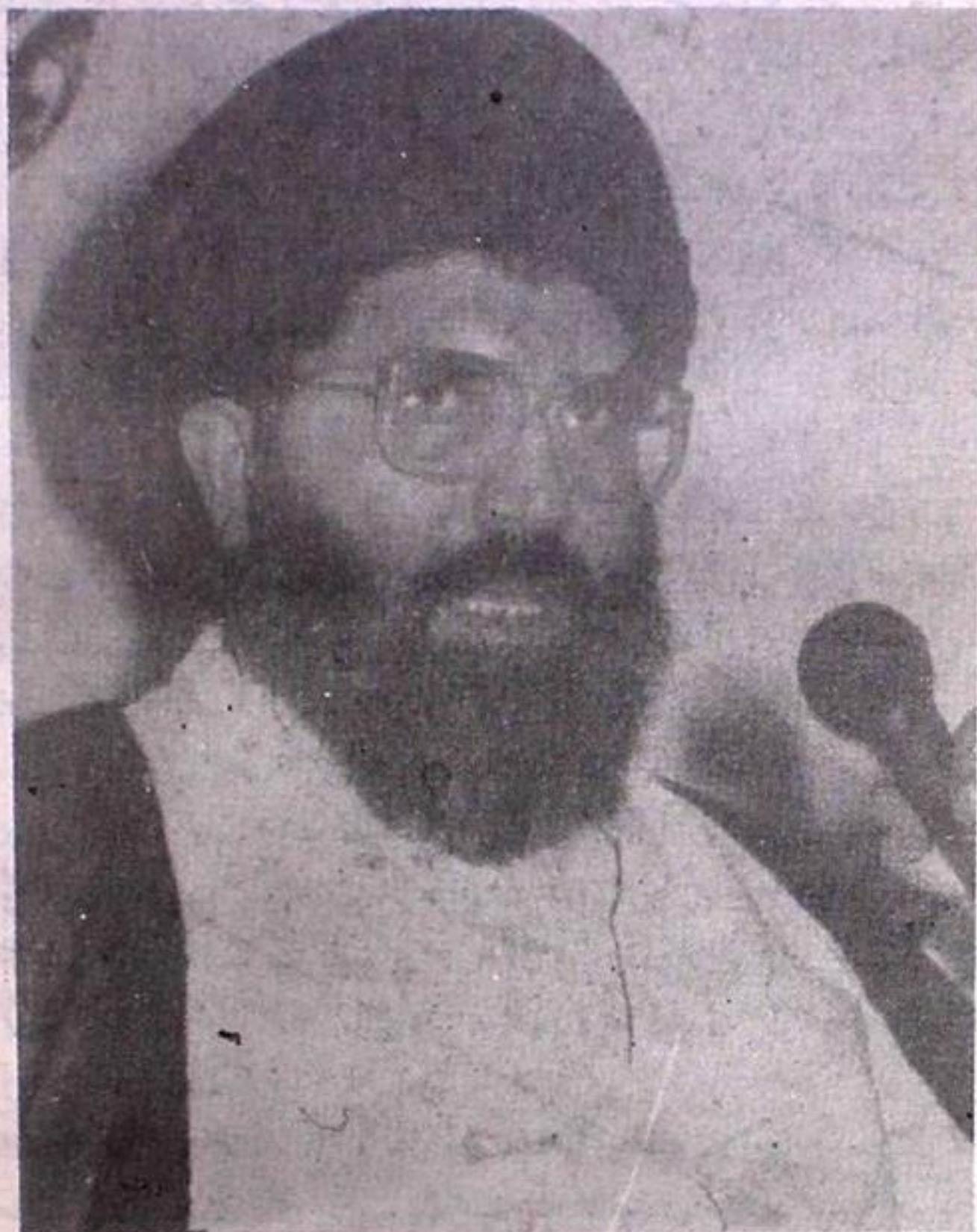
مولانا ساجد نقوی

لئے تو شاید ٹھیک ہو مگر ملت اسلامیہ کے لئے اور وطن کے لئے سود مند نہیں۔ 1980ء میں مفتی صاحب نے زکواۃ آرڈی نینس کو چیلنج کیا اور صدر ضیاء الحق نے مجبور ہو کر ملت جعفریہ کو زکواۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا۔ مفتی جعفر حسین صاحب نے افغانستان کی جنگ کو غیر اسلامی قرار دیا تھا انہوں نے فرمایا تھا کہ افغان جنگ امریکہ کے مفاد کے لئے کی جا رہی ہے۔ مفتی جعفر حسین کی وفات کے بعد تحریک جعفریہ کے سربراہ علامہ عارف الحسینی بنائے گئے تھے علامہ عارف الحسینی اور تحریک جعفریہ پاکستان کے قائدین نے بحالی جمہوریت کے ایم آر ڈی کے ساتھ اتحاد کیا اور جمہوریت کے لئے نواب زادہ نصر اللہ خان اور دیگر قائدین کے ساتھ مل کر جدوجہد میں شامل ہوئے۔ 15 اگت 1988ء کو تحریک نفاذ جعفریہ کے صدر حضرت علامہ عارف الحسینی قتل کر دیئے گئے ان کی جگہ تحریک کے سربراہ علامہ ساجد نقوی بنائے گئے۔ 1988ء میں ہی صوبہ سرحد میں ڈیرہ اسماعیل خان میں تحریک جعفریہ کے کارکنان قتل ہوئے۔ 1993ء میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کا نام تحریک جعفریہ رکھ دیا گیا اس وقت اہل شیعہ اور اہل سنت میں تصادم کی کیفیت ہے۔ اس تصادم کی ابتداء سنی عالم دین مولانا حق نواز جھنگوی کے قتل سے ہوئی اور اس کے بعد 1988ء میں قومی اسمبلی کے ممبر اور سپاہ صحابہ پاکستان کے صدر مولانا ایثار الحق قاسمی قتل کر دیئے گئے۔ سابقہ گورنر صوبہ سرحد جناب فضل الحق صاحب کا قتل بھی فرقہ وارانہ کشیدگی کا نتیجہ ہی بتایا جاتا ہے۔ شیعہ حضرات نے تحریک جعفریہ کے سابق راہنما علامہ عارف الحسینی اور حکومت ایران کے کونسلیٹ جناب صادق گنجی اور دیگر بہت سارے لوگ قتل ہو چکے ہیں اگر کوئی شیعہ راہنما قتل ہو جاتا ہے تو اس کا الزام سپاہ صحابہ پر لگایا جاتا ہے اگر کوئی سنی راہنما جس کا تعلق سپاہ صحابہ سے ہو قتل ہو جائے تو اس کا الزام تحریک جعفریہ پر لگا دیا جاتا ہے اس وقت تک دونوں اطراف کے لوگوں اور راہنماؤں سمیت یک صد یک صد سے زائد قتل ہو چکے ہیں تحریک جعفریہ نے بھی سپاہ محمدی کے نام پر ایک مسلح تنظیم قائم کرلی ہے دونوں طرف کے لوگوں کو قتل کرنے کا طریقہ یہ رائج ہے کہ سپاہ صحابہ کے ہمدردوں کو مساجد میں وقت نماز بم مار کر بے گناہ لوگوں کو قتل کیا جاتا ہے جبکہ شیعہ اجتماعات میں گولیاں چلا کر بم مار کر بے گناہ لوگوں کو قتل کیا جاتا ہے۔

شمالی علاقہ جات تبرا بازی اور مدح صحابہ

شیعہ اور سنی عقید کے لوگوں میں تفرقہ اور وجہ نزاع تبرا بازی اور مدح صحابہ ہے۔ شیعہ عقید میں یہ شامل ہے کہ اگر موقع ملے تو حضور علیہ اسلام کے صحابہ پر تبرا، گالیاں دی جائیں لعنت کی جائے جبکہ سنی حضرات صحابہ رسول کو بہت ہی زیادہ احترام دیتے ہیں۔ نومبر 1994ء کو لاہور میں شیعہ حضرات نے مینار پاکستان کے کھلے میدان میں عظمت اسلام کانفرنس منعقد کی جس

میں پاکستان بھر سے شیعہ مندوبین شامل ہوئے تحریک جعفریہ کے صدر علامہ ساجد نقوی صاحب نے فرمایا کہ ملک میں فرقہ پرستی کو بہت ہوا دی جا رہی ہے انہوں نے کہا کہ اہل شیعہ امت مسلمہ کا طاقت ور حصہ ہیں اس کانفرنس میں پیپلز پارٹی کے لیڈروں اور حکومت کے خلاف نعرہ بازی کی گئی اور پیپلز پارٹی سے قطع تعلق کا اعلان کیا گیا انہوں نے کہا کہ ہمارے قائد علامہ عارف الحسینی کو شہید کیا گیا اور اس کے علاوہ تقریبا ایک سو سے زائد نامور شیعہ حضرات اور کارکنوں کو شہید کیا گیا انہوں نے کہا کہ ہماری خلاف دہشت گردی کی جاتی ہے ہمارے لوگوں کو قتل کیا جاتا ہے مجبورا ہمیں بھی اسلحہ اٹھانا پڑا ہے انہوں نے کہا کہ خلیج کی ریاستوں کو امریکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا ہے۔ اس وقت تحریک جعفریہ کے سربراہ علامہ ساجد نقوی صاحب ہیں ان کے علاوہ بڑے لیڈران میں علامہ باقر نجفی' علامہ رمضان توقیر' افتخار نقوی' سید ریاض احمد' علامہ محمد حسین جعفری' اور جنرل سیکرٹری انور علی اخوندزادہ ہیں۔ 25 نومبر 1994ء کو مینار پاکستان کے میدان میں جو عظمت اسلام کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کے شرکاء جب واپس جا رہے تھے تو کھاریاں ضلع گجرات کے قریب شرکائے جلسہ کی گاڑی پر نامعلوم حملہ آوروں نے فائرنگ کر دی جس سے 7 آدمی موقعہ پر مرگئے اور ساٹھ آدمی زخمی ہوئے بس پر بہتر آدمی سوار تھے اور اس کے جواب میں 27 نومبر 1994ء کو لاہور لوئر مال کے علاقہ میں ایک مسجد میں نمازیوں پر بم مارا گیا جس سے تین آدمی مارے گئے اور بیس نمازی زخمی ہوئے شیعہ سنی یہ فسادات ہوتے رہتے ہیں اس وقت یہ روزمرہ کا معمول بن چکا ہے سنی حضرات نے مسلح رضا کار تنظیم سپاہ صحابہ بنا رکھی ہے جبکہ شیعہ حضرات نے مسلح رضا کار تنظیم سپاہ محمدی بنا رکھی ہے - اس وقت پاکستان کے شمالی علاقہ جات گلگت ' ہنزہ' وغیرہ کی الگ سیاسی حیثیت بنائی گئی ہے اس میں تحریک جعفریہ کو اچھی خاصی کامیابی ہوئی ہے شمالی علاقہ جات کی کونسل میں تحریک جعفریہ کے 9 ممبر منتخب ہوئے ہیں ابھی تک اس علاقہ کی کوئی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ تحریک جعفریہ والے الزام لگا رہے ہیں کہ پیپلز پارٹی والے ہارس ٹریڈنگ کے ذریعے ہمارے ممبران کو ورغلا رہے ہیں اور تحریک جعفریہ کے ممبران کو خریدا جا رہا ہے۔ آنے والا وقت شیعہ سنی فرقہ واریت کے تصادم میں زیادہ بھیانک نظر آ رہا ہے۔

جمعیت علمائے پاکستان

جمعیت علمائے پاکستان 1952ء میں مدرسہ حزب الاحناف علمائے مکتبہ بریلوی اور مشائخ حضرات کے اجتماع میں قائم کی گئی۔ جمعیت کے پہلے صدر حضرت مولانا عبدالحامد بدایونی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت مولانا ابو الحسنات رحمتہ اللہ علیہ جنرل سیکرٹری بنائے گئے جن لوگوں پر یہ جماعت مشتمل ہے وہ لوگ سیاسی مزاج نہ رکھتے ہوئے بھی انہوں نے سیاسی جماعت کی تشکیل دے دی جماعت کی تشکل کے باوجود کافی وقت تک جمعیت علمائے پاکستان کی بھرپور سرگرمیاں منظر عام پر نہیں آئیں۔ میں جب زیر نظر کتاب کی متعلق مواد حاصل کرنے کے لئے گیا تو مجھے کہا گیا کہ میں رضائے مصطفیٰ کے ایڈیٹر جناب نیازی صاحب کے پاس جاؤں میں نے گوجرانوالہ کے مسجد روڈ والی میں جا کر نیازی صاحب سے رابطہ کیا تو وہ کہنے لگے کہ آپ چند روز بعد آئیں میں پھر ان کی بتائی ہوئی تاریخ پر حاضر ہوا انہوں نے مسجد کے کتب خانہ سے ایک کتابچہ مجھے دیا کہ جس کا نام تھا مخالفین پاکستان کا کردار میں نے سرورق دیکھ کر نیازی صاحب سے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ جمعیت علمائے پاکستان اپنے کارہائے نمایاں بتائے تاکہ میں لکھوں۔ جمعیت کا کردار تاریخ میں نمایاں نظر آئے اس پر انہوں نے فرمایا کہ ہماری جدوجہد بھی اسی کتابچے میں نظر آجائے گی میں نے کتابچہ پڑھا مجھے اس میں سوا اس کے اور کچھ نظر نہیں آیا کہ تحریک آزادی کے ساتھ وابستہ جماعتوں کی لیڈروں کی کردار کشی کی گئی ہے اور مشائخ اور بریلوی مکتبہ فکر کے ساتھ تعلق رکھنے والے علماء کی تعریف کی گئی ہے میں یہاں صرف اس قدر ہی عرض کروں گا کہ اگر بدیشی انگریز حکمرانوں کے خلاف کسی قسم کی تحریک چلانا اچھا عمل تھا تو پھر پاکستان کے 95 فیصد بریلوی مکتبہ فکر کے علمائے مشائخ اور مسلم لیگ کے سو فیصد سیاست دان خطاب یافتہ گان اس تحریک میں شامل نہ تھے اگر انگریز حکمرانوں کے خلاف تحریک چلانا بری بات تھی انگریز حکومت کے ساتھ تعاون کرنا ہر قسم کی خدمت بجا لانا اچھی بات تھی خدمت کے صلہ میں انعام اکرام حاصل کرنا اچھی بات تھی تو اس میں مسلم لیگ کے ساتھ بریلوی مکتبہ فکر کے علماء اور مشائخ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مندرجہ بالا چند فقرات ضمناً آ گئے تھے اب اصل موضوع کی طرف پھر آتا ہوں میں جمعیت علمائے پاکستان کے اور لیڈروں سے بھی ملا ان سے جمعیت کے بارے معلومات حاصل کرنے کے کوشش کی جن حضرات سے میں اس سلسلہ میں ملا ان میں حضرت علامہ سعید احمد مجددی خطیب جامع مسجد ماڈل ٹاؤن گوجرانوالہ' جناب مولانا غلام فرید صاحب خطیب جامع مسجد گرونانک پورہ گوجرانوالہ بھی شامل ہیں مگر ان لوگوں کی اس قدر مصروفیات تھیں کہ وقت ہی نہ دے سکے اور جمعیت کے بارے میں کوئی لٹریچر بھی ان سے نہ مل سکا۔ دراصل ذہنی طور پر بریلوی مکتبہ فکر کے علمائے اور مشائخ اپنے خاص طریقہ تبلیغ میں مصروف رہتے ہیں اور اپنی جماعت

جمعیت علمائے پاکستان کو بوقت ضرورت ٹائیٹل کے طور پر ہی استعمال کرتے ہیں ورنہ ان حضرات کو سیاست میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی کئی وقت میں مختلف علماء حضرات اور مشائخ عظام جمعیت علمائے پاکستان کے سربراہ بھی رہے اور بوقت ضرورت جماعت کو سرگرم عمل بھی کیا جمعیت علمائے پاکستان میں جن علماء حضرات اور مشائخ عظام کا نام منظر عام پر آیا ان میں حضرت بدایونی حضرت ابو لحسنات کے علاوہ حضرت ابو البرکات علامہ سعید احمد کاظمی ملتان حضرت پیر سید فیض الحسن صاحب سجادہ نشین الو مہار شریف خواجہ قمر الدین صاحب سیالوی' سید محمود احمد رضوی' گجراتی اور دیگر کئی علماء اور مشائخ حضرات کا نام اکثر سننے میں آتا رہا ہے۔

ایوب کے دور حکومت میں مشائخ حضرات اور جمعیت علمائے پاکستان کے اکابرین ایوب حکومت کے ساتھ تھے غالبا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت پیر دیول شریف رحمتہ اللہ علیہ ایوب خاندان کے مرشد کامل تھے اور تمام ایوبی خاندان حضرت دیول شریف کے دستہ بستہ غلاموں میں شمار ہوتے تھے - ایوب کے دور حکومت میں خواجہ قمر الدین سیالوی رحمتہ اللہ علیہ جمعیت علمائے پاکستان کے صدر اور حضرت پیر سید فیض الحسن الو مہار شریف جنرل سیکرٹری تھے - بشمول مندرجہ بالا حضرات کے جمعیت علمائے پاکستان بحیثیت جماعت بھی ایوب حکومت کے ساتھ تھی - 1962ء کا آئین نافذ ہونے کے بعد جب بھی رابطہ عوام کی مہم پر ایوب نے ملک کا دورہ کیا تو حضرت پیر فیض الحسن صاحب جنرل سیکرٹری جمعیت علمائے پاکستان صدر ایوب کے ساتھ ہوتے تھے اور ایوبی حکومت کے آخر تک وہ ساتھ رہے اور دیگر جمعیت کے اراکین اور مشائخ بھی ساتھ رہے۔

یحییٰ خان کے دور حکومت میں نیشنل عوامی پارٹی نے پیپلز پارٹی کے تعاون سے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں سوشلسٹ کانفرنس کی تھی جس میں سوشلزم کی گونج نے پورے ملک کو سکتے میں ڈال دیا تھا اس کانفرنس میں پنجاب سے لاکھوں لوگ شریک ہوئے تھے مولانا بھاشانی نے اس جلسہ کو خطاب کیا تھا اور بہت ہی کامیاب کانفرنس ہوئی تھی اس کانفرنس کے جواب میں جمعیت علمائے پاکستان نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہی چند ہفتے بعد نظام مصطفیٰ کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں لاکھوں لوگ شریک ہوئے اور بھاشانی کانفرنس کے اثرات کو زائل کر دیا گیا - 1970ء کے الیکشن میں جمعیت علمائے پاکستان کافی متحرک ہوئی اور بہت جگہوں پر اپنے نمائندے کھڑے کئے کافی ووٹ حاصل کئے مگر پنجاب میں بہت کم کامیاب ہوئی مجموعی طور پر 1970ء کے الیکشن میں جمعیت قومی اسمبلی میں سات نشستیں ملیں تھیں لائل پور میں جمعیت نے میاں رفیق سہگل کو قومی اسمبلی کا ٹکٹ دیا تھا مگر وہ ناکام ہو گئے تھے۔ 1970ء میں ہی سندھ کی صوبائی اسمبلی میں بھی 9 ممبران کامیاب ہوئے جن میں شاہ فرید الحق ظہور الحسن بھوپالی صوفی ایاز اور حافظ محمد تقی بھی شامل تھے۔

جمعیت کے قومی اسمبلی کے سات ممبر تھے پارلیمانی پارٹی کے لیڈر مولانا شاہ احمد نورانی ڈپٹی لیڈر حضرت مولانا عبد المصطفیٰ الازہری تھے۔ جمعیت نے حکمران جماعت پیپلز پارٹی سے تعاون

نہیں کیا اور اپوزیشن کے بنچوں پر بیٹھ گئے اور متحدہ اپوزیشن پارلیمانی پارٹی کے لیڈر جناب عبدالولی خان بنائے گئے تھے۔ جمعیت کی پارلیمانی پارٹی اور جمعیت علمائے پاکستان بھی بھٹو کے دور حکومت میں اپوزیشن کے ساتھ رہے اور تحریک نظام مصطفیٰ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا قومی اتحاد نے جو مشترکہ جھنڈا بنایا تھا جس میں نو ستارے تھے جمعیت بھی ان نو ستاروں میں ایک ستارہ تھی۔ جتنا عروج جمعیت علمائے پاکستان کو بیسوی صدی کی آٹھویں دھائی میں ہوا ویسا عروج کبھی بھی حاصل نہیں ہوا اس زمانے سے ہی جماعت کے صدر حضرت شاہ احمد نورانی چلے آ رہے ہیں۔ رفیق احمد باجوہ کی جماعت سے علیحدگی کے بعد مولانا عبدالستار نیازی جمعیت کے جنرل سیکرٹری بن گئے ہیں۔ ان ہر دو شخصیات کا آپس میں اختلاف مگر یہ اختلاف ذاتی نوعیت کے ہیں جمعیت کے پروگرام میں دونوں حضرات کا کوئی اختلاف نہیں جمعیت کے بنیادی ذہنیت میں احترام مشائخ علمائے دین بنیادی حیثیت کے دو عمل ہیں اگر کوئی شخصیت علمائے یا مشائخ جمعیت علمائے پاکستان کا عہدیدار نہ بھی ہو تو بھی جماعت میں اس کی عزت مقدم ہوتی ہے۔

بھٹو دور کے بعد ضیاء الحق کے دور حکومت میں غیر جماعتی انتخابات میں قومی اسمبلی کے انتخابات میں حاجی حنیف طیب، جنرل انصاری، احمد سعید کاظمی، عطاء محمد قریشی کامیاب ہوئے عوام کا ایک بہت بڑا حلقہ جو بریلوی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ جمعیت کے ساتھ ہے۔

ضیاء دور حکومت میں ہی جب سندھ کے بڑے شہروں میں مہاجر قومی موومنٹ منظم ہونا شروع ہو گئی تو ان حلقوں میں دیگر جماعتوں کا اثر گھٹنا شروع ہو گیا جمعیت علمائے پاکستان کو 1970ء کے الیکشنوں میں کراچی اور حیدر آباد سے قومی اسمبلی کی چھ نشستیں ملیں تھیں اور کراچی حیدر آباد کو جمعیت کا مرکز سمجھا جانے لگا تھا مگر اب حیدر آباد اور کراچی کی سیاست پر مہاجر قومی موومنٹ نے قبضہ کر لیا ہے۔

1990ء کے الیکشنوں میں مولانا عبدالستار نیازی اور ان کے گروپ کو پنجاب میں کچھ کامیابی ہوئی ہے۔ نیازی صاحب قومی اسمبلی کے ممبر بھی بن گئے اور نواز شریف کولیشن حکومت میں شامل بھی ہو گئے اور وزارت مذہبی امور کا قلمدان انہیں سونپا گیا۔ مولانا عبدالستار نیازی صاحب نے ہی توہین رسالت کے مرتکب مجرم کو سزائے موت کا قانون مرکزی اسمبلی سے منظور کرایا تھا۔ اور آج پاکستان میں یہ قانون ہے کہ جو بھی بدبخت توہین رسالت کا مرتکب ہو گا اسے سزائے موت دی جائے گی۔ 1993ء کے الیکشن میں نیازی صاحب قومی اسمبلی کے ممبر نہ بن سکے مگر ان کی ہمدردیاں اس وقت بھی اسلامی جمہوری اتحاد کے ساتھ ہیں۔ شنید ہے کہ کشمیر کی گوریلا جنگ میں اس وقت جہاں دیگر گروپ مصروف عمل ہیں وہاں جمعیت علمائے پاکستان کے ورکر بھی کشمیر کی اس جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ اس وقت جمعیت علمائے پاکستان کے صدر حضرت مولانا شاہ احمد نورانی اور جنرل سیکرٹری مولانا عبدالستار نیازی ہیں جبکہ دونوں حضرات کی سیاسی راہیں الگ الگ ہیں نیازی صاحب نواز شریف کے ساتھ ہیں اور انہیں کے تعاون سے وہ

سینٹ کے ممبر بھی بنے ہیں اور سینٹ میں اور باہر بھی وہ اسلامی جمہوری اتحاد کے ساتھ ہیں جبکہ حضرت شاہ احمد نورانی مسلم لیگ نواز گروپ کے خلاف ہیں ان کا فرمانا ہے کہ ایم کیو ایم کو کراچی اور سندھ میں ضیاء الحق نے طاقت ور بنانے میں الطاف حسین کے ساتھ بہت تعاون کیا ہے جس کی وجہ سے جمعیت علمائے پاکستان کراچی اور سندھ میں اپنی طاقت کھو بیٹھی ہے اس وجہ سے ضیاء الحق اور اس کے باقیات جمعیت علمائے پاکستان کے قاتل ہیں۔

مجلس احرار اسلام پاکستان

متحدہ ہندوستان کے وقت مجلس احرار پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی مضبوط جماعت تھی مجلس احرار کے متحدہ ہندوستان کے وقت پنجاب اسمبلی میں 1937ء کے الیکشن میں تین نشستیں تھیں۔ بمبئ اسمبلی میں احرار کے ایک ممبر حافظ علی بہادر تھے کلکتہ کارپوریشن کے میر سید بدردجہ بھی مجلس احرار سے وابستہ تھے مگر پاکستان بن جانے کے بعد دوسری غیر مسلم لیگی جماعتوں کی طرح احرار بھی غیر متحرک ہو گئی بلکہ 1948ء میں مجلس احرار کانفرنس لاہور میں ہوئی تھی جس میں احرار کو سیاسی طور پر ختم کر دیا گیا تھا اس کے ورکر بھی منتشر ہو کر دوسری جماعتوں میں چلے گئے تھے نواب زادہ نصر اللہ خان جو کہ اس وقت بھی زندہ ہیں ملکی سیاست کے عروج پر ہیں وہ 1947ء میں مجلس احرار اسلام ہند کے جنرل سیکرٹری تھے۔ حضرت سید پیر فیض الحسن صاحب سجادہ نشین الو مہار شریف مرحوم بھی 1947ء میں آل انڈیا مجلس احرار کے سالار تھے حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی مرحوم سابقہ ممبر قومی اسمبلی جنرل سیکرٹری جمعیت علمائے اسلام بھی مجلس احرار کے ساتھ ہی وابستہ تھے۔ عہدہ دار تھے۔ پاکستان بن جانے کے بعد احرار کے لئے سیاسی حالات موافق نہ تھے اس وجہ سے احرار سیاسی طور پر منتشر ہو گئے جو عشق کی حد تک مجلس احرار کے ساتھ تھے وہ چند لوگ ہیں مگر وہ غیر متحرک ہو چکے ہیں۔ اس وقت مجلس احرار کا صدر دفتر ملتان میں ہے چند سال قبل تک لاہور کے چودھری ثناء اللہ بھٹہ صاحب مجلس احرار کے صدر تھے اس وقت حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے صاحبزادے حضرت ابو ذری بخاری احرار کے صدر ہیں دیگر صاحب زادہ گان بھی س احرار کے ساتھ ہی وابستہ ہیں۔ ملتان لاہور اور دیگر کسی بڑے شہر میں کہیں کوئی احرار کا بورڈ نظر آ جاتا ہے سیاسی طور پر یہ جماعت بالکل غیر متحرک ہے معتقدین کبھی کبھی حضرت امیر شریعت کے صاحب زادہ گاہ کا کوئی جلسہ کرا لیتے ہیں اور جب حکومت پاکستان نے جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں سیاسی جماعتیں رجسٹرڈ کرانے کا حکم دیا تھا تو اراکین احرار نے مجلس احرار کو بطور سیاسی جماعت رجسٹرڈ بھی کرا لیا تھا۔
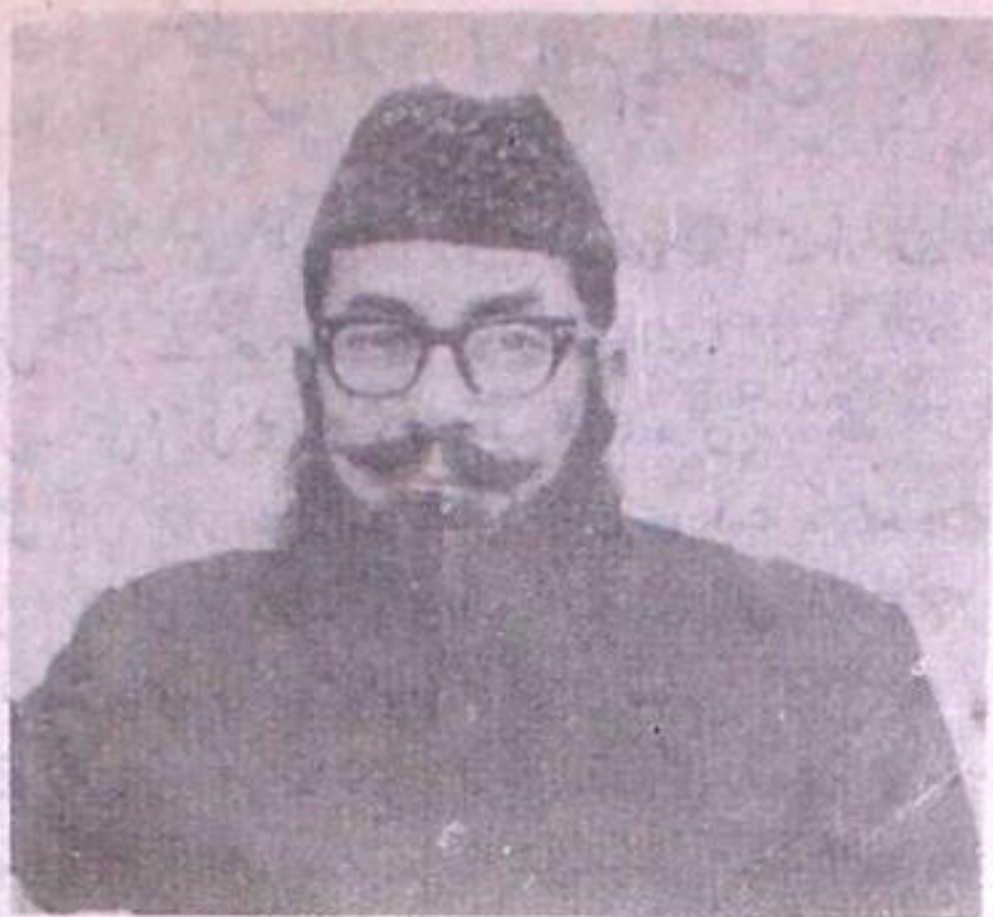
خطیب اسرار صاحبزادہ فیض الحسن

درورے پختون - پختون بھائی

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کئی ابواب میں ذکر کیا ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد مسلم لیگ جو پاکستان کی خالق جماعت تھی اس کے علاوہ کسی بھی دیگر جماعت کو عملاً سیاست سے الگ کر دیا گیا تھا۔ دیگر جماعتوں کے لیڈران کی کردار کشی اخبارات' ریڈیو اور جلسوں کے ذریعے کی جاتی تھی۔ طرح طرح کے الزامات لگائے جاتے تھے۔ ہندوؤں کا ایجنٹ کسی کو کہہ دینا' غدار کہہ دینا تو معمولی بات تھی۔ اسی طرح انجمن وطن بلوچستان کو بھی خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور ان کے لیڈران کو گرفتار بھی کیا گیا۔ یہ لیڈران اور ورکران کئی سال تک قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرتے رہے۔ آخر جب مشرقی پاکستان کے الیکشن میں مسلم لیگ کو شکست فاش ہوئی تو حکومت کی پالیسی میں کچھ فرق آیا اور متحدہ ہندوستان کے وقت کی جماعتوں پر سے عتاب کچھ کم ہوئے۔ ورکر اور لیڈر جیلوں سے باہر آئے تو انہوں نے نئے طریقہ سے جدوجہد کا آغاز کیا۔ 1955ء میں ہی خلاف قانون انجمن وطن کے لیڈران' ورکران کوئٹہ میں ہاشم خان غلزئی کے مکان میں جمع ہوئے۔ جن میں خان عبدالصمد خان اچکزئی' ہاشم خان علزئی' ڈاکٹر خدائے داد اور دیگر بہت سارے پرانے سیاسی کارکن جمع ہوئے۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض ڈاکٹر خدائے داد نے ادا کئے۔ اس کنونشن میں درورے پختون کی بنیاد رکھی گئی جس کا بنیادی نظریہ جمہوریت کے ساتھ ساتھ بلوچستان کو صوبہ کا درجہ دلوانا اور آئنی حقوق دلوانا تھا جو کہ پاکستان کے دوسرے صوبوں کو حاصل تھے اور سیاست پر جو اجارہ داری مخصوص طبقہ کو حاصل تھی اسے ختم کرانا تھا۔ 1956ء میں ہی حکومت پاکستان نے مغربی پاکستان میں تمام صوبوں کو ختم کر کے ایک صوبہ مغربی پاکستان بنانے کا اعلان کر دیا اور اس پر عمل درآمد 1956ء کے آئین کے ساتھ ہی ہو جانا تھا۔ اب سیاست کا رخ بدل گیا۔ چھوٹے صوبوں کے لوگ چھوٹے صوبوں کے ختم کرنے کے حق میں نہ تھے۔ حصول مقصد کے لئے پاکستان کی سطح پر جماعت بنانے کی ضرورت کا احساس بڑی شدت سے ابھرا۔ بلوچ لیڈران نے دوسرے صوبے کے لیڈران کے ساتھ رابطے کئے اور باہم اجلاس وغیرہ ہوئے اور آخر 1957ء میں ملک گیر جماعت نیشنل عوامی پارٹی میں درورے پختون جماعت مدغم ہو گئی۔

استھمان گل عوامی پارٹی

متحدہ ہندوستان کے وقت ریاست قلات میں قلات نیشنل پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت تھی جس کا ذکر سابقہ باب میں آچکا ہے ریاست قلات بلوچستان کے بیشتر رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ صرف پختون علاقہ اور کوئٹہ شہر پر ہی انگریز حکومت تھی بقیہ سارے بلوچستان پر ریاست قلات کی حکمرانی تھی۔ قلات نیشنل پارٹی قلات کی واحد سیاسی جماعت تھی اور تقسیم ہند کے خلاف تھی۔ متحدہ ہندوستان کی حامی تھی۔ پاکستان بن جانے کے بعد یہ جماعت بھی معتوب قرار دی گئی۔ خلاف قانون قرار دی گئی۔ متحدہ ہندوستان کے وقت قلات اسمبلی میں قلات نیشنل پارٹی کو اکثریت حاصل تھی اور قلات اسمبلی میں ہی مشہور بلوچ لیڈر میر غوث بخش بزنجو اور دیگر بلوچ لیڈران نے الحاق پاکستان کی مخالفت کی تھی اور پاکستان بن جانے کے بعد خان آف قلات کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ریاست کا الحاق ہندوستان کے ساتھ

کریں اس زمانے میں یہ بھی سنا گیا تھا کہ خان آف قلات نے ریاست قلات کی ہندوستان میں شمولیت کی درخواست بھی کی تھی مگر ہندوستانی حکومت نے یہ درخواست یہ کہ کر مسترد کر دی تھی کی جس ریاست پر حکومت ہند آسانی سے کنٹرول نہیں کر سکتی اس ریاست کی ہندوستان میں شمولیت نہیں کریں گے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ریاست قلات کی پاکستان میں شمولیت کے بعد خان آف قلات کے چھوٹے بھائی شہزادہ عبدالکریم نے حکومت پاکستان کے خلاف مسلح بغاوت کر دی تھی جو جنگ ایک ماہ سے زیادہ وقت تک جاری رہی اس جنگ میں کئی لوگ جاں بحق ہوئے۔ یہ جنگ افغان سرحد پر ہوئی تھی یہ بغاوت کچل دی گئی تھی اس جنگ کا ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ انگریز کے وقت کا ایک صوبے دار ریٹائرڈ سردار بیگ محمد عرف بیگو شہزادہ عبدالکریم کی فوج کا کمانڈر ان چیف تھا مگر پاکستان سرکار کے ساتھ ملا ہوا تھا وہ شہزادہ عبدالکریم کی فوج یا اپنی فوج جس کا وہ کمانڈر انچیف تھا ہر راز حکومت پاکستان کی فوج کو بتا دیا کرتا تھا اس وجہ سے بھی شہزادہ عبدالکریم کی فوج کو بہت جلد شکست ہو گئی تھی اور کمانڈر انچیف بیگ محمد عرف بیگو کو حکومت پاکستان نے بہت انعام کرام سے نوازا تھا۔ شہزادہ عبدالکریم کی فوجی مسلح بغاوت کچل دی گئی اور وہ گرفتار کر لئے گئے اور 1954ء تک جیل میں قید رہے۔ ان کے علاوہ دیگر کئی بلوچ لیڈر بھی گرفتار کئے گئے تھے اور یہ لوگ کئی برس تک قید رہے۔ پھر جب مشرقی پاکستان کے صوبائی الیکشنوں میں مسلم لیگ کو شکست ہوئی تو پاکستان کی مرکزی سیاست میں بھی تبدیلی آنا شروع ہو گئی اور وہ لوگ جو پاکستان سے قبل غیر مسلم لیگی تھے انہیں بھی کسی حد تک برداشت کیا جانے لگا۔ اسی برداشت کے احساس نے بلوچ لیڈروں کو سیاسی جماعت بنانے اور منظم ہونے کی حوصلہ افزائی کی۔ بلوچ لیڈروں نے کوئٹہ میں' مستونگ میں کنونشن منعقد کئے جس میں شہزادہ عبدالکریم' میر گل خاں نصیر' میر غوث بخش بزنجو' عبدالکریم شورش کے علاوہ بہت سارے بلوچ لیڈر شامل ہوئے جس میں استمان گل نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی گئی جس کے پہلے صدر شہزادہ عبدالکریم اور جنرل سیکرٹری میر گل خان نصیر بنائے گئے تھے اس جماعت کے مطالبات میں بھی بڑے مطالبات یہ تھے کہ بلوچستان کے صوبہ کو آئینی حقوق جو کہ پاکستان کے دوسرے صوبوں کو حاصل ہیں دیے جائیں۔ آزاد انتخابات کے ذریعے بلوچستان اسمبلی چنی جائے۔ سیاسی قیدی رہا کئے جائیں۔

ابھی 1955ء میں یہ سیاسی جماعت بنی ہی تھی کہ مرکزی حکومت نے مغربی پاکستان کے تمام صوبے ختم کر کے ایک صوبہ مغربی پاکستان بنائے جانے کا اعلان کر دیا جس پر عمل درآمد 1956ء میں ہونا تھا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں کی سیاست بدل گئی اور ان لوگوں نے ون یونٹ کے خلاف سوچنا شروع کر دیا اور بالآخر 1957ء میں استمان گل پاکستان نیشنل پارٹی میں ضم ہو گئی۔

پاکستان نیشنل پارٹی بنائے جانے کا پس منظر

مارچ 1957ء میں ایک کنونشن لاہور شہر برکت علی محمڈن ہال میں منعقد ہوا تھا جس میں پاکستان نیشنل پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی اس کنونشن میں مغربی پاکستان کی ان چھ جماعتوں کے مندوبین جمع ہوئے تھے جن لوگوں نے 1947ء سے قبل تقسیم ہند یعنی پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ ویسے تو مسلم لیگ کے

علاوہ تمام جماعتوں نے تقسیم ہند کی مخالفت کی تھی مگر ان میں سے بعض جماعتیں ایسی تھیں جنہوں نے سیاست کی سمت ہی الگ متعین کر لی تھی۔ اور کچھ بچاؤ کی صورت پیدا کر لی تھی۔ جیسے جماعت اسلامی نے بھی مذہبی جماعت کی حیثیت سے پاکستان کی مخالفت کی تھی مگر پاکستان بن جانے کے بعد انہوں نے اپنے سابقہ عمل پر شرمندگی کا اظہار کر دیا۔ اور تحریرات میں تاویلات بھی پیش کر دیں تھیں اور پھر پاکستان کے سب سے زیادہ برگزیدہ بن گئے تھے بلکہ مسلم لیگ سے زیادہ پاکستان پر نچھاور ہونے لگ گئے تھے حکومت اور مسلم لیگ نے ان کے سابقہ گناہ بھی بخش دیئے تھے اگر مسلم لیگ والے پاکستان کے سابقہ مخالفین کو ایک گالی دیتے تھے تو جماعت اسلامی والے انہیں دس گالیاں دیتے تھے۔

پھر مجلس احرار تھی جس نے بھرپور طریقہ پر مخالفت کی تھی۔ 1945ء کے الیکشن میں پنجاب اسمبلی کی ممبرشپ کے لئے مسلم لیگ کے خلاف اپنے امیدوار کھڑے کئے تھے۔ پنجاب میں بڑی جرات کے ساتھ الیکشنوں میں مسلم لیگ کا مقابلہ کیا تھا۔ صرف ایک سیٹ کے علاوہ مسلم لیگ کے مقابلہ میں کوئی سیٹ بھی حاصل نہ کر سکے تھے۔ پاکستان بن جانے کے بعد احرار اکابرین نے مجلس احرار کو ہی منتشر کر دیا احرار جماعت میں جو مذہبی گروہ تھا اس نے مرزائیت کے خلاف محاذ بنا لیا اور ساتھ ہی مسلم لیگ کے ساتھ تعاون بھی کرنا شروع کر دیا۔ 1950ء کے انتخابات میں مجلس احرار مسلم لیگ کے ساتھ پوری طرح معاون تھی۔

پھر احرار کے وہ لوگ جو خالص سیاسی رجحانات رکھتے تھے جیسے نواب زادہ نصراللہ خان شیخ حسام الدین اور دیگر ہزاروں ورکر عوامی لیگ میں شامل ہو گئے۔ کچھ احرار ورکر جماعت اسلامی اور دیگر پارٹیوں میں بھی گئے اور احرار کے گناہ حکومت نے معاف کر دیئے بلکہ احرار نے خود کشی ہی کر لی تھی۔

خاکساروں نے بھی تقسیم ہند کی مخالفت کی تھی بلکہ ایک خاکسار رفیق مزنگوی نے قائداعظم محمد علی جناح پر قاتلانہ حملہ بھی تقسیم ہند سے قبل بمبئی میں کیا تھا۔ اسے پانچ سال قید ہوئی تھی وہ پھر پاکستان نہیں آیا تھا وہ ہندوستان کا باشندہ ہی بن گیا تھا مگر پاکستان بن جانے کے بعد انہوں نے اپنی سیاست کا رخ بدل لیا اور پبلک جلسوں میں کہنا شروع کر دیا کہ جناح نے یہ کیا لولا لنگڑا پاکستان بنایا ہے اگر خاکساروں کی حمایت حاصل کی جاتی تو یہ لولا لنگڑا پاکستان نہ ہوتا۔ مغربی پاکستان کی سرحدیں دہلی سے آگے جمنا دریا تک ہوتیں اور مشرقی پاکستان میں سارا بنگال اور آسام بھی شامل ہوتا اور مسلم لیگ سے بڑھ کر پاکستان کے رکھوالے بن گئے۔ خاکسار جماعت کو توڑ کر اسلام لیگ نام رکھ لیا پھر جب مشرقی پاکستان میں 1954ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کو جگتو فرنٹ کے ہاتھوں شکست ہوئی تو ان الیکشنوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بھارت کے وزیراعظم پنڈت نہرو نے کہیں کہہ دیا کہ پاکستان میں مسلم لیگ ختم ہو چکی ہے اس کے جواب میں حضرت علامہ مشرقی نے اپنی جماعت اسلام لیگ کا نام بدل کر مسلم لیگ رکھ دیا اور دلیل یہ پیش کی کہ چونکہ پنڈت نہرو یہ کہتا ہے کہ مسلم لیگ پاکستان میں ختم ہو چکی ہے اس لئے پنڈت نہرو کو یہ بتانے کے لیے کہ مسلم لیگ ابھی زندہ ہے اس لئے اسلام لیگ کا نام ہم نے بدل کر مسلم لیگ رکھ لیا ہے۔ پھر ہر وہ قدم سیاست میں علامہ صاحب نے آگے بڑھایا جو مسلم لیگی سیاست میں فرقہ پرستی کی سیاست میں معاون ثابت ہوا۔ اور خاکساروں کے علامہ مشرقی کے گناہ بھی معاف کر دیئے گئے۔ اب ایک جماعت جو پورے برصغیر میں منظم بھی تھی اور جس نے بھرپور طریقہ پر قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی وہ تھی جمعیت علمائے ہند۔

خان عبدالصمد خان اچکزئی
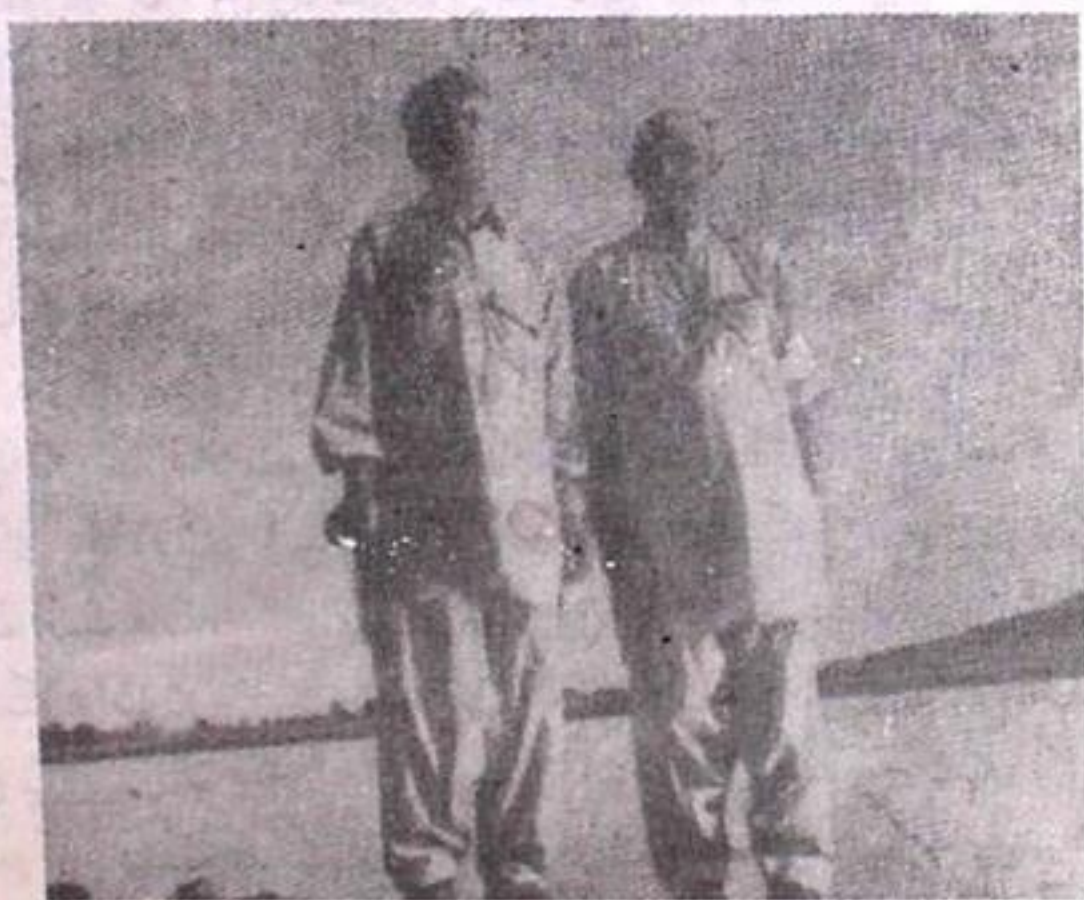
ہاشم خان غلزئی اور بابو عبدالکریم امن

پاکستان بن جانے کے بعد یہ جماعت بھی زیرِ عتاب آ گئی مگر اس جماعت کے پاس مذہبی ہتھیار ایسا تھا کہ مسلم لیگ حکومت اس جماعت کو مرعوب نہ کر سکی۔ جمعیت علمائے ہند نے اپنا نام بدل کر پہلے جمعیت علمائے پاکستان رکھ لیا مگر بہت جلد حضرت شبیر احمد عثمانی کی اقتدا کرتے ہوئے جمعیت علمائے اسلام بنا رکھ لیا اس کے متعلق بھی مسلم لیگ اور حکومت کا رویہ وہی تھا جو دوسری پاکستان مخالف جماعتوں کے بارے تھا۔ شروع شروع میں صوبہ سرحد میں جمعیت کے دفاتر پر حکومتی کارندوں نے چھاپے مارے ہراساں بھی کیا، کتابیں باہر بازاروں میں پھینکی گئیں مگر ان دفاتر میں تمام کتابیں مذہبی ہی ہوتی تھیں۔ حکومت کو اس کاروائی میں فائدے کے بجائے نقصان ہوا لوگوں میں یہ پراپیگنڈا عام ہوا کہ یہ کیسی اسلامی حکومت ہے جو قرآن و حدیث کی توہین کرتی ہے یہ تو اسلام کے نام پر کافروں کی حکومت بن گئی ہے۔

حکومتی اخبارات اگر ان علماء حضرات کو مطعون کرتے تو ان علماء حضرات کے پاس مساجد تھیں ان مساجد میں علماء حضرات حکومت کو بدنام کرتے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنایا گیا ہے یہ حکومت تمام کام کافرانہ کرتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

صرف جمعیت علمائے اسلام والوں نے مذہبی آڑ میں اپنی سیاست بھی بچائی ہے اپنی جانیں بھی بچائیں اور اسی مذہبی آڑ میں اپنی سیاست بھی زندہ رکھی اس وقت بھی جمعیت علمائے اسلام پاکستان میں مجموعی طور پر صوبہ سرحد اور بلوچستان میں خصوصی طور پر جمعیت علمائے اسلام کو کوئی حکومت بھی کمزور نہیں کر سکی۔ دیگر مندرجہ ذیل جماعتیں جو پاکستان نیشنل پارٹی کے نام پر جمع ہوتی ہیں وہ مسلسل 10 سال تک زیرِ عتاب رہے آج تک عملی طور پر زیرِ عتاب ہیں۔

پاکستان نیشنل پارٹی آف پاکستان

راقم الحروف اس زمانے میں آزاد پاکستان پارٹی کے ساتھ وابستہ تھا۔ جنوری 1957ء میں آزاد پاکستان پارٹی آف پاکستان کے جنرل سیکرٹری قصوری صاحب گوجرانوالہ تشریف لائے تھے ایک پبلک جلسہ بھی ہوا تھا جس میں جناب قصوری صاحب نے خطاب کیا تھا ملکی اور بین الاقوامی حالات پر تقریر فرمائی تھی ورکر میٹنگ میں انہوں نے فرمایا تھا کہ پاکستان کی تمام معتوب اور سیکولر جماعتوں کو یکجا کرنے کے لئے سب جماعتوں کو ملا کر ایک جماعت بنانے کی جو ہم کوشش سال بھر سے کر رہے تھے اس میں اب کامیابی ہو گئی ہے۔ اگلے ماہ مارچ 1957ء میں جس کی مقررہ تاریخ چند روز تک بتا دی جائے گی۔ لاہور میں تمام جماعتوں کا مشترکہ کنونشن ہو گا جس کا انتظام پنجاب کے ورکرز آزاد پاکستان پارٹی کے ورکروں نے کرنا ہے اس لئے آپ لوگ جو بھی وقت آسانی سے دے سکتے ہیں وہ مقررہ تاریخ سے ایک روز قبل ہی لاہور پہنچ جائیں۔ کنونشن دو روز تک رہے گا جس میں نئی پارٹی کے متعلقہ تمام امور طے کئے جائیں گے۔ گوجرانولہ سے تقریباً آزاد پاکستان پارٹی کے 20 کارکن مقررہ تاریخ کو لاہور پہنچ گئے۔

اس زمانے میں آزاد پاکستان پارٹی کا دفتر میکلوڈ روڈ پر لاہور ہوٹل کے سامنے ہوتا تھا بیرون صوبہ جات سے آنے والے مندوبین کی رہائش اور خوراک کا انتظام لاہور ہوٹل میں ہی کیا گیا تھا۔ پنجاب کے ورکروں کی رہائش اور خوراک کا انتظام پارٹی دفتر میں ہی تھا۔

بڑے لیڈران کی آپس کی میٹنگیں میاں محمود علی قصوری صاحب کی کوٹھی یا میاں افتخارالدین کی کوٹھی پر ہوتی تھیں۔ آپس کے تمام معاملات پر اتفاق رائے کے بعد برکت علی محمڈن ہال میں کنونشن اجلاس ہوا جس میں مبصر کی حیثیت سے راقم الحروف بھی شامل تھا سارا حال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا صوبہ سرحد سے زیادہ مندوبین کنونشن میں شریک ہوئے۔ سندھی سب سے کم تھے مگر سندھی لیڈران زیادہ شریک ہوتے تھے سابقہ جماعتوں کے نمائندہ لیڈروں کو سٹیج پر بٹھایا گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سٹیج پر سندھ عوامی محاذ کی طرف سے جناب شیخ عبدالمجید سندھی تشریف فرما تھے سندھاری کمیٹی کی طرف سے حیدر بخش جتوئی صاحب استمان گل کی طرف سے شہزادہ عبدالکریم' آزاد پاکستان پارٹی کی طرف سے جناب میاں محمود علی قصوری تھے اور خدائی خدمت گار تحریک کی طرف سے جناب عبدالولی خان سٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس میں کاروائی ہوتی رہی پھر اجلاس ختم ہو گیا صوبہ سرحد کے مندوبین لاہور ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے رات کے وقت ان میں سے کئی نامی گرامی لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں جن میں حسین بخش کوثر مرحوم بڑی ہی پر کشش شخصیت کے مالک تھے ملک امیر محمد خان آف مردان مرحوم جو بیگم نسیم ولی خان کے والد تھے اور بھی کئی لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں یاد نہیں رہا دوسرے روز پتہ چلا کہ پارٹی کا نام رکھنے پر اختلاف ہو گیا۔ پاکستان نیشنل پارٹی نام رکھنے پر تمام لوگ متفق ہو گئے ہیں میاں افتخار الدین بضد ہیں کہ آزاد پاکستان نیشنل پارٹی نام رکھا جائے اس پر پنجاب کے آزاد پاکستان پارٹی کے ورکروں میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ انہوں نے میاں افتخار الدین صاحب کے خلاف نعرہ بازی شروع کر دی جس سے معاملہ بہت جلد سدھر گیا اور پاکستان نیشنل پارٹی کے نام پر اتفاق رائے ہو گیا اور پاکستان میں ایک سیاسی جماعت پاکستان نیشنل پارٹی کے نام سے معرض وجود میں آ گئی۔

مندرجہ بالا جماعتیں جنہیں ملا کر پاکستان نیشنل پارٹی بنائی گئی تھی اس میں سب سے مضبوط جماعت صوبہ سرحد کی خدائی خدمت گار تھی جو صوبہ سرحد کی انتہائی منظم جماعت تھی تقسیم ہند سے قبل صوبہ سرحد میں اسی جماعت کی حکومت تھی بادشاہ خان اس جماعت کے لیڈر تھے جو جیل میں ہونے کی وجہ سے کنونشن میں شریک نہ ہو سکے تھے۔

دوسرے نمبر پر سندھ عوامی محاذ طاقت ور تھا جس کے مغربی پاکستان کی اسمبلی میں 9 ممبر تھے۔ بلوچستان کی جماعتیں بھی طاقت ور تھیں۔ آنے والے وقت میں انہوں نے اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔ آزاد پاکستان پارٹی کے مرکزی اسمبلی میں میاں افتخار الدین ممبر تھے۔ جو اپنے ذاتی اثر و رسوخ اور دولت کی وجہ سے ممبر بنے تھے یا مغربی پاکستان اسمبلی میں سید امیر حسین شاہ ممبر تھے وہ بھی اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی وجہ سے ممبر تھے۔ آزاد پاکستان پارٹی کی حیثیت ایسی نہ تھی کہ وہ پنجاب میں سے کسی بھی حلقہ نیابت سے الیکشن جیت سکے۔ سندھ عوامی محاذ جس کے مغربی پاکستان اسمبلی میں 9 ممبر تھے وہ ممبران بھی اپنے ذاتی اثر کی وجہ سے ہی ممبر بنے ہوئے تھے اس لیے کہ یہ ممبر سب کے سب بڑے لوگ ہی تھے۔ جن میں جی ایم سید' پیر الٰہی بخش' غلام مصطفیٰ بھرگری' رسول بخش تالپور بھی شامل تھے

مرکز میں چھ لیڈران کی تنظیمی کمیٹی بنائی گئی جس کے سربراہ جناب شیخ عبدالمجید سندھی بنائے گئے اس طرح چھ لیڈران کی ہر صوبائی تنظیمی کمیٹیاں بنائی گئی اور ان کمیٹیوں کے سربراہ بنائے گئے اسی طرح تمام ملک میں ہر سطح پر تنظیمی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ ابھی نیشنل پارٹی تنظیمی مراحل سے گزر رہی تھی

کہ نہر سویز کی جنگ شروع ہو گئی نہر سویز تھی تو مصر میں مگر ملکیت برطانیہ اور فرانس کی تھی مصر کی حکومت جس کے اس وقت سربراہ جمال عبدالناصر تھے انہوں نے نہر سویز کو قومی ملکیت قرار دے کر نہر سویز پر قبضہ کر لیا۔ برطانیہ اور فرانس کے وقار کو اس واقعہ سے بہت دھچکا لگا۔ آخر کار برطانیہ' فرانس اور اسرائیل نے مل کر مصر پر حملہ کر دیا اور دو دن میں ہی صحرائے سنیا اور سویز پر قبضہ کر لیا اس جنگ میں پاکستانی عوام کی ہمدردیاں مصر کے ساتھ تھیں جب کہ حکومت پاکستان کا تعاون برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ تھا اس وقت پاکستان کے وزیراعظم عوامی لیگ کے جناب سہروردی تھے۔ مندرجہ بالا واقعہ کی وجہ سے عوامی لیگ میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ مولانا عبدالحمید خان بھاشانی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ عوامی لیگ کے خلاف بغاوت کر دی۔ ادھر پاکستان نیشنل پارٹی کے لیڈروں نے مولانا بھاشانی اور انکے ساتھیوں کے ساتھ ملاقاتیں شروع کر دیں۔ اس سارے گٹھ جوڑ میں سب سے زیادہ متحرک پاکستان نیشنل پارٹی کے معتمد لیڈر جناب میاں افتخارالدین تھے جو اس سلسلہ میں کئی بار دیگر ساتھیوں کے ہمراہ ڈھاکہ گئے۔ مولانا بھاشانی اور ان کے دیگر ساتھیوں کے ساتھ ملاقاتیں کیں۔ آخر فیصلہ ہو گیا کہ ڈھاکہ میں کنونشن منعقد کیا جائے جس میں پاکستان نیشنل پارٹی اور عوامی لیگ بھاشانی گروپ گنا تنتری دل جس کے صدر حاجی محمد دانش تھے اور دیگر وہ لوگ جو بائیں بازو کی سیاست کے ساتھ چلنا چاہتے ہوں وہ مل کر نئی سیاسی پارٹی تشکیل دیں گے۔ ڈھاکہ کنونشن کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ قبل اس کے کہ ڈھاکہ کنونشن کا تذکرہ کیا جائے قارئین کو نیشنل پارٹی میں شامل جماعتوں کے سیاسی رجحانات کے متعلق چند الفاظ میں بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے ان جماعتوں میں خدائی خدمت گار اور بلوچستان کے انجمن وطن کے وارث وروری پختون اور قلات نیشنل پارٹی کے وارث استمان گل۔ یہ جماعتیں سیکولر تھیں اور بین الاقوامی معاملات میں غیر جانب دار سیاست کے حامی تھے ان جماعتوں کا نظریہ پاکستان بن جانے کے بعد یہ تھا کہ متحدہ ہندوستان کے وقت ہم نے تقسیم ہند کی مخالفت دیانت داری کے ساتھ کی تھی اس پر ہمیں کوئی شرمندگی نہیں ہے اب چونکہ پاکستان بن گیا ہے ہم اپنی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے پاکستان کی تعمیر ترقی میں بھرپور کردار ادا کریں گے اور مادر وطن کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ جبکہ حکومت اور مسلم لیگ ان کی سابقہ حیثیت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی یہ جھگڑا ہی انہیں آج تک معتوب کئے ہوئے ہے۔ ان تین پارٹیوں کے علاوہ حیدر بخش جتوئی کی سندھاری کمیٹی سیاسی جماعت ہی نہ تھی یہ صرف کسانوں کی فلاح و بہبود کی جماعت تھی۔ آزاد پاکستان پارٹی میں وہ لوگ شامل تھے جو تقسیم ہند سے تھوڑا عرصہ قبل ہی کیمونسٹ پارٹی کانگرس پارٹی اور دیگر متحدہ ہندوستان کے وقت کی جماعتوں سے الگ ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے اور پھر پاکستان بن جانے کے تھوڑا عرصہ بعد ہی الگ ترقی پسند سیکولر نظریات کی حامل جماعت آزاد پاکستان پارٹی بنا لی تھی۔ سندھ عوامی محاذ سندھ کے بڑے لوگوں کا گروہ تھا جو اپنے اثر رسوخ کی وجہ سے سیاست کرتے تھے ممبریاں اور وزارتیں حاصل کر لیتے یہ سب لوگ پہلے مسلم لیگ میں ہی تھے جی ایم سید تقسیم ہند سے تھوڑا عرصہ قبل قائداعظم محمد علی جناح سے اختلاف کی وجہ تھی کہ وہ مسلم لیگ سے الگ ہو گئے۔ دیگر ان کے ساتھی پیر الٰہی بخش سندھ کے وزیر اعلیٰ بھی رہ چکے تھے اور دیگر لوگ بھی صرف وڈیرے ہونے کی حیثیت سے ہی ممبران اسمبلی بھی تھے۔ نیشنل پارٹی کے قیام کی ایک بڑی وجہ ون یونٹ جو مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ختم کر کے بنایا گیا تھا اسے ختم کرنا تھا۔ سابقہ صوبے بحال

ہونے سے ان لوگوں کو فائدہ تھا اس وجہ سے یہ لوگ بھی نیشنل پارٹی کے ہراول دستہ میں شامل ہو گئے تھے۔ نیشنل پارٹی اور بعد میں نیشنل عوامی پارٹی کے منشور میں نمایاں حصہ یہ تھا کہ یہ پارٹی سامراجیت کے خلاف تھی ون یونٹ کے خلاف تھی سیاست میں مذہب کی مداخلت کے خلاف تھی جبکہ پاکستان کے حاکم سامراجیت کے حامی تھے مذہب سیاست میں استعمال کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔
گزشتہ صفحہ پر ڈھاکہ کنونشن کا ذکر کر رہے تھے درمیان میں چند باتیں ضمناً آ گئیں تھیں اب پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

ڈھاکہ کنونشن

نومبر 1957ء میں ڈھاکہ کنونشن کی تاریخ مقرر کی گئی تھی مغربی پاکستان سے نیشنل پارٹی کے بہت لوگوں نے ڈھاکہ کنونشن میں شریک ہونا تھا ہندوستانی سفارت خانے سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اس زمانے میں لاہور میں بھی بھارتی کونسلیٹ کا دفتر ہوتا تھا اس زمانے میں پاسپورٹ بھی ذرا مشکل سے بنتا تھا۔ لیڈران نے حکام سے رابطہ قائم کیا اس زمانے میں مغربی پاکستان میں ریپبلکن پارٹی کی حکومت تھی مرکز میں ریپبلکن پارٹی اور کرشک سرامک پارٹی کی حکومت تھی لیڈران کی کوشش سے ارجنٹ پاسپورٹ بن گئے تقریباً 200 دو صد مندوبین نے بذریعہ ریل گاڑی براستہ بھارت ڈھاکہ کنونشن میں جانا تھا ویزے بھی ارجنٹ لگ گئے ڈھاکہ کنونشن براستہ بھارت ریل گاڑی جانے والوں کا پروگرام کچھ اس قسم کا تھا کہ انہوں نے دلی اور کلکتہ سے ہوتے ہوئے جانا تھا اور حکومت نے خفیہ طور پر سرکاری لوگ بھی ساتھ کر دیے تھے نئی جماعت تھی ورکر بھی کچھ حکومت نے کار خاص کے لیے خرید لئے تھے۔
ڈھاکہ کنونشن میں جانے کے لیے لیڈر حضرات تو بذریعہ ہوائی جہاز ڈھاکہ گئے تھے مگر ورکر اور چھوٹے درجے کے لیڈر براستہ بھارت بذریعہ ریل گاڑی دلی اور کلکتہ سے گھومتے ہوئے پرانے دوستوں کو ملتے ہوئے ڈھاکہ پہنچے تھے ڈھاکہ کنونشن ایک سینما ہال میں ہوا تھا کنونشن کی صدارت مولانا بھاشانی نے کی تھی منشور طے کیا گیا جماعت کا نام رکھ لیا گیا جدوجہد کی راہیں متعین کی گئیں جماعت کا نام نیشنل عوامی پارٹی رکھا گیا متفقہ طور پر جماعت کا صدر مولانا عبدالحمید خان بھاشانی بنائے گئے جنرل سیکرٹری کراچی کے محمود الحق عثمانی بنائے گئے۔ جماعت کے منشور میں ون یونٹ توڑنے کو اولیت دی گئی سامراجیت سے تعلق توڑنے کی مانگ کی گئی۔ ملک کی خارجہ پالیسی غیر جانب دارانہ بنائے جانے کی مانگ کی گئی۔ کنونشن جب ختم ہوا تو باہر کی گزر گاہوں پر عوامی لیگ کے ورکر ڈنڈوں سے پتھروں سے مسلح کھڑے تھے کچھ کوٹھوں کی چھتوں پر بھی کھڑے تھے تاکہ شرکائے کنونشن پر پتھراؤں کیا جائے۔ مشرقی پاکستان میں حکومت بھی عوامی لیگ کی ہی تھی پولیس بھی فسادیوں کی ہی حامی تھی بڑی مشکل سے لیڈر اور ورکر جانیں بچاتے زخمی ہوتے کنونشن ہال سے رہائش کی جگہ پہنچے دوسرے دن ڈھاکہ پلٹن میدان میں جلسہ ہونا تھا وہ بھی فساد کی نذر ہو گیا۔ نیشنل عوامی پارٹی بن جانے کے بعد ڈھاکہ کنونشن ختم ہو گیا جو لوگ مغربی پاکستان سے بذریعہ ہوائی جہاز گئے ہوئے تھے وہ اسی راستے سے واپس آئے اور جو لوگ بذریعہ ریل گاڑی گئے ہوئے تھے وہ بھارت سے گھومتے ہوئے واپس آئے اور جو سیاسی ورکروں کے بھیس میں سرکاری لوگ گئے ہوئے تھے ان کی رپورٹ پر مغربی پاکستان کے اخبارات نے کئے جھوٹے

من گھڑت افسانے بنا کر شائع کیے اور لوگوں میں نیشنل عوامی پارٹی کے خلاف اشتعال پیدا کیا۔

نیشنل عوامی پارٹی آف پاکستان

نیشنل عوامی پارٹی بن جانے کے بعد پاکستانی اخبارات نے اس نئی پارٹی کے خلاف بھرپور انداز سے زہریلا پراپیگنڈا شروع کر دیا۔ ون یونٹ بہت زیادہ مقدس بنا دیا گیا۔ وحدت کا نام دیا جانے لگ گیا۔ گویا ون یونٹ کی مخالفت خدا کی وحدانیت کی مخالفت کا درجہ اختیار کر گئی تھی مغربی پاکستان کے اخبارات میں کوہستان، نوائے وقت، تعمیر اور جنگ کراچی اور دیگر چھوٹے اخبارارت ون یونٹ کی حمایت میں نیشنل عوامی پارٹی کے خلاف بھرپور انداز سے زہر اگل رہے تھے۔ سیاسی پارٹیوں میں پیش پیش مخالفت میں جماعت اسلامی تھی اور مسلم لیگ بھی پوری طرح معاون تھی۔

نیپ نے رابطہ عوام مہم چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ فروری 1958ء کو مغربی پاکستان کا پارٹی لیڈروں نے دورہ کرنا تھا۔ پروگرام بن گیا پہلا جلسہ نیپ کا پشاور میں ہوا۔ جلسہ بہت کامیاب ہوا۔ دوسرا جلسہ راولپنڈی لیاقت باغ میں ہونا قرار پایا۔ جلسہ میں نیپ کی چوٹی کی لیڈر شپ بشمول بادشاہ خان شامل ہوئے۔ جلسہ شروع ہونے سے قبل ہی فسادیوں نے جلسہ گاہ پر قبضہ کر لیا۔ منتظمین جلسہ کرنا چاہتے تھے مگر ہلڑ باز لوگوں کو جلسہ گاہ میں داخل ہی نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ سٹیج کے آگے ننگا ناچ کرتے، بھنگڑا ڈالتے لیڈران کو گالیاں دیتے۔ سٹیج پر پتھر مارتے۔ پولیس کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھی۔ فسادیوں کو کھلی چھٹی تھی۔ آخر کار جلسہ منتشر کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ لیڈران اپنی منزل کی طرف پیدل ہی چل دیے۔ مری روڈ کی طرف وہ جا رہے تھے لفنگے آگے اخلاق سوز حرکات کر رہے تھے۔ مری روڈ کے کمیٹی چوک میں گندگی پر ایک مردہ کوا پڑا ہوا تھا۔ ایک لفنگے نے اٹھا کر بادشاہ خان کے منہ پر مار دیا۔ مگر بادشاہ خان کے ماتھے پر ذرا شکن نہیں آئی۔ اور پولیس بھی ساتھ ہے جو کسی بھی حرکت پر غنڈوں کو کچھ بھی نہیں کہہ رہی۔ آخر لیڈران کا یہی قافلہ بمع ورکران کے مری روڈ کے ملحقہ ایک مکان میں قیام پذیر ہوا اور ہلڑ بازوں سے چھٹکارا حاصل ہوا اور اس کے بعد نیپ کا جلسہ لاہور میں ہونا قرار پایا یہ جلسہ موچی دروازہ میں ہونا تھا۔ اس جلسہ میں مولانا بھاشانی نے تقریر کرنا تھی۔ یہ جلسہ بھی ہلڑ بازی کی نذر ہو گیا۔

غرض پنجاب کے تمام شہروں لائل پور، ساہیوال، ملتان ہر جگہ نیپ کے جلسوں کو ہلڑ بازی نے تباہ کر دیا گیا صرف اوکاڑہ میں نیپ کا جلسہ کامیاب ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ستلج کاٹن مل میں تقریباً 300 پٹھان کام کرتے تھی جو جلسہ گاہ میں پہنچ گئے تھے۔ انہیں کے انتظام میں جلسہ ہوا اور کامیاب ہوا تھا۔

پنجاب کے باہر حیدر آباد، کراچی اور کوئٹہ میں بڑے کامیاب جلسے ہوئے اور لوگوں نے بہت تعاون کیا۔ پنجاب کے تمام اخبارات نیشنل عوامی پارٹی کے خلاف بڑا زہریلا پراپیگنڈا کر رہے تھے۔ صرف میاں افتخار الدین کے اخبارات امروز اور پاکستان ٹائمز نیشنل عوامی پارٹی کے حق میں لکھتے تھے اور عوام کے کچھ طبقہ کو اصل حقیقت سے آگاہی ہوتی تھی۔ 1958ء میں ہی جب مغربی پاکستان کا اسمبلی سیشن ہوا تو اس میں نیشنل عوامی پارٹی کے پارلیمانی لیڈر جناب جی ایم سید نے ون یونٹ کے خلاف اور سابقہ

صوبوں کی بحالی کے حق قرارداد پیش کر دی۔ مغربی پاکستان اسمبلی کے 300 ممبران کے ہاؤس میں صرف 4 ممبران اسمبلی نے اس قرارداد کے خلاف ووٹ دیا باقی 296 ممبران نے اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیا اور قرارداد منظور ہو گئی۔ اس زمانے میں امریکہ کی حمایت میں سوویت یونین کے خلاف بشمول (امریکہ کے چار مسلم ملکوں کا جس میں پاکستان' ایران' اعراق' ترکی۔) عراق کے دارالحکومت بغداد میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس کا نام بغداد پیکٹ رکھا گیا تھا نیشنل عوامی پارٹی نے بغداد پیکٹ کے خلاف چھوٹے جلسوں اشتہاروں اور اخباری بیانات کے ذریعے لوگوں کو بغداد پیکٹ کے نقصانات سے آگاہ کیا تھا۔ اس وقت ملک میں ایک جھگڑا یہ بھی تھا کہ آنے والے انتخابات جداگانہ ہوں یا مخلوط مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے علاوہ مشرقی پاکستان کی تمام جماعتیں مخلوط انتخابات کی حامی تھیں اور مغربی پاکستان اکثریت بشمول نیشنل عوامی پارٹی اور ری پبلکن پارٹی بھی مخلوط انتخابات کے حامی تھی۔

اکتوبر 1958ء کو صدر جنرل سکندر مرزا نے ملک مارشل لاء کے حوالے کر دیا۔ جنرل محمد ایوب خان جو اس وقت پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف تھے انہیں پاکستان کا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا دیا گیا۔ تمام سیاسی جماعتیں خلاف قانون قرار دی گئیں۔ 1956ء کا آئین منسوخ کر دیا گیا۔ ملک میں دہشت کی فضا قائم کر دی گئی۔ نیشنل عوامی پارٹی کے بہت سارے ورکر لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ ہمارے گوجرانوالہ سے غلام نبی بھلا اور غنی قریش گرفتار کئے گئے۔ اسی طرح لاہور کے بہت سارے ترقی پسند بائیں بازو کے لیڈر ورکر جن میں روزداد خان قسور گردیزی' فضل الٰہی قربان' فیروز دین منصور اور دیگر بہت سارے لوگ جن میں بلوچستان کے عبدالصمد خان اچکزئی' ہاشم خان اور دیگر بہت سارے نیپ کے کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ یہ ایک حیرانگی کی بات تھی جن حکمرانوں کی حکومتیں ختم کر کے ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کیا تھا انہیں تو کچھ نہیں کہا گیا مگر نیپ کے ورکروں اور لیڈروں کو گرفتار کیا گیا۔ اگر اس سارے معاملے کا سائنسی تجزیہ کیا جائے تو معاملہ بالکل سمجھ آ جاتا ہے کہ ایوب خان کا انقلاب آیا ہی نیشنل عوامی پارٹی کے خلاف تھا۔ واقعہ یوں ہے کہ 1956ء کا آئین نافذ ہونے کے بعد پاکستان میں انتخابات ہونے تھے عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں میں اکثریت نیشنل عوامی پارٹی کو مل جانی تھی اور توقع تھی کہ مشرقی پاکستان میں بھی نیشنل عوامی پارٹی کو اچھی خاصی حمایت حاصل ہو جانی تھی مجموعی طور پر نیپ کو پارلیمنٹ میں 30 فیصد نمائندگی مل جانی تھی ایسی صورت میں مشرقی پاکستان کی ایک مضبوط جماعت کو ملا کر مرکز میں حکومت نیشنل عوامی پارٹی کی کولیشن بن سکتی تھی اگر ایسا ہو جاتا تو پاکستان کے اصل حکمرانوں کو بہت بڑا دھکا لگنا تھا ایسی صورت کبھی بھی پاکستان کے مستقل حکمران برداشت نہیں کر سکتے تھے جس سے مستقل طور پر انکے ہاتھ سے اقتدار نکل جائے۔ الیکشن ہو جانے کے بعد ان حالات کے پیش نظر وہ اس وقت مارشل لاء لگاتے تو زیادہ خطرناک پوزیشن ہونا تھی اس لئے حکمرانوں نے امریکہ کی اشیرباد سے بہتر یہی سمجھا کہ 1958ء کے الیکشن ہونے ہی نہ دیے جائیں نہ الیکشن ہوں گے اور نہ ہی متوقع خطرہ سامنے آئے گا سابقہ تاریخ بتاتی ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی والے جرنیلوں یا نوکر شاہی کے ساتھ سمجھوتہ یا سودے بازی کر کے حکومت لینے کے حامی نہیں ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر ہمیں عوام نے حق حکمرانی دیا ہے تو نوکر شاہی یا جرنیل اسے روکنے کا کیا حق رکھتے ہیں

آخر یہی واقعات 1970ء کے الیکشن میں سامنے آئے جرنیلوں نے مجیب کا حق حکمرانی نہیں مانا اور

میاں افتخار الدین اور پاکستان ٹائمز

مارشل کی صعوبتوں نے میاں افتخار الدین کو بھی جکڑ لیا بہتر ہو گا کہ ہم میاں صاحب کے حالات زندگی پر بھی کچھ روشنی ڈالیں

میاں افتخار الدین لاہور کے متمول ترین گھرانے کے چشم و چراغ تھے وہ 1906ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ملکی اور غیر ملکی اعلی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کی وہ پیدائشی حریت پسند تھے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی انہوں نے سیاست کی خاردار وادی میں تحریک آزادی کے حوالے سے قدم رکھا وہ اگر منصب کے طلب گار ہوتے تو انہیں سرکار برطانیہ کی طرف سے بہت اچھا حکومتی منصب مل سکتا تھا حکومت کی تائید کر کے پنجاب کے روسا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حکومت سے اعزازات بھی حاصل کر سکتے تھے لاہور کی اس وقت کی کروڑوں کی جائیداد کے مالک تھے اور اربوں کی جائیداد بھی بنا سکتے تھے مگر انہوں نے وطن کی آزادی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی اور وہ مجلس احرار میں شامل ہو گئے مجلس احرار ہی اس وقت 1931ء میں پنجاب کے مسلمانوں کی حریت پسند جماعت تھی بہت جلد انہوں نے حریت پسندی کی تشنگی کو محسوس کیا اور انہوں نے احرار کو چھوڑ دیا اور کانگرس میں شامل ہو گئے کانگرس میں شامل ہو کر بہت آگے بڑھ کر تحریک آزادی کا جھنڈا اٹھا لیا پنجاب کانگرس کے صف اول کے لیڈروں میں شمار ہونے لگے گئے اور ابتدائی ادوار میں ہی انہیں آزادی وطن کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں اٹھانا پڑیں 1937ء میں کانگرس کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے انہوں نے کانگرس میں مسلم حریت پسند نوجوانوں کا اچھا خاصا حلقہ پیدا کر لیا تھا ان کے اس وقت کے حریت پسند دوستوں میں فیض احمد فیض' مظہر علی خان' طاہرہ مظہر علی' عبداللہ ملک اور بہت سارے حریت پسند بھی شامل تھے 1938ء میں وہ پنجاب کانگرس کے صدر چنے گئے اور اپنے جذبہ حریت اور اعلی صلاحیتوں کی وجہ سے کانگرس کے صف اول کے لیڈروں میں شمار ہونے لگ گئے 1942ء کانگرس کی تحریک ہندوستان چھوڑ دو میں وہ قید کر لئے گئے۔

اور ایک سال سے زائد وقت تک وہ جیل میں رہے جب دوسری عالمی جنگ کے ختم ہونے کے آثار نظر آنے لگ گئے تو انہیں جیل سے رہائی ملی جیل سے باہر آ کر انہوں نے محسوس کیا کہ اب ہندوستان آزاد ہونے ہی والا ہے اور اب زیادہ دیر تک انگریز ہندوستان پر قابض نہیں رہ سکے گا۔ اور ساتھ ہی اس وقت مسلم لیگ تقسیم ہند کا فارمولا لے کر میداں عمل میں آ چکی تھی مطالبہ پاکستان مسلمانوں میں مقبول ہونے لگ گیا تھا انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اب ان کی جگہ کانگرس میں نہیں ہے۔ میاں صاحب نے پہلے قدم کے طور پر پنجاب کانگرس کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ پھر چند روز بعد پنجاب اسمبلی کی ممبری سے مستعفی ہو گئے پھر چند روز بعد کانگرس کی ابتدائی رکنیت بھی چھوڑ دی اور مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا اور ساتھ ان کے جو ساتھی مسلمان کانگرس میں تھے وہ بھی کانگرس چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

کانگرس میں بھی ان کا اچھا خاصا حلقہ اثر مسلم کانگرسیوں میں تھا جو سب کے سب میاں
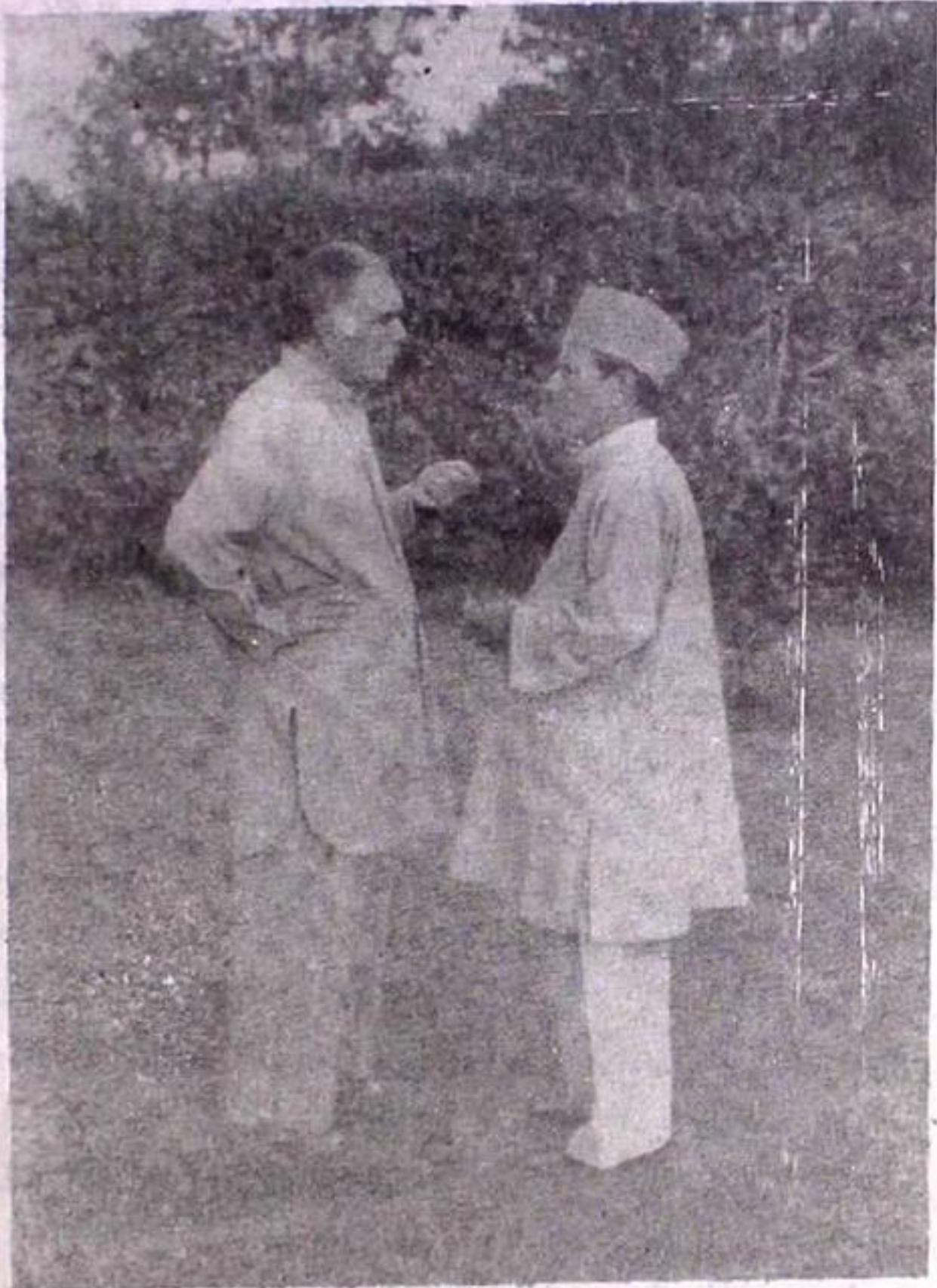
راؤ مہروز اختر اور عبدالخالق خان

صاحب کے ساتھ ہی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ان لوگوں میں مظہر علی خان' سی آر اسلم' عبداللہ ملک' فیروز دین منصور' فضل الٰہی قربان' غلام نبی بھلر' اور دیگر بہت سارے کانگرسی مسلم ادیب اور کارکن بھی شامل تھے۔

میاں صاحب لاہور کے بہت بڑے رئیس تھے لاہور شہر کے ساتھ ہزاروں ایکڑ اراضی ان کی ملکیت تھی اور 22 دیہات کی نمبرداری بھی ان کی تھی جو تحریک آزادی میں شمولیت کی وجہ سے ختم کر دی گئی تھی۔ اتنے بڑے رئیس اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ علم دوست بھی تھے ان کی ذاتی لائبریری میں ہزاروں کتابیں تھیں وہ سیاست میں معیشت میں مارکسزم سے متاثر تھے ان کے حلقہ احباب میں بھی زیادہ سوشلسٹ نوجوان ہی تھے وہ سمجھتے تھے کہ ایشیا میں سوشلزم ہر صورت قائم ہو کر رہے گا۔ وہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں رکھ کر مساوی تقسیم کے حامی تھے۔

میاں صاحب اور ان کے ساتھیوں نے مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بعد مسلم لیگ کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا خضر وزارت کے خلاف تحریک میں بھی وہ پیش پیش تھے اور میاں صاحب مسلم لیگ کے صف اول کے لیڈروں میں شمار ہونے لگ گئے تقسیم ہند کے وقت لاہور سے کانگرس کا انگریزی اخبار ٹریبیون شائع ہوتا تھا میاں صاحب نے پاکستان بنتے وقت ٹریبیون بلڈنگ مع پریس مشینری خرید لی تھی۔ اور ٹریبیون کی جگہ پاکستان ٹائمز انگریزی میں اور اردو میں امروز دو اخبارات جاری کر دیے اور ان اخبارات کی ادارت میں لاہور کے ترقی پسند ادیب جو تحریک آزادی کی سیاست میں بھی ان کے ساتھی تھے وہ شامل کیے گئے۔ چیف ایڈیٹر جناب فیض احمد فیض بنائے گئے پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر جناب مظہر علی خان اور امروز کے ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی بنائے گئے دیگر جو لکھاڑی تھے یا جو نمائندے بنائے گئے تھے وہ بھی سارے ترقی پسند طبقہ سے ہی بنائے گئے تھے۔

جس تنظیم کے تحت یہ ادارہ بنایا گیا تھا اس کا نام رکھا گیا تھا پروگریسیو پیپر لیمٹڈ جس میں 95 فیصد شیئر میاں افتخارالدین کے تھے باقی پانچ فیصد شیئر بھی ترقی پسند دوستوں کے ہی تھے۔

میاں صاحب اور ترقی پسند ادیبوں کی کوشش اور جدو جہد سے پاکستان ٹائمز اور امروز پنجاب کے مقبول ترین اخبار بن گئے پاکستان ٹائمز اس وقت پنجاب میں واحد انگریزی اخبار تھا اور اس کا معیار انتہائی بلند تھا۔ جس اخبار کے ایڈیٹر انچیف فیض احمد فیض ہوں اس اخبار کے معیار کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں۔ امروز اردو اخبارات میں بہت ہی پسند کیا جاتا تھا۔ مضامین کا معیار بہت پسندیدہ تھا۔ تعلیم یافتہ لوگ زیادہ انہیں اخبارات کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ جب آزاد پاکستان پارٹی تھی اس وقت تک ان اخبارات کی پالیسی آزاد پاکستان پارٹی کے تابع تھی جب نیشنل پارٹی اور پھر نیشنل عوامی پارٹی بن گئی تو یہ اخبارات ان پارٹیوں کے آرگن بن گئے ان اخبارات کی پالیسی سامراجیت کے خلاف تھی امریکہ کے خلاف تھے اور کیمونسٹ ممالک کے حامی تھے غیر جانب دار تیسری دنیا کے حامی تھے ایوب کا مارشل لاء لگ جانے کے بعد جہاں نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈروں اور ورکروں پر عتاب نازل ہوا وہاں ان اخبارات کا بھی صفایا کر دیا گیا۔ حکومت نے مارشل لاء کے ایک حکم کے تحت پروگریسیو پیپر لیمٹڈ جسکی ملکیت میں روزنامہ پاکستان ٹائمز' روز نامہ امروز' ہفت روزہ لیل و نہار چل رہے تھے قبضہ کر لیا اور اپنی حکومتی پالیسی کے تحت اخبارات چلانے شروع کر دے۔ پہلے دن جب حکومتی کنٹرول میں اخبارات چھپ کر سامنے آئے تو اس میں یہ ادارات لکھوائے گئے تھے کہ اخبارات کی سابقہ پالیسی
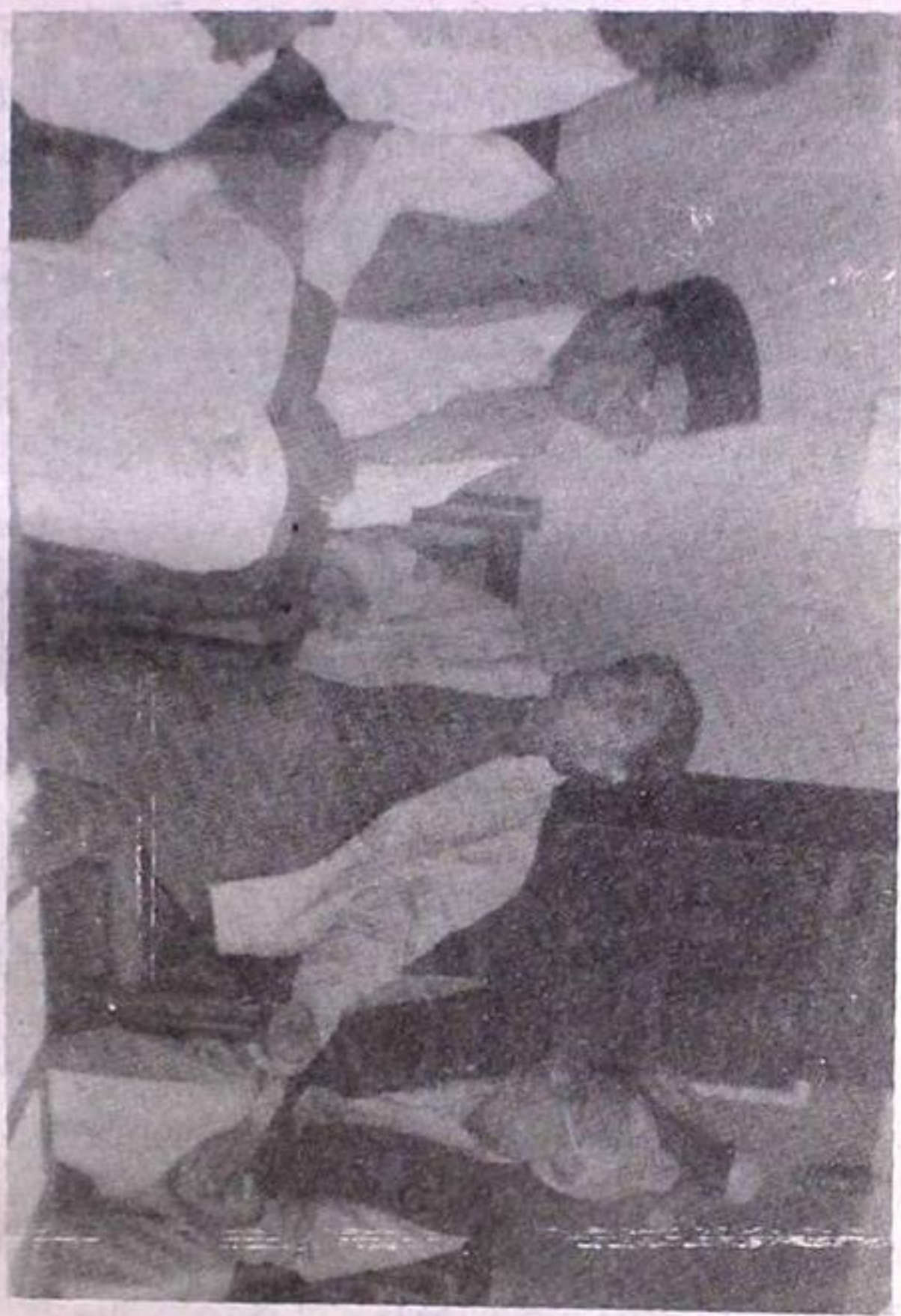
رانا مقبول اور راؤ مہروز اختر

کافرانہ تھی ہم اس پالیسی سے توبہ کرتے ہیں آئندہ ہم اسلامی اور پاکستان پالیسی کے تحت اخبار چلائیں گے۔ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کی عمارت پر اخبارات پر حکومت نے قبضہ کر لیا اور میاں افتخار الدین کا حق ملکیت ختم کر دیا گیا۔ کچھ وقت بعد اس ملکیت کی قیمت لگائی گئی جس میں سے نصف قیمت انکم ٹیکس میں کاٹ کر بقایا قیمت میاں افتخار الدین کے خاندان کو دے دی گئی۔

چونکہ میاں افتخار الدین نے ان اخبارات کو چلانے میں بہت جدوجہد کی تھی یہ اخبارات ہی ان کی پہچان بن چکے تھے ان کے چھن جانے کی وجہ سے انہیں بہت صدمہ ہوا وہ دل کے مریض بن گئے اور زیادہ تر صاحب فراش رہنے لگے۔

راقم الحروف چند دوستوں کے ساتھ 1960ء میں ان کی بیمار پرسی کے لیے گیا تھا ملاقات ہوئی۔ ہمارے آنے سے بہت خوش ہوئے گلہ بھی کیا کہ گوجرانوالہ بہت دور تو نہیں ہے کبھی کبھی آ جایا کرو۔ کافی دیر ہم ان کے پاس رہے دوران گفتگو انہوں نے فرمایا کہ پاکستان کے سیاسی لیڈر بڑے بے غیرت ہیں چند روز ہوئے لاہور میں فیلڈ مارشل ایوب خان آیا تھا اس کے اعزاز میں ایک سرکاری دعوت کا اہتمام کیا گیا جس میں بڑے بڑے سرکاری افسران کے علاوہ وہ سابق سیاسی لیڈروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

مجھے یہ سن کر بہت دکھ ہوا کہ وہ سارے سیاسی لیڈر جنہیں ہر روز اخبارات کے ذریعے گالیاں دی جاتی ہیں وہ اس دعوت میں موجود تھے اور سب سے بڑھ کر دکھ اس بات پر ہوا کہ پاکستان کے سابق وزیر اعظم ملک فیروز خان کو جن سے ایوب خان نے حکومت چھینی تھی وہ بھی اس دعوت میں موجود تھے۔

آخر 1962ء میں ایک روز انہیں خالق حقیقی سے بلاوا آ گیا دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا وہ اس دار فانی سے چلے گئے۔

اتفاقاً اسی روز ایوب خان کی حکومت نے چار سال بعد ملک میں سے مارشل لاء ختم کیا تھا اور جلسے کرنے کی اجازت ہو گئی تھی میاں صاحب کے سوگ میں لاہور، گوجرانوالہ کے علاوہ سارے ملک میں جلسے کیے گئے انہیں خراج عقیدت پیش کیے گئے۔ میاں افتخار الدین بہادر انسان تھے عظیم انسان تھے اب وہ تاریخ کا حصہ بن چکے وہ بہادروں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

صوبہ سرحد میں مارشل کے خلاف تحریک

اکتوبر 1958ء کو پاکستان میں جمہوری حکومت ختم کر کے مارشل لگا دیا گیا تھا۔ جب مارشل لگے ہوئے زیادہ وقت ہو گیا تو نیشنل عوامی پارٹی صوبہ سرحد نے مارشل کے خلاف تحریک چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ بادشاہ خان نے سارے صوبہ سرحد کا دورہ کیا پارٹی کارکنوں کو مارشل کے خلاف تحریک چلانے پر آمادہ کیا گیا۔ اور لوگوں کو پارٹی ورکروں کو خان صاحب نے کہا کہ اگر میں گرفتار ہو گیا تو میری عدم موجودگی میں تحریک کس طرح چلانی ہے۔ مارشل کے خلاف یہ تحریک این اے پی نے 1960ء میں صوبہ سرحد کی حدود کے اندر ہی چلائی تھی۔

بادشاہ خان نے صوبہ سرحد کے دیہاتوں کا دورہ کیا لوگوں کو مارشل کے خلاف ذہنی طور پر تیار کیا گیا اور لوگوں کو کہا گیا تھا کہ مارشل لاء مہذب لوگوں کا قانون نہیں ہوتا یہ جنگل کا قانون ہوتا ہے

اس جنگل کے قانون کے خلاف جدوجہد کرنا مہذب انسانوں کا فرض ہے۔ اور تمام لوگوں کا فرض ہے کہ وہ مارشل کے خلاف میدان عمل میں نکل آئیں۔ جب بادشاہ خان گرفتار کر لئے گئے تو این اے پی صوبہ سرحد کی میٹنگ پشاور میں ارباب سکندر خان کے دفتر میں ہوئی۔ جس میں ارباب سکندر خان' ارباب عبدالغفور خان' حسین بخش کوثر' اجمل خٹک' صدیق بزاز' غازی خان آف ہی اور دیگر بہت سارے پارٹی ورکر جمع ہوئے اور فیصلہ کیا گیا کہ مارشل - لاء کے خلاف تحریک چلائی جائے۔ تحریک چلانے کا طریقہ کار یہ بنایا گیا کہ نیپ کا کوئی لیڈر یا کارکن ضلع کچہری جائیں۔ افسران کے سامنے تقریر کریں کہ آپ لوگ مارشل لا کا حکم ماننا چھوڑ دیں۔ مارشل لا عوامی قانون نہیں ہے یہ فوجی قانون ہے جنگل کا قانون ہے۔ لوگوں پر یہ قانون چلانا چھوڑ دیں اور یہ بھی فیصلہ ہوا کہ صرف ایک شخص ایک وقت میں اپنے آپکو گرفتاری کے لئے پیش کرے گا پھر ہر روز ایک شخص کسی قصبہ یا شہر کی عدالت میں جائے اور گرفتاری پیش کرے اگر افسر گرفتار نہ کریں تو کچہری کے احاطہ میں ہی جلسہ کیا جائے اور مارشل کے خلاف تقاریر کی جائیں۔

غازی خان آف ہی کی ڈیوٹی نوشہرہ میں گرفتاری دینے کی لگائی گئی وہ مقررہ تاریخ اور وقت پر نوشہرہ گئے اور اے سی کی عدالت میں مارشل کے خلاف آواز بلند کی اور کہا کہ بادشاہ خان مارشل کی مخالفت میں گرفتار ہو چکے ہیں میں بھی مارشل لاء کی مخالفت میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں انہیں کمرہ عدالت سے باہر نکال دیا گیا۔ انہوں نے کچہری کے احاطہ میں ہی لوگوں کو جمع کر کے مارشل لا کے خلاف تقریر شروع کر دی۔ دوران تقریر ہی پولیس آگئی انہیں گرفتار کرنا چاہا تو وہ زمین پر بیٹھ گئے جب انہیں زمین پر بیٹھے ہوئے ہتھکڑی لگانا چاہی تو وہ لیٹ گئے آخر کار پولیس انہیں اٹھا کر گاڑی میں ڈال کر گرفتار کر کے لے گئی اسی طرح ہر شہر ضلع تحصیل کے ہیڈ کوارٹر میں نیپ کے ورکر لیڈر جاتے اور گرفتاری پیش کرتے جب پولیس گرفتار کرنے لگتی تو لیٹ جاتے ہر ضلع' شہر'قصبہ میں ہر روز اسی انداز میں گرفتاریاں پیش کی جاتیں گرفتار شدگان کو فوجی عدالتوں میں پیش کیا جاتا۔ جہاں انہیں سرسری سماعت کے بعد سزائیں سنا دی جاتیں۔ یہ تحریک تقریباً چار ماہ تک چلتی رہی ہر روز ہر جگہ سے گرفتاریاں پیش کی جاتیں تقریباً دو ہزار این اے پی کے لیڈروں اور ورکروں نے گرفتاریاں پیش کیں۔ جنہیں فوجی عدالتوں نے مختلف میعاد کی سزائیں دیں۔ جن میں زیادہ لیڈروں کو چودہ چودہ سال کی سزائیں سنائیں۔ گرفتار شدگان کی جائیدادیں بھی ضبط کر لی گئیں۔ پشاور کے صدیق بزاز کو پچیس سال قید بامشقت کی فوجی عدالت نے سزا سنائی تھی اور تمام جائیداد بھی ضبط کر لی گئی تھی۔

مشہور قانون دان میاں محمود علی قصوری جو این اے پی مغربی پاکستان کے جنرل سیکرٹری بھی تھے وہ فوجی عدالتوں میں این اے پی کے لیڈروں کے مقدمات کے لڑنے کے لئے پشاور آئے تھے مگر لیڈران نے مقدمات لڑنے کی انہیں اجازت نہ دی

گرفتار شدگان کو جیلوں میں اذیت ناک سزائیں دی گئیں جن میں کوڑے مارنا بھی شامل تھا۔ پشاور جیل میں شریف الدین ' مانڈا ملاں خان اور قاضی صاحب کو کوڑے مارے گئے۔ طیب شاہ کو ملتان جیل میں کوڑے مارے گئے اور دیگر بھی کئی جیلوں میں ان سیاسی قیدیوں پر جبر کیا گیا۔ کوڑے مارے گئے۔ غازی خان آف ہی کی جائیداد بھی ضبط کر لی گئی اسی جائیداد کی آمدنی سے ہی ان کی گزر اوقات تھی تنگ دستی کی وجہ سے ان کے بچوں کی تعلیم بھی جاری نہ رہ سکی وہ جب رہا ہو کر آئے تو بچوں کی تعلیم کو

دوبارہ جاری کیا گیا۔

گرفتار شدگان سیاسی قیدیوں کو پاکستان کی مختلف جیلوں میں رکھا گیا جن میں پشاور، ہری پور، ڈی آئی خان، اٹک، ساہیوال، ملتان، بہاولپور، سکھر، حیدر آباد، مچھ جیل بھی شامل تھیں۔

ارباب عبدالغفور کو جب پشاور سے حیدر آباد جیل منتقل کیا گیا تو بادشاہ خان بھی اسی جیل میں تھے پھر ان دونوں لیڈروں نے حیدر آباد جیل میں ساری قید کاٹی تھی مختلف جیلوں میں سات سیاسی قیدی مناسب علاج نہ ہونے کی وجہ سے زندگی ہی ختم کر بیٹھے جن کی میتیں گھروں کو واپس آئیں تھیں۔ اسی طرح پنجاب سندھ سے بھی بہت سارے ترقی پسند ورکر مارشل لاء کے تحت گرفتار کیے گئے تھے جن میں میجر اسحاق، سعید ڈار، لعل خان، سید محمد قسور گردیزی، ڈاکٹر اعزاز نذیر، جی ایم سید، انیس ہاشمی، حسن ناصر اور دیگر بہت سارے ترقی پسند دوست گرفتار کیے گئے تھے جنہیں جیلوں میں تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا جن میں حسن ناصر لاہور کے شاہی قلعہ میں پولیس تشدد کی وجہ سے شہید ہو گیا تھا باقی لوگ مارشل لا ختم ہونے کے بعد جیلوں سے رہا کیے گئے تھے۔

صوبہ سرحد سے جن لوگوں کی جائیدادیں ضبط کی گئی تھیں انکی رہائی کے بعد انہیں غیر منقولہ جائیدادیں واپس مل گئی تھیں مگر منقولہ گھریلو سامان زیور وغیرہ واپس نہیں ملا تھا

جمہوری تحریک صدارتی، الیکشن مادر ملت

مارشل لاء ختم ہونے کے بعد این اے پی کے بیشتر سیاسی قید رہا کر دیئے گئے تھے مگر کچھ قیدی جن میں جناب عبدالصمد خان اچکزئی، صدیق برناز اور دیگر کئی لوگ رہا نہیں کیے گئے تھے مگر جو قیدی باہر آئے وہ آرام سے نہیں بیٹھے۔ مارشل لا تو ختم ہو گیا تھا۔ مگر جمہوریت ابھی بحال ہونا باقی تھی۔ اس کے لئے بھی جدوجہد کی ضرورت تھی۔ عوامی لیگ کے جناب حسین شہید سہروردی نے تمام سیاسی پارٹیوں کو تجویز پیش کی کہ وہ پارٹیاں بحال نہ کریں بلکہ تمام پارٹیاں مل کر جمہوریت کے لئے جدوجہد کریں ان کی تائید کرتے ہوئے نیشنل پارٹی کو بحال نہیں کیا گیا عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی نے مل کر جمہوریت کی بحالی کی کوششیں شروع کر دیں اس سلسلہ میں سب سے پہلے جلسہ گوجرانوالہ میں ہونا قرار پایا اس جلسہ میں نیشنل عوامی پارٹی اور عوامی لیگ کی لیڈر شپ نے آنا تھا اور گوجرانوالہ میں مشترکہ جلسہ ہونا تھا اس جلسہ کا ذکر عوامی لیگ کے باب میں بھی کیا گیا ہے۔ میں مختصر لفظوں میں دوبارہ اس جلسے کا ذکر کرتا ہوں اس لئے کہ پاکستان دو ٹکڑے ہونے میں جلسہ کو خراب کرنے کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ جلسہ مارشل لا ختم ہونے کے بعد پہلا بڑا جلسہ تھا۔ سہروردی صاحب مجیب الرحمن صاحب، نوابزادہ نصراللہ خان صاحب، جناب قصوری صاحب اور دیگر لیڈران بذریعہ ریل گاڑی صبح تقریباً دس بجے پہنچے تو عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی کے ورکر استقبال کے لئے سٹیشن پر موجود تھے جبکہ بے وردی اور باوردی پولیس کے علاوہ بے شمار غنڈے جو گوجرانوالہ کے علاوہ دوسرے اضلاع سے بھی جمع کیے گئے تھے اور ساتھ ہی جماعت اسلامی کے نوجوان جو حافظ اسحاق کی زیر قیادت پولیس اور غنڈوں کی معاونت برائے ثواب کر رہے تھے۔ گاڑی جب سٹیشن پر پہنچی تو غنڈہ عناصر لیڈروں پر حملہ آور ہوئے سہروردی صاحب پر پستول کا فائر بھی کیا گیا تھا جو عوامی لیگ کے ورکر چراغ دین کی ران پر لگا تھا۔

نیشنل عوامی پارٹی اور عوامی لیگ کے ورکروں نے بڑی کوشش اور جدوجہد سے لیڈران کو حفاظت کے ساتھ خواجہ صدیق الحسن کی کوٹھی پر پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر پولیس غنڈوں کو لے کر خواجہ صاحب کی کوٹھی پر بھی پہنچ گئی اور کوٹھی پر پتھراؤ کیا۔ جس سے خواجہ صاحب کی کوٹھی کے شیشے ٹوٹ گئے تھے اسی کوٹھی میں جناب سہروردی اور مجیب الرحمن اور دیگر لیڈر بیٹھے ہوئے تھے۔ راقم الحروف بھی اسی کوٹھی میں لیڈران کے پاس موجود تھا۔ جب شیخ مجیب الرحمن نے سہروردی صاحب سے یہ کہا تھا کہ بابا تو مجھے اجازت دے میں اس غنڈہ گردی کا جواب ان غنڈوں کو ڈھاکہ پلٹن میدان میں دوں اور بابا ہم ان غنڈوں کے ساتھ زیادہ دیر رہ بھی نہیں سکتے۔ سہروردی مجیب الرحمن سے خفا ہوئے اور مجیب الرحمن غصے میں اٹھ کر چلے گئے پھر واپس نہیں آئے۔ رات کا جلسہ بھی غنڈوں نے پولیس اور جماعت اسلامی کے تعاون سے خراب کر دیا تھا۔ تمام پنڈال تباہ کر دیا گیا تھا اس زمانے میں منتظمین جلسہ کو 20000 بیس ہزار روپے تباہ شدہ چیزوں کے ادا کرنے پڑے تھے۔ اس جلسے کو خراب کرنے سے پاکستان کی سالمیت کو کلہاڑے سے کاٹ دیا گیا تھا۔ اور دیگر بات یہ ہے کہ پولیس نے مقدمات بھی منتظمین جلسہ پر ہی قائم کئے۔ راقم الحروف پر بھی مقدمہ بنایا گیا تھا۔ 2 سال تک مقدمہ چلتا رہا پھر اس جھوٹے مقدمہ سے جان چھوٹی۔ اس جلسہ کے بعد مشرقی پاکستان کے لیڈران نے مغربی پاکستان میں سیاست کی دلچسپی بہت کم کر دی۔ شیخ مجیب الرحمن 1962ء کے اس جلسہ کے بعد 1968ء کی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے ہی مغربی پاکستان آئے تھے۔ 1964ء میں جناب حسین شہید سہروردی بیروت کے ایک ہوٹل میں پراسرار حالت میں اپنے کمرے میں مردہ پائے گئے تھے۔ عام چرچا یہی تھا کہ ایوب خان نے انہیں مروایا ہے۔ جس روز وہ قتل ہوئے اس روز جناب بھٹو جو اس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ تھے وہ بھی بیروت میں مقیم تھے۔ بھٹو کو بھی ان کی موت کا ذمہ دار کہا جاتا رہا ہے۔

جمہوریت کی جدوجہد کی گاڑی چلتی رہی۔ 1964ء میں مولانا بھاشانی بھی مغربی پاکستان آئے تھے انہوں نے چند جگہوں پر جلسے بھی کئے تھے۔ حکومت نے جماعت اسلامی کو جب لاہور میں اپنا جلسہ نہیں کرنے دیا اور جلسہ گاہ میں ایک جماعت کے ورکر کو قتل کر دیا گیا تو جماعت اسلامی بھی جمہوریت کی گاڑی میں سوار ہو گئی۔ صدارتی الیکشن میں متحدہ اپوزیشن کی جماعتوں سی او پی جس میں نیشنل عوامی پارٹی' عوامی لیگ' کونسل مسلم لیگ' جماعت اسلامی کرشک سرامک پارٹی شامل تھی۔ ایوب خان کے مقابلہ میں مس فاطمہ جناح کو کھڑا کر دیا۔ مغربی پاکستان میں صرف پشاور ڈویژن میں مس فاطمہ جناح کے ووٹ زیادہ تھے باقی سارے مغربی پاکستان میں ایوب کا پلہ بھاری تھا اور ایوب خان سارے پاکستان میں اکثریت کے ساتھ جیت گئے۔

صدارتی الیکشن جیت جانے کے بعد صدر ایوب پاکستان کے منتخب حکمران بن گئے تھے۔ 1965ء میں پاکستان کی بھارت کے ساتھ جنگ ہوئی جو چودہ دن جاری رہنے کے بعد بند ہو گئی تاشقند کے مقام پر ہندوستان اور پاکستان کے سربراہان مملکتوں کا اجلاس ہوا جس میں روس کے صدر مملکت بھی موجود تھے دونوں ملکوں کا صلح نامہ ہوا جس کا ذکر ہم پیپلز پارٹی اور کنونشن لیگ کے باب میں کر آئے ہیں اس صلح نامے کو اعلان تاشقند کے نام سے پکارا گیا ہے اور یہ تاریخ کا ایک باب بن چکا ہے جس میں دونوں حکومتوں سے کہا گیا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے مقبوضہ علاقے خالی کر دیں۔ اپنی فوجیں اپنی سرحدات کے اندر لے جائیں۔ اس اعلان تاشقند پر بھارت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری' پاکستان

خان عبدالولی خان پارٹی ورکرز کے ساتھ

شیر باز خان مزاری اور محمد فاروق قریشی

کے صدر ایوب خان سوویٹ یونین کے وزیر اعظم مسٹر کو سیجن ازبکستان کے وزیر اعظم جناب قربانوف نے دستخط کئے تھے۔

ایوب خان کے خلاف جمہوری تحریک جس میں پیپلز پارٹی کے علاوہ تمام جماعتیں شامل تھیں اس اتحاد کا نام پے ڈی ایم رکھا گیا تھا اس تحریک میں نیشنل عوامی پارٹی ولی خان گروپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس میں سینکڑوں ورکر اور لیڈر این اے پی کے گرفتار ہوئے جو صدر ایوب کی حکومت کے خاتمے کے بعد رہا کیے گئے۔

نیشنل عوامی پارٹی اور اندرونی خلفشار

نیشنل عوامی پارٹی آٹھ جماعتوں کو ختم کر کے بنائی گئی تھی۔ جس میں چھ جماعتیں مغربی پاکستان سے تھیں دو جماعتیں گنا تنتری دل اور عوامی لیگ بھاشانی گروپ مشرقی پاکستان سے تھیں ان جماعتوں میں قدر مشترک صرف یہ تھی کہ یہ جماعتیں سیکولر تھیں فرقہ واریت پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔

مغربی پاکستان کے تمام گروپ تخلیق پاکستان میں شامل نہ تھے ماسوائے آزاد پاکستان پارٹی کے۔ جس جذبے نے ان سب کو جمع کیا تھا سامراجیت کی مخالفت اور ون یونٹ کی مخالفت سرفہرست تھی ون یونٹ کے ہوتے ہوئے مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبے کبھی بھی مقتدر نہیں ہو سکتے تھے اور قوم پرستوں کی طاقت کسی حد تک صوبہ سرحد بلوچستان اور بہت تھوڑی طاقت سندھ میں تھی مگر ون یونٹ کے ہوتے ہوئے ان کی یہ طاقت صفر رہ جاتی تھی وہ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ ادھر بھاشانی گروپ جن کے پنجاب کے سوشلسٹ بھی ہمنوا تھے یہ مارکسٹ نظریات کے حامی تھے ایوب کی حکومت کے دوران ہی بھاشانی گروپ واضع طور پر الگ ہو گیا تھا اور انہوں نے اپنی پارٹی کا نام نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ رکھ لیا تھا بھاشانی گروپ اور ولی خان گروپ دونوں الگ الگ ہو گئے تھے اور ایوبی اقتدار کے آخری دور میں بھاشانی صاحب اور ان کا گروپ ایوب کے کسی حد تک حامی ہو گئے تھے ان کی وجہ یہ تھی کہ 1965ء کی جنگ جو پاکستان اور بھارت کے درمیان ہوئی تھی اس جنگ میں امریکہ نے پاکستان کی امداد نہیں کی تھی اس لئے ایوب خان امریکہ کے ذہنی طور پر خلاف ہو گئے تھے اور انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام کا ترجمہ اردو میں تھا کہ "ہمیں دوست چاہیے آقا نہیں"۔ سامراجیت کے مخالف ہونے کی وجہ سے نیشنل عوامی پارٹی کا بھاشانی گروپ ایوب خان کے خلاف تحریک میں شامل نہیں ہوا تھا جب ایوب حکومت کو ختم کر کے یحیی خان نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تو ریڈیو پاکستان پر پہلی تقریر میں ہی ون یونٹ کے خاتمے کا اعلان کر دیا تھا اور ساتھ ہی پاکستان کے دونوں حصوں کو پارلیمنٹ میں برابر کی نمائندگی ختم کر دی ان میں ون مین ون ووٹ کے حق کو تسلیم کر لیا گیا اس ون یونٹ کے خاتمے کے اعلان کے بعد نیشنل عوامی پارٹی بنائے جانے کا بنیادی مقصد ختم ہو گیا تھا مختلف الخیال لوگ کسی حد تک صرف ون یونٹ کی مخالفت پر ہی اکٹھے ہوئے تھے یہ مسئلہ حل ہو جانے کے بعد جماعت میں اختلاف رونما ہونا شروع ہو گئے۔ مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں میں الیکشن جیتنے کے لئے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے پنجاب کو مطعون کرنا ضروری تھا جبکہ پنجاب میں پارٹی اس طرح چل ہی نہ سکتی تھی پھر آہستہ آہستہ پنجاب میں پارٹی انتشار کا شکار ہو گئی۔ سب سے

پہلے بھاشانی گروپ بنا جس میں 80 فیصد پنجاب کے ہی ورکر تھے جو بعد میں سوشلسٹ پارٹی کی حیثیت اختیار کر گئے پھر میجر اسحاق صاحب نے بہت سارے کارکنوں کو الگ کر کے مزدور کسان پارٹی بنا لی پھر کچھ مزدور یونین جو نیشنل عوامی پارٹی میں شامل تھے انہوں نے ورکر پارٹی کے نام سے الگ تنظیم قائم کر لی۔ مشہور مزدور راہنما مرزا ابراہیم صاحب اس تنظیم کے راہنما بن گئے۔

پھر سندھ پارٹی کے راہنما جی ایم سید نے پارٹی کے اندر رہتے ہوئے مرکزی پارٹی کے ساتھ رابطہ ہی ختم کر لیا اگر کوئی اخباری بیان جاری کرتے تو وہ بھی پارٹی کے لئے نقصان دہ ہوتا وہ پاکستان کے وجود کی ہی واشگاف الفاظ میں مخالفت کرتے جس سے پارٹی کو نقصان ہوتا وہ سیاست میں سندھی سوچ کے نقیب بن گئے۔ ادھر بلوچستان میں بھی پارٹی کے اندر اختلاف منظر عام پر آئے دیگر یہ کہ بلوچستان کے لوگوں میں بھی آپس کے اختلاف ون یونٹ کے خاتمے کے بعد اجاگر ہو کر سامنے آ گئے۔ شہزادہ عبدالکریم جو کہ نیشنل عوامی پارٹی میں بلوچ لیڈر کی حیثیت رکھتے تھے نوجوانوں میں ان کے کردار کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا عام نوجوان یہ خیال کرتے تھے شہزادہ عبدالکریم اپنے بھائی خان آف قلات کی خانی کو مضبوط کرنے کے لئے زیادہ کوشش کر رہے ہیں اور ون یونٹ کی مخالفت بھی وہ ریاست قلات کی بحالی کے لئے کر رہے ہیں۔ دیگر یہ کہ ایوب خان کے دور حکومت میں شہزادہ عبدالکریم اور خان عبدالصمد خان اچکزئی ایک ہی جیل میں رہنے کی وجہ سے ان میں بھی اختلاف پیدا ہو گئے تھے وہ ایک دوسرے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے انکے ذاتی اختلاف بھی ان کی سیاست پر اثر انداز ہوئے۔ دیگر یہ کہ اسی زمانے میں حکومت افغانستان نے پختونستان کا ایک نقشہ لاکھوں کی تعداد میں شائع کیا تھا اور بہت زیادہ تقسیم کیا گیا تھا اس نقشہ میں سارا بلوچستان پختونستان کا حصہ دیکھایا گیا تھا یہ نقشہ بھی بلوچستان میں بلوچ لیڈروں اور پختون لیڈروں میں اختلاف کا موجب بنا۔ دیگر یہ کہ نیشنل عوامی پارٹی کے منشور میں لکھا ہوا تھا کہ ون یونٹ توڑ کر لسانی بنیادوں پر نئے صوبے تشکیل دیے جائیں ون یونٹ ٹوٹ جانے کے بعد خان عبدالصمد خان اچکزئی نے نیشنل عوامی پارٹی سے مطالبہ کیا کہ وہ بلوچستان کے پٹھانوں کے لئے الگ پختونستان کے حصول کے لئے پھر سے تحریک چلائیں صرف سابقہ صوبوں کے بحالی سے بلوچستان کے پختون مطمئن نہیں ہوں گے مگر نیشنل عوامی پارٹی کی مرکزی قیادت نے کثرت رائے سے خان عبدالصمد خان اچکزئی کا مطالبہ مسترد کر دیا اور اچکزئی صاحب نے 1970ء میں نیشنل عوامی پارٹی پختون خواہ کے نام سے الگ گروپ بنا لیا اور 1970ء کا الیکشن بھی الگ لڑا جس میں وہ صوبائی اسمبلی کا ممبر بننے میں کامیاب ہو گئے تھے دیگر انہیں کوئی سیٹ نہیں ملی تھی۔ نیشنل عوامی پارٹی میں شامل لوگ زیادہ تر 1947ء میں فیصلہ تقسیم ہند کے خلاف تھے فرقہ واریت کے خلاف تھے سیکولر تھے اس لئے حکومتی عناصر بھی انہیں منتشر کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اخبارات ہمہ وقت نیپ کے خلاف تشہیر کرتے رہتے تھے۔

یحیی خان کے دور حکومت میں نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک کانفرنس کی تھی جس میں مولانا عبدالحمید خان بھاشانی نے بھی خطاب کیا تھا یہ کانفرنس بہت کامیاب ہوئی تھی۔ پیپلز پارٹی نے بھی اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں معاونت کی تھی۔ اس کانفرنس میں لاکھوں لوگ شریک ہوئے تھے اس کانفرنس میں مولانا بھاشانی نے کہا تھا کہ یحیی خان اگر تم نے سازشوں کا سلسلہ بند نہ کیا تو پاکستان ٹوٹ جائے گا۔

نیپ، یحییٰ خان، بھٹو، بنگلہ دیش

1970ء کے انتخابات میں نیشنل عوامی پارٹی کو متوقع کامیابی تو نہ ہوئی مگر پنجاب کے لوگوں کے لئے حیران کن بات تھی نیپ کے حلقے یہ سمجھتے تھے کہ انہیں صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اکثریت حاصل ہو جائے گی مگر توقع کے مطابق انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ بلوچستان میں تو اکثریت مل گئی مگر صوبہ سرحد میں قومی اسمبلی کی صرف 3 نشستیں ملیں اور صوبائی اسمبلی کے چالیس کے ہاؤس میں 13 نشستیں حاصل ہوئیں۔ اس صورت میں صوبائی اسمبلی میں سب سے بڑا گروپ انہیں کا تھا۔ 1970ء کے الیکشن میں عوامی لیگ اکثریت میں کامیاب ہوئی دوسرے نمبر پر پیپلز پارٹی کامیاب ہوئی اس صورت حال میں حکومت کے ایوانوں میں غور و فکر شروع ہو گیا کہ عوامی لیگ کو اقتدار منتقل کرنا چاہیے کہ نہیں اس تفصیل کو ہم نے عوامی لیگ، پیپلز پارٹی کے باب میں لکھ دیا ہے۔ اس وقت ہم نے نیشنل عوامی پارٹی کے کردار کے بارے لکھنا ہے۔ جب یحیی خان نے انتخابات کے بعد ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس مورخہ 71-3-3 بلانے کا اعلان کیا تو پیپلز پارٹی کے جناب بھٹو نے قومی اسمبلی کے اجلاس ڈھاکہ میں جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جو لوگ ڈھاکہ سیشن میں جائیں گے ان کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی مگر نیپ کے منتخب ممبران نے کہا کہ ہم ضرور جائیں گے ہمیں لوگوں نے قومی اسمبلی کے اجلاسوں میں شامل ہونے کے لئے منتخب کیا ہے ہم ضرور اسمبلی اجلاسوں میں شمولیت کریں گے چنانچہ ولی خان اجلاس سے چند روز پہلے ہی ڈھاکہ پہنچ گئے انہوں نے اس سیاسی بحران کو حل کرنے کے لئے شیخ مجیب الرحمن اور یحیی خان سے کئی ملاقاتیں کیں اور دونوں لیڈران کو آگاہ کیا کہ اس طرز عمل سے پاکستان بالاخر ٹوٹ جائے گا مسائل کا حل اسمبلیوں کے اندر بیٹھنے سے غور و فکر سے نکلتا ہے۔ یحییٰ خان نے ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیا اور عوامی لیگ کو خلاف قانون قرار دیا گیا اور ساتھ ہی نیشنل عوامی پارٹی کو بھی خلاف قانون قرار دیا گیا۔ 1971ء کے اس نازک ترین دور میں نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈر اور ورکر اس کوشش میں مصروف رہے اور حکومت پر زور دیتے رہے کہ وہ عوامی لیگ کے ساتھ سیاسی سمجھوتہ کرے اسی صورت میں ہی ملک بچ سکتا ہے۔ 1971ء میں نیشنل عوامی پارٹی کے ورکرز نے لاہور مال روڈ پر ایک جلوس نکالا تھا جس میں حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں فوجی کاروائی بند کریں اور عوامی لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کریں۔ یحیی خان حکومت نے سیاسی سمجھوتہ کی کوئی بات بھی نہ مانی اور 1971ء کے اخیر میں پاک بھارت جنگ ہوئی اور بنگلہ دیش بن گیا۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد مغربی پاکستان میں یحیی خان کی حکومت ختم ہو گئی اور ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے صدر اور پھر وزیر اعظم بن گئے پاکستان کے عوام میں یہ خدشات ابھی باقی تھے کہ جمہوری تقاضوں کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے بنگلہ دیش بن گیا اور پاکستان دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا اس لئے اگر بلوچستان اور سرحد میں نیپ کا حق بنتا ہے تو اسے حکومت دی جانی چاہیے۔ لوگوں کے ان خدشات پر جناب بھٹو صدر پاکستان نے نیپ پر سے پابندی ختم کر دی اور انہیں بات چیت کی دعوت دی گئی اور انہیں 1972ء میں صوبائی حکومتیں بنانے کی اجازت دی۔ صوبہ سرحد میں جمعیت علمائے اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کی مخلوط حکومت قائم ہوئی جس کے سربراہ مفتی محمود صاحب بنے تھے صوبہ سرحد کے گورنر

میر افضل خان، بیگم نسیم ولی خان، اور راؤ مہروز اختر

ارباب سکندر خان خلیل بنائے گئے تھے بلوچستان میں بھی نیپ جمعیت مخلوط حکومت بنی۔ صوبے کے وزیر اعلیٰ سردار عطاء اللہ خان مینگل اور گورنر میر غوث بخش بزنجو بنے تھے یہ حکومتیں بنتے ہی ان کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں۔ نواب محمد اکبر خان بگتی جو کہ بلوچستان کی بڑی ہی بااثر شخصیت اس وقت بھی تھے آج بھی ہیں انہوں نے 1970ء کے الیکشن میں نیپ کی امداد کی تھی اپنا اثر رسوخ بھی استعمال کیا تھا اور سرمایہ بھی خرچ کیا تھا ان کے ایک بھائی احمد نواز بگتی صوبائی اسمبلی کے ممبر بھی تھے جب بلوچستان میں نیپ کی صوبائی حکومت بنی تھی کہ نواب صاحب نے اس حکومت کے خلاف پہلے اندرون خانہ اور پھر ظاہرا مخالفت شروع کر دی۔ شاید نیپ والوں کا کوئی زبانی معاہدہ نواب صاحب کے ساتھ تھا جسے پورا نہ کیا گیا تھا یا نواب صاحب کوئی خاص توقع نیپ سے رکھتے تھے جسے نیپ والوں نے پورا نہیں کیا۔ آخر انہوں نے 1970ء کے انتخابات میں نیپ کی بڑھ چڑھ کر مدد کی تھی اس کا کوئی معاوضہ تو ضرور ہونا چاہئے تھا جسے نیپ نے پورا نہیں کیا تھا۔ پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر بھٹو بھی نیپ کی حکومتوں کو پسند نہیں کرتے تھے وہ موقع کی تلاش میں تھے اور دیگر انہیں بلوچستان کی کوئی اہم شخصیت کی ضرورت تھی وہ بھی انہیں نواب اکبر بگتی مل گئے صوبہ سرحد میں انہیں خان عبدالقیوم خان بھی مل گئے خان عبدالقیوم خان کو انہوں نے وزیر داخلہ بنا لیا وزیر داخلہ کے پاس اتنے اختیارات ہوتے ہیں کہ وہ صوبائی حکومتوں کو بڑی آسانی سے غیر مستحکم کر سکتے ہیں۔ میں خود اس وقت پشاور گیا ہوا تھا دیکھا اور پتہ لگا کہ قبائلی شہر سے بچوں اور بڑوں کو اغوا کر کے لے جاتے اور ساتھ ہی صوبائی حکومت کے خلاف مظاہرے شروع ہو جاتے اور شہر میں ہڑتال ہو جاتی۔ یہی حال صوبہ سرحد کے دوسرے شہروں کا بھی تھا ادھر بلوچستان میں نواب اکبر بگتی کے بیٹے سلیم اکبر بگتی بہت سارے قبائلیوں کا ایک لشکر ترتیب دے کر کوئٹہ شہر جاتے ہیں صوبائی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے شہر میں لاقانونیت پھیلاتے ہیں اگر صوبائی حکومت لاقانونیت سختی سے ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے تو قبائلی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بھٹو حکومت نے ہر طریقہ پر نیشنل عوامی پارٹی کی ان صوبائی حکومتوں کو غیر مستحکم کیا اور آخری حربہ یہ استعمال کیا گیا کہ عراقی سفارت خانے سے 12 پیٹی اسلحہ برآمد کیا گیا اور الزام لگایا گیا کہ یہ اسلحہ نیشنل عوامی پارٹی نے منگوایا ہے اور حکومت پاکستان کے خلاف دہشت گردی میں استعمال ہونا تھا۔ موچی دروازہ لاہور میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس میں نواب محمد اکبر خان بگتی خصوصی مقرر تھے انہوں نے سلطانی گواہ کی حیثیت سے عراقی سفارت خانے سے برآمد شدہ اسلحہ کے متعلق لوگوں کو کہا کہ یہ اسلحہ پاکستان کو تباہ کرنے کے لئے عراق سے منگوایا گیا تھا اور قبل از وقت پتہ چل گیا اور پاکستان بچ گیا جب چند باہر کے ملکوں کے اخبار نویسوں نے عراق سفارت خانے کا رجوع کیا تو عراقی سفیر نے پہلے تو کوئی جواب ہی نہ دیا پھر صرف اتنا کہا کہ یہ سازش عراقی سفارت خانے کے خلاف کی گئی اسی عراقی اسلحہ کی برآمد کے الزام میں بلوچستان کے گورنر میر غوث بخش بزنجو کو برطرف کر دیا گیا اور ان کی جگہ گورنر نواب محمد اکبر بگتی بنا دیے گئے۔ تین دن بعد عطاء اللہ مینگل وزارت کو بھی برطرف کر دیا گیا۔ بلوچستان کی صوبائی حکومت کی برطرفی کے خلاف بطور احتجاج سرحد کے گورنر ارباب سکندر خان اور وزیر اعلیٰ مفتی محمود بھی مستعفی ہو گئے نیپ کا جزوی اقتدار سرحد اور بلوچستان سے ختم کر دیا گیا۔

وزارتیں ختم ہونے کے بعد

وزارتیں ختم ہونے کے بعد نیپ پر بہت ظلم ہوا۔ ہزاروں لوگ گرفتار کر لئے گئے ہزاروں لوگ اپنی جانیں بچاتے ہوئے دوسری جگہوں پر چلے گئے۔ سیف الدین صاحب جو بنیادی طور پر پٹھان یا بلوچ نہ تھے وہ صرف کاروباری تھے بوھرا برادری سے تعلق رکھتے تھے کوئٹہ میں سورج گنج بازار میں ان کی دوکانیں تھیں جو اس وقت بھی ہیں مگر ان کا تعلق نیپ سے تھا وہ اس دور میں بھاگ کر کراچی چلے گئے تھے۔ انہیں کراچی سے گرفتار کیا گیا تھا ان پر الزام تھا کہ نیپ کے جو لوگ بلوچستان سے بھاگ کر آئے ہیں وہ ان کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں ان کے سارے خاندان کو مقدمات میں ملوث کیا گیا جب تک بھٹو اقتدار میں رہے ان پر مقدمات چلتے رہے۔ بہت سارے قبائلی پہاڑوں پر چلے گئے انہوں نے حکومت کے خلاف گوریلہ جنگ شروع کر دی جو بہت جلد کچل دی گئی بہت سارے لوگ افغانستان چلے گئے تھے جن میں نواب خیر بخش مری' سردار عطاء اللہ مینگل اور ان کے ساتھ ہزاروں قبائلی بھی تھے صوبہ سرحد سے بھی نیپ کے بہت لوگ افغانستان چلے گئے تھے جن میں حسین بخش کوثر' افراسیاب خٹک بھی شامل تھے بعد میں اجمل خٹک بھی افغانستان چلے گئے تھے قبل اس کے جب صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ کی وزارتیں تھیں تب بادشاہ خان افغانستان سے واپس اپنے ملک آ گئے تھے لاکھوں لوگوں نے مفتی محمود صاحب' وزیر اعلی سرحد اور بلوچستانی لیڈروں کے سمیت تورخم کی سرحد پر استقبال کیا تھا جو پشاور سے لے کر تورخم تک تھا بادشاہ خان نے اعلان کیا تھا کہ وہ بھٹو کی پیپلز پارٹی کی حکومت کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کریں گے مگر بھٹو صاحب نے چار روز بعد ان کی تعاون کی پیشکش کو نہایت ذلت آمیز طریقہ کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا۔ نیپ نے اپنا تعلق اپوزیشن پارٹیوں سے قائم کرلیا۔ قومی اسمبلی میں متحدہ اپوزیشن کے لیڈر خان عبدالولی خان بنائے گئے تھے متحدہ اپوزیشن جماعتوں میں نیشنل عوامی پارٹی جمعیت علمائے اسلام مسلم لیگ جمعیت علمائے پاکستان جماعت اسلامی اور دیگر سیاسی گروپ بھی شامل تھے حکومت کے خلاف جو جدوجہد ہوتی تھی وہ متحدہ جمہوری محاذ کی طرف سے ہوتی تھیں۔

مارچ 1974ء کو راولپنڈی لیاقت باغ میں یو ڈی ایف کے زیر اہتمام جلسہ منعقد کرنے کا اعلان ہوا اس جلسہ کو کامیاب کرنے کے لئے متحدہ جمہوری محاذ نے بہت جدوجہد کی۔ صوبہ سرحد سے لے کر فیصل آباد اور لاہور تک کے لوگ یو ڈی ایف کا جلسہ سننے کے لئے راولپنڈی کی طرف رواں دواں تھے۔ راقم الحروف بھی جلسہ سننے کیلئے دیگر ساتھیوں کے ساتھ گوجرانوالہ سے راولپنڈی گیا تھا راستے میں پولیس جہلم اور گوجر خان کھڑی تھی ہر بس کو چیک کیا جاتا تھا جس شخص پر شک گزرتا کہ جلسہ سننے کے لئے جا رہا ہے اسے بس سے اتار لیا جاتا۔ تقریبا ہر شخص کی تلاشی لی جاتی کہ اسلحہ وغیرہ تو ان کے پاس نہیں ہے اگر کسی کے پاس اسلحہ مل جاتا تو اسے گرفتار کر لیا جاتا دوسری طرف پیپلز پارٹی والے جلسہ خراب کرنے کے لئے الگ گاڑیوں پر جا رہے ھیں ان کے پاس اسلحہ بھی ہے انہیں کوئی بھی پوچھتا نہیں صوبہ سرحد سے نیشنل عوامی پارٹی والے جو تقریبا دو سو سے زائد بسوں پر سوار ہو کر سرخ ٹوپیاں پہنے ہوئے کئی لوگوں نے سرخ وردیاں بھی پہنی ہوئی تھیں۔ جلسہ میں شامل ہونے کے لئے راولپنڈی پہنچے راقم الحروف گوجرانوالہ کے دیگر ساتھیوں سمیت دو بجے دوپہر راولپنڈی پہنچا لیاقت باغ

کے قریب گئے تو گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھی پتہ چلا کہ جلسہ خراب کر دیا گیا ہے راقم الحروف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جلسہ گاہ کے قریب جو نیپ والوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں انہیں شر پسندوں نے آگ لگا دی۔ فیڈرل سیکورٹی فورس شرپسندوں کی معاونت کر رہی تھی جلسہ گاہ کے گرد کئی جگہوں پر کئی لوگوں کو گولیوں سے زخمی حالت میں تڑپتے دیکھا مرنیوالوں میں تمام کے تمام نیپ کے لوگ ہی تھے وہ مرنے کے لئے نہیں آئے تھے وہ تو جلسہ دیکھنے' سننے کے لئے آئے تھے ان کے پاس لاشیں اٹھانے کے لئے چارپائیاں بھی نہ تھی وہ فولڈنگ کرسیوں پر لاشیں رکھ کر اپنی گاڑیوں کی طرف لے جا رہے تھے مگر جلسہ کے قریب کھڑی گاڑیوں کو جب آگ لگ گئی تو وہیں سڑک پر لاشیں رکھ کر بیٹھ گئے اس جلسہ میں نیپ کے آٹھ ورکر فوت ہوئے تھے تقریباً 200 دو سو کے قریب لوگ زخمی ہوئے ان میں بھی زیادہ نیپ والے ہی تھے اس لئے کہ ان لوگوں نے سرخ ٹوپیاں یا سرخ وردی پہن رکھی تھی اور انہیں ہی نشانہ بنایا جاتا تھا ہمیں بھی اپنی جان کے لالے پڑ گئے لیاقت باغ بازار کے ایک دوکاندار نے ہمیں دوکان کے اندر بیٹھنے کو جگہ دی جب تک حالات مخدوش رہے خطرناک رہے ہم وہیں بیٹھے رہے۔ جب ہم وہاں سے اٹھے اور لیاقت باغ کی طرف چل دئے تو اس وقت بھی جلسہ گاہ کو فیڈل سیکورٹی فورس نے گھیرا ہوا تھا اور اس کے بعد بھی نیپ والوں پر مسلسل عذاب نازل ہوتا رہا۔ زیر عتاب رہے۔ نیپ میں پنجاب کے ورکروں کی حیثیت کچھ بھی نہ تھی مگر پنجاب میں بھی نیپ کے لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا جن میں فاروق قریشی' راؤ مہروز اختر' حبیب جالب وغیرہ شامل تھے۔ 1975ء میں پشاور یونیورسٹی میں بم کے دھماکے سے حیات محمد خان شیر پاؤ ہلاک ہو گئے تھے۔ ان کے قتل کا الزام بھی نیپ پر ہی لگایا گیا تھا خان عبدالولی خان اور ان کے بیٹے جو اس وقت لاہور میں تھے انہیں پشاور جاتے ہوئے گوجرانوالہ کے قریب گرفتار کر لیا گیا تھا اور دیگر کئی لوگ گرفتار کئے گئے تھے اور اتنی دہشت ناک فضا قائم کی گئی تھی کہ ہم گوجرانوالہ کے ورکر جو کسی گنتی میں نہ تھے ہمیں بھی خوف زدہ کیا جانے لگ گیا تھا۔

نیپ کو خلاف قانون قرار دیا گیا

بھٹو جب سیاست میں آئے تھے تو ان کے متعلق عام تاثر یہ تھا کہ وہ بائیں بازو کی سیاست کے حامی تھے لوگ امریکی سیاست دائیں بازو کی سیاست سے تنگ آ چکے تھے اس لئے بھٹو کے پیش کاروں نے بھٹو کو چینی بائیں بازو کی سیاست کار کے روپ میں پیش کیا اور اس وقت بائیں بازو کی سیاست پر نیپ کی ہی اجارہ داری تھی اور نیپ ہی اپنے آپ کو قومی اور سوشلسٹ سیاست کے علمبردار کہتے تھے۔ نیپ بھاشانی گروپ نے جب ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک بہت بڑی کسان کانفرنس منعقد کی تھی اس کانفرنس میں بھٹو اور پیپلز پارٹی کی مرضی سے ہزاروں ورکر شامل ہوئے تھے اور ایسا تاثر بن گیا تھا کہ پاکستان کا مقدر سوشلزم بن چکا ہے پھر ایک سے زائد موقع بھٹو نے کہا تھا کہ میرا ارادہ ہوا تھا کہ میں نیپ میں شامل ہو جاؤں مگر نیپ بذات خود ہی انتشار کا اتنا شکار تھی کہ میرے شامل ہونے سے انتشار مزید بڑھ سکتا تھا کم نہیں ہونا تھا بھٹو کے اس تاثر کے پیش نظر بہت سارے نیپ کے لوگ خاص کر پنجاب کے ورکر بشمول میاں محمود علی قصوری' شیخ رفیق احمد' رؤف طاہر' اسمٰعیل ضیا' شیخ رشید احمد اور

راقم الحروف سمیت بہت لوگ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے تھے انکی عزت کی جاتی تھی ان کو عہدے پیش کئے جاتے تھے یہ سب عزت افزائی 1970ء کے الیکشن سے قبل تھی۔

جب 1970ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی الیکشن جیت کر حکمران پارٹیوں میں شمار ہونے لگ گئی تو پھر یہ بڑے لوگوں کی جماعت بن گئی پیپلز پارٹی کا منشور اور نیپ کا منشور ایک جیسا ہی تھا دونوں جماعتوں کے پروگرام ایک جیسے ہی نظر آتے تھے مگر اقتدار مل جانے کے بعد نیپ اور پیپلز پارٹی میں زمین آسمان کا فرق ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ حکمران پارٹی کا مزاج جب سامنے آگیا تو راقم الحروف اور پھر قصوری صاحب نے پیپلز پارٹی کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ حکمران جماعت کی حیثیت سے پیپلز پارٹی کا ہر عمل آمرانہ تھا اور اس جماعت کی تمام تر کوشش نیشنل عوامی پارٹی کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا ہر حربہ آزمایا اور بلاخر نیپ کو خلاف قانون قرار دیا گیا صرف حکم سے ہی نیپ کو خلاف قانون قرار نہیں دیا بلکہ سپریم کورٹ آف پاکستان میں ریفرنس پیش کیا گیا اور سپریم کورٹ سے نیپ کو خلاف قانون قرار دیئے جانے کی سند حاصل کی۔ تصدیق کروائی اور عدالتی مہر لگا دی گئی تھی تاکہ آئندہ آنے والی کوئی حکومت بھی نیپ پر سے پابندی ختم نہ کر دے اس خدشہ کے پیش نظر نیپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا تھا۔ اور ساتھ ہی تمام لیڈران کو گرفتار کر لیا گیا اور ان پر بغاوت اور غداری کے مقدمات قائم کئے گئے جس کے لئے حیدر آباد ٹریبونل قائم کیا گیا تھا۔

نیشنل عوامی پارٹی کے خلاف قانون کئے جانے کے بعد جیل کے اندر سے ہی نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈران نے کارکنوں کو منظم رکھنے، متحد رکھنے کے لئے نئی جماعت بنانے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ قومی اسمبلی کے ممبر جناب شیر باز خان مزاری کے تعلقات نیپ کے لیڈران کے ساتھ اچھے تھے انہیں کہا گیا کہ وہ نئی پارٹی بنانے کا اعلان کریں این اے پی کے لیڈران کے مشورے سے نئی سیاسی جماعت نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کا کنونشن لاہور میں صفدر صدیقی صاحب کے مکان پر ہوا جس میں رانا مقبول احمد ایڈووکیٹ، شیر باز خان مزاری، فاروق قریشی، صفدر صدیقی راؤ، مہروز اختر، مولوی غلام محمد ہاشمی اور دیگر بہت سارے لوگ شامل ہوئے جس میں نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کا اعلان کیا گیا۔ پہلے کنوینر جناب شیر باز خان مزاری بنائے گئے تھے تنظیمی کمیٹی کے ممبران میں دیگر بہت سارے لوگوں کے علاوہ فاروق قریشی راؤ، مہروز اختر، بیگم نسیم ولی خان اور دیگر بہت سارے لوگ شامل تھے۔
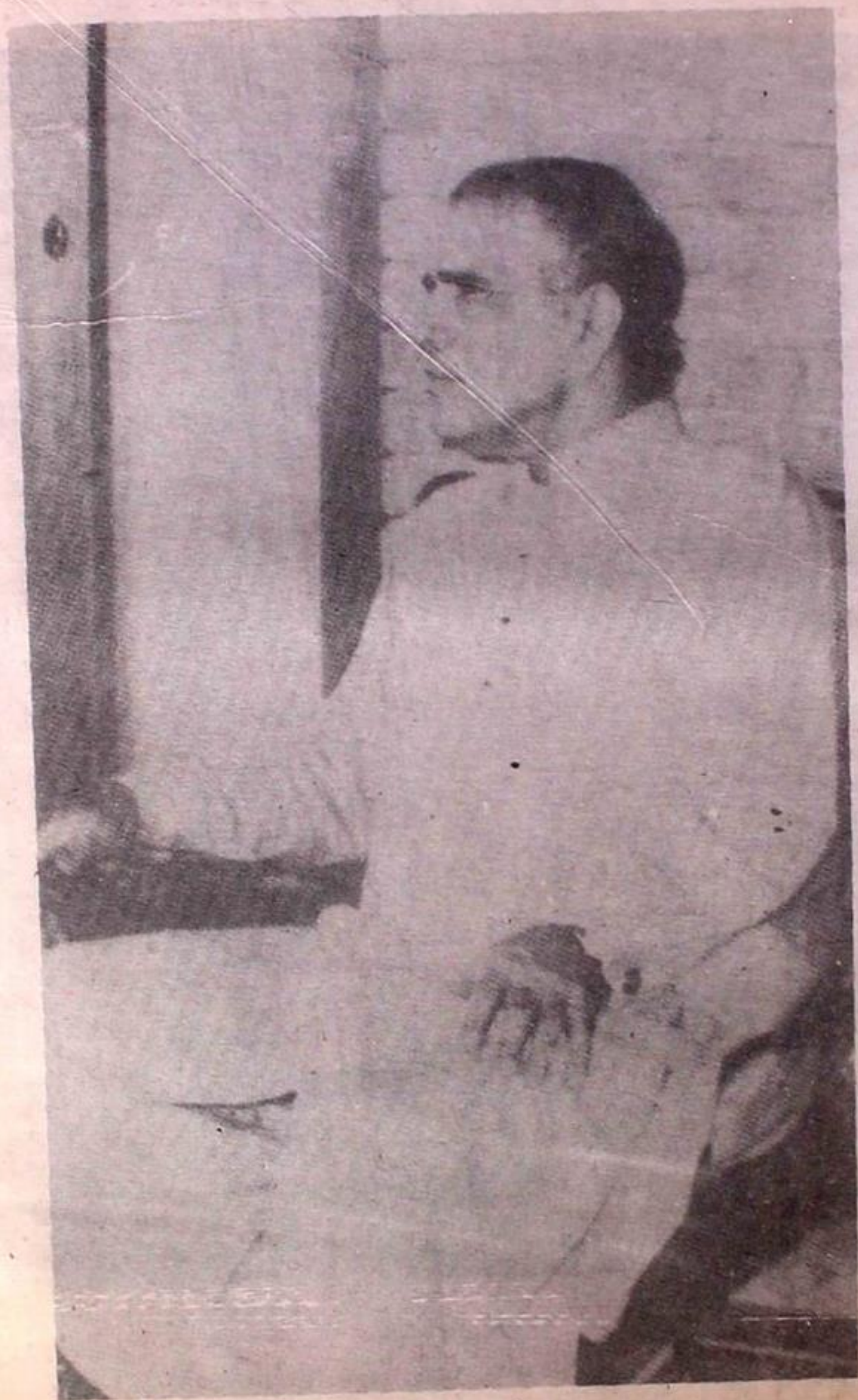
شیرباز خان مزاری

بیگم نسیم ولی خان

نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی

این ڈی پی 1976ء میں قائم ہوئی تھی اس کے پہلے کنونیئر اس وقت قومی اسمبلی کے ممبر جناب شیر باز خان مزاری بنائے گئے تھے۔ پہلا کنونشن لاہور میں صفدر صدیقی کے مکان پر جب کہ دوسرا کنونشن پشاور میں ہوا تھا۔ جس میں جناب شیر باز خان مزاری کو پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ نیشنل عوامی پارٹی کی ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران جن کی تعداد 32 تھی جن میں شاعر انقلاب حبیب جالب، سید محمد قسور گردیزی، جناب عبدالولی خان، خیر بخش مری، عطاء اللہ مینگل، غوث بخش بزنجو اور دیگر تمام لوگ بھی شامل تھے انہیں گرفتار کیا گیا تھا ان پر غداری اور بغاوت کے مقدمات قائم کئے گئے تھے ان مقدمات کو سننے کے لئے حکومت نے ایک ٹریبونل قائم کیا جس کو حیدر آباد ٹریبونل کا نام دیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس مقدمہ کے لئے شہادتوں کا اتنا بڑا ذخیرہ قائم کیا گیا تھا کہ یہ مقدمہ بیس سال تک بھی ختم نہیں ہونا تھا اور نیشنل عوامی پارٹی کے یہ لیڈران جیلوں میں ہی گل سڑ کر مر جانے تھے اور مقدمہ ختم نہیں ہونا تھا 1977ء میں بھٹو حکومت کے خلاف اپوزیشن کی نو جماعتوں کے متحدہ محاذ بنایا گیا تھا جس نے بھٹو حکومت کے خلاف تحریک چلائی تھی جو مسلسل چار ماہ تک چلتی رہی۔ ہر روز گرفتاریاں ہوتی تھیں ہڑتالیں ہوتی تھیں ان نو جماعتوں میں نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی بھی شامل تھی اس وقت این ڈی پی کی نائب صدر بیگم نسیم ولی خان تھیں انہوں نے تحریک میں بھرپور حصہ لیا وہ عملی طور پر سیاست میں پہلی دفعہ آئی تھیں اور انہوں نے پوری جدوجہد کے ساتھ تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ملکی اور غیر ملکی سطح پر نام پیدا کیا۔ اپنی بیگم کے بارے جناب عبدالولی خان نے یوں بیان کیا تھا کہ جب وہ جیل میں تھے تو بیگم نسیم سیاست میں آئیں تو ان کا تعارف یوں ہوتا تھا کہ بیگم نسیم ولی خان صاحب جو کہ اس وقت جیل میں ہیں ان کی بیگم ہے۔ جب عبدالولی خان جیل سے باہر آگئے تو ان کا تعارف ان کی بیگم کے حوالے ہوتا تھا کہ جناب عبدالولی خان بیگم نسیم ولی خان والے ولی خان ہیں یعنی کہ بھٹو کے خلاف تحریک میں انہوں نے اتنی جدوجہد کی کہ ان کی شخصیت قومی اور بین الاقوامی سطح پر بہت زیادہ نمایاں ہوئی ہے۔ جولائی 1977ء میں بھٹو حکومت ختم کر دی گئی جنرل ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کر لیا حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی ضیاء الحق حکومت نے 90 دن کے اندر الیکشن کرائے جانے کا اعلان کیا جب الیکشن قریب آئے تو حکومت نے غیر معینہ مدت کے لئے الیکشن ملتوی کر دئے اور اسی دوران سیاسی جماعتوں کے مطالبے پر نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈران کو جیل سے رہائی ملی اور حیدر آباد ٹریبونل ختم کیا گیا اور نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈران پر سے مقدمات ختم کئے گئے ان تمام لیڈران نے رہائی کے بعد نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور تھوڑے وقت بعد بلوچ لیڈران میر غوث بخش بزنجو، سردار عطاء اللہ مینگل، عبدالحی بلوچ اور دیگر لیڈران نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی سے علیحدگی اختیار کر لی اور لاہور میں جمع ہو کر اپنی الگ پارٹی پاکستان نیشنل پارٹی کی بنیاد رکھی جس کے صدر میر غوث بخش بزنجو بنے تھے۔ اس طرح بلوچستان کے لوگ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی سے الگ ہو گئے۔ جب ضیاء الحق کی مارشل لاء حکومت بنی تھی اس میں شمولیت نہیں کی۔ قومی اتحاد کی جماعتوں کو جنہوں نے بھٹو کے خلاف تحریک چلائی تھی دعوت دی گئی تھی۔ دیگر تمام جماعتیں ضیاء الحق کی مارشل
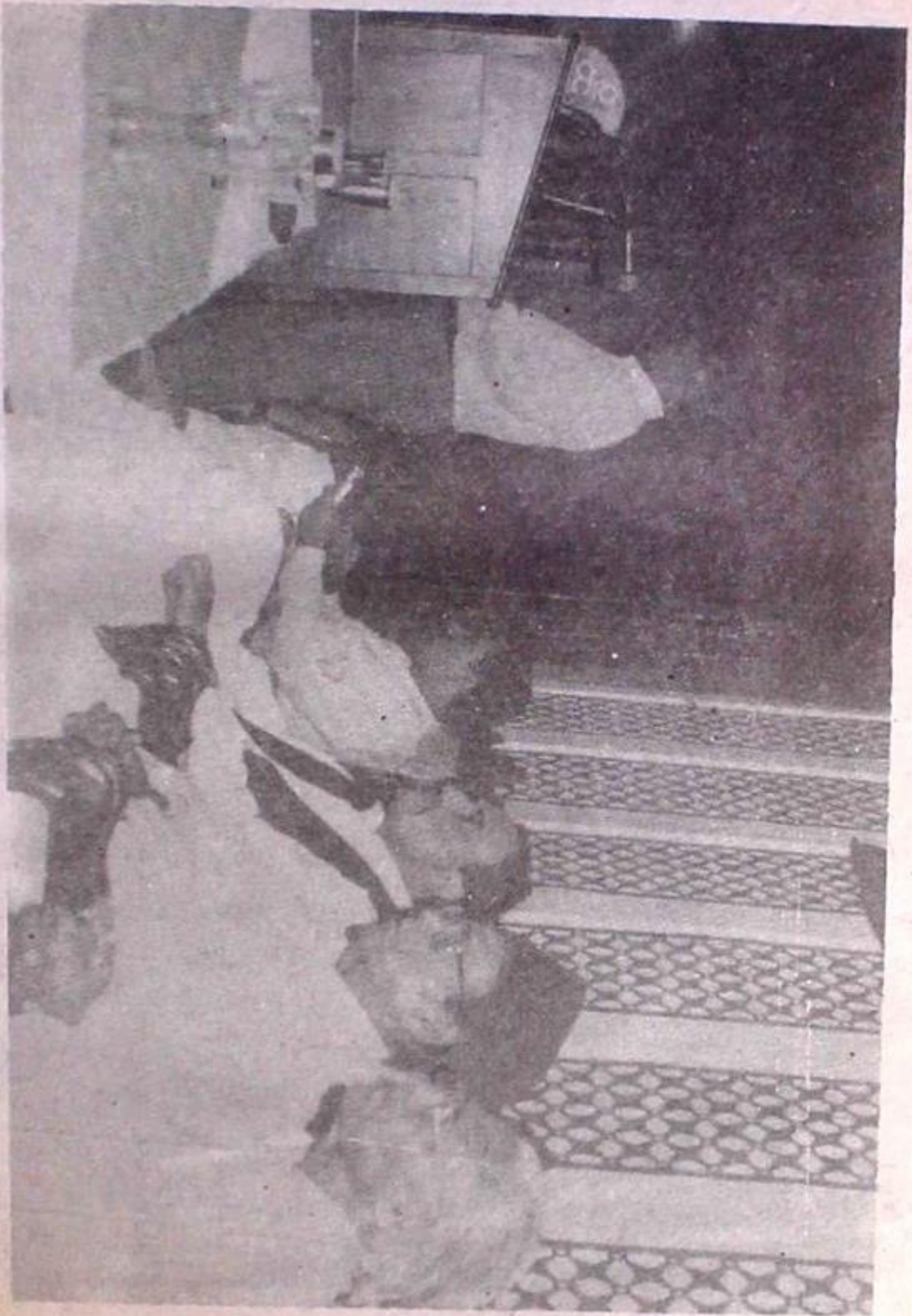
رانا مقبول، محمد اعظم ہوتی اور دیگر

بلخ شیر خان مزاری' فاروق قریشی اور جنرل فضل حق

لاء حکومت میں شامل ہو گئیں تھی مگر نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی نے حکومت میں شمولیت نہیں کی تھی۔ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے بانی جناب شیر باز خان مزاری ذہنی طور پر مسلم لیگی اور سرکار پرست تھے جب کہ نیشنل عوامی پارٹی کے لوگ یا اجزائے ترکیبی ان سے بالکل مختلف تھے۔ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل ہی وہ لوگ ہوئے تھے جو نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ وابستہ تھے اور پرانے قوم پرست بھی تھے ان کی سوچ میں اور ان کے کردار میں بہت بڑا فرق تھا۔ اس وجہ سے پارٹی کے بانی جناب شیر باز خان مزاری اور نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل ہونے والے قوم پرستوں کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اجلاسوں میں میٹنگوں میں یہ سوچ کا اختلاف سامنے آتا رہتا تھا۔ اور بعض وقت یہ اختلاف شدت بھی اختیار کر جاتا۔ 1987ء میں بادشاہ خان کراچی جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ دیگر لوگوں کے علاوہ جناب خالق خان بھی تھے ہم بادشاہ خان کی ملاقات کے لئے گوجرانوالہ سٹیشن پر پہنچے۔ بادشاہ خان اور دیگر دوستوں سے ملاقات کرنے کے دوران راقم الحروف کو خالق خان نے بتایا کہ بہت جلد نئی پارٹی تشکیل ہو رہی ہے جس کا نام عوامی نیشنل پارٹی ہو گا۔

عوامی نیشنل پارٹی

نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی میں قوم پرستوں جن کی تعداد 99 فیصد تھی نے الگ ہو کر عوامی نیشنل پارٹی کی بنیاد رکھی۔ قوم پرستوں سے الگ پارٹی بنا لینے کی وجہ سے نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی نام کی پارٹی رہ گئی تھی اور بعد میں اس کا نام بھی ختم ہو چکا ہے۔ عوامی نیشنل پارٹی کا کنونشن 1987ء کو کراچی میں جناب حاکم علی زرداری کی کوٹھی پر ہوا تھا۔ اس کنونشن میں پارٹی کا نام بھی رکھا گیا تھا اور پارٹی قائم بھی کی گئی تھی۔ اس کنونشن میں قوم پرستوں کے علاوہ مزدور کسان پارٹی کے سردار شوکت علی گروپ' رسول بخش پلیجو کی عوامی تحریک' قومی محاذ آزادی کے لطیف آفریدی اور معراج محمد خان بھی شامل ہوئے تھے۔ اور عوامی نیشنل پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ پہلے پارٹی کے صدر جناب ولی خان صاحب اور جنرل سیکرٹری سردار شوکت علی صاحب بنے تھے۔

نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے وقت جب ولی خان اور ان کے تمام ساتھیوں کو رہا کیا گیا اور حیدر آباد ٹربیونل جو کہ نیشنل عوامی پارٹی کے لوگوں کے خلاف مقدمات کی سماعت کے لئے بنایا گیا تھا توڑ دیا گیا اور ذوالفقار علی بھٹو کو حکومت نے گرفتار کر لیا تھا۔ اس وقت خان عبدالولی خان نے کہا تھا کہ پہلے احتساب بعد میں انتخاب ہونا چاہئے۔ ذوالفقار علی بھٹو سانپ ہے فوجی بوٹوں کے نیچے آ گیا ہے۔ اگر کچل دیا گیا تو فوجی بچ جائے گا اور اگر چھوڑ دیا گیا تو فوجی مارا جائے گا۔ پاکستان کے قوم پرستوں جو 1945ء میں مسلم لیگ کے مقابلہ میں الیکشن ہار جانے کی وجہ سے پاکستان بن جانے کے بعد وہ معتوب قرار دیئے گئے تھے۔ صوبہ سرحد میں ان کی پوزیشن لوگوں میں کافی مضبوط تھی۔ 1945ء کا الیکشن بھی انہوں نے جیتا تھا۔ وہ پاکستان بن جانے کے بعد معتوب قرار دیئے گئے۔ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں خان عبدالقیوم خان جب صوبہ سرحد کے وزیر اعظم تھے ان پر بہت زیادہ ظلم ہوا تھا۔ بھٹو کے خلاف جناب ولی خان کا بیان فطری عمل تھا۔

اجمل خٹک، سی آر اسلم، راو مہروز اختر، عبداللہ ملک
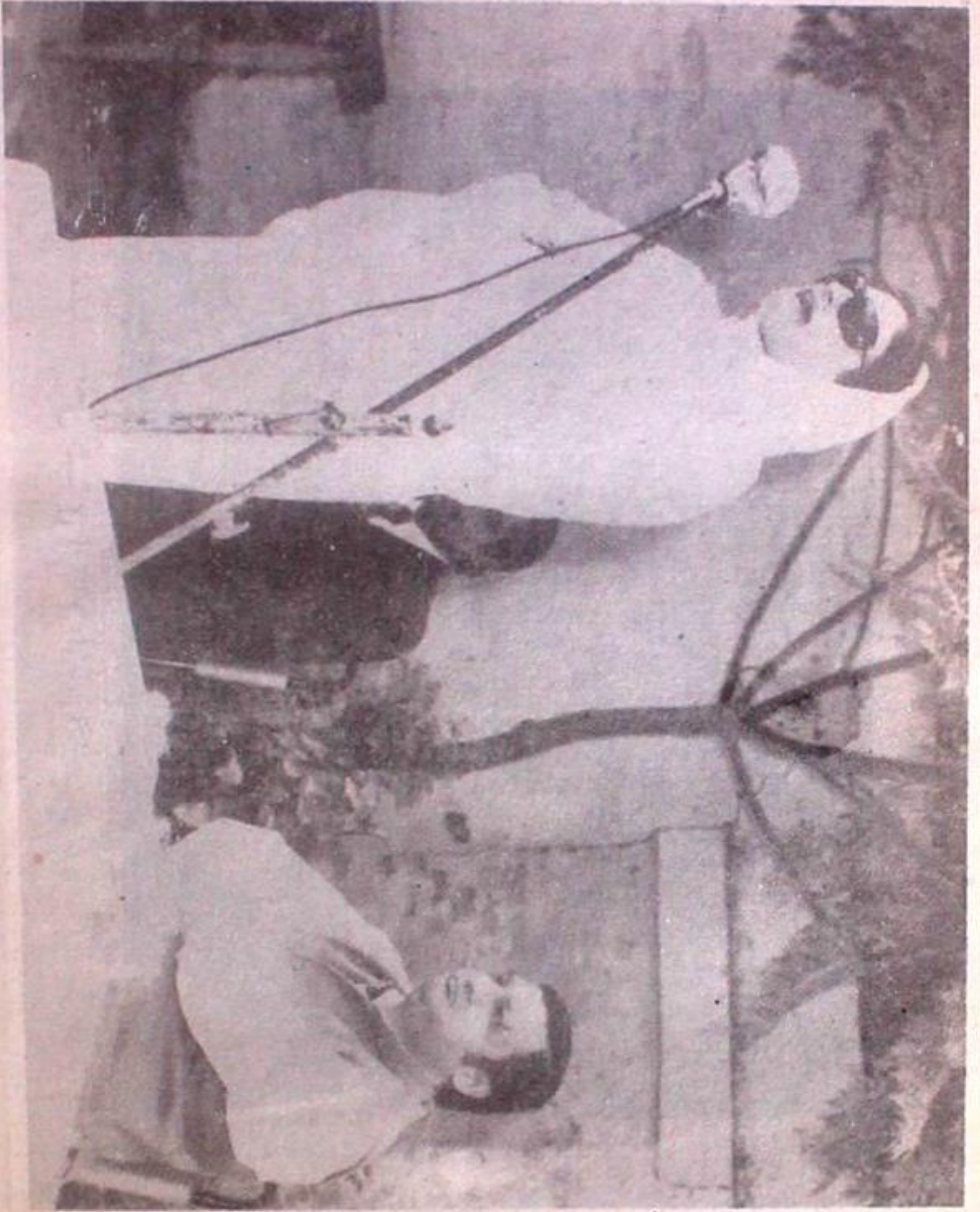
نسیم ولی خان اور محمد فاروق، قریشی

بادشاہ خان کی وفات

جناب خان عبدالغفار خان جنہیں صوبہ سرحد کے لوگ احترام سے بادشاہ خان بھی کہتے تھے انہوں نے تقریباً 78 سال ملکی سیاست پر عموی طور پر اور صوبہ سرحد کی سیاست پر خصوصی طور پر بھرپور اثر ڈالا ہے۔ انہوں نے تمام زندگی سازش کی سیاست نہیں کی۔ ان کی جو بھی بات ہوتی تھی ڈنکے کی چوٹ ہوتی تھی۔ انہوں نے تحریک آزادی میں بھرپور کردار ادا کیا۔ وہ تمام زندگی صعوبتیں برداشت کرتے رہے مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ ہمیشہ جوانمردی کے ساتھ اپنی بات کہتے رہتے۔ ناموافق حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ راقم الحروف نے چند دوستوں کے ساتھ 1987ء میں ولی باغ ان کی رہائش گاہ میں ملاقات کی تھی۔ گزری ہوئی زندگانی کے کئی واقعات ہمیں سنائے تھے وہ اس وقت 98 سال کی عمر میں بھی عزم و ہمت کے پیکر تھے۔

جنوری 1988ء کے ایک روز بادشاہ خان اس دارفانی سے رحلت فرما گئے تھے۔ شام کے وقت گوجرانوالہ کے جواں سال نسیم چوہدری صاحب تشریف لائے اور افسردگی کی حالت میں کہنے لگے آپ نے سن لیا ہے میں نے کہا کیا وہ کہنے لگے کہ بادشاہ خان انتقال فرما چکے ہیں اور ان کی نماز جنازہ کل دو بجے بعد دوپہر پشاور کے کننگھم پارک میں ادا کی جائے گی۔ اس وقت بادشاہ خان کے جنازے میں شرکت کے لئے پشاور جانے کی تیاری شروع کر دی گئی اور بھی گوجرانوالہ سے چند دوست تیار ہو گئے تھے۔ دس ساتھی بذریعہ خیبر میل برائے پشاور رات کو روانہ ہو گئے صبح کے وقت ہم پشاور پہنچ گئے۔ بادشاہ خان کی میت کننگھم پارک میں ہی رکھی ہوئی تھی۔ ہم نے پہلی فرصت میں بادشاہ خان کی میت کے آخری دیدار کئے۔ سب لوگ قطار میں جا کر میت دیکھتے تھے اور دوپہر کے وقت تو زائرین کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی جو کہ کننگھم پارک سے لے کر گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے اڈے تک تھی یہ فاصلہ تقریباً ایک میل کا بنتا ہے اس روز پشاور میں بارش ہو رہی تھی لوگ لاکھوں کی تعداد میں بارش میں ہی سوگوار عقیدت کا نذرانہ دینے کے لئے ہجوم در ہجوم موجود تھے۔ جنازے میں شمولیت کے لئے لاکھوں لوگوں اور صوبہ سرحد کی سیاسی شخصیات کے علاوہ پاکستان کی سیاسی شخصیات جن میں نواب زادہ نصراللہ خان، ملک قاسم، مولانا فضل الرحمن، مولانا سمیع الحق اور دیگر بہت ساری شخصیات کے علاوہ پاکستان کے وزیر اعظم جناب محمد خان جونیجو مرحوم صدر پاکستان جناب ضیاء الحق صاحب مرحوم اور صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ جناب ارباب جہانگیر اور ان کی کابینہ بھی شامل تھی۔ قبل ازیں جب ایک روز قبل بادشاہ خان کی موت کی خبر بھارت میں پہنچی تھی تو اسی وقت تمام مصروفیات ترک کر کے بھارت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی بھی اظہار افسوس کے لئے ان کی میت پر پھول چڑھانے کے لئے پشاور پاکستان آئے تھے اور بھارتی حکومت نے چالیس یوم تک ان کا سوگ منانے کا فیصلہ کیا تھا۔ پشاور میں جس وقت ان کا جنازہ ہو رہا تھا اس وقت موسلا دھار بارش تھی بارش میں ہی نماز جنازہ ادا کی گئی تھی اور صوبہ سرحد کی حکومت نے تین دن تک ان کا سوگ منایا تھا ریڈیو، ٹیلی ویژن پر قرآن خوانی ہوتی رہی تھی۔ ناچ، گانے، ڈرامے نہیں دکھائے گئے تھے

بادشاہ خان نے زندگی میں ہی وصیت کی تھی کہ مجھے جلال آباد میں دفن اس مکان میں کیا جائے جہاں میں نے زندگی کا بہت وقت گزارا ہے اس لئے ان کی میت جلال آباد لے جائی گئی۔ جلال آباد
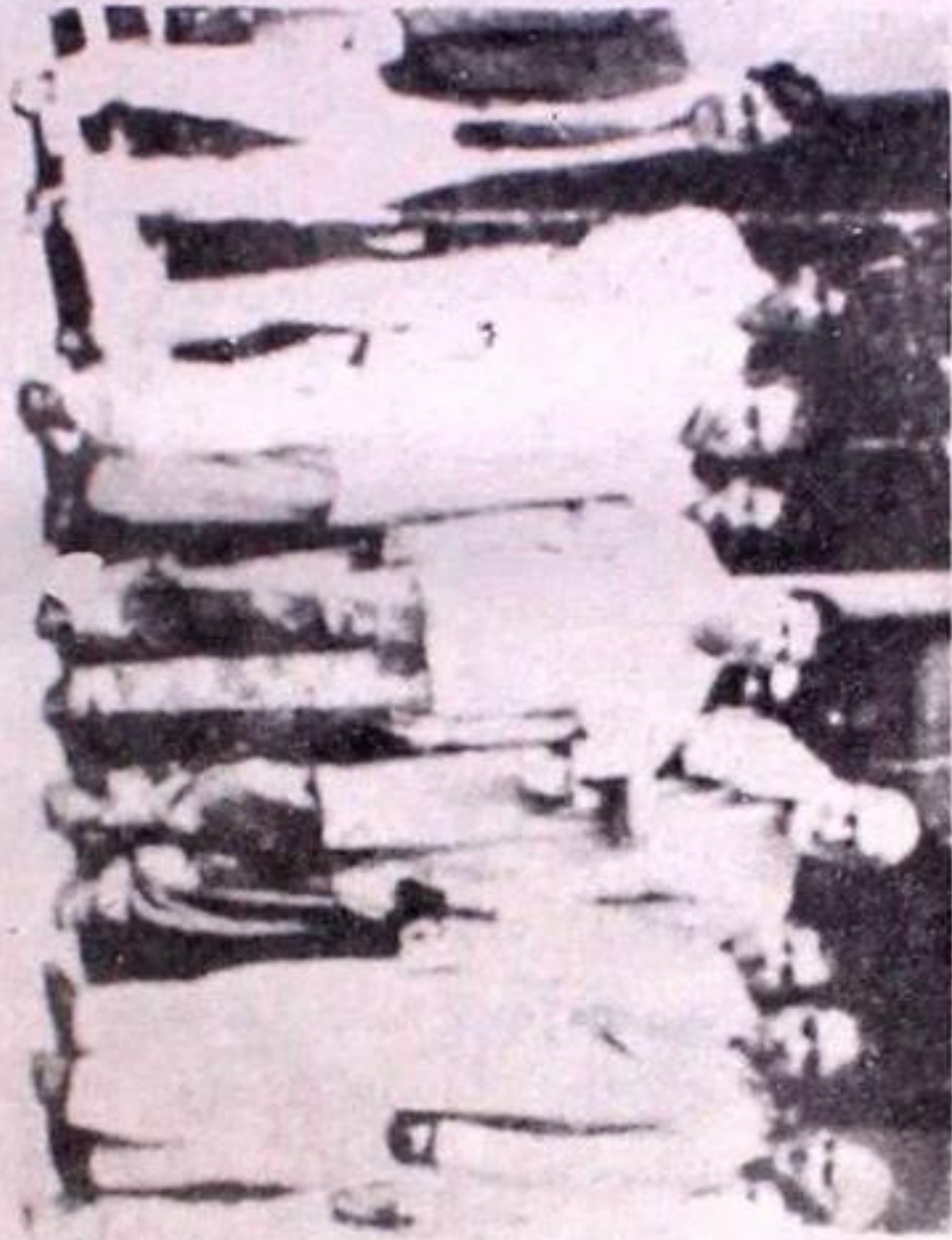
خان عبدالغفار خان اپنے پارٹی کارکنان کے ساتھ

ان کی میت کے ساتھ تقریبا 2600 گاڑیوں کا بہت بڑا جلوس گیا تھا۔ راقم الحروف بھی جلال آباد ماتمی جلوس کے ساتھ گیا تھا۔ ہماری گاڑی جس وقت پاک افغان سرحد تورخم سے گزری تو وہاں پر کچھ ہندوستانی لیڈر جن میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ بھی شامل تھے میت کے منتظر کھڑے تھے جب یہ ماتمی جلوس افغانستان کی حدود میں داخل ہوا تو جنگی ہیلی کاپٹر جلوس کے اوپر حفاظتی اقدامات کے تحت پرواز کر رہے تھے۔ راستے میں بھی ہم نے کئی جگہوں پر دیکھا تھا کہ فوجی مختلف جگہوں پر بھاری اسلحہ کے ساتھ پہرا دے رہے تھے اس وقت بظاہر سرحدات کے علاقوں میں امن ہی معلوم ہوتا تھا۔ تورخم سے جلال آباد جاتے ہوئے مغرب کی جانب پاک افغان سرحد بھی قریب ہی ساتھ ساتھ جاتی ہے اس وقت افغانستان میں پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کے ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت تھی اور پاکستان سے ڈاکٹر نجیب کی حکومت کے خلاف گوریلا جنگ ہو رہی تھی جب یہ ماتمی قافلہ جلال آباد پہنچا تو بشمول ڈاکٹر نجیب اللہ صدر افغانستان کے افغان حکام نے استقبال کیا۔ بادشاہ خان کی میت کو ماتمی گاڑی سے اتار کر توپ گاڑی پر رکھا گیا فوجی بینڈ ماتمی دھنیں بجاتا ہوا ماتمی جلوس کے آگے جا رہا تھا اس جلوس میں پاکستان افغانستان کے لیڈروں کے علاوہ بھارت کے لیڈروں بشمول بھارت کے نائب صدر جناب وینکٹ رامن کشمیر کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ' مسز ارونا' آصف علی اور دیگر بہت سارے لیڈران موجود تھے یہ ماتمی جلوس تھوڑے وقت میں ہی تدفین کی جگہ پر پہنچ گیا یہ جگہ بہت ہی خوبصورت رہائشی کوٹھی تھی جس میں بادشاہ خان جب بھی جلال آباد جاتے تو رہا کرتے تھے۔ یہ حکومت افغانستان کی ملکیت تھی اور حکومت نے یہ کوٹھی بادشاہ خان کو دے دی تھی اور بادشاہ خان کی وصیت کے مطابق انہیں اس کوٹھی میں دفن کیا گیا تھا۔ تدفین کے وقت پاکستان بھارت اور افغانستان کے لیڈران نے بادشاہ خان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ 21 توپوں کی سلامی دی گئی اسی دوران جب توپوں کی سلامی دی جا رہی تھی تو پاکستانی گوریلوں نے ماتمی جلوس کی کھڑی گاڑیوں پر دو راکٹ فائر کئے جس سے پانچ شخص موقعہ پر ہی ہلاک ہو گئے بہت سارے زخمی ہوئے۔ 20 گاڑیاں جل کر راکھ ہو گئی تھیں۔ ایک سو سے زائد جزوی طور پر تباہ ہوئیں۔ لوگوں میں خوف پیدا ہو گیا مگر تدفین کے عمل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ کام اور اجلاس جاری رہا۔ مقررہ وقت پر تدفین کا اجلاس ختم ہو گیا اور شرکائے ماتم نے واپس جانے کے لئے اپنی اپنی گاڑیوں کی تلاش شروع کر دی۔ گاڑیاں اس قدر زیادہ تھیں کہ ہمیں اپنی گاڑی ڈھونڈنے میں دو گھنٹے لگ گئے تھے جو گاڑیاں جل گئی تھیں ان کے مسافراں کو حکومت افغانستان نے تورخم تک پہنچانے کا انتظام کر دیا تھا جب یہ ماتمی قافلہ واپسی کے سفر پر تھا تو راستے میں توپوں کی گھن گرج کی خوفناک آوازیں آ رہی تھیں۔ پاکستان کی گوریلہ جنگ باز فورسز اور افغان حکومت کی فورسز کے درمیان مسلسل خوفناک جنگ ہو رہی تھی ماتمی جلوس کے لوگ بھی خوف اور دہشت میں مبتلا تھے خوف کے مارے میری حالت یہ تھی کہ منہ سے بات تک نہ نکلتی تھی ہر آن یہ خدشہ کہ ابھی ہماری گاڑی کسی بم کا نشانہ بن جائے گی اور بس کے ساتھ ہی انسانوں کے بھی پرخچے اڑ جائیں گے۔ جب تورخم کا بارڈر کراس کر لیا گیا تب ہوش و حواس ٹھکانے ہوئے۔ جان میں جان آئی اور جلال آباد والی خبر کے ماتمی جلوس کی گاڑیوں میں بمباری ہو گئی ہے تمام پاکستان کے ساتھ دنیا میں پھیل گئی تھی گھر والوں کو بذریعہ فون مطلع کیا کہ ہم زندہ ہیں۔
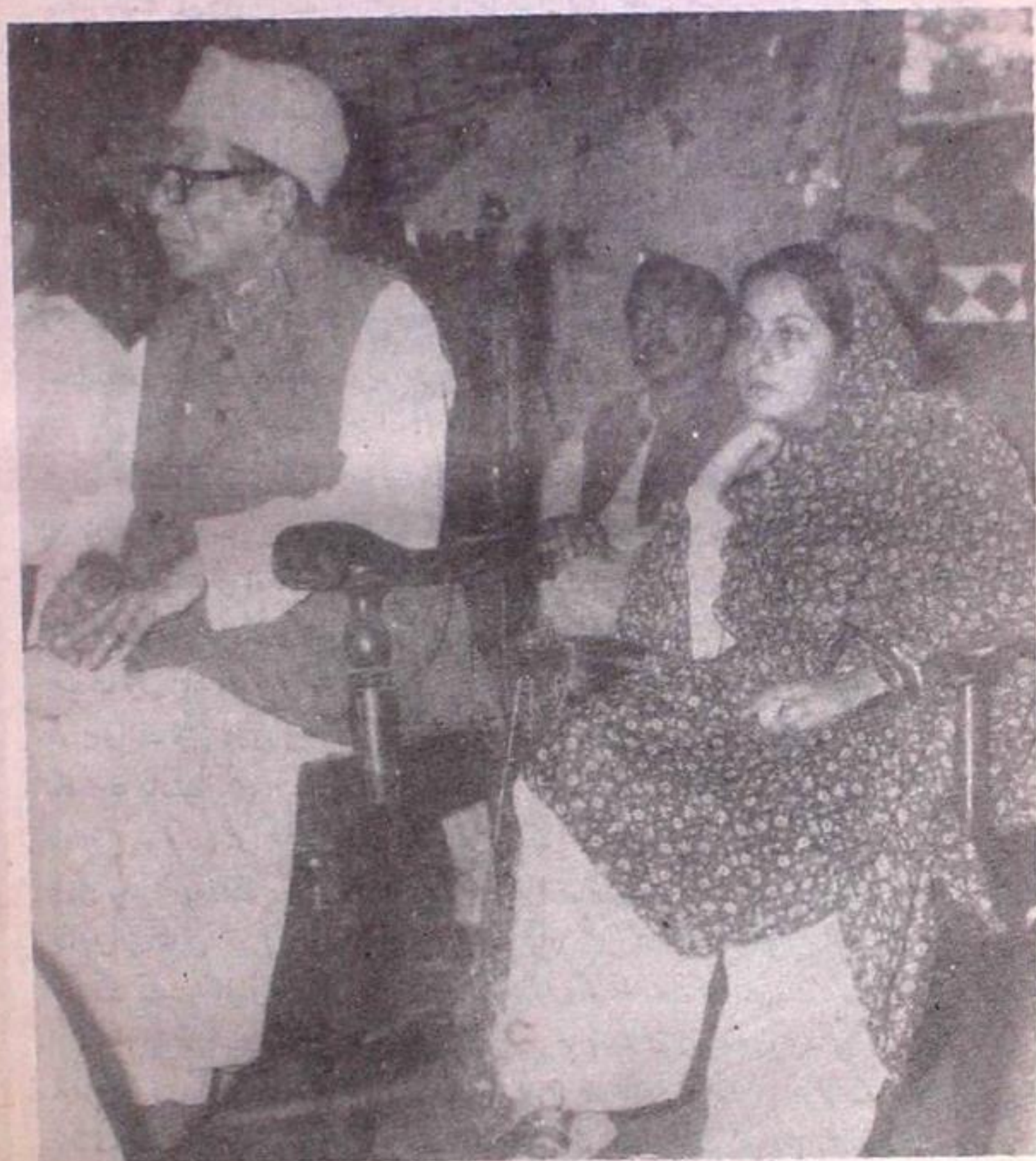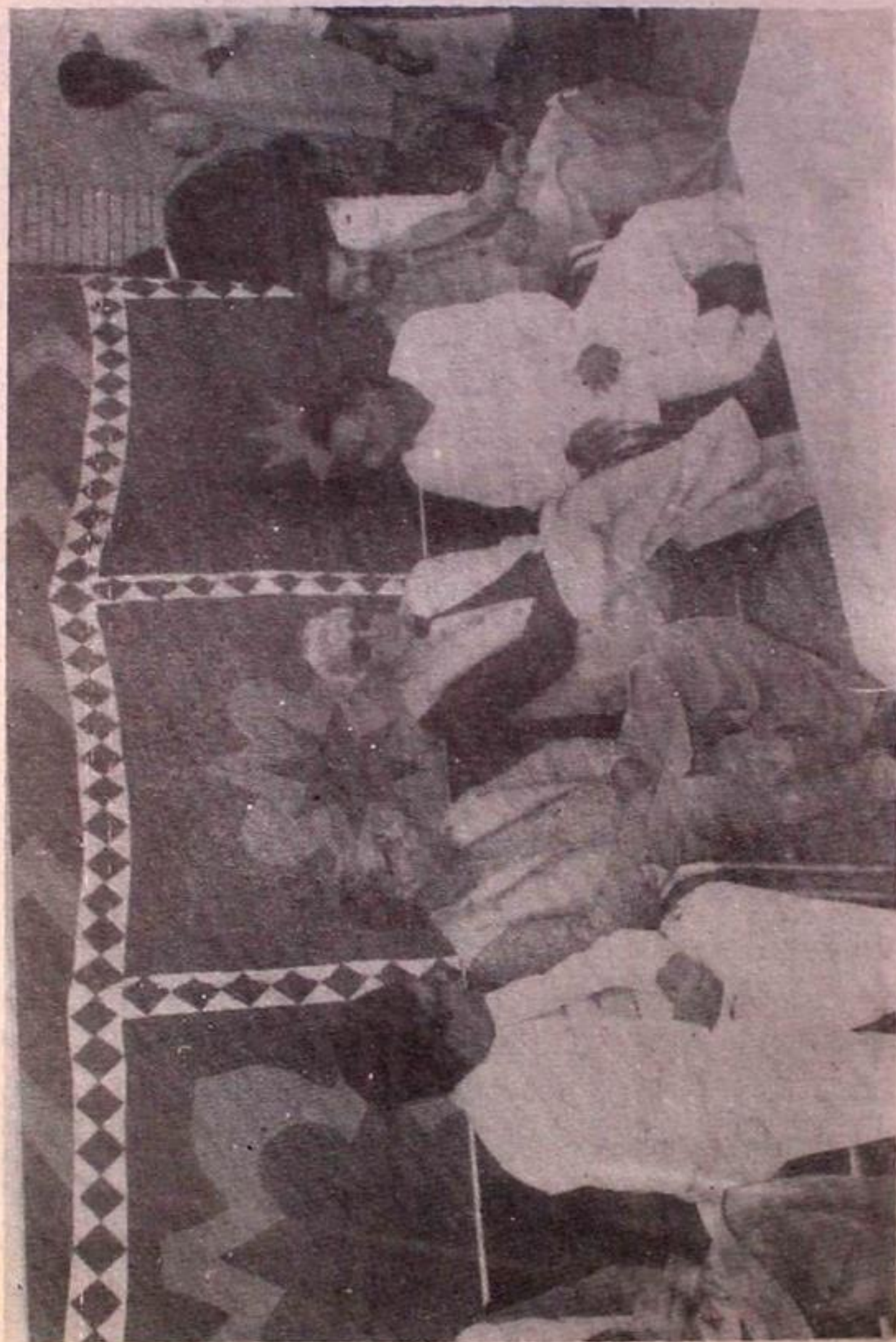
حاجی غلام احمد بلور، طارق لطیف، خان عبدالولی خان، سردار شوکت علی اور راؤ مہروز اختر

عوامی نیشنل پارٹی اور 1988ء کے انتخابات

بادشاہ خان کے انتقال اور وقت سوگ گزر جانے کے بعد عوامی نیشنل پارٹی پھر متحرک ہو گئی ملک میں اس وقت جنرل ضیاء الحق کی حکمرانی تھی 1988ء میں ہی کچھ واقعات جن میں اوجڑی کیمپ کا واقع بھی شامل تھا ملک کے وزیراعظم جناب محمد خان جونیجو تھے۔ کہتے ہیں کہ چند ایک فوجی افسران اور چند سیاست دانوں کا کچھ تنازعہ ہوا۔ یہ خبر جنرل ضیاء الحق تک گئی جنرل ضیاء الحق صاحب نے وزیراعظم جونیجو کو بلایا اور فوجی افسران کی توہین کا گلہ کیا وزیراعظم صاحب نے سیاسی لوگوں کی توہین کا گلہ کیا اختلاف کچھ زیادہ ہو گئے آخر مئی 1988ء میں محمد خان جونیجو کی حکومت پر بد دیانتی' اقربا پروری اور دیگر بہت سارے الزام لگا کر ساتھ ہی قومی اسمبلی کو بھی برطرف کر دیا گیا اور 90 دن کے اندر الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا گیا۔ پہلے تو یہ الیکشن جماعتی بنیادوں پر کرانے کا اعلان کیا گیا تھا مگر جب جنرل ضیاء الحق صاحب کو پتہ چلا کہ وہ جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرا کے اپنی خواہش کے مطابق نتائج حاصل نہیں کر سکتے تو انہوں نے غیر جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا اس اعلان کے ساتھ ہی ملک کی سیاسی فضا میں جمود آ گیا اور سیاسی جماعتوں کے پروگراموں پر مایوسی چھا گئی اور پھر 17 اگست 1988ء کے روز جناب ضیاء الحق صاحب بہاولپور کے قریب ہوائی حادثہ کا شکار ہو کر راہی ملک عدم ہو گئے۔ نئے صدر جناب غلام اسحاق خان نے ملک میں جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا۔ عوامی نیشنل پارٹی نے 1988ء کے انتخابات میں حصہ لیا۔ قومی اسمبلی کے لئے صرف تین ممبر منتخب ہوئے جب کہ صوبائی اسمبلی کے لئے 13 ممبر کامیاب ہوئے۔ مرکز اور صوبے میں پیپلز پارٹی کے ساتھ الحاق کیا مگر یہ الحاق صرف چند ماہ تک چل سکا تھا پھر دونوں پارٹیوں میں بہت زیادہ اختلاف پیدا ہو گئے جو وزیر سرحد کی کولیشن حکومت میں شامل تھے وہ پارٹی کے حکم کے مطابق وزارتوں سے الگ ہو گئے اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ دونوں پارٹیوں میں خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی سیاسی دشمن بن گئیں۔ دونوں پارٹیوں کے اختلاف کی اصل وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اے این پی کے ممبران کو پیپلز پارٹی کی حکومت میں وزیر تو بنا لیا مگر اختیار نہیں دئے گئے تھے۔ دیگر یہ کہ پیپلز پارٹی والو ں نے عوامی نیشنل پارٹی کے کارکنوں کو لالچ وغیرہ دے کر اپنے ساتھ ملانا شروع کر دیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں پیپلز پارٹی عوامی نیشنل پارٹی کو ختم ہی کر دینا چاہتی تھی ان تمام وجوہات کی بناء پر پیپلز پارٹی اور اے این پی دور بہت دور ہو گئیں۔ اے این پی نے 1990ء میں مسلم لیگ نواز گروپ کے ساتھ مل کر الیکشن میں حصہ لیا تھا جس کے نتیجہ میں قومی اسمبلی میں سات نشستوں پر عوامی نیشنل پارٹی نے کامیابی حاصل کی تھی۔ سرحد اسمبلی میں 80 کے ہاؤس میں 22 نشستیں حاصل ہوئیں۔ سینٹ میں چار ممبر بنے تھے 1990ء میں صوبہ سرحد میں عوامی نیشنل پارٹی اور مسلم لیگ نواز گروپ کے میر افضل خان وزیر اعلیٰ بنے تھے اور جب تک 1990 کی اسمبلی اور وزارت قائم رہی اور دونوں جماعتوں کی کولیشن بھی قائم رہی۔ 1993ء میں صدر محمد اسحاق نے قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں توڑ دیں۔ نئے الیکشن کا اعلان بھی کیا گیا تھا مگر سپریم کورٹ کے فیصلہ پر دوبارہ وزارتیں اور اسمبلیاں بحال کر دی گئیں پھر از خود کسی بہت بڑے دباؤ کے تحت نواز شریف کی مرکزی حکومت اور چاروں صوبائی حکومتیں مستعفی ہو گئیں۔ معین قریشی صاحب کو نگران وزیر اعظم پاکستان بنا دیا گیا 1993ء میں الیکشن ہوئے اس کے
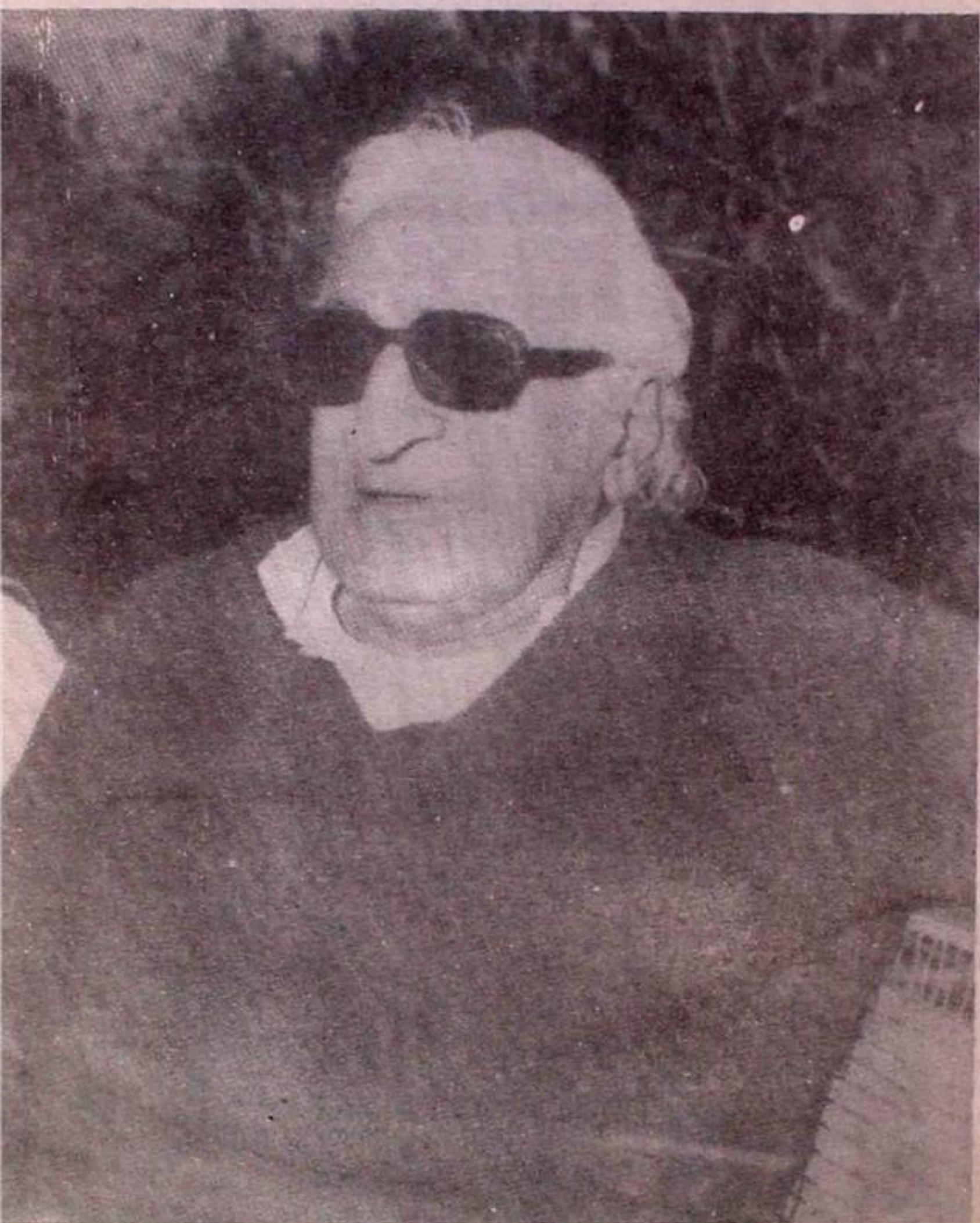
خان عبدالولی خان
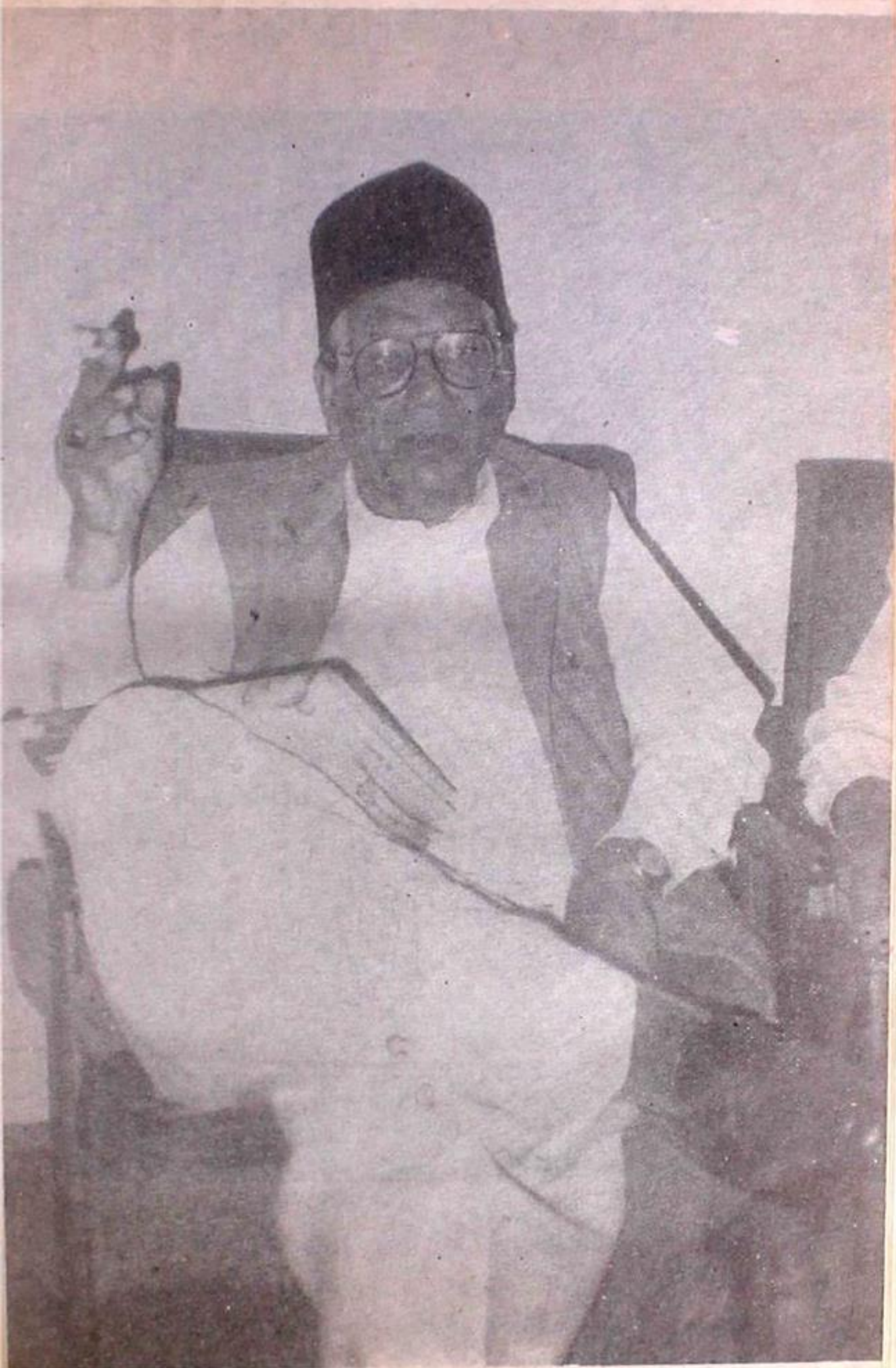
راو مہروز اختر

نتیجے میں عوامی نیشنل پارٹی کو قومی اسمبلی میں صرف تین نشستیں اور صوبہ سرحد اسمبلی میں 21 نشستیں ملیں اور سینٹ میں پانچ نشستیں ہو گئیں۔ 1994ء کے ابتدائی ایام میں عوامی نیشنل پارٹی اور مسلم لیگ کی کولیشن حکومت بنی تھی اور اس وزارت کو ممبران کی اکثریت حاصل تھی یہ وزارت دو ماہ تک کام کرتی رہی اس کے بعد گورنر نے اس کولیشن حکومت کو برطرف کر دیا اور سرحد اسمبلی کو بھی معطل کر دیا۔ پیپلز پارٹی کی مرکز میں حکومت تھی اس دوران پیپلز پارٹی نے مسلم لیگ کے دو اور عوامی نیشنل پارٹی کا ایک ممبر توڑ لیا۔ جب پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کر لی تو گورنر سرحد نے پیپلز پارٹی سرحد اسمبلی کے لیڈر آفتاب احمد خان شیرپاؤ کو حکومت بنانے کی دعوت دی گئی لور شیرپاؤ نے آہستہ آہستہ اکثریت بنا لی۔ اس وقت بھی صوبہ سرحد میں آفتاب احمد شیرپاؤ پیپلز پارٹی کے وزیر اعلیٰ ہیں۔ عوامی نیشنل پارٹی حزب اختلاف میں ہے مسلم لیگ نواز گروپ اس وقت پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف متحرک ہے اور عوامی نیشنل پارٹی بھی نواز لیگ کی تحریک میں پورا پورا ساتھ دے رہی ہے اس وقت عوامی نیشنل پارٹی کے صدر اجمل خٹک ہیں۔

تنقید و تبصرہ

خدائی خدمت گار نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی' عوامی نیشنل پارٹی ایک ہی گروہ کے مختلف وقتوں میں نام ہیں ان کی ابتداء تحریک آزادی کی جدوجہد سے ہوتی ہے۔ یہ لوگ ملک کے جس خطہ میں بھی تھے انگریز حکومت کے خلاف متحرک تھے۔ یک جہتی کی وجہ بھی انگریز دشمنی تھی مگر ان لوگوں کی بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ مسلمانوں کی قیادت مجموعی طور پر ان کے ہاتھ نہ آسکی۔ دوسرے لفظوں میں انگریز پرست سیاست دان انگریز کے خطاب یافتہ انعام یافتہ مراعات یافتہ اور مسلم نوکر شاہی نے جذباتی نعروں کے ذریعے لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ تحریک آزادی کے ساتھ وابستہ لوگوں کا صرف ایک نعرہ تھا کہ "انگریزو! ہمارے ملک سے نکل جاؤ" صرف اس ایک مطالبہ کے لئے وہ قید و بند کی صعوبتیں جان و مال کی قربانیاں بھی دے رہے تھے۔ سرکار انگلشیہ کا انعام یافتہ' مراعات یافتہ' خطاب یافتہ طبقہ جو مسلم لیگ کے نام پر متحد تھا' وہ انگریز سرکار سے فائدہ بھی حاصل کر رہا تھا اور سیاست بھی اس کے اشارے پر کر رہا تھا وہ جذباتی نعروں کے ذریعے مسلمانوں کو غیر مسلموں سے برگشتہ بھی کر رہا تھا فرقہ واریت کو ہوا بھی دے رہا تھا۔ انگریز کو لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر چلتے ہوئے مسلم اور غیر مسلم کو آپس میں لڑا بھی رہا تھا اور اس کے عوض سرکار انگلشیہ سے انعام و اکرام' خطاب اور نوکریاں بھی حاصل کر رہا تھا جبکہ قوم پرست مسلمان تمام مسائل کا حل صرف انگریز سے آزادی حاصل کرنے کو بتا رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہماری تمام مصیبتوں کی وجہ انگریز حکمران ہیں۔ اگر انگریز سے آزادی حاصل ہو جائے گی تو تمام مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے اور مسلم لیگ والوں نے مسائل کا حل تقسیم ہند میں بتایا اور بالآخر ہندوستان تقسیم ہو گیا اور پاکستان بن گیا۔ تحریک آزادی کے ساتھ وابستہ قوم پرست مسلمان اپنے کاز میں مخلص تھے' دیانت دار تھے مگر وہ سیاست میں مات کھا گئے اور ان کی جو سیاسی طاقت تھی وہ بھی پاکستان کے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ہی تھی حکومت پاکستان کے ایماء پر اخبارات میں ریڈیو پر ان کی کردار کشی 1947ء سے ہی شروع کر دی گئی تھی۔ آج 48 سال گزر جانے کے بعد یہ صورت حال
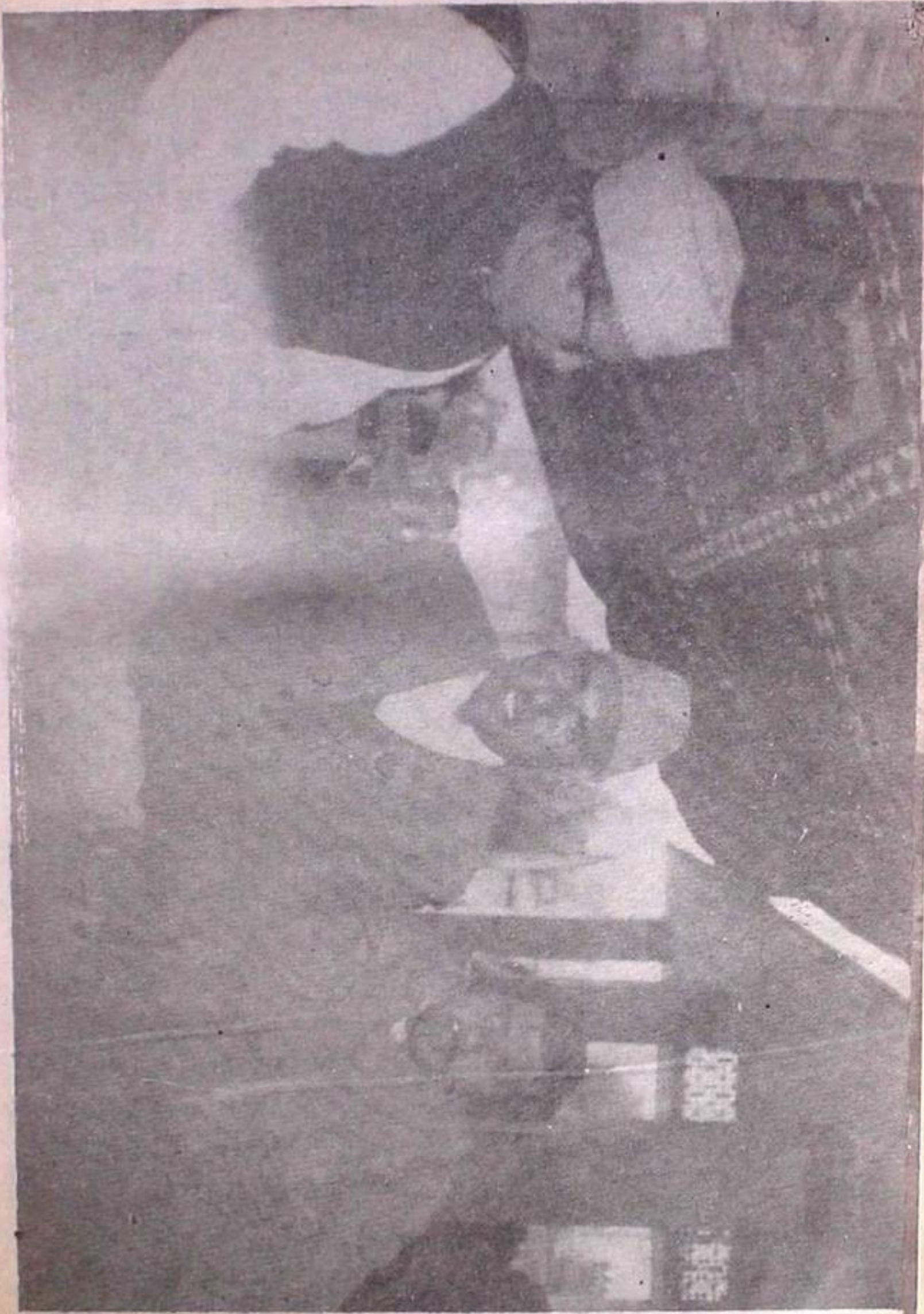
محمد افضل خان۔ راؤ مہروز اختر

ہے کہ پنجاب میں خصوصی طور پر جو پاکستان کی 62 فیصد آبادی کا صوبہ ہے پھر سندھ میں بھی قوم پرست مسلمان سیاست دانوں کو غدار اور بدکردار بنا کر پیش کیا گیا ہے اور لوگوں نے بھی قوم پرستوں کو غدار اور بدکردار سمجھ کر یقین بھی کر لیا ہے اس لئے پاکستان میں قوم پرستوں کی سیاست کا مستقبل تاریک ہے۔

پختون خواہ عوامی نیشنل پارٹی حقیقی

اس جماعت کے سرکردہ لیڈران جناب محمد افضل خان وزیر برائے امور کشمیر اور ارباب جہانگیر خان، محمد افضل خان جو اس وقت پیپلز پارٹی کی مرکزی حکومت میں وزیر برائے امور کشمیر ہیں اور ارباب جہانگیر بھی قومی اسمبلی کے ممبر ہیں۔ محمد افضل خان 1987ء میں صوبہ سرحد عوامی نیشنل پارٹی کے صدر تھے۔ اور پارٹی اکابرین میں گنے جاتے تھے۔ جناب ولی خان جو کہ اس وقت عوامی نیشنل پارٹی کے صدر تھے۔ ان کے متبادل قائد کے طور پر جناب محمد افضل خان کو تسلیم کیا گیا تھا۔ 1988ء کے الیکشن کے نتیجہ میں عوامی نیشنل پارٹی نے پیپلز پارٹی کے ساتھ صوبہ سرحد میں مخلوط حکومت بنائی تھی۔ اس میں پیپلز پارٹی اور عوامی نیشنل پارٹی کا آپس میں معاہدہ ہوا تھا کہ اگر وزیر اعلیٰ سرحد پیپلز پارٹی کا ہو گا۔ تو گورنر عوامی نیشنل پارٹی کا ہو گا اس گورنری کے کے لئے دو امیدوار بن گئے تھے ایک افضل خان اور دوسرے خالق خان پارٹی کے زیادہ کارکن خالق خان کے ساتھ تھے۔ اس وجہ سے افضل خان عوامی نیشنل پارٹی سے دور ہوتے چلے گئے اور ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیپلز پارٹی نے جناب افضل خان کو اپنے بہت قریب کر لیا۔ 1990ء کے الیکشن میں جناب محمد افضل خان قومی اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ انکی حمایت پیپلز پارٹی نے بھی کی تھی اور انہوں نے اپنا الحاق پیپلز پارٹی کے ساتھ رکھا اور جب تک پیپلز پارٹی حزب اختلاف میں رہی وہ بھی حزب اختلاف میں رہے۔ 1993ء کے انتخابات میں جناب محمد افضل خان قومی اسمبلی کے پھر ممبر بن گئے اس دفعہ ارباب جہانگیر بھی جو قبل ازیں عوامی نیشنل پارٹی کے ساتھ تھے عوامی نیشنل پارٹی سے الگ ہو کر محمد افضل خان کے ساتھ مل گئے اور 1993ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی کی حمایت سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔ محمد افضل خان اور ارباب جہانگیر خان دونوں پختون عوامی نیشنل پارٹی حقیقی کے لیڈر ہیں پیپلز پارٹی کے ساتھ وابستہ ہیں انکی یہ سیاسی پارٹی انکی ذاتی شخصیات کے گرد ہی گھومتی ہے عوام میں اس کی جڑیں نہیں اور یہ پارٹی بھی صوبہ سرحد تک محدود ہے۔

نیشنل عوامی پارٹی پختون خواہ گروپ

پاکستان نیشنل پارٹی اور پھر بعد میں نیشنل عوامی پارٹی بن جانے کی وجوہات میں ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ مغربی پاکستان کے ون یونٹ بن جانے کی وجہ سے چھوٹے صوبوں کے لوگوں اور لیڈروں نے محسوس کیا کہ مغربی پاکستان کا ایک صوبہ بن جانے کی وجہ سے اختیارات کا مرکز لاہور بن گیا اور چھوٹے صوبوں کو اپنے معاملات سلجھانے میں جو اختیارات انگریز کے وقت کے ملے ہوئے تھے وہ بھی

چھین لئے گئے ہیں۔ نیشنل عوامی پارٹی نے ون یونٹ کے خلاف جدوجہد کی بلاآخر یحیٰی خان نے برسراقتدار آتے ہی اپنی پہلی ریڈیائی تقریر میں مغربی پاکستان کے ون یونٹ توڑنے اور سابقہ صوبے بحال کرنے کا اعلان کر دیا حکومت کے اس اعلان کے ساتھ ہی نیشنل عوامی پارٹی کے منشور میں یہ واضح طور پر لکھا ہوا تھا کہ مغربی پاکستان کا ون یونٹ توڑ کر لسانی بنیادوں پر از سر نو صوبوں کی تشکیل کی جائے اور ان کو صوبائی خود مختاری دی جائے۔ خان عبدالصمد خان اچکزئی نیشنل عوامی پارٹی کے بڑے لیڈروں میں شمار ہوتے تھے پارٹی کے اندر ان کا مطالبہ یہ تھا کہ بلوچستان کے پختون علاقے کو بلوچ علاقے سے الگ کر کے ایک صوبہ بنایا جائے جس کا نام پختونستان رکھا جائے۔ ان کے اس مطالبے کو نیشنل عوامی پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے نہیں مانا اور کہا کہ جو کچھ اس وقت بڑی جدوجہد کے بعد ملا ہے اس پر ہی صبر شکر کیا جائے۔ دیگر مطالبات کسی اور وقت پر ملتوی کر دیے جائیں جب مناسب وقت ہو گا دیگر مطالبات بھی حکومت کے آگے پیش کریں گے اور جدوجہد بھی کریں گے۔ اسی اختلافات کی وجہ سے جناب عبدالصمد خان اچکزئی اور ان کے ساتھی سابقہ وردر پختون نیشنل عوامی پارٹی سے الگ ہو گئے۔ انہوں نے اپنی پارٹی کا نام نیشنل عوامی پارٹی پختون خواہ گروپ رکھ لیا اور 1970ء کے انتخابات بھی انہوں نے اسی نام سے نیشنل عوامی پارٹی کے خلاف لڑے تھے جس میں نیشنل اسمبلی کی سیٹ پر جناب عبدالصمد اچکزئی ہار گئے تھے۔ بلوچستان کی صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے تھے۔ یحیی خان کے دور حکومت میں جب عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں الیکشن جیت لیا تھا اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کامیاب ہو گئی تھی۔ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کا کوئی آئینی سمجھوتہ نہیں ہو رہا تھا مغربی پاکستان کی نیشنل عوامی پارٹی ولی گروپ اور بھاشانی گروپ بھی حکومت اور پیپلز پارٹی پر زور دے رہے تھے کہ وہ عوامی لیگ کے ساتھ ملک کے مستقبل کو بچانے کے لئے آئینی سمجھوتہ کریں مگر یحیی حکومت اور پیپلز پارٹی کسی قیمت پر بھی عوامی لیگ کے ساتھ آئینی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے۔ آخر حکومت نے عوامی لیگ کے ساتھ ہی نیشنل عوامی پارٹی کے تمام گروپوں کو خلاف قانون قرار دیا مگر تنظیمی طور پر نیشنل عوامی پارٹی کے یہ تمام گروپ متحرک رہے کسی سرکاری حکم کو دلی طور پر تسلیم نہیں کیا گیا۔ 1971ء کی جنگ کے بعد مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور بقیہ پاکستان پر مسٹر بھٹو برسراقتدار آ گئے تو عوام کے مطالبہ پر نیشنل عوامی پارٹی پر سے پابندی اٹھا لی گئی۔ بھاشانی گروپ جو کہ مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش میں رہ گیا تھا وہ تو الگ ہو گیا بقیہ نیشنل عوامی پارٹی مغربی پاکستان کے ولی خان گروپ اور پختون خواہ گروپ پھر متحرک ہو گئے ولی خان گروپ کی مرکزی اسمبلی میں سات ممبران کی نمائندگی تھی جبکہ سرحد اسمبلی میں 40 چالیس کے ہاؤس میں 14 ممبر تھے اور بلوچستان اسمبلی میں اکثریت حاصل تھی جب کہ پختون خواہ نیشنل عوامی پارٹی کے صرف خان عبدالصمد خان اچکزئی ہی بلوچستان اسمبلی کے ممبر تھے۔ ان کی ہمدردیاں تعاون پیپلز پارٹی کے ساتھ تھیں۔ اس وقت ابھی نیا ہی بنگلہ دیش بنا تھا۔ لوگوں میں مغربی پاکستان کے منتشر ہونے کا بھی اندیشہ تھا۔ بھٹو حکومت پر عوامی دباؤ بڑھنے لگا کہ نیشنل عوامی پارٹی کو ناراض نہ کیا جائے سرحد اور بلوچستان اگر ان کی اکثریت ہے تو انہیں حکومتیں دی جائیں۔ عوامی دباؤ کے تحت سرحد او بلوچستان میں نیپ اور جمعیت کی مخلوط حکومتیں قائم ہو گئیں۔ صرف دس ماہ بعد ہی پیپلز پارٹی کی مرکزی حکومت نے سرحد اور بلوچستان کی نیشنل عوامی پارٹی کی حکومتیں برطرف کر دیں اور ساتھ ہی نیشنل عوامی پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ اس میں خان عبدالصمد خان صاحب اچکزئی

کا گروپ نیشنل عوامی پارٹی، پختون خواہ بھی خلاف قانون قرار پائی۔ اس کے ساتھ ہی سپریم کورٹ آف پاکستان نے بھی نیشنل عوامی پارٹی کے خلاف قانون ہونے کی تائید کر دی۔ اب نیشنل عوامی پارٹی مستقل طور پر خلاف قانون جماعت بن گئی اور ساتھ ہی پختون خواہ گروپ نیپ بھی مستقل طور پر ختم ہو گیا۔
انہی ایام 1974ء میں ہی خان عبدالصمد خان اچک زئی کوئٹہ میں اپنی رہائش گاہ پر ٹھہرے ہوئے تھے کہ انہیں شہید کر دیا گیا۔ اور نیپ پختون خواہ کا ایک باب ختم ہو گیا

پختون خواہ ملی عوامی پارٹی

خان عبدالصمد خان اچکزئی کی وفات کے بعد پارٹی کی قیادت ان کے بیٹے محمود خان اچکزئی کے پاس آگئی انہو نے بہت جلد بلوچستان کے پختون نوجوانوں میں اثر رسوخ قائم کر لیا اور پارٹی کو نئی لائنوں پر منظم کرنے کے ساتھ ہی بانیاں پارٹی کا ایک اجتماع کوئٹہ میں کیا جس میں بہت سارے پختون نوجوان کے علاوہ جناب عبدالرحیم مندو میل، عبدالرزاق مرحوم، محمد جان اور ڈاکٹر کلیم اللہ بھی شامل ہوئے۔ متفقہ طور پر پختون خواہ عوامی ملی پارٹی کا سربراہ محمود خان اچکزئی صاحب کو بنایا گیا۔ خان صاحب نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت پارٹی میں نئی جان ڈال دی اور بہت جلد ہی پختون خواہ عوامی ملی پارٹی کا شمار بلوچستان کی مضبوط ترین پارٹیوں میں ہونے لگا۔ اس دوران پاکستان سے جمہوریت کی سیاست لپیٹ دی گئی اور ملک میں مارشل لا مسلط کر دیا گیا اور سیاسی پارٹیوں پر جمود طاری کر دیا گیا اور ملکی سیاست کے دھارے ہی بدل دیئے گئے جب تک جنرل ضیاء الحق زندہ رہے ملک پر مارشل لا بھی مسلط رہا۔ سیاسی پارٹیاں تو زندہ تھیں مگر انہیں بحیثیت جماعت کے اسمبلیوں میں جانے کا کوئی حق نہیں تھا بحیثیت جماعت نمائندہ اداروں کے الیکشن کرانے کا جنرل ضیاء الحق کے دور میں رواج ہی ختم کر دیا گیا تھا جنرل ضیاء الحق جب 1988ء میں ایک ہوائی حادثہ میں مارے گئے تو اس کے بعد نئے صدر پاکستان نے ملک میں جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانے کا اعلان کیا۔ 1988ء کے انتخابات میں صرف بلوچستان کی صوبائی اسمبلی میں دو نشستیں پختون خواہ عوامی پارٹی کو ملیں تھیں یہ دو ممبر نواب محمد اکبر خان بگٹی کی کولیشن حکومت میں شامل ہو گئے اور وزیر بھی بنے اور بعد میں کولیشن حکومت سے الگ ہو گئے۔

1990ء کے انتخابات میں پارٹی کے چیئر مین جناب محمود خان اچکزئی قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے اور صوبائی اسمبلی کے تین ممبر منتخب ہوئے اور مسلم لیگ کی جمالی کولیشن حکومت میں شامل ہوئے اور وزیر بھی بنے۔ سینٹ میں بھی ایک سیٹ ملی جس کے ممبر جناب عبدالرحیم مندوخیل بنے۔ 1991ء میں کوئٹہ شہر میں بلوچوں اور پختونوں کا تصادم ہوا تصادم کی وجہ یہ تھی کہ بوستان میں غیر ترقی یافتہ ممالک کی یورپین تنظیم کی طرف سے بوستان میں ایک زرعی کالج بنا تھا جس کے متعلق بلوچ کہتے تھے کہ کالج بلوچ علاقے میں بنایا جائے۔ جب کہ پختون خواہ عوامی پارٹی والے کہتے تھے کہ پختون علاقے بوستان میں بننا چاہئے اس تصادم کی وجہ سے شہر کوئٹہ میں ہڑتال ہو گئی بلوچوں اور پختونوں کا تصادم ہوا۔ تین آدمی مارے گئے اور کئی زخمی ہوئے اسی روز گیارہ اکتوبر 1991ء کو چند لوگ پختون خواہ عوامی

ملی پارٹی کے دفتر پر حملہ آور ہوئے جس کے نتیجہ میں مندرذیل پانچ پختون خواہ عوامی پارٹی کے ورکر شہید ہو گئے جن کے نام یہ ہیں صابر شاہ' عبدالرحیم چکوال' صاحب خان' باز محمد خان' حبیب الرحمن پختون خواہ عوامی ملی پارٹی فرقہ پرست یا مذھبی جماعت نہیں سیاست میں سیکولر نظریات رکھتی ہے دین اور مذھب کو انسان کا ذاتی اور انفرادی مسلہ سمجھتی ہے۔ پختون خواہ پارٹی بھارت اور دیگر ہمسائیہ ممالک کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے کی حامی تھے۔ افغانستان میں امن کی اور عدم مداخلت کی حامی ہے اور ان کا خیال ہے کہ افغانستان میں اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک لوگوں کی رائے سے ووٹ سے حکومت قائم نہ ہو جائے اور افغانستان میں بیرونی مداخلت ہر حالت میں بند ہونی چاہیے۔ پختون خواہ پارٹی والے الزام لگاتے ہیں کہ بلوچوں نے اپنے اسررسوخ کی وجہ سے بھٹو دور حکومت کی مردم شماری میں بلوچوں کی تعداد بڑھادی ہے اور پختونوں کو کم دکھایا ہے۔ 1993ء کے انتخابات میں پختوں عوامی ملی پارٹی کو بلوچستان کے پختوں علاقوں میں بہت نمایاں کامیابی ہوئی۔ پختون خواہ عوامی پارٹی کو پاکستان کی سینٹرل پارلیمنٹ میں تین نشستیں ملیں جو لوگ مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ان کے نام یہ ہیں جناب محمود خان اچکزئی' جناب ڈاکٹر حامد خان اچکزئی' جناب نواب ایاز خان جوگے زئی۔ بلوچستان کی صوبائی اسمبلی کے بختوں خواہ عوامی ملی پارٹی کے چار ممبر منتخب ہوئے جن کے نام یہ ہیں جناب ڈاکٹر کلیم اللہ صاحب' جناب عبدالحمید خان اچکزئی' جناب عبدالقہار خان ودان' جناب عبداللہ جان بابت

پختوں خواہ ملی عوامی پارٹی کے یہ صوبائی اسمبلی کے ممبران نواب ذوالفقار علی مگسی کی صوبائی کولیشن حکومت میں شامل ہیں اور یہ ممبر صوبائی حکومت میں اس وقت اگست 1994ء میں وزیر ہیں۔ پختون خواہ ملی عوامی پارٹی نواب ذوالفقار علی مگسی حکومت کی معاون ہے۔ اس وقت 1994ء میں پاکستان کی سینٹ میں پختوں خواہ ملی عوامی پارٹی کے دو ممبر ہیں ان کے نام یہ ہیں سینٹر جناب عبدالرحیم مندوخیل اور سینٹر جناب اکرم شاہ صاحب شامل ہیں۔ راقم الحروف اگست 1994ء کو صرف اسی مقصد سے کوئٹہ گیا تھا کہ وہاں کی سیاسی جماعتوں کے متعلق مطالعہ کرنے کے بعد لکھوں اس سلسلہ میں مورخہ 11-8-94 گیارہ اگست 1994ء کو بوقت دوپہر تقریبا گیارہ بجے جناح روڈ پر کوئٹہ میں پختوں خواہ عوامی ملی پارٹی کے دفتر میں حاضر ہوا دفتر میں کافی رونق تھی لوگ آجارہے تھے تقریبا 50 سے زائد لوگ اپنے کاموں کے لئے پارٹی عہدیداروں کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے پارٹی عہدیداروں کے آگے جھکے ہوئے اپنے اپنے مسائل اور تکالیف بیان کر رہے تھے پارٹی عہدیدار عوام کی تکالیف اور مسائل حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے میں بھی ایک پارٹی عہدہ دار کے آگے پیش ہو کر مدعا بیان کیا اور ماہنامہ جینے دو کا تعارفی کارڈ بھی پیش کیا مجھے کسی اور صاحب کی طرف بھیج دیا گیا جب میں ان صاحب کے پاس گیا تو انہوں نے کسی اور صاحب کے پاس بھیج دیا پھر مجھے کہا گیا کہ پارٹی کے صوبائی صدر آئیں گے آپ ان سے اپنا مدعا بیان کریں جب صوبائی صدر آگئے تو انہوں نے بھی کوئی توجہ نہ دی تقریبا ایک بجے تک مجھے کوئی کامیابی نہ ہوئی آخر کار ایک ورکر نما لیڈر سے جس کا نام میں بھول گیا ہوں انہوں نے مجھے یہ سب معلومات مہیا کئے ہیں اور ڈاکٹر خدا داد صاحب نے ان تمام تاریخی معلومات کی تصدیق کی ہے۔ سینٹ اور قومی اسمبلی میں اس وقت پختون خواہ ملی عوامی پارٹی کے ممبران کسی بھی کولیشن میں شامل نہیں ہیں وہ الگ آزاد حیثیت سے بیٹھے ہیں۔

پختون خواہ ملی عوامی پارٹی کے متعلق تاثرات

پختون خواہ ملی عوامی پارٹی وارث ہے جناب عبدالصمد خان اچکزئی کی خان صاحب نے سیاست کا آغاز جیسا کہ ہم نے انجمن وطن بلوچستان کے باب میں لکھا ہے کہ وہ قوم پرست راہنما تھے عدم تشدد کے مبلغ تھے کھدر پوش تھے انہیں بلوچستان کا گاندھی بھی کہا جاتا تھا وہ عظیم انسان راقم الحروف نے ان کے ساتھ نیپ کے وقت کئی دفعہ بیٹھک کی کئی مسائل پر گفتگو بھی کی انکے نظریات میں اور پنجاب کے نیپ کے ورکروں میں فرق تھا وہ کہتے تھے کہ بلوچستان کے مسائل الگ ہیں پنجاب کے مسائل الگ ہیں لیکن وہ تشدد کے حامی بالکل نہ تھے ان کے ہاتھ میں کبھی لاٹھی بھی نہ دیکھی گئی تھی مگر اس وقت ان کے جانشینوں کی جو حالت میں نے دیکھی ہے دنگ رہ گیا ہوں کہاں ایک درویش صفت ملنگ انسان کہاں دہشت گرد پختوں خواہ ملی عوامی پارٹی کے دفتر میں کئی نوجوان کلاشنکوفوں سے مسلح تھے اور ایسا منظر تھا کہ کوئی امن پسند شہری خوف زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کوئٹہ شہر میں ویسے تو ہر سیاسی جماعت کے جھنڈے جا بجا نظر آتے ہیں مگر پختوں خواہ پارٹی کے جھنڈے زیادہ ہیں اور ساتھ دیواروں پر زیادہ لکھا ہوا انہی کا نظر آتا ہے پختوں خواہ پارٹی صوبے کی تقسیم کی حامی ہے سڑکوں پر دیواروں پر پختونستان زندہ باد کے نعرے لکھے ہوئے نظر آتے ہیں

بلوچستان نیشنل مومنٹ ڈاکٹر جی گروپ

بلوچستان نیشنل مومنٹ کا کنونشن 1988ء میں کوئٹہ میں منعقد ہو جس میں مندرجہ ذیل شخصیات کے علاوہ سینکڑوں کارکن جمع ہوئے۔ کنونشن میں جناب فدا محمد خان شہید' ڈاکٹر عبدالحی بلوچ جناب ایوب صاحب' ڈاکٹر یاسین بلوچ' جناب منظور گچکی' ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ اور دیگر بہت سارے کارکنان جمع ہوئے جس میں بلوچستان نیشنل مومنٹ جماعت کی بنیاد رکھی گئی پارٹی کے بانی سربراہ کا درجہ جناب فدا محمد کو دیا گیا متفقہ طور پر جناب ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ کو صدر بنایا گیا جبکہ جنرل سیکرٹری جناب ایوب ختک' سنیئر نائب صدر جناب اختر مینگل کو بنایا گیا۔ جماعت سازی کے چند ماہ بعد ہی پارٹی کے بانی سربراہ جناب پروفیسر فدا محمد خان کو اپنے ہی شہر تربت کے بازار میں نا معلوم لوگوں نے شہید کر دیا۔ پارٹی کے ذمہ دار لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان کی شہادت کی وجہ یہ تھی کہ پارٹی کے معرض وجود میں آنے کے چند ماہ بعد ہی پارٹی بلوچستان کے لوگوں میں کافی مقبول ہو گئی تھی مخالفین جن میں بلوچستان کے سردار یا وہ جماعتیں جو بلوچستان مومنٹ کے لوگوں میں اتنی جلدی ترقی برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے قتل کرایا ہے ورنہ جناب فدا محمد خان کو کسی سے بھی کوئی ذاتی دشمنی نہ تھی وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے' دانشور تھے' جمہوریت پسند تھے' ترقی پسند تھے' رند قبیلے سے ان کا تعلق تھا نیشنل عوامی پارٹی کے وقت وہ طالب علم راہنما تھے ڈاکٹر عبدالمالک جو اس وقت وزیر ہیں وہ بھی ان کے شاگردوں میں سے ہیں اور بھی بہت سارے نامی گرامی لوگ ان کے شاگردوں میں شامل تھے۔

پارٹی کے منشور میں جاگیرداری سرداری سماجی ناہمواری کے خاتمے ظلم و جبر کے خاتمے کو اولیت

دی گئی ہے یہ مستقبل کے لئے سیکولر خوشحال معاشرے کے قیام پاکستان کے دوسرے صوبوں کے ساتھ مل کر طبقاتی ناہمواری کے خاتمہ کی جدوجہد کو بھی اولیت دیتی ہے۔ 1988ء کا الیکشن جمہوری وطن پارٹی کے ساتھ مل کر لڑا۔ سات ممبر صوبائی الیکشن کے منتخب ہوئے جن میں نیشنل موومنٹ کے چار صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے۔ 1988ء میں ہی قومی اسمبلی کے تین ممبر منتخب ہوئے جن میں نیشنل موومنٹ کے دو ممبر تھے پھر اسی الائنس کے ساتھ جمیعت علمائے اسلام' مسلم لیگ اور دیگر آزاد ممبروں کو ملا کر صوبائی حکومت بنائی گئی۔ بگٹی صوبے کے وزیر اعلیٰ بنے اور بی این ایم کے اکرم بلوچ سپیکر اور ڈاکٹر عبدالمالک وزیر صحت بنے۔ سپیکر اور وزیر صحت کی وجہ سے پارٹی بہت مقبول ہوئی پھر نیشنل موومنٹ کا اکبر بگٹی وزیر اعلیٰ سے اختلاف ہو گیا پارٹی کے فیصلے کی وجہ سے وزیر اپنے عہدوں سے مستعفی ہو گئے۔ 1990ء کے الیکشنوں میں بلوچستان کے نگران وزیر اعلیٰ اکبر بگٹی کے داماد ہمایوں صاحب کو بنایا گیا جن کے حکم سے بہت دھاندلی ہوئی جس کے باوجود صوبائی اسمبلی میں نیشنل موومنٹ کے دو ممبر ڈاکٹر عبدالمالک اور کچکول علی بلوچ کامیاب ہوئے اور اپوزیشن کے بنچوں پر بیٹھے حکومت میں شامل نہیں ہوئے۔ 1993ء کے انتخابات میں اس وقت ایک ایم این اے ڈاکٹر یاسین بلوچ ہیں جو کہ مرکزی پارلیمانی سیکرٹری بھی ہیں اور ڈاکٹر عبدالحی بلوچ سینٹ کے ممبر ہیں صوبائی اسمبلی میں چار ممبر ہیں جو کہ وزیر بھی ہیں جن کے محکمے یہ ہیں ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ' وزیر تعلیم ہیں' اکرم بلوچ وزیر ثقافت کھیل اور اطلاعات ہیں' کچکول علی بلوچ ایڈووکیٹ وزیر ماہی گیری و وسائل ترقی' ایوب بلوچ وزیر ایکسائز اینڈ ٹیکنیشن اور مال' ڈاکٹر عبدالحی بلوچ جو کہ بلوچستان نیشنل موومنٹ کے صدر ہیں اور کسی قبیلے کے سردار نہیں انہوں نے سٹوڈنٹ لیڈر کی حیثیت سے سیاست کا آغاز کیا تھا وہ بلوچ سٹوڈنٹ آرگنائزیشن کے بانی چیئرمین تھے ایم بی بی ایس ڈاکٹر بنے نیشنل عوامی پارٹی کے ٹکٹ پر 1970ء میں قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ان کے مقابلہ میں خان آف قلات کے بیٹے شہزادہ محی الدین کھڑے ہوئے تھے انہیں بھاری اکثریت سے شکست دی تھی۔ 1973ء کے آئین پر دستخط نہیں کئے تھے ان کا کہنا تھا کہ اس آئین میں جو صوبائی خود مختاری دی جا رہی ہے وہ کم ہے اس بنا پر دستخط نہیں کئے تھے بلوچ سٹوڈنٹ آرگنائزیشن کا قومی تحریک میں اہم رول رہا ہے نیشنل موومنٹ سیکولر جماعت ہے فرقہ پرست نہیں لسانی مذہبی تعصبات سے پاک ہے بلوچ قومی تحریک سرزمین بلوچستان کا تحفظ بلوچ زبان اور ثقافت کو قومی سطح پر اجاگر کرنا ہے بلوچستان نیشنل موومنٹ عدم تشدد پر یقین رکھتے ہوئے طویل عرصہ سے صوبائی خود مختاری اور بلوچ حقوق کی پر امن جدوجہد کر رہی ہے بی ایس او کے نوجوان جدوجہد میں شہید بھی ہوئے 1988ء میں امیر بلوچ کو فوجی عدالت سے پھانسی ہوئی تھی طالب علم راہنما سلیم بلوچ اور مجید بلوچ پولیس کی گولیوں سے شہید ہوئے تھے۔ پارٹی کا اثر زیادہ مکران ڈویژن میں ہے جو اس وقت اسمبلیوں میں ممبران ہیں وہ زیادہ مکران ڈویژن سے ہیں ڈاکٹر عبدالحی بلوچ بھی ڈویژن کے رہنے والے تھے غریب گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں بلوچستان لیبر فیڈریشن اور بلوچستان کی بہت ساری مزدور تنظیمیں بھی ان کے ساتھ ہیں
بلوچستان نیشنل موومنٹ ڈسٹرکٹ کوئٹہ کے چیئرمین جناب عبدالغفار سے انٹرویو لیا گیا

بلوچستان نیشنل موومنٹ اختر مینگل گروپ

میر غوث بخش بزنجو۔ محمد فاروق قریشی اور ساتھی۔

B-N-M اختر مینگل اور حی گروپ کی ایک ہی پارٹی تھی اختلاف کی بنا پر اختر مینگل کے لوگ الگ ہو گئے ان لوگوں نے دسمبر 1990ء میں لیبر حال کوئٹہ میں کارکنان کا ایک ھنگامی اجلاس کیا جس میں B-N-M کے مرکزی کونسل 400 میں سے 284 مرکزی کونسلر نے شرکت کی۔ بشمول جناب سردار اختر مینگل سردار دھنی بخش لاشاری کامریڈ مصطفےٰ مرحوم' غوث بہادر' بہرام خان' وحید بلوچ اور دیگر لوگ بھی جمع ہوئے جس میں صدر جناب سردار اختر مینگل اور جنرل سیکرٹری ایوب جتک مقرر ہوئے اس کے تھوڑا عرصہ بعد ہی پروگریسیو نیشنل مومنٹ بھی اس میں ضم ہو گئی اس انضمام کا باقاعدہ فیصلہ کیا گیا تھا اس وقت بلوچستان نیشنل مومنٹ بلوچستان میں موجود تھے

1993ء میں صوبائی اسمبلی کی دو سیٹوں پر پارٹی کے امیدوار کامیاب ہوئے تھے کوئٹہ شہر سے عبدالوحید بلوچ خضدار سے سردار اختر مینگل کامیاب ہوئے۔ قومی اسمبلی کی سیٹ خضدار سے ایوب جتک نے جیتی تھی سینٹ میں بھی اس وقت جاوید مینگل ممبر ہیں یہ سردار عطاء اللہ خان مینگل کے صاجزادے ہیں اور سب سے کم عمر سینٹر ہیں صوبہ بلوچستان کے سیکرٹری عبدالوحید بلوچ ہیں اور حزب اختلاف کے لیڈر بھی B-N-M کے سردار اختر جان مینگل ہیں سردار اختر مینگل نے قائد ایوان کے لئے الیکشن لڑا تھا 40 کے ہاؤس میں چار ووٹوں سے شکست کھا گئے تھے۔ B-N-M کے راہنما کہتے ہیں کہ ووٹ بنک کے لحاظ سے پارٹی کا اثر پورے بلوچستان میں ہے اور سندھ میں بھی پارٹی مقبول ہو رہی ہے۔ سردار عطاء اللہ مینگل اور سردار خیر بخش مری جب بیرون ملک سے واپس آئے تو بلوچستان نیشنل مومنٹ نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ ہوائی اڈا سے کسی شرپسند نے پاکستان کا جھنڈا اتار لیا تھا جس کی وجہ سے بی این ایم کے کئی کارکن گرفتار کر لئے گئے جن کی رہائی کے لئے صوبہ بھر میں جلسے کئے جلوس نکالے گئے تھے اور ان کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا کارپوریشن کے انتخابات کے لئے حکومت نے پہلے 42 حلقے بنائے تھے پھر بعد میں 60 حلقے کر دئے تھے کچھ سیاسی عناصر نے کوشش کر کے پھر 42 حلقے کروا دئے تھے اس پر تحریک چلائی گئی کہ کوئٹہ شہر کے کارپوریشن کے 60 حلقے ہی ہونے چاہئے۔ ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا بلوچستان اسمبلی میں افغان مہاجرین کے متعلق سردار اختر مینگل صاحب نے قرارداد پیش کی کہ اب چونکہ افغانستان آزاد ہو گیا ہے اس لئے افغان مہاجرین کو وطن واپس بھیجا جائے قرارداد کثرت رائے سے منظور ہوئی ایک اور قرار داد مینگل صاحب نے اسمبلی میں پیش کی سرکاری ملازمین کو کالونیوں میں جو مکان دئے گئے ہیں ان کے مالکانہ حقوق دئے جادیں قرارداد کثرت رائے سے منظور ہوئی۔ مینگل صاحب نے ایک اور قرارداد بلوچستان اسمبلی میں پیش کی بلوچستان کو کسی حالت میں تقسیم نہ کیا جائے۔ پختون خواہ ملی عوامی پارٹی نے قرارداد کی مخالفت کی۔ بلوچ نیشنل مومنٹ کا مرکز اور صوبے میں پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحاد ہے

پاکستان نیشنل پارٹی 1980ء

نیشنل عوامی پارٹی خلاف قانون کی جانے کے بعد اس کی جگہ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی نے لے لی۔ نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈران جیلوں میں تھے حیدر آباد ٹریبونل کے تحت ان پر مقدمات چل رہے تھے بھٹو حکومت ختم ہونے کے بعد ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کر لیا نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈر رہا ہو

گئے حیدر آباد ٹریبونل ختم ہو گیا حکومت نے تمام مقدمات واپس لے لئے جب لیڈر لوگ جیلوں سے باہر آئے تو ان میں اختلاف رونما ہو گئے بلوچی لیڈراں نے اپنی سیاسی راہیں الگ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس مقصد کے لئے لاہور میں ایک کنونشن منعقد ہوا جس میں میر غوث بخش بزنجو' سردار عطاء اللہ مینگل' ڈاکٹر عبدالحی بلوچ' سید محمد قسور گردیزی' شمیم اشرف ملک اور دیگر بہت سارے لوگ پنجاب' سندھ' بلوچستان سے جمع ہوئے جس میں پاکستان نیشنل پارٹی کی بنیاد رکھی گئی جس کے بنیادی نظریات میں صوبائی خود مختاری اور غیر طبقاتی سماج کی جدوجہد بھی شامل تھی۔ پارٹی سیکولر نظریات کی حامی ہر قسم کی فرقہ پرستی کے خلاف تھی اس جماعت میں پنجاب' سندھ کے ترقی پسند لوگ بھی کثیر تعداد میں شامل ہوئے تھے

مارشل لا کا دور تھا دیگر پارٹیوں کی طرح اس پارٹی کی سرگرمیاں بھی کوئی زیادہ نہ تھیں ترقی پسند لوگ کبھی کبھار کوئی چھوٹا موٹا جلسہ وغیرہ کر لیتے۔ 1985ء میں پارٹی کا دوسرا کنونشن ملتان میں سید محمد قسور گردیزی کی کوٹھی پر ہوا جس میں سندھ پنجاب بلوچستان کے قریبا 400 چار صد مندوبین نے شمولیت کی۔ پارٹی صرف میر غوث بخش بزنجو کے گرد ہی گھومتی تھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ پارٹی اب صرف بزنجو پارٹی ہے یا کسی حد تک قسور گردیزی کی پارٹی ہے۔ پھر تھوڑے وقت بعد یہ خبر پڑھی گئی کہ ڈاکٹر عبدالحی بلوچ نے الگ سیاسی پارٹی بنا لی ہے جس میں بلوچستان کے بااثر لوگ اختر مینگل' ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ اور دیگر شخصیات آئیں اور پنجاب کے ورکر حضرات میں مایوسی آئی مگر تھوڑی وقت بعد ہی نیشنل پارٹی میں پھر کچھ جان آگئی جب یہ سنا گیا کہ نیشنل پارٹی میں سندھ کے بااثر لوگ شامل ہو گئے ہیں جن میں سابقہ وفاقی وزیر حفیظ پیرزادہ بھی شامل ہیں

مگر 1988ء میں نیشنل پارٹی میں پھر مایوسی آئی جب الیکشنوں میں کوئی نمایاں کامیابی نہ ہوئی بلوچستان سے قومی اسمبلی کے الیکشن میں کوئی سیٹ بھی نہ ملی۔ خود غوث بخش بزنجو قومی اسمبلی کی اپنی سیٹ بھی حاصل نہ کر سکے۔ بلوچستان صوبائی اسمبلی کی دو نشستیں ملیں تھیں جن پر نواب اسلم رئیسانی اور ہاشم شاہوانی کامیاب ہوئے تھے یہ دونوں ممبر مسلم لیگ کی جمالی حکومت کی کولیشن میں شامل ہو گئے نواب اسلم رئیسانی صوبائی وزیر بھی بنے تھے اور آخر وقت تک اس کولیشن میں شامل رہے۔ 1989ء میں جناب غوث بخش بزنجو انتقال کر گئے بزنجو صاحب کی وفات کے بعد ان کے بیٹے بزن بزنجو پارٹی کے صدر بنے۔ غوث بخش بزنجو صاحب اپنی زندگی میں بلوچ پارٹیوں کے اتحاد کی کوشش کرتے رہے مگر ناکام ہوئے۔ نیشنل پارٹی کے سرگرم کارکن عبدالرشید صاحب کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا پولیس تشدد کی وجہ سے وہ بعد میں فوت ہو گئے احتجاج میں نیشنل پارٹی نے تحریک چلائی جس میں بہت کارکن گرفتار ہوئے۔ جن میں حکیم لہڑی عبدالعلی کاکڑ' بسم اللہ کاکڑ' محمد خیل لانگو اور بہت سارے کارکن گرفتار ہوئے۔ افغان مہاجرین کے خلاف بھی تحریک چلائی گئی تھی جس میں جلسے کئے جلوس نکالے اور مطالبہ تھا کہ افغان مہاجرین کو واپس افغانستان بھیجا جائے۔ جلوس پر لاٹھی چارج ہوا جس سے کئی کارکن زخمی ہوئے آنسو گیس کے گولے بھی پھینکے گئے تھے۔

1990ء کے الیکشن میں نیشنل پارٹی کو اچھی خاصی کامیابی ہوئی۔ بزنجو صاحب مرحوم کے دونوں بیٹے بزن بزنجو جو کہ پارٹی کے صدر بھی ہیں اور آصل بزنجو قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔ صوبائی اسمبلی میں چھ ممبر منتخب ہوئے جن کے نام ہیں۔ اسلم رئیسانی سردار ثناء اللہ زہری مشکل بلوچ اشرف

جام ہاشم شاہوانی اسرار زہری نے سینٹ میں صرف ایک نشست حاصل کی۔ بلوچستان کی صوبائی حکومت ظفراللہ جمالی نے بنائی تھی۔ نیشنل پارٹی کے ممبران اس کولیشن میں شامل تھے۔ جب گورنر نے بلوچستان اسمبلی توڑ دی تو نواب اکبر بگٹی نے عدالت میں رٹ کر دی اور عدالت نے اسمبلی بحال کر دی۔ اسمبلی کی بحالی کے بعد حکومت بنانے کے لیے جمہوری وطن پارٹی کو دعوت دی گئی - نواب محمد اکبر بگٹی بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ اس وزارت کو نیشنل پارٹی کی حمایت حاصل نہ تھی اور وہ حزب اختلاف میں ہی رہے۔

1993ء کے الیکشن میں نیشنل پارٹی کو بہت ناکامی ہوئی۔ مرکز میں کوئی سیٹ بھی نہ ملی۔ صوبے میں صرف دو سیٹیں ملیں' نواب زادہ لشکری اور ثناء اللہ زہری کامیاب ہوئے اور یہ دونوں وزیر بھی ہیں۔ غوث بخش بزنجو کی وفات کے بعد بزن بزنجو نیشنل پارٹی کے صدر اور جنرل سیکرٹری سندھ کے جناب حفیظ پیرزادہ تھے۔ اس وقت بھی یہی جنرل سیکرٹری ہیں۔

نیشنل پارٹی کے اثرات زیادہ مکران ڈویژن میں ہے اور اس وقت پارٹی شخصیتوں کے گرد ہی گھوم رہی ہے اور پارٹی انتشار کا شکار ہے۔ پارٹی کے کئی گروپ بنے ہوئے ہیں جن میں کوئٹہ میں حکم لہڑی کا گروپ ہے۔ سندھ میں حفیظ پیرزادہ اور اعجاز جتوئی کا گروپ ہے۔ بزن بزنجو کا گروپ الگ ہے۔ آنے والے وقت میں کوئی امید نہیں کی جاسکتی کہ یہ انتشار کیا صورت اختیار کرتا ہے۔

جمہوری وطن پارٹی

16 اگست 1990ء کو کوئٹہ میں جمہوری وطن پارٹی کا کونشن جس میں جناب نواب محمد بگٹی سابق وزیر اعلیٰ بلوچستان میر ہمایوں خان مری' میر عبد الجبار' سردار یار محمد خان رند' نواب زادہ احمد یار جوگیزئی' انور درانی' ارجن داس بگٹی کے علاوہ تقریباً" 3000 ہزار مندوبین اور مبصر جمع ہوئے جو کہ بلوچستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔ کونشن وزیر اعلیٰ ہاؤس میں ہوا تھا۔ اس وقت نگران وزیر اعلیٰ میر ہمایوں خان مری تھے۔ اس میں پارٹی کی بنیاد رکھی گئی اور پارٹی سربراہ جناب نواب محمد اکبر خان بگٹی جنرل سیکرٹری خدائے نور بنائے گئے۔ پارٹی کا نیا قانون بنایا گیا جس کے نمایاں نقاط یہ ہیں

پارٹی قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نافذ نہیں کرے گی۔ قوم کے ہاتھوں قوم کے استحصال کا خاتمہ کیا جائے۔ ملک کی سلامتی اور استحکام کے لیے زیادہ اختیارات وحدتوں کے سپرد کیے جائیں گے۔ مخلوط بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منصفانہ انتخاب کے ذریعے نمائندے منتخب کرنے کا حق حاصل ہو گا۔ صوبائی خود مختاری کی دستور میں حمایت کی جائے گی۔ دفاع' امور خارجہ' کرنسی' مواصلات کے علاوہ باقی تمام امور وحدتوں کے پاس ہوں گے۔ وفاق کے تمام اداروں میں آبادی کی بنیاد پر ملازمتوں کے کوٹے کا تعین کیا جائے گا۔ اسی تناسب سے ملازمتیں دی جائیں گی۔

1990ء کے الیکشن میں بلوچستان کی صوبائی اسمبلی میں 52 کے ہاؤس میں 13 نشستیں حاصل کیں۔ قومی اسمبلی میں دو نشستیں حاصل کیں جو ممبر ہوئے ان کے نام ہیں' نواب سلیم اکبر بگٹی' سردار یار محمد خان رند' سینٹ میں دو ممبر بنے۔ سردار بشیر خان ترین اور میر عبدالجبار۔

1990ء میں صوبہ کی وزارت مسلم لیگ کے سردار ظفر اللہ جمالی نے بنائی تھی اور جمہوری وطن پارٹی حزب اختلاف میں تھی۔ صوبائی گورنر نے اسمبلی توڑ دی تھی۔ نواب اکبر بگٹی عدالت میں گئے انہوں نے صوبائی گورنر کے حکم کو چیلنج کیا۔ عدالت نے اسمبلی بحال کردی اور پھر نواب اکبر خان بگٹی صوبہ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ 1993ء کے الیکشن میں بلوچستان اسمبلی کی سات نشستوں پر کامیاب ہوئے۔ قومی اسمبلی میں نواب محمد اکبر خان بگٹی سردار یار محمد خان رند کامیاب ہوئے۔ سینٹ میں بھی اس وقت مزید دو ممبر بنے۔ ایم ظفر ایڈووکیٹ' میر نبی بخش ڈومکی۔ اس وقت جمہوری وطن پارٹی کے سینٹ میں کل چار ممبر ہیں۔ نواب محمد اکبر خان بگٹی جو جمہوری وطن پارٹی کے سربراہ ہیں اور پارٹی کے سیاہ سفید کے مالک ہیں۔ بگٹی قبیلہ کے سردار بھی ہیں اور ڈیرہ بگٹی ایجنسی کے نواب بھی ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں وہ علی گڑھ اور پھر بیرون ملک تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں۔ بلوچستان کے سب سے پہلے سی ایس ایس ہیں۔ عمران کی تقریباً" ستر سال ہے۔

جمہوری وطن پارٹی کے ورکروں کا کہنا ہے کہ 1970 میں نیپ کی کامیابی میں نواب صاحب کا بہت بڑا ہاتھ تھا کہ انہوں نے الیکشن میں نیپ کی خاطر سرمایہ بھی خرچ کیا تھا اور بلوچستان کا دورہ کر کے لوگوں کو نیپ کی امداد کے لیے ووٹ دینے کے لیے بھی کہا تھا۔

1990ء کے صدارتی انتخابات میں جمہوری وطن پارٹی نے نواب زادہ نصر اللہ خان کو ووٹ دیے تھے۔ سڈک پروجیکٹ کا دفتر کراچی سے کوئٹہ میں منتقل کرانے میں نواب صاحب کی بھی کوشش ہے۔

جمہوری وطن پارٹی کے لوگ کہتے ہیں کہ 1990ء میں بے نظیر حکومت ختم کرانے میں نواب صاحب کا بھی بہت ہاتھ تھا۔

جمہوری وطن پارٹی عملی طور پر نواب اکبر بگٹی کی ہی ملکیت سمجھی جاتی۔ پارٹی کے بانی بھی وہی ہیں اور عملی طور پر بھی سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ پارٹی کے لوگ کہتے ہیں کہ پارٹی کا زیادہ اثر نصیر آباد' سی' قلات' چاغی ڈویژنوں میں ہے۔

جمہوری وطن پارٹی کے تاثرات

میرا کوئٹہ آنے کا مقصد ہی صرف ایک تھا کہ میں بلوچستان کی سیاسی جماعتوں کی تاریخ اور حالات لکھوں۔ اس سلسلہ میں مجھے تمام پارٹیوں کے دفاتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ سب سے جو وحشت ناک اور دہشت ناک اتفاق تھا وہ جمہوری وطن پارٹی کے دفتر جانے کا یا ان سے ملنے کا اتفاق تھا۔ میں جب پہلے روز کوئٹہ پہنچا تو ایک دن کے آرام کے بعد میں نے دوسرے دن ہی اپنا کام شروع کردیا اور اس روز جمہوری وطن پارٹی کے دفتر بگٹی ہاؤس فاطمہ جناح روڈ کوئٹہ میں صبح گیارہ بجے کے قریب حاضر ہوا۔ دفتر کے گرد تقریباً" دس دہشت ناک قسم کے مسلح افراد کا پہرا تھا۔ ان مسلح افراد کو دیکھ کر میرے جیسا کوئی بھی شخص خوف زدہ ہو سکتا ہے۔ میں اس خوف کے عالم میں ڈرتے ہوئے ایک دفتر نما کمرے میں اجازت کے ساتھ داخل ہوا۔ اس کمرے میں چند لوگ کرسیوں پر تشریف فرما تھے میں بھی اجازت لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے کے ایک طرف ایک صاحب جو شاید آفس سیکرٹری تھے۔ ان سے میں مخاطب ہوا اور مدعا بیان کیا کہ میں سیاسی جماعتوں کی تاریخ لکھ رہا ہوں۔ مناسب ہو گا کہ آپ بھی اپنی جماعت کی تاریخ واقعات اور جدوجہد کے بارے میں کچھ بتادیں تاکہ میں لکھ لوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ باتیں پارٹی کا کوئی ذمہ دار آدمی ہی بتا سکتا ہے اور پارٹی کے ذمہ دار نواب صاحب ہیں وہ اس وقت ڈیرہ بگٹی میں ہیں وہ چار پانچ دن تک آئیں گے وہی بتائیں گے۔ میں نے کہا جو میں پوچھنا چاہتا ہوں وہ معلوماتی سوالات ہیں جو ایک عام ورکر بھی بتا سکتا ہے۔ پھر آفس سیکرٹری صاحب نے جواب دیا کہ آپ کل آئیں شاید کوئی صورت نکل آئے۔ دوسرے دن گیا تو آفس سیکرٹری ضرورت سے زیادہ مصروف تھا جب میری طرف متوجہ ہوا تو کہنے لگا کہ ہم مصروف ہیں اس لیے کہ 94-8-16 کو ہماری جماعت کا کنونشن ہے ہم بہت مصروف ہیں۔ کنونشن میں نواب صاحب بھی آجائیں گے پھر آپ ان سے مل لیں آپ کا مسئلہ حل ہوجائے گا میں نے کہا کہ میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے چند معلومات آپ کی پارٹی کے متعلق حاصل کرنی ہیں کوئی ورکر بھی یہ معلومات دے سکتا ہے۔ آفس سیکرٹری نے جواب دیا کہ ہم مجبور ہیں جی نواب صاحب کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کرسکتے آپ کنونشن کے ایک دن بعد آئیں ان ایام میں مسلسل جمہوری وطن پارٹی کا کوئی ورکر تلاش کرتا رہا جو صاحب علم بھی ہو۔ ایک دو کے متعلق پتہ چلا بھی مگر ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ جمہوری وطن پارٹی کا کنونشن شروع ہوچکا تھا۔ بگٹی ہاؤس کے اردگرد سیکڑوں خوفناک اور دہشت ناک کلاشن کوفوں سے مسلح گروہ گھوم رہے تھے۔ کچھ مورچہ بند ہو کر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ پتہ چلا کہ سلیم اکبر بگٹی صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں اس لیے بھی یہ بہت زیادہ پہرہ بڑھ گیا ہے۔ بگٹی ہاؤس کے قریب ہی فاطمہ جناح روڈ پر ڈاکٹر شاہ محمد کی لیبارٹری ہے۔ ان

عابد حسن منٹو۔ قلب علی شیخ؛ رانا عبدالرحمان اور طارق چودھری ایڈووکیٹ۔
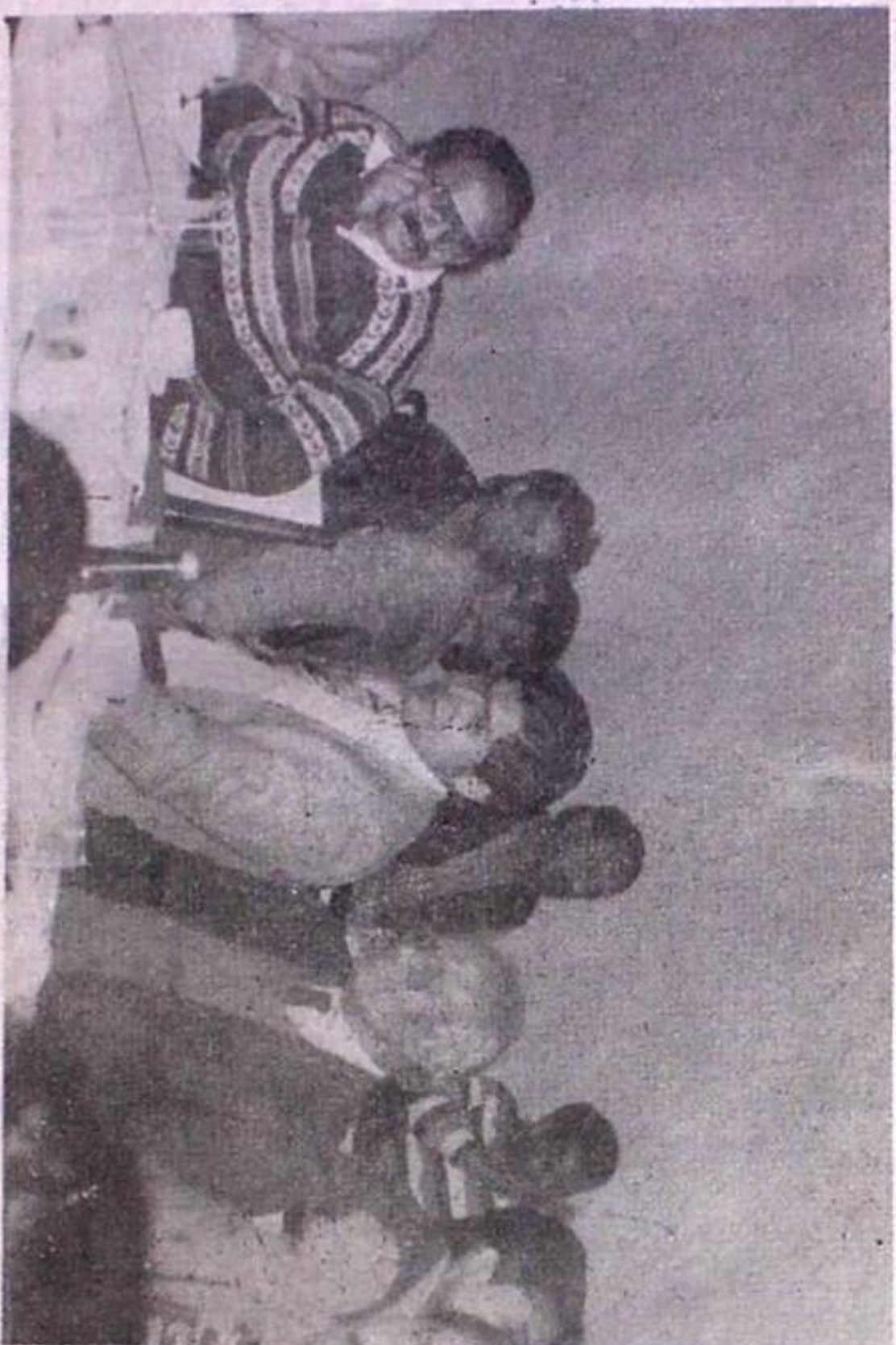
ایم اے سکندر۔ طارق چودھری ایڈووکیٹ اور دیگر

کے پاس ہی میں تھا کہ بازار سے جلوس گزرا۔ یہ شام کا وقت تھا سینکڑوں نوجوانوں کا جلوس تھا' جن میں مسلح لوگ بھی تھے وہ نعرے بازی کرتے تھے ان کا نعرہ تھا نعرا بگٹی جیوے بگٹی۔ میں نے قبل ازیں زندگی میں دو نعرے سنے ہوئے تھے۔ نعرہ تکبیر' اللہ اکبر۔ یا نعرہ رسالت' یا رسول اللہ۔ یہ تیسرا نعرہ زندگی میں پہلی بار سنا تھا' حیرانگی ہوئی۔ 16-8-94 کو جمہوری وطن پارٹی کا کونشن ختم ہوا۔ 17 تاریخ کو پھر بگٹی ہاؤس گیا تو بہت زیادہ دہشت ناک خوفناک ماحول دیکھا۔ بہت سارے خوفناک چہروں والے مسلح نوجوان بگٹی ہاؤس کے اطراف کھڑے تھے۔ ٹہل رہے تھے۔ لوگ بھی آجارہے تھے پتہ چلا کہ نواب صاحب آئے ہوئے ہیں۔ میں نے ڈرتے جھجکتے ہوئے آفس سیکرٹری کے کمرے میں ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ آفس سیکرٹری نے کہا ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو نواب صاحب سے ملواتا ہوں۔ پتہ چلا کہ نواب اکبر بگٹی تو نہیں آئے سلیم اکبر بگٹی ہیں۔ کافی دیر بیٹھا رہا ملاقات نہ ہوئی۔ پھر اٹھ کر چلا آیا اور کسی پڑھے لکھے جمہوری وطن پارٹی کے ورکر کی تلاش شروع کردی۔ ڈاکٹر شاہ محمد سے ملا انہوں نے ارجن دار بگٹی کے گھر جو قریب ہی تھا بھیج دیا۔ گھر کے نوکر سے پتہ چلا کہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔ گھر کے باہر تھڑے پر بیٹھ گیا۔ تقریبا ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کے بعد میرا کارڈ اندر پہنچایا گیا۔ تقریبا" دس منٹ بعد مجھے اندر بلا لیا گیا۔ ارجن داس صاحب سے میں نے مدعا بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں کوئی انٹرویو وغیرہ نہیں دے سکتا۔ آپ پارٹی کے جنرل سیکرٹری فدائے نور کے پاس جائیں۔ میں نے کہا جی وہ بھی شاید ایسانہ کرسکیں کیونکہ میں دس دن سے اس کام میں مبتلا ہوں مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ انہون نے اپنا کارڈ مجھے دیااور ساتھ معذرت بھی کی۔ یہ ارجن داس صاحب بلوچستان اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکرہیں۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ دوسرے روز بتائے ہوئے وقت پر بگٹی ہاؤس چلا گیا۔ جمہوری وطن پارٹی کے آفس میں جا کر بیٹھ گیا۔ پتہ چلا کہ خدائے نور صاحب تھوڑی دیر بعد آئیں گے اور بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد خدائے نور صاحب جنرل سیکرٹری جمہوری وطن پارٹی آگئے میں نے مدعا بیان کرنا چاہا تو وہ میری طرف مخاطب ہوئے اور کہا کہ بابا تو پھر آگیا ہے۔ میں نے اس دن بھی تم سے کہا تھا کہ ہم کوئی انٹرویو ونٹرویو وغیرہ نہیں دیتے۔ میں نے اپنا کارڈ اور ارجن داس صاحب کا کارڈ آگے بڑھایا تو انہوں نے ہاتھ جھٹک کر کہا بابا جا میرا وقت ضائع نہ کرو۔ قبل اس کے کہ مجھے دھکے دے کر باہر نکالا جاتا میں خود ہی باہر آگیا۔ دوبارہ پھر نہیں گیا۔

عوامی جمہوری پارٹی

عوامی جمہوری پارٹی کی بنیاد ضیاء الحق کے دور حکومت 1987ء میں کمیونسٹ مارکسٹ قوم پرست لوگوں کا کونشن لاہور میں شملہ پہاڑی کے قریب ایک بہت بڑے ہال جس میں عام وقتوں میں بیاہ شادی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کنونشن میں تقریبا" 600 افراد مندوبین پنجاب اور سندھ کے دور دراز علاقوں سے شامل ہوئے تھے جن میں سندھ سے سو بھوگیان چندنی' معراج محمد خان' ڈاکٹر اعزاز نذیر اور پنجاب سے جناب عابد حسن منٹو ایڈووکیٹ' چودھری فتح محمد' غلام نبی بھکر' ظفر سلیم ایڈووکیٹ اور دیگر بہت سارے لوگ جمع ہوئے تھے۔ اس کنونشن کے تین اجلاس ہوئے تھے اور رات کے اجلاس کے بعد ایک ڈرامہ بھی پیش کیا گیا تھا۔ اس جماعت کے بنیادی عناصر مارکسٹ نظریات رکھنے والے لوگوں پر
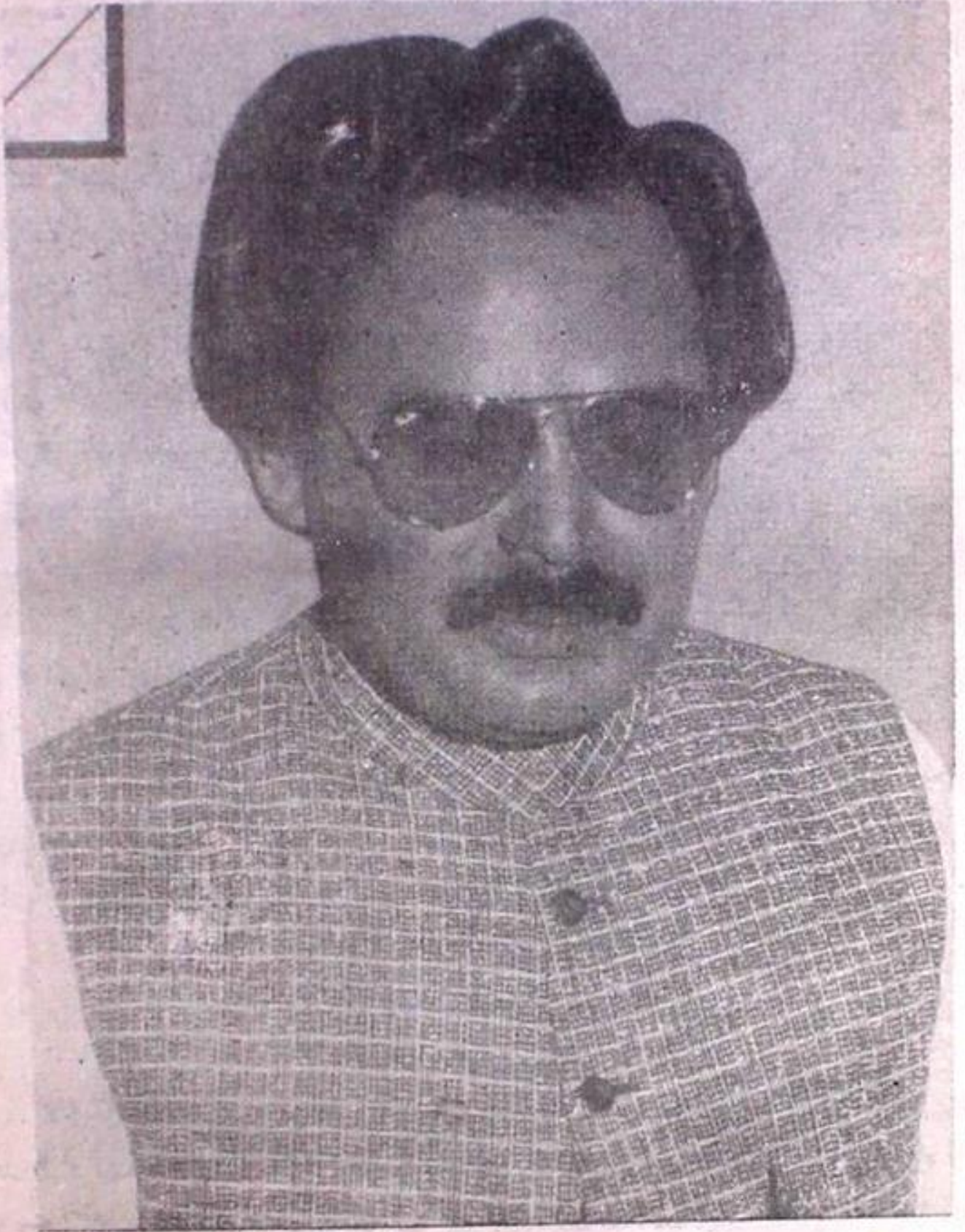
الطاف حسین بانی ایم کیو ایم

مشتمل تھے۔ جماعت کے پہلے صدر جناب عابد حسن منٹو ایڈووکیٹ اور جنرل سیکرٹری معراج محمد خان بنائے گئے تھے 62 افراد پر مشتمل ایک تنظیمی کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اس جماعت کی □□□ بہت اچھی تھی اور خیال بھی یہی تھا کہ عوامی جمہوری پارٹی لوگوں میں کافی مقبول ہوگی مگر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ یہ عوامی جمہوری پارٹی معرض وجود میں آتے ہی اس پر اوس پڑ گئی۔ عوامی جمہوری پارٹی کے پروان نہ چڑھنے کی سب سے بڑی وجہ بین الاقوامی تھی۔ وہ یوں کہ عوامی جمہوری پارٹی کا منشور مارکسزم پر مبنی تھا جبکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت سوویٹ یونین نے مارکسزم کو خیرباد کہہ دیا تھا اور یورپ کی معیشت کو ہی اپنا لیا تھا۔ سوویٹ یونین کے منتشر ہونے کے اثرات دنیا بھر کی مارکسٹ پارٹیوں پر پڑے مگر پاکستان میں کچھ زیادہ ہی یہ اثرات قبول کیے گئے۔ جو پارٹیاں بھی مارکسٹ سوشلسٹ نظریات رکھتی تھیں وہ نیم جان ہوگئیں اور جو جماعتیں زیب داستان کے لیے سوشلزم کا نام لیتی تھیں انہوں نے یہ نام لینا بھی چھوڑ دیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ پاکستان کی تمام وہ جماعتیں یا گروپ جو سوشلزم کا نام لیتی تھیں وہ یا تو ختم ہوچکی ہیں یا نیم جان ہیں۔ یہی حال عوامی جمہوری پارٹی کا ہے۔ اس وقت یہ پارٹی اپنے ابدی صدر اور بڑی شخصیت جناب عابد حسن منٹو کے گرد گھومتی ہے۔ ان کی ذات کو ھی عوامی جمہوری پارٹی سمجھا جاتا ہے۔

ایم کیو ایم

1947ء میں جب تخلیق پاکستان ہوئی تو اس وقت مرکزی حکومت کے ملازمین سے پوچھا گیا تھا کہ جو لوگ پاکستان جانا چاہتے ہیں وہ پاکستان چلے جائیں تو تقریباً" سو فی صد مرکزی حکومت کے مسلم ملازمین نے پاکستان جانے پر آمادگی ظاہر کی اور وہ پاکستان کے اس وقت کے دار الحکومت کراچی میں آگئے اور ساتھ ہی وہ لوگ جو تعلیم یافتہ تھے وہ بھی پاکستان آگئے اور انہیں ملازمتیں بھی آسانی سے مل گئیں۔ مرکزی حکومت کے یہ ملازمتیں یا تعلیم یافتہ لوگ جنہیں ملازمتیں آسانی سے مل گئیں یہ تقریباً" 95 فیصد لوگ یوپی اور دلی کے اردگرد کے ہی رہنے والے تھے پھر پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان بھی اس علاقے کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے ووٹ بنک بنانے کیلئے اپنے علاقے کے لوگوں کو زیادہ تر کراچی میں آباد کرنے کی کوشش کی۔ پھر چودھری خلیق الزماں جو مسلم لیگ پاکستان کے صدر بھی بن گئے تھے۔ انہوں نے بھی اردو بولنے والے لوگوں کو کراچی میں آباد کرنے کی کوشش کی۔ پھر جب پاکستان میں کراچی کے رہنے والے لوگ ہندوستان کے مسلمانوں سے زیادہ خوشحال بھی نظر آنے لگ گئے تو بھارت میں جو بھی نوجوان مسلمان تعلیم یافتہ ہوجاتا یا اگر کسی کے پاس کچھ دولت وغیرہ اکٹھی ہوجاتی تو وہ اپنے بہتر مستقبل کے لیے پاکستان کا رخ کرتے اور وہ کراچی یا حیدر آباد اور دیگر شہروں میں آکر آباد ہوجاتے اور نقل مکانی کا سلسلہ آج تک جاری ہے 1947ء میں کراچی کی آبادی تقریباً" چار لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ جن میں تقریباً" 80 فی صد غیر مسلم سندھی آباد تھے جو نقل مکانی کر کے بھارت چلے گئے تھے انہیں کی جائیدادوں پر انہیں کے کاروبار پر مرکزی سرکاری ملازمتوں پر دلی یوپی اور اردو بولنے والے لوگ آکر آباد ہو گئے۔ بھارت کے علاقہ گجرات کاٹھیاواڑ بمبئی وغیرہ سے بھی میمن گجراتی بوھرے لوگ کراچی حیدر آباد وغیرہ میں آباد ہوئے مگر یہ لوگ زیادہ تر کاروباری لوگ ہیں۔

پر امن لوگ ہیں اور ان لوگوں نے اپنے آپ کو الگ منظم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ دیگر کراچی کی قدیم مقامی آبادی جن میں زیادہ تر مکرانی کچھی بلوچی سندھی اور دیگر لوگ بھی ہیں ان کی تعداد بھی اردو بولنے والے لوگوں سے بہت کم ہے اور نہ وہ لوگ اپنے کو الگ منظم کرنے کا خیال ہی کرتے ہیں۔ دیگر چونکہ کراچی کاروباری مرکز ہے اس میں روزگار آسانی سے مل جاتا ہے۔ تلاش روزگار کے لیے پاکستان کے دیگر صوبہ جات سے بھی لوگ کافی آکر آباد ہوچکے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے کو الگ منظم نہیں کیا۔ پاکستان بن جانے کے بعد 1950ء میں پہلے انتخابات ہوئے اس میں مسلم لیگ کے علاوہ مغربی پاکستان میں دیگر کوئی جماعت ہی سیاسی نہ تھی اس لیے کراچی اور دیگر مغربی پاکستان میں مسلم لیگ ہی کثرت سے کامیاب ہوئی۔اس کے بعد جب 1970ء میں الیکشن ہوئے تو کراچی اور حیدر آباد کے نتائج حیران کن تھے ان علاقوں کی تمام سیٹوں پر روائتی سیاسی جماعتیں کامیاب نہ ہوئیں بلکہ جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے پاکستان کے امیدوار کثرت سے کامیاب ہوئے۔ اس وقت تک ابھی الطاف حسین سکول میں پڑھ رہا تھا۔ مگر وسط ہند کے مہاجرین نے اپنے کو مذہبی جماعتوں میں منظم کرنا شروع کردیا۔ 1970ء کے الیکشن میں غالباً" صرف ایک امیدوار پیپلز پارٹی کاکراچی سے کامیاب ہوا۔باقی تمام سیٹیں جمعیت علمائے پاکستان اور جماعت اسلامی نے کراچی اور حیدر آباد کی حاصل کر لی تھیں۔ اس وقت یہ اندازہ کیا جانے لگ گیا تھا کہ جمعیت علمائے پاکستان اور جماعت اسلامی نے واقعی سیاست میں پیش قدمی کی ہے اور آنے والے وقت میں ان جماعتوں کومزید کامیابیاں حاصل ہوں گی۔ مگر ایم کیو ایم جب بذات خود منظم ہوگئی تو جمعیت علمائے پاکستان اور جماعت اسلامی کی ہردلعزیزی کا گراف دھڑام سے نیچے گرگیا۔ ایم کیو ایم بنیادی طور پر الطاف حسین کی قیادت میں آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹ آرگنائزیشن کے طور پر معرض وجود میں آئی جس کے صدر الطاف حسین تھے اور نائب صدر عظیم احمد طارق شہید بنے تھے۔ کراچی کے تمام کالجوں میں اور یونیورسٹی پر مہاجر سٹوڈنٹ آرگنائزیشن کا تسلط ہوگیا۔ کراچی کے نوجوانوں کو الطاف حسین کی قیادت میں ایک نیا ولولہ اور نیا جذبہ ملا۔ یہی نوجوان جب کالجوں سے فارغ ہوکر عام زندگی میں آئے تو یہ پھر بھی الطاف حسین اور مہاجر قومی موومنٹ کے ہی گرویدہ رہے۔ درمیانہ طبقہ میں الطاف حسین کی مقبولیت بڑھنے لگی۔ مہاجر نوجوانوں کے مسائل میں یہ باتیں بھی شامل تھیں کہ انہیں نوکریاں نہیں ملتی۔ ان کے ڈومی سائیل پر کئی اعتراض لگ جاتے ہیں۔ دفاتر روزگار میں جاتے ہیں نام اندراج نہیں ہوتا کئی اعتراض لگا کر کاغذات رد کردئے جاتے۔ اگر یہ تمام مراحل سے گزر کر درخواست گزار ہی دیتےتو کئی اعتراض لگا کر نوکری حاصل کرنے میں ناکام ہوجاتے۔ ان اعتراض کے علاوہ بھی مہاجر کہتے ہیں کہ ہمیں سندھ حکومت شہری تسلیم ہی نہیں کرتی۔ کراچی اور سندھ میں پنجابی لوگوں کی اجارہ داری ہے پولیس میں بھرتی نہیں کیا جاتا کہ تمہارا قد چھوٹا ہے جس کی مثال 1992ء میں ڈھائی ہزار مہاجر پولیس مینوں کو فارغ کر دیا گیا اگر کسی کی سفارش پیپلزپارٹی یا مسلم لیگ کی طرف سے ہوتی تو اسے رکھ لیا جاتا وہ بھی عارضی طور پر ایم کیو ایم کے لیبل پر نوکری بالکل نہیں دی جاتی۔ پولیس مہاجرین پر ظلم کرتی تھی۔ تشدد کرتی تھی۔ انہیں دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ اس روشنی میں لوگوں نے الطاف حسین کی آواز پر لبیک کہہ کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کے لیے تیار ہوگئے۔

ایم کیو ایم کا تاریخی کنونشن

یہ کنونشن اگست 1978ء میں نشتر پارک کراچی میں منعقد ہوا جس میں جناب الطاف حسین، عظیم احمد طارق، فاروق ستار، ڈاکٹر عمران فاروق، زرین مجید، سلیم شہزاد، آفاق احمد عامر خان اور تقریباً پندرہ ہزار نوجوان کارکن جمع ہوئے تھے اور پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ پھر اسی روز نشتر پارک میں جلسہ ہوا جس میں بارش کے باوجود پانچ لاکھ لوگ جمع ہوئے تھے۔ دوسرا کامیاب جلسہ حیدر آباد میں پکہ قلعہ کے مقام پر ہوا جس میں تقریباً دو لاکھ لوگ جمع ہوئے تھے۔ اسی جلسہ میں شمولیت کے لیے کارکنان کراچی سے حیدر آباد جا رہے تھے کہ سہراب گوٹھ کے مقام پر کارکنان کے قافلے پر فائرنگ ہوئی جس سے تقریباً 35 کارکن شہید ہو گئے اور 100 کے قریب زخمی ہوئے پھر اس کے بعد علی گڑھ کالونی میں کارکنان پر حملہ ہوا جس میں 60 کارکن شہید ہوئے اور دو صد کے قریب زخمی ہوئے اور تمام املاک نذر آتش کر دی گئیں۔ پھر یہ قتل غارت گری روزمرہ کا معمول بن گیا کبھی کسی گروہ کے چند لوگ قتل ہو جاتے کبھی کسی گروہ کے لوگ قتل ہو جاتے۔ گورنمنٹ کی مرضی سے ایم کیو ایم میں سرکاری بندے داخل کیے جاتے ہیں جو تخریب کاری کرتے ہیں اور اس کا الزام ایم کیو ایم پر لگا دیا جاتا ہے۔ یہ بات جب قائد تحریک کے علم میں آئی تو انہوں نے اس قسم کے لوگوں کو پارٹی سے نکال دیا اور یہی لوگ بعد میں ایم کیو ایم حقیقی بن گئے جن کے لیڈر آفاق احمد عامر خان منصور چاچا اور بھی بہت سارے کارکن جو غلط کاموں میں پائے گئے تھے۔

1982ء میں بلدیاتی الیکشن میں کراچی کی بلدیہ عظمیٰ پر ایم کیو ایم نے 90 فیصد نشستیں حاصل کرکے پورے پاکستان میں اپنی طاقت کا لوہا منوالیا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی کامیابی کو دیکھ کر جنرل ضیاء الحق نے ہی الطاف حسین کو اپنی سیاسی پارٹی بنانے کا مشورہ دیا تھا۔ انہیں کے مشورہ پر ایم کیو ایم ایک سیاسی طاقت کے طور پر معرض وجود میں آئی۔

1988ء کے الیکشن میں ایم کیو ایم نے قومی اسمبلی کی 13 نشستیں حاصل کی تھیں۔ صوبائی اسمبلی کی 28 نشستیں اور سینٹ کی دو نشستیں حال کی تھی اور پیپلز پارٹی کے ساتھ سندھ میں کولیشن گورنمنٹ میں شامل ہوئے اور پیپلز پارٹی نے اپنے حلیفوں کو اعتماد میں نہ لیا اور انہیں ذلیل کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں بھی حیدر آباد، پکہ قلعے کا واقع ہوا تھا گولی چلی تھی۔ کئی لوگ مارے گئے تھے اور ایم کیو ایم والے پیپلز پارٹی سے الگ ہو گئے۔

1990ء کے الیکشن میں ایم کیو ایم نے حسب سابق قومی اسمبلی کی 13 نشستیں صوبائی کی 28 اور سینٹ میں مزید دو نشستیں حاصل کیں اور مجموعی طور پر سینٹ میں ایم کیو ایم کی چار نشستیں ہو گئیں۔

1990ء کے الیکشن کے نتیجہ میں نواز شریف کی حکومت مرکز میں بنی تھی اور صوبہ سندھ میں مسلم لیگ اور ایم کیو ایم کی مخلوط حکومت بنی تھی۔ نواز شریف کے دور حکومت میں کراچی میں دہشت گردی کو روکنے کے لیے فوج متعین کی گئی تھی۔ ایم کیو ایم والوں کا کہنا ہے کہ جب نواز شریف کی حکومت سپریم کورٹ آف پاکستان نے بحال کی تھی تو اس وقت نواز شریف چاہتے تھے کہ کراچی سے فوج ہٹالی جائے مگر اسے فوج نے ایسا نہیں کرنے دیا تھا اور فوج کے دباؤ پر ہی نواز شریف کو حکومت اور وزارت سے استعفیٰ دینا پڑا تھا اور پھر الطاف حسین ملک سے باہر جا چکے تھے۔

1993ء کے الیکشنوں میں قومی اسمبلی کا الیکشن ایم کیو ایم نے بائیکاٹ کیا تھا میرے ایک سوال کے جواب میں ایم کیو ایم کے ذمہ دار ورکر نے یہ کہا تھا کہ ہمیں فوجی جرنیلوں نے کہا تھا کہ قومی اسمبلی کی صرف آپ کو تین سیٹیں زیادہ سے زیادہ دی جاسکتی ہیں۔ صوبائی کی چاہے ساری لے لو ہم نے فوج کے دباؤ کی وجہ سے قومی اسمبلی کے الیکشن کا بائیکاٹ کیا تھا۔ قائد تحریک الطاف حسین صاحب نے لندن سے اعلان کیا تھا کہ عوام قومی اسمبلی کے الیکشن میں ووٹ ڈالنے نہ جائیں اس لیے عوام ووٹ ڈالنے گئے ہی نہیں جو لوگ قومی اسمبلی کے ممبر بنے ہیں انہیں بہت کم تعداد میں ووٹ ملے تھے۔ قومی اسمبلی نے جس حلقہ کے دولاکھ ووٹ تھے وہاں ووٹنگ پندرہ بیس ہزار سے زیادہ نہیں ہوا اور جو بھی قومی اسمبلی میں ممبر بنے ہیں ان کے ووٹ کسی کے بھی پندرہ ہزار سے زائد نہ تھے۔ لوگ ووٹ ڈالنے گئے ہی نہ تھے اور الیکشن لڑنے والوں کو جعلی ووٹ ڈالنے کی بھی کھلی چھٹی تھی ایسی حالت میں بھی ووٹ بیلٹ بکسوں سے بہت کم برآمد ہوئے۔ پھر قائد تحریک نے جب صوبائی اسمبلی کے الیکشن میں لوگوں کو ووٹ ڈالنے کی اجازت دے دی تو صوبائی اسمبلی کے ممبران کے ووٹوں کی تعداد بھی چالیس ہزار سے زیادہ ہوتی تھی۔ دیگر یہ کہ صوبائی الیکشن پر حقیقی والے بھی کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں کوئی بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ایم کیو ایم والے کہتے ہیں کہ حقیقی گروپ گورنمنٹ کی مرضی سے بنا ہے اور دہشت گردی بھی حقیقی والے ہی کرتے ہیں جب حکومت نے ذرا دباؤ ڈالا تو حقیقی والے دیگر صوبوں میں بھاگ گئے اور الزام ایم کیو ایم پر لگا دیا جانے لگا۔ اپنے کارناموں کو الطاف حسین پر تھوپ دیا گیا۔ اور پھر پنجاب میں جمع ہوئے افسران کے ساتھ مل کر ایم کیو ایم کو کریش کرنے کا منصوبہ بنایا اور یہی حقیقی والے 1992ء میں کراچی میں داخل ہوئے اور ایک سازش کے ذریعے دہشت گردی کی۔ تقریباً" دو ہزار لوگ قتل ہو گئے اور بہت سارے مکانات بھی نذر آتش کیے گئے۔ ایم کیو ایم احتجاج کرے تو اس کی سنی ہی نہیں جاتی بلکہ انہی کو گرفتار کیا جاتا ہے۔ جس کی زندہ مثال ہے۔ سید اشتیاق اظہر جن کی اس وقت عمر 80 سال ہے ان پر اغوا برائے تاوان کا مقدمہ' گاڑی جلانے کا مقدمہ' قتل کا مقدمہ اور بھی کئی مقدمات قائم کیے گئے ہیں۔ اس بات کی دلیل ہے کہ ایم کیو ایم کو کرش کرنے کے لیے 10 سال کے بچے سے لے کر 80 سال کے بوڑھے تک کو معاف نہیں کیا جاتا۔ عدلیہ مفلوج ہو چکی ہے کوئی چارہ جوئی کامیاب نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ حکومت بھی اس میں پس پردہ شامل ہوتی ہے۔ الطاف حسین نے آج تک کوئی ایسی اپیل نہیں کی جس سے فوج یا عدلیہ کا وقار مجروح ہوا ہو۔ اور انہوں نے کہا کہ بہادر علی انسپکٹر پولیس نے ایم کیو ایم پر بڑے ظلم کیے وہ جس ورکر کو گرفتار کرتا اسے ہی گولی سے اڑا دیتا۔ اس نے تقریباً" ایک سو سے زائد نوجوان قتل کیے۔ آخر ایک دن وہ بھی دہشت گردوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ کراچی کے ہنگاموں میں 10 سے زائد فوجی مارے گئے ہیں اور ایک سو سے زائد پولیس مین بھی مارے گئے ہیں۔ ایم کیو ایم کا کہنا ہے کہ اس وقت سندھ اسمبلی میں ایم کیو ایم کے ممبران حزب مخالف میں ہیں اور انہیں اسمبلی کے اندر بے عزت کیا جاتا ہے مارا جاتا ہے گالیاں دی جاتی ہیں۔

ایم کیو ایم والے کہتے ہیں کہ نواز شریف کسی حد تک ہمارے ساتھ تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ فوج کراچی پر اس طرح اثر رنداز ہو۔ مگر پیپلز پارٹی اور فوج نہیں چاہتی کہ مہاجرین کے مسائل حل ہوں۔ میرے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم تو پاکستان میں ہی آکر پیدا ہوئے ہیں مگر

ہمارے باپ دادا قیام پاکستان کے وقت کی بات کہتے تھے کہ جب مسلم لیگ والے ہم سے ووٹ مانگتے تھے تو ہم کہتے تھے۔ کہ پاکستان پنجاب سندھ بنگال میں بننا ہے ہمیں اس کا کیا فائدہ ہو گا۔ ہمیں یہ کہا جاتا تھا کہ پاکستان مسلمانوں کا ہو گا اور آپ بھی پاکستان میں آباد ہو جائیں گے تو پاکستان آپ کا بھی اسی طرح ہو گا۔

تنقید و تبصرہ

کراچی حیدر آباد کا مسئلہ حکومت کا مسئلہ' ایم کیو ایم کا مسئلہ' سندھیوں کا مسئلہ اتنا سیدھا اور آسان نہیں کہ آسانی سے حل ہو جائے۔ اس میں بہت ہی بڑے جکڑ بند ہیں جسے سمجھنے کے لیے تاریخ کی بھول بھلیوں میں جانا پڑے گا۔ تبادلہ آبادی پنجاب میں بھی ہوا تھا لاکھوں لوگ قتل ہو گئے تھے پھر انتقال آبادی ہوا مگر پنجاب کے دونوں حصوں کا تہذیب تمدن' بات چیت تقریباً" ایک جیسی تھی۔ دیگر یہ کہ پنجاب کے ہر شہر اور مملاقے دیہات میں سے جیسے غیر مسلم گئے تھے ویسے ہی ان شہروں' علاقوں' دیہاتوں میں مہاجرین آکر آباد ہو گئے اور آپس میں تھوڑے وقت بعد مکس ہو گئے آپس میں شادیاں بھی ہونے لگ گئیں زبان کے لب و لہجے میں جو تھوڑا فرق تھا۔ وہ آنے والی نسل میں ختم ہو گیا اب جو نسل اس وقت پیدا ہو رہی ہے۔ اس کی زبان اور لب لہجہ سے آپ یہ اندازہ ہرگز نہیں کر سکیں گے کہ یہ نوجوان مہاجر ہے یا مقامی ہے اس لیے وہاں یہ مسئلہ تقریباً" ختم ہو گیا ہے اور دیگر یہ کہ پنجاب میں ایسا کوئی خطہ بھی نہیں تھا۔ جہاں پہلے بہت زیادہ ہندو آباد تھے اور پھر بہت سارے مہاجر آکر آباد ہو گئے ہوں۔ اس لئے وہاں تو یہ مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوا مگر کراچی حیدر آباد اور سندھ کی پوزیشن ذرا مختلف ہے۔ کراچی حیدر آباد یا سندھ کے دیگر شہروں میں متحدہ ہندوستان کے وقت غیر مسلم زیادہ رہتے تھے۔ اور دیہاتوں میں مسلمان زیادہ رہتے تھے۔ خصوصی طور پر کراچی شہر میں تو سندھی مسلمان چار فی صد سے بھی کم تھے۔ اس شہر میں باہر سے جتنے لوگ بھی آکر آباد ہوئے وہ زیادہ تر یوپی بہار وغیرہ سے اردو بولنے والے تھے اور سندھی دیہاتیوں کی نسبت مہذب بھی تھے' پڑھے لکھے بھی تھے بلکہ زیادہ تر وہی لوگ سرکاری عہدوں پر بھی قابض ہو گئے۔ پاکستان کے ابتدائی حکمران جناب لیاقت علی خان اور دوسرے لیڈر بھی یوپی وغیرہ سے ہی آئے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے لوگوں کو بھی بھارت سے لاکر کراچی میں آباد کیا تاکہ ان کی پوزیشن کراچی میں مستحکم ہو۔ آہستہ آہستہ اب صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ سندھ میں غیر سندھیوں کی تعداد تقریباً" 46 فی صد ہو گئی ہے' جن میں بھاری اکثریت بھارت کے اردو بولنے والے علاقوں کی ہے۔ کراچی میں بسنے والے لوگ کہتے ہیں کہ کراچی اور حیدر آباد کو باقی سندھ سے الگ صوبہ بنایا جائے' سندھی نہیں مانتے۔ وہ سندھ کا دار و مدار ہی کرچی اور حیدر آباد سمجھتے ہیں۔ سندھی اور غیر سندھی تصادم کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اس کی مثال فلسطین اور یہود کی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ تصادم صدیوں تک بھی چل سکتا ہے۔

جی اے سندھی پارٹی

جی ایم سید۔
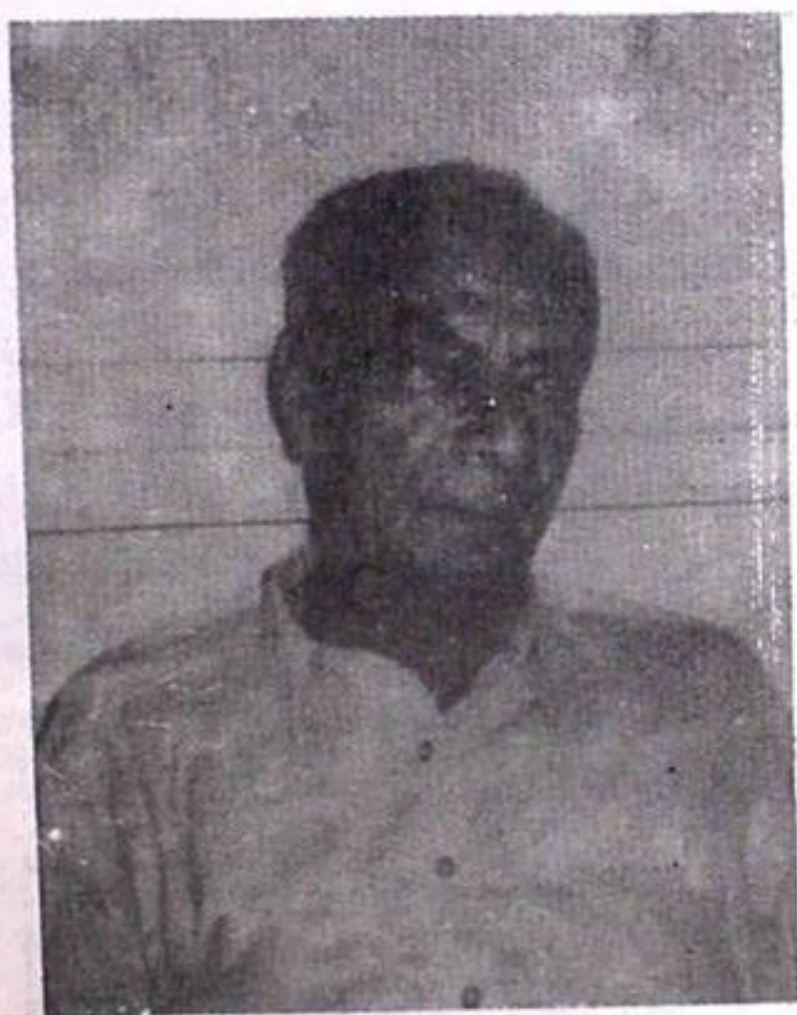
سوبھو گیان چندانی

جی اے سندھی پارٹی جناب جی ایم سید کی شخصیت کے گرد گھومتی ہے۔ جی ایم سید سندھ ضلع دادو کے ایک چھوٹے سے قصبہ سن کے رہنے والے ہیں۔ جس کی آبادی تقریباً" دس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ ٹاؤن کمیٹی بھی بنی ہوئی ہے۔ سید صاحب وہاں کے بڑے زمیندار ہیں۔ 1904ء میں اسی قصبہ میں پیدا ہوئے تعلیم حاصل کرنے کے بعد سیاست کی طرف راغب ہوئے۔ انڈین نیشنل کانگرس میں شمولیت اختیار کی - تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1934ء میں وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اور وہ اپنی خداداد صلاحیت اور ذہانت کی بدولت صوبہ سندھ مسلم لیگ کے صدر بن گئے اور 1937ء میں سندھ اسمبلی کے ممبر بنے۔ اللہ بخش سومرو کی وزارت سندھ میں قائم ہو گئی۔ یہ وزارت قوم پرست مسلمانوں بشمول کانگرس کے کولیشن حکومت تھی جسے مسلم لیگ والے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اس وزارت کو غیر مستحکم کرنے کے لیے مسجد منزل گاہ کی تحریک چلائی جس کی قیادت جی ایم سید نے کی یہی اس وقت مسلم لیگ کے صدر بھی تھے۔ اس تحریک میں تقریباً" ایک سو سے زائد لوگ گولی چلنے سے شہید اور بہت سارے لوگ زخمی بھی ہوئے تھے۔ اس تحریک کی وجہ سے فرقہ پرستی کو طاقت حاصل ہوئی۔ مسلم لیگ کو قوت ملی اور سندھ کے قوم پرست وزیر اعلیٰ اللہ بخش سومرو قتل کردیے گئے تھے اور ان کی جگہ سندھ کی وزارت مسلم لیگ نے بنائی تھی اور وزیر اعلیٰ غلام حسین ہدایت اللہ بنے تھے

1944ء میں تقسیم ہند کی قرارداد سندھ اسمبلی میں پیش کی اور کثرت رائے سے منظور ہو گئی۔ 1945ء میں سندھ اسمبلی کے ممبر بنے۔ وزارت سازی پر آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح سے اختلاف پیدا ہو گئے تو مسلم لیگ سے الگ ہو کر مسلم لیگی حکومت کے خلاف حزب مخالف کے لیڈر بن گئے اور کچھ مسلم لیگی ممبران جن میں میر بندے علی تال پوری بھی شامل تھے اپنے ساتھ ملا لئے اور مسلم لیگ کے سر غلام حسین کی وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کردی جو کثرت رائے سے منظور ہو گئی۔ اس صورت حال کے پیش نظر سندھ کے گورنر نے سندھ اسمبلی توڑ دی۔ دوبارہ الیکشن کرانے کا حکم دے دیا۔ جب 1945ء میں ہی سندھ اسمبلی کے دوبارہ الیکشن ہوئے تو جی ایم سید سندھ اسمبلی کے ممبر بھی نہ بن سکے۔

سندھ عوامی محاذ

جی ایم سید مسلم لیگ سے نکل چکے تھے اور پھر 1947ء میں پاکستان بھی بن چکا تھا۔ مسلم لیگ کے علاوہ دیگر تمام جماعتیں 1945ء کے الیکشن میں شکست کھا جانے کے بعد پاکستان میں غیر متحرک ہو چکی تھیں اور سیاست پر صرف مسلم لیگ کی ہی اجارہ داری قائم ہو چکی تھی۔ اپنی ذات کے حوالے سے وہ اس دور میں کسی حد تک متحرک رہے۔ حکومت کے ایوانوں میں جاتے انہیں سندھ کراچی میں اس وقت مہاجرین کی آمد پر سندھ کے خدشات سے سندھی حکومت کو آگاہ کرتے اور کہتے تھے۔ کہ وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب سندھی اپنے ہی دیش میں اقلیت ہو جائیں گے۔ 1949ء میں انہوں نے بادشاہ خان سے ملکر نئی جماعت پیپلز پارٹی بنائی مگر یہ جماعت بھی نہ چل سکی۔ خان عبدالغفار خان گرفتار کر لیے گئے اور یہ جماعت بنتے ہی ختم ہو گئی۔ 1951ء کے صوبائی الیکشن میں مسلم لیگ کے علاوہ سندھ میں

کوئی جماعت بھی نہ تھی۔ سیاست پر اجارہ داری مسلم لیگ کی ہی قائم ہو چکی تھی۔ ایسی حالت میں مسلم لیگ اور حکومت کے خلاف ایک متبادل طاقت پیدا کر دینا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ انہوں نے مسلم لیگ کے خلاف ایک سیاسی محاذ قائم کردیا جس کا نام انہوں نے سندھ عوامی محاذ رکھا۔ جس کے صدر شیخ عبدالمجید سندھی بنے جس کے نمایاں لیڈروں میں غلام مصطفیٰ بھرگری' جی ایم سید' پیرالٰہی بخش اور دیگر بہت سارے لوگ بھی شامل تھے۔ سندھ عوامی محاذ نے 1951ء کے صوبائی اسمبلی الیکشن میں سندھ کی پیشتر سیٹوں پر اپنے امید وار کھڑے کیے تھے۔ اس وقت مسلم لیگ کے خلاف الیکشن لڑنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ جب کہ سندھ اسمبلی کی 50 سیٹوں میں سے انہوں نے 10 نشستیں حاصل کیں اور جی ایم سید سندھ عوامی محاذ اسمبلی پارٹی کے لیڈر بنے۔ اور سندھ کے اپوزیشن لیڈر بھی جناب جی ایم سید ہی بنے تھے۔ 1955ء میں ون یونٹ بنائے جانے کا چرچہ عام ہو چکا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ختم کر کے ایک صوبہ مغربی پاکستان بنایا جائے۔ سندھ اسمبلی میں بھی ون یونٹ کی قرارداد حکومت سندھ کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ اس قرارداد کی سندھ عوامی محاذ نے مخالفت کی مگر حکومتی پارٹی کی طاقت سندھ اسمبلی میں زیادہ تھی اس وجہ سے یہ قرارداد کثرت رائے سے منظور ہو گئی۔ حکومت نے ون یونٹ بنا دیا تو اس کے خلاف جدوجہد شروع کردی۔ اسی جدوجہد میں ہی نیشنل عوامی پارٹی معرض وجود میں آئی تھی۔ سندھ عوامی محاذ بھی نیپ میں مدغم ہو گئی اور نیشنل عوامی پارٹی جس میں پاکستان کی دیگر چھ جماعتیں ضم ہو گئی تھیں جن کا ذکر نیشنل عوامی پارٹی کے باب میں آگیا ہے اس میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

جی اے سندھ کا کنونشن

1971ء میں کنونشن ہوا جس میں جی ایم سید' جام ساقی' شیخ عبدالمجید سندھی' ادریس چانڈیو' ارباب خاور اور دیگر بہت سارے لوگ شامل ہوئے جس میں جی اے سندھ تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔ پہلے صدر جناب شیخ عبدالمجید سندھی بنے منشور میں صوبائی خودمختاری زیادہ سے زیادہ صوبوں کو دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ غیر سندھیوں کی سندھ میں آباد کاری کے متعلق تشویش کا اظہار کیا گیا۔ خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ جس طرح غیر سندھیوں کو متواتر سندھ میں آباد کیا جا رہا ہے اس طرح سندھی اپنے ہی ملک میں ایک روز اقلیت میں ہوجائیں گے۔ جی ایم سید جو اس وقت جی اے سندھ کی تحریک کے روح رواں ہیں۔ انہیں زیادہ تر نظر بند ہی رکھا جاتا ہے وہ پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان کے سخت مخالف ہو گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ پاکستان کی وجہ سے سندھی زیادہ مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ ہندوؤں کے چلے جانے کے بعد غیر سندھیوں نے سندھ کی معیشت پر قبضہ کر لیا ہے اور سندھی مسلسل غربت' افلاس میں مبتلا ہیں اور جو شخص سندھ میں سندھی حقوق کی بات کرتا ہے اس پر مقدمات بنائے جاتے ہیں۔ ہراساں کیا جاتا ہے۔ تنگ کیا جاتا ہے جی اے سندھ کے جن لوگوں پر مقدمات کئی دفعہ بنے ان میں گل محمد جکھراتی' حافظ قریشی وکیل' بشیر خان قریشی بھی شامل ہیں۔

جی ایم سید سن ضلع دادو کے زمیندار ہیں ان کے بیٹے سید امیر حیدر شاہ سید امداد شاہ اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے کبھی صوبائی اسمبلی کے ممبر بن جاتے ہیں کبھی قومی اسمبلی کے۔ جی اے سندھ تحریک کا
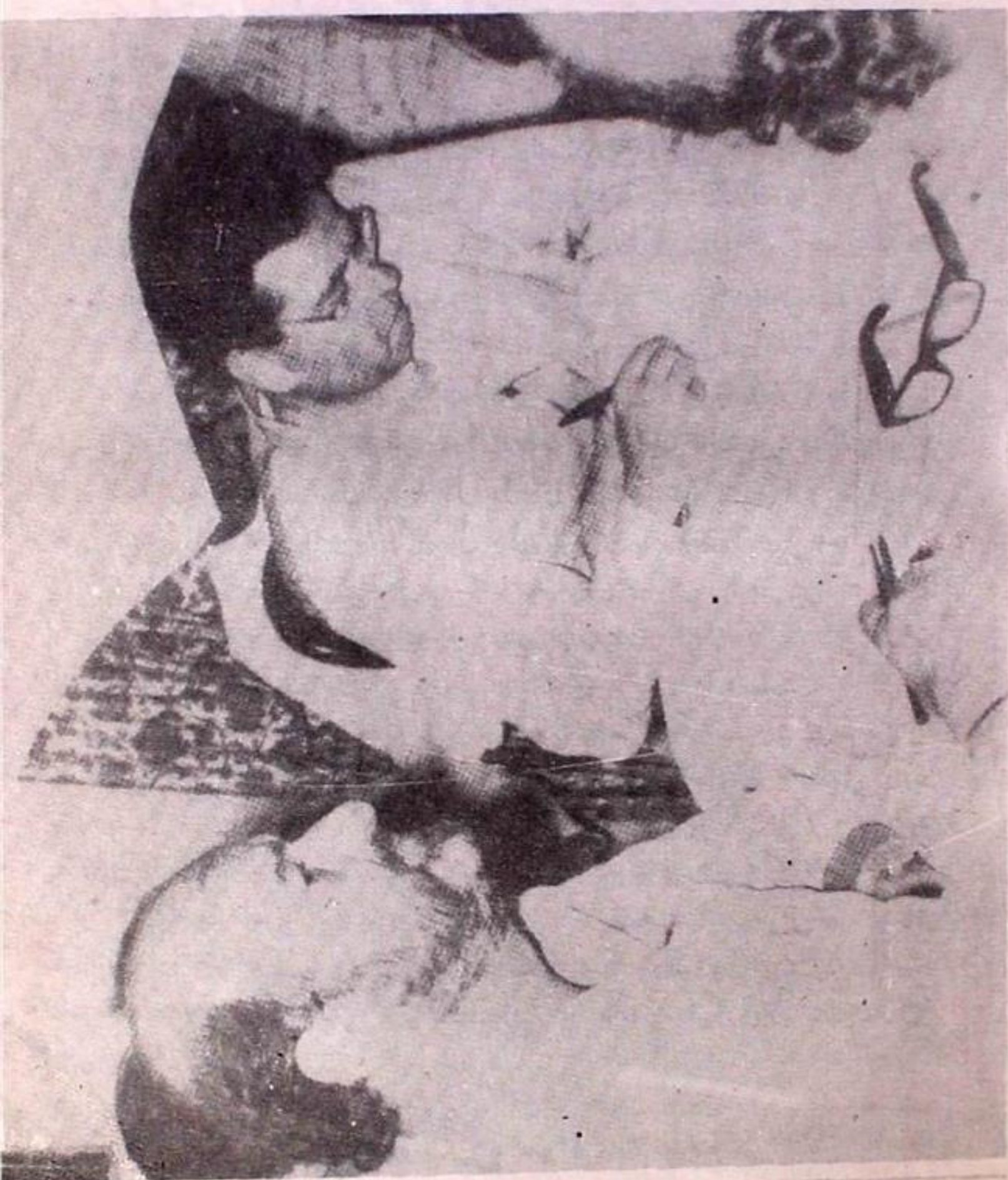
ممتاز بھٹو اور عبدالحفیظ پیرزادہ۔

زیادہ اثر پڑھے لکھے لوگوں میں ہے۔ کالجوں یونیورسٹیوں میں طالب علم کافی جی اے سندھ تحریک کے ساتھ ہوتے ہیں مگر یہ نوجوان جب کالج سے فارغ ہو کر زندگی کے مسائل کا سامنا کرتے ہیں تو وہ مفادات کے حصول کے لیے حکومت پارٹیوں میں شامل ہوجاتے ہیں۔ سن اور ضلع دادو کے شہر اور قصبات میں کئی جگہوں پر جی اے سندھ تحریک کا جھنڈا جو سرخ ہے درمیان میں سفید ہے اور اس پر کلہاڑی کا نشان بنا ہوا ہے - گھروں پر اور دکانوں پر لگا ہوا دیکھا گیا ہے۔ سندھ کے دیگر شہروں میں بھی کہیں کہیں یہ جھنڈا نظر آجاتا ہے۔ پورے سندھ میں جی اے سندھ تحریک کی برانچیں اور کہیں دفاتر بھی موجود ہیں۔ جی ایم سید کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ جن میں یہ کتابیں بھی شامل ہیں۔

1- جن کے ساتھ میں نے زندگی گزاری۔

2- جسے میں نے دیکھا۔

3- سندھ بات کہانی۔ یہ عدالتی بیان ہے۔

4- سندھ کی بمبئی سے علیحدگی۔

یہ سب تصانیف سندھی زبان میں ہیں' ان کی اپنی اکیڈمی ہی ان کو چھاپتی ہے۔

جی ایم سید کی اس وقت عمر 90 سال ہے مگر ان کے حواس ٹھیک ٹھاک ہیں۔ نوجوانوں کو لیکچر بھی دیا کرتے ہیں۔ لندن میں سندھی ورلڈ کانگرس ہوئی تھی جس میں انہیں اعزازی طور پر بذریعہ تصور اجلاس کا صدر بنایا گیا تھا ایک ایجوکیشن کمیٹی بنائی ہوئی ہے۔ جس سے غریب لڑکوں کو جو ہونہار ہوتے ہیں' تعلیم جاری رکھنے کے لیے وظیفہ دیا جاتا ہے۔ غریب بچوں کو کتابیں دی جاتی ہیں۔ سن یا دیگر گوٹھوں میں جہاں سید صاحب کی زمین وغیرہ ہے۔ وہاں سکولوں' درس گاہوں کے لئے زمین مفت دی جاتی ہے۔ اور سید صاحب ان درس گاہوں کی عمارات کے لیے رقم بھی مہیا کرتے ہیں۔ سن میں کالج کے لیے زمین بھی دی اور عمارت کے لیے بھی بہت خطیر رقم دی۔ ابھی تھوڑے عرصہ میں یہ کالج چالو ہوجائے گا۔ سندھ میں لڑکیوں کی تعلیم کے لوگ بہت مخالف ہیں۔ مگر انہوں نے مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے لڑکیوں کی درس گاہیں قائم کیں جو سن میں بھی ہے اور جگہوں پر بھی بنائی گئی ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا ہے کہ جن لوگوں کے بچے غربت کی وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کرسکتے انہیں ایجوکیشن کمیٹی حصول علم کے لیے ہر قسم کی امداد کرے گی۔ جی ایم سید کے اپنے گاؤں سن میں اور دیگر ساتھ کے دیہاتوں میں نسبتا سندھ کے دیگر دیہاتی علاقوں کے پڑھے لکھے لوگ زیادہ ہیں۔ جی اے سندھ تحریک بظاہر کوئی کامیاب تحریک نہیں لیکن سندھیوں کی غربت' جہالت' پسماندگی کی وجہ سے بالاخر ایسی تحریکیں ہی پروان چڑھیں گی۔

سندھ نیشنل موومنٹ

اس جماعت کا مرکز لاڑکانہ میں ہے اس جماعت کے روح رواں جناب ممتاز بھٹو ہیں۔ ممتاز بھٹو صاحب ذوالفقار بھٹو سابق وزیر اعظم پاکستان کے قریبی رشتہ دار ہیں لاڑکانہ کے مضافات میں رتو ڈیرو گاؤں ہے جس کے یہ رہنے والے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے والد کو سرکار انگلشیہ سے سر کا خطاب ملا تھا۔ وہ سر شاہنواز بھٹو کہلواتے تھے۔ جبکہ ممتاز بھٹو کے والد نواب نبی بخش بھٹو تھے یہ بھی سرکار

انگریز کے خطاب یافتہ تھے انہیں نواب کا خطاب ملا ہوا تھا۔

ممتاز بھٹو جنرل ایوب کی صدارت کے زمانے میں سیاست میں آئے اور وہ قومی اسمبلی کے ممبر بنے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو نے پیپلز پارٹی بنائی تو اس میں شامل ہو گئے۔ 1970ء کے الیکشن میں سندھ کی صوبائی اسمبلی کے ممبر بنے اور پیپلز پارٹی کی سندھ اسمبلی کے پارٹی کے لیڈر بنے اور پھر سندھ کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ تقریباً" دو سال تک ممتاز بھٹو سندھ کے وزیر اعلیٰ رہے پھر پارٹی اختلاف کی وجہ سے وزارت سے مستعفی ہو گئے۔ ان کی جگہ سندھ کے وزیر اعلیٰ غلام مصطفیٰ جتوئی بنے۔ جناب ممتاز بھٹو مارشل لاء تک پیپلز پارٹی کے ساتھ رہے بعد میں وہ الگ ہو گئے اور انہوں نے ایک اخباری بیان میں کہا تھا کہ پاکستان کا مستقبل فیڈریشن میں نہیں کنفڈریشن سے ہی محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس لئے پاکستان کے آئین میں تبدیلی ہونی چاہیے اور پاکستان کے چاروں صوبوں کی کنفڈریشن ہونی چاہیے۔ مرکز کو صوبوں پر حاوی نہیں ہونا چاہیے جو اختیارات صوبے مرکز کو دیں وہی اختیارات مرکز کے پاس ہونے چاہئیں۔ مارشل لاء کی وجہ سے عملی سیاست مفلوج ہو چکی تھی۔ سیاسی پارٹیاں تھیں مگر جمہوریت نہ تھی۔ الیکشن نہیں ہو رہے تھے اگر ہو بھی رہے تھے تو وہ غیر جماعتی انتخابات تھے جن سے سیاسی جماعتوں کو اہمیت نہ تھی۔

1989ء میں جناب ممتاز بھٹو لندن گئے وہاں پر ان کی ملاقات بلوچستان کے سابق وزیر اعلیٰ سردار عطاء اللہ خان مینگل سے اور سرحد کے جناب افضل بنگش ایڈووکیٹ سے ہوئی۔ باہم ان تینوں لیڈروں کے مشورے ہوئے پھر اور لوگوں کو بھی جو پاکستان کے ان تینوں چھوٹے صوبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان سے ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ ایک جماعت تشکیل دی گئی جس کا نام سندھی بلوچی پختونی اتحاد رکھا گیا یہ جماعت لندن میں ہی بنی تھی وہاں سے ہی اس کا اعلان کیا گیا تھا۔ منشور میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ پاکستان کے چھوٹے صوبے عملاً" غلام ہیں جب تک انہیں پورے حقوق حاصل نہیں۔ اس وقت تک ان کی پسماندگی ختم نہیں ہو گی۔

1988ء کے انتخابات کے نتیجہ میں پاکستان کے اندر سندھ میں پختون بلوچ سندھ اتحاد کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں فیصلہ ہوا کہ علاقائی پارٹیاں بنائی جائیں۔ اس فیصلے کے پیش نظر بلوچستان میں بلوچستان نیشنل موومنٹ بنائی گئی جس کا تذکرہ ہم نے الگ کیا ہے۔ صوبہ سرحد میں نیشنل موومنٹ نہ بن سکی اس لئے کہ افضل بنگش صاحب فوت ہو چکے تھے دیگر کوئی ایسی قد آور شخصیت نہ تھی جو پارٹی تشکیل دے سکتی۔

سندھ نیشنل موومنٹ کا کنونشن

1989ء میں حیدر آباد کے ایک بڑے فائیو سٹار ہوٹل میں تقریباً" ایک ہزار لوگوں کا اجتماع ہوا۔ جس میں جناب ممتاز بھٹو، نواب یوسف تالپور، نبی بخش بھرگری، جمیل سومرو، ڈاکٹر روشن بھی شامل تھے۔ سندھ نیشنل موومنٹ قائم کی گئی اور اس کے چیئرمین جناب ممتاز بھٹو بنائے گئے اور اس وقت بھی یہی چیئرمین ہیں۔ 1990ء کے الیکشن میں کئی امیدوار کھڑے کیے گئے مگر کوئی بھی کامیابی نہ ہوئی قومی اسمبلی کے الیکشن نتائج کو دیکھتے ہوئے صوبائی الیکشن کا مقاطعہ کر دیا گیا۔ 1993ء کے الیکشن میں

صوبائی اسمبلی کے تقریباً 12 امیدوار کھڑے کیے مگر صرف کامیابی جناب ممتاز بھٹو کو نصیب ہوئی وہ اس وقت سندھ اسمبلی میں سندھ نیشنل مومنٹ کے واحد ممبر ہیں۔ اپوزیشن کے بنچوں پر بیٹھتے ہیں۔ پارٹی کے منشور میں ہے کہ چاروں صوبوں کی قومیتیں مانی جائیں۔ صوبائی خود مختاری دی جائے۔ برابری کی بنیاد پر قوموں کے حقوق دیے جائیں۔ اس لیے کہ پاکستان بنتے وقت قومیتوں کے حقوق کو تسلیم کیا گیا تھا۔ وفاق کے پاس کم سے کم اختیارات ہوں گے زیادہ اختیارات صوبوں کے پاس ہوں۔ صوبوں کی حیثیت ریاست جیسی ہو اور مرکز کی حیثیت متحدہ ریاستوں جیسی ہو جیسے یونائیٹڈ اسٹیٹ آف امریکہ کی ریاستوں کو اختیارات ہیں وہی اختیارات ریاستوں کو ہونے چاہئیں۔ سندھ میں نوکریوں کا حق صرف سندھیوں کو ہونا چاہیے۔ غیر سندھیوں کو سندھی وسائل پر قبضہ کرنے کو کوئی حق نہیں ہونا چاہیے۔ جو لوگ کراچی حیدر آباد وغیرہ میں رہتے ہیں وہ سندھی بن کر رہ سکتے ہیں۔ سندھ کے آقا بن کر نہیں رہ سکتے۔

سندھ نیشنل مومنٹ کے لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں قوموں کے حقوق کی بات سنی جاتی ہے اس لیے سندھ کے دانشور پر امید ہیں کہ ان کی بات بھی سنی جائے گی اور سندھیوں کے حقوق تسلیم ہوں گے۔ سندھ میں اور بھی کئی تنظیمیں جن میں جی اے سندھ بھی شامل ہے' یہ لوگ پاکستان کی فیڈریشن کے خلاف ہیں۔ کنفڈریشن کی بات کرتے ہیں۔ ان کا واضح موقف ہے کہ مرکز کے پاس کم سے کم اختیارات ہوں اور زیادہ سے زیادہ اختیارات صوبوں کے پاس ہوں اور صوبوں پر مرکز کا جبر بھی نہ ہو۔

عوامی تحریک پلیجو گروپ

عوامی تحریک پلیجو گروپ کے بانی جناب رسول بخش پلیجو ہیں۔ یہ پیشہ وکالت سے تعلق رکھتے ہیں۔ صوبہ سندھ کے ضلع تھرپارکر کے رہنے والے ہیں۔ مگربعد میں سکھر آکر آباد ہو گئے تھے۔ بنیادی طور پر ترقی پسند کمیونسٹ نظریات کے حامل ہیں۔ انہوں نے سیاست کی ابتداء نیشنل عوامی پارٹی کے پلیٹ فارم سے کی تھی۔ سندھ نیشنل عوامی پارٹی کے صدر بھی رہے اور جب نیشنل عوامی پارٹی کو بھٹو دور میں خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور این اے پی کے لیڈران پر مقدمات کی پیروی کے لیے این اے پی کے وکلاء کا ایک پینل قائم کیا گیا تھا اس میں جناب رسول بخش پلیجو بھی شامل تھے۔ نیشنل عوامی پارٹی کے خلاف قانون ہوجانے کے بعد رسول بخش پلیجو صاحب نے اپنی الگ جماعت بنا لی جس کا نام عوامی تحریک رکھا گیا۔ پلیجو صاحب میں نوجوانوں کو پیچھے لگانے کی صلاحیت تھی انہوں نے کافی نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو پیچھے لگا لیا اور اچھی خاصی طاقت حاصل کر لی مگر یہ طاقت ہجوم عاشقاں جیسی نہ تھی جو ملکی الیکشن یا صوبوں کے الیکشنوں میں کوئی کامیابی دلا دیں۔

پلیجو صاحب کی جماعت صرف نظریاتی لوگوں پر ہی مشتمل تھی جس کے ورکر جتنے بھی تھے وہ سیاسی شعور اور نظریات سے مسلح تھے مگر ان کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی۔ دیگر اس میں حیران کن بات یہ بھی تھی کہ سندھ جیسے ذہنی پسماندہ صوبے میں عوامی تحریک میں نوجوان لڑکیاں بھی کافی تعداد میں تھیں۔
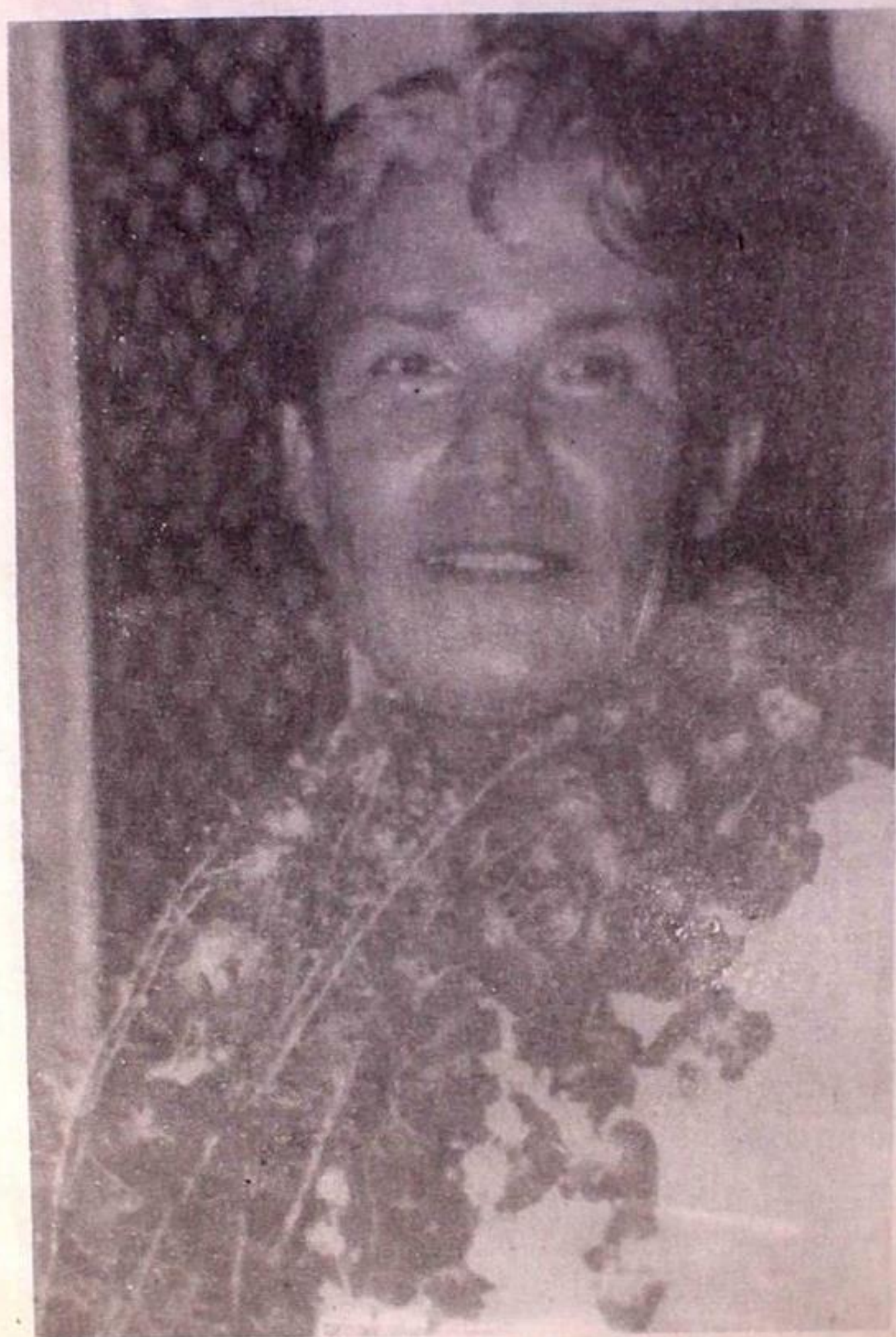
رسول بخش پلیجو
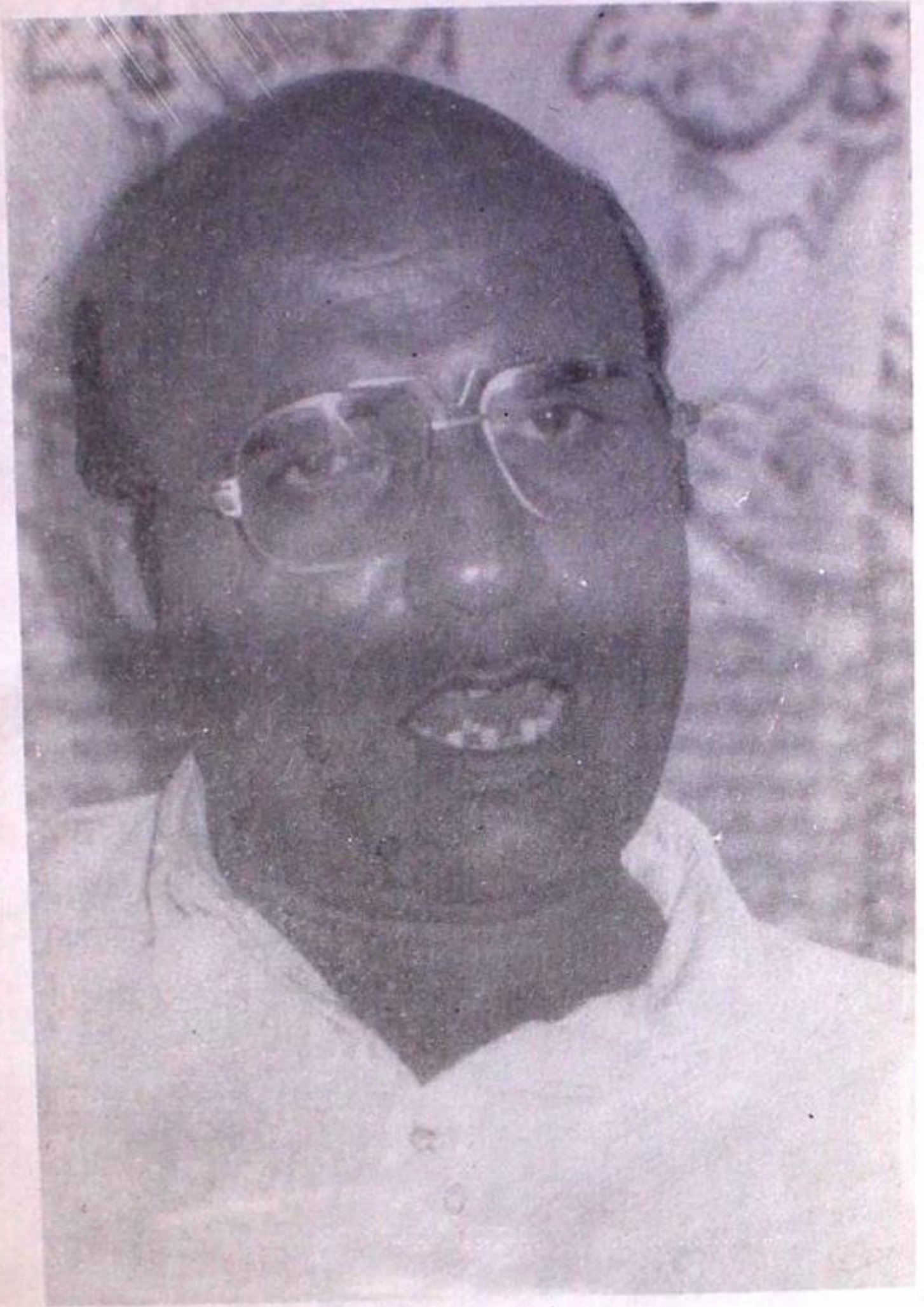
فاضل راہو شہید

1987ء میں جب صوبہ سرحد کے سرخ پوشوں نے محسوس کیا کہ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی میں وہ شیر باز مزاری کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ نئی جماعت بنانے کی ضرورت محسوس کی گئی اور عوامی نیشنل پارٹی معرض وجود میں آ گئی۔ عوامی تحریک پلیجو گروپ نے اپنی الگ حیثیت ختم کر کے عوامی نیشنل پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ جناب رسول بخش پلیجو عوامی نیشنل پارٹی کے جنرل سیکرٹری بن گئے۔

1989ء کے عام انتخابات میں عوامی نیشنل پارٹی کے 14 چودہ ارکان صوبائی اسمبلی میں کامیاب ہوئے تھے باقی کسی بھی صوبے میں عوامی نیشنل پارٹی کو کوئی سیٹ نہیں ملی تھی۔ عوامی نیشنل پارٹی اور پیپلز پارٹی نے سرحد میں مخلوط حکومت بنائی۔ تھوڑے عرصہ بعد دونوں جماعتوں میں اختلاف پیدا ہو گئے۔ اور کولیشن حکومت ختم ہو گئی۔ اس کولیشن حکومت کے خاتمے سے قبل عوامی نیشنل پارٹی کی مرکزی کونسل کا اجلاس بلایا گیا تھا۔ جس میں پیپلز پارٹی کے ساتھ کولیشن حکومت کے خاتمہ پر بحث کی گئی رسول بخش پلیجو صاحب اور ان کے سندھی ساتھیوں کی رائے یہ تھی کہ پیپلز پارٹی کے ساتھ کولیشن ختم نہ کی جائے مگر دیگر تمام صوبوں کی پارٹیوں نے پیپلز پارٹی کے ساتھ حکومت میں کولیشن ختم کرنے کی حمایت کی تھی۔ جس کے نتیجے میں انتشار پیدا ہو گیا بائیں بازو کے خیالات رکھنے والے بہت سے لوگ بشمول رسول بخش پلیجو عوامی نیشنل پارٹی سے الگ ہو گئے اور انہوں نے دوبارہ اپنی پارٹی عوامی تحریک بحال کر لی۔ مگر اس دوران ایک واقعہ یہ بھی ہوا کہ مولانا طاہر القادری صاحب نے بھی اپنی جماعت بنا لی جس کا نام عوامی تحریک رکھا گیا تھا۔ اب پلیجو صاحب نے اپنی پرانی جماعت بحال کر لی جس کا نام عوامی تحریک ہی رکھا اب ایک نام کی دو جماعتیں ہو گئیں۔ اس لیے ان جماعتوں کو ان کے قائدین کے نام سے ہی گروپ کے طور پر پکارا جانے لگا۔

عوامی تحریک پلیجو گروپ کے اثرات کسی حد تک اندرون سندھ میں ہیں۔ یہ ایک بائیں بازو کی ترقی پسند سیاسی جماعت ہے کسی قسم کے الیکشن جیتنے کی حیثیت میں نہیں۔ اور اس جماعت کے کارکن جناب رسول بخش پلیجو کے گرد ہی گھومتے ہیں انہی سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

عوامی تحریک (طاہر القادری)

حضرت مولانا محمد طاہر القادری ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے اور پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ ایم اے ایل ایل بی، پی ایچ ڈی کر لینے کے بعد چکوال میں کالج کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ 1980ء میں لاہور میں تبادلہ ہو گیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر بن گئے۔ اسی زمانہ میں شادمان لاہور کی ایک مسجد میں خطبہ جمعہ دیا کرتے تھے۔ سابق وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف کے والد میاں محمد شریف نے ان کا خطبہ جمعہ سنا اور انہیں طاہر القادری کے انداز بیان اور علمیت نے بہت متاثر کیا میاں شریف صاحب کی درخواست پر جناب طاہر القادری صاحب نے جامع مسجد اتفاق میں خطبہ جمعہ پڑھانے کی پیش کش قبول کر لی اور مستقل طور پر جامع مسجد اتفاق کے خطیب بن گئے اس سے قبل ادارہ منہاج القرآن قائم ہو چکا تھا۔ ضیاء الحق کے دور حکومت میں میاں محمد شریف کا اتفاق خاندان کافی نام ور ہو چکا تھا۔ میاں نواز شریف 1984ء کے غیر جماعتی انتخابات میں پنجاب اسمبلی کے ممبر بن جانے کے بعد پنجاب کابینہ کے سینئر وزیر بھی بن چکے تھے اور میاں نواز شریف کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ہی مولانا طاہر القادری

صاحب کو ٹیلی ویژن پر اسلامی تعلیمات کے عنوان سے تقاریر کرنے کے کئی بار مواقع ملے ان کی شہرت پنجاب یونیورسٹی یا لاہور کی جامع مسجد اتفاق سے نکل کر پورے پاکستان میں پھیل گئی اور وہ پاکستان کے بہت بڑے مذہبی سکالرز میں شمار ہونے لگ گئے اور ساتھ ہی ان کے مذہبی رجحانات کو عوام کے ایک بڑے طبقے میں قبولیت حاصل ہو گئی اور لوگ ادارہ منہاج القرآن کے ساتھ وابستہ ہونے شروع ہو گئے۔ علامہ طاہر القادری صاحب نے منہاج القرآن کو ترقی دینے کے لیے ایک اسلامی یونیورسٹی اور اس کے ساتھ ملحقہ عمارت تقریباً" 50 2 یکڑ رقبہ پر لاہور ٹاؤن شپ میں بنائی گئی ہیں۔ جہاں پر تعلیم تدریس کا سلسلہ جاری ہے اور ساتھ ہی ماڈل ٹاؤن میں تقریباً" ایکڑ رقبہ پر بہت ہی شاندار عمارت میں منہاج القرآن کا سیکرٹریٹ بنا ہوا ہے جس میں تمام ادارے کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ٹاؤن شپ کی زمین جو کہ تقریباً" 50 ایکڑ سے زائد ہے اور ماڈل ٹاؤن سیکریٹ کی زمین جو کہ 2 ایکڑ سے زائد ہے یہ سرکاری زمین تھی جو کہ اس وقت اربوں روپے کی قیمت رکھتی ہیں۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ سابق وزیر اعظم جب پنجاب کے وزیر اعلیٰ یا سینئر وزیر تھے تو ان کے اثر و رسوخ یا احکامات کی وجہ سے یہ سرکاری زمین انہیں ملی ہے۔ اس وقت ان زمینوں کی اربوں روپے مالیت ہے۔ ڈاکٹر طاہر القادری صاحب 1989ء تک نواز شریف خاندان کے ساتھ وابستہ رہے اور جامع مسجد اتفاق کے خطیب رہے جب بے نظیر کی حکومت 1989ء میں تھی اس وقت ڈاکٹر طاہر القادری نے میاں شریف خاندان سے قطع تعلق کر لیا اور ذاتی حیثیت سے وہ پبلک میں متعارف ہونا شروع ہو گئے اور ساتھ ہی انہوں نے کئی بار اعلان بھی کیا کہ میرا تعلق اب میاں شریف خاندان سے قطعی نہیں ہے اور میں شریف خاندان سے الگ ہو گیا ہوں اور انہوں نے اپنی سیاسی جماعت بنانے کا اعلان کردیا اور اس کے لیے انہوں نے 25 مئی 1989ء کو موچی دروازے میں ایک پبلک جلسہ بلایا جس میں لوگوں کو اس کشش پر بلایا گیا کہ وہ بتائیں گے کہ اسلام میں بغیر سود کے بنکاری کا نظام چل سکتا ہے۔ اس جلسے میں تقریباً" ایک لاکھ لوگ جمع ہوئے بغیر سود کے بنکاری کا نظام تو نہیں بتا سکے مگر انہوں نے اس بہت بڑے اجتماع میں اپنی نئی سیاسی جماعت عوامی تحریک کا اعلان کردیا اور خود ہی اس کے چیئرمین بھی بن گئے۔ عوامی تحریک جماعت کا اعلان ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے بھی کیا گیا تھا اور انہوں نے 1990ء کے انتخابات میں حصہ لینے کا عزم بھی کیا اور بہت سارے حلقوں میں عوامی تحریک کے امیدوار کھڑے کیے گئے اور قادری صاحب نے اپنے کھڑے کیے ہوئے جماعت کے امیدواروں کی کامیابی کی جدوجہد بھی کی مگر پورے پاکستان میں ایک بھی امید وار کامیاب نہیں ہوا۔ اس کے نتیجہ کو دیکھتے ہوئے پروفیسر طاہر القادری صاحب نے اپنی جماعت عوامی تحریک کو سیاست کی خاردار وادی سے نکال لینے کا اعلان کردیا اور فرمایا کہ عوامی تحریک آئندہ قطعی سیاست میں حصہ نہیں لے گی اور صرف تبلیغی کام ہی کرے گی۔
اس وقت ادارہ منہاج القرآن کے دفاتر ملک میں بہت جگہوں پر موجود ہیں اور وہ تبلیغ دین کا ہی کام کرتے ہیں۔ طریقہ یہ بھی ہے کہ قادری صاحب کی کیسٹیں بھی لوگوں کو دی جاتی ہیں جس میں مذہبی تبلیغ کا درس اور دیگر احکام دین کے متعلق ہی ہدایات ہوتی ہیں۔

مزدور کسان پارٹی

مزدور کسان پارٹی 1967ء میں قائم ہوئی اس جماعت کے بانی اراکین میں ریٹائرڈ میجر محمد اسحاق' محمد افضل بنگش ایڈووکیٹ' غلام نبی کلو اور دیگر بہت سارے بائیں بازو کے سوشلسٹ خیالات رکھنے والے کارکن تھے۔ یہ لوگ اپنی الگ تنظیم بنانے سے قبل نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ وابستہ تھے۔ قبل ازیں نیشنل عوامی پارٹی کے واضح دو گروپ' بھاشانی گروپ اور ولی خان گروپ بن چکے تھے۔ مزدور کسان پارٹی بنانے والے ورکران اور عہدیداران ولی خان گروپ کے ساتھ وابستہ تھے۔ اس زمانے میں نیشنل عوامی پارٹی "ولی خان گروپ" کا دفتر لاہور میں غازی عبدالرحمٰن مرحوم کی کوٹھی میوہسپتال کے قریب مسجد مائی لاڈو کے سامنے ہوا کرتا تھا۔ نیشنل عوامی پارٹی ولی گروپ پنجاب کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا کے دوران اجلاس ہی تہہ شدہ منصوبہ کے مطابق تقریباً" نصف کے قریب لیڈران اور کارکنان جن میں میجر اسحاق اور غلام نبی کلو' کامریڈ بشیر فضل احمد ڈار' سید سبط الحسن ضیغم اور دیگر تقریباً" پچاس کے قریب کارکنان مارکسٹ نظریات رکھنے والے شامل تھے۔ نیشنل عوامی پارٹی سے اختلاف کرتے ہوئے الگ ہوگئے۔ اسی دفتر میں الگ اپنی میٹنگ کی اور بعد میں صوبہ سرحد کے جناب محمد افضل بنگش ایڈووکیٹ اور دیگر لوگوں کے ساتھ مل کر مزدور کسان پارٹی کی بنیاد رکھی' یہ پارٹی مارکسٹ نظریات رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ مگر عملی طور پر یہ جماعت ہمیشہ نیشنل عوامی پارٹی ولی گروپ کی مخالف رہی۔ 1973ء میں جب نیشنل عوامی پارٹی ولی گروپ کی صوبہ سرحد میں کولیشن حکومت تھی تو پیپلزپارٹی کی امداد سے مزدور کسان پارٹی والوں نے اس حکومت کے خلاف بہت کام کیا اور جب تک نیشنل عوامی پارٹی کی کولیشن حکومت ختم نہیں ہوگئی ان کی جدوجہد جاری رہی۔ جب عوامی نیشنل پارٹی بنی تو اس میں مزدور کسان پارٹی کا ایک گروپ سردار شوکت علی اور لطیف آفریدی کی قیادت میں عوامی نیشنل پارٹی میں شامل ہوگئے۔ مگر 1989ء میں پھر اختلاف کرتے ہوئے مزدور کسان پارٹی کے یہ لوگ عوامی نیشنل پارٹی سے الگ ہوگئے۔ اس وقت مزدور کسان پارٹی انتشار کا شکار ہے۔ کئی گروپوں میں تقسیم ہے۔ میجر اسحاق اور فضل بنگش صاحب کی وفات کے بعد ان میں کوئی قدر آور شخصیت نہیں رہی منتشر قسم کے چند ورکر ہیں جو کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔ مزدور کسان پارٹی کی کبھی اور کسی جگہ بھی ایسی حیثیت نہیں رہی کہ وہ ملکی انتخابات میں نمائندے کھڑے کرکے کسی بھی ملکی اسمبلی میں کوئی ممبر کامیاب کراسکیں۔ اس لئے مزدور کسان پارٹی کو ہم ایک سیاسی گروپ تو کہہ سکتے ہیں مگر سیاسی جماعت نہیں کہہ سکتے۔

آخری باب

کتاب کے اختتام سے قبل حالات حاضرہ کے متعلق لکھنا اور اس پر تبصرہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اس وقت ۱۹۹۵ء میں ملک پاکستان پر بے نظیر بھٹو کی پیپلزپارٹی حکمران ہے۔ بے نظیر صاحبہ کی حکمرانی اس وقت بہت ہی مضبوط ہے۔ امریکی حکومت کی پوری حمایت اس کے ساتھ ہے۔ ملک میں فوج اور نوکر شاہی بھی پوری طرح معاون ہے۔ کسی حد تک اسمبلی میں مخالفت ہے' مگر پاکستان میں وہی سیاسی جماعت مضبوط ہے جس کے ساتھ سول اور فوجی افسران ہوں' امریکہ ہو' یہ تینوں طاقتیں اس وقت بے نظیر صاحبہ کی حکمرانی کے ساتھ ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں بھی بے نظیر صاحبہ کی حکمرانی تھی مگر صدر پاکستان ان کی اپنی پارٹی کے نہ تھے' اس وقت صدر پاکستان بھی پیپلزپارٹی کے فاروق احمد خان لغاری صاحب ہیں۔ اسمبلی میں بھی بے نظیر صاحبہ کی معقول حد تک اکثریت ہے' کسی قسم کے عدم اعتماد کا کوئی خطرہ نہیں۔ صوبائی حکومتیں بھی انہیں کے تابع فرمان ہیں اگر ملکی ترقی کے لئے پیپلزپارٹی کی حکومت کوئی بھی قدم اٹھائیں ان کے آگے کوئی امر مانع نہیں وہ ہر اعتبار سے مضبوط حکمران ہیں۔

۱۹۹۳ء کے الیکشن کے نتیجہ میں صوبہ سرحد کی حکومت عوامی نیشنل پارٹی اور مسلم لیگ کولیشن کی بنی تھی۔ اس حکومت کو ایوان میں چند لوگوں کی اکثریت حاصل تھی مگر یہ کولیشن حکومت بے نظیر صاحبہ کو بالکل پسند نہ تھی صرف دو ماہ بعد ہی گورنر نے اس حکومت کو برطرف کردیا' پھر دھونس اور لالچ سے مسلم لیگ اور عوامی نیشنل پارٹی کے ممبران کو توڑا گیا اور جب گورنر سرحد نے یقین کرلیا کہ اب پیپلزپارٹی کی کولیشن کو سرحد اسمبلی میں اکثریت حاصل ہوگئی ہے تو پیپلزپارٹی کی اسمبلی پارٹی کے لیڈر جناب آفتاب احمد شیرپاؤ کو صوبہ سرحد کی حکومت بنانے کی دعوت دی گئی' اور پیپلزپارٹی کی حکومت بھی آجانے کے کئی روز بعد جب پوری طرح یقین ہوگیا کہ اب اسمبلی میں یقینی اکثریت ہوگئی ہے تو اسمبلی کا اجلاس بلایا گیا اور عوامی نیشنل پارٹی کے سپیکر اسمبلی صوبہ سرحد کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کردی گئی' جو کہ کامیاب ہوگئی اور سپیکر سرحد اسمبلی کو ہٹادیا گیا اور پیپلزپارٹی کے سپیکر اسمبلی کو منتخب کرلیا گیا۔ یہ صدا عدالتوں تک گئی مگر حکومت کی جیت ہوئی۔

بلوچستان میں اس وقت مخلوط حکومت ہے جس میں کئی پارٹیاں شامل ہیں سربراہ حکومت جناب نواب ذوالفقار علی مگسی ہیں۔ جس وقت سے نیشنل عوامی پارٹی کو خلاف قانون کیا گیا ہے اس وقت سے بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی ہی چھ حصوں میں تقسیم ہوچکی ہے میں جب زیر نظر

کتاب کے متعلق معلومات کی غرض سے کوئٹہ گیا تو کئی سیاسی پارٹیوں کے ورکروں سے اس قدر زیادہ مقامی پارٹیوں کے بارے میں بات چیت ہوئی کہ مجھے تو ایک ذہین قسم کے ورکر نے کہا کہ بلوچستان کی مقامی جماعتیں جمع ہوجاویں تو یہ ذہنی طور پر قوم پرستوں کی جماعت ہوگی اور یہ جماعت بلوچستان سے الیکشن بھی جیت جاوے گی۔

مگر مرکزی حکومت کا پالیسی ساز ادارہ یہ نہیں چاہتا کہ بلوچستان میں قوم پرست لوگوں کی کوئی مضبوط حکومت بنے اس وجہ سے حکومتی ادارے نے قوم پرست جماعتوں کو ایک جگہ جمع نہیں ہونے دیا انہیں اختلاف کو اجاگر کیا جاتا رہتا ہے یہ آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور حکومتی اعلیٰ با اختیار اداروں کی کوئی پریشانی بھی نہیں ہوتی اور جمہوریت بھی قائم رہتی ہے بلوچستان کسی کولیشن حکومت چھ جماعتوں پر مشتمل ہے' اور کولیشن میں شامل تمام ممبران اسمبلی صوبائی وزیر ہیں۔

سندھ میں اس وقت پیپلزپارٹی کی حکومت ہے۔ مہاجر قومی موومنٹ کے ارکان اسمبلی حزب مخالف میں بیٹھے ہیں سندھ میں تصادم کی سی کیفیت ہے' جس کا ذکر ہم پہلے بھی کرچکے ہیں اور مزید تصادم کا تذکرہ کسی اور سطور میں کریں گے۔ پنجاب میں پیپلزپارٹی اور مسلم لیگ جونیجو گروپ کی کولیشن حکومت ہے اور یہاں منظور احمد وٹو پنجاب کے وزیراعلیٰ ہیں۔ پنجاب میں حزب اختلاف کے نواز شریف گروپ کی پوزیشن بھی بہت مضبوط ہے۔ اسمبلی میں چند ووٹوں کی اکثریت سے ہی حکومت چل رہی ہے اور حکومتی کولیشن کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔

پاکستان پر جن عناصر کی حکمرانی ہے ان میں سرفہرست امریکی حکومت کے محکمہ خارجہ کا وہ دفتر ہے جو پاکستان کی سیاست کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس دفتر کی منشاء کے بغیر پاکستان کی سیاست چل بھی نہیں سکتی حکومت امریکہ کی مرضی سے ہی پاکستان کی سیاست میں تغیر رونما ہوتے ہیں۔

پاکستان کی سیاست پر کنٹرول اعلیٰ فوج اور نوکر شاہی کے پاس ہے۔

ان دونوں اداروں کی مرضی سے ہی سیاست میں کوئی تبدیلی آتی ہے۔ ان اداروں میں کافی تعداد میں امریکہ کے خاص آدمی ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں۔

سیاست دانوں کا شمار نمبر ۳ میں آتا ہے کسی بھی سیاسی جماعت جس نے حکمرانی حاصل کرنی ہو اس کے لئے پبلک کی حمایت کے ساتھ ساتھ حکومت امریکہ کی حمایت' فوج اور نوکر شاہی کی حمایت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے' ایسی سیاسی جماعت جسے امریکہ فوج اور نوکر شاہی کی حمایت حاصل نہ ہوگی اگر اسے لوگوں کی حمایت حاصل بھی ہے تب بھی اسے کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا اخبارات' ریڈیو' ٹیلی ویژن کے ذریعے ایسی جماعت کو بدنام کیا جاتا ہے۔ کردار کشی کی جاتی ہے۔ اگر کوئی جماعت فوج کی مرضی کے بغیر الیکشن جیت بھی لے تو اسے اقتدار نہیں دیا جاتا' جیسے مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے ساتھ ہوا۔ ملک دو ٹکڑے کرلیا مگر عوامی لیگ کو الیکشن جیت

جانے کے باوجود اقتدار نہیں دیا گیا صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی نے الیکشن جیت لیا مگر انہیں اقتدار نہیں دیا گیا بالاخر نیشنل عوامی پارٹی کو کچل دیا گیا۔ صرف یہ امر جماعتوں تک ہی محدود نہیں اگر انفرادی طور پر کوئی بھی شخص سیاست میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اسے بھی مقامی حکمرانوں کی رضامندی سے ہی سیاست میں داخلہ ملے گا ورنہ اسے کسی منصب کے حصول میں ناکام بنادیا جائے گا۔ کردار کشی کی جائے گی' اس سے زیادہ بھی اگر حکمران ضرورت محسوس کریں گے تو وہ بھی کر گزریں گے۔

نفع بخش سرکاری ملازمتیں خصوصی طور پر عام سرکاری ملازمین عمومی طور پر افسران کے بچوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ دوسرے غیر ممبران اسمبلی و پارلیمنٹ کو باقاعدہ کوٹہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جن کو چاہیں ملازمتیں دیں اول تو سرکاری افسران اور ممبران پارلیمنٹ و اسمبلی وغیرہ اپنے عزیز و اقارب کو ہی ملازمتیں دیتے ہیں اگر کوئی جاب ان سے بچ جائے تو وہ "قیمتاً" فروخت کی جاتی ہے۔ اس وقت تھانے دار' تحصیل دار' سول جج' انکم ٹیکس افسر اور دیگر اسی قسم کی ملازمتوں کی قیمت پانچ لاکھ روپے سے لے کر دس لاکھ روپے تک ہے۔

پاکستان میں ٹیکس گزار کو ذلیل ترین مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ لاکھوں روپے ٹیکس دینے والے شہری کو ایک ٹیکس انسپکٹر ذلیل کر سکتا ہے۔ ٹیکس افسر قید کر سکتا ہے محکمہ ٹیکس کے چھوٹے اہل کار بھی دھونس ڈال کر رشوتیں وصول کرتے ہیں۔ ٹیکس گزار کو ٹیکس چور کہا جاتا ہے اور جو لوگ گورنمنٹ کے خزانہ کو لوٹ رہے ہیں وہ پاکستان میں عزت دار ہیں۔

انگریز کے دور حکومت میں ٹیکس گزار کی عزت کی جاتی تھی عدالتوں میں' دفاتر میں' ٹیکس گزار کو باعزت کرسی پیش کی جاتی تھی' اس وقت بھی جو لوگ یورپ جاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ تمام ترقی یافتہ ممالک بشمول امریکہ کے ٹیکس گزار کی عزت و احترام ہے اور جو لوگ ان ترقی یافتہ ممالک میں سکونت اختیار کرنے جاتے ہیں ان میں اگر کسی کو ایسی نوکری مل جائے جس سے گورنمنٹ کو ٹیکس ملتا ہو تو اسے جلدی شہریت دی جاتی ہے۔

رشوت

اس وقت ملک میں رشوت خوری کا یہ عالم ہے کہ ۹۹ فی صد سول سرکاری ملازمین میں رشوت خور ہیں چاہے کتنا ہی جائز کام ہو رشوت کے بغیر افسران یا ملازمین سرکار نہیں کریں گے بغیر رشوت کے بڑے لوگوں' ایم این اے' ایم پی اے اور افسران کے ذاتی کام ہوجاتے ہیں' عوام کے کام بغیر رشوت کے ہونے کا تصور بھی نہیں ہے پولیس' عدلیہ' انتظامیہ' بلدیاتی ادارے' ٹیکس وصول کرنے والے محکمہ مالیات کے اداروں میں رشوت انتہائی اونچے درجے کی ہے۔ دیگر کوئی

محکمہ بھی ایسا نہیں جس کا تعلق عوام سے ہو اور وہاں رشوت نہ ہو۔

حکام اس قدر ظالم ہیں کہ عام شہری کی زندگی خطرے میں ڈال کر رشوت وصول کرتے ہیں محکمہ ٹیکس کے ملازمین افسران حصول رشوت کے لئے کسی بھی شہری کو کنگال کردینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کریں گے۔

تصادم کی کیفیات

پاکستان میں اس وقت مختلف جگہوں پر تصادم کی کیفیات ہیں افغانستان انقلاب کے بعد پاکستان کی جو مذہبی تنظیمیں حکومت کی معاونت سے افغانستان میں مداخلت کر رہی تھیں افغانستان میں کامیابی کے بعد اب وہ تمام تنظیمیں کشمیر کے محاذ پر آگئی ہیں تقریباً" تین سال سے کشمیر کا محاذ کافی گرم ہوگیا ہے۔ جماعت اسلامی کی مخصوص تنظیم جماعت اہل حدیث اور سنی بریلوی حضرات اور دیگر گروہ کشمیر کے جہاد کے لئے رضاکار نوجوانوں کو گوریلہ جنگ کی تربیت دے کر کشمیر کے محاذ پر بھجواتے ہیں۔

ہمارے گوجرانوالہ میں آئے دن کسی نہ کسی مجاہد کی شہادت کی خبریں آتی رہتی ہیں ریڈیو اور پاکستان ٹیلی ویژن پر بھی مجاہدین کی کاروائیوں کی خبریں ہر روز بیان کی جاتی ہیں۔ اور ساتھ ہی کراچی میں بھی دہشت گردی کی گوریلہ جنگ جاری ہے خیال کیا جاتا ہے کہ بھارت کی مدد سے کراچی میں بد امنی اور گوریلا جنگ ہورہی ہے۔ جس قسم کی خبریں کشمیر سے آتی ہیں اسی قسم کی خبریں کراچی سے بھی آتی رہتی ہیں اس وقت بھارت اور پاکستان کے تعلقات انتہائی خراب ہیں مستقل قریب میں بھی یہ تعلقات اچھے ہوتے نظر نہیں آتے بین الاقوامی رائے عامہ بدستور اس خدشے میں مبتلا ہے کہ بھارت اور پاکستان دونوں نے ہی ایٹم بم بنائے ہوئے ہیں اور یہ دونوں ملک جنگ کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور یہ خدشات بدستور تقویت حاصل کر رہے ہیں کہ بھارت اور پاکستان کا باہم تصادم ہوجائے جو ایٹمی جنگ کی شکل اختیار کرجائے اور یہ دھرتی اور یہ تہذیب ہی تباہ ہوجائے دیگر یہ کہ مخصوص سنی تنظیم اور مخصوص شیعہ تنظیم بھی دہشت گردی میں مبتلا ہیں آئے دن کبھی سنی مساجد میں اجتماعات میں بم مار کر برنگ کرکے بے گناہ لوگوں کو قتل کیاجاتا ہے اسی طرح شیعہ اجتماعات میں بم مار کر فائرنگ کرکے بے گناہ لوگوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے پس پردہ بھی بیرونی طاقتوں کا ہاتھ ہے یہ تمام تصادم کی کیفیت ہر آن خطرے کی جانب بڑھ رہی ہیں کون جانے آنے والے وقت میں کیا ہوسکتا ہے۔

اس وقت کراچی میں تصادم یا گوریلا جنگ کی سی کیفیت ہے مگر اس وقت جنوری ۱۹۹۵ء میں

کراچی کے فسادات کی روک تھام کے لئے حکومت نے جدید طریقہ پر روک تھام کے لئے کوششیں تیز کردی ہیں امید کی جاتی ہے کہ کراچی کے فسادات پر وقتی طور پر قابو پالیا جائے گا امید کی جاتی ہے کہ بھارت کے سفارت خانہ کراچی میں بند ہوجانے سے امن قائم ہونے میں بہت مدد ملے گی۔

کراچی اور اندرون سندھ کے لوگوں میں نفرت اور تصادم کی کیفیت بدستور موجود ہے آنے والا وقت سندھ میں سندھی اور غیر سندھی کے تصادم کی کیفیات کا فیصلہ کرسکتا ہے قبل از وقت کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے۔ مگر یہ مسئلہ کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت جماعت اسلامی کی رضاکار فورس جہاں کشمیر میں گوریلہ جنگ میں شمولیت کئے ہوئے ہے وہاں مقامی طور پر اندرون ملک ڈنڈا فورس میں بنائے ہوئے ہیں۔ کسی بھی جگہ جماعت اسلامی والے مناسب سمجھتے ہیں ڈنڈا فورس کے ساتھ حملہ آور ہوجاتے ہیں۔ الزام لگانے کے لئے ان کے پاس سب سے بڑا ہتھیار فحاشی' ہوتا ہے کسی بھی جگہ فحاشی قمار بازی شراب نوشی کا الزام لگا کر تشدد کیا جاسکتا ہے۔ مگر جماعت اسلامی کے لٹھ بردار فوجی کلبوں' سول افسران کے کلبوں کی طرف منہ نہیں کرتے رشوت خور افسران کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کرتے سپاہ صحابہ والے بھی اب شیعہ سنی جھگڑے کے علاوہ عام لوگوں پر دھانس کا پروگرام بنا رہے ہیں سپاہ صحابہ کے امیر مولانا اعظم طارق ایم این اے نے مورخہ ۹۴-۱۲-۳۱ کو ایک اخباری بیان میں کہا تھا کہ آج رات سپاہ صحابہ کے نوجوان رضا کار محلے گلی کوچوں میں پھیل جاویں نئے سال کی خوشی میں کوئی بھی شخص شراب نوشی قمار بازی رقص و سرور میں نظر آجائے تو اسے ایسی چھینٹی لگائیں کہ سال بھر اسے کسی نشہ کی ضرورت نہ رہے۔

اس دھونس کی عوام یہ شکایت زبان پر نہیں لاتے مگر ان خودساختہ خدائی فوجداروں سے بھی خوف زدہ ہیں آنے والے وقت کا کیا تقاضا ہے دنیا بھر میں امن کی کوششیں کامیاب ہورہی ہیں مگر پاکستان کی اندر اور پورے برصغیر میں بھی زبردست تصادی کیفیت ہے کوئی صورت بظاہر ایسی نظر نہیں آرہی جس سے یہ تصادی کیفیت ختم ہو' کون کہہ سکتا ہے آنے والے کل کو کیا ہونے والا ہے کیا واقعی یہ تہذیب اور دھرتی تباہی کے دھانے پر ہے کیا واقعی ایٹمی جنگ۔ اس دھرتی کے مقدر میں لکھی جاچکی ہے۔

ملک میں ظلم' جبر اور افسران کی لوٹ کھسوٹ کا یہ عالم ہے کہ ہر چہرہ کسی مسیحا کا منتظر ہے جو گو مسلم معاشرے میں ممکن نہیں یہاں وہ قابل ذکر جماعت لوگوں کو جذباتیت میں ابھار کے بھارت کے خلاف یا کسی اور جنگ کی بھٹی میں جھونک دینے کی کوششیں کرتی ہیں یہاں کوئی بھی تحریک احترام آدمیت ارتقائے انسانیت کی نہیں یہاں سب لوگ انتشار کے جہنم میں جل رہے ہیں۔

جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا

کتابیں	مصنفین
میری زندگی اور جدوجہد	خان عبدالغفار خان
ہماری آزادی	مولانا ابوالکلام آزاد
کاروان احرار، امیر شریعت، مسجد شہید گنج	جانباز مرزا
مولانا عبید اللہ سندھی کے کابل میں سات سال	پروفیسر سرور
مارشل لاء سے مارشل لاء تک	سید نور احمد
حیات سید جمال الدین افغانی	شاہد حسین رزاقی
پنجاب کی سیاسی تحریکیں	پروفیسر عبداللہ ملک
جمعیت علمائے ہند	مس پروین
بیداری ملت کی تحریکیں	اسد گیلانی
خاکساروں کے ۲۱ نکات ۱۲ اصول اخبار الاصلاح	ادارہ عالیہ
سفر نامہ یورپ مصر و شام	منشی محبوب عالم
روداد جماعت اسلامی	شعبہ تصنیف جماعت اسلامی
حیات مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	عبدالرحمٰن عبید
تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء	مولوی اللہ وسایا
تحریک ختم نبوت تحقیقاتی عدالتی رپورٹ	جسٹس منیر احمد
پاکستان کی سیاسی جماعتیں	مہدی حسن
پاکستان کے سیاسی اتحاد	منیر احمد
شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب
ماہنامہ نوکین دور کوئٹہ	ڈاکٹر شاہ محمد مری

جن لوگوں سے معلومات حاصل کیں

ڈاکٹر شاہ محمد مری کوئٹہ، ڈاکٹر خدائیداد کوئٹہ، عبدالغفار کوئٹہ، محمد حسن چپل فروش کوئٹہ، سعید احمد نوشیروانی کوئٹہ، غازی خان آف ہری صوبہ سرحد، محمد شریف شاہ خاکسار گوجرانوالہ، مولانا زاہد اسراشدی گوجرانوالہ، غلام نبی بھلر گوجرانوالہ، جناب امان اللہ قادری گوجرانوالہ، شیخ امان اللہ ایڈووکیٹ گوجرانوالہ، چوہدری محمد یعقوب مسلم گوجرانوالہ، مقبول الٰہی کھوکھر گوجرانوالہ، جی اے سندھ پارٹی کے ایک کارکن سن ضلع دادو ڈاکٹر روشن مہران ہوٹل والے لاڑکانہ سندھ، حکیم جمیل احمد کراچی، رانا مقبول احمد ایڈووکیٹ لاہور۔

"پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں" گوجرانوالہ کے ایک ایسے کارکن کی تصنیف ہے جنہوں نے پاکستان کی مختلف جماعتوں اور تحریکوں میں خود حصہ لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صاحب کتاب ایک کارکن ہیں انہوں نے اسی حیثیت سے ان پارٹیوں اور تحریکوں کو دیکھا یہ ہی اس کتاب کی اہمیت ہے کہ یہ کتاب کسی سیاسی لیڈر کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ ایک سیاسی کارکن کی تصنیف ہے۔

حافظ تقی الدین گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز جمیعت علماء ہند کے ایک کارکن کے طور پر کیا۔ اس کے بعد احرار اور نیشنل عوامی پارٹی میں بھی رہے۔ "جینے دو" کے نام سے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا۔ اس میں انہوں نے "بیسویں صدی کی سیاسی تحریکیں تاریخ کے آئینے میں" کے نام سے ایک کالم شروع کیا۔ یہ کالم بہت پسند کیا گیا۔ یہ ہی کالم بعد میں اس کتاب کی وجہ تصنیف بنا۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں 1947ء تک مشترکہ ہندوستان کی (اس علاقے کی) جماعتوں اور تحریکوں پر بحث کی ہے جب کہ دوسرے حصے میں انہوں نے 1947ء سے آج تک کی جماعتوں اور تحریکوں پر تاریخی روشنی ڈالی ہے۔ اسی حوالے سے یہ ایک اہم کتاب ہے۔ جس میں انہوں نے آئندہ نسلوں کے لئے اپنے وقت کی اہم سیاسی جماعتوں کی تاریخ کو محفوظ کیا ہے۔ تاریخ کے یہ اوراق کتنے قیمتی ہیں اس بات کا اندازہ آپ کو کتاب پڑھ کر ہوگا۔

اقبال قیصر

فکشن ہاؤس

۱۸۔ مزنگ روڈ، لاہور